سب رس



بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۲ شمارہ ۷

جولائی سنہ ۱۹۷۰ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم	مہتمم
وقار خلیل	محمد جمال الدین

زر سالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے پندرہ روپے

ششماہی چار روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد نمبر ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

ترتیب

اپنی بات

" ادارۂ ادبیاتِ اردو" اب سے ۳۶ سال پہلے جن اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے قائم ہوا تھا' وہ اپنا منصب اب بھی ادا کر رہا ہے۔" اس کا ماہانہ ادبی ترجمان "سب رس" ادب کی اشاعت اور ترجمانی کا کام انجام دے رہا ہے۔ اس کا گرانقدر کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات و مخطوطات) علمی ادبی اور تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے پوری ذمہ داریوں سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ "ایوانِ اُردو" کا دارالمطالعہ تشنگانِ علم و ادب کی تسکین طبع میں مصروف ہے اور ادارے کی طرف سے مختلف موقعوں پر کلچرل تقریبیں منعقد ہوا کرتی ہیں' سمپوزیم' ادبی اجلاس اور شعری محفلوں کے علاوہ علم و ادب' تنقید و تحقیق کے باب میں نئی کتابیں بھی شائع ہوتی ہیں اور ادارے کے زیر اہتمام کم پڑھے لکھوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے ادارے کے امتحانات اُردو عالم اور اردو فاضل (مسلم جامعہ اُردو علی گڑھ) سے جو طالب علم استفادہ کرتے ہیں ان کو اُردو زبان کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم کے حصول سے فیضیاب ہونے کے مواقع ملتے ہیں۔

اس رپورٹ کے ملاحظہ کے بعد قارئین محسوس کریں گے کہ سن ۷۰-۱۹۶۹ء میں ادارہ کے تمام شعبوں نے اپنے اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیئے۔ ادارہ اپنے ان کرم فرماؤں کا بطور خاص ممنون ہے جنھوں نے میوزیم کے لئے نادر اشیاء اور کتب خانے کے لئے بیش بہا علمی و ادبی اور فنی کتابیں اور قدیم رسائل وغیرہ عنایت فرمائے۔

ادارہ کے میوزیم میں بھی اس سال قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے جس سے دکنی تہذیب و تمدن سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب استفادہ کرتے ہیں۔

یہ بات باعث مسرت ہے کہ ادارہ کے علمی و ادبی اور تہذیبی کاموں کو اردو دنیا میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ صحافت اور دیگر ہمدردانِ ادارہ کے تعاون کا ادارہ دل سے شکر گذار ہے اور آئندہ بھی تعاون کا خواہشمند ہے۔

(ادارہ)

تاثرات

دوران ۱۹۶۸ء میں "ادارۂ ادبیات اردو" کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات تحریر یا تقریر کے ذریعہ ظاہر فرمائے یا شائع کئے، ان کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ (ادارہ)

۱۔ جناب ایل رائے چودھری

ڈائرکٹر "میوزیم ریسرچ بیورو" دہلی۔

"ادارہ ادبیات اردو" ایک مفید کام انجام دے رہا ہے۔ میرے خیال میں اس کی مطبوعات اردو زبان و ادب کے فروغ میں گرانقدر مقام رکھتی ہیں۔ "ایوان اردو" اس امر کا مستحق ہے کہ اس کی مدد اور سرپرستی کی جائے۔ (ترجمہ)

(۱۱ جنوری ۱۹۶۸ء)

★

۲۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی

یہ میرا ایمان ہے کہ اردو جمہوریت کی امانت اور سالمیت قوم اور ملک کی ضمانت ہے اور وہ فرد اور ادارہ میرے لئے ولی اور حریم دانش و کعبۂ تہذیب ہے جو ملک و قوم کی خدمت کی نیت سے زبان کے فروغ اور تبلیغ میں معروف و مشغول ہے۔ اگرچہ یہ رہ پیمبری ہے اور اس میں آزمائش صبر آزما ہیں۔ حیدرآباد دکن (آندھرا) حاضر ہوکر "ایوان اردو" ادارہ ادبیات اردو، یادگار عظیم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور میں حاضر ہوکر یک گونہ سکون اور راحت قلب و جگر نصیب ہوئی اور ایک مبلغ، رضاکار اور مجاہد اردو کی حیثیت سے اطمینان ہوا کہ ابھی "نوشتہ بماند سیاہ بر سپید" کے مصداق حریم اردو اور محفل ادب سجا ہوا ہے اور لیلیٰ معنیٰ، مجنونانِ زبان کی دسترس سے دور نہیں ہے ایک خزینہ و گنجینۂ معانی اور تاریخ علم و ایمان محفوظ ہے۔ کاش مجھے توفیق ہوتی کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ایک ہفتہ کم از کم ادارہ ہی میں مقید کر لیا جاتا اور لائبریری میں اندر سے تالا ڈال کر بیٹھ سکتا۔ مگر پھر بھی جو کچھ میری پیاسی آنکھوں نے دیکھا ہے اس سے روح کی تشنگی دور اور بالیدگی و سرور حاصل کرنے میں امداد ملتی ہے

"زندہ صحبت باقی" پر دست ایک رباعی حاضر کرتے
ہوں ؎

فرخندہ یہ گلزار سخن آیا ہوں
پردیس نہیں فن کے وطن آیا ہوں
ارباب بصیرت سے ہے الفت مطلوب
ہیں داغ کی دلی سے دکن آیا ہوں

۲۴ر مارچ ۱۹۶۸ء

★

۳ - جناب پروفیسر امین چند شرما

صدر شعبۂ اُردو و فارسی، جبل پور یونیورسٹی ۔

مجھے اس ادارہ میں آنے کا زریں موقع ملا ہے۔ اس ادارہ کی ادبی خدمات سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہیں۔ دراصل یہ عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب کے خلوص، ایثار اور ادبی کاوش پر شاہد ہے۔ یہاں نادر اور بیش قیمت مخطوطات کا خزانہ ہے ڈاکٹر زور صاحب نے اردو کی ترویج اور ترقی کا سنگ بنیاد رکھکر ہمارے شانے پر عظیم ذمہ داری کا بوجھ ڈالا ہے ادارہ میں نوع بہ نوع نادر اشیاء محفوظ ہیں جملہ کارکنان ادارہ اپنے فرائض منصبی بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ یہاں ہر شخص کسی دُھن میں مگن ہے۔ ملک کے مختلف حصوں سے اردو کے شیدائی اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ میں اس ادارہ کے سنہری کاموں کو کئی سال سے جانتا ہوں۔ تشنۂ ادبی ذوق کے لئے اس ادارہ کی کشش قابل داد ہے۔ ہندوستان [illegible]

اعتبار سے اس کا مقام ارفع و اعلیٰ ہے کارکنان ادارہ مرحوم ڈاکٹر زور کے نقش قدم پر چل کر ان کے پیغام اور مقاصد کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں کارکنان اس ادارہ کی جان اور ڈاکٹر زور مرحوم کا ذوق تحقیق اس کی روح رواں ہے۔ اردو دوست حضرات کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اس ادارہ کی ترقی کے لئے دل و جان سے تعاون کریں۔ اس پودے کی نشو و نما میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں کیونکہ اردو بنی ہے ہندو مسلم کے میل سے ۔

۵ر اگست ۱۹۶۸ء

★

۴ - جناب بدرالدین طیب جی

سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔

جناب میر سراج الدین علی خاں نے ازراہ کرم مجھے ادارہ کے معائنہ کی دعوت دی، اور ادارہ کا تفصیلی معائنہ کروایا۔ میں اس ادارہ کے بانی کو اس بات پر خراج عقیدت پیش کرتا ہوں کہ اُردو کے مقصد سے متعلق انہوں نے جس بے لوث جذبے سے خدمات انجام دی ہیں، اس کو ان کے جانشینوں نے برقرار رکھا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ ادارہ آیندہ بھی اس شاندار کام کو جاری رکھیگا۔ (ترجمہ)

۱۹ر اگست ۱۹۶۸ء

★

۵ - جناب ثناء الحق (شعبۂ جغرافیہ)

مگدھ یونیورسٹی - آرہ (بہار) ۔

آج اس خانۂ اُردو میں آنے کا شرف حاصل ہوا، طالب علمی کے دور میں ہمیں پڑھا تھا کہ دکن اُردو کا آبائی

وطن ہے۔ آج اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ سلامت رکھے
اس گھر کو جب تک یہ زندہ ہے، اردو زندہ رہے گی۔
بے اختیار یہ خواہش ہوئی کہ کاش ایسے ادارے ہندوستان
کے کم از کم ان علاقوں میں تو ضرور ہوں جہاں کے باسی
اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں (اردو زندہ باد)

۱۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء



۶۔ جناب یونس اگاسکر

بھیونڈی (مہاراشٹرا)۔

حیدرآباد آکر دو اداروں کی اہمیت کا مجھے
خاص طور پر اندازہ ہوا۔ "سالار جنگ میوزیم" اور
"ادارۂ ادبیات اردو"۔ اس ادارہ میں ایک بات جس
نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا، وہ قدیم مخطوطات و نوادر
کا تحفظ ہے جس کے لئے یہاں کے اراکین تن دہی سے
کوشاں نظر آتے ہیں۔ اس ادارے کے سرگرم کارکنوں
سے بمبئی جیسے یا جو بھی شہر کے باشندے جو خدمت اردو کے
دعوے کرتے ہیں، بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ میں خاص طور
پر وقار خلیل صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنا
قیمتی وقت صرف کرکے مجھے مکمل معلومات بہم پہنچائیں۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۸ء



۷۔ جناب رشید حسن خاں

(شعبہ اردو) دہلی یونیورسٹی

مجھے تین دن تک مسلسل ادارۂ ادبیات اُردو
کے کتب خانہ میں کام کرنے کا موقع ملا، جس طرح تعاون کیا،
مدد کی اور رہنمائی بھی، اس سے میں بے حد متاثر ہوا۔ تحقیقی
کام کرنے والوں کو سب سے زیادہ ضرورت انہیں چیزوں
کی ہوا کرتی ہے یہاں کا میوزیم اور کتب خانہ دیکھ کر
مرحوم زورؔ صاحب کی بے مثال کارکردگی، دلچسپی اور لگن
کا اندازہ ہوا ع "ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا بن گئی"
میں بے حد متاثر ہوا ہوں یہاں کے نوادر کے ذخیرے سے
اور اس سے زیادہ اس بات سے کہ یہاں کے کارکن
حضرات ان کو بے حد احتیاط اور اہتمام کے ساتھ محفوظ رکھتے ہیں
اور اس سے زیادہ فراخ دلی کے ساتھ اس سے استفادے
کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ میں بطور خاص ممنون ہوں وقار خلیل
صاحب کا جن کے پُرخلوص تعاون سے مجھے بہت مدد ملی
کاش ہمارے سارے کام کرنے والوں میں بھی یہی جذبہ کارفرما ہو

۲۷ر نومبر ۱۹۶۸ء



۸۔ جناب محمود احمد ہنرؔ

ایڈیٹر ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد۔

ادارہ ادبیات اُردو کی زیارت کی آرزو مدت
سے تھی جو آج پوری ہوئی۔ دکن میں اب اردو کے شیدائیوں
کے لئے واقعی یہ ایک زیارت گاہ ہی ہے اور اردو کے
خدمت گزاروں کے لئے سعی و عمل کا ایک پیغام۔
خدا کرے یہ ادارہ یوں ہی کام کرتا رہے کہ دکن کے
باہر کے لوگوں میں بھی اسے دیکھ کر کام کرنے کا حوصلہ ہو۔

۴ر دسمبر ۱۹۶۸ء

تاثرات سنہ ۱۹۶۹ء میں

۱- جناب محمد حسین حسّان صاحب ندوی

ایڈیٹر "پیام تعلیم" جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی۔

وقتاً فوقتاً ادارہ ادبیاتِ اُردو کی مطبوعات کے مطالعہ کا اتفاق ہوتا رہا۔ ادارہ کے آرگن ماہنامہ سب رس سے بھی ادارہ کی سرگرمیوں کا حال معلوم ہوتا رہا۔ اسی لئے ادارہ کو دیکھنے کا شوق کبھی کبھی دل میں چٹکیاں لیتا تھا۔ خدا کی شان یہ موقع نصیب ہوگیا اور اِس ادارہ کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ کیسی عالیشان عمارت ہے۔ باہر کے کچھ اصحاب علم سے ملاقات اور تعارف کے بعد ادارے کے کارکنوں نے یہاں کی ایک ایک چیز دکھائی۔ ادارے میں جو قیمتی ذخیرہ ہے وہ بھی انتہائی شاندار ہے لیکن ان سب سے بڑھکر ایک اور چیز ہے اور وہ ہیں اس ادارے کے مخلص کارکن جو آجکل کے ناساز گار حالات میں پورے خلوص اور لگن کے ساتھ اسے ترقی دینے کی دُھن میں لگے ...

... ۱۹۶۹ء

۲- جناب کرسٹیاں ولیم نزال

ریسرچ اسکالر اُردو لندن (جرمن)

میں بہت خوش ہوں کہ میں آج ایوانِ اُردو اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا کام دیکھ سکا۔ یہ اس قسم کا پہلا ہال اور ادارہ ہے جس کو میں نے دیکھا۔ عام طور پر ہمارے اُردو کے ادارے یا تو کسی یونیورسٹی کا ایک حصّہ ہوتے ہیں یا حکومت کی طرف سے قائم ہوئے۔

یہاں میں محسوس کرتا ہوں کہ مختلف بزرگوں اور خصوصاً ڈاکٹر زور صاحب کی بے حد اُردو زبان و ادب بلکہ اُردو تہذیب کی محبت اِس ایوان کی بنیاد ہے۔ شعراء اور ادباء کی ممتاز تصویریں، مختلف دلچسپ نقشے، مخطوطات اور دوسری تاریخی چیزوں کی نمائش وغیرہ یہ سب ڈاکٹر زور اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کی اُردو کی محبت کے ثبوت ہیں۔ یہ دیکھکر کہ ادارہ اور ایوان ابھی زندہ طور پر وہی کام قائم رکھے ہیں میں بہت خوش ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یورپ کے ہر اُردو سیکھنے والے کو ایک

ایسا ادارہ دیکھنا چاہیئے اور مجھے اُمید ہے کہ ہم لندن یونیورسٹی میں بھی چند ایسی تصویریں اور نقشے حاصل کر سکیں گے۔ یہاں کے سارے اسٹاف کا بہت بہت شکریہ۔ اُردو، اُردو ادب، اردو ادب کی بڑی انسانیت زندہ باد (۲ر مارچ ۱۹۶۹ء)

۳۔ جناب نظر کامرانی صاحب

حیدرآباد سندھ پاکستان

"ایوانِ اُردو" اردو کا تاج محل ہے۔ جو ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے بعد شاید کوئی نہ بنا سکے۔ اِس دَور میں اور اِس وقت" ایوانِ اُردو" کے کارکن جو خدمت انجام دے رہے ہیں، یہ سب اُن کا حصّہ ہے۔ زورؔ مرحوم اور ایوانِ اُردو، اُردو زبان کے ایسے کارنامے ہیں جو ہمیشہ یاد رہیں گے۔ میں۔ وقار خلیل صاحب کا نہایت مشکور ہوں کہ اُنھوں نے اپنا قیمتی وقت دے کر مجھے اُردو اور کارنامۂ ایوانِ اُردو سے واقف کرایا۔

(۴ر جولائی ۱۹۶۹ء)

۴۔ جناب ڈاکٹر مجاہد حسین صاحب زیدی

ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ یونیورسٹی آف ہائیڈل برگ (جرمنی)

ادارۂ ادبیات اُردو کو دیکھنے کا مجھے پہلی بار موقع ۱۹۶۴ء میں ملا مجھے انتہائی مسرت ہے کہ پانچ سال کے بعد اِسے دیکھنے کا شرف پھر حاصل ہو سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادارہ کا وجود اور اُس کی سرگرمیاں اُردو دُنیا سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے از بس ضروری ہیں۔ ادارہ اپنے علمی کام سے اُردو دُنیا کو جس طرح فیض پہنچا رہا ہے، میری دعا ہے کہ فیض کا یہ دریا ہمیشہ جاری و ساری رہے۔ آمین

(۱۴ر ستمبر ۱۹۶۹ء)

۵۔ جناب پروفیسر اختر اورینوی صاحب

صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی (بہار)

ادارۂ ادبیاتِ اُردو ایک قیمتی امانت ہے۔ اس کا وزن، وقار اور اس کا حسن و جمال دل نشین ہے اللہ تعالیٰ اِن باقیات الصالحات کی حفاظت فرمائیے۔ خدا حافظ۔

(۲۷ر نومبر ۱۹۶۹ء)

۶۔ "پرچا" ہفتہ وار

آج سے ۴۰ برس پہلے پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ دکنی نے نئے ڈھنگ سے اُردو زبان و ادب کی خدمت کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ اِس غرض کے لیئے آپ نے ادارۂ ادبیات اُردو قائم کیا اور دکن میں اُردو زبان کی ترویج و احیاء اور دکنی ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات سے علمی دُنیا کو روشناس کرایا۔ اِس ادارہ کے تحت جتنے مخطوطات جمع کرے گئے، جتنی کتابیں لکھی اور شایع کی گئیں اِن سے ظاہر ہوتا ہے کہ پروفیسر زورؔ مرحوم نے اپنا نصب العین حیات ہی یہ بنا لیا تھا کہ دنیا کو دکن کی تاریخ تہذیب و تمدن اور اردو زبان و ادب سے متعلق دکن کی گرانقدر خدمات سے واقف کرایا جائے۔ اِس مقصد

کیلئے خود پروفیسر زورؔ مرحوم نے کئی کتابیں لکھیں اور گویا دوسرے لکھنے والوں کیلئے مشعلِ راہ فراہم کی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی اپنی علمی کاوشوں کی بنا پر دوسرے تو دوسرے خود ہم اہلِ دکن اپنے ماضی سے اور اپنی پوشیدہ صلاحیتوں سے واقف ہوں گے۔ اِسی واقفیت کی بنا پر اُردو زبان شعر و ادب سے متعلق ہمارے تحت الشعور میں چھپا ہوا احساسِ کمتری دور ہوا اور شمال کے مقابلہ میں ہماری خودی بیدار ہوئی۔ دکن کی جامعہ عثمانیہ ہی وہ واحد یونیورسٹی ہے جس نے اُردو کے ذریعہ جامعاتی سطح تک تعلیم دی۔ ہندوستان بھر میں دکن کا دارالترجمہ ہی ایسا ادارہ تھا جس نے اردو زبان میں مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے نہ صرف معیاری ترجمے کئے بلکہ فنی اصطلاحات وضع کیں اور حیدرآباد دکن کا ادارہ ادبیات اردو ہی وہ واحد ادارہ ہے جس نے شعبۂ تصنیف و تالیف کے تحت اب تک تین سو سے زیادہ کتابیں دکنی ادب، لسانیات و صوتیات، تاریخ و ثقافت دکن جیسے موضوعات پر شائع کئے۔ ادارۂ ادبیات اُردو نے اس طویل عرصہ میں دکنی ادب، تاریخ اور مختلف علوم و فنون پر اُردو، فارسی، عربی اور ہندی زبانوں میں ۲۵ ہزار مطبوعات اور ۵ ہزار مخطوطات کا جو بیش بہا علمی خزینہ فراہم کیا ہے وہ اِس ادارہ کی علمی ادبی خدمات کا واضح ثبوت ہے۔
اِس ادارہ کے تحت دکن کی تاریخ و ثقافت کے آثار کا جو میوزیم ہے وہ واقعی ایک ایسا عجائب گھر ہے جہاں قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفجاہی سلاطین کے فرامین و اسناد اور دکن کی خطاطی و مصوری کے نادر نمونے گولکنڈہ کے ہیروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ گولکنڈے کے ہیرے تو ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بکھر گئے لیکن ادارہ ادبیات اُردو نے ہماری تہذیب و تمدن کے جواہر پاروں کو یکجا اور محفوظ رکھا ہے جو بہت بڑا کام ہے۔
جو صاحبِ ذوق حضرات اِس ادارہ کی علمی ادبی خدمات سے جو بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہیں روشناس اور مستفید ہونا چاہتے ہیں وہ اگر بہ ذاتِ خود کبھی اس ادارہ کا معائنہ کریں تو پروفیسر زورؔ مرحوم اور ان کے جانشینوں کی خدمات سے کماحقہٗ واقف ہو سکیں گے۔ قابلِ صد تحسین ہیں وہ لوگ جو اس ادارہ کے بانی کے بعد بھی پوری دھن، مستعدی اور صلاحیت کیساتھ کام کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ماہنامہ سب رس جو پینتیس سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اِس ادارہ کا ترجمان ہے اور حق تو یہ ہے کہ دور دراز مقامات پر رہنے والوں سے ادارۂ ادبیات اردو کے کام اور خصوصیات کا تعارف اسی علمی ادبی ماہنامے کے ذریعہ ہوتا ہے۔ خود اس رسالہ میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ دکن میں اردو زبان کی سابقہ و موجودہ خدمات اور علمی و ادبی کاوشوں کے آئینہ ہوتے ہیں۔

ہفتہ وار "پرچا"

(مورخہ ۱۱ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء)

مصروفیات ادارہ

علمی ——— ادبی اور ——— ثقافتی

ادارے کی ۱۹۶۸ء کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۶۸ء

۵ جنوری :- اردو ڈائجسٹ ماہنامہ "جمالستان" دہلی کی اشاعت جنوری ۶۸ء میں سب رس سے جناب باقر منظور کی غزل اور ڈاکٹر سید یحییٰ احمد ہاشمی کا مقالہ "ڈاکٹر اقبال اور سید سلیمان ندوی" حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ ہوئے۔

۶ جنوری :- ماہنامہ "دورم" ٹانڈہ (فیض آباد) بابتہ جنوری ۶۸ء میں جناب شبنم سبحانی کی رپورٹ "تعمیر پسند اہل قلم حیدرآباد" کے زیرعنوان شائع ہوئی جس میں اسلامی طرز فکر کے ادیبوں اور شاعروں کے دورۂ ایوان اردو کے بعد کے تاثرات کئے گئے ہیں۔

اتوار ۷ جنوری :- انجمن اردو کے چوتھے سالانہ کنونشن میں ادارہ کی نمائندگی کرتے ہوئے صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے خطاب فرمایا۔

جمعرات ۱۱ جنوری (۱۱ بجے صبح) جناب ابل اداے چودھری، ڈائرکٹر میوزیم ریسرچ بیورو دہلی نے ادارہ اردو میوزیم اور دیگر شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد اردو میوزیم نے موصوف کو میوزیم کے گرانقدر اثاثہ سے متعارف کرایا۔

ہفتہ ۲۷ جنوری (۵½ بجے شام) :- ادارہ کی مجلس انتظامی کا اجلاس ایوان اردو کے کمیٹی روم میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں انتظامی امور اور علمی و ادبی مسائل پر غور کیا گیا اور فیصلے کئے گئے۔ جناب حامد علی عباسی، نواب عنایت جنگ، جناب سید امداد حسین، جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب، جناب میر حسن صاحب، ڈاکٹر ہاشم میر علی، جناب میر سراج الدین علی خاں، جناب رمن راج سکسینہ صاحب جناب سید نقی الدین قادری صاحب اور معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مسعود راج صاحب سکسینہ نے شرکت کی

فروری ۱۹۶۸ء

۳ فروری :- ماہنامہ "جمالستان" دہلی بابتہ فروری ۶۸ء میں جناب اندرجیت دت کی "سب رس" میں مطبوعہ کہانی جس کا عنوان "تعویذ" تھا حوالہ کے ساتھ ڈائجسٹ ہوئی۔

جمعرات ۱۵ر فروری (٦ بجے شام) یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے انعقاد کے سلسلے میں آغاز کار کے لئے معتمد تقاریب جناب رمن راج صاحب سکسینہ (ایڈوکیٹ) نے ایک مشاورتی اجلاس میں مختلف علم دوست اصحاب سے بات چیت کی

ہفتہ ۱۷ر فروری: گیارھویں سالانہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب ۲۵ تا ۲۷ فروری کو منعقد کئے جانے کے بارے میں ادارہ کی طرف سے پریس نوٹ جاری کیا گیا

اتوار ۱۶ر فروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کے سلسلے میں مندرجہ ذیل معتمدین کا انتخاب عمل میں آیا۔ جن میں معتمد یوم محمد قلی جناب رمن راج صاحب سکسینہ، شریک معتمد جناب سید نقی الدین صاحب قادری معتمد استقبالیہ آقائی حسین ضابطہ صاحب، معتمد نمائش جناب ضیاء الدین احمد شکیب صاحب، معتمد مالیہ جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب، معتمد نشر و اشاعت جناب وقار خلیل صاحب، معتمد ادبی اجلاس جناب میر حسن صاحب، معتمد مشاعرہ محترمہ بانو طاہرہ سعید صاحبہ معتمد تلگو اجلاس جناب سی ایچ سنکر صاحب، معتمد بین کلیاتی بیت بازی جناب صلاح الدین صاحب نیر منتخب کئے گئے

پیر ۱۹ر فروری (۵ بجے شام): یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں بمقام "نظام کالج" (معظم جاہی مارکٹ) بین کلیاتی بیت بازی کے مقابلوں کا آغاز ہوا جس میں شہر حیدرآباد کے طالب علموں نے حصہ لیا۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد بیت بازی کی کوششوں سے یہ مقابلے نہایت کامیاب رہے۔

اتوار ۲۵ر فروری (۵ بجے شام): ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے یوم محمد قلی قطب شاہ کا سہ روزہ گیارھواں اختتامی اجلاس گنبد محمد قلی واقع گولکنڈہ کے وسیع و عریض چبوترے پر منعقد ہوا۔ جسٹس سید قمر حسن صاحب نے صدارت فرمائی۔ میر عابد علی خاں صاحب (نغمہ سوسائٹی) نے اولاً محمد قلی کی مشہور مناجات "مرا شہر لوگاں سوں معمور کر" ساز و پر سنائی۔ معتمد یوم محمد قلی جناب رمن راج صاحب سکسینہ ایڈوکیٹ نے خیر مقدمی تقریر فرمائی اور ادارہ کی طرف سے اس سالانہ اجلاس کے انعقاد پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ نے بتایا کہ اس سال ادارہ کی طرف سے علمی و ادبی سرگرمیاں فروغ پاتی رہیں۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر نشین ادارہ نے مشاہیر کے پیامات سنائے۔ عظیم تر مجلس بلدیہ حیدرآباد کی طرف سے میئر بلدہ جناب کے کنڈا ریڈی صاحب نے بانی شہر حیدرآباد۔ محمد قلی قطب شاہ کی تہذیبی اور ادبی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب معتمد ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے محمد قلی قطب شاہ کے ثقافتی اور یادگار زمانہ عہد کو اپنی عالمانہ تقریر میں پیش کیا اور قطب شاہوں کی قومی یکجہتی اور معارف پروری کی تفصیلات بیان کیں۔ ممتاز ترقی پسند شاعر جناب مخدوم محی الدین (ایم ایل سی) اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے نظمیں سنا کر داد حاصل کی۔ کیپٹن عباس عابدی صاحب نے محمد قلی کا منظوم شجرہ سنایا اور ادارہ کی طرف سے اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی کے مزار پر چادر گل چڑھائی گئی۔

اس موقع پر بین کلیاتی تحریری اور بیت بازی کے مقابلوں میں کامیاب ہونے والے طلباء اور طالبات کو ادارہ کی طرف سے انعامات دئے گئے۔ میسرز ہلال پن اسٹور نے "سلطان پن" کا سٹ بطور ترغیبی انعام عطا کیا ۔

ادارہ کی طرف سے اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب پروفیسر حامدی کاشمیری (استاذ اردو کشمیر یونیورسٹی) کہانیوں کے خوبصورت مجموعہ ۔۔۔ کی رسم اجرا بھی انجام دی گئی۔

آخر میں دکن کے ممتاز موسیقار عزیز احمد خاں صاحب وارثی کی قوالی ہوئی۔ ہزاروں اردو ادب اور دکنی کلچر کے شیدائیوں نے بلا لحاظ رنگ و مذہب و نسل اس اجلاس میں شرکت کی۔ اور دکنی ادب اور کلچر کے اس میلہ کو کامیاب بنایا۔ جسے ڈاکٹر زور مرحوم نے قیام آندھرا پردیش کے بعد سے ہر سال منائے جانے کی بناء ڈالی تھی۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی طرف سے افتتاحی اجلاس کی کارروائی نشر کرنے کے لئے ریکارڈ کی گئی۔

پیر ۲۶ فروری ۴ بجے شام :- یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں دوسرے دن ایوان اردو کے ایک گوشے میں قطب شاہی ادب اور تمدن پر مشتمل تاریخی نمائش جناب ضیاء الدین احمد صاحب شکیب ایم۔ اے (علیگ) آرکائیوسٹ، اسٹیٹ آرکیوز ریاست آندھرا پردیش کی نگرانی میں ترتیب دی گئی تھی جس میں قطب شاہی دور کے دکنی ادب، اور محمد قلی پر کئے گئے علمی و ادبی کاموں پر مشتمل مطبوعات نظم و نثر اور تصاویر علاوہ اسٹیٹ آرکائیوز کی طرف سے عہد قطب شاہیہ کے فرامین و اسناد سلیقے سے سجائے گئے تھے۔ باذوق حاضرین کی ایک بڑی تعداد نے اس نمائش کا معائنہ کیا اور اظہار خوشنودی فرمایا جن میں سابق وزیر داخلہ نواب میر احمد علی خاں صاحب صدر ریاستی انجمن ترقی اردو، جسٹس سید قمر حسن، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، نواب عنایت جنگ بہادر، جناب سید رحمت علی ڈپٹی میئر بلدیہ اور مولوی سرفراز علی مرزا مہتمم تعلیمات حیدرآباد شامل ہیں۔

۵ بجے شام :- ایوان اردو کے آڈیٹوریم میں یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ادبی اجلاس جناب سری کرشن صاحب سہنا (آئی۔ اے۔ ایس) کی صدارت میں منعقد ہوا (خطبۂ صدارت علحدہ صفحات پر شائع کیا جارہا ہے)۔

بین کلیاتی تحریری مقابلہ یوم محمد قلی میں انعام اول کے مستحق جناب محمد جعفر حسین جعفری متعلم جامعہ عثمانیہ کے مضمون "دکنی تمدن قطب شاہی عہد میں" سے اس اجلاس کا آغاز ہوا۔ جناب نجم صدیقی صاحب (ایم اے) ریسرچ اسکالر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے قطب شاہی عہد کے اصول تعلیم اور تعلیمی مرکزوں پر مضمون سنایا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب لکچرار شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے عہد محمد قلی کے شاعر ملا وجہی کی گرانقدر تصنیف "سب رس" پر سیر حاصل مقالہ پڑھا۔ محترمہ مس نجمہ صدیقہ (ایم اے) ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ نے عہد محمد قلی کے فارسی شاعر حضرت میر محمد مومن کی شخصیت اور فارسی شاعری پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر عبدالوہاب صاحب ظہوری پرنسپل نظامیہ طبی کالج نے "قطب شاہی عہد کے چند اطباء" کے زیر عنوان مقالہ سنایا۔ محمد قلی قطب شاہ کو پرنس نقی طبی نصاب

ثاقب، جناب نر ساحری صاحب اور جناب بشیر انور صاحب
نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ جناب مہر حسن صاحب
معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر ادبی اجلاس کامیابی کے
ساتھ اختتام کو پہنچا۔

مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ

پیر، ۲۶ فروری (۹½ بجے شب):۔ یوم محمد قلی قطب شاہ
کے گیارھویں سالانہ اجلاس کی تیسری تقریب "محفل شعر"
جناب محمد عبدالوحید خاں صاحب ناظم آثار قدیمہ کی صدارت
میں منعقد ہوئی۔ جناب وقار خلیل صاحب نے معتمد
مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ یہ مشاعرہ دو بجے رات
تک نہایت ہی کامیابی سے جاری رہا۔ حیدرآباد کے قدیم
وجدید مکتب خیال کے مشہور اور ممتاز شعرا کے علاوہ
ابھرتے ہوئے نئے فنکاروں نے بھی کلام سنا کر داد لی۔
جن میں مخدوم محی الدین، خورشید احمد جامی، سعید
شہیدی، حیرت بدایونی، تاج قریشی، ڈاکٹر غیاث صدیقی
پرنس نقی علی خاں ثاقب، وقار خلیل، خیرات ندیم، پرنس
سیادت علی خاں صاحب، صلاح الدین نیر، عشرت
کرتپوری، اسد انصاری، داؤد نصیب، فیض الحسن
خیال، برق یوسفی، حسن فرخ، علی الدین نوید، مجاہد الانصاری
مسعود عابد، سراج حیدرآبادی، غازی جلیلی، غیاث
متین، مسعود عابد، محمود خاور، ثریا مہر، رحمان جامی،
سراج منیر، تاج کریم نگری، شمیم، نصرتی، ناصر صدیقی،
عثمان علی ضیا، طاہر عابدی، راجہ کرن پرشاد کرن،
نواب گیسو دراز خاں گیسو، عازم رضوی، نعیم راہی اور
رحمت یوسف زئی نے کلام سنایا۔ زندہ دلان حیدرآباد
کانفرنس میں آئے ہوئے مہمان شعرا جناب رضا نقوی صاحب
واہی، جناب واقف مرادآبادی اور نوجوان شاعر جناب
اسلم آزاد نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کی اور اپنے کلام
سے ممنون فرمایا۔

سہ شنبہ، ۲۷ فروری (۶ بجے شام)

تلگو اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ

ایوان اردو میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ
تقاریب کا آخری تلگو اجلاس ڈاکٹر پی، ورگیا ریڈر شعبہ
تلگو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلگو بولنے
اور سمجھنے والوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ ڈاکٹر
ٹی نارایانا شاستری، ڈاکٹر پی، مادھوا شرما اور جناب
یم سیوا پرساد نے محمد قلی کی تمدنی، ادبی اور تلگو شعر
وادب کی خدمات کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔ جناب
سی، سنکر معتمد ادبی اجلاس کے شکریہ پر یہ جلسہ برخاست ہوا۔

مارچ ۱۹۶۸ء

ہفتہ، ۲ مارچ:۔ غالب صدسالہ تقاریب کے
انعقاد کے سلسلے میں ایک مرکزی کمیٹی کا اجلاس
اردو ہال میں منعقد ہوا۔ نائب صدر ادارہ جناب
سید دلدار حسین صاحب نے (جو ادارہ کی طرف سے
قائم کردہ "غالب کمیٹی" کے صدر بھی ہیں) شرکت
کی اور ادارہ کی نمائندگی فرمائی۔ ادارہ کے اعزازی
معتمد دفتر جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب
نے بھی اس اجلاس میں ادارہ کی طرف سے نمائندگی کی۔
اتوار، ۳ مارچ (۱۰½ بجے صبح) ادارے کے صدر
پروفیسر سید علی اکبر صاحب کے بنگلہ واقع ہمایوں نگر

ادارہ کے شعبہ امتحانات کی کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب نے ڈسمبر ۱۹۶۷ء میں منعقدہ امتحانات ادارہ کا نتیجہ کمیٹی کے آگے بغرض توثیق و اجرائی پیش کیا۔ اور کمیٹی کی منظوری کے بعد نتائج بغرض اشاعت اجازت اور امتحانی مراکز کو جاری کئے گئے۔ اس اجلاس کی صدارت پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے فرمائی اور مولوی غلام رسول صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، محمد اکبر الدین صدیقی صاحب اور جناب عارف الدین حسن صاحب نے شرکت کی۔

۴ مارچ :۔ ماہنامہ "جمالستان" دہلی بابتہ مارچ ۱۹۶۸ء میں "سب رس" میں مطبوعہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا مقالہ "اردو نظم میں حالی کا مقام" اور جناب سہیل اختر کی نظم "شہاب ثاقب" حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ ہوئی۔ ادارے کے امتحانات منعقدہ ڈسمبر ۱۹۶۷ء کے نتائج تمام مقامی روزناموں میں شائع ہوئے۔

۷ مارچ :۔ ریاستی انجمن ترقی اردو کے پندرہ روزہ ترجمان "ترقی اردو" حیدرآباد کی اشاعت یکم مارچ ۱۹۶۸ء میں یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کی تفصیلی رپورٹ شائع ہوئی۔

چہارشنبہ ۱۳ مارچ (۶ بجے شام) مجلس انتظامی

ادارہ ادبیات اردو کا اجلاس کمیٹی روم ایوان اردو میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ادارہ کے ٹرسٹ کے مسودہ کو منظور کیا گیا اور ٹرسٹیز کا انتخاب عمل میں لایا جاکر جدید مجلس انتظامی بھی تشکیل دی گئی۔ اس اجلاس میں رائے جانکی پرشاد صاحب، جناب سید دلاور حسین صاحب، جناب سجاد علی صاحب عباسی، نواب عنایت جنگ بہادر، جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب، جناب رمن راج سکسینہ صاحب، مولوی میر حسن صاحب، جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب، ڈاکٹر ہاشم علی صاحب، مولوی عارف الدین حسن صاحب، مولوی سید تقی الدین قادری صاحب اور معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مہندر راج صاحب سکسینہ نے شرکت فرمائی۔

۱۶ مارچ : ماہنامہ "نقش" کراچی بابتہ جنوری، فروری ۱۹۶۸ء میں جناب مظفر حنفی کی "سب رس" میں مطبوعہ غزل حوالہ کے ساتھ ڈائجسٹ ہوئی۔

اتوار ۲۴ مارچ (۵ بجے شام)

پنڈت گلزار دہلوی کے ساتھ محفل شعر

دہلی اسکول کے ممتاز شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کا ایوان اردو میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ موصوف نے ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی معتمد کتب خانہ ادارہ، جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد اردو میوزیم اور جناب وقار خلیل صاحب نے تمام شعبوں کی سیر کرائی اور شریک معتمد ادارہ رائے رمن راج صاحب سکسینہ نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر منعقد محفل شعر میں راجہ کرن پرشاد کرن، جناب مجاہد اللہ انصاری صاحب، جناب گیان سنگھ شاطر، جناب عشرت کرن پوری، جناب وقار خلیل، جناب کنول پرشاد صاحب کنول، جناب سرفراز علی مرزا نے کلام سنایا۔ جناب گلزار نے حیدرآباد اور اردو کے تعلق سے رباعیات سنا کر خوب داد پائی۔ اس موقع پر ادب دوستوں کی خاصی تعداد ایوان اردو میں

موجود تھی، جن میں ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ، جناب جیجن صاحب، جناب منوہر پرشاد صاحب ماتھر (ایڈووکیٹ) قابل ذکر ہیں۔

۲۵ مارچ :۔ ماہنامہ "جمالستان" دہلی (اپریل ۶۸ء) میں جناب مظفر حنفی کی "سب رس" میں مطبوعہ غزل بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

جمعرات ۲۸ مارچ (۹ بجے شب) "آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نیرنگ پروگرام میں افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب" کی تفصیلی ریڈیو رپورٹ مرتبہ جناب مرزا اظہر افسر صاحب نشر ہوئی۔

اپریل ۱۹۶۸ء

جمعرات، ۱۱ اپریل :۔ سہ لسانی فارمولے سے متعلق اردو بولنے والوں کے جذبات، احساسات اور ضروریات سے ریاستی حکومت کو واقف کرانے اور اپنے نقطۂ نظر کو منوانے کے مقصد سے ایک نمائندہ اردو وفد نے وزیر تعلیم آندھرا پردیش سے ملاقات کی۔ ادارہ کی طرف سے اس وفد میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے نمائندگی فرمائی۔

مئی ۱۹۶۸ء

۶ مئی: ہفتہ وار "تعمیر" محبوب نگر میں ادارہ کے امتحانات منعقدہ ڈسمبر ۱۹۶۷ء محبوب نگر پر ہونے والے نتائج شائع ہوئے۔

۱۳ مئی :۔ ادارہ کے سلسلہ اشاعت مطبوعات کشمیر کے تحت جناب ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے شائع شدہ افسانوں کے مجموعہ "برف میں آگ" پر روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں تبصرہ محررہ وقار عظیم صاحب شائع ہوا۔

جون ۱۹۶۸ء

اتوار ۲ جون :۔ بانی ادارہ ڈاکٹر زور کی سالانہ فاتحہ اور ان کے والد حضرت زائر کے عرس کی تقاریب بعد نماز عصر خانقاہ عنایت الٰہی میں منعقد ہوئے۔

● ادارہ کے اردو امتحانات، اردو فاضل، اردو عالم اردو زباندانی اور اردو دانی بابتہ جون ۱۹۶۸ء حسب ذیل مرکزوں پر ۲ تا ۴ جون ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ مرکز حیدرآباد (انوار العلوم کالج، سٹی ہائی اسکول اور سنٹرل جیل) مرکز مدراس، مرکز محبوب نگر، مرکز نظام آباد، مرکز سنگاریڈی، مرکز نارائن کھیڑ، مرکز سرپور کاغذ نگر، مرکز مدور، حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم کالج پر پروفیسر اکبر الدین صاحب صدیقی اور معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب نے نگران اعلیٰ کے فرائض انجام دیئے پروفیسر سید محمد صاحب سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ نے مدراس کے مرکز کی نگرانی فرمائی۔

۴ جون (۱۰½ بجے صبح): مہتمم تعلیمات حیدرآباد جناب سرفراز علی مرزا صاحب نے ادارہ کا تفصیلی معائنہ کیا۔ اس موقع پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب اور نائب صدر جناب سید دلاور حسین صاحب کے علاوہ آنرری سکریٹری جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب بھی ادارہ میں موجود تھے۔

چہارشنبہ ۱۲ جون (۱۱ بجے صبح) حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں مرحوم کے صاحبزادے پرنس نواب تقی جاہ بہادر نے ایوان اردو کا معائنہ فرمایا۔ اور

ادارے کے کتب خانہ سے تیس سال قبل رسائل میں اپنے مطبوعہ کلام کی نقولات حاصل کیں۔ موصوف کے ہمراہ ان کے صاحبزادے پرنس نقی علی خان صاحب ثاقب بھی تھے جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب اور وقار خلیل صاحب نے ان حضرات کو ادارہ کے تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔

جولائی ۱۹۶۸ء

سہ شنبہ ۲ جولائی (۶ بجے شام) ایوان اردو کے کمیٹی روم میں مجلس انتظامی ادارہ ادبیات اردو کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب (صدر ادارہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مختلف تنظیمی اور علمی و ادبی امور پر بحث ہوئے اور فیصلے کئے گئے۔ جناب محامد علی عباسی صاحب، پی۔ این۔ گپتا صاحب، نواب عنایت جنگ بہادر، جناب ابر حسن صاحب، ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب، جناب رائے جانکی پرشاد صاحب، جناب رمن راج سکسینہ صاحب اور جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب کے علاوہ معتمد عمومی ادارہ پروفیسر مہندر راج صاحب سکسینہ نے شرکت فرمائی۔

پیر ۸ جولائی (۹ بجے صبح): شعبہ اردو امتحانات کی مجلس مشاورت کا اجلاس پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں مختلف امور کے علاوہ دسمبر میں انعقاد امتحانات کی منظوری دی گئی۔ پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی غلام رسول صاحب، جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب اور معتمد امتحانات جناب سید عاطف الدین حسن صاحب نے اس کمیٹی میں شرکت کی۔

۱۸ جولائی:۔ پاکستان کے ڈائجسٹ ماہنامہ "جائزہ" کراچی کی اشاعت ماہ جولائی ۶۸ء میں "سب رس" سے جناب روشن صدیقی کی مطبوعہ غزل بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

دوشنبہ ۲۹ جولائی: ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی اپنے نئے عہدہ کا جائزہ لینے کے لئے علی گڑھ روانہ ہوئے۔ ادارہ کی طرف سے موصوف کو آفس سکریٹری میر سراج الدین علی خاں صاحب نے ریلوے اسٹیشن پر وداع کیا۔

اگسٹ ۱۹۶۸ء

۴ اگسٹ:۔ جناب اندرجیت دت کی کہانی "معاوضہ" مطبوعہ "سب رس" دہلی کے ڈائجسٹ "جہاں ستان" (اگسٹ ۶۸ء) میں بحوالہ دوبارہ اشاعت پذیر ہوئی۔

دوشنبہ ۵ اگسٹ: جناب پروفیسر امین چند صاحب شرما صدر شعبہ فارسی و اردو جبل پور یونیورسٹی نے ادارہ کا معائنہ کیا۔ میر سراج الدین علی خاں صاحب آفس سکریٹری نے موصوف کو تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔

۱۵ اگسٹ:۔ "یوم آزادی ہند" کے موقع پر صبح ۸ بجے ادارہ کی عمارت "ایوان اردو" پر جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب (افس سکریٹری) نے قومی پرچم لہرایا۔

● معتمد اعزازی ادارہ پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب کے دورہ آسٹریلیا پر آفس سکریٹری ادارہ اور شریک معتمد ادارہ جناب رمن راج صاحب سکسینہ نے موصوف کو ادارہ کی طرف سے بیگم پیٹ ہوائی اڈہ پر خدا حافظ کہا۔ پروفیسر سکسینہ نے آسٹریلیا میں ہونے والی امن ولیجہ

کانفرنس میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی فرمائی ۔

اتوار، ۱۸ راگست (۴ بجے شام) مشہور طنز و مزاح نگار ادیب و شاعر جناب برق آشیانوی اور نواب طفیع الدین خاں صاحب شفیع سب رجسٹرار میدک نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا ۔ وقار خلیل صاحب نے ان حضرات کو تمام شعبوں کے کاموں سے متعارف کرایا ۔

پیر ۱۹ راگست (۱۱ بجے صبح) جناب بدر الدین طیب جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ایوان اردو کا بہ نظر غائر معائنہ فرمایا ۔ آنریری سکریٹری میر سراج الدین علی خاں صاحب نے ادارے کے تمام شعبوں سے معزز مہمان کو تفصیلی طور پر واقف کرایا ۔

شنبہ ۲۷ راگست ۔ بزم صباحیہ کیا یاد کی طرف سے ممتاز غزل گو شاعر حضرت فانی بدایونی کی ۲۷ ویں برسی کے موقع پر دیگر علمی و ادبی اداروں کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے مزار فانی پر چادر گل چڑھائی اور اسی روز ۶ بجے شام اردو ہال میں منعقدہ جلسہ یاد فانی سے خطاب فرمایا ادارہ کی طرف سے وقار خلیل صاحب، میر سراج الدین علی خاں صاحب اور محمد جلال الدین صاحب نے بھی دونوں جلسوں پر شرکت کی ۔

ستمبر ۱۹۶۸ء

پیر ۲ ستمبر (۵½ بجے شام) ایوان اردو میں پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے مجلس انتظامی کے اجلاس کی صدارت فرمائی جس میں مختلف علمی و انتظامی مسائل پر غور و خوض اور فیصلوں کے ساتھ "یوم زور" کے انعقاد کی منظوری بھی دی گئی ۔ اجلاس میں جناب محامد علی عباسی صاحب، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی سید حسن صاحب، ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب، جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب اور شریک معتمد جناب رمن راج سکسینہ صاحب شریک رہے ۔

۷ ستمبر ۔ ہفتہ وار "مورچہ" گیا (بہار) میں "سب رس" اگست سے جناب رؤف خیر کی مطبوعہ غزل ڈائجسٹ ہوئی ۔

۹ ستمبر ۔ بانی ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی علمی و ادبی خدمات میں "یوم زور" کے انعقاد کی تفصیلات مقامی اخباروں میں شائع ہوئیں ۔

۱۰ ستمبر : ادارہ کی سالانہ رپورٹ ادارہ ۶۸-۱۹۶۷ء میں کے نام سے مرتبہ وقار خلیل صاحب شائع ہوئی جس پر ادارہ کا سلسلہ مطبوعات نمبر (315) درج

شنبہ ۱۴ ستمبر ۔ بانی ادارہ ڈاکٹر زور مرحوم کی چھٹی برسی کے موقع پر مسجد افضل گنج میں بعد نماز عصر فاتحہ ختم قرآن کا انتظام کیا گیا تھا جس میں پروفیسر سید محمد، جناب حیرت بدایونی، جناب تاج قریشی، جناب عارف الدین حسن خاں، مراد علی طالع، جناب عبدالرحمن شریف، جناب سید محی الدین صاحب، میر سراج الدین علی خاں صاحب، وقار خلیل صاحب، محمد جلال الدین صاحب، مولوی ضامن علی بخاری صاحب، رئیس الدین صاحب،

نے شرکت کی۔ بعد نماز مغرب ڈاکٹر زورؔ کے والد گرامی حضرت
زعیم کے مزار واقع خانقاہ عنایت الٰہی پر ادارہ کی
طرف سے چادر گل چڑھائی گئی۔

پیر ۳۰ ستمبر (۵ بجے شام) ممتاز ادیب
اور محقق پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب ڈائرکٹر
انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کی وفات
حسرت آیات پر ایوان اردو پر ایک جلسہ تعزیت
منعقد ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے صدارت
فرمائی۔ پروفیسر سید محمد صاحب سابق ریڈر جامعہ
عثمانیہ، محمد اکبر الدین صاحب صدیقی اور ڈاکٹر مغنی
تبسم نے ندوی صاحب مرحوم کے خدمات کو زبردست
خراج عقیدت ادا کیا۔ وقار خلیل صاحب نے نظم
سنائی۔ کرسی صدارت سے قرارداد تعزیت منظور کی گئی
فاتحہ کے بعد دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔
گئی۔ ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے
ندوی نمبر کی اشاعت کے سلسلہ میں ڈاکٹر مغنی
تبسم صاحب کی تجویز کا صدر ادارہ نے خیر مقدم
کیا اور جلد ہی "سب رس" کے خاص نمبر کی اشاعت
کے سلسلے میں معتمد "سب رس" جناب اکبر الدین صدیقی
صاحب کو توجہ دلائی۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء

۱۱ اکتوبر۔ ہفتہ وار "پرچار" (اردو) نظام آباد
میں ادارہ کے علمی و ادبی خدمات کے تعلق سے اداریہ
شائع ہوا۔

پیر ۱۴ اکتوبر (۱۱ بجے صبح) جناب ثناء الحق صاحب
لکچرار شعبہ جغرافیہ مگدھ یونیورسٹی (گیا۔ بہار) نے ادارہ
کے تمام شعبوں کو ملاحظہ فرمایا۔ وقار خلیل صاحب نے
موصوف کو ادارہ کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے متعارف کرایا

سہ شنبہ ۲۹ اکتوبر (۱۱ بجے صبح) اردو و مراٹھی کے
جواں سال ادیب و مترجم جناب یونس اگاسکر صاحب
(بمبئی) نے ایوان اردو کا معائنہ کیا۔ وقار خلیل صاحب
نے تمام شعبوں کی سیر کرائی۔

نومبر ۱۹۶۸ء

اتوار ۱۰ نومبر (۱۱ بجے صبح)۔

ادبی اجلاس یوم زورؔ

بانی ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی چھٹی برسی کے
موقع پر ایوان اردو میں جناب محمد ابراہیم علی انصاری
صاحب ریاستی وزیر طبابت و صحت عامہ کی صدارت
میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب
نے صدر صاحب کا خیر مقدم فرمایا اور شریک معتمد
ادارہ جناب رمن راج صاحب سکسینہ نے پیامات
سنائے۔ ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب، محترمہ نجمہ
صدیقہ، جناب مرزا اسرار علی مرزا، جناب میر یٰسین
علی خاں صاحب اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے ڈاکٹر زورؔ
کی علمی، ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ وقار خلیل صاحب
اور محترمہ ناز حمیدہ صاحبہ نے نظمیں سنائیں۔ صدارتی
خطبہ کے بعد ڈاکٹر مغنی تبسم کے شکریہ پر اجلاس
برخواست ہوا۔ (یوم زورؔ کی مکمل تفصیلات علاحدہ
صفحات میں شائع کی جارہی ہیں)

پیر ۱۱ نومبر (۹ بجے شب) یوم زورؔ کے سلسلے میں

میں جناب سری کرشن سبل صاحب کی صدارت میں طرحی و غیر طرحی کامیاب مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں حیدرآباد کے تیس قدیم و جدید مکتب خیال کے شعراء نے کلام سنایا۔ وقار خلیل صاحب نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ (مشاعرہ کے اقتباسات اور صدر مشاعرہ کا خطبہ بھی علحدہ صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۱۱ر نومبر: ماہنامہ جانثار اہرت سر کی اشاعت نومبر ۱۹۶۸ء میں "سب رس" ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۵ر نومبر: پندرہ روزہ "ترقی اردو (ترجمان انجمن ترقی اردو حلقہ عام میں ادبی اجلاس یوم زور کی تفصیلات شائع ہوئیں۔

۱۶ر نومبر: ادارہ کے نائب صدر رائے جانکی پرشاد صاحب کی وفات کی حسرت آیات کی خبر ملتے ہی "ایوان اردو" کے دفاتر بند کر دیئے گئے مرحوم کے جلوس جنازہ کی طرف سے پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ جناب میر حسن، جناب میر سراج الدین خاں صاحب اور وقار خلیل صاحب نے شرکت کی۔

اتوار ۱۷ر نومبر (۵ بجے شام) ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو اور ہندو کی طرف سے رائے جانکی پرشاد صاحب کے سانحہ ارتحال پر اردو ہال میں جناب سعید جنگ ایک جلسہ تعزیت ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر نے ادارہ سے رائے صاحب کی دیرینہ وابستگی اور مرحوم کی گراں قدر علمی ادبی اور تہذیبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا۔ تینوں اداروں کی طرف سے مشترکہ قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

پنجشنبہ ۲۱ر نومبر (۴ بجے شام) دوردراں اصفی کے جواں سال شاعر پرنس سیادت علی خاں صاحب نے آخر صدیقی صاحب کے ہمراہ ادارہ کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ وقار خلیل صاحب نے موصوف کو ادارہ کی خدمات سے روشناس کرایا

۲۴ر نومبر: آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے "نیرنگ" پروگرام میں ۹ بجے شب مشاعرہ یوم زور کی ریڈیو رپورٹ مرتبہ جناب اظہر افسر نشر ہوئی۔

سہ شنبہ ۲۶ر نومبر: اردو کے مشہور ادیب اور محقق جناب رشید حسن خاں صاحب لکچرار شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی نے "غالب" کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا اور ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی طور پر معائنہ فرمایا اس موقع پر ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب پرنسپل اردو کالج محترمہ زینت ساجدہ ریڈر ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ اور محترمہ زاہدہ ابوالحسن لکچرار اردو کالج بھی ادارہ میں موجود تھیں۔ ترجیص الدین صاحب انصاری اور وقار خلیل صاحب نے موصوف کو ادارہ کے تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔

دسمبر ۱۹۶۸ء

چہارشنبہ ۴ر دسمبر (۱/۲ ۱ بجے دوپہر) اردو کے مشہور علمی و ادبی ڈائجسٹ ماہنامہ "شاہکار" الہ آباد کے مالک و مدیر جناب محمود احمد صاحب ہنر نے ایوان اردو کے تمام شعبوں کا معاینہ کیا۔ ترجیص الدین صاحب نے کتب خانہ کے شعبوں اور وقار خلیل صاحب نے اردو میوزیم اور علمی و ادبی رسائل کے بارے تفصیلات سے واقف کرایا۔

۱۹ر اکتوبر ۔ ادارہ اور ایوانِ اردو میں نیا ٹیلیفون
ب ہوا جس کا نمبر (۶۹۴۴۳۸) ہے۔

جمعرات ۲۶ر ڈسمبر (۱/۲ ۲ بجے صبح) محترمہ ڈاکٹر
یب النساء بیگم صاحبہ صدر شعبہ اردو میسور یونیورسٹی
قیادت میں جامعہ میسور کی طالبات کی ایک جماعت
ن اردو کا معاینہ کیا جن میں ایم۔ اے کی طالبات
یدہ خانم ثریا، صفی ناز شاہدہ، نیلوفر ثمینہ، جمیلہ بیگم
کے علاوہ معین الحق (ایم۔ اے) اور مشتاق احمد (ایم اے)
مل ہیں۔ جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب
ں سکریٹری اور ترجیس الدین انصاری صاحب لائبریرین
۔۔ نے مہمانوں کو تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔

● (۱/۲ ۲ بجے دوپہر) اشرف المدارس ہائی اسکول
حیدرآباد کے پندرہ طالب علموں کے گروپ نے اسداللہ
صاحب علوی پرنسپل، رکن الدین صاحب فاروقی اور
شبیر حسین خاں صاحب محترم اساتذہ کی قیادت میں
ایوان اردو کے تمام شعبوں سے متعلق معلومات حاصل
کیں۔ وقار خلیل صاحب نے طلباء کو اردو میوزیم اور
کتب خانہ اور آڈی ٹوریم کے بارے میں واقف کرایا۔
مولوی عارف الدین حسن صاحب معتمد اعزازی شعبہ اردو
امتحانات اور جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب آفس
سکریٹری نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے اردو اور ادارہ کے
بارے میں معلومات بہم پہنچائیں۔

مصروفیاتِ ادارہ

علمی، ادبی اور ثقافتی

ادارے کی سنہ ۱۹۶۹ء کی ڈائری سے

جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

اتوار ۵ جنوری: ــــ (۱۱ بجے) ایوانِ اُردو میں بچوں کے مشہور اور بزرگ ادیب مولانا محمد حسین حسان ندوی ایڈیٹر ماہ نامہ "پیامِ تعلیم" جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور ممتاز ادیب جناب نثار احمد فاروقی لکچرار عربی دہلی کالج کے خیر مقدم میں ایک علمی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ نے صدارت کی۔ اُردو میں بچوں کے ادب پر حسان صاحب نے روشنی ڈالی، حیدرآباد میں بچوں کے ادب اور ادیب اطفال پر وقار خلیل صاحب نے تفصیلی طور پر اظہار رائے کیا۔ اُردو کے تنقیدی اور تخلیقی ادب پر جناب نثار احمد فاروقی اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے مخاطب کیا۔ محفلِ شعر میں ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب جہانگیر افسر، وقار خلیل اور جناب قطب سرشار نے کلام سنایا۔ اس موقع پر مسز منوہر پرشاد ماتھر (ایڈوکیٹ) مولوی اسرائیل خاں صاحب، شاہین سلطانہ، ترصیع الدین انصاری صاحب اور میر سراج الدین علی خاں صاحب آفس سکریٹری ادارہ اور دیگر اصحاب موجود تھے۔

۲۶ جنوری: ــــ یوم جمہوریہ کے موقع پر ایوانِ اُردو پر قومی پرچم لہرایا گیا۔

فبروری سنہ ۱۹۶۹ء

۷ فبروری: یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں بین کلیاتی تحریری مقابلوں کے سلسلے میں ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب کنوینر کی طرف سے پریس نوٹ شائع ہوا۔

۸ فبروری: ــــ یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب کا تفصیلی پروگرام بغرض اشاعت جاری کیا گیا۔

۱۱ فبروری: ــــ مجلس مشاورت یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس ایوان اردو میں منعقد ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے صدارت فرمائی۔ جناب میر حسن، نواب میر یسین علی خاں، جناب سید رحمت علی ڈپٹی میر مجلس بلدیہ، محترمہ لکشمی دیوی راج، عابد علی خاں صاحب (الغہ سوسائٹی) جناب رسی راج سکینہ ایڈوکیٹ۔

۱۲ر فروری :— بچوں کا رسالہ ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی بابتہ فروری ۱۹۶۹ء میں جناب محمد حسین حسان صاحب نے اپنے ایڈیٹوریل میں ادارہ اور ایوانِ اُردو کی علمی و ادبی خدمات اور ادب اطفال کے سلسلے میں ادارہ کی مطبوعات پر سیر حاصل رائے شائع کی۔

۱۵ر فروری :— حیدرآباد میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو، انجمنِ ترقی اُردو اور اُردو مجلس اور دیگر اداروں کے اشتراک و تعاون سے غالب صدی تقاریب کے پہلے مرحلہ کا آغاز ہوا اور اُردو کے مشہور شعرا حضرت داغ دہلوی، حضرت امیر مینائی، فصاحت جنگ جلیل، حضرت امجد، صفی اورنگ آبادی، صاحبزادہ میکش اور شاہد صدیقی کی مزاروں پر چادر گل چڑھائی گئی۔

۱۹ر فروری :— حکومت آندھرا پردیش نے یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس میں عوام کی شرکت میں سہولت کی خاطر ادارہ کی درخواست پر ۲۲ر فروری کو مدارس اور دفاتر کے ۴ بجے برخاست کئے جانے کا سرکلر جاری کیا۔

۲۰ر فروری :— "ماہنامہ القریش" حیدرآباد بابتہ فروری میں سب رس پر تبصرہ شائع ہوا۔

ہفتہ ۲۲ر فروری :—

افتتاحی اجلاس یوم محمد قلی قطب شاہ

۵ بجے شام گنبدانِ قطب شاہی واقع گولکنڈہ پر اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور اُردو بنیاد حیدرآباد شہر کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ کی آخری آرام گاہ کے وسیع و عریض چبوترہ پر ادارہ کی طرف سے سہ روزہ محمد قلی قطب شاہ کی بارہویں سالانہ تقاریب کا افتتاحی اجلاس ریاستی گورنر شری کھنڈو بھائی دیسائی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر شہریانِ حیدرآباد کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں مورخ، ادیب، نقاد، شاعر، یونیورسٹی کے اساتذہ، مختلف سیاسی اور سماجی قائدین اور اُردو دوست شامل ہیں۔ جلسہ کا آغاز میر عابد علی خاں صاحب (نغمۂ سوسائٹی)، کی پیش کش محمد قلی کی مقبولِ عام مناجات سے ہوا۔ پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ نے گورنر اور شرکائے جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ادارہ کی سالانہ علمی و ادبی مصروفیات کا ذکر کیا اور یوم محمد قلی کی افادیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی۔ گورنر آندھرا پردیش، شریمتی کمودنا ملک میئر حیدرآباد، شری کونڈا لکشمن باپوجی ریاستی وزیر اطلاعات اور جناب سید رحمت علی سابق ڈپٹی میئر نے اپنی تقریر دل کے ذریعہ محمد قلی کے فکر و فن، اُس کے شہر آرزو کی تہذیب اور ادارہ کی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے اس موقع پر آئے ہوئے قائدین کے پیامات سُنائے انگریزی کے معروف شاعرہ راج کماری اندرا دھن راج گیر اور جناب خیرات ندیم نے محمد قلی کو منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا دکنی مرثیہ سُنایا۔ کماری شاملا دیوی، سرگم سوسائٹی کے لائق طلبا اور عابد علی خاں (نغمۂ سوسائٹی) نے محمد قلی کا کلام سازوں پر پیش کیا۔ ملک کے ممتاز موسیقار عزیز احمد خاں

وارثی نے قوالی سنا کر داد حاصل کی۔ جناب رمن راج سکینہ معتمد تقاریب یوم محمد قلی کے شکریہ پر افتتاحی اجلاس ختم ہوا۔

ادبی اجلاس اور مشاعرہ

اتوار ۲۳ فروری :— ۱۰ بجے صبح

ایوانِ اردو کے آڈیٹوریم میں جناب محمد احمد انصاری صاحب پروچانسلر عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، ڈاکٹر رشید موسوی، پروفیسر سید محمد اور رائے محبوب نارائن گوڑ نے علی الترتیب دکن کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ، دکنی ذخیرۂ الفاظ کی بعض خصوصیات، دکن میں مرثیہ نگاری، عہدِ قطب شاہی کا دکنی ادب اور دکنی محاورے کے زیرِ عنوان مقالے سنائے۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی، نواب میر لئیق علی خاں اور وقار خلیل نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ جناب سید رحمت علی کنوینر ادبی اجلاس نے شکریہ ادا کیا

اسی رات ۹ بجے ایوانِ اردو میں غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جناب جے۔ وی۔ نرسنگ راؤ وزیر مواصلات و تعمیرات آندھرا پردیش نے صدارت کی۔ حیدرآباد کے قدیم و جدید مکاتیبِ خیال کے مشہور شعراء کی کثیر تعداد نے کلام سنایا۔ نواب میر لئیق علی خاں کنوینر مشاعرہ نے شکریہ ادا کیا۔

تلگو اجلاس یوم محمد قلی

دوشنبہ ۲۴ فروری :— ۶ بجے شام۔

سری کرشنا دیورایا آندھرا بھاشا نیلم سلطان بازار میں ادارہ کی طرف سے تلگو اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر ڈی، وینکٹ اوددھانی صدر شعبۂ تلگو جامعہ عثمانیہ نے صدارت کی۔ ڈاکٹر وینکٹ رمیا شرما، جی، وی سبرامنیم لکچرار نظام کالج اور شری آئی کرشنا مورتی لکچرار ایوننگ کالج نے محمد قلی کی تلگو خدمات، اس کے دور اور کلچر کے بارے میں تفصیلی تقریریں کیں شری ایم، ایل، نرسمہاراؤ کنوینر تلگو اجلاس نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ فروری :— معتمدین تقاریب یوم محمد قلی سرز رمن راج سکینہ، آقائی حسین ضابطہ، میر سراج الدین علی خاں، سید رحمت علی، میر لئیق علی خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ایم، ایل، نرسمہاراؤ کی طرف سے سہ روزہ تقاریب کے کامیاب اختتام پر شہریوں، تقاریب میں حصہ لینے والے ادیبوں، شاعروں اور قائدین اور جماعت کا شکریہ بغرضِ اشاعت جاری کیا گیا۔

ادارۂ کے اردو امتحانات منعقدہ ڈسمبر ۱۹۶۸ء کے نتائج بعد تصفیہ و منظوری مجلسِ مشاورت اردو امتحانات بغرضِ اشاعت جاری کئے گئے۔

مارچ ۱۹۶۹ء

یکم مارچ :— جشن غالب کے سلسلے میں اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں غالبیات کی نمائش ایک ہفتے کے لئے منعقد ہوئی۔ ادارہ کے کتب خانہ کی غالب سے متعلق نظم و نثر کی کئی کتابیں اس

نمائش میں رکھی گئی تھیں اور ادارہ کی طرف سے جناب
وقار خلیل نے نمائندگی کی۔

۹؍مارچ:— آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
سے ادارہ کی طرف سے منعقدہ یوم محمد قلی قطب شاہ
کے ادبی اجلاس کی ریڈیو رپورٹ مرتبہ جناب اظہر افسر
۹½ بجے نیرنگ پروگرام میں نشر ہوئی۔

جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کے ساتھ ایک شام

سہ شنبہ ۴؍مارچ:— (۶½ بجے شام)
ادارہ کی طرف سے ایوانِ اُردو میں ممتاز شاعر جناب
کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی آمد پر "شامِ شعر" کا اہتمام
کیا گیا۔ اِس محفل شعر کی صدارت حضرت حیرتؔ بدایونی نے
پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے مہمان شاعر کا
خیر مقدم کیا۔ جناب سحرؔ نے استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے
ادارہ کی گرانقدر خدمات کا اعتراف کیا اور حیدرآباد
کی علمی و ادبی ترقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُردو کے
تابناک مستقبل پر روشنی ڈالی۔ جناب محمد منظور احمد صاحب
ایم اے نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے محفل
شعر میں جناب سحرؔ، حضرت حیرتؔ، حضرت تاج قریشی
ڈاکٹر غیاث صدیقی، وقار خلیل، جہاندار افسر، پرنس
سیادت علی خاں صائبؔ، عشرت کرتپوری، محمد منظور احمد
علی سرور، سراج منیر، ثریا مہر، اسلم عمادی، اثر صدیقی
الادت جہاندار جاہی، قمر عباس، ارم ناتھ صبا، جناب
آفریدی اور صابر کمال نے کلام سنایا۔ میر سراج الدین علی خاں
صاحب آفس سکریٹری ادارہ نے شکریہ ادا کیا۔

۹؍مارچ:— آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے
اختتامی اجلاس یوم محمد قلی شاہ کی ریڈیو رپورٹ ۹½ بجے
شب نیرنگ پروگرام میں نشر ہوئی جسے جناب اظہر افسر نے
پیش کیا۔

۱۰؍مارچ:— ماہنامہ جمالستان دہلی کی اشاعت
مارچ سنہ ۶۹ء میں جناب ہاشمی صاحب کی سب رس میں
مطبوعہ غزل بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۴؍مارچ:— شاہ یوم محمد قلی کے اقتباسات
آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نیرنگ میں نشر ہوئے، جسے
اظہر افسر صاحب نے ترتیب دیا تھا۔

۱۸؍مارچ:— اقوام متحدہ میں ہندوستان کے
سابق مندوب جناب ظہیر احمد صاحب (آئی اے ایس)
سکریٹری و مشیر حضور نظام حیدرآباد نے ایوان اُردو کے تمام
شعبوں کا معائنہ کیا۔

۲۰؍مارچ:— دبستان سیمابؔ کے بزرگ
شاعر حضرت شفیق کوٹی (لاہور) مولوی یوسف الدین صاحب
سب ایڈیٹر روزنامہ رہنمائے دکن اور جناب نذیر علی
عدیلؔ نے ادارہ کے شعبوں کا معائنہ کیا۔

اپریل سنہ ۱۹۶۹ء

۲۷؍اپریل:— ادارہ کے اُردو امتحانات
کی مجلسِ مشاورت کا اجلاس بصدارت پروفیسر سید علی اکبر صاحب
صدر ادارہ منعقد ہوا اور جون میں انعقاد امتحانات سے
متعلق اُمور متفقہ طور پر طے پائے۔ پروفیسر سید محمد مولوی
عارف الدین حسن معتمد امتحانات اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے

شرکت کی۔

مئی سنہ ۱۹۶۹ء

ہفتہ ۳ مئی :— صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفاتِ حسرت آیات کی اطلاع ملتے ہی ایوانِ اُردو کے دفاتر تین یوم کے لیے سوگ میں بند کر دیے گئے

جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

ہفتہ ۱۰ مئی :— ۵ بجے شام ایوانِ اُردو میں جناب بدرالدین طیب جی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی صدارت میں جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین منعقد ہوا۔ مولوی خواجہ محمد احمد صاحب معتمد ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے قرات سے جلسہ کا آغاز کیا۔ پروفیسر سید محمد سابق ریڈر جامعہ عثمانیہ نے ذاکر صاحب اور حیدرآباد کے زیرِ عنوان تقریر فرمائی، صدرِ ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے سنہ ۱۹۲۶ء میں بمقام برلن ذاکر صاحب سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ مرحوم کی عظیم قومی و ملی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا اور ادارہ سے ذاکر صاحب کی وابستگی کا ذکر کیا۔ جناب ضیاء الدین احمد شکیب نے علی گڈھ اور ذاکر صاحب کے زیرِ عنوان تقریر کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسمؔ، وقار خلیلؔ صلاح الدین نیّرؔ، علی سرور اور فکری بدایونی نے ذاکر صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ کرسیٔ صدارت سے قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔ فاتحہ خوانی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد جلسہ اختتام کو پہنچا۔

۱۱ مئی :— پروفیسر راہی قریشی (گلبرگہ) اور جناب علی سرور معتمد بزمِ ادب بیدر نے ڈاکٹر غیاث صدیقی کے ہمراہ ایوانِ اُردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔

۱۵ مئی :— بانیٔ ادارہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی سالانہ فاتحہ کی تقریب خانقاہ عنایت اللّٰہی میں بعد نمازِ مغرب منعقد ہوئی۔

۲۲ مئی :— ہفتہ وار ہماری زبان علی گڈھ میں جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین کی تفصیلات شائع ہوئیں۔

جولائی سنہ ۱۹۶۹ء

۵ جولائی :— ادارہ کے ششماہی اُردو امتحانات ۹ تا ۱۱ جولائی۔ اضلاع حیدرآباد اور دیگر ریاستوں میں ایک ساتھ منعقد ہوئے اور ہر سنٹر پر ادارہ کی طرف سے صدر نگراں کارنے امتحانات کے اُمور کو بخیر و خوبی سرانجام دیا۔

۲۹ جولائی :— ادارہ کے امتحانات کے نتائج بعد تصفیہ و منظوری مجلس مشاورتِ اُردو امتحانات اشاعت کے لئے جاری کئے گئے۔

اگست سنہ ۱۹۶۹ء

۱۳ اگست :— ماہنامہ "جمالستان" دہلی بابتہ اگست میں سب رس سے جناب جناب ہاشمی کی مطبوعہ غزل ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۵ اگست :— جشنِ آزادیٔ ہند کے موقع پر جناب محمد جلال الدین منتظم ادارہ نے ۹ بجے

ایوان اُردو پر قومی پرچم لہرایا۔ بانیٔ ادارہ ڈاکٹر
زورؔ کی یاد میں "زور میموریل تعلیم بالغان اسکیم" کا
باقاعدہ آغاز ۱/۲ ۶ بجے شام جناب سید احمد ہاشمی پرنسپل
انوار العلوم ہائی اسکول کے درس سے ہوا۔ معتمد امتحانات
ادارہ جناب عارف الدین حسن صاحب کے علاوہ اُردو
اساتذہ اور طلبا کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

سہ شنبہ ۲۶ راگسٹ: — اُردو کے
ممتاز شاعر جناب مخدوم محی الدین کی وفات پر ادارہ کی
مجلس انتظامی میں قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ صدر
ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے جلسہ کی صدارت کی
پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد ادارہ، مولوی محامد علی عباسی
نواب عنایت جنگ، مولوی سید دلدار حسین، مولوی
عارف الدین حسن، جناب برمن راج سکسینہ اور
جناب میر سراج الدین علی خاں نے شرکت کی۔

ستمبر ۱۹۶۹ء

۶ ستمبر: — ماہنامہ "جمالستان" دہلی
بابتہ ستمبر میں امداد ہمدانی اور قمر صدیقی صاحبان کی
سب رس میں مطبوعہ غزلیں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ
ہوئیں۔

حضور نظام مرحوم کے پوتے پرنس فراست علیخاں
[illegible] نے جناب عثمان ابوطالب کے ہمراہ ایوان اُردو
کا تفصیلی معاینہ فرمایا۔

۷ ستمبر: — محترمہ سعیدہ سلطانہ ظہور علی
پرنسپل جی، وی، آئی، کالج اورنگ آباد اور جناب [illegible]

ریسرچ اسکالر ہندی مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد نے
ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا۔

۸ ستمبر: — روزنامہ سیاست حیدرآباد میں
بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ مرحوم کے تعلق سے جناب مولوی
سید دلدار حسین صاحب وظیفہ یاب چیف انجینئر کا مضمون
شائع ہوا۔

۱۵ ستمبر: — پندرہ روزہ "مصنف" حیدرآباد
میں یوم زورؔ کے موقع پر جناب بھارت چند کھنّہ کا مضمون
بعنوان "ڈاکٹر زورؔ" شائع ہوا۔

۱۷ ستمبر: — ادارہ کی مجلس انتظامی نے
۲۸ ستمبر کو یوم زورؔ کے سلسلے میں پروگرام کو قطعیت دی

۲۰ ستمبر: — یوم زورؔ کے ادبی اجلاس
اور مشاعرہ کا پروگرام بغرض اشاعت جاری کیا گیا۔

۲۴ ستمبر: — یوم زورؔ کے سلسلے میں ادارہ
کی طرف سے مسجد افضل گنج میں بعد عصر فاتحہ و قرآن خوانی
کا اہتمام کیا گیا۔

ادبی اجلاس و مشاعرہ یوم زورؔ

اتوار ۲۸ ستمبر: — (۱۱ بجے صبح)
ایوان اُردو میں بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ کی ساتویں
برسی منائی گئی۔ نواب میر احمد علی خاں صاحب صدر ریاستی
انجمن ترقی اُردو نے ادبی اجلاس کی صدارت کی۔ محمد عبداللہ
صاحب منتظم ادارہ کی قرأت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا۔
پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد اعزازی ادارہ نے خیر مقدمی
تقریر کی اور جناب برمن راج سکسینہ شریک معتمد نے یوم زورؔ کے

موقع پر لکھے ہوئے پیامات سنائے

راے محبوب نارائن گوڑ ڈاکٹر غلام عمر خاں
صاحب، جناب میر عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر سیاست،
ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ اور صدر مجلس
ڈاکٹر زورؔ کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں
اور ان کی عظیم اردو خدمات اور پہلو دار شخصیت پر
تقریریں کیں۔ جناب سرفراز علی مرزا مہتمم تعلیمات حیدرآباد
ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب وقار خلیل، جناب صلاح الدین
نیّر اور جناب علی سرور نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا
نواب میر یٰسین علی خاں صاحب معتمد یوم زورؔ نے شکریہ ادا کیا۔

اسی رات ۱/۲ ۹ بجے اردو کے بزرگ شاعر
الحاج مرزا شکور بیگ صاحب کی صدارت میں مشاعرہ
منعقد ہوا۔ وقار خلیل صاحب نے معتمد مشاعرہ کے فرائض
انجام دیئے۔ مشاعرہ میں قدیم و جدید مکتب خیال کے شعراء نے
کلام سنایا جن میں مرزا شکور بیگ، میر یٰسین علی خاں،
حکیم یوسف حسین خاں، اسد انصاری، حسن فرخ، غیاث
متین، عشرت کرتپوری، راشد آذر، روحی قادری،
عظمت عبدالقیوم، رحمن جامی، علی سرور، سراج منیر
ناز حیدر، ثریا مہر، قمر عباس، یوسف نظر، رؤف خیر، شمیم
نصرتی، اثر غوری، شاملی ادیب، احمد اللہ حسینی، احمد اسحٰق
ملک اور اتر پردیش کے ہندی اردو شاعر جناب دھنوا
سرن نے کلام سنایا۔

اکتوبر ۱۹۶۹ء

۴ر اکتوبر: —— مہاراشٹرا کے مشہور شاعر
جناب محمود عشقی (ناندیڑ) نے ایوانِ اردو کا تفصیلی
معائنہ کیا۔

۶ر اکتوبر: —— حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر
جناب منوہر لال بہارؔ نے ادارہ کا معائنہ کیا۔

۸ر اکتوبر: —— روزنامہ "ترجمان" لدھیانہ
میں سب رس کے غالب نمبر حصہ اوّل پر تبصرہ شائع ہوا۔

۱۱ر اکتوبر: —— ماہنامہ جمالستان دہلی۔
بابتہ اکتوبر میں جناب نیاز احمد شمیم فتح پوری کی سب رس
میں مطبوعہ غزل ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۳ر اکتوبر: —— روزنامہ سیاست حیدرآباد
میں سب رس کے غالب نمبر پر جناب میر حسن ایم، اے
(عثمانیہ) کا تبصرہ شائع ہوا۔

ماہنامہ "چلّا شار" امرتسر (بابتہ اکتوبر) نے
سب رس کے غالب نمبر پر تبصرہ شائع کیا۔

۱۵ر اکتوبر: —— پندرہ روزہ "منصف"
حیدرآباد میں سب رس کے غالب نمبر سے ڈاکٹر خلیق
احمد شیرا اور جناب یوسف ناظم کے مضامین بحوالہ ڈائجسٹ
ہوئے۔

نومبر ۱۹۶۹ء

یکم نومبر: —— ماہنامہ "تحریک" دہلی (نومبر)
میں سب رس کے غالب نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۷ر نومبر: —— روزنامہ رہنمائے دکن حیدرآباد
کے ادبی ایڈیشن میں سب رس کے غالب نمبر سے [illegible]
کا مضمون ڈائجسٹ ہوا۔

۲۷ر نومبر: ــــــ (۴½ بجے) پروفیسر اختر اورینوی صاحب صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی نے ایوانِ اُردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ اِس موقع پر نواب میر لئیق علی خان صاحب معتمد اُردو مجلس اور محترمہ زبیدہ یزدانی شعبۂ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی ادارہ میں موجود تھے۔ وقار خلیل اور ترصیص الدین انصاری نے ادارہ کے بارے میں تفصیلات سے واقف کرایا۔

ڈسمبر ۱۹۶۹ء

۸ار ڈسمبر: ــــــ ماہنامہ صبح اُمید بمبئی (نومبر، ڈسمبر) میں ادارہ کی مطبوعہ کتاب "برف میں آگ" (افسانے) نوشتہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری پر جناب یونس اگاسکر کا تبصرہ شائع ہوا۔

۲۵ر ڈسمبر: ــــــ ادارہ کے امتحانات اُردو فاضل، اردو عالم، اُردو دانی اور اُردو زباندانی حیدرآباد اور دیگر اضلاع کے مرکزوں پر ۲۵ تا ۲۷ ڈسمبر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔ ذیل میں مقامات اور وہاں جانے والے صدر نگران کاروں کے نام تحریر ہیں۔

مرکز آرمور: ــــ سید تمیم صاحب۔

مرکز اورنگ آباد: ــــ پروفیسر سید محمود صاحب۔

مرکز بانسواڑہ: ــــ سید علی نقی صاحب۔

مرکز کریم نگر: ــــ عارف احمد صاحب۔

مرکز محبوب نگر: ــــ عبدالقدوس صاحب۔

مرکز نظام آباد: ــــ محمود احمد صاحب۔

مرکز بنگلور: ــــ پروفیسر [illegible] صدیقی صاحب۔

مرکز نرمل: ــــ انور کمال خوندمیری صاحب

مرکز انوار العلوم ہائی اسکول حیدرآباد: ــــ ذوالفقار حسین صاحب، سعیدہ جہاں صاحبہ، صدیق حسین صاحب اور عزیزہ سلطانہ صاحبہ)

مرکز بے سی اسکول چپا بیٹھ: ــــ ظہیرالدین صاحب

۲۷ر ڈسمبر: ــــ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے ریسرچ اسکالر اور جواں سال شاعر قاضی محمد ذکریا امیر عازفی (ایم اے) نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ایوانِ اُردو کا معائنہ کیا

علمی، ادبی اور کلچرل تعاون

(سنہ ۱۹۶۸ء ادارے کی ڈائری سے)

جناب دلکش ساگری صاحب (بھوپال) کو انکی زیر ترتیب کتاب "نئی غزل، نیا لہجہ" کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے حیدرآباد اور جنوبی ہند کے غزل گو شعراء کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچائے گئے۔

جناب شمشاد ادیب صاحب سہارنپوری کو زیر تصنیف کتاب "اردو کی خواتین شعراء" کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے حیدرآبادی شعراء کے بارے میں رہنمائی کی گئی

جناب جبار جمیل صاحب (کرنول) کو "جنوب اور جدید شاعری" نامی کتاب کے سلسلے میں حیدرآباد دکن کے شاعروں اور کتابوں کے بارے میں ادارہ کی طرف سے معاونت کی گئی۔

جناب جعفر حسین جعفری صاحب ایڈیٹر پندرہ روزہ "منصف" حیدرآباد کو علمی، ادبی اور تہذیبی موضوعات اور اردو مصنفین کے بارے میں ادارہ کی طرف سے معاونت کی گئی۔

سنہ ۱۹۶۹ء

جناب ضمیر نیازی صاحب (کراچی) کو ولی اورنگ آبادی کے بارے میں ادارہ کے شعبۂ مخطوطات سے ضروری تفصیلات روانہ کی گئیں۔

حیدرآباد کے کہنہ مشق شاعر جناب منوہر لال بہار کے علمی وظیفہ کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے رہبری کی گئی

جناب شمس الغنی فاروقی کلمنوری (بمبئی) کو جامعۂ سندھ پاکستان سے ڈاکٹرز ڈگری 'پی ایچ ڈی' کے سلسلے میں علمی استفسارات بہم پہنچائے گئے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری (شعبۂ اردو جامعہ کشمیر سری نگر) کو مخطوطہ دیوان میر کے بارے میں ادارہ کے کتب خانے سے معاونت کی گئی



رپورٹ شعبۂ امتحانات

ادارہ ادبیات اُردو چار اُردو امتحانات سال میں دو دفعہ منعقد کرتا ہے جس کے مراکز نہ صرف آندھرا پردیش میں بلکہ آندھرا پردیش سے باہر بھی ہوتے ہیں اور مرکزوں کے معتمدین امیدواروں میں ترغیب و تحریص پیدا کرکے انھیں تحصیل علم اور افزونی معیار پر آمادہ کرتے اور انھیں تعلیم دیتے اور امتحانوں میں شریک کراتے ہیں۔ ابتدائی امتحان اُردو دانی کا ہوتا ہے دوسرا اُردو زبان دانی کا تیسرا اُردو عالم کا اور چوتھا اردو فاضل کا ان کا معیار صرف اُردو کی حد تک ترتیب وار دوسری، چھٹی، میٹرک اور بی اے کی جماعتوں کے مماثل ہوتا ہے۔ یہ امتحانات عموماً جون اور ڈسمبر میں منعقد ہوتے ہیں۔ جون ۱۹۶۸ء میں جو امتحانات منعقد ہوئے ان کی تفصیلات ذیل میں دی جاتی ہیں۔ تمام مراکز پر ادارہ کی جانب سے نگران کار بھیجے جاتے ہیں جنھیں سفر خرچ اور بھتہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ جونیر سرٹیفائیڈ اسکول۔ قیدی بچوں کی تعلیم کا مرکز ہے اور مہتمم صاحب کے زیر نگرانی کام کرتا ہے۔ یہاں اردو دانی اور اُردو زبان دانی میں امیدوار شریک ہوتے ہیں۔ مصباح الدین صاحب نے ادارہ کی جانب سے صدر نگران کار کے فرائض انجام دیئے۔

۲۔ مرکز حیدرآباد سے ذکور واناث اردو دانی اور زبان دانی میں کم اور اردو عالم میں زیادہ شرکت کرتے ہیں۔

۳۔ سنٹرل جیل بھی امتحان کا ایک مرکز ہے جو مسٹر گنیش پرشاد کے زیر نگرانی کام کرتا ہے اسمیں اکثریت اردو دانی اور اردو زبان دانی کے قیدی امیدواروں کی ہوتی ہے۔ صلاح الدین صاحب نیر نے نگرانی کی۔

۴۔ سنگاریڈی کا مرکز سید ابراہیم علی صاحب معتمد مرکز کی نگرانی میں چلتا ہے۔ اس امتحان میں اردو دانی اور اردو عالم میں شریک رہے۔ ہاشم مہاجر صاحب امتحانات کی نگرانی کے لئے ادارہ سے بھیجے گئے تھے۔

۵۔ کاغذ نگر ڈسرپور کے مرکز کے معتمد جناب لیسین غوری صاحب ہیں اور یہاں اردو دانی اردو زبان دانی اور اردو عالم تینوں امتحانوں میں امیدوار شریک رہے۔ عارف احمد صاحب نے نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔

۶۔ محبوب نگر کے مرکز کے معتمد محمد غلام حیدر صاحب ہیں۔ یہاں اردو دانی اور زبان دانی میں کوئی شریک نہیں ہوا صرف اردو عالم کا امتحان ہوا حسن علی خاں صاحب ایم اے بی ایڈ بحیثیت صدر نگران کار ادارہ کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔

۷۔ مدراس کا مرکز ریاض نظوری صاحب بی اے (علیگ) ایم او ایل (عثمانیہ) کے زیر نگرانی کام کرتا ہے یہاں

اردو عالم میں امیدواروں نے شرکت کی اور پروفیسر سید محمد صاحب نائب صدر مجلس شعبۂ امتحانات نگرانی کیلئے تشریف لے گئے تھے۔

۸۔ مدور۔ تعلقہ جنگاؤں ضلع ورنگل کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں علمی تشویق و ترغیب دلانے کا سہرا مرکز کے معتمد صاحب ______ کے سر ہے۔ صرف اُردو عالم کے امتحان میں امیدواروں نے شرکت کی اور انور کمال خوندمیری صاحب بی اے ایڈیٹر "نفسیات" نے نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔

۹۔ نارائن کھیڑ ضلع محبوب نگر۔ مرکز کے معتمد سید احمد علی صاحب ہیں۔ جہاں اردو دانی' زبان دانی اور عالم کے امتحانوں میں امیدواروں نے شرکت کی۔ حیدر علی خاں صاحب نے ادارہ کی جانب سے نگرانی کی۔

۱۰۔ نظام آباد کا مرکز حافظ سید معظم علی صاحب کی نگرانی میں چلتا ہے اور اردو دانی' زبان دانی اور عالم تینوں امتحانوں میں امیدوار شریک رہے۔ حیدرآباد سے ادارہ کی طرف سے ظہیرالدین صاحب نے نگرانی کے فرائض انجام دیئے۔

اِن امتحانوں میں اردو دانی اور زبان دانی میں امیدواروں کی تعداد و شرکاء و کامیاب حسب صراحت مندرجہ رہی۔

اُردو دانی		اُردو زبان دانی		اُردو عالم	
شریک	کامیاب	شریک	کامیاب	شریک	کامیاب
۵۰	۳۴	۴۶	۲۳	۲۴۶	۱۵۰

ڈسمبر ۱۹۶۸ء

ڈسمبر ۱۹۶۸ء میں دس مراکز رہے۔[1] آرمور مرکز کی نگرانی عبدالوارث صاحب نے کی (۲) مرکز اورنگ آباد غلام جیلانی صاحب ہاشمی کی کوششوں سے قایم ہوا اور پروفیسر سید محمد صاحب نے ادارہ کی جانب سے نگرانی کے فرائض انجام دیئے (۳) مرکز بنگلور کی نگرانی کے لیے ادارہ نے حسن علی خاں صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ (۴) بھینسہ عادل آباد پر بھی مرکز قائم ہوا ~~... صاحب تھے~~ اور نگرانی کیلئے خلیل احمد صاحب ادارہ سے تشریف لے گئے ~~تھے~~ (۵) حیدرآباد کے مرکز پر اردو زبان دانی اور اردو عالم کے امتحانوں میں اُمیدواروں نے شرکت کی (۶) کاماریڈی نگر بیدر کے مرکز کے لیے محمد نذیرالدین صاحب نگرانی کیلئے ادارہ کی جانب سے گئے (۷) کرنول کا مرکز محمد عبدالشکور صاحب پکچرار کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔ یہاں محمد جہانگیر صاحب مولوی کامل (نظامیہ) نے نگرانی کی (۸) کوہیر ضلع بیدر کے مرکز کے معتمد ______ ہیں اور نگرانی کیلئے ہاشم مہاجر بی اے ایل بھیجے گئے (۹) محبوب نگر کے مرکز کی نگرانی کیلئے شاہ احمد صاحب ادارہ کی جانب سے گئے (۱۰) ورنگل کا مرکز یکی صاحب معتمد کی نگرانی میں چلتا ہے۔ امتحانات کی نگرانی کیلئے سید شریف الدین صاحب نے زحمت فرمائی۔

اردو دانی اور زبان دانی میں امیدواروں کی تعداد کم رہی اردو عالم میں ۲۲۰ شریک اور ۱۱۶ کامیاب ہوئے۔

جولائی ۱۹۶۹ء

جون کے مہینے میں موزوں تاریخ نہ ہونے سے جولائی کی ۱۹، ۲۰، ۲۱ کو امتحان منعقد ہوئے۔
اورنگ آباد کے مرکز کی نگرانی کیلئے خلیل احمد صاحب ادارہ کے نمائندے کی حیثیت سے گئے اور (۲) بنگلور پر حسب سابق حسن علی خاں صاحب نے نگرانی کی (۳) حیدرآباد کے مرکز پر اردو عالم کے اُمیدواروں کی اکثریت رہی (۴) کاغذ نگر سرپور پر شرف الدین صاحب نے نگرانی قبول کی (۵) کریم نگر کے مرکز پر عارف احمد صاحب بھیجے گئے اور (۶) محبوب نگر پر محمد عبدالقدوس صاحب نے نگرانی کی (۷) مرکز مدراس کی نگرانی کیلئے پروفیسر سید محمد صاحب تشریف لے گئے (۸) میسور کا مرکز سلیم تمنائی صاحب نے قائم کیا اور یہاں ادارہ کے منتظم محمد جمال الدین صاحب کو بھیجا گیا۔ (۹) نارائن کھیڑ کے مرکز پر سید احمد پادشاہ صاحب قادری نے نگرانی کی۔ (۱۰) نظام آباد پر محمد جہانگیر صاحب نے نگرانی کا کام انجام دیا۔ اردو عالم کے امتحان میں (۲۸۳) اُمیدواروں نے شرکت کی اور ۲۳۵ نے کامیابی حاصل کی۔

دسمبر ۱۹۶۹ء

دسمبر ۱۹۶۹ء کے امتحانات (۱۳) مراکز پر ہوئے۔ (۱) آرمور پر سید تمیم صاحب نے نگرانی کی۔ (۲) اورنگ آباد پر پروفیسر سید محمد صاحب نگرانی کیلئے تشریف لے گئے۔ (۳) بانسواڑہ ضلع نظام آباد کا مرکز شیخ حسین صاحب احسان کی دلچسپی سے قائم ہوا اور یہاں سید علی نقی صاحب نگرانی کے لئے گئے (۴) بنگلور پر حسین علی مرزا صاحب معتمد نے اُمیدواروں کو شریک کرایا اور محمد اکبرالدین صدیقی صاحب رکن مجلس امتحانات نے نگرانی کے فرائض انجام دیئے (۵) مرکز جالنہ محمد بشیرالدین صاحب شاکر کی دلچسپی کا نتیجہ ہے جہاں بشیر احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی لکچرار ازار العلوم کالج نے نگرانی کی (۶) جونیر ٹیفا یٹیڈ اسکول پر ظہیرالدین صاحب تشریف لے گئے اور (۷) مرکز کرنول کی نگرانی کیلئے محمد جہانگیر صاحب مولوی کامل نظامیہ کو منتخب کیا گیا۔ (۸) کریم نگر کے لیے عارف احمد صاحب کا انتخاب ہوا اور (۹) محبوب نگر پر مولوی محمد عبدالقدوس صاحب تشریف لے گئے (۱۰) نرمل کا مرکز یحییٰ بن علی صاحب کی نگرانی میں قائم ہے۔ یہاں انور کمال صاحب خوندمیری اڈیٹر نغمۂ حیات نے نگرانی کی (۱۱) نظام آباد مرکز کے معتمد حافظ سید معظم علی صاحب ہیں اور یہاں نگرانی کا کام کے سپرد تھا۔ (۱۲) ندیال کا مرکز سید احمد میاں صاحب کی معتمدی میں قائم ہے اور یہاں سید احمد صاحب قادری نے نگرانی کا کام انجام دیا۔ حیدرآباد میں سبھی امتحانوں میں اُمیدواروں نے شرکت کی۔ اردو دانی کے امتحان میں ۵۴ امیدوار شریک رہے اور ۳۵ کامیاب ہوئے۔ اُردو زبان دانی میں صرف ۱۰ شریک ا ور ۱۰ کامیاب ہوئے۔ اردو عالم میں (۲۰۲) نے شرکت کی اور (۱۴۹) نے کامیابی حاصل کی۔

ادارہ کی جانب سے تمام مراکز کے معتمد صاحبان اور وہاں تعاون کرنے والے حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان تمام نگراں کار صاحبان کا بھی ممنون ہے جنہوں نے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں اور امتحان کی نگرانی کی خاطر مختلف مقامات پر تشریف لے گئے۔ ہمیں توقع ہے آئندہ بھی تمام اصحاب ادارہ سے تعاون کرتے اور اردو کے تحفظ و بقا کیلئے خدمت کرتے رہیں گے۔ عارف الدین حسن کلکر مؤلف معتمد شعبہ امتحانات

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۶ سے آگے)

(۲۷) سلیمان خطیب اور ان کا کلام مرتبہ سید معیار الدین رفعت (۲۸) اسلام اور اشتراکیت از غلام محمد۔ (۲۹) گنجینۂ غالب۔ پبلی کیشنز ڈیویژن دہلی (۳۰) غالبیات از عبدالقوی دسنوی (۳۱) بھوپال اور غالب از عبدالقوی دسنوی (۳۲) درد چراغ محفل (ڈرامہ) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (۳۳) پیکر غالب (ڈرامہ) عبداللطیف خاں۔ (۳۴) نذر غالب (ساوینر) غالب صدی تقاریب کمیٹی گلبرگہ (۳۵) غالب اور حیدرآباد از ضیاء الدین احمد شکیب (۳۶) عیار غالب مرتبہ مالک رام۔

رسائل اور ان کے خاص نمبر:

(۱) سہ ماہی سیپ کراچی (نمبر۳) مدیر نسیم درانی (۲) مہر نیم روز (سندھ یونیورسٹی پاکستان کا ترجمان) (۳) سالنامہ پیام تعلیم دہلی مدیر محمد حسین حسان (۴) سہیل (گیا) بھاگلپور کا موجودہ ادبی ماحول نمبر (۵) سالنامہ نیرنگ خیال لاہور مدیر حکیم محمد یوسف حسن (۶) شاعر بمبئی (غالب نمبر) مدیر اعجاز صدیقی (۷) علی گڈھ میگزین کا غالب نمبر مدیر بشیر بدر (۸) جامعہ دہلی کا غالب نمبر مدیر عبداللطیف اعظمی (۹) نیا دور لکھنؤ کا غالب نمبر مدیر خورشید احمد (۱۰) علم و فن ڈائجسٹ دہلی کا غالب نمبر مدیر ناز انصاری (۱۱) سریت جائزہ دہلی کا غالب نمبر (۱۲) دیڑھ ماہی شگوفہ حیدرآباد کا غالب نمبر مدیر مصطفےٰ کمال (۱۳) ماہنامہ پونم حیدرآباد کا غالب نمبر مدیر ناصر کرنولی (۱۴) ماہنامہ تحریک دہلی کا غالب نمبر مدیر گوپال متل (۱۵) ماہنامہ جہاں نشار امرتسر کا غالب نمبر مدیر میلا رام وفا (۱۶) سالنامہ الماس میسور کا غالب نمبر مدیر قیوم صادق۔

تمت بالخیر

استفادۂ کتب خانہ

سنہ ۱۹۶۸ء اور سنہ ۱۹۶۹ء

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے گرانقدر اور وقیع کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات، مخطوطات اور دارالمطالعہ) ایوانِ اُردو سے اُردو زبان و ادب کے شیدائی، دیگر زبانوں کے محققین، طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور مطالعہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں، ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے مختلف اوقات میں یا متواتر کئی روز ادارہ کے کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور حوالوں کے سلسلے میں اُن کی نقلیں لیں یا ایم۔ اے کے نصاب سے متعلق یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے حصول کے ضمن میں یا پھر اخبارات و رسائل کے لئے فیچروں کی تیاری کے سلسلے میں اُردو کی علمی، ادبی اور تاریخی مطبوعات کے ذخیرۂ کتب خانہ سے مورد حاصل کیا —— (ادارہ)

۱۔ فریدہ فاطمہ صاحبہ ایم اے ناگپور یونیورسٹی۔
۲۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب لکچرار تروپتی۔
۳۔ ڈاکٹر مغنی تبسم صاحب لکچرار جامعہ عثمانیہ۔
۴۔ ڈاکٹر جعفر حسن صاحب سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔
۵۔ ڈاکٹر رشید موسوی لکچرار وینکٹ راما ریڈی کالج حیدرآباد
۶۔ محمد منظور احمد صاحب لکچرار ایوننگ کالج کریم نگر۔
۷۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر صاحبہ ریڈر جامعہ عثمانیہ
۸۔ طیب انصاری صاحب لکچرار آرٹس کالج گلبرگہ۔
۹۔ زاہدہ ابوالحسن صاحب لکچرار
۱۰۔ وینکٹ رام راؤ صاحب گاندھی میموریل کمیٹی حیدرآباد۔
۱۱۔ پروفیسر امین چند شرما ودربھا مہاودیالیہ جبلپور
۱۲۔ ہادی بلگرامی صاحب سابق ناظم سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد۔
۱۳۔ محمد عبدالرزاق صاحب فاروقی لکچرار عثمانیہ کالج کرنول
۱۴۔ میر حسن صاحب ایم۔ اے سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر اے۔ آئی۔ آر
۱۵۔ عبدالواحد صاحب تسنیم لکچرار وی۔ آر کالج نیلور (اے پی)
۱۶۔ سید محی الدین صاحب مددگار سنٹرل ریکارڈ آفس حیدرآباد۔
۱۷۔ رشید حسن خاں صاحب لکچرار دہلی یونیورسٹی
۱۸۔ سید حمید صاحب غفاری ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ۔
۱۹۔ عبدالاحد صاحب لکچرار شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج نلگنڈہ
۲۰۔ ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب مددگار اے جی آفس حیدرآباد
۲۱۔ محمد یونس صاحب پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ
۲۲۔ ڈاکٹر سری رام شرما ریڈر شعبۂ ہندی [illegible] کالج [illegible]
۲۳۔ ڈاکٹر سید سلیمان حسین صاحب ایم اے لکھنؤ یونیورسٹی
۲۴۔ [illegible]

۲۵- قیوم صادق ایم اے لکچرار مہارانی کالج میسور
۲۶- ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب پرنسپل اردو کالج حیدر آباد
۲۷- ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
۲۸- نذیر الدین احمد صاحب رکن بلدیہ حیدر آباد
۲۹- محمود احمد صاحب ہنر ایڈیٹر شاہکار الٰہ آباد
۳۰ ڈاکٹر حبیب النساء صاحبہ پروفیسر شعبۂ اردو میسور یونیورسٹی

۱۹۶۹ء

۱- جناب ظہیر احمد صاحب (آئی۔ اے۔ ایس) سکریٹری صوبۂ نظام حیدر آباد
۲- جناب مصطفٰے کمال احمد صاحب لکچرار ممتاز کالج حیدر آباد۔
۳- شاہد علیم صاحب سب ایڈیٹر روزنامہ ملاپ حیدر آباد
۴- عشرت کرتپوری صاحب ہمدرد دواخانہ۔ حیدر آباد۔
۵- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب لکچرار ایس۔ وی یونیورسٹی ترو پتی
۶- جناب ڈیوڈ ڈی، وی صاحب ریسرچ اسکالر شکاگو یونیورسٹی
۷- جناب احمد علی ادیب صاحب استاد اردو حیدر آباد
۸- مسز سجاج ریسرچ اسکالر ہندی ناگپور یونیورسٹی
۹- محترمہ فرزانہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۱۰- محترمہ سیدہ ظہور علی پرنسپل جی، وی اے کالج اورنگ آباد۔
۱۱- ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
۱۲- جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج کریم نگر
۱۳- ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی صاحب ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی)
۱۴- جناب ضیاء الدین احمد شکیب صاحب مددگار اسٹیٹ آرکیوز حیدر آباد۔
۱۵- جناب نظام الدین مغربی لکچرار اردو کالج حیدر آباد
۱۶- جناب قاضی ذکریا آمیر عارفی ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔



اعداد و شمار

استفادہ دارالمطالعہ عام و کتب خانہ "ایوانِ اُردو"

جنوری تا ڈسمبر سنہ ۱۹۶۸ء

جنوری	(۳۷۵)	افراد	جولائی	(۴۹۵)	افراد
فروری	(۳۸۰)	"	اگست	(۳۹۸)	"
مارچ	(۳۵۰)	"	ستمبر	(۳۸۸)	"
اپریل	(۳۹۰)	"	اکتوبر	(۳۶۰)	"
مئی	(۴۵۲)	"	نومبر	(۳۳۶)	"
جون	(۴۶۳)	"	ڈسمبر	(۳۹۰)	"

جنوری تا ڈسمبر سنہ ۱۹۶۹ء

جنوری	(۴۸۲)	افراد	جولائی	(۴۳۰)	افراد
فبروری	(۴۶۵)	"	اگست	(۳۹۰)	"
مارچ	(۴۷۵)	"	ستمبر	(۳۴۸)	"
اپریل	(۴۹۵)	"	اکتوبر	(۳۲۰)	"
مئی	(۴۰۳)	"	نومبر	(۳۴۸)	"
جون	(۴۱۹)	"	ڈسمبر	(۳۹۶)	"

اِمداد و اعانت

سنہ ۱۹۶۹ء میں حسب ذیل اصحاب اور اداروں نے کتب خانہ، میوزیم اور دارالمطالعہ کو اپنے گرانقدر عطایا سے نوازا جس کے لئے ادارہ اِن اصحاب اور اداروں کا دلی شکرگزار ہے۔ خصوصًا ادارہ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات اور مطبوعات کو اقطاعِ ہند کے قدیم و جدید مختلف فنون کی کتابیں، رسالوں کی فائلیں کتب خانے کے لیے اور سب رس میں تبصرہ کی غرض سے وصول ہوتی رہی ہیں۔ ہم اپنے علم دوست قارئین سے خواہش کریں گے کہ وہ اپنے علمی و ادبی ذخیرے کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسی کتابیں، علمی و ادبی اور تہذیبی نادر اشیا "ادارہ ادبیات اردو" کو تحفتہً مرحمت فرما کر محفوظ فرمائیں۔ ادارے کو ملنے والے ایسے ذخیرہ کی سالانہ فہرستیں معطی کے نام کی صراحت اور تشکر کے ساتھ ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس کی خاص اشاعت "ادارہ نمبر" میں شائع کی جاتی ہیں، تاکہ ان عطایا سے دیگر اصحاب نظر، ریسرچ اسکالر اور اردو دوست حضرات واقف ہو سکیں۔ (ادارہ)

جناب ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب نے اپنی تازہ تالیفات منیا دستونتی اور لیلیٰ و مجنوں کا ایک ایک نسخہ کتب خانہ ادارہ کو تحفتہً مرحمت فرمایا۔

جناب مرزا محمد فاروق صاحب کے فرزندوں نے کلیاتِ رسا (مرزا غلام مصطفےٰ رسا) موسوم بہ "خیالاتِ رنگین" ادارہ کے کتب خانہ کو عنایت کیا۔

مولوی حبیب احمد خاں صاحب مرحوم گتہ دار کی طرف سے جناب اسرائیل خاں صاحب نے (۱۸۳) انگریزی مطبوعات کتب خانہ ادارہ کو روانہ کیں۔

انجمن ہلال اسلام لاہور کی طرف سے اس سال متعدد کیٹلاگ کی صورت میں جملہ (۶۰) اردو کتابیں، کتابچے اور رسائل کتب خانہ میں محفوظ کئے جانے کیلئے ذریعہ پوسٹ وصول ہوئے۔

کے موضوع پر مطبوعہ کتابوں کے تین حصے اور مجلہ قدیم اُردو مرتبہ پروفیسر مسعود حسین خاں کا پہلا حصہ تحفتہً وصول ہوا۔

پروفیسر سید علی اکبر صاحب، ڈاکٹر ہاشم علی خاں صاحب مولوی محمد اکبر الدین صدیقی صاحب اور وقار خلیل صاحب کی طرف سے کتابیں کتب خانہ ادارہ کو تحفتہً ملیں۔

زندہ دِلانِ حیدرآباد کی مطبوعات "گھر کو کے کائنات" اور "نشتر و مرہم" جناب سید مصطفےٰ کمال صاحب کے ذریعہ کتب خانہ کو تحفتہً ملیں۔

جناب اسماعیل شریف نے ہندی رسم الخط میں قرآن کا ایک مکمل نسخہ کتب خانہ کو تحفتہً عنایت کیا۔

نواب سعید جنگ، جناب عشرت کرتپوری صاحب اور شریف صاحب نے کتب خانہ کو کتابیں تحفتہً روانہ فرمائیں۔

جناب حاجی بشیر احمد صاحب طاہر بنجارہ ہل نے ۷۰ء

نظام ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے "ہند میں زراعت" مطبوعات کتب خانہ ادارہ کو بطورِ عطیہ مرحمت فرمائیں۔

نواب معین الدین صاحب نے دو کتابیں کتب خانہ کو تحفتہً عطا کیں۔ جناب پروفیسر سید محمد صاحب نے دو کتابیں اور جناب غلام [illegible] صاحب نے کلام [illegible] ادارہ کو تحفتہً مرحمت فرمائیں۔

میوزیم ایوانِ اُردو

ایوانِ اُردو کا میوزیم دکن کے تاریخی و ثقافتی آثار کا آئینہ دار ہے۔ میوزیم کی نادر اشیا میں قطب شاہی، عادل شاہی اور آصفی فرامین و اسنادی کاغذات، دکنی خطاطی و مصوری کے نمونے، بادشاہوں اور عمائدین کی تصویریں، دکنی خطاطی و مصوری کے نمونے، مشاہیر کے مکتوبات، قلمی تصاویر، قدیم اسلحہ، بیدری ظروف، قدیم شجرے اور نقشے وغیرہ داخل ہیں۔

میوزیم کے نوادرات میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ چنانچہ اس سال نواب محمد عبدالحکیم خاں نبیرۂ نواب تدبیر جنگ مرحوم نے مشاہیر کے (۳۹) خطوط، محمد اشرف صاحب انجینیر نے مشاہیر کے کئی مکتوبات اور عہد آصفی سے متعلق تصاویر کا نادر ذخیرہ اور میوزیم کے سرپرست نواب عنایت جنگ بہادر نے خطاطی کے چند نمونے حیثیت کی ایک قدیم مرادی ۵ عدد چاول (جن پر تحریر ہے) اور دیگر چند نادر اشیا عنایت فرمائی ہیں جس کے لئے ادارہ ان علم دوست احباب کا شکر گزار ہے۔

میر سراج الدین علی خاں (معتمد میوزیم)

بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۸ سے آگے۔

	عنوان	مضمون نگار	
۸۶	مرزا غالب کی چکنی ڈلی	محمد حنیف شاہد	ستمبر اکتوبر
۸۷	غالب اور ابوالکلام (غالب نمبر دوم)	ڈاکٹر رضی الدین احمد	نومبر دسمبر
۸۸	خطوطِ غالب کی سوانحی، تاریخی اور ادبی حیثیت	بشیر بدر	″
۸۹	غالب کے کلام میں شوخی و اور طنز و ظرافت	افتخار احمد فخر	″
۹۰	غالب بحیثیت محقق لغت	عبدالقادر احقر عزیزی	نومبر دسمبر
۹۱	غالب ایک عظیم شاعر	تلک پیامی	″
۹۲	غالب میری نظر میں	محمد ایوب واقف	″
۹۳	غالب اور نئی نسل	خواجہ شمیم الدین	″
۹۴	اُردو املا میں غالب کا اجتہاد	غلام رسول	″
۹۵	مرزا غالب کی موجِ زیست	قیوم صادق	″

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس"

۱۹۶۹ء

"ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جنوری ۱۹۶۹ء سے یہ اپنی عمر کے بتیسویں (۳۲) سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح "سب رس" نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر و زبان کی تین دہائیوں کی سفر عبور کرلی ہے۔ ادارہ کے بانی اور معتمد اول "سب رس" کے موسس اور نگران ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی ادبی یادگار ہونے کا اعزاز بھی سب رس کو حاصل ہے، ڈاکٹر زور کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مجلس مشاورت کے معتمد جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ہیں جو ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں اور کتب خانہ اور دار المطالعہ کے معتمد بھی۔ ترتیب و کتابت و طباعت کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں مراسلت کے فرائض کی انجام دہی بھی کرتے ہیں جس کی وجہ رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۹ء میں "سب رس" نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ (۱۲) شمارے دیئے۔ جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۵۸۴) ہوتی ہے۔ سب رس کو دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جہاں جہاں دکنیات پڑھائی جاتی ہے، وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں یوم محمد قلی نمبر اور (ادارہ نمبر) کے علاوہ دیگر پابندی سے شائع ہونے والے دس شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں، جنھیں دیگر معاصرین نے افادیت کے پیش نظر اپنے اخبارات و رسائل میں حوالے کے ساتھ زیر بحث کیا ہے۔

ایک سال میں "سب رس" نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں ہیں جن میں ۶۹ مضامین (۱۹) نظمیں ۹۵ غزلیں، ایک افسانے کے علاوہ (۴۴) نئی کتابوں اور (۵) رسالوں یا ان کے خاص نمبروں پر تبصرے وغیرہ شائع کئے۔
مضامین کی ایک جامع اور دیگر تفصیلات اگلے صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کی غرض سے بصراحت پیش کیجارہی ہے

وقار خلیل

فہرست مضامین مطبوعہ "سب رس" حیدرآباد دکن

جلد: ۳۱ — شمارہ: ۱ تا ۱۲ — جنوری تا دسمبر ۱۹۶۸ء

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
۳۰	حیوانات آئینہ شاعری میں	ڈاکٹر اختشام احمد ندوی	جون
۳۱	سرور آنند کی شاعرانہ	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	"
۳۲	مرزا غالب، سارے جہاں کے	قیوم صادق	"
۳۳	عبدالرحیم خان خاناں	ڈاکٹر وشنو سوپ	"
۳۴	طلباء میں بے ضابطگی و بدنظمی	جمال کڑپوی	"
۳۵	خطبہ استقبالیہ یوم محمد قلی	رمن راج سکسینہ	جولائی
۳۶	خطبہ صدارت یوم محمد قلی	جسٹس سید قمر حسن	"
۳۷	تعارف ادبی اجلاس یوم محمد قلی	میر حسن	"
۳۸	صدارتی تقریر ادبی اجلاس یوم محمد قلی	شری کرشنا سہتا	"
۳۹	میر محمد مومن	مس نجمہ صدیقہ	"
۴۰	قطب شاہیوں کے تعلیمی مراکز	نجم صدیقی	"
۴۱	قطب شاہی دور کے چند اطباء	حکیم عبدالوہاب ظہوری	"
۴۲	دکنی تمدن قطب شاہی عہد میں	محمد حسین جعفری	"
۴۳	" " " "	سید مجیب الدین	"
۴۴	" " " "	قدر بانو	"
۴۵	خطوط واجد علی شاہ بنام حمشید بیگم	یوسف کمال بخاری	اگست
۴۶	شاید احمد دہلوی امن اور شخصیت	حسرت سہاگنجوی	"
۴۷	آہ ! اکبرو فانی	طیب انصاری	"
۴۸	اختر اور رومان	جمال کڑپوی	"
۴۹	رحیم کے چند دوہے	اشرف الدین فیضی	"
۵۰	ادارہ اور ایوان اردو	میر سراج الدین علیخاں	ستمبر

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
۵۱	ادارہ ادبیات اردو	مصباح الدین عبدالرحمٰن	ستمبر
۵۲	یوم محمد قلی ۱۹۶۷ء (ایک جائزہ)	وقار خلیل	"
۵۳	ملک محمد جائسی	جے کرشن چودھری	اکٹوبر
۵۴	رومانی تنقید (ایک جائزہ)	ڈاکٹر مغنی تبسم	"
۵۵	جگر کا سیاسی اور سماجی شعور	حسرت سہاگنجوی	"
۵۶	مکتوبات کرشن چندر	ضیاء حسینی	"
۵۷	مراسلہ نگاری	صیب انصاری	"
۵۸	مکتوب لندن	محسن شمسی	"
۵۹	ملا فتح گیلانی	ڈاکٹر امیر حسن عابدی	نومبر
۶۰	غالب، انانیت کے آئینہ میں	ڈاکٹر اختشام احمد ندوی	"
۶۱	سب رس (ملا وجہی)	ڈاکٹر مغنی تبسم	"
۶۲	دستور العمل ٹھاکر لعل برہانپوری	پروفیسر شیخ فرید	"
۶۳	تورنگ جہانگیری کا قلمی نسخہ	یوسف کمال بخاری	"
۶۴	عہد عثمانی میں تعلیم کی ترقی	پروفیسر سید علی اکبر	ڈسمبر
۶۵	حالی کا ایک کمیاب شخصی مرثیہ	ڈاکٹر محمد احمد ہاشمی	"
۶۶	اردو ادب میں شخصیت	سید غلام رسول کڑپوی	"
۶۷	جگر کی شاعری	فرزانہ حمید	"
۶۸	پانی کی زبان (ایک تبصرہ)	غلام مرتضیٰ راہی	"
۶۹	مہاراشٹرا اور اردو مدارس	میر رونق علی	"

نظمیں "سب رس" جنوری تا دسمبر ۱۹۶۶ء میں جملہ انیس (۱۹) نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں نظمات، رباعیات اور نظموں کے عنوانات اور شعرا صاحبان کے نام مندرج ہیں۔ (۱) قطعات از حسن بخت (۲) بیگانہ فرزانہ از ... (۳) مناجات از میر یسین علی خاں (۴) آواز از عبد المتین نیاز (۵) ایک خط کا اقتباس از شاہد ماہلی (۶) حکمت از جمال شریفی (۷) مناجات محمد قلی قطب شاہ معانی (۸) نظم فارسی نذر محمد قلی از حسن طیبی نیر (۹) نعت از محمد قلی قطب شاہ معانی (۱۰) صنم خانہ تخیل از اطہر نقوی (۱۱) جمیں جمیں از فرحت قمر (۱۲) رباعیات از طالب جے پوری (۱۳) حیدرآباد دکن از قمری (۱۴) رباعیات از عطا کیانوی (۱۵) شاعر سے کچھ سوال از فرحت قمر (۱۶) اشکیک از تقی شاعر (۱۷) سحر ماحول از عباس آذر (۱۸) پرتو از اطہر نقوی (۱۹) دلی از امین عالم راہی۔

غزلیں اس سال جملہ سچانوے (۹۵) شعرا صاحبان کی غزلیں سب رس میں شائع ہوئیں اور بعض شعرا کی ایک سے زائد غزلیں بھی چھپیں۔ ذیل میں شعرا کے نام نامی درج کئے جا رہے ہیں۔

مظفر حنفی، انوار ظہوری، سعادت نظیر، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، حافظ رفیق درد، حسن بخت، ناصر نظامی، کیف انصاری، اقبال منہاس، ریاض چودھری، محمد منظور احمر، صابر شاہ آبادی، مست فتح پوری، رؤف خیر، کونت سنگھ جانی، نعیم نقوی، اسحق ملک، باقر منظور زیب غوری، ساحل مانکپوری، غلام مرتضیٰ راہی، شاہد ماہلی، شمیم فاروق، صلاح الدین نیر، شبیب رضوی، حرمت الاکرام، [illegible]، رونق ... سجادی، عبد المتین نیاز، اخلاق فتح پوری، میر یسین علی خاں، جاندار افسر، روشن صدیقی، گووند ورشک، مظہر ہوشیار پوری، معصوم شرقی، ابو سعید سیدہ، محمد شفیع الدین خاں شفیع کسری، منہاس مقیم جنگلی، شارق جے پوری، طرب میرٹھی، شمشاد ادیب، مہا بیچی کرار نوری، ناشاد کانپوری، سہیل اختر، امجد نظمی، نسیم قریشی، نسیم نقوی، حباب ہاشمی، ریورنڈ محسن ریحانی، ڈاکٹر سید اختر احمد حسرت، سہروردی، شاد عباسی، اقبال طاہر اور عزیز۔

افسانہ صرف ایک:-

معاوضہ از اندرجیت دت

تبصرے۔ "سب رس" نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو شائع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں جملہ ۴۴ نئی مطبوعات پر اور (۵) رسائل و جرائد یا اُن کے مخصوص شماروں پر تبصرے شائع ہوئے۔ تبصرہ کرنے والوں میں "سب رس" کے تبصرجات محمد اکبر الدین صاحب صدیقی لکچرار شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ کے علاوہ پروفیسر حمید شطاری، مولوی غلام رسول، حکیم یوسف حسین خاں، وقار خلیل اور فرزانہ انصاری شامل ہیں۔

ذیل میں تبصرہ شدہ مطبوعات کی تفصیلات درج کی جا رہی ہیں۔

کتب:-

۱. "سب رس" پر ایک نظر از ڈاکٹر سہیل بخاری
۲. حج و زیارت از عبد الصمد نعمانی
۳. تلخیص تذکرہ سراپا سخن مرتبہ ڈاکٹر سید سلیمان حسین
۴. تعمیر نگاراں از سید سبط حسن
۵. سید کوئی قوم نہیں۔

۶۔ نقشِ اول (مجموعہ کلام) قسیم الحق گیاوی
۷۔ حسن نظر (" " ") چرنجی چینوٹی
۸۔ انتخاب کلام وحید از سکندر علی وجد
۹۔ منارۂ نور (مجموعہ کلام) خاور نوری
۱۰۔ وجدان فکر (" ") منوہر لال شارب
۱۱۔ روشنی کے حضور (افسانے) حسن فیاض
۱۲۔ کلیاتِ آفریں از فقیر اللہ آفریں
۱۳۔ گلِ صحرا (مجموعہ کلام) طالب جے پوری
۱۴۔ مرقعِ یوسفی (مکتوبات و تقاریر) محمد یوسف کاندھلوی
۱۵۔ خوابِ شیریں از سچے کرشن چودھری
۱۶۔ آہنگ ادب از ناظر انصاری
۱۷۔ ادب اور جدید ذہن از دیویندر اسر
۱۸۔ نگارشاتِ بہادر یار جنگ مرتبہ
۱۹۔ حیاتِ طیبہ مؤلفہ غلام محمد نظام الدین
۲۰۔ احوال و نقدِ غالب مرتبہ پروفیسر محمد حیات خاں سیال
۲۱۔ ریاست یا تحقیقِ عدل (افلاطون) ترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین
۲۲۔ سوویت سفارت خانے میں ترجمہ محمود سعدی
۲۳۔ نیا طبقہ ترجمہ جلیس عابدی
۲۴۔ روحِ کلامِ غالب مرتبہ افتخار حسین زیدی
۲۵۔ نغمۂ شعور (مجموعہ کلام) عبدالمتین نیاز
۲۶۔ اردو میں قصیدہ نگاری از ڈاکٹر ابو محمد سحر
۲۷۔ ایک تھا شاعر مرتبہ مظفر حنفی
۲۸۔ نثر و غزل دستہ " " "
۲۹۔ پانی کی زبان (انتخاب کلام) مظفر حنفی
۳۰۔ مرج البحرین از عبدالحق محدث دہلوی
۳۱۔ علامہ اقبال بھوپال میں از عبدالقوی دسنوی
۳۲۔ نذیر ذاکر (ناشر) مکتبہ جامعہ دہلی
۳۳۔ گلِ تر (مجموعہ کلام) واحد پریمی
۳۴۔ اینٹ کا جواب (افسانے) مظفر حنفی
۳۵۔ عکس ریز (طویل نظم) مظفر حنفی
۳۶۔ اردو زبان کا مذہبی ورثہ از قیوم صادق احمد پوری
۳۷۔ اقبال قلندر نہیں تھا از صائب عاصمی
۳۸۔ اسرارِ کائنات و اشرف المخلوقات از ڈاکٹر سید اختر احمد
۳۹۔ نوائے ازل مرتبہ ریحانی لکھنوی
۴۰۔ رنگِ زرد (انتخاب کلام مسیحی شعراء) ریحانی
۴۱۔ منثورات از برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی
۴۲۔ مقالاتِ یوم شبلی مرتبہ حافظ نذر احمد
۴۳۔ عکس و شخص (خاکے) عنوان چشتی
۴۴۔ شعلۂ خاموش (مجموعہ کلام) کمالی داس رعنا

رسائل و جرائد کے خاص نمبر!

۱۔ المجید کا سائنس نمبر (مجلہ اسلامیہ کالج الہ آباد)
۲۔ صریرِ خامہ (مجلہ جامعہ سندھ پاکستان)
۳۔ پیامِ تعلیم دہلی (سالنامہ) مدیر محمد حسین خان
۴۔ الشجاع کراچی (سالنامہ) مدیر سلمان الراشد
۵۔ شاعر بمبئی (افسانہ و ڈرامہ نمبر) مدیر اعجاز صدیقی۔

سب رس ۱۹۶۹ء میں

۱۹۶۹ء میں سب رس نے اپنے پڑھنے والوں کو دس شمارے دیئے، جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۷۰۸) رہی ہے۔ اِس سال سب رس نے ملک کے ممتاز اہل نظر ادیب پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی یاد میں ایک معیاری اور وقیع خاص نمبر شائع کیا۔ غالب صدی تقاریب کے موقع پر ادارہ کی طرف سے دو ضخیم اور دستاویزی غالب نمبر شائع ہوئے، جنھیں مضامین کے معیار کے سبب ملک کے انشا پردازوں، مشاہیر اور اساتذہ اردو کے علاوہ ادبی رسائل نے اپنے تبصروں میں کافی سراہا۔ غالب نمبر کے دو حصوں کی محدود کاپیاں بغرض فروخت موجود ہیں، غالب پرستوں سے خواہش ہے کہ وہ دس روپے میں ہر دو حصے طلب کر سکتے ہیں ختم ہو جائیں تو یہ کسی قیمت پر نہ مل سکیں گے۔

ابتدائی صفحات پر مضامین نما سب رس ۱۹۶۹ء شائع کیا جا چکا ہے۔ ذیل میں دیگر مندرجات مختلف ابواب کے تحت درج کی جارہی ہیں۔

نظمیں: "سب رس" جنوری تا ڈسمبر ۱۹۶۹ء میں جملہ تیرہ (۱۳) نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں نظموں کے عنوان اور شعراء صاحبان کے نام درج کئے جاتے ہیں:—

۱۔ یادِ زورؔ کی نذر (خیرات ندیم) ۲۔ درد آراستگی حسن (مرزا رہبر) ۳۔ رباعیات (عطا کلیانوی) ۴۔ قصیدہ در مدح افضل الدولہ (غالب) ۵۔ قصیدہ در مدح مختار الملک سالار جنگ (غالب) ۶۔ یاد غالب (جذب عالمپوری) ۷۔ کلامِ غالب کے کرشمے (باقر امانت خانی) ۸۔ اسداللہ خاں غالب (رونق دکنی سیمابی) ۹۔ غالب (نازش پرتاب گڈھی) ۱۰۔ اے شاعر خوش فکر (مہدی پرتاب گڈھی) ۱۱۔ آشوب ستائش (نازؔ قادری) ۱۲۔ قطعات (غلام مرتضیٰ راہی) ۱۳۔ غالب (وقار خلیل)

غزلیں: اس سال جملہ (۱۷) غزلیں شائع ہوئیں اور بعض شعراء کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی اشاعت پذیر ہوئیں۔ ذیل میں شعراء کے نام مندرج ہیں: —

مظفر حنفی ۔ عشرت کرتپوری ۔ صلاح الدین نیر ۔ راہی قریشی ۔ غلام مرتضیٰ راہی ۔ نسیم کفوی ۔ نعیم کفوی ۔ رؤف خیر ۔ واحد پریمی ۔ مخمور سعیدی ۔ زیب غوری ۔ حباب ہاشمی ۔ باقر منظور ۔ حفیظ صدیقی ۔ طالب قریشی ۔ محمد منظور احمد منظور ۔ عاصم بریلوی ۔ طرب سیرمحی ۔ غضنفر برنی ۔ جے کرشن چودھری حبیب ۔ ساحل ٹانکپوری ۔



انور ظہوری۔ اقبال منہاس۔ نواب سعادت جاہ۔ پرنس سیادت علی خاں صاحب، کالی داس گپتا رضا۔
ظفر ہمیرپوری۔ شمیم فتح پوری۔ طالب ترلشی۔ ریاض حسین چودھری۔ عبدالمتین نیاز۔ مہدی پرتاب گڈھی۔
محمد نصیرالدین نصیر۔ امداد ہمدانی۔ ظفر صہبائی۔ فوق فاروقی۔ قمر صدیقی۔ ساجد اختر۔ یعقوب راہی۔ قمر بسوانی۔
نثار عباسی۔ شاکر کریتوری۔ انور امروہوی۔ افتخار احمد فخر۔ سید شکیل دسنوی۔ اسلم عمادی۔ رضا وصفی حیدرآبادی۔
محمد منشاء الرحمٰن خاں منشاء۔ ستار چشتی۔

افسانے: دو افسانے چھپے جن میں ایک ترجمہ اور دوسرا طبع زاد ہے۔ (۱) نیلی بار کی جنگ از فرانسس بریٹ ہارٹے مترجم: اندرجیت دت (۲) کمی۔ از اندرجیت دت۔

طنز و مزاح: سب رس غالب نمبر حصۂ اول میں دو طنزیے شائع ہوئے۔ (۱) غالب اور ملازمین سرکار۔ از یوسف ناظم (۲) آگہی دام شنیدن از سید علی شاکر۔

تبصرے: سب رس کا خاص وصف نئی مطبوعات اور رسائل کے خصوصی نمبروں پر سیر حاصل اور بے لاگ تبصرے شائع کرنا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جملہ (۳۶) کتابوں اور رسائل کے (۱۶) خصوصی شماروں پر پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، جناب شاذ تمکنت، مولوی غلام رسول، پروفیسر سید محمد اور جناب بشیر انور نے ادارہ کی درخواست پر تبصرے تحریر فرمائے۔

ذیل میں تبصرہ شدہ مطبوعات و رسائل کے نام درج ہیں۔

کتب: (۱) تذکرہ مولانا آزاد (مرتبہ مالک رام) (۲) خطوط بہادر یار جنگ (مرتبہ نذیرالدین احمد) (۳) بہادر یار جنگ کے خطوط مشاہیر کے نام (مرتبہ نذیرالدین احمد) (۴) مخدوم ایک مطالعہ از داؤد اشرف (یم۔ اے) (۵) حیات پاک (مرتبہ سید محمود ید اللہی) (۶) نئے مشاہدات اور معجزات شق القمر (از رہبر فاروقی) (۷) عروج آدم (کلام) از رفعت سروش (۸) تیکھی غزلیں (کلام) (منظر حنفی) (۹) حضرت علوی (حالات و کلام) (م۔ ع علوی) (۱۰) قرآن اور انسان (از: میر ولایت علی) (۱۱) بھوپال میں غزل (از دلکش ساگری) (۱۲) رشید احمد صدیقی شخصیت اور فن از ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (۱۳) حیات طیبہ ناشر مکتبۂ اردو مدرسہ اسلامیہ سنگاریڈی (۱۴) اسوۂ اکابر (از محمد بہاء الحق قاسمی) (۱۵) اسلام کا تعارف (از وحیدالدین خاں) (۱۶) رواداری ہندوستانی سماج میں (از۔ ابوالفہیم وحید حیدرآبادی) (۱۷) سیاہ، سرخ، سفید (ناول) (آمنہ ابوالحسن) (۱۸) برگ آوارہ (کلام) (خورشید احمد جامی) (۱۹) الفہرس المشروح (عربی مخطوطات حصۂ اول) ڈاکٹر محمد غوث۔ (۲۰) نوائے سرور (مرتبہ ڈاکٹر حکیم چند نیر) (۲۱) غزال رعنا (محمد قلی کی غزلوں کا انتخاب) پروفیسر جاوید وشسشٹ (۲۲) حلم نامہ (کلام طنز و مزاح) محمد یوسف پاپا (۲۳) نجم بردہ (کلام) از رشید احمد رشید) (۲۴) سورج کی صلیب (افسانے) ولایت علی۔ (۲۵) کلیات نسیم میسوری (مرتبہ میر محمد حسین) (۲۶) اسلام اور اس کا آئین حکومت (از غلام محمد) (باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ)

نمبر	عنوان	مضمون نگار	اشاعت	نمبر	عنوان	مضمون نگار	اشاعت
۱	حاجی بغلول (ایک کردار)	ابومحمود	۱۹۷۰ء جنوری	۲۳	میرے چچا	فرحت ہاشمی	؍
۲	فرحت اللہ بیگ کا طنز و مزاح	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	؍	۲۴	نجیب اشرف (ایک تاثر)	طیب انصاری	؍
۳	اورنگ آباد میں اردو افسانہ نگاری	قاضی متین الدین	؍	۲۵	پروفیسر نجیب اشرف ندوی	ڈاکٹر [illegible]	؍
۴	پیرو ڈی اور کنھیا لال کپور	سید جعفر صادق	؍	۲۶	یادگار زمانہ ہیں یہ لوگ	ڈاکٹر نظام الدین گوریکر	؍
۵	عہد بہمنیہ کے تاریخی کتبات	ڈاکٹر عبدالمنان	فروری	۲۷	ندوی صاحب	محمد اکبر الدین صدیقی	؍
۶	ادب میں تحریکِ رومانیت	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	؍	۲۸	ایک خط پروفیسر سید محمد کے نام	عبدالرحیم	؍
۷	غالب کی اصلاحیں خود اپنے کلام پر	میر یسین علی خاں	؍	۲۹	عہد بہمنیہ کی حیات اجتماعی کا ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد عبدالمنان	مئی
۸	اردو ڈرامہ	طیب انصاری	؍	۳۰	داستانِ مخطوطاتِ ہند	سید یوسف کمال بخاری	؍
۹	امجد ایک صوفی شاعر	فریدہ زین ایم اے	؍	۳۱	ادبی تنقید میں فن برائے فن کا نظریہ	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	؍
۱۰	جامعہ میسور میں مخطوطات کا ذخیرہ	ادارہ	؍	۳۲	عابد میسوری اور نقشِ مراد	میر محمود حسین	مئی
۱۱	تحقیقی کارنامے (ایک جائزہ)	ڈاکٹر وحید قریشی	مارچ	۳۳	مولانا سلیمان ندوی کی بارگاہِ علم و دانش میں	ابوعلی ندوی	؍
۱۲	شاعری اپنے مزاج کے آئینے میں	عبدالاحد	؍				
۱۳	ادبی تنقید کا تاریخی نظریہ	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	؍	۳۴	ملا وجہی کی فارسی شاعری	ڈاکٹر نور السعید اختر	؍
۱۴	حضرت صدق جائسی مرحوم	احمد علی خاں ادیب	؍	۳۵	حالی کے مرثیے (ایک خط)	ڈاکٹر وجاہت علی سندیلوی	؍
۱[illegible]	کوثر چاندپوری فن اور شخصیت	ضیار حسنی	؍	۳۶	عہد بہمنیہ کی حیات اجتماعی کا ایک جائزہ	ڈاکٹر محمد عبدالمنان	جون
۱[illegible]	نجیب اشرف ندوی اور ان کا خاندان (ضمیمہ)	شہاب الدین دسنوی	اپریل	۳۷	مقدمہ رقعاتِ عالمگیر پر ایک نظر	محمد ایوب واقف	؍
[illegible]	پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم	سید احتشام حسین	؍	۳۸	اقبال اور طنز	محمد بدیع الزماں	؍
[illegible]	نجیب اشرف ندوی اور انکے نام چند خطوط	عبدالقوی دسنوی	؍	۳۹	نیاز اور [illegible]	حباب ہاشمی	؍
[illegible]	دکنیات سے ندوی صاحب کی دلچسپی	حامد اللہ ندوی	؍	۴۰	حضرت حفیظ میرٹھی	شکیل احمد عاصم	؍
[illegible]	ندوی صاحب شخصیت اور کردار	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	؍	۴۱	جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین	وقار خلیل	؍
[illegible]	ندوی صاحب چند یادیں	محمد ایوب واقف	؍	۴۲	داستانِ مخطوطاتِ ہند	سید یوسف کمال بخاری	جولائی
[illegible]	تقریب بہر ملاقات	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	؍	۴۳	درسی کتابیں	غلام ربانی	؍

نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ	نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ
۴۴	چند دکھنی مرثیہ گو شعراء	وحید النساء	جولائی	۶۵	غالب۔ غالب	فرحت قمر	ستمبر اکتوبر
۴۵	حالی ایک نظر میں	اندرجیت دت	〃	۶۶	..... پر یاد آتا ہے	فریدہ زین ایم اے	〃
۴۶	ادبی تنقید کا تاثراتی نظریہ	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	〃	۶۷	غالب کی شعری بول چال	حشم الرمضان	〃
۴۷	فانی۔ الم پرست شاعر	فریدہ زین	〃	۶۸	غالب کے الفاظ میں تکرارِ صوت	محمد عرفان نگینوی	〃
۴۸	عہد بہمنیہ کا نظامِ تعلیم	ڈاکٹر محمد عبدالمنان	〃	۶۹	غالب کی ایک سعی لاحاصل	حامد اللہ ندوی	〃
۴۹	کتبہ امین درگاہ بیجاپور	محمد امیر الدین صدیقی	اگست	۷۰	غالب کا سماجی شعور	سید مبارز الدین رفعت	〃
۵۰	تاج الحقائق کا فنی تجزیہ	ڈاکٹر نور السعید اختر	〃	۷۱	گنجینۂ معانی کا طلسم	ڈاکٹر ابو محمد سحر	〃
۵۱	حیاتِ غالب	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	ستمبر اکتوبر غالب نمبر	۷۲	نسخۂ حمیدیہ ایک جائزہ	عصمت جاوید	〃
۵۲	غالبِ خستہ جاں	پروفیسر سید محمد	〃	۷۳	سید ہاشمی اور نسخۂ حمیدیہ	عبدالقوی دسنوی	〃
۵۳	غالب کی وارستہ مزاجی	ڈاکٹر حفیظ قتیل	〃	۷۴	خطوط نگاری میں غالب کا ایک پیش رو	اظہر علی فاروقی	〃
۵۴	غالب اور متنبی کا تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	〃	۷۵	غالب کا ایک شعر	سعادت علی صدیقی	〃
۵۵	فارسی میں تا بہ جیتی ..	شکیل احمد صدیقی	〃	۷۶	آگہی دام شنیدن (طنز)	سید علی شاکر	〃
۵۶	مکاتیبِ غالب میں سماجی	ڈاکٹر سلیمان اطہر	〃	۷۷	غالب اور ملازمین سرکار (طنز)	یوسف ناظم	〃
	اور تہذیبی پس منظر	جاوید	〃	۷۸	غالب کی شاعری میں عصری رجحانات	ڈاکٹر خلیل احمد	〃
۵۷	محمد حبیب اللہ ذکا (شاگرد غالب)	محمد عبدالرزاق بسمل	〃	۷۹	مرزا قربان علی بیگ سالک	میر سراج الدین علی خاں	〃
۵۸	فوجدار محمد خاں اور غالب	ڈاکٹر حامد حسین	〃	۸۰	غالب کی جدت پسندی	سہیل بیابانی	〃
۵۹	غالب اور بیدل	ضامن کنتوری	〃	۸۱	غالب اور دکن	محمد اکبر الدین صدیقی	〃
۶۰	غالب نما	ڈاکٹر صفی الدین صدیقی	〃	۸۲	ڈاکٹر ذاکر حسین کا دیوانِ غالب	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی	〃
۶۱	غالب اور تصوف	معز الدین قادری ملتانی	غالب نمبر حصہ اول	۸۳	غالب آلام و امراض کے نرغے میں	〃 〃 〃 〃	〃
۶۲	غالب ہندوستانیت کے لباس میں	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	〃	۸۴	سر عبدالقادر اور دیوانِ غالب	محمد حنیف شاہد	〃
۶۳	غالب فارسی شاعری کے آئینے میں	عبدالغنی فاروقی	〃	۸۵	کیا مرزا غالب بھی پیر ممنون کے ممنون تھے	[illegible] شوکت علی خاں	〃
۶۴	لغاتِ غالب	احمد علی خاں ادیب	〃				

۱ [illegible] صفحہ نمبر ۳۹ [illegible]

"سب رس" کے تبادلے میں آنیوالے رسائل وجرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل وجرائد ایوانِ اردو کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعے کیلئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل وجرائد کو چھوڑ کر "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جنکی مجموعی تعداد (۲۶۶) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علیگڈھ) "ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں میں نے اسقدر تعداد میں معیاری رسائل وجرائد کبھی نہیں دیکھے" اس طرح "ایوان اردو" کا دارالمطالعہ اردو دنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے۔

ہم تمام ہندو پاک اور بیرون ہند کے مدیران جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل، جرائد ارسال فرماتے ہیں امید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہیگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل وجرائد کی اچھی اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کر کے استفادہ کیلئے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے اس سلسلے میں ایک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیر ترتیب ہے، ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل وجرائد کی فائیلیں بھی محفوظ ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر اور علمی ادبی ذخیرے کے علاوہ اس کتب خانے سے آئے دن ادب دوست اصحاب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز [illegible] ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں جسکو ایوانِ اردو [illegible] رہتا ہے۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیران رسائل وجرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا ایسا ادبی ذخیرہ قدیم و جدید کتب ورسائل چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم "تحفتہً" مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریے کے ساتھ کتب خانے میں داخل کرلئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسم گرامی کے ساتھ درج بھی ہوگا۔

امید ہے کہ ساعرین اور دیگر ادب دوست اصحاب اور مختلف علمی وادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاون عمل فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

(ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرِ سالانہ
		(سالانہ)			
۱	انوار	شعبہ اردو انوار العلوم کالج ملے پلی، حیدرآباد دکن	ڈاکٹر خالدہ بیگم	۶۴	۰
۲	جرنل آف ریسرچ (انگریزی)	پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی (لدھیانہ) پنجاب	ہرکرت سنگھ	۱۰۰	۸-۰۰
۳	جوہر (چہار سالی)	انوار العلوم ملٹی پرپز ہائی اسکول نامپلی حیدرآباد	سید جعفر ادیب	۸۰	۰
۴	جیوتسنا (سہ سالی)	ایس۔ آر۔ آر گورنمنٹ آرٹس کالج ویونگ کریم نگر	محمد منظور احمد	۸۰	۰
۵	دی عثمانین (سہ سالی)	عثمانیہ کالج کرنول (اے۔ پی)	فقیر بادشاہ قادری	۱۴۸	۰
۶	شبِ تاب (سہ سالی)	شعبہ اردو ایوننگ کالج عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد	۔	۱۲۶	۰
۷	صریرِ خامہ	سندھ یونیورسٹی حیدرآباد سندھ پاکستان	ڈاکٹر سید نبی احمد ہاشمی	۲۸۰	۰
۸	قدیم اردو	شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن	پروفیسر مسعود حسین خاں	۳۰۰	۱۳-۰۰
۹	مجلہ عثمانیہ	″ ″ ″ ″	″	۱۲۰	۵-۰۰
۱۰	نیفس (چہار سالی)	ملٹی پرپز ہائی اسکول نامپلی حیدرآباد	″	۱۵۰	۰
۱۱	کالج میگزین	ایس۔ آر۔ آر گورنمنٹ کالج کریم نگر (اے۔ پی)	محمد عبدالغفار برق	۸۰	۰
		سہ ماہی			
۱۲	اردو	انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی ۱	جمیل الدین عالی	۲۰۰	۱۰-۰۰
۱۳	اردو نامہ	ترقی اردو بورڈ، اردو بورڈ، کراچی ۱	شان الحق حقی	۱۷۰	۴-۰۰
۱۴	اوراق	چوک، اردو بازار، لاہور (پاکستان) ۲	ڈاکٹر وزیر آغا	۴۰۰	۹-۰۰
۱۵	اقبال ریویو (اردو)	اقبال اکیڈمی ۴۳/ڈی ۶ بلاک ۶، پی، ای، سی، ایچ۔ کراچی ۲۹	پی، اے، ڈار	۱۴۴	۱۲-۰۰
۱۶	″ ″ (انگریزی)	″ ″ ″ ″ ″	″	۱۴۰	۱۲-۰۰
۱۷	امریکن ریویو (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس۔ سکندرا روڈ۔ نئی دہلی ۱	آر۔ او۔ بروکس	۱۱۶	۶-۰۰
۱۸	امریکن لیبر ریویو ″	″ ″ ″	″	۹۸	۴-۰۰
۱۹	پرابلم آف کمیونزم ″	یو، ایس، انفارمیشن ایجنسی۔ واشنگٹن (ڈی۔ سی)	ابرام برمگنف	۸۰	۰

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
۲۰	شیپ	حلقۂ فکر نو، گارڈن آفیسرس، مرادخاں روڈ، کراچی ۳	نسیم درانی	۲۵۰	۸—۰
۲۱	شاخسار	بخشی بازار۔ کٹک (اڑیسہ)	امجد نجمی	۱۴۰	۳—۰
۲۲	صحیفہ	مجلس ترقی ادب، ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ لاہور	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۱۰	۶—۰
۲۳	نوائے ادب	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ ۸۰ شیفرڈ روڈ۔ بمبئی	نجیب اشرف ندوی	۹۴	۶—۰
۲۴	یونسکو نیوز لیٹر	یونسکو ریجنل سنٹر A/۲۶ پی، ای، سی، ایچ، کراچی ۲۹	-	۳۲	۰
۲۵	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاؤس۔ پیرس	ناظم یونسکو	۳۲	۰
		— دوماہی —			
۲۶	ادبی تبصرے	انجم لاج، سکلاں محل۔ دہلی	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۸	۴—۰
۲۷	تحریر	علمی مجلس ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب۔ فراش خانہ۔ دہلی	مالک رام	۲۵۰	۱۲—۰
۲۸	شیرازہ	جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ۔ کلچر اینڈ لنگویجیز۔ سرینگر	محمد یوسف ٹینگ	۱۱۰	۱۰—۰
		— دیڑھ ماہی —			
۲۹	شگوفہ	۲۷، بیچلرس کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ۔ حیدرآباد	مصطفیٰ کمال	۶۴	۱۰—۰
		— ماہنامے —			
۳۰	آندھرا پردیش	محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ۔ کرم جاہی روڈ حیدرآباد	کنول پرشاد کنول	۴۸	۵—۰
۳۱	آیندہ	روڈ ۱۳۔ آزاد نگر۔ مانگو۔ جمشیدپور (انڈیا)	سہیل واسطی	۸۰	۱۰—۰
۳۲	آئینہ	شاہ عالم گیٹ۔ لاہور ۲۷ (پاکستان)	امین شرقپوری	۶۶	۷—۰
۳۳	ادب لطیف	سرکلر روڈ۔ لاہور (")	ناصر زیدی	۸۰	۶—۰
۳۴	ارشاد	دارالارشاد، مغلپورہ۔ حیدرآباد۔ ۲ (اے۔ پی)	جاوید قادری	۳۴	۵—۰
۳۵	اردو زبان	سٹیلائٹ ٹاؤن۔ سرگودھا (پاکستان)	عصمت اللہ	۶۴	۶—۰
۳۶	اسپان (انگریزی)	"بہاولپور ہاؤس" سکندرا روڈ۔ نئی دہلی	ڈی۔ کے۔ براؤن	۵۸	۵—۰
۳۷	اشارہ	صادق پور سرائے۔ پٹنہ (بہار)	قیوم خضر	۴۸	۶—۰

۳۸	افکار	مکتبہ افکار - راسن روڈ - کراچی (پاکستان)	صہبا لکھنوی	۱۰۴	۱۲-۰
۳۹	البلاغ	دارالعلوم کراچی ۱۴ (مشرقی پاکستان)	تقی عثمانی	۶۴	۶-۰
۴۰	الحق	۳۹۷-۱-۲۴ روبرو گیان باغ، سیتا رام باغ - حیدرآباد دکن	انور حسن نعمانی	۴۸	حسب استطاعت
۴۱	الشجاع	ٹائمز پریس - صدر کراچی (پاکستان)	سلمان الارشد	۷۴	۶-۰
۴۲	القریش	۱-۲-۱۱-۷۵ چوراہا حسینی - حیدرآباد - ۲ (آے پی)	ابراہیم مدنی	۱۶	۵-۰
۴۳	المعارف	ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ - لاہور	شاہد حسین رزاقی	۶۴	۸-۰
۴۴	امریکن لیبر ریویو	چانکیہ پوری - شانتی پتھ - نئی دہلی ۱۲	پی، ایچ، ہیلین	۲۲	۱-۰
۴۵	انڈین لٹریچر	۸/۲ رام نگر - نئی دہلی ۱	لکشمن شاستری	۳۲	۶-۰
۴۶	انجمن اسلامیہ میگزین	۸/۵۸ کوچین والا مارکٹ - کراچی ۲	انتظام اللہ شہابی	۶۴	۵-۰
۴۷	بانو	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی	زینت کوثر	۶۴	۱۰-۰
۴۸	بچوں کی دنیا	شاہ عالم گیٹ - لاہور ۲۷ (پاکستان)	امین شرقپوری	۴۸	۴-۰
۴۹	برہان	جامع مسجد، اردو بازار - دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۶-۰
۵۰	بلٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانس اسٹڈیز، راشٹرپتی نواس شملہ	وینکٹ امن	۲۰	۰
۵۱	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ دریا گنج - دہلی	خوشتر گرامی	۱۲۰	۱۰-۰
۵۲	پگڈنڈی	ادبستان اردو، ہال بازار - امرت سر (پنجاب)	امریک آنند	۴۸	۶-۰
۵۳	پرچم	۳۰۱-۷-۱۶ اعظم پورہ حیدرآباد دکن	ناصر کرنولی	۶۰	۱۰-۰
۵۴	پیامِ تعلیم	جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵	محمد حسین حسان	۶۴	۵
۵۵	تجلی	دیوبند ضلع سہارنپور (اترپردیش)	عامر عثمانی	۶۴	۷-۰
۵۶	تحریک	۹ - انصاری مارکٹ، دریا گنج - دہلی ۶	گوپال متل	۶۴	۱۰-۰
۵۷	جاسوسی پنجہ	پنجابی پستک بھنڈار - دریبہ کلاں - دہلی ۶	دی دہلوی	۱۲۰	۸-۰
۵۸	تبصرہ	بیرون دہلی دروازہ - لاہور (پاکستان)	جانباز مرزا	۳۸	۱-۰
۵۹	جامعہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ - جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۱-۰
۶۰	جانثار	۶۸ - سبھاش نگر، کٹڑہ شیر سنگھ، امرت سر (پنجاب)	میلارام وفا	۵۶	[illegible]-۰

۶۱	جائزہ	۶ ۔ حجاز ہوٹل ۔ گرانٹ روڈ ۔ کراچی ۔ (پاکستان)	وسیم فاضلی	۱۴۴	۱۲ــ۰
۶۲	جستجو	اندرون پنج محلہ، حیدرآباد ۔ ۲	سید عبداللہ	۲۴	۴ــ۰
۶۳	جہاں ستان	۴۳۶ ۔ بازار مٹیا محل ۔ دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۸ــ۰
۶۴	حریم	نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ	نسیم انہونوی	۴۸	۷ــ۰
۶۵	خاتونِ دکن	۴-۳-۳-۲۲ گھرکی باولی حیدرآباد ۔ ۲ (بھارت)	صالحہ الطاف	۴۸	۶ــ۰
۶۶	خالقیہ	انجمن خالقیہ، بلاک ۱۷ ۔ سرگودھا (پاکستان)	تاثیر مرزا	۴۸	۵ــ۰
۶۷	دوام	پوسٹ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یو، پی)	مختار احمد مظاہری	۶۴	۷ــ۰
۶۸	دیروحرم	بازار نخاسہ، سہارنپور (یو، پی)	اقبال احمد	۳۲	۴ــ۰
۶۹	زبان و ادب	آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی ۶	معزالدین احمد	۳۴	۲ــ۵۰
۷۰	زیور	سبزی باغ پٹنہ ۔ ۴ (بہار)	رضوان احمد	۶۵	۷ــ۵۰
۷۱	ساقی	بی ۔ آئی ۔ بی ۔ کالونی کراچی ۵ (پاکستان)	عاصمہ بیگم شاہد	۶۶	۱۰ــ۰
۷۲	ساہتیہ اکیڈمی جرنل	رابندر بھون نئی دہلی	بی، ماچوے	۸۰	۵ــ۰
۷۳	سٹی اسپورٹس میگزین	نزد کریم ہوٹل جامع مسجد دہلی ۶	علیم الدین	۴۸	۶ــ۰
۷۴	سروج	صدر بازار دہلی ۶	سیفی پریمی	۴۸	۶ــ
۷۵	سوز	۲۸ ۔ مدن موہن برمن اسٹریٹ کلکتہ ۷	سوز سکندرپوری	۳۲	۴ــ۰
۷۶	سوویٹ لٹریچر (انگریزی)	۱/۹ روبیرو ۱۱ اسٹریٹ (ماسکو یو ایس ایس آر)	ورسیلیواز بلو	۲۰۴	•
۷۷	سلسبیل	ادارہ تصوف، اردو بازار لاہور	محمد اقبال	۶۴	۷ــ۰
۷۸	سہیل	باری روڈ گیا (بہار)	ادریس سہسراوی	۳۲	۴ــ۰
۷۹	سیارہ	۶ ۔ بی، ذیلدار پارک اچھرہ لاہور	نعیم صدیقی	۸۶	۱۰ــ۰
۸۰	شاعر	پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۸ ۔ (بی ۔ آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	۸ــ۰
۸۱	شانِ ہند	۸ ۔ انصاری مارکٹ ۔ دریا گنج دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	۶ــ۰
۸۲	شاہکار	۱۳-۴ بخشی بازار ۔ الہ آباد ۔ ۳ (یو ۔ پی)	محمود احمد ہنر	۱۴۴	۱۲ــ۰
۸۳	شب خون	۳۱۳ ۔ رانی منڈی الہ آباد ۳ " "	جمیلہ فاروقی	۸۰	۱۰ــ۰

۸۴	شب رنگ	۶۳ - زیرو روڈ - الہ آباد (یو-پی)	ڈاکٹر عقیل احمد	۸۰	۱۰-۰
۸۵	شجر	جنتا لائبریری۔ چوک برہان پور (ایم پی)	اندرسین آشنہ	۴۸	۶-۰
۸۶	شمع	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۱۲۶	۱۲-۰
۸۷	شمع ملت	جدید محبوب آباد بیگم پیٹھ حیدرآباد دکن	حکیم غوث محی الدین	۸	۲-۰
۸۸	شہپر	۴۸ - دریاباد - الہ آباد ۳ (یو-پی)	اظہر علی فاروقی	۸۰	۱۲-۰
۸۹	صبا	۱۷/ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد	سلیمان اریب	۹۶	۱۲-۰
۹۰	صبح	انجمن ترقی اردو، علمی منزل کوچہ پنڈت دہلی	عبداللطیف اعظمی	۸۰	۱۰-۰
۹۱	صبح امید	بلاسیس روڈ بمبئی ۸	عبدالحمید بوہیرے	۴۸	۶-۰
۹۲	صبح نو	قطب الدین لین پٹنہ ۴ (بہار)	وفا ملک پوری	۴۸	۷-۰
۹۳	طبیہ کالج میگزین	۱۱۹ - ملتان روڈ لاہور (پاکستان)	عبدالباسط چشتی	۳۲	۴-۰
۹۴	عارف	بل روڈ - لاہور (")	عبدالرحمن شوق	۴۸	۴-۰
۹۵	عصمت	وکٹوریہ روڈ صدر کراچی ۳ (")	رزاق الخیری	۶۴	۶-۰
۹۶	فاران	کیمبل اسٹریٹ - کراچی (")	ماہر القادری	۶۴	۷-۰
۹۷	فارن افیرس ریکارڈ	شعبہ تشہیر وزارت خارجہ حکومت ہند دہلی	-	۶۴	-
۹۸	فروغ اردو	۳۷ - آمین آباد پارک لکھنؤ (یو-پی)	پروفیسر احتشام حسین	۴۸	۳-۰
۹۹	فکر و خیال	پی۔ آئی۔ سی۔ ایچ، کراچی ۲۹ پاکستان	شمیم جاوید	۸۸	۶-۰
۱۰۰	فیض الاسلام	اقبال روڈ۔ راولپنڈی "	غلام قادر غبار	۶۸	۶-۰
۱۰۱	قومی زبان	انجمن ترقی اردو، بابائے اردو روڈ کراچی ۱	مشفق خواجہ	۹۶	۱۰-۰
۱۰۲	کتاب	چوک - لکھنؤ ۳ (یو-پی)	عابد سہیل	۸۰	۱۰-۰
۱۰۳	کتاب نما	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	ریحان احمد عباسی	۳۲	۲-۰
۱۰۴	کتابی دنیا	گیدومل لیکھراج روڈ - کراچی ۱ پاکستان	ضیاء الدین احمد برنی	۳۲	۲-۰
۱۰۵	کشاف	اسٹیٹ ہیڈ کوارٹرس - دول گوڑہ - حیدرآباد ۲	دستگیر عرشی	۴۲	۵-۰
۱۰۶	کھلونا	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۵۸	۸-۰

۱۰۷	گگن	۴ - الانا منشین 16/A اندراؤ نائر روڈ بمبئی ۱۱ بی بی	شمس کنول	۸۰	۸—۰
۱۰۸	گل خنداں	کشمیری بازار ۔ لاہور ۸	عبدالرؤف ملک	۴۸	۸—۰
۱۰۹	مجرم	آصف علی روڈ نئی دہلی ۱	ادریس دہلوی	۱۶۰	۱۲—۰
۱۱۰	محفل	رائل پارک ۔ لاہور (پاکستان)	طفیل ہوشیارپوری	۶۴	۹—۰
۱۱۱	معارف	دارالمصنفین ۔ اعظم گڑھ (یو۔پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸—۰
۱۱۲	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیا ۔ نئی دہلی ۱۴	حسن ثانی نظامی	۴۸	۴—۰
۱۱۳	نقش	کاشانہ اردو ۔ پوسٹ بکس ۳۰۲ کراچی	شمس زبیری	۱۷۰	۱۵—۰
۱۱۴	نوری کرن	رضوی کتب خانہ بازار صندل خاں بریلی (یو۔پی)	اقبال احمد نوری	۹۶	۶—۰
۱۱۵	نیا دور	محکمۂ اطلاعات اترپردیش لکھنؤ	خورشید احمد	۵۶	۵—۰
۱۱۶	نیرنگ خیال	۱۳-B لیاقت روڈ ۔ راولپنڈی پاکستان	حکیم یوسف حسن	۸۰	۱۰—۰
۱۱۷	ہمایوں	۱۴/E کملا نگر ۔ دہلی ۷	تاجور سامری	۸۰	۱۰—۰
		— پندرہ روزہ —			
۱۱۸	امریکن لیبر (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرہ روڈ نئی دہلی	موریس دیا نیر	۲۸	۰
۱۱۹	العرب (انگریزی)	۲۷۔ سردار پٹیل روڈ نئی دہلی ۱	محمد وہبی	۱۶	۱—۰
۱۲۰	پریس ریلیز نیدرلینڈ (اردو)	نیدرلینڈ ایمبیسی ۔ شانتی پتھ ۔ چانکیہ پوری ۔ نئی دہلی ۲۱	—	۸	—
۱۲۱	ترقی اردو	انجمن ترقی اردو ۔ اردو ہال ۔ حمایت نگر حیدرآباد	ڈاکٹر حسینی شاہد	۱۲	۶—۰
۱۲۲	خبرنامہ	شعبہ اردو قومی کمیٹی گاندھی پیدائش صدی ۔ دریاگنج دہلی ۶	گوپی ناتھ امن	۱۸	۰
۱۲۳	سوویت دیس	۲۵۔ بارہ کھمبا روڈ ۔ نئی دہلی	جمیل اختر	۴۸	۶—۰
۱۲۴	سینک سماچار	راجندر پرشاد روڈ ۔ نئی دہلی	چندر موہن لانبہ	۳۰	۶—۰
۱۲۵	کاکل	۸/۱۰۸ سلاس، معظم پورہ، حیدرآباد ۱۰ (آ۔پی)	احمد جلیس	۸	۳—۰
۱۲۶	کرنٹ سائنس	بتوسط یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس ۔ نئی دہلی	ڈی ملر	۲۰	۵—۰
۱۲۷	نغمۂ حیات	کالا ڈیرہ ۔ حیدرآباد ۔ ۲۶ (اے۔پی)	انور کمال خوندمیری	۶	۴—۰
۱۲۸	فلمی دنیا	نامپلی روڈ ۔ حیدرآباد ۔ (اے۔پی)	عثمان رشید	۱۲	۶—۰

۱۲۹	منصف	۵۲۵ - دیل منشن، دریچہ بو اہیر سیفی اسٹریٹ، حیدرآباد ۲	جعفر حسین جعفری	۸	۵-۰۰
۱۳۰	ہماری منزل	۵۰۷ - ۹۸ ۴م - نامپلی مارکٹ، حیدرآباد (آے-پی)	شفیع اقبال	۸	۱۰-۰۰
۱۳۱	ہمدرد	ہمدرد منزل، لال کنواں - دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	۲-۵۰
		— ہفتہ وار —			
۱۳۲	آندھرا پنچ	اوپلی کلاں، حیدرآباد ۱۳ آے-پی	ملک محمد علی خاں	۸	۴-۰۰
۱۳۳	ادبی خبریں	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	"	۸	برائے اشاعت
۱۳۴	امریکن رپورٹر (اردو)	بہاولپور ہاؤس سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	ڈونالڈ برومن	۸	۱-۰۰
۱۳۵	[illegible]	روسی سفارت خانہ ۲۵ - بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	"	۸	برائے اشاعت
۱۳۶ ۱۳۷	ایشیا	اردو بازار - جامع مسجد دہلی	ہرنارائن	۱۲	۹-۰۰
۱۳۸	بلٹز اردو	۱۷، ۱۷، ایچ کاوس جی پٹیل اسٹریٹ بمبئی	اختر حسن	۱۶	-
۱۳۹	پرچا	اعظم روڈ نظام آباد (آے-پی)	عابد انصاری	۸	۶-۰۰
۱۴۰	پرچم ہند	گلی قاسم جان دہلی ۶	انیس الرحمٰن	۲۴	۱۲-۰۰
۱۴۱	پریس بلیٹن (اردو)	پریس انفارمیشن بیلٹن حکومت ہند اردو گلی توپ باؤلی حیدرآباد	اسحٰق ایوبی	۱۲	برائے اشاعت
۱۴۲	ترجمان سرحد	پشاور (مشرقی پاکستان)	امیر عالم اعوانی	۸	۶-۰۰
۱۴۳	تعمیر	کالج روڈ - محبوب نگر آے پی	محمد عبدالعزیز	۱۲	۱۲-۰۰
۱۴۴	حیدرآباد گزٹ	بیری الاوہ حیدرآباد ۲ آے-پی	رحیم فریادی	۸	-
۱۴۵	خبرنامہ اردو	پریس بیورو مغربی پبلک نئی دہلی	—	۸	-
۱۴۶	ذوالقرنین	نظامی بکڈپو - بدایوں یو-پی	وحید الدین نظامی	۸	۶-۰۰
۱۴۷	سائنس کی دنیا	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	"	۸	-
۱۴۸	سحر	ناندیڑ اور بمبئی (مہاراشٹرا)	احمد علی بیگ چغتائی	۸	۵-۰۰
۱۴۹	سوویت جائزہ	۲۵ - بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	اصغر منظم	۳۲	۳-۰۰
۱۵۰	شعور	مدینہ منشن نارائن گوڑہ حیدرآباد ۲۹ (آے-پی)	رحیم قریشی	۱۲	۸-۰۰
۱۵۱	شہریار	بتوسط "بھارت نیوز" معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد	عارف سلیم	۸	۶-۰۰

۱۵۲	طب کی خبریں	روسی سفارت خانہ۔ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	-	۸	برائے مفت
۱۵۳	فارم نیوز لیٹر (انگریزی)	مرکزی وزارت اغذیہ۔ دہلی	۔	۸	”
۱۵۴	قومی محاذ	جونا بازار۔ اورنگ آباد (مہاراشٹرا)	اثر فاروقی	۸	۶-۰۰
۱۵۵	مورچہ	بیراگی۔ گیا (بہار)	کلام حیدری	۱۲	۶-۰۰
۱۵۶	حکمت دھارا (ہندی)	۱۲۴/۴ بھگت سنگھ مارگ۔ نئی دہلی ۱	نریندر شرما	۲۲	۱۲-۰۰
۱۵۷	نیا آدم	۱۰۳۔ جام باغ روڈ۔ حیدرآباد (اے۔پی)	امجد باغی	۱۲	۶-۰۰
۱۵۸	نیا یگ	۲۰۔ بازار لین۔ راجندر نگر۔ نئی دہلی	سودرشن کمار	۱۲	۶-۵۰
۱۵۹	نیوز فرام رومانیہ	سفارت خانہ حکومت رومانیہ ۴۸ گلف روڈ۔ نئی دہلی	—		برائے مفت
۱۶۰	واقعات وتبصرے	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	۔	۱۲	برائے مفت
۱۶۱	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند۔ علی گڑھ (یو۔پی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۵-۰۰
		— دو روزہ —			
۱۶۲	آج کا امریکہ	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس، سکندرا روڈ نئی دہلی	-	۸	برائے مفت
۱۶۳	پریس ریلیز (اردو)	تاس ۲۵ بارہ کھمبا روڈ۔ نئی دہلی	-	۱۲	”
۱۶۴	سوویت یونین کی خبریں		۔	۱۲	”
۱۶۵	” فیچر		۔	۸	”
۱۶۶	میڈیکل نیوز (اردو)	یو ایس۔ انفارمیشن سروس بسکندرا باد روڈ۔ دہلی	۔	۸	”
		— روزنامے —			
۱۶۷	ترجمان	پنڈی اسٹریٹ لدھیانہ (پنجاب)	امرداس بھاٹیہ	۶	۲۴-۰۰
۱۶۸	خدمت	دی بنڈ۔ سری نگر (کشمیر)	بی۔ این۔ ورل	۴	۲۴-۰۰
۱۶۹	رہنمائے دکن	افضل گنج۔ حیدرآباد دکن (اے۔پی)	سید لطیف الدین	۸	۶۰-۰۰
۱۷۰	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد (اے۔پی)	میر عابد علی خاں	۸	۶۰-۰۰

از :- جناب محمد ابراہیم علی انصاری
ریاستی وزیر طبابت وصحت عامہ

خطبہ صدارت یومِ زورؔ

معزز حاضرین !

دنیا میں بہت سی شخصیتیں ایسی گذری ہیں جو اپنے زمانہ کی مایہ ناز ہستی سمجھی جاتی تھیں اور ان کے کارنامے انہی کے زمانہ تک محدود رہتے تھے ۔ لیکن ایسی ہستیاں بہت کم گذری ہیں جن کے کارنامے ان کے زندگی کے بعد بھی آنے والی نسلوں کیلئے سودمند ثابت ہوں ۔ زورؔ صاحب مرحوم کا شمار انہی چند مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا ہے ۔ اپنی ساری عمر انہوں نے درس و تدریس میں گذاردی اور اردو زبان کو ایسے زمانہ میں جبکہ اس کے زوال کے دن شروع ہو چکے تھے سہارا دیا اور اپنی ہی تصانیف سے اس کو مالا مال کر دیا ۔

اگر میں یہ کہوں کہ اردو زبان کے اور خصوصاً دکنی ادب و ثقافت کے ڈاکٹر زورؔ مرحوم مجدد اعظم تھے تو بیجا نہ ہوگا ۔ اردو زبان کی بقا اور اسکی ترقی کو وہ اپنا مقصد بنائے ہوئے تھے اور اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زورؔ صاحب اردو کے بہت بڑے محسن اور علمبردار تھے ۔ ادارہ ادبیات اردو کا قیام ڈاکٹر زور کا ایک عظیم کارنامہ ہے جو اُس وقت تک انکے نام کو روشن رکھنے کا جب تک کہ اردو زبان زندہ ہے ۔ جس طرح مولوی عبدالحق مرحوم کے نام کے ساتھ ہی انجمن ترقی اردو کا خیال آجاتا ہے بالکل اسی طرح ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا نام بھی ذہن میں آتے ہی فوراً خیال ادارہ ادبیات اردو کی طرف چلا جاتا ہے ۔

اردو کا جو چراغ جامعہ عثمانیہ نے روشن کیا تھا اس کی روشنی کو ڈاکٹر زورؔ نے ادارہ ادبیات اردو کے ذریعہ ملک کے گوشہ گوشہ تک پہنچا دیا ۔ یہ ادارہ یقیناً ڈاکٹر زورؔ مرحوم کا لافانی کارنامہ ہے ۔ مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ جس طرح ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی زندگی میں یہ ادارہ ہندوستان میں لسانی تحقیقات کا ایک اہم مرکز بلکہ اردو ادب کی ترقی اور دکنی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں سرگرم عمل تھا آج بھی اس کی وہی حیثیت قائم ہے اور اس چشمہ علم و ادب سے بے شمار طالبانِ علم فیض یاب ہو رہے ہیں ۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ میر کارواں نہ رہے تو کارروان کا سفر اختتام کو پہونچ جاتا ہے لیکن ڈاکٹر زورؔ نے اپنے اطراف ایسے ساتھیوں کو جمع کر لیا تھا اور اُن میں کام کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ انکے بعد بھی انکے بوئے ہوئے درخت کا

برابر آبیاری ہو رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس ادارہ سے انشاءاللہ اور بھی بہت سے زور پیدا ہو جائینگے۔

ادارہ ادبیات اردو کا کتب خانہ دیکھکر مجھے حیرت ہوئی کہ اس قدر قلیل مدت میں اپنی بہت سی کتابیں کیسے جمع ہو گئیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ہاں کوئی علاءالدین کا چراغ تو نہ تھا؟ سلیمان علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ وہ جنات سے کام لیا کرتے تھے اور ایک عالیشان محل تیار کروائے تھے۔ لیکن ڈاکٹر زور مرحوم کے ہاں جنات کہاں وہ تو انسانوں ہی سے کام لیکر ایک زبردست ادارہ جو ریسرچ کے ہر قسم کے ضروریات سے مزین ہو قائم کئے اور ایک عالیشان عمارت بنوائی۔

یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم ہی کی جد وجہد اور کوششوں کی بدولت ایوان اردو جیسی شاندار عمارت تعمیر ہوئی۔ اس عمارت کے متعلق تو میں یہہ نہیں کہہ سکتا کہ " ایں عمارت تا قیامت پائیدار" بلکہ یہہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ " اسم معمار ایں عمارت تا قیامت زندہ باد"۔ جب بھی اس عمارت کے سامنے سے گذرتا ہوں تو زور صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے آزاد اورینٹیل انسٹی ٹیوٹ کا قیام عمل میں لاکے ایک اور بڑا کام کیا۔ اس انسٹی ٹیوٹ ماہرین علم وفن کی ایک خاصی تعداد تحقیقی کاموں میں نہایت ہی تندہی اور سنعدی سے منہمک ہے۔ عام اردو کے ساتھ ڈاکٹر زور نے دکنی زبان کو اجاگر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور دکنی زبان کی کتابیں جو گولکنڈہ اور بیجاپور کے شاعروں نے تصنیف کی تھی ان کو بھی مرتب کر کے شائع کیا۔

محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کی تدوین جو قدیم دکنی زبان میں ہے ڈاکٹر زور کا زبردست کارنامہ ہے اس کے علاوہ حیات سلطان محمد قلی قطب شاہ لکھکر زور صاحب نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف ایک ادیب اور نقاد ہی نہیں بلکہ ایک بلند پایہ مورخ اور سوانح نگار بھی تھے اسی بادشاہ کی عظمت اور اس کے کارناموں سے متاثر ہو کر ہی شاہد زور صاحب نے یوم قلی قطب شاہ کی بنا ڈالی اور آج اس یوم قلی قطب شاہ کو اس قدر مقبولیت حاصل ہو گئی ہے کہ بقول شخصے یہ اب حیدرآباد کا قومی تہوار سمجھا جا رہا ہے جس میں بلا امتیاز مذہب و ملت شہر کے باشندے شریک ہو کر بانی شہر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

غرض کہ زور صاحب مرحوم گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ ایک اچھے نقاد۔ مورخ۔ ماہر لسانیات۔ سوانح نگار۔ شاعر سب کچھ تھے اور ساتھ ہی ساتھ ہر دلعزیز اور بہت ہی ملنسار شخص تھے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اردو زبان کی خدمت جس قدر ڈاکٹر زور مرحوم نے انجام دی اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ سچ تو یہہ ہے کہ وہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے حقیقی جانشین تھے اور اردو زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کی سالانہ رپورٹ بابتہ ۱۹۶۷ء میری نظر سے گذری جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ ادارہ روز افزوں ترقی پذیر ہے اور ڈاکٹر زور مرحوم نے جسکی داغ بیل ڈالی تھی وہ کھیتی ہری بھری۔ سرسبز و شاداب نظر آرہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کی یاد کو تازہ رکھنے کیلئے اس سے بہتر کوئی اور کام نہیں ہو سکتا۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو انکے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین) (بقیہ آئندہ)

صدارتی تقریر مشاعرہ یوم زور

— از جناب سری کرشن سہتا (آئی۔ اے۔ ایس) —

دکن زور کے بغیر اور زور دکن کے بغیر دو ادھوری باتیں ہیں، نا تمام کہانیاں۔ زور کو دکن سے جو والہانہ محبت تھی
اُس کی مثال کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ سرزمین دکن نے بہت سے اچھے اور باکمال سپوتوں کو پیدا کیا لیکن جس قسم کی
وابستگی ڈاکٹر زور کو دکن سے تھی وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ دکن سے محبت ہر دکنی کو ہے۔ لیکن زور صاحب
کی محبت میں گرمی، ولولہ اور عقیدت مندی تھی۔ محض یہی ایک جذبہ تھا جس کے تحت انہوں نے ادارہ ادبیات
اردو کو قایم کیا اور دکنی تاریخ و ادب پر بہت اونچے درجہ کا ریسرچ کروایا۔ ادارہ ادبیات اردو کی کم عمری کے باوجود
جتنی کتابیں اُن کے قلیل اور محدود زمانے میں شائع ہوئیں اس کی مثال اداروں کی زندگی میں کم ملتی ہے۔
افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زور صاحب کے بعد اس ادارہ میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے کہ اس کو پُر کرنا
دشوار نظر آرہا ہے۔ زور صاحب نے علم و ادب کی ایک بارات رچائی۔ کتابیں 'سب رس' ایوان اردو' اردو
امتحانات نے اس بارات کی سج دھج میں اضافہ کیا اور اردو ادب کی تنگ و تاریک دنیا میں روشنی پیدا کی۔
زور سے فنکار کے پکارا اور دکن کی بستیاں یک بیک جاگ اٹھیں۔ علم و ادب کا ایک شہر بن گیا۔ اور اس
شہر کے ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ زور صاحب روشنی کا مینار تھے۔ جو نصب العین انہوں نے اپنے سے
مقرر کر لیا تھا۔ اس کا پرچار یوں کیا ؎

یوں تو کرنے کو بہت کام ہیں لیکن اے زور
کام آتا ہے ہنر کوئی نہ خدمت کے سوا

اور آج انہی کی دی ہوئی جھلملاتی ہوئی روشنی کے تین دکن میں علم و ادب پل رہا ہے۔

آج کا دن سوگ کا ہے اور خوشی کا بھی۔ سوگ کے وقت کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں کہ ان کا
نعم البدل پیدا نہ ہو سکا۔ اور خوشی اس بات کی ہے کہ دکنیوں نے آج یوم زور کو منا کر اپنی ہوشمندی اور احسان مندی کا
ثبوت دیا

———

مشاعرہ یوم زورؔ کے اقتباسات

ذیل میں طرحی مشاعرہ یوم زورؔ میں حصہ لینے والے شعراء صاحبان کی غزلوں کا اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ طرحی دور کا آغاز ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی غزل سے ہوا، جسے وقار خلیل معتمد مشاعرہ نے سنائی۔ جن شعراء نے ہماری متواتر درخواست پر اس مشاعرہ میں سنایا گیا کلام اشاعت کے لئے نہیں بھجوایا وہ شامل نہ ہو سکا، جس کا ہمیں افسوس ہے، حصہ دوم میں طرح میں فرستادہ شعراء کے اشعار ہیں، جو کسی وجہ سے مشاعرہ میں تشریف نہ لاسکے۔ مشاعرہ یوم زورؔ کے موقع پر شعراء صاحبان نے حیدرآباد کی ادبی، تہذیبی اور سماجی پس منظر کے آئینہ میں نظمیں بھی سنائیں اور داد تحسین حاصل کی یہ نظمیں سب رس کی آئندہ اشاعتوں میں شائع کی جارہی ہیں (وقار خلیل)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ :—

ٹوٹیں جو روز سر پہ بلائیں تو کیا کریں
وہ بھی ہنسا ہنسا کے رلائیں تو کیا کریں

ہردم نئے نئے یہ دکھاتی ہے شعبدے
ہستی کا پھر فریب نہ کھائیں تو کیا کریں

اچھا ہے آپ ہم سے کریں عہدِ سرخوشی
لیکن اگر نہ اس کو نبھائیں تو کیا کریں

جی جی کے انتظار میں مرتے رہے ہیں ہم
آخر وہ آتے آتے نہ آئیں تو کیا کریں

نواب میر یٰسین علی خاں یٰسینؔ :—

کچھ لوگ تیرے خون کے پیاسے تو ہیں مگر
ایک بوند بھی لہو کی نہ پائیں تو کیا کریں

ریورنڈ ہنیسن ریحانی :—

جب کوئی معتبر نہیں راہِ حیات میں
اپنی صلیب خود نہ اٹھائیں تو کیا کریں

ہم کو گلہ نہیں ہے جفاؤں کا آپ سے
اپنی وفائیں راس نہ آئیں تو کیا کریں

ریحانی فصلِ گل سے جنھیں واسطہ نہیں
پیغامِ فصلِ گل وہ سنائیں تو کیا کریں

حسن فرخ :—

ایسی عبادت کی ہوں ادائیں تو کیا کریں
صدیوں کا بوجھ لمحے اٹھائیں تو کیا کریں

مانگے ہے تشنگی کسی شعلہ بدن کا جسم
سورج کو گر گلے نہ لگائیں تو کیا کریں

اک دائرے پہ ختم مگر سوچ سے طویل
ہوں زندگی کی ساری ادائیں تو کیا کریں

رؤف خلش :۔

آہوں، کالمس، کرب کی لذت، بدن کی پیاس
زخموں کی رُت میں گھاؤ نہ کھائیں تو کیا کریں

غیاث متین :۔

جو آسماں پہ ہے وہی نقش ریت پر
اہلِ خرد فریب نہ کھائیں تو کیا کریں
اندھی ہے رہگزار، فضا گونگ، دل خموش
اپنے لہو کو ہم نہ جلائیں تو کیا کریں

ناز حیدر :۔

ہر درد زجنیتیں ہی بنیں اور رمیت گئیں
ایسے میں اپنا غم نہ بھلائیں تو کیا کریں
اے ناز جب زمانہ ہی بےنبض بن گیا
خاموش زندگی نہ بتائیں تو کیا کریں

ثریا مہر :۔

جب ہم قریب آئے کنارے ہی مٹ گئے
اب پھر بھنور میں ڈوب نہ جائیں تو کیا کریں
ویسے تو دل کا کچھ بھی ارادہ نہ تھا مگر
گستاخ ہو گئی تھیں نگاہیں تو کیا کریں

ڈاکٹر اسد انصاری :۔

واقف ہیں قدر و قیمتِ لعل و گہر سے ہم
دامن میں اشکِ غم نہ چھپائیں تو کیا کریں
ہے ذرہ ذرہ مظہرِ نیرنگیٔ جمال
دانستہ ہم فریب نہ کھائیں تو کیا کریں

رووف خیر :۔

ہم تو یہ چاہتے تھے کہ رسوا نہ ہو کوئی
احباب جشنِ زخم منائیں تو کیا کریں
پیاسے ہی لوٹ آئے سمندر کو چھوڑ کر
صحرا تری نظر کے بلائیں تو کیا کریں
ہم خیر چُھپ گئے پسِ دیوارِ آئینہ
بے وجہ لوگ منہ جو چڑائیں تو کیا کریں

جلیل ہمنا بادی :۔

جس سمت سے خلوص کی کلیاں نصیب ہوں
اُس سمت بھی نہ ہاتھ بڑھائیں تو کیا کریں
چہرے حقیقتوں کے ہیں پیلے پڑے ہوئے
حق گوئی پہ بھی آنچ نہ آئیں تو کیا کریں

فراست حسین فراست :۔

خلوت ہے، وہ ہیں، اور شبِ ماہتاب ہے
احوالِ واقعی نہ سنائیں تو کیا کریں
اُس بے وفا پہ جان بھی دینے کے باوجود
ٹھکرا کے جائیں اپنی وفائیں تو کیا کریں

یوسف قادری: ــــــ

لفظوں کی شاہراہ سے تخلیق گھر تلک — یادیں تمہاری ذہن پہ چھائیں تو کیا کریں

احمد اللہ حسینی احمدؔ: ــــــ

دُنیا اگر نظر سے گرائے تو غم نہیں — اپنی نظر سے وہ بھی گرائیں تو کیا کریں
احمدؔ ہیں ہم تو ہم قدم اہلِ کارواں — جب راہبر ہی فتنے اٹھائیں تو کیا کریں

حیرتؔ بدایونی: ــــــ

اُتریں جب آسماں سے بلائیں تو کیا کریں — فتنے زمیں پہ ہم نہ اُٹھائیں تو کیا کریں
جمہوریت میں ہو گئے آزاد راہزن — راہرو بھی انقلاب نہ لائیں تو کیا کریں
حیرتؔ، جدیدیوں کے کسی اجتماع میں — جائیں تو کیا سنائیں، نہ جائیں تو کیا کریں

مسعود عابدؔ: ــــــ

پتھر بنا ہے شہر کا ایک ایک آدمی — ہم پتھروں کو پوج نہ پائیں تو کیا کریں
لمحہ یہ لمحہ کٹتی ہے اظہار کی زباں — خوابوں کی فصل گر نہ اُگائیں تو کیا کریں
گلیوں کے موڑ، ادھ کھلے دروازے، کھڑکیاں — بیتی کہانی ہمکو سنائیں تو کیا کریں

اشرف رفیع: ــــــ

گھبرا گیا ہے یاس کی تاریکیوں سے دل — اُمید کے دیئے نہ جلائیں تو کیا کریں
وہ ہر طرف ہیں سمت کی کچھ قید ہی نہیں — دیر و حرم بھی سر کو جھکائیں تو کیا کریں
اشرفؔ کرتھا عمل سے زیادہ کرم پہ ناز — کام آ گئی ہیں اُس کی عطائیں تو کیا کریں

اسحٰق ملک: ــــــ

شرحِ جفا سے باز نہ آیا کوئی ملکؔ — ناکام ہیں ہماری وفائیں تو کیا کریں

اِدارہ ادبیات اُردو حیدرآباد (اے پی)

تختۂ آمد من ابتدا یکم اپریل سنہ ۱۹۶۷ء لغایتہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۸ء

تفصیل ابواب جمع	روپے	پیسے	روپے	پیسے
از سلک اِفتتاحی رقوم نقد و بنکس				
الف۔ نقد رقم	3038	91		
ب۔ رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	7617	41		
ج۔۔ اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ کنرا بنک لمیٹیڈ حیدرآباد				
ادارہ اکاؤنٹ (۱) 191 = 03				
سب رس اکاونٹ (۲) 420 = 21	611	94		
د۔ کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک ضم شدہ بہ کنرا بنک لمیٹیڈ۔	158	90		
ھ۔ فکسڈ ڈپازٹ بہ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	6076	03	17502	49
از۔ فروخت مطبوعات ادارہ			1807	59
۔۔ ماہنامہ سب رس				
(۱) زر سالانہ	274	95		
(۲) فروخت قدیم شمارے و نمونہ کے پرچے	6	00	280	95
۔ کارب بلغ			107	15
۔ امداد لوکل لائبریری اتھارٹی سکندرآباد و حیدرآباد			386	00
اُردو امتحانات اکاونٹ				
فیس امتحانات، فیس میمورنڈم و عارضی صداقت نامہ جات، فروخت فارم شرکت، قواعد و ضوابط و پرچہ جات سوالات امتحانات۔			3,146	30

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد (اے پی)

تخمینۂ آمد من ابتدا یکم اپریل ۱۹۶۷ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء

تفصیل ابواب جمع	روپے	پیسے	روپے	پیسے
از ۔ عطیات				
الف ۔ برائے علمی وادبی مصروفیات	1,000	00		
ب ۔ برائے تنصیب مائیکروفون ایوان اُردو	300	00		
ج ۔ برائے صد سالہ تقاریب مرزا غالب	101	00		
د ۔ محمد قلی قطب شاہ	51	00	1,452	00
از ۔ منافع بنک اکاونٹس				
(۱) فکسڈ ڈپازٹ	403	16		
(۲) سیونگس بنک اکاونٹ کنرا بنک				
7=50 ادارہ اکاونٹ (الف)				
16=75 سب رس اکاونٹ (ب)	24	25	427	41
آمدنی متفرق				
الف ۔ آمدنی از ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ۔				
(۱) بابتہ کرایہ 1,400=00				
(۲) بابتہ صرفہ بجلی 70=00				
(۳) بابتہ ٹیلیفون چارجز 473=17	1,943	17		
ب ۔ بابتہ کرایہ مہمان خانہ وغیرہ	92	00		
ج ۔ جرمانے	4	00		
د ۔ ٹیلیفون کالس	1	20	2040	37
از ۔ اڈوانس رقوم جو واپس لی گئیں			800	00
۱ ۔ اڈوانس (عملہ) وصول بہ اقساط			60	00
میزان			28,010	26

شہادت دستخط چارٹرڈ اکاونٹس

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے پی)

تخمینہ خرچ من ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۷ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء

تفصیل ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
برائے اخراجات اشاعت مطبوعات برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ			925	90
برائے ادائی معاوضہ مصنفین			670	00
برائے اخراجات اشاعت ماہنامہ سب رس				
الف۔ اخراجات طباعت بشمول قیمت کاغذ	1,647	06		
ب۔ اخراجات ڈاک و متفرق	109	97	1,757	03
برائے ادائی محصول سالانہ کار و باغ			22	50
برائے اخراجات امتحانات اردو			2,339	49
برائے اخراجات کتب خانۂ ادارہ				
(۱) قیمت برقی پنکھا چھت برائے کتب خانہ	265	00		
(۲) تنخواہ لائبریرین صاحب	1,200	00		
(۳) مصارف جلد بندی	100	00		
(۴) صادر و متفرق	28	00	1,593	00
برائے اخراجات میوزیم سوائے تیاری شوکیس و تنظیم جدید			۱،۰۰۹	54
برائے اخراجات علمی و ثقافتی مصروفیات و کیٹیاں و تقاریب				
(۱) صد سالہ تقریب مرزا غالب کے ابتدائی مصارف	10	45		
(۲) یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقریب	1,292	72		
(۳) یوم ڈاکٹر زور	290	21		
(۴) علمی و ثقافتی مصروفیات و تقاریب	101	63		
(۵) مصارف تقریب تشریف آوری صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین۔	613	48	2,308	49

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے پی)

تختہ خرچ من ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۷ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء

تفصیل ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
برائے اخراجات دفتر ادارہ				
(۱) عملۂ دفتر کی تنخواہیں	4,320	00		
(۲) ٹیلیفون، و بجلی و پانی	1,025	05		
(۳) صادرہ و طباعت و ڈاک خرچ	284	41		
(۴) متفرق اخراجات	112	89		
(۵) آڈٹ فیس	100	00		
(۶) اخراجات تعمیر و ترمیم	14	41		
(۷) بنک چارجز		80	5,857	56
اخراجات برائے قرض بہ عملۂ دفتر			200	00
سلک اختتامی نقد و بنکس				
الف - نقد	3,568	76		
ب - کرنٹ اکاونٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	504	41		
ج - اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ کنرا بنک حیدرآباد				
(۱) ادارہ اکاونٹ 198=53				
(۲) سب رس اکاونٹ 561=70	760	23		
د - کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ ضم شدہ بہ کنرا بنک لمیٹڈ - جس کو ادارہ واپس نہیں لے سکتا۔	34	16		
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	6,479	19	11,346	75
صدر میزان			28,010	26

شرح دستخط معتمد عمومی ادارہ — ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ

شرح دستخط اکاونٹنٹ دفتر ادارہ — محمد جمال الدین

ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد (اے پی)

تختۂ آمد من ابتدائے یکم اپریل سنہ ۱۹۶۸ء لغایتہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء

ابواب آمدنی	روپے	پیسے	روپے	پیسے
آمدنی از اردو امتحانات ادارہ فیس و دیگر مدات۔			3,660	85
" " عطایا برائے خریدی مائیکروفون۔	568	50		
" " " " یوم قلی قطب شاہ۔	50	-	618	50
" " منافع سیونگ بنک اکاؤنٹ ادارہ	4	75		
" " " " " " سب رس	13	25	18	-
100 = 00 از ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ بابتہ کرایہ مکان				
35 = 00 " " " " " " صرفہ بجلی				
240 = 75 " " " " " " ٹیلیفون	1,375	75		
آمدنی از متفرق مدات فون کالس و جرمانے وغیرہ	26	39	1,402	14
ادائی پیشگی عملہ دفتر (وصول شدہ اقساط قرضہ)			180	-
صدر میزان			33,293	39

مقام حیدرآباد (اے-پی)

مورخہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء

شرح دستخط (سید غلام دستگیر) چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ

ایس، جی، دستگیر اینڈ کو

اِدارہ ادبیات اُردو حیدرآباد (اے پی)

تختہ آمد من ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۸ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء

ابواب آمدنی	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک اِفتتاحی				
الف - نقد رقوم	3,568	76		
ب - رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	504	41		
ج - اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ کنزا بنک لمیٹڈ حیدرآباد 53 = 198				
د - سب رس .... 70 - 561	760	23		
ھ - کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ (در کنزا بنک)	34	16		
و - فکسڈ ڈپازٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد	6,479	19	11,346	75
اِمداد از حکومت ہائے ہند و آندھرا پردیش				
الف - از حکومت ہند برائے ۶۹-۱۹۶۸ء	2,000	-		
ب - از حکومت آندھرا پردیش				
400=00 روپے برائے ۶۸-۱۹۶۷ء				
400=00 روپے برائے ۶۹-۱۹۶۸ء				
450=00 برائے تقاریب یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۶۸ء	11,250	-	-	
ج - امداد از میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد برائے کتب خانہ و دارالمطالعہ ۶۸-۱۹۶۷ء	150	-	13,400	
آمدنی از فروخت مطبوعات			1,985	9
از سب رس ماہنامہ زر سالانہ	555	63		
از فروخت قدیم شمارہ جات سب رس	18	45	574	0
از کارب باغ			107	11

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (اے پی)

تختہ خرچ من ابتدائے یکم اپریل سنہ ۱۹۶۸ء لغایتہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء

ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
اخراجات دفتر				
تنخواہ عملۂ دفتر۔	4,565	-		
ٹیلیفون، بجلی، پانی۔	933	80		
متفرق اخراجات	212	87		
صادر، طباعت و ڈاک خرچ	70	87		
اجرت ٹائپ	284	61		
آڈٹ فیس	100	-		
داغ دوزی و مرمت	41	88		
بنک چارجز و کمیشن	13	35	6,322	38
پیشگی برائے عملہ دفتر			100	-
سلک اختتامی نقد و بنک				
الف - نقد رقم	4,764	14		
ب - نقد رقم در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد کرنٹ اکاونٹ صدر دفتر	6,262	10		
ج - اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ (در کنرا بنک)				
الف - ادارہ اکاونٹ 27 = 78 P				
ب - سب رس ، 144 = 83 P	172	61		
د - کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک ضم شدہ بر کنرا بنک لمیٹیڈ	34	16		
ہ - فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر	6,479	19	17,712	20
صدر میزان			33,293	39

[illegible]

ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد (اے پی)

تختہ خرچ من ابتدائے یکم اپریل ۱۹۶۸ء لغایتہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۹ء

ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
اخراجات مطبوعات				
اخراجات اشاعت و خریدی کتب برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ			352	30
معاوضۂ مصنّفین			550	-
اخراجات اشاعت ماہنامہ سب رس طباعت و قیمت کاغذ	1,598	46		
اخراجات ڈاک و متفرق	172	04	1,770	50
ادائی محصول کاروباغ			22	49
اخراجات اردو امتحانات			3,314	23
اخراجات کتب خانہ				
خریدی فرنیچر	441	60		
صادرہ و متفرق	1	25		
تنخواہ عملۂ کتب خانہ	1,200	-	1,642	85
اخراجات میوزیم			21	80
عطیات برائے کمیٹی مرزا غالب (صد سالہ تقاریب)			200	-
علمی و ثقافتی مصروفیات و تقاریب				
یوم محمد قلی قطب شاہ	912	70		
یوم زور	266	77		
علمی و ثقافتی مصروفیات	89	42		
کمیٹیوں کے اخراجات	15	75	1,284	64

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو

صدورِ ادارہ

نواب سر مہدی یار جنگ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء

نواب لیاقت جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر سیّد علی اکبر ۱۹۶۱ء

نائب صدورِ ادارہ

نواب لیاقت جنگ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۷ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء

پروفیسر سیّد علی اکبر ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹۵۸ء

سیّد دلدار حسین ۱۹۶۱ء

رائے جانکی پرشاد ۱۹۶۲ء

محترمہ تہنیت النساء بیگم زورؔ ۱۹۶۶ء

لکشمی نارائن گپتا } ۱۹۶۹ء
محامد علی عبّاسی }

مجلسِ امنا

۱- پروفیسر سیّد علی اکبر (صدر)

۲- لکشمی نارائن گپتا (نائب صدر)

۳- سیّد دلدار حسین

۴- نواب عنایت جنگ

۵- رائے جانکی پرشاد

۶- محمد اکبر الدین صدیقی

۷- ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ (معتمد عمومی)

مجلسِ انتظامی بہ شمول مجلسِ امنا

۸- محامد علی عباسی (نائب صدر)

۹- بیگم صاحبہ ڈاکٹر زورؔ

۱۰- سید تقی الدین صاحب قادری

۱۱- ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں

۱۲- میر حسن

۱۳- عارف الدین حسن

۱۴- میر سراج الدین علی خاں

۱۵- رمن راج سکسینہ ایڈوکیٹ (نائب معتمد)

اِدارہ کی ذیلی مجالس

۱- مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

۲- مجلس تعلیم بالغان و اردو امتحانات

۳- مجلس انتظامی "سب رس"

۴- مجلس نشر و اشاعت

۵- مجلس انتظامی کتب خانہ

۶- مجلس ادب اطفال

۷- مجلس انتظامی اردو انسائیکلوپیڈیا

عملۂ دفتر

میر سراج الدین علی خاں - آفس سکریٹری

محمد جمال الدین - منتظم ادارہ

ترصیص الدین انصاری - لائبریرین

وقار خلیل - منتظم سب رس و دارالمطالعہ

محمد نذیر الدین - کارپرداز

محمد عبداللہ - چوکیدار

نتائج اُردو امتحانات ادارۂ ادبیات اُردو
منعقدۂ ۲۹، ۳۰، ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء

اُردو فاضل

مرکز چک بالاپور (بنگلور)

درجہ دوم: ۸۔ قمر النسا ۹۔ امۃ الرفیع

درجہ سوم: ۱۔ شتاق احمد خاں۔

۲۔ الیس عبدالرشید

۳۔ کے اقبال احمد شریف

۴۔ سید نور اللہ

اُردو عالم

درجہ اول: —

مرکز مدراس۔ ۳۷۱۔ عرفان اللہ

مرکز اورنگ آباد۔ ۳۔ عتیق الدین صدیقی

مرکز کریم نگر۔ ۱۸۲۔ وقار النسا بیگم

مرکز اورنگ آباد (درجہ دوم)

۱۔ محمد اسحق حسین۔ ۲۔ خواجہ رئیس الدین صدیقی

۴۔ شتاق احمد صدیقی۔ ۷۔ نسیم احمد خاں۔ ۹۔ محمد شفیع

۱۰۔ شیخ حبیب۔ ۱۱۔ خواجہ وحید الدین۔ ۱۲۔ محمد عبدالمجید

۲۰۔ شاہدہ بیگم۔ ۲۱۔ نسیم النسا صدیقی۔

۲۳۔ عابدہ بیگم۔ ۲۴۔ عطیہ سلطانہ ہاشمی

۲۵۔ صقیفہ سلطانہ ہاشمی۔ ۲۶۔ قدسیہ بیگم

درجہ سوم: — ۶۔ غلام معین الدین خاں

۱۴۔ محمد عزیز اللہ۔ ۱۷۔ مظفر علی خاں۔

۲۲۔ تمیز النسا بیگم۔

مرکز حیدرآباد (درجہ دوم)

۳۱۔ مرزا انور بیگ۔ ۳۱۔ غنی شہبانہ

۵۱۔ محمد اقبال احمد۔ ۵۳۔ محمد نور الدین پرویز

۳۶۵۔ شیخ محمد غوث۔ ۳۶۷۔ محمد عثمان صدیقی

۳۸۲۔ محمد عبدالکریم خاں۔ ۳۸۳۔ محمد مقصود احمد۔

۳۹۱۔ سید امجد علی۔ ۳۹۲۔ عوض بن صالح

۶۲۔ صبیحہ فاطمی۔ ۶۳۔ عتیق فاطمی۔

۶۸۔ راشدہ رخسانہ۔

درجہ سوم: ۲۸۔ محمد آصف علی خاں۔

۲۹۔ محمد حسن خاں۔ ۳۲۔ قاضی سید عطاء اللہ

۳۴۔ محمد سراج اللہ خاں۔ ۳۵۔ محمد محبوب علی

۳۶۔ محمد عبدالحمید خاں۔ ۴۰۔ محرم جلیس نامری

۴۱۔ ابوالفضل افتخار الدین۔ ۴۲۔ سید اسد اللہ قادری

۴۴۔ محمد لئیق اختر۔ ۴۶۔ امجد علی۔ ۵۰۔ محمد عثمان قریشی

۵۲۔ میر واجد علی۔ ۵۴۔ غلام غوث خاں۔

۵۵۔ محمد مجاہد شریف۔ ۵۶۔ محمد عبدالعلی۔

۵۷۔ حافظ محمد عبدالحلیم۔ ۳۶۳۔ سید سراج الدین احمد حسینی

۳۶۴۔ حافظ سید محمد داؤد شاہ۔ ۳۶۸۔

محمد قمر الدین۔ ۶۴۔ راشدہ فرزانہ۔ ۶۵۔

حبیب النساء بیگم۔ ۶۷۔ نیر سلطانہ۔ ۷۱۔

خورشید سلطانہ۔ ۷۴۔ رفعت ناہید۔ ۳۸۰۔

سیدہ زینب النساء۔ ۳۸۹۔ واسع النساء۔

۳۹۳۔ زینب بیگم۔

مرکز بنگلور (درجہ دوم)

۳۸۰۔ آمنہ بی۔

درجہ سوم: — ۳۷۸۔ کے محبوب النساء

۳۸۱۔ نازنا نوری۔

مرکز جالنہ (درجہ دوم)

۸۱۔ محمد حفیظ اللہ خاں۔ ۸۳۔ محمد عبدالباری

۸۴۔ شیخ عبداللہ۔ ۸۵۔ سرفراز خاں۔

۸۷۔ مسعود احمد۔ ۸۸۔ عبدالستار خاں۔

۸۹۔ سعید النساء بیگم۔

مرکز جالنہ (درجہ سوم) ۸۹-کبیر احمد خاں
۹۰-خورشید جہاں بیگم-۹۱-گل بانو-

مرکز سنٹرل جیل حیدرآباد (درجہ دوم)
۹۲-گنیش پرشاد

مرکز چک بالاپور (بنگلور)
درجہ دوم:- ۱۰۰-محمد عطاء اللہ
۱۱۳-شفیق النساء بیگم-
درجہ سوم:- ۹۳-امتیاز احمد خاں
۹۵-مریم الطاف احمد خاں-۹۶-عبدالوہاب
۹۷-عبدالعزیز-۹۸-آر سید محی الدین-۹۹-
مبارک شریف-۱۰۱-اللہ بخش-۱۰۳-صبغۃ اللہ
۱۰۹-شکیلہ بیگم-۱۱۰-انیس عقیلہ بانو-۱۱۱-
انیس جمیلہ بانو-۱۱۲-دلشاد النساء بیگم-۱۱۴-
نازنین بیگم-۱۱۵-انیس شکیلہ بانو-۱۱۶-
تاج النساء-۱۱۷-زاہد النساء

مرکز رائچور (درجہ دوم)
۱۱۸-سید لیلین پیر-۱۲۰-سید عارف اللہ یمنی
۱۲۱-سید عثمان-۱۲۳-سلیم الدین-۱۲۵-
محمد ابراہیم-۱۲۷-سید عطاء اللہ یمنی
درجہ سوم:- ۱۲۴-ظہور احمد
۱۳۰/۸-محمد عبداللطیف ۸/۱۳۰-محمد ضیاء الدین قادری

مرکز شمس آباد (درجہ دوم)
۱۳۸-محمد اعظم خاں-۱۴۰-سید عارف الدین
۱۴۱-محمد غلام رسول-۱۴۲-سید محمود علی-
درجہ سوم:- ۱۳۱-محمد حیدر علی خاں

۱۳۲-محمد ظہیر الدین-۱۳۶-محمد عبدالرزاق
۱۳۷-شیخ علی عباس-۱۳۹-محمد نثار الدین
۱۴۴-کریم النساء بیگم-۱۴۵-محمود النساء بیگم
۱۴۶-رحیم النساء بیگم-

مرکز کاغذ نگر سرپور (درجہ دوم)
۱۴۹-میراں محی الدین-۱۵۱-سردار خاں
۱۵۷-محمد عبدالصابر-۱۶۰-محمد عبدالستار انصاری
درجہ سوم:- ۱۵۲-سلیمان بن سعید
۱۵۳-احمد محی الدین-۱۵۵-محمد اکبر خاں-
۱۶۴-سعیدہ سلطانہ-۱۶۶-زبیدہ نانہ-
۲۸۶-محمد عبدالعزیز-

مرکز کریم نگر (درجہ دوم)
۱۶۸-غلام خواجہ معین الدین-۱۷۱-
سید فاروق حسین-۱۷۳-خواجہ بشیر الدین احمد
۱۷۴-خورشید جہاں-۳۸۴-مرزا اکبر علی بیگ
۳۸۵-محمد فاروق-
درجہ سوم:- ۱۷۵-فرزانہ بیگم-
۱۷۹-افسر جہاں-۱۸۰-حسین زمانہ

مرکز کلواکرتی (ضلع محبوب نگر)
(درجہ دوم)
۱۸۴-محمد فاروق محی الدین-۱۸۷-
میر واحد علی-۱۸۸-سیدہ اقبال سردار
درجہ سوم:- ۱۸۶-میر محبوب علی
۱۸۹-نیر نور جہاں-۱۹۰-رفیق النساء بیگم
۱۹۱-قمر النساء بیگم-۱۹۲-سیدہ حبیب النساء بیگم
۱۹۳-سیدہ حمید النساء بیگم

مرکز مدراس (درجہ دوم)
۱۹۵-فخر الاسلام اعظمی-۱۹۸-اے کے ٹی محمد ذکریا-
۲۰۰-ملک حافظ گلزار احمد باقوی-۲۰۲-
سید محمد اللہ ضیا بختیاری-۲۰۶-کے ممتاز بیگم-
درجہ سوم:- ۱۹۷-سید حمید الدین
۲۰۳-محمد کرامت اللہ-۲۰۵-سید نور الرحمن سلطان
۲۰۸-ایچ عائشہ بیگم-۲۰۹-بی جنا-

مرکز محبوب نگر (درجہ دوم)
۲۱۲-اشفاق حسین-۲۱۴-محمد موسیٰ
۲۱۹-سید ہاشم-۲۲۱-محمد چاند-۲۲۲-
محمد خواجہ معین الدین ہاشمی-۲۲۳-
محمد خواجہ معین الدین-۲۲۵-مرزا عبدالعلیم بیگ
۲۲۶-محمد علیم الدین صدیقی-۲۲۸-
محمد سلطان شاہد-۲۳۰-احمد مختار الدین
۲۳۲-اقبال علی خاں-۲۳۴-سید سرور کریم
۲۳۶-محمد عبداللہ قریشی-۲۳۷-
محمد عبدالجبار-۲۳۸-سید نیاز الدین احمد
۲۴۴-محمد عبداللطیف تاج-۲۴۵-خواجہ
احمد علی-۲۴۷-محمد عبدالعزیز خاں-
۲۵۱-شیخ مشتاق احمد صدیقی-۲۵۳-
نسیم النساء بیگم-۲۵۴-نذیر النساء بیگم
۲۶۰-امۃ العزیز فوزیہ-۲۶۱-
شمیم احمد علی-۲۶۲-حسینہ بیگم
۲۶۶-سودامنی-
درجہ سوم:- ۲۱۶-محمد عبدالبا

۲۱۷-علیم الدین خاں - ۲۲۰-محمد رفیع الدین
۲۲۴-خواجہ معین الدین - ۲۲۷ -
محمد اسمعیل - ۲۲۹-محمد بشیر احمد-۲۳۱-
خواجہ حمید الدین احمد خاں - ۲۳۲ -
خورشید علی - ۲۳۵-محمد صادق-۲۳۹-
محمد حسن - ۲۴۰-محمد عبدالستار-۲۴۲-
خواجہ معین الدین-۲۴۳-نورالدین -
۲۴۶-محمود علی-۲۴۸-محمد لیسین خاں
۲۵۰-سید خواجہ منیر الدین- ۲۵۲-عذرہ سلطانہ
۲۵۹-رضیہ سلطانہ-۲۶۲-سعیدالنسا بیگم
۲۶۴-مجیبہ امین-۲۶۷-تاج النساء
۲۶۸-کے سروجنی بائی۔

مرکز میسور (درجہ دوم)

۲۷۰-وزیر احمد-۲۷۲-فاروق پاشا-
۲۷۷-احمد شریف-۲۸۰-نجم الحسن
۲۸۹-زیتون النسا-۲۹۵-کلیم النساء
۲۹۸-حرمت شاہینہ باقر۔

درجہ سوم :- ۲۷۱-سید شاہ الحمید-
۲۷۴-کے نذیر احمد خاں-۲۷۸-سید
الطاف حسین-۲۸۷-فریدہ بیگم-۲۸۸-
حرمت النساء بیگم-۲۹۲-انیس فاطمہ
۲۹۷-بی بی آمنہ خاتون۔

مرکز نارائن کھیڈ (درجہ دوم)

۳۰۲-محمد اقبال-۳۰۴-سید محی الدین
۳۰۶-میر امجد علی-۳۰۷-ابوالحسن کبیر احمد خاں

درجہ سوم :- ۳۰۳-احمد عبدالعلیم
۳۰۵-غلام حسین-۳۰۸-محمد عبدالحلیم
۳۱۰-محمد ظہور علی-۳۱۱-سید فضل احمد
۳۱۲-شنکر راؤ-۳۹۰-فرزانہ بیگم

مرکز نظام آباد (درجہ دوم)

۳۱۹-سید قمر الدین-۳۲۰-شیخ امیر
۳۲۱-محمد اسمٰعیل عادل رفیقی-۳۲۲-
محمد افضل خاں-۳۲۴-محمد دیانت حسین
۳۲۹-محمد عبدالرب-۳۳۰-عبدالقدیر
۳۳۳-خورشید احمد-۳۴۲-عطیہ شاہین
۳۴۳-نکہت حبیب-۳۴۹-سلیم النسا بیگم
۳۵۰-عابدہ بیگم-۳۵۱-رضیہ رقیہ بیگم
۳۵۲-نفیسہ خاتون۔

درجہ سوم :- ۳۲۳-سید اکرام الدین
۳۲۵-محمد مشتاق احمد-۳۳۱-سید
علیم الدین-۳۳۲-مرزا احمد بیگ۔
۳۳۵-محمد نعیم الدین-۳۳۶-سعیدہ بیگم
۳۴۰-شیخہ عزیزہ بیگم-۳۴۳-قمر النسا بیگم
۳۴۵-نصرت النساء بیگم-۳۴۶-اصغری
بیگم-۳۴۷-ظہور النساء بیگم-۳۴۸-
برکت النساء بیگم۔

مرکز نندیال (درجہ سوم)

۳۵۳-سید نور احمد-۳۵۴-شیخ عبدالخالق
۳۵۵-سید احمد-۳۵۶-حافظ عبدالسلام
۳۵۹-سید منیر پاشا-۳۶۰-محبوب بی بی

اردو زبان دانی

مرکز حیدرآباد :-

درجہ اول

۱-سید میر مجاہد علی-۲-اطہر علی اسد

مرکز جالنہ :-

درجہ دوم

۳-شیخ محبوب

مرکز جونیر سرٹیفیکیٹ اسکول چمپا پیٹھ

درجہ سوم

۸-محمد ابراہیم-۹-سید تجمل حسین

مرکز رائچور :-

درجہ دوم

۱۰-سید رحمت اللہ-۱۲-سید اسحٰق یمنی
۱۳-سید احمد محی الدین یمنی -

درجہ سوم

۱۴-قمر بیگم-۱۶-ریحانہ صدیقہ

مرکز شمس آباد :-

درجہ دوم

۱۸-غلام خواجہ طاہر اللہ خاں-۱۹-طاہر النسا

درجہ سوم

۲۰-امتہ العزیز-۲۱-زیب النساء-
۲۲-امیر النساء

مرکز کاغذ نگر سرپور :-

درجہ سوم : ۲۳-محمد مقصود حسین

درجہ دوم

سردار النساء بیگم

... :—

درجہ اول

... نورہ خاتون

... :—

درجہ سوم

۳۲ - فاطمۃ النساء بیگم

۳۳ - قرۃ العین

... دانی

... :—

... با امتیاز

... اقبال احمد

... احمد — ۱۰۰ -

... احمد — ۱۰۲ -

... ۱۰۱ - ... احمد - ۱۰۴ -

... ۱۰۵ - عبد العزیز

... ۱۰۶ - ... فرزانہ

(کامیاب)

۷ - ... ۸ - محمد خواجہ ... ۹ - ...

۱۱ - مسعود جاوید - ۱۲ - غلام مصطفیٰ - ...

عبد الکریم - ۱۶ - محمد یوسف - ۱۹ - احمد ...

۲۱ - حبیب خاں - ۲۲ - افضل خاں -

۲۳ - عبد الغفار - ۲۴ - محمد غوث

۲۵ - سہیل علی - ۲۶ - عبد الستار -

مرکز سنٹرل جیل حیدر آباد -

(کامیاب)

۲۷ - شیخ فرید - ۲۸ - شاہ ... ۲۹ - سید کریم

۳۰ - ایم نارائنا چاری - ۳۱ - جانی میاں

۳۲ - محمد غوث علی - ۳۳ - عبد العلیم - ۳۴ -

کے یلا ریڈی - ۳۶ - خواجہ حسین - ۳۷ -

... علی - ۴۱ - کشن پرشاد ... - ۴۲ - ...

۴۳ - سید ناظر الدین نظامی - ۴۴ - سید

ناصر الدین نظامی -

مرکز چک بالاپور (منگلور)

(کامیاب)

۴۷ - اخلاص احمد خاں - ...

مرکز کاغذ نگر ...

کامیاب ...

... الدین ...

مرکز گلبرگہ (ضلع ...)

کامیاب با امتیاز

۶۱ - ساجد علی - ۶۲ - محمد ... الدین

۶۴ - شفیق الدین - ۶۵ - ... بیگم

کامیاب

۶۳ - عتیق الدین - ۶۶ - محمد مقصود ...

۶۹ - محمد مصلح الدین - ۷۲ - قمر جہاں

مرکز نارائن کھیڑ —

کامیاب

۷۳ - غلام مصطفیٰ - ۷۴ - بشیر احمد

۷۵ - حسینی ... - ۷۶ - ساجدہ بیگم

۷۷ - شاہدہ بیگم -

مرکز تنڈیال (کامیاب)

۷۸ - عبد الماجد - ۷۹ - عبد ...

۸۰ - سید ... قادری - ...

یادگارِ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۳۳ شمارہ ۹
ستمبر ۱۹۷۰ء

ماہنامہ

سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت
پرنس۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ پرنس راج سکینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ محمد منظور احمد

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے ۱۵ روپے
اشتہاری چار روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے

ہر کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر
ہد علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر
یوانِ اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

ڈاکٹر زور

(۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء)

اور

پروفیسر نجیب اشرف ندوی

(۵ ستمبر ۱۹۶۸ء)

کی

یادیں

ساحل مانکپوری

ڈاکٹر زور (مرحوم) — ایک تاثر

ڈاکٹر زور، اُردو کے مشہور محقق، اُستاد، ممتاز ادیب اور ماہر لسانیات۔ سری نگر ہو یا حیدرآباد۔ ہر جگہ انہوں نے ادبی فضا میں ایک نئی جان ڈالی اور حرکت و عمل کی نئی روح پھونکی۔ حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں نہ صرف انہوں نے خود بہت سی کتابیں لکھیں بلکہ نئے لکھنے والوں سے لکھوا کر شائع کیں۔ انہوں نے دکنی ادب کے متعلق تحقیق و تدقیق کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ پیش کیا۔ اُردو زبان و ادب کے ترویج و اشاعت میں زور صاحب نے جیسی محنت کی اور صعوبتیں اٹھائی ہیں وہ اُن کے بڑپن اور عظمت کی نشاندہی کرتی ہیں۔ دورِ طالب علمی سے ہی اُن میں ذوق جستجو پوری طرح موجود تھا انہوں نے جانے کتنے ادیبوں اور شاعروں کو اجنبیت کے حصار اور گمنامی کے پردے سے باہر نکال کر روشناس کرایا ہے۔ جانے کتنی بھولی بسری یادوں کو حقیقت کا روپ دیکر ان تمام حقائق کو صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے وسیع تجربے حوصلوں کے چراغ روشن کئے۔ اسی چراغ علم و یقین کی روشنی میں بلند حوصلگی کے ساتھ کام کیا۔ نہ صرف خود کام کیا بلکہ کام کرنے والوں کا ایک کاروان تیار کیا۔ ادارہ قائم کیا اور ادارہ کے ساتھ ایک ایسے ادبی میوزیم کی نیو ڈالی جس میں قطب شاہی، عادل شاہی، برید شاہی اور آصف جاہی سلاطین کے فرامین و اسناد، دکن کی خطاطی و مصوری کے نایاب نمونے، نادر و کمیاب مخطوطات پرانے رسائل و اخبار کی فائلیں، یادداشتیں، کتابیں، تصویریں اور ادبی تحریریں قابلِ پرستش بن گئی ہیں۔ اس چار دہائی کے عرصہ میں ۲۵ ہزار کے لگ بھگ مطبوعات اور ۵ ہزار کے قریب مخطوطات کا جو بیش بہا علمی خزانہ فراہم کیا گیا۔ وہ زور صاحب کی گراں قدر خدمات کا ثبوت ہیں" ادارۂ ادبیات اُردو" کو جس طرح علمی و فنی خزانوں سے تابناکی ملی ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر اختر اورینوی صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی رقم طراز ہیں:—

> "ادارۂ ادبیات اُردو ایک قیمتی امانت ہے۔ اس کا وزن، وقار اور اس کا حسن و جمال دل نشین ہے"۔

ایک غیر ملکی اسکالر نے بھی ادارہ کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان لفظوں میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے:—

> "شعراء اور ادبار کی ممتاز تصویریں، مختلف دلچسپ نقشے مخطوطات اور دوسری تاریخی چیزوں کی نمائش وغیرہ یہ سب ڈاکٹر زور اور اُن کے دوستوں

اور شاگردوں کی اُردو سے محبت کے ثبوت ہیں"۔

ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اِن نادر و نایاب تحریروں، بے مثال مخطوطات اور دوسرے علمی شہ پاروں کی تلاش و جستجو میں ایک سچے محب زبان و ادب کی طرح سرگرمی دکھلائی ہے جس کے نتیجہ میں ایسے درِ شہوار سے جان پہچان ہوئی ہے جو گردش زمانہ کے سبب معدوم و مجہول ہو چکے تھے۔ اُن کی اس تلاش و جستجو میں دکنی زبان و ادب کی اتھاہ محبت چھپی ہوئی تھی اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اُن کے دل میں ہی نہیں رگ رگ میں دکنی ثقافت اور اس کی روح کی پاکیزگی اپنا گھر بنا چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں قدیم دکنی مخطوطات کے پڑھنے اور سمجھنے کی پوری صلاحیت موجود تھی اُن کے ذوقِ جستجو اور عملی قوت کے سامنے کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت، خط کی قدامت اور خرابی الفاظ کی باہم پیوستگی، مرکزوں اور شوشوں کی بدمعاملگی رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ دکنی ادب کا مطالعہ، اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا انہیں اِس ثقافتی ورثہ سے غیر معمولی محبت اور پیار تھا۔ زورؔ کی اِس علمی اور تحقیقی خدمات کے سلسلے میں جناب ایل اَین گپتا فرماتے ہیں:۔

"تاریخی اور تحقیقی مواد کی فراہمی کا جو کام زورؔ صاحب نے کیا ہے اس سے کئی نسلیں استفادہ کر کے اُردو، اور اس کے ادب کو مالا مال کر سکتی ہیں"۔

موصوف جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد اُردو کو نئی زندگی دینے میں سب سے آگے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ اِس نئی فضا کی تعمیر و تشکیل میں ادارۂ ادبیات اُردو کا اہم حصّہ ہے۔ جس نے لسانی تحقیقات، دکنی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب کی ترقی میں دوسروں کے ساتھ شانہ بہ شانہ حصّہ لیا ہے اس کی اس بے پناہ صلاحیتوں اور کارگزاریوں میں زورؔ صاحب کی عملی کارکردگی اور بے پناہ خلوص کا رویہ کارفرما ہے۔ اُن کی وفات کے بعد ہم سب کا فریضہ ہے کہ اُن کے مشن کو روز افزوں ترقی دیتے رہیں جیسا کہ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین نے ۱۸ دسمبر ۱۹۶۷ء کو حیدرآباد میں ادارہ ادبیات اُردو کو دیکھنے کے بعد فرمایا تھا۔

"ادارۂ ادبیات اردو میں آج حاضری کا موقع ملا یہاں کا کام اور اہتمام دیکھ کر جی خوش ہو گیا اور اس خوشی کے ساتھ ساتھ مرحوم زورؔ کی یاد بھی برابر آتی رہی یہ بڑا کام کر گئے ہیں لیکن ہر بڑے کام کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے اُسے اور بڑا بنائیں۔ حالی پر امنی کا یہ حق ہے مجھے یقین ہے کہ حق پوری طرح ادا کیا جائے گا"۔

موصوف نے جہاں حیدرآباد میں رہ کر ادارۂ ادبیات اُردو، اُردو مولانا آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۱۔ کرسٹیان وبیم نزال ریسرچ اسکالر اُردو لندن (جرمن)

تقویت بخشی وہیں سری نگر میں اورینٹیل ریسرچ سنٹر، ساہتیہ اکیڈمی اور رسالہ آجکل کے مشاورتی ممبر کی حیثیت سے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے اُنہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ جو آخر عمر تک جاری رہا۔ ان کی اپنی تصانیف کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہوگی اس کے علاوہ بہت سی اہم کتابیں شائع کرائیں۔ اُن کی مشہور کتابوں میں ہندوستانی لسانیات، ہندوستانی صوتیات، کلیات محمد قلی قطب شاہ، ادبی شہ پارے، تذکرۂ مخطوطات، ادارۂ ادبیات اُردو (پانچ جلدوں میں) روحِ تنقید، اردو کے اسالیب بیان، میر محمد مومن، داستانِ ادبِ حیدرآباد وغیرہ خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

موصوف کا پہلا تحقیقی کارنامہ "اُردو شہ پارے" ہے جو ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔ جس سے اُن کے ابتدائی تحقیقی رجحانات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں اُردو ادب کے آغاز سے ولی دکنی کے عہد تک کے شاعروں اور ادیبوں کے شہ پاروں کے انتخابات شامل ہیں۔ اِس کی ترتیب و تدوین میں ملک کے باہر کے کتب خانوں سے مدد لی گئی ہے، اِن میں لندن، آکسفورڈ، کیمبرج، پیرس اور اڈنبرا کے کتب خانے شامل ہیں۔

دوسری کتاب "میر محمد مومن" ہے جس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیراعظم میر محمد مومن کے حالاتِ زندگی اس کے علمی، سوشل اور سیاسی کارناموں کی تفصیلات درج ہیں۔

اِس کے بعد دوسری کتابوں میں ایک اہم تحقیقی کارنامہ ادارۂ ادبیات اُردو کے کتب خانہ کے مخطوطات کی فہرست ہے جو انہوں نے پانچ جلدوں میں ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۹ء کے درمیان شائع کیں۔

مرحوم کی ایک اور اہم کتاب جو دکنی ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہے کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا پانچواں علم دوست بادشاہ تھا جس نے ۱۵۸۰ء سے ۱۶۱۱ء تک حکومت کی۔ سلطان قلی، قطب شاہی بادشاہوں میں بڑے امتیاز کا مالک تھا۔ وہ فنِ تعمیر، خوش نویسی، شعر و ادب، رقص و موسیقی، مصوری اور ان کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ سے انتہائی شوق و ذوق رکھتا تھا۔ اس نے تلنگی، فارسی اور دکنی اُردو میں تقریباً ۵۰ ہزار اشعار کہے ہیں۔ غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند، مرثیہ، رباعی اور دوسری نظمیں کہنے میں اُسے مہارت حاصل تھی۔

اِس کتاب نے زورؔ صاحب کو صرف ایک ادیب اور انشا پرداز ہی نہیں بلکہ مورخ بھی بنا دیا ہے۔ موصوف کو قلی قطب شاہ سے انتہائی عقیدت تھی، اسی عقیدت نے یوم قلی قطب شاہ کی بنا ڈالی اور آج اِس جشن زریں نے ایک میلے اور قومی تہوار کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ اسی کتاب کے ساتھ ہی داستانِ ادب حیدرآباد اور حیدرآباد فرخندہ بنیاد شائع کی۔ مرقعِ سخن، تذکرۂ شعرا اور فیضِ سخن، متاعِ سخن اور کیفِ سخن۔ حیدرآباد کے شعراء کے کلام کے انتخابات شائع کئے۔ اِن کتابوں کی اشاعت کا مقصد دکنی زبان کو اُجاگر کرنا، دکنی ثقافت اور اس کی روح کو پیش کرنا تھا اور

ادب کے ذخیروں میں دکنی زبان اور اس کے ورثے کو بہ ہزار احترام و اہمیت کے ساتھ شامل کرانا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ کا یہی نصب العین تھا اور موصوف اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔ انہوں نے دکن کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور اُردو زبان و ادب سے متعلق دکن کی گراں قدر خدمات کا تفصیلی ذکر کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ "دکن کسی سے پیچھے نہیں"۔ پروفیسر حسینی شاہد پرنسپل اُردو کالج نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے۔

"ڈاکٹر زورؔ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے دکن میں شمال والوں کی مرعوبیت پر اُن کی ٹھیکیداری کا قلع قمع کردیا۔"

ان مذکورہ کتابوں کے علاوہ اُردو کے اسالیبِ بیان، طلسمِ تقدیر، فنِ انشاء پردازی، ادبی تحریریں تذکرہ نوادر ایوانِ اُردو، شادؔ و اقبالؔ، سیر گولکنڈہ، طالب و موہنی، قطب شاہی سلطنتیں اور آندھرا سنسکرتی (انگریزی) گارساں دتاسی۔ باغ و بہار، یادگار قلی قطب شاہ وغیرہ جیسی اہم کتابیں تصنیف و تالیف فرمائیں۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ زورؔ صاحب صرف ایک مستند ادیب یا شفیق و مہربان استاد ہی نہ تھے بلکہ اُردو کے بہت بڑے محسن، دوست، رفیق اور ادبی معاملات میں ایک سچے رہنما تھے اُن کی شخصیت میں ایک ایسا جادو تھا جو دوسروں پر دائمی اثر چھوڑ جاتا تھا اُن کے وجود سے ادبی زندگی اور مجالس میں حرکت و عمل کی روشنی پیدا ہوتی تھی۔ انہوں نے دکنی ادب کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ قومی یکجہتی کے لئے گراں قدر کوشش کیں۔ اُن کے اس مشن کو بڑھاتے رہنا ہم آپ سب کا ادبی فریضہ ہے۔ دکن ہی نہیں ملک کے گوشہ گوشہ میں اُن کے لافانی کارنامے اُن کی یاد دلاتے رہیں گے جیسا کہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صاحبہ لکھتی ہیں:۔

"جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا لوگ زورؔ صاحب کے لسانیاتی شعور کا لوہا ماننے لگیں گے اور اس علم اولین کی کوششوں کو بھلایا نہ جاسکے گا"

ڈاکٹر صاحب کی وفات کو ۸ سال گذر چکے ہیں۔ اُن کے کارنامے، ان کی انسان دوستی، رواداری اور شخصیت کا نور ہمیشہ دلوں میں باقی رہے گا۔ اُن کے وجود کے گم ہوجانے سے لسانیات کو عظیم نقصان پہونچا ہے۔ ڈاکٹر سینتی کمار چڑجی نے صحیح کہا ہے:۔

ڈاکٹر زورؔ کی وفات سے نہ صرف اُردو زبان کے تحقیقی کام کو نقصان پہونچا ہے بلکہ ہندوستان کی ثقافت کا بھی نقصان ہوا ہے اب ہم سب کا فرض ہے کہ انہوں نے جو چراغ جلایا تھا اُسے اور روشن کریں اور اُن کے نقش قدم پر چل کر دکنی ادب اور دکن کے تمدن کو آگے بڑھائیں"

اب آخر میں وقارؔ خلیل صاحب کا ہم نوا ہو کر کہتا ہوں ؎

ایک پیغام تھا اک نغمۂ سازِ ہستی		خوش درخشید گر شعلۂ مستعجل تھا
اے دکن! وادیٔ کشمیر میں سونے والا		تیری تاریخ تمنا کا دھڑکتا دل تھا
حال و ماضی ہی نہیں بلکہ بہ شکلِ اُردو		زورؔ کے ہاتھ میں آئینہ مستقبل تھا

میر یٰسین علی خاں

ڈاکٹر زور کی ادبی شخصیت

زورؔ صاحب نے ملکی زبان میں تعلیم دینے والی مادرِ علمی یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کی آغوش میں پرورش پانے کا پورا پورا حق ادا کیا۔ اور اپنی زندگی کے ہر مقام سے خواہ وہ علمی اور ادبی ہو یا طبعی اور عملی اپنے دور کے تقاضوں کی بھرپور نمائندگی کی اور اپنی ذاتی جدوجہد کے بل بوتے پر بہت ہی کم عرصے میں اُردو والوں کے احساسِ کمتری کو مٹا کر دکن اور اطراف دکن میں اُردو کیلئے ایسی پاک و صاف اور سازگار فضا کو جنم دیا جو تنومند ہو کر آج بھی سارے ہندوستان میں اُردو کا بہت بڑا سہارا بنی ہوئی ہے۔ اِس میں زورؔ کے اندرون و بیرون ملک کے تعلیمی اعزازات کے علاوہ ان کے ذاتی کردار اور پرخلوص اور نڈر شخصیت کو بھی بہت بڑا دخل تھا۔ مرحوم لڑکپن سے ذکی اور ذہین مشہور تھے اور اس میں ان کی خوش رُوئی و وجاہت اور تہذیبی لطافت نے اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران ہی میں اپنے ملک پہنچکر اُردو زبان کی خدمت کرنے کا جذبہ ان کے دل میں پوری شدت سے بیدار ہو چکا تھا اور وہ وطن پہنچتے ہی نامساعد حالات اور ماحول سے بے پروا ہو کر اپنے خیالات کی عمل آوری میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر ایک علمی انجمن قائم کی جس کا کوئی نام نہ تھا۔ اِس میں یورپ کے چند فارغ التحصیل نوجوان بھی شامل تھے۔ جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ میر خاں۔ طاہر علی خاں مسلم۔ رضی الدین صدیقی۔ میر ولی الدین۔ سیادت علی خاں۔ محمد علی خاں۔ سید محمد۔ عبدالرزاق راشدؔ اور عمر یافعی وغیرہ۔ لیکن اس زمانہ کے اُردو کے اجارہ دار چند مقتدر حضرات کو یہ بات پسند نہ آئی اور انہوں نے صدرالمہام وقت کو یہ باور کرا کر کہ یہ لوگ ریاست کو لے ڈوبیں گے۔ درپردہ اپنے اقتدار کی بقا کے لئے افہام تفہیم کے ذریعہ اس انجمن کو برخواست کرا دیا۔ زورؔ صاحب کی نڈر شخصیت نے اس شکست کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ۱۹۳۱ء میں بڑے شد و مد کے ساتھ ایک بہت بڑے ادارے کے قیام کا اعلان کر دیا۔ جو آج ادارۂ ادبیات اُردو کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔ اِس ادارہ کا مقصد اردو کی خدمت اور اُردو کی ادبی تاریخ اور ہندوستان کی تمدنی اور تہذیبی تاریخ میں دکن کے کارناموں کو اس کا جائز مقام دلانا تھا۔ یہ کام تلاش و تحقیق اور صبر آزما دقتوں کا سامنا کئے بغیر انجام نہ پا سکتا تھا۔ اس کے لئے زورؔ صاحب نے تیز فہم۔ قابل۔ صاحب الرائے۔ جفاکش اور مستقل مزاج حیدرآبادی ادیبوں، سرپرستوں اور دھن کے پکے لکھنے والوں کی ایک ٹولی اپنے گرد جمع کر لی اور کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں اپنے ادارے کا ایک رسالہ "سب رس" کے

نام سے جاری کردیا۔ جو اس کے کارناموں کا یہ بانگ دہل اعلان کرسکتا تھا اور اس طرح ۱۹۶۹ء تک اضلاع اور قصبات میں ادارہ کی سَتر سے زیادہ شاخیں قائم ہوگئیں اور اُردو کے امتحانات کا وسیع پیمانہ پر کام بھی شروع کرایا گیا چنانچہ خود زورؔ صاحب کے الفاظ میں وہ حیدرآباد کے گلی کوچوں سے کل ہند نوعیت کے شاعر افسانہ نگار اور محقق پیدا کرنا چاہتے تھے اور وہ اپنی اس سعی میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ بدلتے ہوئے حالات میں اردو کے بقا و فروغ کی فکر میں وہ ہمیشہ ڈوبے رہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں

"تقسیم اور آزادی کے بعد اُردو والوں کے حالات میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے باعث کام کرنے کے مواقع اور میدان بدل گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھر از سرِ نو جد و جہد شروع کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنی زندگی میں ٹھہراؤ کیسے محسوس کرسکتا ہوں جبکہ طوفان اور ہنگامہ آرائی کے آثار نمایاں ہیں کام کرنے کا تو یہی اصل وقت ہے میں کبھی نا امید نہیں ہو سکتا۔ میں نے بڑے ہی ناموافق ماحول میں ادارہ قایم کیا تھا اور مخالفت اور اختلافات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت زیادہ کام کرتا ہوں جب کسی کی ذات یا کوششوں کو سدِ راہ پاتا ہوں اب اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ چنگاری تعریف و تحسین کی راکھ میں نہ دب جائے۔"

زورؔ صاحب کی ادبی شخصیت کا سب سے زیادہ حسین پہلو یہ تھا کہ وہ کسی قسم کے تعصب کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک خطبہ میں فرماتے ہیں کہ: —

"ایک اور عیب جس نے اس زبان کی تصنیف و تالیف کے راستہ میں شروع ہی سے کانٹے بو رکھے ہیں۔ صُوبہ جاتی تعصب ہے۔ اگرچہ تعصب خواہ وہ کسی قسم کا ہو معیوب ہے لیکن علمی و ادبی فضا میں تو وہ سب سے زیادہ معیوب ہے پہلے پہل تو صرف دِلّی اور لکھنؤ والے ہی اس تفاخر میں مست تھے اور دوسرے صُوبوں کی اُردو کو اُردو ہی نہیں ماننا چاہتے تھے۔ لیکن اب تو اکثر اُردو بولنے والے علاقوں میں تعصب کا بازار گرم ہے۔ چنانچہ بعض صوبوں میں منظم پیش بندی کی جاتی ہے کہ خواہ ذوق و انصاف کا خون ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے علاقہ کے شاعر و ادیب کے مقابلہ میں دوسرے مقام کے صاحبانِ کمال کو ترجیح نہ حاصل ہونے دے' اس رجحان سے اُردو کی ہمہ گیری کو جو نقصان پہنچے گا اور ایک ایسی بھیانک فضا چھا جائیگی جس سے گلو خلاصی مشکل ہو جائیگی جو لوگ دوسروں سے بحث کرتے وقت دعویٰ کرتے ہیں کہ اُردو اہلِ ہند کی ایک مشترکہ میراث ہے

اور اپنی خاص خصوصیات کے باعث ہندوستان کی عام زبان کہلانے کا حق اسکو حاصل ہے۔ انھیں چاہیئے کہ ذرا اپنے دامن کو بھی دیکھیں اور ان اندرونِ خانہ جھگڑوں کو جلد سے جلد محسوس کرکے صوبہ داری تعصبات کا فراخ دلی کے ساتھ سدِباب کریں"۔

زورؔ صاحب کی ادبی شخصیت کی ایک اور مثال پیش ہے۔ وہ فرماتے ہیں: —

"اُردو والوں کو اپنے ملک کی سرکاری زبان ہندی یا اپنے ہمسایوں کی زبان مرہٹی یا گجراتی یا تلگی سیکھنے میں بھی پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ جب ہم نے انگریزی سیکھی تو پھر اپنی ملکی زبانوں کے سیکھنے اور اس میں مشق و مزاولت پیدا کرنے میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ جب اُردو بولنے والے دوسری زبانیں اور ہندی سیکھ کر اس کے رسم الخط میں لکھنا شروع کرینگے۔ تو رفتہ رفتہ اُردو کا اسلوب بیان ہندی پر بھی چھا جائیگا اور اس کو پڑھکر ہندی والے محسوس کریں گے کہ اردو میں جوش لسنگی۔ روانی اور لوچ ہے اِس سے لطف اندوز ہونے کیلئے خود ہم بھی رسم الخط سیکھیں اور اِس طرح مہاتما گاندھی کا وہ منصوبہ پورا ہو گا جس میں انہوں نے ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام ہندوستانی قرار دیا تھا اور اس کو ہندی اور اُردو دونوں رسم الخطوں میں رائج ہونے پر زور دیا تھا"۔

الغرض اس مختصر سی تحریر میں جو میں نے ½ گھنٹے میں لکھ لی ہے چند قیمتی باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو زورؔ صاحب کی شخصیت میں مجھے ہیرا کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آخر میں میں اس ادارے کے تعلق سے یہ عرض کروں گا کہ: —

زورؔ صاحب کو ادارے کے ذرے ذرے سے والہانہ محبت تھی۔ ایوانِ اُردو کا گوشہ گوشہ اور اسکے کام۔ ڈاکٹر صاحب کی چشمِ نگراں کے منت پذیر ہیں اور اس کے ذرہ ذرہ میں زور صاحب مرحوم کے دل کی دھڑکنیں پوشیدہ ہیں جو نسلاً بعد نسلاً عاشقانِ اُردو کے خون کو گرماتی رہنگی

جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کا سرسید کے بغیر' تاریخ شعرائے اُردو کا آزاد کے بغیر' انقلابی شاعری کا حالیؔ۔ ٹیگور اور اقبال کے بغیر اور تحفظ اردو کا تصور مولوی عبدالحق کو علیحدہ کرکے نہیں کیا جاسکتا' اسی طرح دکنی ادب اور اُردو لسانیات اور ادارۂ ادبیات اُردو کی خدمات کا تصور زورؔ صاحب کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

(یوم زورؔ ۱۹۶۸ء کے ادبی اجلاس میں پڑھا گیا)

نجمہ صدیقہ

ڈاکٹر زورؔ اور تاریخ گولکنڈہ

ہندوستان کی سیاسی اور تمدنی تاریخ میں دکن کی اہمیت کچھ ہی کیوں نہ رہی ہو شمالی ہند کے مورخین نے تاریخ دکن کی طرف کبھی خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ قدیم مورخین نے تو کسی نہ کسی حد تک دکن کا حق ادا کیا ہے لیکن یہ زیادہ حیرتناک بات ہے کہ آج کے غیر دکنی مورخین دکن کی تاریخ سے نسبتاً زیادہ بے توجہی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ بات صرف سیاسی تاریخ تک محدود نہیں ہے بلکہ عمرانی، مذہبی اور لسانی یا ادبی کوئی بھی تاریخ ہو اُس میں دکن کو اُس کا اپنا مناسب مقام شاید ہی ملتا ہو۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ دکن اور اُس میں بالخصوص آندھرا پردیش نے ہندوستان کی تاریخ میں ہر زمانے میں اہم رول ادا کیا ہے اور یہ ریاست ہر طرح کے تاریخی مآثر اور مآخذ کا ایسا گنجینہ ہے کہ جس کی ہمسری ہندوستان کی دوسری بہت کم ریاستیں کرسکتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ دکن نے ہر زمانے میں بہت اچھے مورخین بھی پیدا کئے۔

شاہان بہمنیہ سے لیکر شاہان آصفیہ تک ہر زمانے میں دکن کے حکمرانوں نے مورخین کی سرپرستی کی طباطبا نے عہد بہمنیہ میں "برہان مآثر" لکھی اور اس طرح بہمنی اور نظام شاہی تاریخ مدون کی۔ رفیع الدین ابراہیم نے "تذکرۃ الملوک" اور ابراہیم زبیری نے "بساتین السلاطین" لکھکر عادل شاہی تاریخ نویسی کا فرض انجام دیا۔ ملا عبد شیرازی نے "تاریخ سلطان محمد قطب شاہ" نظام الدین شیرازی نے "حدیقۃ السلاطین" قاسم طبسی نے "انشائے قاسم طبسی" اور ملا طاہر وحید نے "منشات طاہر وحید" لکھکر قطب شاہی مملکت جو گویا موجودہ آندھرا پردیش کی ایک قدیم شکل تھی اُس کے بارے میں تاریخی معلومات بہم پہنچائیں۔ عہد آصفیہ کو گردھاری لال احقر، میر عالم، حکیم غلام حسین، لچھمی نارائن شفیق، شاہ تجلی علی سے لیکر محسن الملک، چراغ علی، نجم الغنی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر وی۔ کے باوا جیسے مورخین مل گئے۔

اس کے باوجود دکن کی تاریخ اپنے قدیم اور وسطی ادوار کے لئے مورخین کی طلبگار رہی چنانچہ آندھرا پردیش کے علاقوں کی حد تک تاریخ دکن کے قدیم زمانے کو ڈاکٹر راما راؤ، ڈاکٹر وینکٹ رامیا، ڈاکٹر ستیا راؤ، ڈاکٹر غلام یزدانی جیسے مورخین ملے اور قرون وسطیٰ کے دکن کو پروفیسر ہارون خاں شیروانی، پروفیسر مجید صدیقی جیسے مورخین ملے۔ ان دو مورخوں میں اگرچہ نقاطِ نظر کے اختلافات ہیں پھر بھی انھوں نے قطب شاہی دکن یا قطب شاہی آندھرا پردیش کی

بازیافت میں گرانقدر کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جدید مورخین میں قطب شاہی دور پر مکمل طور پر قلم اٹھانے کی اوّلیت کا سہرا پروفیسر مجید صدیقی کے سر ہے اور کاملیت کا سہرا پروفیسر ہارون خاں شیروانی کے سر۔

ان مورخین نے دکن کی مبسوط تاریخیں لکھیں لیکن نئے دور کے مورخین دکن کی فہرستیں اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ چند اور ایسی شخصیتوں کے نام نہ لیئے جائیں جو اگرچہ پیشہ ور مورخ نہیں تھے لیکن مورخ سے کسی طرح کم بھی نہیں تھے بلکہ ان کے کارنامے قطب شاہی دور کے مؤرخ کے لیئے ۔۔ بہت کچھ مسالہ فراہم کیئے دیتے ہیں۔ ایسی شخصیتوں میں شمس اللہ قادری، ڈاکٹر زورؔ اور نصیرالدین ہاشمی کے نام لیئے جا سکتے ہیں۔ اِن تینوں شخصیتوں نے نہ صرف قطب شاہی دکن کے مختلف مآخذ کا سُراغ لگایا، ان کی تدوین کی بلکہ دکن کی تہذیب اور بالخصوص لسانی تاریخ کے تعلق سے ایک طرزِ فکر بھی پیش کیا جو دکن کی تاریخ کی تدوین اور اس کی تعبیر دونوں میں ممد و معاون ہو سکتا ہے۔

یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ دکن کی تاریخ اور تہذیب کے تعلق سے اس صدی میں جو مکاتیبِ خیال مرتب ہوئے ہیں اُن کا جائزہ لیا جا سکے۔ آج کی گفتگو کو ڈاکٹر زورؔ تک محدود ہونا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ دکن یا قطب شاہی دور کے پیشہ ور سیاسی مورخ نہیں تھے۔ اگرچہ انھوں نے سلاطین قطب شاہیہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن ڈاکٹر زورؔ اس حیثیت سے قطب شاہی دور کے مؤرخ ہیں کہ انھوں نے اِس دور کی لسانی، ادبی اور تہذیبی تاریخ لکھنے میں اہم حصہ ادا کیا ہے بلکہ یہ کہنا۔ بے جا نہ ہوگا کہ ڈاکٹر زورؔ نے عہد قطب شاہی سے روشناس کرانے کے لیئے جو کچھ کیا وہ اپنی کیفیت اور کمیت میں اتنا عظیم اور مکمل کارنامہ ہے کہ اس کی ہمسری کوئی دوسرا تاریخی کارنامہ نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر زورؔ کا کارنامہ ان کی لسانی تحقیقات، شعرائے دکن کے کلام کی تدوین، عہد قطب شاہی کے بعض افراد اور واقعات پر ڈاکٹر زورؔ کی تصنیفات، اُن کا ایوانِ اردو، یوم قلی قطب شاہ اور خود ان کے طرزِ زندگی پر مشتمل تھا اور ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے دکن کی تاریخ پر صرف مواد ہی اکٹھا نہیں کیا ہے بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ان کا ایک لسانی اور تہذیبی نقطۂ نظر تھا اور انھوں نے اپنے کارناموں کے ذریعہ اس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ جہاں تک ڈاکٹر زورؔ کے تاریخی نقطۂ نظر کا سوال ہے اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے دکنی تہذیب اور دکنی لسانیات کی انفرادیت کو محسوس کیا، اُن کے تہذیبی شعور نے ان کے لسانی شعور کو اور اُن کے لسانی شعور نے اُنکے تہذیبی شعور کو تقویت دی اور انھوں نے دکنی اور بالخصوص حیدرآبادی تہذیب کے عناصر کا مناسب تجزیہ کیا اور بڑی کامیابی سے اُس کا تعین کیا۔ بقول ضیاءالدین احمد شکیبؔ :-

"جس چیز کو حیدرآبادی تہذیب کہا جاتا ہے وہ مغل تہذیب سے انحراف اور گولکنڈہ سے وابستگی کے رجحانات پر مشتمل تھی۔"

ڈاکٹر زورؔ نے قطب شاہی تاریخ کا سُراغ لگانے اور اُس کی انفرادیت کو علمی طور پر اجاگر کرنے کی مہم شروع کی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ مہم سائنٹیفک تھی۔ سائنٹیفک اس لحاظ سے کہ ان کی مہم بنیادی طور پر لسانیاتی تھی۔ اب یہ بات محتاجِ صراحت نہیں رہی کہ لسانیات کا تاریخ سے کیا تعلق ہے۔ عصرِ جدید کا مورخ بادشاہوں کے تاریخی واقعات سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا ہے اسے انسانی زندگی کے ارتقائی مطالعہ سے سروکار ہے۔ لہٰذا آج کے زمانے میں تاریخ نویسی کا انحصار کسی قوم کی معاشرتی اور ثقافتی تاریخ' لسانیات' علم الاستخوان' کے آثارِ قدیمہ اور آرکائیوز کے علمی اور ترقی یافتہ مطالعہ اور تحت نئے انکشافات پر منحصر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک پیشہ ور مورخ کے سوا کوئی دوسرا شخص علم کے یہ سارے راستے اختیار نہیں کرسکتا اور آج جبکہ تخصیص کا رجحان دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ مورخ بھی ان ساری زحمتوں میں نہیں جاتا۔ تاہم تاریخ کو تعبیر کرنے کے لئے ایک مورخ ان میں سے کسی ایک خاص شعبہ کا خصوصی مطالعہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ نے لسانیات پر خصوصی توجہ دیکر دکن کے مورخ کے بہت سے مسائل حل کردیئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ماہرین لسانیات کو ڈاکٹر صاحب کے نظریات سے کہیں نہ کہیں حدتک اختلاف ہے لیکن علمی دُنیا میں اختلافِ رائے، تحقیقی خدمات کے وزن و وقار کو متاثر نہیں کرتا۔

ڈاکٹر زورؔ نے ہندوستانی صوتیات یا لسانیات کے تحت اُردو کے تعلق سے جو کچھ تحقیقات کی ہیں اس میدان میں اولیت کا سہرا انہی کے سرجاتا ہے۔ بقول مولوی غلام رسول "ڈاکٹر زورؔ پہلا محسنِ اُردو ہے جس نے لسانیات جیسے جدید علم سے ہمیں روشناس کیا اور اپنی یورپ سے حاصل کردہ لسانیات اور اس کے تجربات کو کتابی شکل میں پیش کرکے کم مایہ زبانِ اُردو کو مالا مال کیا۔ اُس کا یہ ایسا شاندار کارنامہ ہے جو تاریخ ادب اردو میں یادگار رہے گا۔"

ڈاکٹر جیولز بلاک نے ڈاکٹر زورؔ کی لسانی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے "ابھی تک ایسی کتابوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہو۔ ان کی تعداد کو بڑھانے کے لئے ڈاکٹر قادری (زورؔ صاحب مرحوم) کو ایک غیر مطبوعہ کتابچہ کا حوالہ دینا پڑا۔ جو ہندوستان کی زبانوں میں "ہندوستانی" کا تمام دنیا میں مطالعہ ہوتا رہا ہے۔ خاص طور پر یہ بات عجیب ہے کہ اس زبان کا بھی کوئی اس قسم کا جائزہ لیا گیا اکثر و بیشتر تلفظ کے مسائل پر بڑی قابلیت کے ساتھ اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر مجموعی حیثیت سے کام نہیں کیا گیا۔ اور وہ کام ہے جس کی لسانیات کے مطالعہ اور عملی مقاصد کے لئے ضرورت ہے یہ امر قابلِ تحسین ہے کہ اس سلسلے میں سب سے پہلا قدم ایک ہندوستانی اسکالر نے اُٹھایا ہے۔"

ڈاکٹر گیان چند نے ڈاکٹر زورؔ کو اُردو لسانیات کا ابوالآباء قرار دیا ہے اور انکا یہ ادعا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے ہندوستانی صوتیات میں بعض ایسی خدمات انجام دی ہیں خصوصاً ان کی تصنیف کے چوتھے باب میں

بلّ اور نُسر سے متعلق جو بحث ہے کسی دوسرے ماہرین لسانیات نے آج تک انکی تحقیقات پر کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے قلم کو لرزش ہوتی ہے؟

ہندوستانی لسانیات کے ضمن میں ڈاکٹر زور کو دکنی ادبیات کا مطالعہ کرنا پڑا۔ ان کی ابتدائی تلاش وتحقیق کے دور میں دکنی ادب مختلف افراد کے یہاں شہروں اور دیہاتوں میں گمنامی کے عالم میں پڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تک پہنچنے اور ان کے تحفظ کی جیسی کوشش کی ہیں اُس کی داستان تو کوئی اُن کے رفیق قریب ہی مرتب کرسکتے ہیں تاہم اُن کی مدوّنہ کتب اور ادارۂ ادبیات اُردو کے نوادر اس عظیم مہم کے ایک پہلو کی شہادت دیتے ہیں۔

دکنی لسانیات کے مطالعہ نے ڈاکٹر صاحب میں دکنی زبان، اُس کے روزمرہ اور محاورے، علاقائی مصطلحات اور نحوی در وبست کے ساتھ ساتھ اُس کے اِملا اور صوتی اپج اور ان سب کے منجملہ اُس تہذیب کا ایک گہرا شعور چھوڑا ہے جو مورخ کو اسناد اور احکام، فرامین و نوامیس، تذکرے اور وقایع کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتا۔ دراصل قطب شاہی تاریخ تمدن کا یہ وہ گہرا شعور ہے جو زور صاحب نے مورخ کو دیا ہے۔ دکن کا کوئی مورخ ایسا نہیں ملتا جس کو دکنی زبان اور ادبیات اور صوتیات کے تحلیل و تجزیہ پر وہ قدرت حاصل ہو جو ڈاکٹر زورؔ کو تھی۔ اِس میدان میں وہ سارے مورخین کی آج بھی رہنمائی کرتے ہیں اور اس راستے میں انھوں نے بیسیوں شعلیں روشن کردی ہیں۔

دکنی کی زبان اور تہذیب کے تعلق سے ڈاکٹر زورؔ نے تقریباً (۳۰) کتابیں اور (۵۰) مضامین سپردِ قلم کئے ہیں۔

قطب شاہی دور کی تاریخ میں اگر صرف سیاست اور نظم ونسق کے اعتبار سے توجہ دی جائے تو فارسی زبان میں دس پانچ مخطوطوں اور ریاستی دفتر اسناد کے سوڈیڑھ سو فرامین، اسناد اور وقایع کے سوا کچھ مواد نہیں ملتا اور اس مواد سے اُس زمانے کی تہذیب کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوتا یہ ایک واقعہ ہے کہ شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانے میں اگر اصفہان نصفِ جہان تھا تو دوسرا اصفہان اور دوسرا نصفِ جہان حیدرآباد تھا جہاں ایرانی شعراء ادیبوں، امراء اور دیگر پیشہ وروں کی کثیر تعداد آکر سکونت پذیر ہوگئی تھی۔ لیکن ان لوگوں نے یہاں رہکر یا اپنے وطن واپس جاکر جو کچھ سرمایہ شعر وادب پیش کیا ہے اس میں ہندوستانی آب وہوا کو دخل نہیں ہے۔ یہ تہذیب کی ایک ایسی اوپری سطح تھی جو حد درجہ مرصع ہونے کے باوجود دکن کی حقیقی تہذیب کی نمائندگی نہیں کرتی تھی۔ دکن کی حقیقی تہذیب اِس عجمی تہذیب کے ساتھ ساتھ علاقائی لوگوں کے آغوش میں پروان چڑھ رہی تھی اور دکنی ادبیات اسی تہذیب کی دین ہے۔ یہاں ایک بات محلِ نظر ہے کہ فارسی ادبیات اور رسائل کے ذریعہ دکنی تہذیب کا کھوج لگانا زیادہ سائنٹیفک بات نہیں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انصرام گولکنڈہ کے بعد اس تہذیب کا جو شیرازہ

بکھرا یا اس پر جو افتاد پڑی اس کی وجہ سے دکنی تہذیب اور روایات ہیں کتابوں میں اتنی نہیں ملتیں جتنی نسل درنسل زبانی روایات میں ملتی تھیں۔ ایک برطانوی عہدہ دار نے جب ضلع اننت پور کا MANUAL انیسویں صدی کے وسط میں مرتب کیا تو اس بات پر بڑے تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ دو صدیوں کے گذر جانے کے بعد بھی جب وہ "ابوالحسن تاناشاہ" کی گرفتاری کے بارے میں عوام سے گفتگو کرتا ہے تو ان کو بے انتہا جذباتی پاتا ہے یہاں تک ان واقعات پر گفتگو کرتے وقت لوگ آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ گولکنڈہ سے عوام کی جذباتی وابستگی کی یہ کیفیت ڈاکٹر زور نے بھی دیکھی ہے اور عوام کو بھی وہ شدید جذباتی لگاؤ تھا جس کے آغوش میں نسل درنسل گولکنڈہ کی داستانیں چلی آتی تھیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی تصنیفات میں حوالوں کے بجائے ان داستانوں کی کارفرمائی زیادہ ہے۔ حالانکہ بہت سی چیزیں جو ان میں دی گئی ہیں مستند تاریخی کتابوں میں ملتی ہیں اس کے باوجود انھوں نے ماخذ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر "فرخندہ بنیاد حیدرآباد" ہی کو لیجئے اس کے سرورق پر یہ نوٹ دیا گیا ہے :-

"شہر حیدرآباد کے آغاز و ارتقاء اور حیدرآبادی تہذیب و تمدن کے نشو و نما کی داستان جس کو تاریخوں اور نیم تاریخی روایتوں اور افسانوں کی شکل میں اہل حیدرآباد سینہ بسینہ اور سفینہ بسفینہ محفوظ رکھتے آئے ہیں"۔

اور کتاب کے ابواب افسانوی اسلوب کے ہیں۔ اب بھی حیدرآباد کے سن رسیدہ بزرگ اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ جیسی داستانیں اس کتاب میں منقول ہیں وہ اپنے بچپن میں سنتے آئے ہیں نئی نسلیں اگرچہ اب وہ داستانیں نہیں سنتیں لیکن ڈاکٹر زورؔ نے ان سب کو ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے۔

"محمد قلی قطب شاہ" بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے۔ جس میں سیاسی تاریخ سے زیادہ تہذیبی وقائع کو اہمیت دی گئی ہے۔ تاہم بعض اہم سیاسی واقعات کے لئے ان میں دیگر ماٰخذ کے واضح طور پر حوالے دیئے گئے ہیں۔ اسکے باوجود اس میں بہت سی ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی سند یا مخطوطے سے ہم تک نہیں پہنچی ہیں۔ عبدالحلیم شررؔ نے جب "گذشتہ لکھنؤ" لکھی تو سب نے اُسے گذشتہ لکھنؤ کا ایک مستند مرقع مانا۔ ڈاکٹر زورؔ نے کسی ایک شہر نہیں بلکہ پوری ایک مملکت کی تہذیبی داستان کا ریزہ ریزہ اکٹھا کر کے ہمیں اس کے بیسیوں مرقع دیئے۔ ہم اس کی جتنی بھی قدر کر سکیں وہ کم ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی تصنیفات میں قطب شاہی امراء، سفراء اور اہل فن کا تذکرہ جس وضاحت سے ملتا ہے کسی مورخ کے ہاں نہیں ملتا قطب شاہی تہذیب کے نظم و نسق، سیاست، امور خارجہ، مراتب امراء بادشاہوں کے سوانح، رسم و رواج، علوم و فنون، ادبیات، عمارات اور دیگر تہذیبی و تمدنی مظاہر کے تعلق سے ڈاکٹر زورؔ نے ہمیں علم سفینہ بھی دیا ہے۔ اور علم سینہ بھی۔ مستقبل کے مورخین دکن کو ڈاکٹر زورؔ کے یہاں تاریخ دکن کے لئے خبر بھی ملے گی اور نظر بھی۔ ادارۂ ادبیات اردو ڈاکٹر زورؔ صاحب کے تصورات کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ وہ خود ایک تہذیب کا

ڈاکٹر عبدالمنان

(بہ سلسلۂ گذشتہ)

عہد بہمنیہ کا فن تعمیر

(۴) مقابر و سلاطین بہمنیہ کے گنبد

(الف) چوکھنڈی حضرت خلیل بت شکن[1]: احمد شاہ اوّل اور اس کے بیٹے علاؤ الدین احمد شاہ ثانی کو حضرت نعمت اللہ کرمانیؒ اور ان کی اولاد سے بے حد عقیدت تھی۔ احمد شاہ اول کی درخواست پر مرشد کرمان نے اپنے پوتے حضرت نوراللہ کرمانیؒ کو دکن بھیجا۔ حضرت کے انتقال کے بعد آپ کے فرزند حضرت خلیل اللہؒ اور ان کے دو بیٹے حضرت محب اللہؒ اور حضرت حبیب اللہؒ نے بھی کرمان سے ہجرت کر کے بیدر میں مستقل طور پر رہائش اختیار کی۔ حضرت خلیل اللہؒ کا انتقال ۸۶۴ھ میں ہوا۔ علاؤ الدین احمد شاہ ثانی نے آپ کے لئے ایک خوبصورت مقبرہ تعمیر کرایا جہاں آپ، آپ کی اولاد اور مریدین آرام فرما رہے ہیں۔ یہ مقبرہ عرف عام میں چوکھنڈی کے نام سے مشہور ہے۔ چوکھنڈی سے مراد چار درجے والی عمارت ہے چونکہ یہ عمارت اونچی جگہ پر تعمیر کی گئی ہے۔ اوپر پہونچنے کے لیئے چاروں طرف سیڑھیاں بنائی گئی ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ اس پر قبہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر عرف عام میں چوکھنڈی کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقبرے کا طرز تعمیر بحیثیت مجموعی سادہ اور پر اثر ہے یہی سادگی اور پرکاری دکن کا مقبول عام طرز تعمیر ہے۔ خمیدہ کمانوں اور کالے پتھر پر حاشیے کے کام سے ایرانی اثر ظاہر ہوتا ہے۔ عمارت کی پیشانی پر خدا اور رسول کے نام کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام بھی پایا جاتا ہے۔ آرائشی اور تعمیراتی لحاظ سے یہ علاء الدین احمد شاہ ثانی کے مقبرے سے قریبی مشابہت رکھتا ہے۔ عمارت کے باب الداخلہ پر مغیث شیرازی خطاط کا ایک اہم اور خوبصورت کتبہ بھی پایا جاتا ہے۔ کالے پتھر پر قرآن کی تیرھویں پارے کے نیموں رکوع کی ایک آیت کندہ ہے۔ اس پتھر کا چہرہ نازک گلکار ڈیزائن سے آراستہ ہے۔ ڈیزائن کی نفاست اور نزاکت کے علاوہ کتبے کے حروف کی بڑی ساخت فن کے پرستاروں کی نگاہ کو روشنی بخشتی ہے۔ حروف کی لمبائی ۱۵ انچ اور گولائی ایک انچ ہے خطاطی کے فن کا ایسے جلی حروف میں مظاہرہ قابل دید ہے۔ خطاط کا نام مغیث اور اس کے وطن شیراز کی صراحت جنوبی دروازے کے

---

[1] شہر سے سلاطین بہمنیہ کے گنبدوں کو جانے کے راستے پر واقع ہے۔ مقابر کے بیان میں ان کی ترتیب و تسلسل کا خیال رکھا گیا ہے اس لیئے اس کا ذکر سلاطین بہمنیہ کے گنبدوں سے قبل کیا گیا ہے۔

کیجئے سے ہوتی ہے۔ چوکھنڈی اپنے بلند محل وقوع اور تعمیراتی محاسن کے اعتبار سے بیدر کے پہلے درجے کی عمارتوں میں شمار ہوتی ہے جیسا کہ ایک ماہر آثار قدیمہ نے کہا ہے ؎ :-

"...... ITS STATELY ARCHES, NEAT CARVING MAGNIFICIENT CALLIGRAPHY AND TILE WORK SHOW THE HIGH WATER-MARK OF THE 'BAHMANI ARCHITECTURE WHICH WAS PROBABLY REACHED DURING THE REIGN OF ALAUDDIN".

(ب) سلاطین بہمنیہ کے گنبد : یہ گنبد شہر بیدر کے مشرقی سمت ایک میل، ۷ فرلانگ کے فاصلے پر موضع اشٹور (عیش پور) میں واقع ہیں۔ اس مقام پر بہت سے مقابر پائے جاتے ہیں جن میں حسب ذیل مشہور ہیں :-

۱۔ گنبد احمد شاہ ولی البہمنی (۸۳۹ھ سنہ وفات)
۲۔ گنبد علاءالدین احمد شاہ ثانی (۸۶۲ھ سنہ وفات)
۳۔ گنبد ہمایوں شاہ (۸۶۵ھ سنہ وفات)
۴۔ گنبد نظام شاہ (۸۶۷ھ سنہ وفات)
۵۔ گنبد محمد شاہ ثالث (۸۸۷ھ سنہ وفات)
۶۔ گنبد محمود شاہ (۹۲۴ھ سنہ وفات)
۷۔ گنبد ولی اللہ (۹۳۱ھ سنہ وفات)
۸۔ گنبد کلیم اللہ (۹۳۴ھ سنہ وفات)
۹۔ گنبد سلطان حسن فرزند احمد شاہ
۱۰۔ گنبد مخدومہ جہاں زوجۂ احمد شاہ
۱۱۔ گنبد مخدومہ جہاں نرگس بی بی زوجۂ ہمایوں شاہ

گنبد احمد شاہ ولی بہمنی : احمد شاہ سلاطین بہمنیہ کا نواں بادشاہ تھا جس نے تیرہ سال (۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۶ء)

؎ BIDAR, ITS HISTORY AND MONUMENTS - PAGE (145)

؎ اس گاؤں کا نام بہمنیوں کے زمانے میں عیش پور تھا۔ جہاں گنبدوں کے اطراف ایک پرفضا باغ تھا۔ بیدر میں مشہور ہے کہ علاءالدین احمد شاہ ثانی نے اس کو بسایا تھا جو عیش و آرام کے تمام لوازمات سے آراستہ تھا۔ لیکن اب یہاں کھیت پائے جاتے ہیں۔

نہایت عظمت و جلال سے بادشاہت کی۔ وہ فنون لطیفہ کا شستہ اور لطیف ذوق رکھتا تھا۔ بیدر کی اکثر عمارتیں اسی دور میں تعمیر ہوئیں۔ وہ مذہبی میلان بھی رکھتا تھا۔ ابتدا میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ اور ان کی اولاد اور اس کے بعد مرشد کرمان حضرت نعمت اللہ ولیؒ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کا گنبد اس کے ذوق تعمیر اور میلان مذہبی کا آئینہ دار ہے۔

احمد شاہ کے تعمیراتی دور کی یادگاروں میں اس کے گنبد کو ممتاز مقام حاصل ہے۔ عمارت کا طرزِ تعمیر عظمت و جلال، اعلیٰ فنی اور جمالیاتی اقدار کے امتزاج کا دلفریب نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس گنبد نے اپنے طرز تعمیر سے آئندہ (۷۵) سال کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ قائم کر دیا۔ اس گنبد کا اسلوب فیروز شاہ کے گنبد سے نمایاں تفاوت رکھتا ہے۔ اس گنبد میں فیروز شاہ کے گنبد کے برعکس تین منزل دکھائی دیتے ہیں۔ گنبد کے اندر داخل ہونے کی چار سمتوں کی چار کمانیں فیروز شاہ کے گنبد کے مقابلے میں بلحاظ بلند اور پر عظمت ہیں۔ گنبد کے بیرونی مظاہر کے مقابلے میں اندرون گنبد کی مینا کاری اور نقش و نگار اپنے اندر روح تجمل اور آرائش رکھتی ہے جو گلبرگہ کے اسلوب تعمیر کے مقابلے میں شائستہ مذاق اور نفاست کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔

اس کا چبوترہ ۰ ۵ فیٹ مربع ہے۔ اس کی ہر دیوار ۱۲ فیٹ موٹی ہے۔ اس میں ۴ کمانیں ۲۷ - ۲۷ فیٹ اونچی ہیں۔ قبہ زمین سے ۱۲۰ فیٹ بلند ہے۔ گنبد کی دیواریں اندر کی طرف تمام نقش و نگار اور کتبوں سے پُر ہیں۔ گنبد کی چھت کا اندرونی حصہ اپنی صناعی میں نظیر نہیں رکھتا ہے۔ یہ رنگ بہ رنگ کے نقش و نگار ایرانی طرز کے ہیں۔ اس نقاشی اور رنگ کاری کا حسن رنگوں کے تنوع میں نہیں ہے بلکہ رنگوں کے تضاد اور تقابلی اسکیم میں ہے۔ چاروں طرف فارسی اشعار اور قرآن کی آیتیں پائی جاتی ہیں جن کا سواد خط ایک با کمال خطاط کے فن کو بتلاتا ہے۔ یہ تمام تحریریں نہایت چمکدار سرخ گہرے نیلے رنگ کی زمین پر ہیں جو مشرق کے تمام معلومہ طرز تحریر یعنی خط کوفی طغریٰ اور نسخ میں پائے جاتے ہیں۔ چھت میں جہاں خط کوفی میں آیات قرآنی طلائی حروف میں لکھے ہوئے ہیں وہاں بجائے نقطوں کے ہیرے جڑے ہوئے ہیں جو تاریکی کے وقت آئینہ کے مانند چمکتے ہیں۔ گنبد کی فضا رتاریکی اور روشنی اور عظمت و حزن سے بسی ہوئی ہے جو ہر آنے والے کے دل میں ایک خاص کیفیت پیدا کرتی ہے جس کا اظہار زبان قلم سے ناممکن ہے ۔

کچھ خبر بھی ہے تجھے اس گنبد خاموش میں　　سو رہی ہے عظمتِ بیدر ترے آغوش میں

گنبد کی تمام دیواروں اور قبوں پر میناکاری، چینی اور سیپ کا کام اور طلائی نقش و نگار پائے جاتے ہیں جو امتداد زمانے سے ماند پڑنے لگے ہیں۔ گنبد کی چھت کا اندرونی حصہ اپنی صناعی میں نظیر نہیں رکھتا ہے۔ چار گوشوں کے ہشت پہلو زاویئے دار محرابوں کے بازو طغریٰ سے لکھی ہوئی آیات بہت صاف ہیں۔ گنبد کے اندر صوفیانہ اور خاص کر شیعہ اثرات زیادہ کارفرما نظر آتے ہیں۔ پیغمبر اسلام اور چوتھے خلیفہ کے نام کو سو مختلف طریقوں سے لکھا گیا ہے۔

اس کے علاوہ شیعہ درود کا بھی اضافہ ہے۔ حضرت نعمت اللہ کرمانیؒ کے اشعار کے ایک صوفیانہ رسالے کا متن اور ان کے دو شجرۂ روحانی بھی درج ہیں یا صاحب گنبد کی تاریخ وفات ۲۹۔ ذی الحجہ ۸۳۹ھ بھی ایک طرف درج ہے۔ اندرونی گنبد کی آرائش، تزئین اور تحریر شکراللہ قزوینی کی صناعی اور اس کا نتیجہ ہے جس کا نام بھی ایک کتبہ میں موجود ہے۔ الحاصل یہ گنبد فن تعمیر اور صناعی کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں عجیب و غریب اور ساری دنیا کے لئے اسلامی فنون لطیفہ کا بہترین نمونہ ہے۔ یہ گنبد سلطنت بہمنیہ کے عہد شباب کی یادگار ہے جبکہ سلطنت کو زبردست سیاسی استحکام حاصل ہو گیا تھا حکمران نشۂ طاقت سے سرشار تھا۔ تہذیب و تمدن کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا تھا۔ اس کی تیاری میں ۱۰ لاکھ روپے کا صرفہ ہوا۔ بہمنیہ دور کی صناعی اور کاریگری اس پر ختم ہوگئی۔ اسی بنا پر سلاطین بہمنیہ کے تمام گنبدوں کے مقابلے میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اکثر سیاحوں اور ماہرین فن کا بیان ہے کہ ایسی بے مثال تعمیر نقش و نگار کی ندرت اور طرفگی کے ساتھ مشرق میں بہت کم دکھائی دیتی ہے جو شاہان بہمنیہ کی عظمت اور لطیف و شائستہ مذاق کی ترجمانی کرتی ہے۔ بحیثیت مجموعی گنبد کے مختلف خد و خال مثلاً وسیع احاطہ، مضبوط تعمیر، منتخب رنگوں کی اسکیم، آرائشی نقشے اور خطاطی کے اعلیٰ درجے کے نمونے بانی کے اعلیٰ تصورات، پاکیزہ ذوق اور مذہبی رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خطاطی کے اس قدر اول کے کام کے متعلق پروفیسر شروانی[1] لکھتے ہیں:-

"THE INTERIOR OF AHMED SHAH'S TOMB MUST BE RANKED AS ONE OF THE MASTER PIECES OF THE CALLIGRAPHIC ART OF MEDIEVAL INDIA."

علاءالدین احمد شاہ ثانی کا گنبد: علاءالدین احمد شاہ ثانی اپنے باپ احمد شاہ اول کے مانند شائستہ مذاق کا بادشاہ تھا۔ اس کے گنبد میں تزئین اور آرائش کا کام احمد شاہ اول کے مقابلے میں ترقی یافتہ صورت میں نظر آتا ہے۔ گلکاری اور خطاطی کے مظاہرے بھی فنی حسن اور دلکشی نسبتاً زیادہ رکھتے ہیں۔ اس کا قرینہ ہے کہ محمود گاوان نے (جو اس کے زمانے میں دکن آیا تھا) اچھے نقاش اور کاریگر گنبد کی ترتیب اور آرائش کے لئے ایران سے بلایا ہو۔ گنبد کی کمانیں اپنی کشادگی اور وسعت کے لحاظ سے عظمت اور اعلیٰ ذوق کا احساس پیش کرتی ہیں۔ گنبد کے باہر کے حصے کی تزئین اور آرائش بیت المقدس کی کاشی کاری کا نمونہ پیش کرتی۔

(د) **شہر نعمت آباد** ۔ شہر نعمت آباد بیدر کے شمال مشرق کی سمت میں چند میل کے فاصلے پر انجرا ندی

۱۔ مقتاطیہ اخبار ۔ صفحہ (۱۶۸)

THE BAHMANIS OF THE DECCAN PAGE 191 ۲۰

کنارے واقع ہے۔ یہی وہ تاریخی مقام ہے جہاں میر نور اللہ بن شاہ خلیل اللہ کرمانی کی احمد شاہ اوّل سے ملاقات ہوئی تھی۔ بادشاہ نے جمیع امراء اور شہزادوں کے ساتھ حضرت نعمت اللہ کرمانی" کے پوتے کا نہایت عقیدت اور احترام سے استقبال کیا تھا۔اس واقعے[1] کی یادگار میں بادشاہ نے ایک مسجد اور شہر کی بنیاد ڈالی اور ازراہِ عقیدت اِس کا نام نعمت آباد رکھا۔ یہاں پر ایک قلعہ کی بھی بنیاد ڈالی تھی جو نا تمام حالت میں شکستہ اور ویران موجود ہے۔ اِس کے بعد علاء الدین احمد شاہ ثانی نے یہاں پر ایک عالی شان[2] قصر اور اس کے احاطے کو ایک پُر فضا باغ سے زینت عطا کی۔ اِس قصر کی تعمیر و یجیا نگر کی لڑائی کے بعد ہوئی اور اپنے چچا فیروز شاہ کے مانند اسکو ذیلی پایۂ تخت قرار دیا۔ قصر شاہی کے اطراف امراء اور شرفائے حکومت کے محلات بھی تعمیر ہوئے۔ بادشاہ زیادہ تر اس "باغ جنت مثال" اور "قصر مینو سواد" میں داد عشرت دیتا تھا۔ اب ایک باغ اور محل کے مٹتے ہوئے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

---

[1] فرشتہ جلد اوّل مقالہ سوم صفحہ (۳۲۹) [2] برہان مآثر صفحہ ۷۶ //

(سلسلہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۲ سے آگے) in Miniature by Shobert Vol IV - P.P. 215-216 — The Imperial gazette of India Vol IV P: 408 India and her paple by S. Abhadananda P.P 188-189 P.30 Motin in learning by N.N. law [3] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں ص ۸۹، ۹۰ از عبدالشکور صاحب [4] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں صفحہ ۹۲ تا ۹۶ عبدالشکور صاحب [5] Al Minhaj p: 2 by Sufi B.M.D education in Muslim India — P.P. 20-21 by S.M Safer Hindustan in Miniature by Shobert 1H4IV PP 215-216 The Imperial gazette of India Vol IV P. 408 India and her people by S. Abhananda PP 188-189 Promotion of learning by N.N. law [6] Education in Muslim India p. 8 [7] Ibid p. 18 Alminhaj p. 8 [8] Al Minhaj p: 8 — [9] ہندوستان کی قدیم درسگاہیں ص ۱۰۰ ابوالحسنات عبدالشکور بیگ [10] مآثر قطب شاہی فرشتہ حکیم شمس اللہ قادری ص ۱۰ [11] حدیقۃ العالم ج اول ص ۱۳۹ [12] تاریخ فرشتہ ج دوم ص ۱۶۸ [13] مآثر قطب شاہی ص ۱۸ [14] حدیقۃ العالم ج دوم ص ۱۹۸ [15] مآثر قطب شاہی ص ۱۶ [16] مآثر قطب شاہی ص ۱۷ [17] مآثر قطب شاہی ص ۱۷ [18] تاریخ فرشتہ ج دوم ص ۱۷۳، حدیقۃ العالم ج اص ۲۵۸ [19] حدیقۃ العالم ج ۱ ص ۲۴۴ [20] مآثر قطب شاہی ص ۳۳، ۳۷، ۴۱، ۴۳، ۴۵ (باقی سلسلہ صفحہ نمبر ۳۶ پر ملاحظہ ہو)

میر نجم الدین علیخاں

قطب شاہی دور میں دکن کا نظامِ تعلیم

سلطان قلی جو ایران سے محمود شاہ بہمنی کے عہد میں بیدر پہنچا اور حادثات زمانہ سے گذرتا ہوا ۱۵۱۸ء میں تلنگانہ کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ مذہب اسلام کا پیرو تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت ایران میں ہوئی تھی۔ ایران اُس وقت مشرق میں علوم و فنون کا سرچشمہ بنا ہوا تھا۔ ایران میں شیراز و بغداد کی اسلامی تعلیم گاہیں آج تک ان کی قومی تاریخ کے کارنامے ہیں۔ ایسی تعلیم گاہیں نہ صرف ایران بلکہ اطراف و اکناف میں بھی قائم تھیں جیسے کہ، مدینہ، بصرہ، کوفہ، دمشق، قاہرہ، نیشاپور، بغداد، خراسان اور بخارا وغیرہ[۱]۔

اسلام کا یقین اور اس کے نظریات مستحکم ہیں اس لیے نصاب میں بھی مختلف خطوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ درسی کتابوں میں رد و بدل کبھی کبھی ہوا ہے لیکن عمومیت ہر جگہ باقی رہی ہے۔ اِس طرح زمانۂ قدیم کے مضامین جو متذکرہ صدر مدارس میں جاری تھے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

علم منقول
(۱) قرآن (۲) تجوید (۳) تفسیر (۴) حدیث و اصول حدیث
(۵) فقہ (۶) اصول فقہ (۷) تصوف

ادب
(۱) ادب بشمول نظم و نثر (۲) نحو (۳) صرف (۴) لغت
(۵) بیان (۶) فصاحت و بلاغت

علم معقول
(۱) منطق (۲) ریاضی (۳) ہندسہ (۴) ہیئت (۵) فلسفہ
(۶) طب (۷) زراعت و جغرافیہ (۸) تاریخ۔

ان مضامین کی درسی کتب کے بارے میں وقتاً وقتاً کے لحاظ سے اختلاف رہا ہے۔ ابوالحسنات عبدالشکور ندوی نے "ہندوستان کی قدیم درسگاہوں" پر ایک کتاب لکھی ہے۔ جس میں حکیم سید عبدالحی کے تعلق سے لکھتے ہیں" مولانا تاریخ علماء و علوم ہند کے بہترین عالم ہیں۔ مولانا موصوف نے علمائے ہند کی ایک مفصل و مبسوط تاریخ عربی زبان میں لکھی ہے جو متعدد جلدوں پر مشتمل ہے۔ میں نے جا بجا سے اس کے مختلف صفحات کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ علانیہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس سے زیادہ بہتر تاریخی، تحقیق و تفتیش، تلاش و جستجو اور کاوش و محنت کا نمونہ پیش نہیں کیا جا سکتا افسوس ہے کہ ابھی غیر مطبوعہ ہونے کے باعث یہ بے نظیر اور ضروری تالیف منظر عام پر نہیں آئی۔ مولانا موصوف اپنے مضمون "ہندوستان کا نصاب درس

میں تحریر فرماتے ہیں :—

"مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سہولت کے لحاظ سے نصاب درس کے چار دور قائم کردیں اور جو کتابیں ہر دور میں مروج تھیں ان کی تفصیل جہاں تک تاریخ سے، سیر سے مشائخ کے طبقات سے شعرا کے تذکروں سے اور مکتوبات و ملفوظات سے مل سکتی ہے یکجا کردیں۔ دیکھنے کو تو ایک ذرا سا کام ہوگا مگر مختلف کتابوں کے ہزار ہا صفحے الٹنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں جو ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور کے کتب درسی کی جو تفصیل مذکورہ بالا ذرائع تاریخی سے مولانا ممدوح نے جمع کی ہے اس پر اضافہ مشکل ہے۔ بحیثیت مضمون نگار اس ضرورت کیلئے میں نے بھی مختلف کتب تاریخ و سیر کی ورق گردانی کی لیکن ہر قدم پر مجھے مولانا کی تصریحات سے اتفاق کرنا پڑا اور مزید اضافہ کی کوئی گنجائش نہ نکلی۔ اس بنا پر میں نے مجموعی کاوش سے قطع نظر کرکے مولانا ممدوح ہی کی تصریحات کو اس موقع پر نقل کردینا بہتر خیال کیا۔

مندرجہ بالا تحریر کے بعد مولانا موصوف عبدالشکور صاحب درسی کتابوں کو بلحاظ ادوار یوں نقل فرماتے ہیں :—

دورِ اوّل :— اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے اور انجام دسویں صدی ہجری تک ہے۔

صرف میں :—

نحو میں :— مصباح، کافیہ، لب الالباب مصنفہ قاضی ناصرالدین بیضاوی کچھ دنوں بعد ارشاد مصنفہ شہاب الدین دولت آبادی۔

بلاغت میں :—

فقہ میں :— ہدایہ

اصول فقہ میں :— منار اس کے شروح اور اصول بزدوی۔

تفسیر میں :— مدارک، بیضاوی اور کشاف۔

تصوف میں :— عوارف، فصوص الحکم اور بعد نقد النصوص و لمعات

حدیث میں :— مشارق الانوار، مصابیح السنہ

ادب میں :— مقامات حریری

منطق میں :— شرح شمسیہ

فن کلام میں :— شرح صحائف، ابو شکور سالمی۔

اس زمانے میں فقہ و اصول فقہ کا ماہر ہونا علم و فن کا طغرائے امتیاز تھا۔ حدیث کو فقہ پر کوئی تقدم نہیں

سمجھا جاتا تھا۔

دورِ دوم:۔ اس کا آغاز نویں صدی ہجری کے آخر سے شروع ہوتا ہے:۔

اسی زمانے میں قاضی عضد کی تصانیف مطالع و مواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم داخل نصاب ہوئیں۔ اسی دور میں میر سید شریف کے تلامذہ نے شرح مطالع اور شرح مواقف کو رواج دیا۔ تفتازانی کے شاگردوں نے مطول اور مختصر کی بنیاد ڈالی، تلویح و شرح عقاید نسفی کو رواج دیا۔ اسی زمانے میں شرح وقایہ اور شرح جامی بھی رفتہ رفتہ داخل نصاب ہو گئیں جس طرح کسی زمانے میں صدرا اور شمس بازغہ انتہائی کتابیں سمجھی جاتی تھیں اسی طرح اِس زمانے میں مفتاح العلوم سکاکی اور قاضی عضد کی مطالع اور مواقف منتہیانہ کتابیں تھیں۔

دیگر مضامین میں بھی دورِ اول کی ساری کتابیں رائج تھیں۔

دورِ سوم:۔ اس کا آغاز دربارِ اکبری کی یادگار ہے:

نحو میں:۔ کافیہ، شرح جامی	اصول فقہ میں:۔ حسامی اور کسی قدر توضیح تلویح
منطق میں:۔ شرح شمسیہ، شرح مطالع	بلاغت میں:۔ مختصر و مطول
فلسفہ میں:۔ شرح ہدایۃ الحکم	ہیات و حساب میں:۔ بعض رسایل مختصرہ
کلام میں:۔ شرح عقاید نسفی مع حاشیہ خیالی۔ شرح مواقف	طب میں:۔ موجز القانون
فقہ میں:۔ شرح وقایہ، ہدایہ	حدیث میں:۔ مشکوٰۃ المصابیح، شمائل ترمذی، کسی قدر بخاری
تفسیر میں:۔ مدارک، بیضاوی	تصوف میں:۔ عوارف و رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات جامی۔ مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص وغیرہ

قطب شاہی دور کی ابتدا ۹۲۲ھ یعنی دسویں صدی ہجری کی ابتدا میں ہوئی اور اختتام گیارہویں صدی کے اختتام پر ہوا۔ کتابوں کے لحاظ سے جو تقسیم ہوئی ہے۔ قطب شاہی دور درس کے دوسرے اور تیسرے دور پر پھیلا ہوا ہے۔

تعلیم کے اِس سارے نصاب کو دو گروہ میں تقسیم کر کے چلایا جاتا تھا جنھیں مکتب اور مدرسہ کے نام دیئے گئے تھے۔ مدرسہ کی تعلیم مکتب کی تعلیم کا تسلسل ہوتی تھی لیکن کسی کتاب سے بھی یہ حوالہ نہ مل سکا کہ مکتبی تعلیم کتنے درجوں پر مشتمل تھی البتہ اُس میں جس قسم کی تعلیم دی جاتی تھی اس اعتبار سے مکتبی تعلیم کو بھی دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

ابتدائی تعلیم جو ہر بچے کے لیے ضروری تھی وہ قرآن ناظرہ مع تجوید پڑھتے۔ لکھنے اور ابتدائی ریاضی سیکھنے کی حد تک محدود تھی جس کے ساتھ تاریخی طرز پر انبیاء کے واقعات اور صحابہؓ کی زندگی سے واقف کراتے جاتے تھے اور فرائض میں ارا سر [illegible] سے واقف کرایا جاتا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی شریک درس رہتی تھیں مگر متذکرہ صدر تعلیم کے اختتام پر یا عمر زیادہ ہونے پر لڑکیوں کو لڑکوں سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ اور گھروں میں ان کی تعلیم کا انتظام ہوتا جہاں پر

ذہبی، اخلاقی، ذہنی اور امور خانہ داری کی عملی ٹریننگ دی جاتی تھی[۶] ابتدائی تعلیم کے دوسرے دور میں طلبا کو ادب پڑھایا جاتا تھا جس میں صرف و نحو کا پڑھنا، فصاحت و بلاغت کا جاننا ضروری تھا۔ ادب کے ساتھ ساتھ حدیث اور قہ سے ابتدائی طور پر واقف کرا کے چند سورتوں کی تفسیر سکھلائی جاتی، حساب اور فرائض پڑھائے جاتے تھے[۷] خوشنویسی میں لم ہندسہ کے بعض بنیادی اصولوں سے واقفیت کرائی جاتی تھی۔

مکتب میں جن مضامین کی تکمیل نہیں ہوتی تھی۔ مدارس نہ صرف ان مضامین کی تکمیل کرتے تھے بلکہ مزید اور مضامین پڑھاتے تھے جیسے اصول فقہ، منطق، اصولِ حدیث، فلسفہ، تصوف، ہیئت، حساب، طب، مناظرہ، زراعت، جغرافیہ، تاریخ، اصول تجارت وغیرہ۔

مدارس کی تعلیم کے بعد بھی جو طلبا مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے وہ کسی مضمون کو مخصوص کر لیتے تھے۔ اس کیلئے ان کو مدرسین کے انتخاب اور تحصیل علم کیلئے دور دراز کے سفر کرنے پڑتے تھے[۸] خصوصاً ادب و حدیث کی مندرجہ کتابیں ہر جگہ نہیں پڑھائی جاتی تھیں جس کسی کو ادب پڑھنے کا شوق ہوتا وہ کتب درسیہ کے علاوہ خارج اوقات میں ادب کی مذکورہ نصاب کی کتابوں کو بھی پڑھتا تھا بشرطیکہ اس کو کوئی معلم ادب بھی مل جائے۔ حدیث کے لیئے کتب درسیہ سے فارغ ہوجانے کے بعد ایسے مقامات کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ جہاں حدیث کے پڑھانے والے مل سکیں[۹]

ہر اس موضع میں جہاں مسلمانوں کے گھر ہوتے انکی عبادت کے لیے ایک مسجد ہوتی وہاں مسلمانوں کی کلینی تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا تھا۔ قلی قطب شاہ ان حقیقتوں سے واقف تھا۔ اس کا دربار ارباب کمال کا مرکز و ماوی بنا ہوا تھا نیز اس کے مذہب امامیہ نے بھی اثر دکھایا اور ایران و عراق سے علمائے شیعہ کی کثیر جماعت حیدرآباد آکر جمع ہوگئی۔ ان میں شعرا بھی۔ مجتہدین بھی، فلسفی بھی، ہیئت دان بھی غرض کہ ہر علم و فن کے لوگ مجتمع ہوگئے تھے جس کی وجہ سے تلنگانہ ایران کا نمونہ بن گیا تھا۔ دارالحکومت حیدرآباد کی وہی کیفیت تھی جو صفویوں کی وجہ سے اصفہان میں پیدا ہوگئی تھی۔ مشہور شاعر میر مومن استرآبادی نے جو قصائد سلطان محمد قطب شاہ کی مدح میں لکھے ہیں اس میں انھوں نے بھی اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے ؎

یادگار جد و عم سلطاں محمد قطب شاہ　　آنکہ ہندوستاں ز فیضش گشتہ ایران نوی
سرمہ شد خاک تلنگانہ ز فرخ پائے تو　　اے فدائے خاک پاکت ہر زمان جان نوی
گر صفاہان نو شد از شاہ جہاں عباس شاہ　　حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہان نوی[۱۰]

اس سلطان محمد قلی قطب شاہ کے زمانے کے ایک مدرسہ کا پتہ چلتا ہے جو جامع مسجد چار مینار میں قایم کیا گیا تھا۔ اور دوسرا طبیہ مدرسہ جو دارالشفا میں کام کرتا تھا اور تیسرا جسے حیات بخشی بیگم دختر محمد قلی قطب شاہ نے [حیا]ت نگر میں تعمیر کروایا۔ ان مدارس میں لازماً وہی نصاب اور تدریسی کتب استعمال میں رہی جو نصاب کے لحاظ سے [د]وم اور سوم میں رائج تھیں لیکن پایہ ثبوت کو پہنچانے کے لیئے ان کی متذکرہ مضامین کو شریک نصاب ہونے کا

مفروضہ اختیار کرکے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا قرآن، تجوید، حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، ادب، نحو، صرف، لغت، البیان، فصاحت، بلاغت، نزالفرائض لازماً طرز ثانیاً جاری رہنے کے مضامین ہیں۔ ان مضامین سے اس وقت کی سوسائٹی یا کوئی عالم یا کوئی مدرسہ خالی نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی تدریس بھی یقینی تھی۔ علم معقول میں جیسا کہ عنوان ہے فلسفہ، کلام، منطق، ہئیت، حساب، طب، تصوف، زراعت، خوشنویسی وغیرہ لوازمات زمانہ میں تھے۔ مضامین کی اہمیت و افادیت سے انکار ہی نہیں کیا جا سکتا تھا اور کوئی مدرسہ اس زمانے میں ان علوم کے سوا کوئی دوسرا نصاب مرتب ہی نہیں کر سکتا تھا۔

ان بنیادوں پر کہ جب علمائے ایران و عراق یہاں جمع تھے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ بیکار نہ تھے۔ بلکہ ہر وہ عالم جسے اپنے مضمون میں کمال حاصل تھا کسی نہ کسی مدرسہ میں درس و تدریس کے لئے مقرر ہوا ہوگا۔

مزید یہ کہ ان مضامین کا شریک نصاب ہونا پایۂ ثبوت کو اس طرح بھی پہنچتا ہے۔ جمشید قلی قطب شاہ خود ایک اچھا شاعر تھا۔ ابراہیم قلی قطب شاہ کے ساتھ سفر و حضر میں ہر وقت ارباب فضل و ہنر رہا کرتے تھے اور اس کی مجالس میں مختلف علوم و فنون کے مسائل پر بحثیں ہوا کرتی تھیں[۱۱]۔ اس کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی اور شاہان سلف کے واقعات رغبت کے ساتھ سنا کرتا تھا[۱۲]۔ اور اپنے شوق کو پورا کرنے کی خاطر اس نے تاریخ میں دو ضخیم کتابیں لکھوائی تھیں جن کے مصنف خورشاہ اور محمد شریف تھے[۱۳]۔

ابراہیم قطب شاہ کے کئی بیٹے تھے جو جداگانہ صلاحیتوں کے حامل تھے ان کی تعلیم و تربیت بھی یہیں دکن میں ہوئی[۱۴]۔ جن میں سے عبدالقادر کو خوش نویسی اور حسن خط میں کمال حاصل تھا[۱۵]۔ مرزا حسین قلی کو علوم معقول خصوصاً منطق و فلسفہ میں کمال حاصل تھا[۱۶]۔ عبدالفتاح علم تجوید میں کمال رکھتا تھا[۱۷]۔

محمد قلی قطب شاہ خود بھی شاعر تھا اور شعراء و علماء کی کثیر تعداد اس کے اطراف جمع رہتی تھی۔ وہ ارباب فضل و کمال کی خوب قدر و منزلت کیا کرتا۔ جس کی وجہ سے ایران، عراق اور ہندوستان کے بڑے بڑے سادات علماء شعراء اور مصنفین اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے جیسے میر محمد مومن استرآبادی کو علوم منقول و معقول میں کمال حاصل تھا وہ شاعر اور مورخ بھی تھے[۱۸]۔

میر جملہ مرزا محمد امین شہرستانی علوم متداولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور شعر بھی خوب کہا کرتے تھے[۱۹]۔

رضی الدین محمد، حاجی زین العطا اور حکیم صفی الدین محمد گیلانی قابل طبیب تھے۔ عبدالرحمن بن منصور الفرسی حکمت و ریاضیات کا ماہر تھا۔ حسین بن علی الفرسی، درباری مورخ تھا۔ ملا سعید میرک ملک الشعراء تھا۔ فکری رازی مشہور عالم اور شاعر تھا اس طرح کئی قابل ترین شعراء، ادیب، عالم اور مورخ دربار میں رہتے تھے اور ابراہیم قلی قطب شاہ کے فرزندوں نے ایسے ہی درباری علماء سے علم حاصل کیا تھا[۲۰]۔ تب ہی وہ اس قابل ہو سکے کہ علمی مباحثوں میں حصہ لے سکیں اور خود کی قابلیت[۲۱]

دوسروں کو مستفید کر سکیں۔

سلطان محمد قطب شاہ کی مجلس میں روزانہ ارباب فضل جمع ہوتے اور مسائل مہمہ پر بحث مباحثے ہوا کرتے تھے۔ خود بادشاہ بھی شریعت و حکمت کے اسرار و غوامض بیان کرتا اور اتمام حجت کے لئے ائمہ فن کے اقوال و منطق کے دلائل سے استدلال کیا کرتا تھا۔ اس میدان میں کامیابی ہمیشہ بادشاہ کے ہاتھ رہا کرتی تھی۔ ارباب تاریخ جب کسی واقعہ کا آغاز کرتے تو بادشاہ اس کے متعلق روایات کے تمام اختلافات کا ذکر کرتا اور ارباب مجلس اس کے افادات دانشمندانہ سے مستفیض ہوا کرتے تھے[۱۹]۔

محمد قطب شاہ قاضی محمد سمنانی کا شاگرد تھا اور اس سے عربی، فارسی کے جملہ علوم منقول و معقول تحصیل کئے تھے۔ طبیعت بھی موزوں پائی تھی اور شعر بھی کہا کرتا تھا[۲۰]۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی دختر، محمد قطب شاہ کی بیوی نے اطراف بلدہ میں شہر سے تقریباً ۲ میل دور ایک مدرسہ قائم کیا۔ شہزادی کے نام کی مناسبت سے اس موضع کا نام بھی حیات نگر پڑ گیا۔ اس مدرسہ کے نگران ملا ابن خاتون تھے[۲۱]۔

سلطان عبداللہ شاہ نے زمانہ شہزادگی میں اول قرآن پڑھا۔ پھر مسائل شروع کیے اور احکام دین کی تعلیم حاصل کی[۲۲]۔ اس کے بعد خود بادشاہ محمد قطب شاہ نے شہزادے کو حکمرانی کے آداب اور بادشاہت کے مراسم بتائے۔ عدل و انصاف کے قوانین سکھائے۔ سلاطین سلف کے حالات حکمائے پیشین کے اقوال سنا کر ازمنۂ ماضیہ کی تاریخ سے واقف کرایا[۲۳]۔

سلطان عبداللہ قطب شاہ کے پیشوا اور نائب السلطنت علامہ ابن خاتون ایران کے مشاہیر علما میں شمار ہوتے تھے۔ نظام الدین، سید احمد، عبداللہ قطب شاہ کے داماد کو جو ریاضی علوم ادبیہ میں کمال حاصل تھا۔ ان کا لڑکا صدرالدین سید علی تفسیر، حدیث اور لغت وادب کا جید عالم تھا[۲۴]۔ غرض حیدرآباد میں ملا، مفتی، قاضی، عالم، محدث، شاعر، ادیب، مورخ، ریاضی داں، مفسر، منطق، فلسفہ، کلام کے ماہر سب ہی جمع تھے۔ کیا کوئی خیال کر سکتا ہے کہ ان کا اجتماع بیکار اور فضول رہا ہوگا؟ ان ہی اور ایسے ہی ارباب کمال و فن کی صلاحیتوں سے مدارس کا نصاب حرکی پہلو اختیار کیا ہوا تھا جو یہی تھا جس کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ چونکہ قدیم تواریخ صرف سلاطین کے اعمال سے بھرپور ہوتے تھے اور اس طرح کی کوئی روئیداد ان میں نہیں لکھی جاتی تھی اس لیے پورے پورے علما کی کارکردگی کا پتہ مشکل ہی سے ملتا ہے جس میں صفحات کے الٹنے کی تعداد بعض دفعہ ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں میں پہنچ جاتی ہے۔ غرض بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں نے جو علوم سیکھے تھے وہی علوم حیدرآباد کے مدارس میں داخل نصاب تھے اور ان تمام علوم کو جمع کر لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ متذکرہ صدر علوم یہاں شامل نصاب تھے۔

فرنیچر اس زمانے میں بینچ و کرسی کا فرنیچر کے طور پر استعمال شروع ہو چکا تھا۔ طلبا لکڑی کی تختیوں پر واسطی قلم سے لکھا کرتے تھے۔ کاغذ استعمال میں تھا لیکن اس کی قلت تھی نیز استعمال میں چینی کاغذ تھا جو انگریزی کاغذ سے زیادہ چکنا ضرور تھا مگر اس میں ویسی صفائی نہیں تھی[۲۵]۔

کمرے اور تعمیری اصول | مدرسہ حیات نگر کی موجودگی سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ تدریسی کمرے، اساتذہ کے حجرے اور رہائشی حجرے الگ الگ تھے ان کمروں میں ہوا اور روشنی کا انتظام تھا۔ جہاں موسمی اثرات سے بچاؤ ہوتا ہے۔

جگہ کا انتخاب | مدرسہ شہر سے دور سکون کی جگہ تعمیر کیا گیا ہے۔ مدرسہ کی تعمیر میں اس بات کا اصول کارفرما ہے کہ بیرونی شور و غل سے تعلیم مدارس متاثر نہ ہونے پائے۔

حجرے اور مسجد کو قدرے اونچی زمین و اونچی بنیاد پر تعمیر کیا گیا ہے جس سے بارش وغیرہ کا پانی جمع ہونے نہیں پاتا۔ اطراف و اکناف میں باغ و چمن تھے جس کی وجہ سے مدرسہ کی فضا پاک و صاف تھی۔ حمام۔ مطبخ، کتب خانہ اور دواخانہ کے آثار واضح نہیں ہیں۔ مگر خیال غالب ہے کہ دیگر مدارس کی طرح یہاں بھی وہ ضرور قایم تھے اور عمارت کے کسی نہ کسی حصہ کو ان اغراض کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہوگا۔

اوقات مدرسہ | اس زمانے کے لحاظ سے اقامتی مدارس صبح بعد نماز فجر تا چاشت کام کرتے اور پھر دوپہر یا سہ پہر میں باعتبار سہولت موسم مقرر کیے جاتے تھے۔

تعطیلات | جمعہ، عیدین، متبرک راتیں، محرم، رمضان اور میلاد النبی میں مدارس بند رہا کرتے تھے۔[۲۸]

امتحانات | امتحانات کا کوئی خاص مروجہ طریقہ نہیں تھا اور نہ کوئی خاص زمانہ مقرر کیا گیا تھا۔ مدرس متعلقہ، آزمائشی طور پر طالب علم کی جانچ ساری کتاب سے کر کے اہل یا نا اہل قرار دیتا تھا۔ اس آزمائش میں کوئی جوابی بیاض، سوالات کا پرچہ یا نشانات نہیں ہوتے تھے جیسا کہ آج کل ہے۔ طالب علم کے لئے ضروری تھا کہ وہ مکمل کتاب کو اچھی طرح پڑھے، سمجھے، لکھے اور ان کے سوالات کے جوابات فی الفور دیا کرے[۲۹]۔ بالآخر منتہی کے کورس کے اختتام پر عمامہ باندھا جاتا اور جبہ پہنایا جاتا۔ جو اس بات کی سند تھی کہ طالب علم مذکور صاحب ارشاد ہے۔ درس دے سکتا ہے۔ اُن دنوں صرف علماء کے کوئی دوسرا شخص عالمانہ عمامہ اور جبہ نہیں پہن سکتا تھا۔ بعض دفعہ تحریری اجازت نامے بھی جاری کیے جاتے تھے جو اس وقت سلک کے کپڑے پر تحریر ہوتے تھے[ب]۔

سزا | سزا اس زمانے میں معدوم تھی اللہ اور روزِ آخرت کا ڈر علماء کو سزا دینے سے باز رکھتا تھا اور وہ جسمانی سزا دینے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ کبھی سزا دیتے تو اس بات کا خیال رکھتے کہ سزا دیتے وقت لڑکے کا جسم اور اس کی ذہنی کیفیت پیش نظر رہے نیز سزا سے تعمیری نتائج حاصل ہو سکیں۔

ب۔ تحریری اجازت ناموں کے تعلق سے بیدر میں جناب نظام الدین صاحب نامہ نگار سیز بیپر سے معلوم ہوئے جنہوں نے بیان کیا کہ اس قسم کا ایک اجازت نامہ جناب سید محمد صاحب۔ مورخ بیدر حال مقیم پاکستان کے پاس انھوں نے دیکھا ہے۔

(یہ عام طریقہ جو بعد میں رائج تھا کہ طلبا کو مرغا بنایا جاتا پیٹھ پر پتھر رکھ دیئے جاتے یا کوڑے لگائے جاتے اِس زمانے کے بعد کی پیداوار ہے جبکہ علما مذہب سے دور اور علوم معقول سے قریب تر ہو گئے تھے ورنہ جسے اللہ اور روزِ آخرت کا ڈر ہے وہ ایسی حرکتیں کبھی بھی قوم کے ننھے بچوں سے نہیں کرتا۔ مذہبی علما تو طلباسے اپنے لیے فیس لینا بھی خود داری کے خلاف اور اللہ کی نعمت کا غلط استعمال سمجھتے تھے)

انعام یوں تو اچھے طلبا کو وظائف بھی دیئے جاتے تھے مگر سوسائٹی میں طالب علم اور عالم کی جو عزت و وقعت تھی یہی طلبا کے لیے انعامی صورت تھی لیکن ان کو نائب مقرر کیا جانا بھی انعام میں شامل تھا۔[۳۱]

تدریسی زبان: تدریسی زبان فارسی تھی جو رابطے کی اور سرکاری زبان تھی۔[۳۲]

مخلوط تعلیم: مکتب کی تعلیم مخلوط ہوا کرتی تھی جس میں زیادہ دس سال تک لڑکے، لڑکیاں آپس میں مل کر پڑھتی تھیں مدرسہ کی تعلیم میں لڑکے اور لڑکیاں الگ کر دی جاتی تھیں۔ لڑکیوں کے لیے مدارس ہونے کا ابھی تک کہیں پتہ نہیں چلا ہے۔ البتہ علما کو گھر پر مقرر کرکے امرا اپنی لڑکیوں کو تعلیم دلاتے تھے۔ اِن لڑکیوں کے ساتھ ساتھ رشتہ داروں اور پڑوس کی لڑکیاں بھی شامل ہو جایا کرتی تھیں۔

نظم و ضبط طلبا مکتب و مدارس کا نظم و ضبط اس قدر سخت تھا کہ کسی طالبِ علم کو سرزنش کی مجال ہی نہ تھی۔ اِس سے قطعی یہ مطلب بھی نہیں کہ ڈنڈے کے زور پر ان امور کو چلایا جاتا تھا بلکہ اس زمانے کی سوسائٹی ہی خود ایسی تھی جو ناپسندیدہ افعال کو کبھی معاف نہیں کرتی تھی اور لوگوں کا مذہبی ذہن بھی انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتا تھا۔ کوئی لڑکا بلا ضرورت بار بار جماعت سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ باہر جانے والے پر پابندی تھی کہ وہ دوسری جماعتوں میں نظر نہ دوڑائے بلکہ سر نیچا کرکے آہستگی سے گذر جائے۔ ہر بڑے لڑکے کو سلام کرنے میں پہل کرے۔ احاطہ مدرسہ میں شور نہ کرے دالانوں میں کھڑا نہ رہے۔ مدرس سے نہایت ادب سے ملے اور تعظیم کرے۔

لائبریری چھاپے خانے نہ ہونے کے سبب کتب خانے میں قلمی کتب جمع کیے جاتے تھے جو طلبا، و مدرسین کے استفادہ کے لیے ہوتے تھے۔ چھاپے خانے کی اِس کمی کے باوجود لائبریری میں ہر متن پر چند نسخوں کا ہونا ضروری تھا۔

طریقۂ تدریس مکتب میں کتابوں کے ذریعہ پڑھائی ہوتی تھی۔ لکچر دینے کا طریقہ اونچی جماعتوں میں رائج تھا۔ مدرس لکچر دیتا اور طلبا نوٹ لیتے تھے مگر لکچر کا یہ طریقہ صرف ارشاد یا وعظ کا نہیں ہوتا تھا بلکہ تفہیم و تلقین کے انداز میں ہوتا کہ حافظہ پر زیادہ زور پڑے اور بار بار دہرا کر کوئی چیز یاد دلا دی جاتی تھی۔[۳۳]

تحتانیہ میں طلبا کو اولاً حروف تہجی سے صحیح مخرج کے ساتھ واقف کرایا جاتا۔ پھر انکی بدلی ہوئی اشکال یاد دلائی جا کر مختصر جملے لکھائے اور پڑھائے جاتے تھے۔ ابتدائی ریاضی کے طور پر ہندسوں کا لکھنا پڑھنا وغیرہ بتایا جاتا تھا۔ روزانہ طلبا سے تختیوں پر ایسی مشقیں کرائی جاتی تھیں۔[۳۴]

اس ابتدائی دور کے بعد طلبا کو لغت دیکھنے کا طریقہ بتا کر عادی بنا دیا جاتا تاکہ درس کی تیاری وہ از خود کر کے جماعت میں آئیں اور جماعتی مباحثے یا تبادلہ خیال میں حصہ لیں۔ اس وقت تک طلبا کو صرف و نحو فصاحت و بلاغت کا مختصراً درس بھی دیا جاتا تھا۔

مدرس اور صدر مدرس کے فرائض

مدرس اور صدر مدرس کے لیے ضابطہ اخلاق مدون تھے جو ضوابط مذہب اور سوسائٹی نے مقرر کیے تھے۔ اُن سب کی پابندی کرنا ان سب کا فرض تھا۔ نیز قوانین ملازمت کی پابندی بھی ان پر ضروری تھی مگر اُس زمانے میں مدرس پر آج کل کی طرح سختیاں نہ تھیں البتہ مدرس کو صدر مدرس کے ساتھ تعاون عمل کرنا اور مدرسہ کی بہبودی کا خیال رکھنا ازبس ضروری تھا۔ حکومت کی طرف سے ان کے نام سالانہ' اور ماہانہ وظائف رقمی اور محاصلی زمینات کی شکل میں عطا کیے جاتے تھے۔[۳۱]

مدارس کے ذرائع آمدنی

اخراجات مدرسہ سرپرست مدرسہ برداشت کرتا یا حکومت۔ حکومت کا طریقہ تھا کہ کوئی جائیداد محاصلی' اخراجات مدرسہ کے لیے وقف کر دی جاتی تھی جس کی آمدنی سے اخراجات مدرسہ برداشت کیے جاتے تھے۔[۳۵] ان اخراجات کی دیکھ بھال کے لیے حکومت کا ایک عہدہ دار مقرر تھا جو حسابات کی تنقیح کیا کرتا تھا۔[۳۲] اس آمدنی سے طلبا کے لیے نہ صرف مفت رہنے کھانے اور پڑھنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ بلکہ بعض نادار طلبا کے وظائف بھی مقرر کیے جاتے تھے۔[۳۳]

انتخاب مضامین

طلبا کو اجازت تھی کہ جن مضامین کو چاہیں وہ اپنے لیے منتخب کر کے اس کا علم حاصل کریں۔ مضامین کی کوئی لازمی گروہ بندی نہیں تھی لیکن اِن بنیادی مضامین (جن کا راست واسطہ سوسائٹی اور مذہب سے تھا) سے گریز نہیں کر سکتے تھے۔

اہل ہنود اسلامی مذہبی علوم سے معاف کر دیئے گئے تھے البتہ ان کو اخلاقی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں بھی علوم معقول میں انتخاب مضامین کی آزادی تھی اور ادب ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ طالبان علم' تحصیل علم کیلئے دور دراز کے ملکوں کی سیر و سیاحت کرتے اور صعوبتیں برداشت کیا کرتے تھے۔ ہندو اور مسلم دونوں ایک ساتھ علم حاصل کیا کرتے تھے۔[۳۵]

---

1. Al Minhaj p 9 Sufi G.M.D education in Muslim India p 3 by S.M. Jafar - Short History of Saracens pp 205-207, 469, 400-517 by Amir Ali - Encyclopedia Britannia 12 edi.
2. Al Minhaj p:17 Education in Muslim India p 21 Hindustan [illegible]

حامد اللہ ندوی

ندوی صاحب - ایک عکس جمیل

سنہ ۱۹۴۹ء کی بات ہے، میں .... پہلی بار بمبئی پہنچا تھا، روزگار کی تلاش تھی، بیسیوں دروازوں پر گیا، مگر بے وسیلہ آدمی کی کون سنتا ہے، ایک صاحب نے مشورہ دیا، اندھیری جاؤ۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے ملو، وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔

لفظ ندوی میں میرے لئے ایک کشش تھی، میں امید و بیم کے ملے جلے جذبات لے کر دوسرے ہی دن اندھیری پہنچا، میرے پاس ندوی صاحب کا پورا پتہ نہیں تھا، دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ ایرلا برج کے قریب ان کا بنگلہ ہے، ایرلا برج کے قریب چھوٹے چھوٹے احاطوں میں بیسیوں بنگلے تھے، میں داخل ہوتا تو کس میں، نہایت بے بسی کی حالت میں ایک بنگلہ کے سامنے ٹہلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں میں نے دیکھا کہ لکھنوی کرتے اور چست پاجامے میں ایک شخص میری طرف چلا آرہا ہے۔ المانوی سائنسدانوں جیسے بال، کشادہ پیشانی، رومی ناک، گھنی اور سیاہ بھویں، متوازن قدوقامت اور رنگ سرخ کابلیوں جیسا مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں ایک غیر شعوری کشش تھی، میرے قدم بے اختیار ادھر کو اٹھ گئے۔ قریب پہنچ کر بات کی تو معلوم ہوا کہ پروفیسر ندوی وہی تھے۔

ندوی صاحب ان دنوں اسمٰعیل یوسف کالج میں پڑھاتے تھے، اور اعزازی طور پر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، دو تین بجے کالج سے چھوٹ کر انجمن پہنچنا ان کا روزانہ کا معمول تھا، جن لوگوں کو ندوی صاحب سے ملنا ہوتا تھا وہ زیادہ تر انجمن ہی میں ان سے ملنے کے لئے آتے تھے، میرے لئے بھی آسانی اسی میں تھی کہ انجمن جا کر ان سے مل لوں، چنانچہ میں پابندی سے وہاں جانے لگا۔ میں ایک خاموش طبیعت کا آدمی تھا، ان سے بات چیت کیا کرتا، صورت سوال بنا کر ان کے قریب ہی کہیں بیٹھا رہتا۔ جب وہ چلے جاتے تو میں بھی چلا آتا تھا۔ کبھی وعدۂ فردا کی خوشی لے کر اور کبھی خالی ہاتھ مایوسیوں کے ساتھ۔

ایک دن ندوی صاحب مجھے یونیورسٹی لائبریری لے گئے، لائبریرین ڈی، این، مارشل سے ملایا، لائبریرین کی نشست کے پیچھے لوہے کی ایک بڑی الماری رکھی ہوئی تھی، انھوں نے اسے کھولا، دو چار کتابیں نکال کر دکھائیں پھر کہنے لگے کل سے تم یہاں آؤ اور ان مخطوطات کو پڑھ کر ہر ایک کے مصنف، سنہ تصنیف اور موضوع کا پتہ چلاؤ۔ اور انھیں الگ الگ پرزوں پر نوٹ کرو، جب تک تمہیں کوئی اور کام نہیں ملتا میں تمہارا خرچ دوں گا۔

ندوی صاحب کا خط تو پختہ تھا مگر جب وہ تیزی سے لکھتے تھے تو نوک پلک بہت کم درست ہوتے تھے نتیجہ یہ کہ وہ ہمیشہ ہی اپنے کسی نہ کسی خوش خط دوست یا شاگرد کے رہین منت رہتے اور اپنے مضامین انھیں سے صاف کرواتے تھے' ان دنوں میرا خط نسبتاً اچھا تھا' لہٰذا ان کے مضامین نقل کرنے کی خدمت بھی میرے سپرد ہو گئی' میرا نام انھوں نے کاتب الوحی رکھ دیا تھا اور کہا کرتے تھے: "خدا نے مجھ پر رحم کھا کر تمھیں کہیں سے میری مدد کے لئے بھیج دیا ہے"۔

ندوی صاحب سے جب میں اور زیادہ قریب ہو گیا تو وہ مجھے یونیورسٹی لائبریری سے نکال کر انجمن لے آئے اور وہیں ملازم کروا دیا' انجمن میں میں نے لائبریری کلرک' ٹیچر' فیلو' غرض مختلف اوقات میں مختلف حیثیتوں سے باری باری کام کیا' یہاں تک کہ خود ندوی صاحب اسمٰعیل یوسف کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہمہ وقتی ڈائرکٹر کی حیثیت سے چلے آئے اور مجھے اپنے کتب خانے کا لائبریرین بنا دیا' دس بارہ سال اس طرح بھی گزرے۔ انتقال سے صرف دو ماہ پیشتر کی بات ہے کہ انھوں نے خود اپنی نگرانی میں اپنے ہی ہاتھوں مجھے انجمن سے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر منتقل کیا' اور راہی ملک عدم ہو گئے۔

اس طرح مجھے برسر روزگار کرنے کا جو ذمہ ندوی صاحب نے بیس سال پیشتر لیا تھا' آخری وقت تک اس کو نباہا اور جہاں میری بہتری کی صورت نکلی وہاں مجھے کر دیا۔ جب انھوں نے پہلی بار مجھے سہارا دیا تھا اس وقت میری عمر مشکل سے انیس بیس سال کی تھی' ندوی ہونے کے ناطے تھوڑی بہت عربی فارسی جانتا تھا جو آج کے حالات میں کسی اچھے روزگار کے لئے کافی نہیں اور اب جبکہ ان کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہے اس حالت میں ہوں کہ اپنے پیر پر کھڑا ہوں اور سر ندوی صاحب کے احترام میں جھکا ہوا ہے۔

پورے بیس سال ندوی صاحب سے وابستہ رہنے کی وجہ سے مجھے ان کی اچھی بری ہر چیز کو قریب سے دیکھنے اور اس پر غور کرنے کا کافی موقع ملا اور میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی شخصیت کا جو اثر لیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نے لیا ہو' قریب کے بعض لوگوں کو ان سے جو شکایتیں تھیں اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ان کے تعلقات اور ان کے اثر و رسوخ کی وجہ سے لوگ ان سے بڑی بڑی توقعات قائم کر لیتے تھے جن کا پورا کرنا ان کے بس سے باہر تھا' یا پھر یہ کہ انھوں نے گروہ بندیوں کے اس دور میں اپنی ذات کو ان سے بالاتر رکھا اور کسی ایک فریق کے نہ ہوئے۔ ان میں اگر واقعی کوئی کمزوری تھی تو وہ زبان کی تھی' بعض اوقات ان کے گہرے نشتروں سے لوگ تلملا اٹھتے تھے مگر کچھ کہہ نہیں پاتے تھے۔ لیکن اس ایک کمزوری کے مقابلے میں خوبیاں بے شمار تھیں' یہاں میرا مقصد انھیں خوبیوں کا ایک ہلکا سا عکس پیش کرنا ہے۔ جو میرے علم میں آئی ہیں۔

ندوی صاحب انسان دوست اور غریب نواز تھے' ہمدردی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا' علانیہ اور پوشیدہ' مدد کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں ان کے ہاں چھوٹے بڑے' اپنے غیر

اور دوست دشمن کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔

ایک دن کچھ لکھنے لکھانے کے سلسلہ میں ان کے گھر پہنچا، بش شرٹ پہنے ہوئے تھا، وہ تھا تو اجلا مگر شام کے دل کی طرح جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا، ندوی صاحب نے مجھے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور تھوڑی ہی دیر بعد خاکی رنگ کا ایک اچھا سا بش شرٹ اندر سے لا کر مجھے پہنا دیا، کہنے لگے "میں اپنے کاتب الوحی کو اس پھٹی حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید میری بدقسمتی تھی کہ یہ خلعت مجھے راس نہ آئی، صرف ایک بار ایک دوست نے اس کے دیدہ زیب ہونے کی وجہ سے میری تعریف کی تھی، پھر تو مجھے کسی نے مہتروں کا سردار جانا کسی نے ٹیکسی ڈرائیور سمجھا اور کسی نے خفیہ پولس ہونے کا شبہ کیا، آخر میں نے تنگ آکر اس کو ایک پاکستانی دوست کی نذر کر دیا۔

ایک اور دن میں ندوی صاحب کے گھر میں بیٹھا کچھ کام کر رہا تھا، صبح کا وقت تھا، ایک بھکاری لکڑی اور لڑکے کے سہارے احاطہ پار کر کے اندر چلا آیا، تیس بتیس سال کی عمر تھی، ظاہری وضع قطع سے مہاراشٹرین معلوم ہوتا تھا، بنگلہ کے قریب پہنچ کر صدا دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ندوی صاحب کی بیوی، بہت سے کپڑے، کھانے کی چیزیں اور کچھ پیسے لے کر نمودار ہوئیں اور اس کے پھیلے ہوئے دامن میں ڈال دیا۔ میرے لئے یہ حیرت کی بات تھی کہ ایک بھکاری بیک وقت اتنی نعمتوں سے مالا مال ہو، ندوی صاحب سے وجہ پوچھی تو کہنے لگے "یہ ایک غریب مزدور ہے کچھ ماہ پیشتر چند اور مزدوروں کے ساتھ ہمارے گھر کی سفیدی میں لگا ہوا تھا کہ اچانک اوپر سے چونے کی بھری ہوئی بالٹی اس پر الٹ گئی اور اس کی بینائی جاتی رہی، ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ٹھیک ہو جائے مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے اب وہ اندھا ہے اور محنت مزدوری سے معذور، کبھی کبھی ہمارے گھر آجاتا ہے اور ہم سے جو کچھ ہو تا ہے اس کی مدد کر دیتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور دن جب کہ تقسیم ہند کا زخم ابھی تازہ تھا۔ شرنارتھیوں کی آمد جاری تھی میں عید ملنے کی غرض سے شام کے وقت ندوی صاحب کے گھر پہنچا، کچھ اور ملاقاتی بھی پہلے سے وہاں موجود تھے۔ سویوں اور کیلوں سے سب کی خاطر ہو رہی تھی، اتنے میں ایک سردار جی بیوی، بچوں کے ساتھ بنگلہ کے احاطہ میں داخل ہوئے ظاہری حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ لٹا ہوا قافلہ ہے جو کسی طرح جان بچا کر یہاں تک پہنچا ہے۔ وہ لوگ آئے تھے۔ دراصل اندھیری کا کسی آٹو موبائیل کمپنی کا پتہ پوچھنے کے لئے مگر ندوی صاحب کو مہربان پایا تو اپنی داستان غم چھیڑ دی، ندوی صاحب اندر گئے شاید دس روپے کا نوٹ تھا لا کر انہیں دیا اور مہمانوں کی تواضع کے لئے جو کیلے رکھے ہوئے تھے وہ سب ان کے حوالے کر دیئے۔

ندوی صاحب کو اپنے شاگردوں کا بڑا خیال تھا۔ کالج کی ملازمت کے زمانے میں فیس رہائش اور کتابوں کے سلسلے میں مستحق طلبہ کی جس طرح وہ مدد کرتے تھے۔ اور مختلف ذرائع سے جس طرح انہیں وظائف دلاتے تھے اس کا ذکر بعض طالب علم اب بھی بڑی احسان مندی کے ساتھ کرتے ہیں دو ایک طلبہ کا قیام تو ہر سال مستقل طور پر

انہیں کے بنگلہ پر ہوتا تھا، اکثر ایک ہی میز پر اپنے بال بچوں کے ساتھ انہیں بٹھا کر کھلاتے پلاتے بھی تھے، بعض اوقات تو وہ اپنے طلبہ کی مدد کے سلسلہ میں اتنا آگے بڑھ جاتے تھے کہ پھر تو نہ انہیں کسی کے اعتراض کی فکر ہوتی تھی اور نہ اپنی تکلیف کا خیال۔

ندوی صاحب کے ایک شاگرد تھے، نام تو ان کا فقیہ تھا، مگر دل کے معاملہ میں وہ اقبال کی اس نصیحت کو زیادہ مانتے تھے۔ اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل، لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔

جب وہ سورت کے ایک مشہور کالج میں لکچرر ہوئے تو غزلوں کا مطلب سمجھاتے سمجھاتے ایک طالبہ کو دل ہی دے دیا، کالج والے اس طریقہ تعلیم کو روا نہیں رکھ سکتے تھے۔ جلد ہی نتیجہ سامنے آگیا اور انہیں محبوب اور ملازمت ان دونوں میں کسی ایک کو چننا تھا۔ انھوں نے ایڈورڈ ہشتم کی طرح محبوب کو لے لیا اور ملازمت چھوڑ دی پھر تو دمشق میں اتنا قحط پڑا کہ یار لوگ عشق بازی بھی بھول گئے۔"

ندوی صاحب کو یہ سب کچھ معلوم تھا لیکن پھر بھی انھوں نے کسی اعتراض کی پروا نہ کی، جب رتنا گری کالج کے وائس پرنسپل نے اپنے ہاں اردو کی ایک خالی جگہ کو پُر کرنے کے سلسلہ میں ندوی صاحب سے مشورہ کیا تو ندوی صاحب نے بلا تامل اپنے عاشق مزاج شاگرد کا نام پیش کر دیا اور وہ لے لئے گئے۔

ندوی صاحب کے ایک شاگرد تھے، خاندیس کے رہنے والے، نام کچھ اسقدر مقدس پایا تھا کہ مسلمان صرف روزوں کے زمانے میں اس کو زبان پر لا سکتے تھے۔ گریجویشن کے بعد یورپ چلے گئے۔ کچھ سال بعد جب وہ واپس ہوئے تو ان کے ساتھ ایک فرنچ بیوی ایک اینگلو فرنچ بچہ اور متعدد ڈگریاں بھی تھیں، گاؤں جاتے ہوئے شرماتے تھے ندوی صاحب کے گھر میں پناہ لی۔ ندوی صاحب لگے ان کی خاطر مدارات کرنے، ایک دن گیا، دو دن گیا، تین دن گیا یہاں تک کہ تین چار ماہ گذر گئے اور میزبانی کا یہ سلسلہ ختم نہ ہوا ندوی صاحب کی بے بسی کا عجیب حال تھا۔ ایک طرف بیوی کی پریشانی اور دوسری طرف شاگرد کا پاس خاطر، نہ چپ رہتے بنتی تھی۔ اور نہ کچھ کہتے بنتی تھی آخر ندوی صاحب کے بعض قریبی دوست بیچ میں پڑے اور ان کے شاگرد کو کسی طرح تیار کیا کہ وہ اپنا کوئی متبادل انتظام کر لیں۔

ندوی صاحب میں زندہ دلی اور خوش مزاجی بھی بے حد تھی۔ وہ اکیلے بہت کم رہتے تھے گھر ہو کہ کالج اور یونیورسٹی اٹھتے، بیٹھتے دو چار آدمی ان کے آگے پیچھے ضرور رہتے۔ وہ نہ صرف خود خوش رہتے بلکہ دوسروں کو بھی اپنی باتوں سے خوش رکھنے اور ہنسنے ہنسانے کی کوشش کرتے تھے، ان کی فرصت کا کوئی لمحہ لطف ظرافت سے خالی نہیں جاتا تھا سامنے والا اگر ان کی اس خوش مزاجی کا پورا پورا لطف اٹھا سکتا تو ان کی خوش مزاجی دو بالا ہو جاتی تھی وہ اس پرند کی طرح تھے جو صبح سے شام تک باغ کے ہر ڈال پر بیٹھ کر چہچہاتا رہتا ہے ان کے بہت سے لطیفے ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں کو ابھی تک یاد ہیں

سید عبدالحی الرضا ندوی صاحب کے قریبی عزیز بھی ہیں اور پرانے شاگرد بھی، پہلے سینٹ زیورس کالج بمبئی میں اردو کے لکچرر تھے اور اب مہاراشٹرا کالج میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ سنایا، کہنے لگے " ایم۔ اے کی کلاس تھی چچا میاں غزل کی زبان اور اس کے مخصوص علائم و رموز پر روشنی ڈال رہے تھے کہ 'چاہِ ذقن' کا ذکر آگیا، انھوں نے اس کی وضاحت شروع ہی کی تھی کہ ایک طالبہ کا ہاتھ اتفاقی طور پر ٹھوڑی تک پہنچ گیا۔ ندوی صاحب ایسے موقعوں پر کہاں چوکنے والے تھے، فوراً اس طالبہ کو مخاطب کر کے کہا۔ معاف کیجئے! آپ کو مغالطہ ہوا ہے، اگر آپ کے واقعی چاہِ ذقن ہوتی تو یہ تمام لونڈے اس میں ڈوب مرتے"

ایک صاحب ہیں احمد، انجمن کے پرانے ملازم ہیں، ہیں تو بہت چھوٹے لیکن ان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ انھیں ہمیشہ بڑوں کا تقرب حاصل رہتا ہے۔ ندوی صاحب کا ایک لطیفہ انھوں نے سنایا، کہنے لگے ایک بار ندوی صاحب کے دو تین پرانے دوست ان سے ملنے کے لئے آئے، ان میں ایک خوش پوش نوجوان بھی تھے، بے تکلفی کے ساتھ بات چیت ہونے لگی، اتنے میں ایک صاحب نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا 'آپ کی صحبت نے ان کو اس بلند رتبہ پر پہنچایا ہے' ندوی صاحب غصے سے لال پیلے ہوگئے" بولے " خبردار! پھر کبھی ایسا لفظ زبان سے نکالا، میں نے کبھی ان سے محبت نہیں کی ہے"۔ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

عبدالرحیم ندوی صاحب کے ایک پرانے دوست اور نیاز مند ہیں، بمبئی کی ایک مشہور فرم کے منیجر ہیں اور صاف ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ " ایک عید کے موقع پر میں ندوی صاحب سے ملنے کے لئے ان کے بنگلہ پر گیا۔ ان دنوں پنڈت سندر لال ان کے مہمان تھے، محفل جمی ہوئی تھی، میں نے سب سے معانقہ کیا اور پنڈت جی سے بھی پھر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی نے بات شروع کی، کہنے لگے پتہ نہیں معانقہ کی یہ رسم کہاں سے آئی ہے، ہندوستان میں قدیم سے موجود تھی یا عربوں نے اس کو رواج دیا ہے۔ ندوی صاحب فوراً بول اٹھے، اول تو معانقہ کا لفظ خود ہی بتاتا ہے کہ یہ رسم عربوں سے یہاں آئی ہے اور پھر ہندوستان میں اس کا رواج ہو ہی نہیں سکتا، یہاں گلے ملنا کیسا، جب کبھی کوئی پنڈت کسی شودر کو دیکھتا تھا تو فوراً چیخ اٹھتا تھا 'میچھی دور ہٹو'!

ایک بار خود ندوی صاحب نے اپنا ایک واقعہ مجھے سنایا، کہنے لگے 'ایک مرتبہ میں سفر کر رہا تھا، میرے ہم سفر زیادہ تر ہندو تھے، میں اردو بولتا تھا اور وہ ہندی، ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں نے ایک مسافر سے پوچھ لیا، یہاں کہیں پانی پینے کو ملے گا، میرے ہم سفر پانی کے لفظ پر جھلا گئے، ایک نے کہا 'آپ پانی کیوں کہتے ہیں، جل کیوں نہیں کہتے' میں نے جواب دیا دیکھئے صاحب، ہم مسلمان ہیں، ہمارے ہاں معمولی سے معمولی چیز تک کے لئے مراتب مقرر ہیں، جب کوئی مسلمان حج سے واپس آتا ہے اور اپنے ساتھ چاہِ زمزم کا پانی لاتا ہے تو ہم اسے زمزم کا پانی نہیں کہتے، آبِ زمزم کہتے ہیں، اسی طرح جب کوئی ہندو اپنی یاترا سے واپس آتا ہے اور اپنے ساتھ گنگا کا پانی لاتا ہے تو ہم اسے گنگا کا پانی نہیں کہتے،

گنگا جل کہتے ہیں، ہم سے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم معمولی پانی کے لیے جل کا مقدس لفظ استعمال کریں۔

ندوی صاحب میں جمالیاتی احساس بھی بے پناہ تھا، وہ ایک خاص معیار سے کبھی نیچے نہیں اترے، اپنی ہر چیز میں انھوں نے حسن، پاکیزگی، نفاست اور لطافت کا ہمیشہ ہی خیال رکھا۔ ان کا جمالیاتی ذوق ان کی تحریر سے گفتگو سے رہن سہن سے، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے سے، غرض کہ ان کی ہر ادا سے ظاہر تھا، بمبئی کی زندگی نے اِن کے اِس احساس کو اور شدید اور ان کی جمال آشنا آنکھیں یہاں کی ہر چیز میں ایک حسن تلاش کرتی تھیں، ان کا کہنا تھا کہ :—

"بمبئی اپنی گوناگوں دلچسپیوں، اپنی لاتعداد دلفریبیوں، اپنی بے شمار کششوں اور اپنی ان گنت حسین چیزوں کے لیے ایک دنیائے رنگ و بو، ایک جہانِ حسن و جمال، ایک عالم نزاکت و لطافت ایک معمورۂ تمنا، ایک شہر آرزو ہے، یہ وہ جنت ارضی اور فردوس خاکی ہے جہاں حسن اپنی تمام دلکشیوں، ضیا پاشیوں اور رنگینیوں میں جلوہ گر ہے، جہاں ملکۂ جمال و رعنائی کی حکومت ہے، یہ پیروانِ مذہب عشق کے لیے وہ ارضِ مقدس اور حریم ناز ہے کہ جہاں تصوف کا اعلیٰ درجہ اور بلند ترین مرتبہ حاصل کیا جا سکتا ہے، یہاں ہماری توقعات کے خلاف محبوب عاشق کے لیے سرگرداں ہوتا ہے، پروانہ کے لئے شمع آتش بداماں ہے، جہاں مجنوں کی تلاش میں لیلیٰ گم ہے۔ جہاں ہارون کی جستجو میں زبیدہ حیران ہے، جہاں عذرا وامق کی طالب ہے، شیریں فرہاد کے لئے جوئے خوں بہا رہی ہے تو پھر آپ خود اندازہ کر لیجیے کہ اِس یوسفستان و لیلیٰ زار میں کوئی معصوم دل سلامت رہ سکتا ہے۔"

چنانچہ ندوی صاحب کا دل بھی اِس یوسفستان و لیلیٰ زار میں سلامت نہ رہ سکا، قیس، کوہکن یا شبلی ایک کی عاشقی میں بدنام ہوئے لیکن ندوی صاحب کو کسی ایک کے پیچھے صحرا کی خاک چھاننے یا جوئے شیر لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، ان کے اردگرد جلووں کا ایک اژدحام تھا، اِن کے قدم جس طرف کو اُٹھتے ان کا ہاتھ جہاں پڑتا اور ان کی نظر جدھر کو جاتی وہاں ایک چمن لگی موجود تھا، اِسی لئے انھوں نے چاند پر کمند پھینکنے یا ستاروں کو قابو میں لانے کی فضول کوشش کبھی نہیں کی بلکہ ایک ایسے شاعر کی طرح جو کسی حسین وادی میں بیٹھ کر رنگ برنگی پھولوں، پودوں اور تیتریوں کا نظارہ کرتا اور ان سے لطف اندوز ہوتا ہے، یا ایک ایسے مسافر کی طرح جو راہ چلتے چلتے، چاندنی رات کی خاموشیوں میں کہیں سستانے کے لئے بیٹھ جاتا اور کوثر و تسنیم کی ٹھنڈک کو دل میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے ندوی صاحب نے بھی اپنی ہستی کو فنا کئے بغیر ایک خاص وقار اور وضع داری کے ساتھ، سارے آدابِ حسن و عشق کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اِن رنگارنگی جلووں سے اپنے جمالیاتی احساس کی تسکین کا سامان کیا۔ اور بادِ صبا کی طرح چمن میں پھولوں اور کلیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے گذر گئے۔

انتقال سے کچھ ہی ماہ پیشتر کی بات ہے کہ ایک دن میں نے ندوی صاحب کو خوش پا کر کہا، لوگوں کا

خیال ہے کہ آپ اپنی جوانی میں بہت رنگین مزاج رہے ہوں گے۔ ندوی صاحب کی آنکھوں سے اسی کی خوش گواریادوں نے جھانکا، ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ٹھنڈی سانس بھر کر نہایت حسرت آمیز لہجے میں بولے " اسی لئے بہت بدنام بھی تھے "۔

ندوی صاحب عملاً کوئی مذہبی آدمی نہیں تھے، نماز روزوں کی پابندی تو کیا آخر آخر میں جمعہ اور عیدین کا بھی انھیں ہوش نہ رہا۔ لیکن جذباتی طور پر دینی حمیت ان میں بے حد تھی، مذہب و ملت پر جہاں جس گوشے سے حملہ ہو اس کو وہ برداشت نہیں کرپاتے تھے اور ان کی زبان تیغ بے نیام ہو جاتی تھی۔

تقسیم ہند سے پہلے الہ آباد سے ایک سیاسی ماہنامہ نکلتا تھا " نئی زندگی " انیس الرحمٰن اس کے مدیر تھے، ہندوستان میں اس وقت قوم پرست مسلمانوں کے جتنے پرچے نکلتے تھے، ان میں یہ پرچہ ممتاز تھا اس میں جو مضامین شائع ہوتے تھے ان میں عام طور پر معقول دلائل کے ساتھ، نہایت عالمانہ انداز میں قیام پاکستان کی مخالفت کی جاتی تھی۔

پاکستان کو بہرحال بننا تھا وہ بن گیا، اس کے بعد ملک کے دونوں حصوں میں بہت سے ناخوش گوار واقعات بھی پیش آئے، جن میں ایک حیدرآباد کے خلاف پولیس ایکشن بھی تھا، پولیس ایکشن سے ذرا پہلے حیدرآباد سے شعیب کی ادارت میں " امروز " نامی ایک روزنامہ نکلنا شروع ہوا جو اتحاد المسلمین کا سخت مخالف تھا، اور حکومت ہند کو علانیہ حیدرآباد پر چڑھائی کرنے کی دعوت دیتا تھا، رضاکار اس کو برداشت نہیں کرسکے شعیب پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گئے۔ پولیس ایکشن کے بعد وہاں کی قومی حکومت نے شعیب کی یادگار کے طور پر تقریباً دو لاکھ روپے کے سرمایہ سے " امروز " کی جگہ " شعیب " نامی ایک روزنامہ جاری کیا اور انیس الرحمٰن کو الہ آباد سے بلا کر ان کی دیرینہ خدمات کے صلہ میں اس کا مدیر مقرر کر دیا۔

انیس الرحمٰن کی ندوی صاحب سے بے انتہا بے تکلفی تھی، ایک بار جب روزنامہ شعیب کی تیاریوں کے سلسلہ میں ان کا بمبئی آنا ہوا تو وہ ندوی صاحب سے ملنے کے لئے بھی چلے آئے۔ کچھ دیر تو خیر خیریت ہوئی اور پھر سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیال ہونے لگا۔ انیس الرحمٰن قوم پرستی کو وقت کی اہم ضرورت قرار دیتے اور ملّی قدروں کو ثانوی چیز سمجھتے تھے اور ندوی صاحب ملی قدروں کے احترام کو ہر مسلمان کا اولین فریضہ سمجھتے تھے۔ بحث میں گرمی پیدا ہوئی۔ آخر ندوی صاحب اپنی خفگی کو چھپا نہ سکے۔ جوش میں آکر کہا " یاد رکھنا تم ملحد ہو کر مروگے "۔ انیس الرحمٰن کہاں اس کی پرواکرنے والے تھے، انھیں تو ندوی صاحب کو چھیڑنے میں اور مزا آتا تھا زور دار قہقہہ لگایا اور کہا " بس آپ سے کوئی دلیل نہ بن پڑے تو غصہ ہو جایئے "۔

میں نے اوپر ندوی صاحب کی جن خوبیوں کا ایک ہلکا سا عکس پیش کیا ہے وہ دراصل ان کی زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں، جب کہ سورج ابھی نصف النہار پر تھا اور چمن میں ہر طرف بہار ہی بہار تھی، ندوی صاحب کا یہ زرین دور اسمٰعیل یوسف کالج کی ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ ختم ہو گیا اور پھر جو گرم ہوائیں چلنا شروع ہوئیں تو اس ہرے بھرے آباد چمن کو اجڑتے زیادہ دیر نہیں لگی۔

ندوی صاحب کی زندگی میں یہ خطرناک موڑ اس وقت آیا جب کہ انھیں اپنے سالہا سال کا پرانا رہائشی مکان خالی کرنا پڑا۔ وہ کوئی سرکاری مکان نہ تھا، مگر بدقسمتی سے عین ان کے ریٹائرمنٹ کے قریب حکومت نے اپنے کسی منصوبہ کی تکمیل کی خاطر اسے خرید لیا۔ دو چار سال سرکاری دفاتر کے چکر کاٹنے کے بعد حکومت نے تلافی کے طور پر قریب ہی میں سستے داموں پر ایک معقول سا پلاٹ ان کو دیدیا اور ندوی صاحب نے اِس کے آدھے حصّے میں اپنی ضرورت کے مطابق ایک چھوٹا سا ذاتی بنگلہ بنایا بھی، لیکن وہ کسی طرح آباد نہ ہو سکا۔ لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ سدھارے اور لڑکیاں شادی کرکے اپنے سسرال جا بسیں، ایک بیگم تھیں اور وہ بھی ایسی بیمار ہوئیں کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اِس دُنیا سے مُنہ موڑ لیا۔

اب اِس اجاڑ بنگلے میں ندوی صاحب اکیلے رہ گئے تھے اور ان کا پرانا خادم سعید، جس شخص نے زندگی بھر کبھی تنہائی نہیں دیکھی تھی، جس کا گھر ہمیشہ شاگردوں، دوستوں اور مہمانوں سے آباد رہتا تھا، جس کی بیٹھک میں صبح شام قہقہے گونجتے تھے، وہ اچانک اِس بھری دنیا میں اکیلا ہو جائے تو اس کی بے کسی کا کیا کہنا! ان کا دل ڈوبنے لگا اور ایک ایک کرکے اِس گھر کے سارے دیئے بجھ گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ آیا جب کہ موت کی بھیانک تاریکی نے انھیں ہمیشہ کے لئے اپنے آغوش میں لے لیا۔

(سلسلہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۹ سے آگے) ۲۱ تاریخ قطب شاہی ص ۳۰۷،۴ ۲۲ مآثر قطب شاہی ص ۴۱ ۲۳ تذکرہ سلاطین دکن ص ۷۰ ۲۴ حدیقۃ السلاطین ص ۱۰ ۲۵ حدیقۃ السلاطین ص ۱۷ ۲۶ مآثر قطب شاہی ص ۷۱، ۷۴۔

27 Hindustan in Mintazure by Shobert Vol IV PP 215 - 216

قطب شاہی دور از نصیر الدین ہاشمی ۲۸ مآثر قطب شاہی ص ۵۹ (حدیقۃ قطب شاہی ص ۴۹ و ۵۲)

29 Briggs Translation of Tarikh Farishta Vol IV P 366, History of India as told by its own Historians Vol VI P 487 Dr: Ziauddin's article "Systems of Exam'n" in the Muslim University Journal Vol I P 304. 30 Education in Muslim India p-6 by S.M. Jafer 31 Ibid p: 20 قطب شاہی دور از نصیر الدین ہاشمی

۳۲ قطب شاہی دور از نصیر الدین ہاشمی ۔ 33 Education in Muslim India p-87

34 Indian Administration by V.G Kale P: 432 // ۳۵ تذکرہ سلاطین دکن ص ۹۷

Promotion of learning in India by N.N. Law P: 104 36 Ibid P. 9

37 Education in Muslim India P 11

38 India and her people by S. Abhe nanda p. 188

محمد ایوب واقف

مقالاتِ نجیب اشرف ندوی

اِس سے قبل میں استاذی المحترم سید نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم و مغفور کے خاندانی حالات، تعلیم و تربیت ان کی نجی زندگی کے ابتدائی دور سے لیکر آخری ایام تک کے واقعات اور ان کے علمی و ادبی مشاغل پر کئی مقالے قلم بند کر چکا ہوں۔ تاہم مجھے یہ دعوٰی نہیں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مرحوم کا سیرت اور ادبی و علمی مشاغل پر تشفی بخش مواد فراہم کرتا ہے۔ مگر اتنا کہنے کی جرات ضرور کر سکتا ہوں کہ مجھے ان کے بارے میں جو کچھ معلوم تھا اسے بے کم و کاست حق اور ایمانداری کے ساتھ قلمبند کر دیا۔ اور اس امر کا پورا لحاظ رکھا کہ میرے قلم کی بے اعتدالی اور کم ظرفی سے ان کی شخصیت کا کوئی رُخ مجروح نہ ہونے پائے۔ میرے بعض احباب سے مجھے شکایت کی ہے کہ میں نے اپنے مضامین میں ندوی صاحب کے اوصاف ہی کے گن گائے ہیں اور ان کی خامیوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ میرے احباب کی شکایت درست ہے مگر اول تو اس احساس کے تحت کہ عیوب اور نقائص حیاتِ انسانی کا خاصہ ہیں۔ ان سے بشریت کو نہ تو نجات مل سکتی ہے اور نہ ہی ان کے بغیر زندگی مکمل ہی ہوتی ہے۔ کارزارِ حیات میں اچھائیوں کی ہمسفر برائیاں ہی تو ہوتی ہیں۔ دوسرے عقیدت و محبت کے پُرخلوص جذبے نے مجھے اپنے مخدوم و محترم کی عیب جوئی پر کسی طرح آمادہ نہ ہونے دیا۔ مرحوم کی صحبت میں میری زندگی کے چار سال گذرے اِس مدت میں میں نے ان سے قریب ہو کر ان کی زندگی کے ہر گوشے کو ٹٹولا۔ ان کے عادات و اطوار کا مطالعہ کیا مگر مجھے ان کے یہاں کوئی عیب اور کوئی ایسی کمزوری نہ دکھائی دی جس سے ان کی بزرگی اور برتری پر کوئی حرف آتا۔ کسی انسان کی اچھی خاصی شخصیت کو داغدار کرنے کے لئے .... غلط قسم کے واقعات گڑھنا اور دوسروں کے گڑھے ہوئے واقعات کو اس کی ذات کے ساتھ منسوب کر دینا انسانیت اور انصاف کے چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ کے مترادف ہے میں ان اصولوں کا سخت مخالف ہوں۔ اِس طرح کی غلط بیانیوں سے کم از کم سماج کے اس انسانی گروہ کو ضرور بچنا چاہیئے جن کے ہاتھوں میں قلم ہوتا ہے۔ اور جو ایک ملک کے اصل معمار ہوتے ہیں۔

ندوی صاحب پر میرا مزید کچھ لکھنے کا ارادہ ہرگز نہ تھا۔ اِس لئے کہ ان کے دوسرے بہت سے معتقدین اور مداحوں کی توجہ اس طرف منعطف ہو چکی تھی۔ بہت سے مضامین لکھے بھی گئے۔ بعض رسالوں کے نمبر بھی شائع ہوئے۔ "سب رس" کا ندوی نمبر اس سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ان تمام تحریروں کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ابھی تک ان پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا مزاج محض تاثراتی ہے۔ اِس سے ان کی علمی و ادبی حیثیت پر کوئی

روشنی نہیں پڑتی۔ بمبئی کے مشہور تحقیقی سہ ماہی جریدہ "نوائے ادب" کے ندوی نمبر کی اشاعت کی خبر گرم ہوئی تو دلی مسرت و طمانیت حاصل ہوئی اور پورا یقین تھا کہ یہ نمبر ندوی صاحب کی شخصیت اور فن کا پورا احاطہ کریگا اور ایک شاندار شاہکار کی شکل میں علمی و ادبی دنیا کے روبرو پیش کیا جائیگا۔ ہم ناپختہ اور کم ظرف قلمکاروں کی اچھی بری تحریروں سے بڑھ چڑھ کر ایک ٹھوس اور پختہ کام ہوگا جو ندوی صاحب کی شہرت و مقبولیت کا ضامن اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کا غماز ہوگا۔ مگر ہمارا یہ خوبصورت خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس نمبر کے دو ایک مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین پھیکے بے جان اور چبائے ہوئے لقمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ ان میں وہی سب باتیں بیان کی گئی ہیں جو "سب رس" کے ندوی نمبر میں لکھی جا چکی تھیں۔ مگر اس خامی کی ذمہ داری اس کے اڈیٹر کے سر عائد نہیں ہوتی اس لئے کہ قریشی صاحب جو نوائے ادب کے اڈیٹر ہیں انھوں نے اہل قلم حضرات کے یہاں بار بار لکھا لوگوں نے وعدے بھی کئے مگر عین وقت پر لوگوں نے اپنی معذوری ظاہر کر دی۔ ندوی صاحب نوائے ادب کے اڈیٹر تھے اور اس پرچے کے ذریعہ انھوں نے لکھنے والوں کی ایک بھاری صف تیار کی۔ جنھیں انھوں نے قلم پکڑنے کے شعور سے لیکر فن کی معراج تک پہنچنے میں ہر طرح کی مدد کی کم از کم انھیں تو فرض شناسی کا ثبوت دینا چاہئیے تھا۔ مگر نہ جانے کیوں قلم جنبش میں نہ آیا۔ اگر اس کے پیچھے کوئی مصلحت یا سیاست کارفرما ہے تو یہ اچھی بات نہیں۔ اپنے محسنین کے حق میں خود غرضی کبھی روا نہیں رکھی جا سکتی۔

زیر تحریر موضوع "مقالات نجیب" کے ذریعہ میں ان تمام کوتاہیوں اور خامیوں کا ازالہ کرنے کی کوئی غرض نہیں رکھتا۔ مرحوم سے میرا جو تعلق تھا ان کی زندگی میں ان کی خدمت کا جو جذبہ رکھتا تھا اب جبکہ وہ مرحوم ہو چکے ہیں وہ جذبہ سرد نہیں ہوا ہے۔ میں نے اپنے ذمہ تحریری خدمت فرض کر لی ہے۔ جب بھی موقع ملیگا ان کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گا۔ مگر اس کے پس پشت نہ تو مجھے ماہر اشرفیات بننے کی کوئی خواہش ہے اور نہ کسی نمود و نمائش کی تمنا

اس مضمون میں میں ان کے صرف انھیں مضامین سے بحث کروں گا جو "معارف" اور "نوائے ادب" میں شائع ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان دو جرائد کے مضامین ان کی علمی و ادبی زندگی کے دو رخ کی نمائندگی کرتے ہیں "معارف" کے مضامین ان کی ادبی زندگی کے ابتدائی دور کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آغاز میں ان کی ادبی پرواز کیسی تھی۔ قدرت نے انھیں کس قدر ذہانت و فطانت ودیعت کی تھی۔ اس کے برعکس "نوائے ادب" کے مضامین ان کی ادبی زندگی کے آخری ایام کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہمیں یہ سمجھنے میں مدد کر سکتے ہیں کہ نجیب اشرف ندوی نے اپنے تحقیقی ولولے جوش اور خروش کو آخری عمر تک باقی رکھا بھی یا نہیں۔ تو آئیے پہلے ہم معارف کے مضامین کا مطالعہ کریں۔ معارف کی پرانی فائلوں سے ان کے جن مضامین کا میں سراغ لگا سکا ہوں وہ حسب ذیل ہیں:—

۱۔ ۔۔۔ رسالہ بنگلہ "معارف" جنوری ۱۹۲۳ء

(۲) "کتب خانہ خدابخش خاں کی چند نادر کتابیں"	"معارف" مارچ ۱۹۲۳ء
(۳) "ایک تاریخی غلطی کی اصلاح"	"معارف" ستمبر ۱۹۲۴ء
(۴) "میخانۂ عبدالنبی"	"معارف" فروری ۱۹۲۶ء
(۵) "روداد ترتیب رقعات عالمگیر"	"معارف" ڈسمبر ۱۹۲۶ء
(۶) "انڈیا آفس لائبریری کی فہرست"	"معارف" اپریل ۱۹۲۶ء
(۷) "دو اہم تاریخی دستاویز"	"معارف" مارچ ۱۹۲۶ء
(۸) "کیا دارا شکوہ مسیحی مزاج"	"معارف" اپریل ۱۹۲۶ء

دیوانِ حافظ خدابخش خاں مرحوم کی مشہور اورینٹیل لائبریری پٹنہ میں ایک مختصر سا دیوان ہے۔ جو خوبصورت خط میں تحریر کیا گیا ہے اِس دیوان میں کل دس عبارتیں ہیں۔ اگرچہ فارسی ادب میں ایسے بہت سے نادر و کمیاب نسخے موجود ہیں جو ہر لحاظ سے قابلِ ذکر بھی ہیں ان نسخوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو دیوانِ حافظ سے قدیم، خوش خط اور مطلا ہیں۔ لیکن وہ اتنی شہرت اور قدر و قیمت کو نہ پہنچ سکے جتنی اس نسخے کو حاصل ہے۔ اس کی اصل وجہ اس کا ظاہر حسن نہیں بلکہ باطنی خوبی ہے۔ ہمایوں، جہانگیر، شاہجہاں اور نورجہاں جیسے بڑے سلاطین بھی جب کسی مصیبت میں گھر جاتے تو اس کا حل وہ دیوانِ حافظ کی عبارتوں میں فال کے ذریعہ تلاش کر لیتے۔ دیوانِ حافظ کی سطور سے ان سلاطین مغلیہ کو نہ صرف اپنی مشکلوں سے نجات مِل جاتی بلکہ ان کے روزگار کے لئے انھیں گراں قدر ہدایات بھی مل جاتیں! اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دیوانِ حافظ کس طرح ان سلاطین اور دوسرے متعلقین دربار کے سکون و اطمینان کا باعث بنتا تھا۔ نجیب اشرف ندوی نے مغل سلطنت کے ایسے تمام واقعات کو تاریخ کے صفحات سے چُن چُن کر یکجا کر دیا ہے۔ جن میں اس مختصر سے دیوان نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو حل کیا ہے۔ ان مسائل میں بعض تو ایسے بھی گئے ہیں جن کا حل اس عہد کے بڑے بڑے علماء و فقرا بھی نکالنے سے قاصر رہے تھے۔ اور جب ان کا حل دیوانِ حافظ میں تلاش کیا گیا تو لسان الغیب نے فوراً اپنی خاموش زبان سے مسرت کا راستہ بتا دیا۔ نجیب اشرف ندوی نے اس مضمون میں جو بھی واقعات بیان کئے ہیں بڑے دلچسپ ہیں ان سے ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوتا ہے۔ جو حضرات اس مضمون کو اس غرض سے پڑھیں گے کہ اس میں دیوانِ حافظ کے فنی محاسن و معائب سے متعلق انھیں مواد ملیگا تو انھیں سخت مایوسی ہوگی۔ دیوانِ حافظ کے اس پہلو کو بالکل سامنے نہیں لایا گیا ہے اور جس نوعیت کا یہ مضمون ہے اِس کو سامنے رکھتے ہوئے اس میں دیوانِ حافظ کی فنی خصوصیات اور اس کے عیوب کا بیان تلاش کرنا کچھ دور اندیشی بھی نہ ہوگی۔ یہاں تک مضمون کی کامیابی اور ناکامیابی کا تعلق ہے۔ بغیر کسی پس و پیش کہا جا سکتا ہے کہ اِس موضوع سے متعلق انھوں نے تسلی بخش مواد فراہم کیا ہے جو ان کے غیر محدود مطالعہ اور دور بینی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

ان کا دوسرا مضمون "کتب خانہ خدا بخش خاں کی چند نادر کتابیں" ہے۔ اس مضمون کا آغاز انھوں نے کتب خانہ کے بانی خدا بخش خاں کے علمی ذوق اور نادر و کمیاب کتابوں سے ان کی بے پناہ دلچسپی سے کیا ہے پھر اس لائبریری کی اہمیت اس کی اہم کتابوں کے نام اور ان سے متعلق مختصر معلومات فراہم کی ہیں۔ اس میں اس لائبریری کی گئی طرح کی کتابوں کے نام ہیں۔ کچھ تاریخی، کچھ تذکرے، کچھ نظم کی اور پھر کچھ متفرق موضوعات پر۔ "تاریخ خاندانِ تیموریہ" بادشاہ نامہ، شہنشاہ نامہ، شاہنامہ، تصانیف جامی، دیوانِ حافظ، دیوان میرزا کامران، سفینۃ الاولیا، کلیاتِ سعدی، انتخاب بوستان، کلیاتِ خسرو، خلاصۃ الاخبار، تاریخ طبری، مجمل فصیحی، تاریخ ابوالخیر خانی، تحفۃ الکلام، ہشت بہشت، تاریخ داؤدی، تذکرۂ اولیاء، آثار الانوار، رشحات، مجالس العشاق، مآثر رحیمی، کلمات الصادقین، گلِ رعنا، مثنوی مولانا روم، دیوانِ امامی، شش رسالہ سعدی، ہفت بند کاشی، مطلع الانوار خسرو، دیوانِ حق، دیوان سلمان، کیمیائے سعادت، روح الجنان، انیس الطالبین وغیرہ کتابوں کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ نجیب اشرف ندوی کا کوئی ناقد اس مضمون کے سلسلے میں اگر یہ کہے کہ اس میں ان کی خاص تحقیق و جستجو کا دخل نہیں ہے یا اس طرح کا مضمون لکھنا کچھ دشوار نہیں تو بظاہر درست ہو سکتا ہے لیکن ایک شخص جو اس طرح کی تصانیف کی فہرست مرتب کریگا اسے ان کتابوں کے سلسلے میں پوری معلومات حاصل کرنا ہوں گی اس لئے کہ مخطوطات کے نام اور ان کے مصنفین کے نام بعض اوقات غلط دے دیئے جاتے ہیں۔ آپ متذکرہ بالا مضمون پڑھیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ انھوں نے کتب خانہ خدا بخش خاں کی نادر کمیاب کتابوں کی صرف فہرست ہی نہیں دی ہے ان کتابوں کے اصل نام اور اصل مصنف کی تحقیق بھی کی ہے۔ اس لحاظ سے نجیب اشرف ندوی کا یہ مضمون غیر اہم قرار نہیں دیا جاسکتا۔

"ایک تاریخی غلطی" میں انھوں نے اولین مسلم فاتح ہند محمد بن قاسم الثقفی (جس کی موت کے مختلف اسباب بیان کئے جاتے ہیں) کی موت کے اصل اسباب کی تلاش کی ہے۔ فارسی کی مشہور تاریخی کتابوں "چچ نامہ" "فرشتہ" "طبقات اکبری" اور "زبدۃ التواریخ" میں محمد بن قاسم کی موت کے جو اسباب بیان کئے گئے ہیں ان کی صحت پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا اس کی نوعیت ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ ان تمام تاریخی کتابوں میں جس کا ذکر اوپر آیا ہے اس افسانے کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ درج کر لیا گیا اور اصل واقعہ کی چھان بین نہیں کی گئی۔ ان فارسی تاریخوں میں محمد بن قاسم کی موت کے اسباب اس طرح بیان کئے گئے ہیں۔

"دارالسلطنت سندھ کی فتح کے بعد مال غنیمت میں وہاں کے راجہ داہر کی دو لڑکیاں بھی گرفتار ہو کر آئیں۔ ان کے حسن و جمال کو دیکھکر نوجوان فاتح نے ان کو خلیفہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔ جب وہ دارالخلافہ میں داخل ہوئیں تو انھوں نے خلیفہ سے عرض کی کہ اب وہ حرم امیر المومنین کے لائق نہیں رہیں۔

کیوں کہ ان کو وہاں سے روانہ کرنے سے پہلے قاسم ان کے باغِ حسن کی خوشہ چینی کر چکا ہے۔ خلیفہ کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس نے فوراً خط لکھا کہ قاسم جہاں کہیں بھی ہو اسے کو نامہ بر کے حوالے کر دے جو اسے ایک بیل کی کھال میں سی کر خلیفہ کے سامنے لائے۔ جب نامہ بر قاسم کے پاس پہنچا تو فرمانبردار سپہ سالار نے اپنے کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے ہدایت کے مطابق اسے کھال میں سی لیا۔ تین دنوں کے بعد اس کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہو گئی۔

نجیب اشرف ندوی نے مذکورہ بالا سطور سے تین سوالات کے ذریعہ اصل واقعہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اول تو یہ کہ کیا واقعی داہر کی لڑکیاں گرفتار ہوئی تھیں؛ دوسرے یہ کہ کیا وہ دارالخلافہ کو بھیجی گئی تھیں؛ تیسرے یہ کہ کیا قاسم کی موت اس طرح واقع ہوئی تھی؛ ان سوالوں کے تسلی بخش جواب کے لئے انھوں نے فارسی کتابوں سے ہٹ کر عربی کی مستند کتابوں کا عمیق مطالعہ کیا۔ اگرچہ یہ قطعی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا کہ عربی تاریخوں میں اس طرح کے جو واقعات مندرج ہیں وہ مبنی بر حقیقت ہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ عرب مورخین دنیا کی دیگر زبانوں اور قوموں کے مورخین سے اس اعتبار سے مستند اور برتر ہیں کہ انھوں نے تاریخی واقعات میں اپنے منشا کے مطابق بہت کم تبدیلیاں کی ہیں۔ دوسرے مورخین کی طرح انھوں نے نسلی، جغرافی اور تہذیبی و ثقافتی حدبندیوں میں مقید ہو کر نہ تو کسی قوم کی تاریخ کو صرف خوبیوں سے سنوار نکھار کر پیش کیا اور نہ ہی کسی قوم کو ذلیل کرنے کی غرض سے ان کی تمام تر اچھائیوں کو پس پشت ڈال کر صرف برائیوں کو بیان کیا۔ انھیں جہاں سچائی نظر آئی۔ اس کو اسی رنگ میں تاریخ کے صفحات پر منقش کر دیا۔ یہ عرب مورخین کی بہت بڑی خوبی ہے اور عہد جدید یا مستقبل کا جو بھی مورخ ماضی کی تاریخ مرتب کرنے بیٹھیگا اور یہ کوشش کریگا کہ وہ جو کچھ بیان کرے اسکی صحت پہ کوئی شبہہ نہ کیا جائے تو اسے عربی تاریخوں سے بہر حال استفادہ کرنا پڑیگا۔ کچھ انھیں وجوہ کی بنا پر نجیب اشرف ندوی نے ہندوستان کے فارسی مورخین کی تصانیف سے قطع نظر کر کے عربی کی مستند کتابوں کی ورق گردانی کی اور خود بھی غور و فکر کیا مسلسل مطالعہ اور غور و خوض کے بعد وہ جس نتیجے پر پہنچے اسے حسب ذیل سطور میں واضح کیا۔

"واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اپنے عہدِ حکومت کے آخری ایام میں یہ کوشش کی تھی کہ وہ اپنے بھائی سلیمان بن عبدالملک کے بجائے اپنے بیٹے عبدالعزیز بن ولید کو جانشین بنائے۔ حجاج بن یوسف اور قتیبہ بن مسلم نے جو اس عہد کے دو مشہور افسر تھے اس کی رائے سے اتفاق کر کے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں حجاج نے قاسم کو جو سندھ میں

اس کا نائب تھا اس کو لکھا۔ لیکن یہ تجویز ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ حجاج کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کے سات ہی مہینوں بعد خود ولید بن عبدالملک کو بھی حاکم حقیقی کے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ اب سلیمان خلیفہ تھا اور اس نے ان تمام اشخاص کو جو اس تحریک کے حامی تھے قتل معزول و گرفتار کرنا شروع کیا قتیبہ بن مسلم نے اس جرم کی پاداش میں جان دی۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ حجاج نے محمد بن قاسم کو بھی اسی لئے لکھا اور اس نے یقیناً اپنے محسن و ظالم چچا کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہوگا اور اسی دعویٰ کا یہ ثبوت ہے کہ جوں ہی سلیمان تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس نے محمد بن قاسم کو معزول و قید کر کے بلا لیا اور یزید بن ابی کبشہ السکسکی کو اسکا جانشین بنایا۔ راستہ میں عراق تھا وہاں صالح بن عبدالرحمٰن گورنر تھا حجاج نے اس کے بھائی آدم بن عبدالرحمٰن کو خارجی ہونے کے جرم میں قتل کروا دیا تھا۔ اس نے جوشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لئے محمد بن قاسم کو منتخب کیا کہ اس وقت حجاجیوں کا ستارۂ اقبال ڈھل چکا تھا۔ طرح طرح کی تکلیفیں دیکر اس بدقسمت سپہ سالار اور اس کے رفقاء کی زندگیوں کو دردناک اختتام تک پہنچا دیا"۔

اوپر نجیب اشرف ندوی کے مضمون" ایک تاریخی غلطی" سے جو اقتباس ہیں نے درج کیا ہے اسے انھوں نے کسی خاص کتاب سے اخذ نہیں کیا ہے بلکہ خلیفہ ولید بن عبدالملک کے عہد سے لیکر قاسم کی وفات کے دور تک کی تاریخ کا جو انھوں نے بالتفصیل مطالعہ کیا اور اس مطالعے سے جو نتیجہ انھوں نے نکالا اسے اپنے الفاظ میں بیان کیا۔ آپ خود غور کریں گے تو دیکھیں گے کہ ولید بن عبدالملک سے لیکر قاسم تک کی تاریخ کو چند سطور میں انھوں نے کس خوبی سے بیان کر دیا اور کمال تو یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان کی اس سلسلے کی کڑیاں بالکل ملی ہوئی ہیں ان سطور کو پڑھ کر واقعتاً ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم نے اس کی مکمل تاریخ پڑھ ڈالی ہے۔

"میخانہ عبدالنبی" قدیم تذکروں کی نوعیت کا ایک تذکرہ ہے۔ اس کو مولوی محمد شفیع استاد عربی جامعہ پنجاب نے مرتب کیا ہے۔ اس تذکرہ کے نسخے کتب خانہ پٹنہ اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ اس تذکرہ میں صرف انھیں شعراء کے تراجم ہیں جنھوں نے مستقل ساقی نامے لکھے ہیں۔ یا جن کے کلام میں مرتب کو ایسے اشعار دستیاب ہوئے جو اس عام سرخی کے ذیل میں آسکتے تھے۔ مضمون کے آغاز میں۔ نجیب اشرف ندوی نے تذکرہ نویسی کی اجمالی تاریخ اور اسکی مختلف نوعیتوں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کے بعد تذکرہ میخانہ عبدالنبی کے محاسن و معائب پر روشنی ڈالی ہے۔ اس تذکرہ کے

اوصاف بیان کرتے ہوئے انھوں نے اس کی کئی خوبیوں کی طرف قارئین کے اذہان کو مبذول کرایا ہے۔ اول تو یہ کہ اس تذکرہ میں جتنے بھی شعراء کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے متعلق جن سوانحی حالات کو درج کیا گیا ہے۔ وہ بالکل درست ہیں اس لئے کہ یہ حالات مؤلف تذکرہ نے خود ذاتی واقفیت کی بنا پر تحریر کئے ہیں اور جن شعراء کے متعلق مؤلف کو خود معلومات نہ تھے انھیں شعراء کے اعزہ و اقارب سے حاصل کئے دوسرے یہ کہ تذکرہ کے مصنف نے نہایت صفائی سچائی اور ایمانداری کے ساتھ شعراء پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ جن شعراء کے کلام میں محاسن نظر آئے ان کی مدح و ستائش میں کمی نہ کی اور جن کے یہاں کچھ خامیاں ملیں اسے بیان کرنے سے گریز نہ کیا۔ اس طرح کی خوبیاں دوسرے تذکرہ نویسوں کے یہاں بہت کم ملیں گی۔ عام طور پر دوسرے تذکرہ نگاروں نے اپنی پسند کے شاعروں کے متعلق یا ان شاعروں کے متعلق جن سے ان کے ذاتی تعلقات تھے اچھی رائے قائم کی باقی شعراء کے حالات اور ان کے کلام کے متعلق ایسی مبہم اور غیر واضح رائیں دی ہیں کہ ان کی شخصیت اور فن کے اصل جوہر سامنے نہیں آتے۔ اس تذکرہ کی تیسری خوبی بیان کرتے ہوئے نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے کہ اس تذکرہ میں ایسے کئی ایک شعراء کے تراجم مندرج ہیں جو دوسرے تذکروں میں نہیں ملتے یہ در اصل تذکرہ کی اسی خوبی نے اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے اور صاحب ذوق حضرات کی توجہ اس طرف منعطف ہوتی جہاں نجیب اشرف ندوی نے "میخانہ عبدالنبی" کے ان اوصاف کو بیان کیا ہے وہیں اس تذکرہ کی بعض خامیوں کی طرف بھی ہماری توجہ منعطف کرائی ہے۔ مثلاً اس کی، سب سے بڑی خامی انھوں نے یہ بتائی ہے کہ مؤلف تذکرہ نے بہت سے ایسے شعراء کا ذکر نہیں کیا ہے جن کے ساقی نامے موجود تھے اور جن کی اہمیت بھی کسی طرح دوسرے ساقی ناموں سے کم نہ تھی اور یہ شعراء مؤلف سے پہلے کے یا اس کے ہم عصر تھے۔ اس سے دو طرح کے خیالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اول تو یہ کہ یا تو تذکرہ نگار نے جان بوجھ کر ان شاعروں کو نظر انداز کیا یا پھر یہ شعراء مؤلف کے علم میں نہ تھے مگر گمان یہ غالب ہے کہ تذکرہ نگار نے جان بوجھ کر ان ساقی ناموں کا ذکر نہیں کیا اس لئے کہ یہ ساقی نامے نہ تو غیر معروف تھے اور نہ ہی ان کے خالق قعرِ گمنامی میں تھے ایسی صورت میں اگر ان ساقی ناموں کا ذکر نہیں کیا گیا تو یہ تذکرہ نگار کی مصلحت پسندی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نجیب اشرف ندوی نے تذکرہ کے دونوں پہلوؤں (محاسن و معائب) پر نظر ڈالی ہے۔ مگر انھوں نے تذکرہ کے مرتب کی محنت کی فراخدلی سے داد بھی دی ہے۔

نجیب اشرف ندوی نے جو بھی مضامین لکھے ہیں تحقیق و تاریخ کے میدان میں اہم مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر کچھ لکھنے کے لئے ایک دفتر ہی درکار ہو سکتا ہے مگر ان کے قلم کا یہ خاص جوہر تھا کہ ایسے مسائل پر اظہارِ خیال کرنے کے لئے دوسرے محققین کی طرح سیکڑوں صفحات سیاہ کرنے کی بجائے انھوں نے چند ہی اوراق میں اپنی ہر وہ بات کہہ دی جو اس سلسلے میں کہنا ضروری تھی اور کمال یہ ہے کہ مضامین کو تشنۂ تحقیق بھی نہیں چھوڑا۔ یہ فن بڑا ہی مشکل ہوتا ہے۔ اور سچ پوچھئے تو ان کی اسی خوبی نے انھیں اعلیٰ درجے کے محققین میں جگہ دی ہے۔ ان کے ان تحقیقی مضامین کے ذریعہ ان کی وسعتِ نظر، کمالِ محنت، انتہائی باریک بینی اور اعلیٰ تحقیقی صلاحیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

"روداد رقعاتِ عالمگیر" ان کا ایک مختصر سا مضمون ہے جو معارف کے دسمبر ۱۹۲۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

دارالمصنفین نے جب رقعاتِ عالمگیری کی ترتیب کا اعلان شائع کیا تو شائقینِ عالمگیر نے اس سلسلے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اڈیٹر معارف کے یہاں خطوط لکھنا شروع کئے ان خطوط میں یہ جاننے کی کوشش کیجارہی تھی کہ رقعاتِ عالمگیر کی ترتیب کا کام کس محنت، سرعت اور تدریج سے انجام پا رہا ہے۔ چنانچہ اس وقت کے دارالمصنفین کے رفیق نجیب اشرف ندوی کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ ترتیب رقعات عالمگیر کا پروگرام شائع کریں اس غرض سے ندوی صاحب نے ایک مختصر سی روداد شائع کی اس میں ان کتابوں کی ایک فہرست بھی دی گئی جن سے اس کی ترتیب میں استفادہ کیا جارہا تھا۔

انڈیا آفس لائبریری کی فہرست" بھی کچھ اسی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس مضمون میں انڈیا آفس لائبریری کے اردو مخطوطات کی فہرست ہے۔ اس مقالے میں ایک خاص بات یہ پیدا کی گئی ہے کہ ان مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے والے انگریز اسکالر نے کتابوں اور مصنفین کے ناموں میں بعض قابل افسوس غلطیاں کی تھیں۔ نجیب اشرف ندوی نے ان کتابوں کے اصل نام ان کے مصنفین اور ان تصنیفات کے سنین تلاش کرکے ان غلطیوں کو درست کیا۔ اس اعتبار سے اس مضمون کو بھی سرسری نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے کہ جب تک ایک تصنیف کا سنِ تحریر اور اس کے اصل مصنف کا علم نہ ہو اسکو کسی خاص عہد سے منسلک نہیں کیا جاسکتا اس سے کتاب کی اہمیت پر بھی حرف آتا ہے اور جس عہد کی وہ تصنیف ہے اس عہد کا ادبی ماحول بھی دھندلکے میں رہ جاتا ہے۔ اس لئے اولین ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے قدیم ادوار کی جتنی نادر و کمیاب تصانیف ہیں ان کے اصل مصنف اور جن سنوں میں یہ کتابیں لکھی گئیں اس کا پتہ لگانا بہت ضروری ہے اور جب تک یہ کام نہیں ہوتا اردو ادب کے گذشتہ ادوار کے ادبی معیار کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کام اگرچہ ہو رہا ہے لیکن اسے انجام دینے والے چند ہی لوگ ہیں نوجوان طبقہ اس کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہا ہے۔ ہمارے کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ اگر اس طرف تھوڑی توجہ دیں اور طلباء کے ذہنوں میں اس کام کی اہمیت پیدا کردیں تو معاملہ کچھ مشکل نہیں رہ جاتا۔

ان مضامین کے علاوہ ندوی صاحب کے دو اور بہت اہم مضامین معارف میں شائع ہوئے ہیں۔ پہلا "دو اہم تاریخی دستاویز" (مراد بخش اور اورنگ زیب) دوسرا "کیا دارا شکوہ مسیحی مرا؟" (منوچی کی ایک غلط بیانی) یہ مضامین تاریخی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مغلیہ سلطنت کی پوری تاریخ میں اورنگ زیب واحد بدقسمت شہنشاہ ہے جس کے اعلیٰ انسانی اقدار، شرافت، عدل وانصاف اور رعایا پروری کو تعصب پرور مورخین نے ایسے غلط رنگ میں پیش کیا کہ اس کا اصل روپ اوجھل ہوگیا اور وہ محض ایک اسلامی مبلغ اور متعصب مسلم بادشاہ بن کر رہ گیا۔ کبھی اسے اسلام پسند کہکر اس کی شخصیت جو ہمہ گیر تھی محدود کرنے کی کوشش کی گئی کبھی اسے اپنے باپ اور بھائیوں کا دشمن و قاتل کہکر اسے خود غرض اور مفاد پرست ثابت کیا گیا اور کبھی ہندوستان کو اسلامی سلطنت میں تبدیل کرنے کی

جان توڑ کوشش کرنے والا بدیسی حملہ آور کہکر ہندوؤں کی نظر میں اسے بے عزت اور بے وقار بنانے کی جدوجہد کی گئی اس طرح کی غیر منصفانہ کوشش آج بھی جاری ہیں اور شاید ہندوستان کے فن تاریخ نویسی میں ایسی بے اعتدالیاں مستقبل میں اور زیادہ ہی ہوں گی اس لئے کہ تعصب اور فرقہ پرستی کا جنون اور بھیانک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے مگر ایسے دل شکن ماحول میں آپ ایسے انصاف پسند مورخین کو بھی پائیں گے جنھوں نے عالمگیر پر عائد کئے جانیوالے سارے الزامات کی تردید بھی کی ہے میرا خیال ہے ہندوستان کی تاریخ نویسی میں مولانا شبلی پہلے مورخ ہیں جنھوں نے ان بے بنیاد الزامات کی مدلل تردید کی ہے۔ شبلی کے بعد اسی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے ایک دوسرے بزرگ سید نجیب اشرف ندوی نے بھی اس سلسلے میں بڑا نمایاں کام انجام دیا۔ جن حضرات نے ان کی معرکتہ الآرا تصنیف "مقدمہ رقعات عالمگیر" کا مطالعہ کیا ہوگا انھیں اس بات کا ضرور علم ہوگا کہ انھوں نے کس محنت اور دلیری کے ساتھ اورنگ زیب کی شخصی زندگی اس کے عوامی اشغال اور طرز فکر کو ناظرین کے سامنے پیش کیا۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے صاف و صریح لفظوں میں اورنگ زیب پر کئے جانے والے اعتراضات کو غلط اور بے بنیاد بتا دیا ہے بلکہ اپنے دعوؤں کو مبنی برحقیقت وانصاف ثابت کرنے کے لئے انھوں نے تاریخ کے اوراق سے ایسے واقعات کی دریافت کی ہے جو اب تک قصداً گوشۂ گمنامی میں رکھے گئے تھے۔ ان کا مضمون "دو اہم تاریخی دستاویز" اسی سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون انھوں نے مقدمہ رقعات عالمگیر لکھنے کے بعد قلمبند کیا تھا اس میں اورنگ زیب کے خلاف دو سنگین الزاما کی انھوں نے تردید کی ہے اصل میں اورنگ زیب کے بارے میں ہندوستانی مورخین نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ اس نے مراد کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ اس کا (اورنگ زیب) منشا ہندوستان کا شہنشاہ بنکر اس کے طول و عرض پر حکومت کرنا نہیں ہے بلکہ دارا شکوہ کے ملحدانہ وجود کا صفحہ ہند سے خاتمہ کر کے ہندوستان کو ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کرنا ہے اور جب وہ (اورنگ زیب) اس مقصد میں کامیاب ہو جائیگا تو حکومت سے علیحدگی اختیار کرے گا۔ اور پھر خدا کی عبادت و بندگی میں منہمک ہو جائیگا اس کے بعد دارا شکوہ جو اس وسیع سلطنت مغلیہ کا سلطان بننا چاہتا ہے۔ اس کی مراد بر آئیگی، اپنے مضمون میں سید نجیب اشرف ندوی نے مورخین کے اس بیان کی کہ اورنگ زیب نے دارا شکوہ سے گوشہ نشینی اختیار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ تردید کی ہے اس کے ثبوت کے طور پر انھوں نے اورنگ زیب کے اس عہد نامہ کا ذکر کیا ہے جسے اس نے تقسیم ہند سے متعلق دارا کو تحریر کیا تھا۔ اورنگ زیب کے سر دوسرا الزام یہ عائد کیا گیا ہے کہ فتح آگرہ کے بعد اورنگ زیب نے چالاکی سے مراد بخش کو قید کروا لیا تھا۔ اس بیان کی تردید کرتے ہوئے اسی مضمون میں وہ اس طرح لقطراز ہیں۔

" اورنگ زیب نے اس وقت شاہجہاں اور مراد کی ملی جلی کوششوں سے بچنے کے لیے مراد کو قید کیا تھا۔ ورنہ اورنگ زیب پر خطرہ لاحق تھا۔

شاہجہاں اورنگ زیب سے انتقام کا جو کھلا جذبہ رکھتا تھا۔ اس جذبے نے
اسے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ وہ اسے قتل کرا دینے کی فکر میں لگ گیا چنانچہ اس
جذبے کے تحت اس نے مراد کو خط لکھا کہ وہ اگر اورنگ زیب کو قتل کر دے تو حکومت اسکی ہے
اس خط نے اورنگ زیب کو مراد کو قید کرنے پر مجبور کیا"۔

یہاں پر ایک بات اور کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ دارا اور شاہجہاں کو قید کرنے سے اورنگ زیب کا صرف یہ طلب نہ تھا کہ وہ دارا کے قاتلانہ حملوں سے نجات حاصل کرے بلکہ سلطنتِ مغلیہ کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کا بھی وہ مصمم ارادہ رکھتا تھا۔ اس لئے کہ شاہجہاں کی لاپرواہی اور دارا کی ناسمجھی و نااہلی سے پوری سلطنت کا نظام درہم برہم ہو رہا تھا۔ شاہجہاں اور دارا کے سامنے سلطنتِ مغلیہ کے عروج و زوال کا سارا دار و مدار اورنگ زیب کی حیات و موت تھی، حالانکہ ان کے خیالات درست نہ تھے اورنگ زیب کو اگر شاہجہاں اور دارا کے ناروا سلوک نہ ملے ہوتے تو شاید مغلیہ سلطنت کی تاریخ میں کچھ روشن و تابناک ابواب کا اور اضافہ ہوا ہوتا مگر اس کی وہ بے پناہ قوت جو سلطنت کے فروغ میں صرف ہونے والی تھی خانہ جنگی میں صرف ہو گئی۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سید نجیب اشرف ندوی نے اورنگ زیب کے متعلق ہر بات صاف صاف اور بالکل واضح طور پر بیان کر کے اس کی حق پسندی، کشادہ دلی، سخاوت اور غیر جانبداری کو داغدار ہونے سے بچا لیا ہے۔ تاریخ میں یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اس مضمون کو غور سے پڑھئے تو آپ کو پتہ چلیگا کہ اس کا ایک ایک جملہ ایک ایک لفظ اس گراں قدر گوہر کے مانند ہے جسے ایک غوطہ خور سمندر کی تہ کی کیچڑ سے نکال کر باہر لاتا ہے۔ کاش کہ ہمارے نوجوان مورخ اپنے پیش رو فرقہ پرست مورخین کی زہر افشانیوں کا نشانہ نہ بنکر ایسے غیر جانبدار مورخین کے تاریخی شعور سے استفادہ کرتے اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا کہ ہمارے ملک کی تاریخ کا صحیح منظر ہمارے سامنے آجاتا اور بھی ایک بہت بڑا کارنامہ ہوتا کہ تاریخ نویسی کی دنیا میں ایک ایسی جماعت تیار ہو جاتی جس کا قلم حق اور انصاف کی ترجمانی کرتا۔ وقت کی تیز و تند آندھی انسان کے فکر و خیالات کو ضرور بدل دیتی ہے لیکن ایک قوم کے افراد اپنے قوم کی تاریخ کے اوراق سے بھی بہت کچھ سبق لیتے ہیں، اس لئے تاریخی کتابوں میں فتنہ و فساد برپا کرنے والے عناصر کو جگہ نہیں ملنی چاہیئے۔ (باقی آئندہ)

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴ سے آگے) جیتا جاگتا مرقع ہے۔ نہ صرف ادارہ بلکہ خود اُن کی شخصیت بھی قدیم تہذیب و تمدن کے مطالعہ سے گویا صدیوں کا نچوڑ بن گئی تھی ؎ نچوڑ تھا کئی صدیوں کا شخصیت تیری ٭ بھلا سکے گی نہ یہ خاکِ عنبریں تجھ کو

ڈاکٹر صاحب کو پیشہ ور مورخ ہونے کا ادعا نہیں تھا لیکن آج ان کا مخالف بھی جب کبھی تاریخ دکن پر قلم اٹھاتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ دکن کے سارے راستے ڈاکٹر زور تک ہی جاتے ہیں۔ اور وہ اُن کے حوالے دینے پر مجبور ہے ڈاکٹر صاحب [illegible] بقول ڈاکٹر احتشام حسین ڈاکٹر زور [illegible] اردو [illegible] ۱۹۶۲ء [illegible] اجلاس میں پڑھا گیا

عظمت عبدالقیوم

سرزمین حیدرآباد

پیار کی گیتوں کی رنگین بہاروں کی زمیں
جگمگاتے ہوئے آکاش کے تاروں کی زمیں
باغِ فردوس کے شاداب نظاروں کی زمیں
امن و آسائش و الفت کے اشاروں کی زمیں

جس کی محفل میں ہیں گوتم کی صدائیں اب بھی
زندگانی سے ہیں معمور فضائیں اب بھی

جا بجا عظمتِ فن کے وہ ہزاروں شہکار
کیف تقدیس لئے تاج و اجنتا کا وقار
چپہ چپہ میں یہ مشرق کا فسونِ بیدار
اُف ایہ تابندہ روایات کا خوابوں کا دیار

آج بھی شامِ اودھ صبح بنارس کی قسم
ماضی و حال کا کس درجہ ہے دل کش سنگم

اپنی تاریخ کا ہر نقش ابھارا تو نے
زلفِ تہذیب و تمدن کو سنوارا تو نے
لے کے اخلاص و محبت کا سہارا تو نے
کتنے طوفانوں میں ڈھونڈا ہے کنارا تو نے

تیرے آغوش میں پل کر ہوئی اک قوم جواں
یہ ہمالہ کی بلندی تری عظمت کا نشاں

ہر طرف آج ہے بیداریٔ احساس و نظر
تیری محفل میں اجالا تری دنیا میں سحر
تیرے ذرے بھی نظر آتے ہیں الماس و گہر
ماہ و انجم سے بھی روشن ہے تری راہگذر

بن گیا امن کا پیغام ترانہ تیرا
آج دنیا کی زباں پر ہے فسانہ تیرا

تیری آزاد فضاؤں میں ہے پیغامِ حیات
تیرے میخواروں کے ہاتھوں میں ہے اب جامِ حیات
تیرے افسانے کا عنوان بنا نامِ حیات
دے دیا تو نے ہر اک عزم کو انعامِ حیات

انجمن میں تری گاندھی کی بصیرت زندہ
تیرے سینے میں ہے انساں کی محبت زندہ

رحمٰن جامی

شہرِ نگاراں

رات کو نیند جب نہیں آتی
شعر اپنے ہی گنگناتا ہوں
وقت کٹتا نہیں کسی صورت
حال پر اپنے مسکراتا ہوں
فکر کے کھولتا ہوں دروازے
دیپ یادوں کے بھی جلاتا ہوں

کتنے روشن تصورات حسین!
پھر مرے ذہن و دل پہ چھاتے ہیں
کتنے نازک حسین جسموں کے
بُت مرے آگے آتے جاتے ہیں
ان میں مغرور بھی ہیں خود بیں بھی
ہر قدم پر جو دل دکھاتے ہیں
جو فقط اپنی تاب کی خاطر
دوسروں کے نگر لٹاتے ہیں
میں بھی ان کے عتاب کا ہوں اسیر
یاد جو کرکے بھول جاتے ہیں۔

شبِ غم سوچ کر یہی سب کچھ
مَیں نے اپنی نظر کو پرکھا ہے
دل کو آتی نہیں ہے خود بینی
دل کے آگے وفا کا پردہ ہے
اور پھر اس کے بعد سوچا ہے
دل بھی اپنا نہیں پرایا ہے
کیونکہ اس مختصر خزینے میں
کتنے لوگوں کا غم سمایا ہے

اپنے حسنِ نظر کے مَیں صدقے
غم جو اپنا نہ تھا وہ اپنا ہے
اے وطن تیرے حسن کی سوگند
تجھ کو جنت ہی مَیں نے سمجھا ہے
اور اس رشکِ خیز جنت میں
کتنے میں نے حسیں بھی دیکھے ہیں

جن میں تسخیرِ دل کی قدرت ہے
ایسے کچھ مہ جبیں بھی دیکھے ہیں
کچھ تو دیکھے ہیں اور کچھ مَیں نے
حسن والے نہیں بھی دیکھے ہیں
جانے کتنے حسیں ابھی ہوں گے
جن کو دیکھا ہے اور نہ جانا ہے
جن کے بارے میں حسنِ ظن ہے ابھی
دل تو یوں بھی فریب خوردہ ہے
یوں بھی کب کیا دیا حسینوں نے
درد جو وہ بھی بے مداوا ہے
اور اس پر بھی کب رہے خاموش
درد دے کر پھر آزمایا ہے
حیدرآباد ہی میں اے جامی
ان حسینوں نے مجھ کو لوٹا ہے
اور لوٹا ہے یوں سرِ بازار
یہ تماشہ سبھی نے دیکھا ہے

برق یوسفی

حیدرآباد (سانیٹ)

حیدرآباد دل کی صورت ہے
دل دھڑکتا ہے سانس چلتی ہے
آرزو زندگی کی پلتی ہے
حیدرآباد اک محبت ہے

حیدرآباد ہے قلیؒ کا دل
جسمیں بستا ہے حسنِ بھاگ متی
اور اس شہر شعر و نغمہ کی
زندگی ہے کہ پیار کی محفل

قبلۂ دل کہوں گا میں اس کو
'حیدرآباد ہے وطن میرا'
رشکِ جنت ہے یہ چمن میرا
یہ نہیں ہے تو کیا ہے تم ہی کہو

زخم الفت کا بھر نہیں سکتا
حیدرآباد مر نہیں سکتا

قطب سرشار

حیدرآباد

یہ شہر عشق و محبت کی داستاں کی کتاب
یہ شہر شاعر رنگیں نوا کا دلکش خواب
یہ شہر علم و ادب سوز شاعری کا رباب
یہ شہر شہر نوا حسنِ زندگی کا شباب

یہاں کی شام کا پرکیف سانولا چہرہ
ہے جس میں بھاگ متی کی صباحتِ رخسار
قلی قطب کی وفاؤں کا جس میں رنگ بہار

یہ سرزمین کہ جس نے وفا کی بستی میں
امام پیدا کئے فکر و فن کے قدآور
محققوں میں بڑا زور سا محقق تھا
سخنوروں میں قطب شاہ سا سخنور تھا

یہ سرزمیں ہمیشہ گہر اگلتی رہی
یہاں کی خاک حسیں پیکروں میں ڈھلتی رہی
یہ شہر شہر نوا حسنِ زندگی کا شباب
نوائے علم و ادب سوز شاعری کا رباب

قدر عریضی

حیدرآباد اور زورؔ

آلام و حادثات ستائیں تو کیا کریں — ابھرے نقوش لوگ مٹائیں تو کیا کریں
جور و جفا کا رنگ جمائیں تو کیا کریں — ظلمت میں راہ فکر نہ پائیں تو کیا کریں
اپنا چراغ دل نہ جلائیں تو کیا کریں

ملتی ہے جا کے خاک میں خاکی کے تن کی خاک — سرمہ ہے عندلیب کے حق میں چمن کی خاک
ہے کہتے قطب شاہوں کی مٹی دکن کی خاک — محبوب سب کو ہوتی ہے اپنے وطن کی خاک
اپنے وطن کے گیت نہ گائیں تو کیا کریں

تاثیر خود میں رکھتی ہے خاکِ دکن عجیب — ابھرے اسی جگہ سے مفکر، ذکی، خطیب
تشہیر ان کی ہوگی کیا دور کیا قریب — کرتے ہیں یاد زورؔ کو ذی ہوش سب ادیب
ہم یاد زورؔ کی نہ منائیں تو کیا کریں

اس درجہ زور دار ہے معیار زورؔ کا — اردو کا ہر ادیب طرفدار زورؔ کا
ہے صاف صاف جادۂ افکار زورؔ کا — مجبور جب کرے ہمیں کردار زورؔ کا
ہم یاد زورؔ کی نہ منائیں تو کیا کریں

اے سرپرستِ علم و ادب خوش مزاج زورؔ — سر پہ ہے تیرے اردو نوازی کا تاج زورؔ
تو جزم فکر و فن کا ہے روشن سراج زورؔ — حد سے بڑھی ہوی ہے تری یاد آج زورؔ
ہم تیری یاد اب نہ منائیں تو کیا کریں

اردو عجب ترے ہی خواہوں میں زور ہے — دل میں ہے آنکھ زور نگاہوں میں زورؔ ہے
دعوے میں زور ادر گواہوں میں زور ہے — لفظوں میں زور معنوی راہوں میں زورؔ ہے
اردو میں حال دل نہ سنائیں تو کیا کریں

ایوان بنگیا ہے اک اردو کا شاندار — ہر علم و فن کی جس میں کتابیں ہیں بے شمار
شعر و ادب کی نظر میں سب رس کا ہے وقار — یہ سب کے سب ہیں زورؔ کی کوشش کے شاہکار
... تو کیا کریں

مرزا سرفراز علی

ڈاکٹر زورؔ

ادب نواز ادب دوست رُوحِ وجانِ ادب
کبھی نہ زورؔ کو بھولیں گے رہروانِ ادب

زباں کا مردِ مُجاہد وہ عاشقِ اُردو
محیُ دین رہا میرِ کاروانِ ادب

دکن کی خاک کے شیدا دکن کے متوالے
جنوں نے تیرے بڑھائی ہے آن بانِ ادب

بلند عزم پہ بالاحصار نازاں تھا
جبیں پہ تیری مچلتے تھے کہکشانِ ادب

ہماری بزم میں تو کوہِ نور بن کے رہا
تو شمعِ شہرِ قلیؔ تو چراغِ کانِ ادب

محاوروں کو دکن کے حیاتِ تازہ دی
سجائی محفلِ نو بن کے میزبانِ ادب

رہینگی تیری تصانیف زندۂ جاوید
لگا ینگے انھیں سینے سے عاشقانِ ادب

جتن ہزار کیے تھے زباں کی خدمت میں
لیا نہ چین کبھی تو نے پاسبانِ ادب

"صلائے عام تھی یارانِ نکتہ داں کے لیے"
بچھا تھا اُردو کے ایواں میں ایک خوانِ ادب

سلام زورؔ کو اُستادِ محترم کو سلام
وہ سرفراز کا محسن وہ مرزبانِ ادب

وقار خلیل

ایک آواز

(زورؔ اور مخدومؔ کی معطر یادوں کے نام)

•

رات اندھیری ہے چراغوں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش نہ ہو جائے کہیں
اک کرن حسنِ تمنا کی جلائے رکھنا
صبح تک شعلۂ انفاس فروزاں تو ہے
حیدرآباد کی تہذیب نہ کجلائے کہیں
راگ اور رنگ کی تحریر نہ مٹ جائے کہیں
پیار شرمندۂ عکسِ لب و رخسار نہ ہو
زورؔ و مخدوم کا نام آتے ہی دل ڈوبتا ہے
اور پلکوں سے ستارہ سا کوئی ٹوٹتا ہے
اور رہ رہ کے یہ ہوتا ہے گماں ——
حیدرآباد کی تہذیب نہ کجلائے کہیں
تازگی فن کی نہ مرجھائے کہیں
وہ تمازت ہے کہ جلتے ہیں بدن
فکر کا شعلۂ احساس نہ سنولائے کہیں
ایک آوازِ شبِ تار ہیں روشن سی ہے
دوستو! پیار کی قندیل جلائے رکھنا!
زورؔ و مخدومؔ کے رشتے کو بچائے رکھنا!

از: علی سرور

محسنِ اُردو

پھر چھیڑ گئی ہے درد بھری داستاں کوئی
آتا ہے یادِ محسنِ اُردو زباں کوئی

ہر با ادب اداس ہے نا مطمئن ہے آج
یعنی جنابِ زورؔ کی برسی کا دن ہے آج

وہ زورؔ جس کے دِل میں تڑپ تھی زبان کی
وہ زورؔ جس نے خدمتِ اردو میں جان دی

للکار جس کی سوتوں کو بیدار کر گئی
اردو زباں کی زلفِ پریشاں سنور گئی

حسنِ بیاں سے زورِ قلم سرفراز تھا
اُردو کو زورِ قوتِ بازو پہ ناز تھا

پھولی پھلی زبان اسی سرزمین پہ
اہلِ دکن کو فخر ہے اِس مہ جبین پہ

برسوں سے اِس زبان کی صورت گری ہوئی
اردو دکن کی گود میں پل کر بڑی ہوئی

اہلِ دکن کی دی ہوئی یہ ساری شان ہے
غواصیؔ، نصرتیؔ کی، ولیؔ کی، زبان ہے

دعویٰ کیا تھا زورؔ نے ثابت بھی کر دیا
جامِ کہن میں بادۂ تحقیق بھر دیا

سر دھن رہے ہیں اب بھی مقالاتِ زورؔ پہ
اہلِ زباں کو فخر ہے خدماتِ زورؔ پہ

وہ پھول ہے کہ جس پہ ہے سارے چمن کو ناز
ہندوستان کو ناز ہے اہلِ دکن کو ناز

تالیف بے مثال، تصانیف لاجواب
تنقید ہی کے فن نے کیا مل کو بے نقاب

دورِ روزہ زندگانی میں وہ کام کر گیا
خاکِ دکن کو رتبۂ چرخِ بریں دیا

جا کر دکن سے دور گلستاں میں سو گیا
نوحہ دکن کا نوحۂ کشمیر ہو گیا

تارِ مژہ میں اشک پروتے ہیں آج بھی
اے زورؔ تیری یاد میں روتے ہیں آج بھی

سارے جہاں میں زورؔ کی خدمت کا شور ہے
سرورؔ بھی اک قدیم پرستارِ زورؔ ہے

نقد و نظر

میگزین
فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی
غالب نمبر

بہ سرپرستی شمشاد حسین پرنسپل فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی۔ مرتب ڈاکٹر محمد شکیل احمد صدیقی

اسلامیہ کالج بریلی ۱۹۰۷ء میں ایک مکتب کی شکل میں قایم ہوا اور آج انٹر کالج ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جہاں صرف سوا تین سو طلبا تھے آج ان کی تعداد دو ہزار چھ سو ہے جب خرچ صرف دس ہزار سالانہ تھا آج تقریباً تین لاکھ ہے اور صرف چار کمروں والی عمارت آج چالیس کمروں پر مشتمل ہے۔ یہ عمارت پہلے بریلی کالج (جو آج روہیلکھنڈ کا سب سے بڑا اور قدیم پوسٹ گریجویٹ کالج ہے) کی بورڈنگ کے طور پر استعمال ہوتی تھی جہاں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے ملک کے مایۂ ناز سپوت تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں رہے ہیں اساتذہ میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور خواجہ احمد فاروقی کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ اِس طرح اِس درس گاہ نے اعلیٰ روایات قایم کی ہیں اور آج انھیں پر گامزن ہے۔

درس گاہ کے منیجر جناب عبدالواحد صاحب چالیس سال سے اِس کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُردو اور فارسی سے ذوق گہرا ہے آپ کی فرض شناسی اور بے لوثی نے کالج کو آج اِس بلند مقام تک پہنچایا ہے۔ نام سے زیادہ کام کی لگن نے انھیں ہمیشہ ہر کام میں در پردہ ہی رکھا۔ اِس رسالے کے حسن و جمال میں جو اضافہ ہوا ہے پردۂ زنگاری میں انھیں کا ہاتھ ہے۔

شمشاد حسین صاحب پرنسپل بیس سال کی طویل مدت سے اس کی عنان نظم و نسق تھامے ہوئے ہیں۔ ایسی درسگاہ سے غالب نمبر کا اجرا خلاف توقع تو نہیں کہلایا جا سکتا۔ جہاں فاضل اساتذہ موجود ہوں اور جن کی رسائی علمائے عصر تک ہو تو ان کے لئے خاص نمبر نکالنا مشکل نہیں۔ لیکن یہ کہنے کی بات ہے۔ عملاً جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

فاضل مرتب نے اس کو نہایت سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ متنوع مضامین فراہم کئے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف حسن نے "شعرائے بریلی اور غالب پر" نہایت سیر حاصل اور قابل مطالعہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔" خان بہادر عبدالجلیل جنون (شاگرد غالب) پر تنویر سعید صاحب کا تحقیقی مضمون فاضل مرتب کے دو مضمون بادۂ جاں فزا اور غالب خدا کے حضور میں ہیں۔ حضرت عرشی کا مقالہ اُردو شاعری پر غالب کا اثر" پروفیسر ضیار احمد بدایونی کا" غالب کی ایک غزل کا تجزیہ" پروفیسر عبدالشکور کا "غالب کی انسان دوستی" سید سکندر آغا کا مضمون گلاب غالب کا ایک غیر مطبوعہ نادر شرح مصنفہ بے خود موہانی۔ شمشاد حسین صاحب کا مضمون" غالب گردش ایام کے آئینہ میں اور نصیر احمد صدیقی کا مضمون" غالب فارسی غزل کے آئینہ میں" قاری کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، وجاہت علی سندیلوی، ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی اور محمد عرفان صاحب

علاوہ اور کئی اساتذہ کی تخلیقات شامل ہیں۔ نہم، دہم اور کالج کے طلبا کے مضامین کا معیار بھی بلند ہے۔ خوبصورت ٹائیٹل کے علاوہ غالب کی مختلف مراحیر کے عکسوں کو مضامین کے آخر میں غالب کی تحریروں کے اقتباسات کے بعد دیگر رسالہ کی تزئین کی گئی ہے۔

کالجوں کے رسائل کے جو غالب نمبر نکلے (یونیورسٹیوں کا ذکر نہیں) ان میں یہ نہایت کامیاب ہے اور ان کے حوصلوں اور عزائم سے زیادہ۔ یہ شمارہ پانچ روپے میں کالج سے مل سکتا ہے۔ یہ قیمت رسالے کی ضخامت اور حسن و خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں بلکہ نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔

تاثرات سفر ایران

ڈاکٹر رضیہ اکبر۔ ناشر ادبی ٹرسٹ حیدرآباد صفحات ۱۸۵۔ مجلد معہ گرد پوش۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر جامعہ عثمانیہ میں شعبہ فارسی کی صدر ہیں۔ انھیں ایران جانے کا موقع ملا اور وہاں دوران قیام میں جو تاثرات انھوں نے قبول کئے یہ ان کا نقش ہے۔ اس کا حرف اول عابد علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ سیاست) اور پیش لفظ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے لکھا ہے۔ ٹرسٹ کی پہلی کتاب غالب اور حیدرآباد پر غالب نمبر حصہ دوم میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ یہ دوسری کتاب ہے جو ٹرسٹ سے منظر عام پر آئی ہے۔ سفر نامہ بڑی دلچسپ چیز ہوتی ہے۔ بعض ایسے سفر نامے بھی ہیں کہ مسافر کے ساتھ ہم بھی ہم سفر ہو جاتے ہیں۔ مصنف کی تحریر کی دلآویزی، دلکشی اور دل بستگی کو ختم نہیں ہونے دیتی۔ خواہ دلکش واقعات ہوں یا اسلوب بیاں۔

ڈاکٹر رضیہ اکبر کا اسلوب بیان اس سفر نامہ میں بہت زیادہ شاعرانہ ہو گیا ہے۔ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے چلنے کی کوشش تو کرتی ہیں لیکن اس کوشش میں واقعات کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ بات دو ٹوک نہیں ہو بلکہ حرف زیر لب بن جاتی ہے۔ حجاب کا یہ انداز شاید ان کی اپنی نسائیت کی وجہ سے ہے۔

کتاب ختم ہو جاتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایران پر ابھی کچھ پردے پڑے ہیں جو اٹھنے نہیں پائے۔ اسلوب کی دل آویزی سے کتاب دلکش اور قابل مطالعہ ہو گئی ہے لیکن ۱۸۵ صفحوں کیلئے پانچ روپے قیمت بہت زیادہ ہے۔

الجھی لڑکی کالے بال

کرشن چندر۔ ناشر ادبی ٹرسٹ بکڈپو حیدرآباد ۱ء ۲۲۵ صفحے مجلد۔

یہ ٹرسٹ کی تیسری کتاب ہے اور کرشن چندر کی کہانیوں (افسانوں) کا مجموعہ۔ اس میں ایک حرف اول ہے اور تیرہ کہانیاں۔ حرف اول ٹرسٹ کے معتمد عابد علی خاں نے لکھا ہے اور بتلایا ہے کہ ٹرسٹ کب کیوں اور کیسے قایم ہوا۔ ٹرسٹ کی پہلی کتاب غالب اور حیدرآباد تھی اور دوسری تاثرات سفر ایران۔ کرشن چندر کی کتاب چھاپنے کا سبب یہ ہے کہ حرف اول لکھنے والے صاحب کے الفاظ میں "کرشن چندر کا حیدرآباد سے تعلق کسی وضاحت کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کئی مرتبہ حیدرآباد آچکے ہیں"۔ اگر بنیاد صرف یہی ہے تو کتنے ہی ادیب باہر سے یہاں آئے اور زندگیاں ختم کر دیں۔ اپنے فن پاروں سے ادب کو مالا مال کیا لیکن متاع کس مپرسی رہے اور گھر کی مرغی تو دال برابر

ر ہوتا کہ بات دو ٹوک کی جاتی کہ ٹرسٹ کا مفاد پیش نظر رکھ کر "ابھی لڑکی کالے بال" شائع کی گئی ہے۔

کرشن چندر نے ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب
ں تیرہ افسانے ہیں اور منجملہ تیرہ کے صرف تین میں کرشن چندر کی تحریر کا رنگ نکھرتا اسلوب بیان ملتا اور تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے
ن کی پچھلی دو چار سال کی تصانیف میں کرشن کا قلم تھکا تھکا سا اور تخیل رکا رکا سا محسوس ہونے لگا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ ازدیاد کاری کے
ث ہو یا حکم حاکم کی طرح "بہرحال لکھنا تو ہے" "سب ہو" "ابھی لڑکی کالے بال" بھی اسی انداز کے افسانوں کا مجموعہ ہے اور کرشن چندر کی
شیدائیوں کے لیئے صلائے عام۔ میں نے جن تین افسانوں کا ذکر کیا ہے وہ ہیں۔ نئی تمیض (وناۓ ضلع سے) گرھا اور
ک بینگ نیٹنگ۔ پانچ روپے میں کتاب مہنگی رہے۔

یا آدم" ہفتہ وار "مخدوم نمبر" مرتبین۔ کے ایل مہندرا، احسن علی مرزا۔ امجد باغی
حمایت نگر۔ حیدرآباد صفحے ۲۵۰ قیمت دو روپے۔

"نیا آدم" نے مخدوم کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرنے کیلئے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ لکھنے والوں میں
بھی ایسے ہیں جو مخدوم سے راست متعارف تھے اشفاق حسین۔ شکور بیگ، یحییٰ صدیقی، عمر خاں، حیدر حسین، محبوب نالائق
مہ، احسن علی مرزا، عابد علی خاں، مہدی اور زینت ساجدہ وغیرہ سے بے تکلف دوستی تھی۔ حیدرآباد سے باہر کے رہنے والوں میں
سجاد ظہیر، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، شبنم قیوم، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، آل احمد سرور وغیرہ بھی اجنبی نہیں اور بارہا
مخدوم سے مل چکے تھے۔ اس لئے سب کا انداز تحریر افسردہ جذبات سے مملو ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ ہم سے ایک ایسی پہلو دار
شخصیت اچانک چھین لی گئی ہے جیسے کسی چھوٹے بچے کے ہاتھ سے کسی نے کھلونا چھین لیا ہو ۔ نیا آدم کی محفل میں جن ادیبوں نے
شرکت کی ہے ایسا جان پڑتا ہے کہ ابھی ان کے آنسو خشک نہیں ہوئے اور اپنی تحریروں میں سے

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

کا مظاہرہ کیا ہے یحییٰ صدیقی نے ہاسٹل کی زندگی کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے۔ مادر جامعہ کے شہر میں قیام کے
آخری دور کی ایک روشن تصویر سامنے آتی ہے اور اس برات کا دولھا مخدوم ہی ہے۔ ہم جستہ جستہ مضامین
میں مخدوم کی سیاسی زندگی سے بھی واقف ہوتے ہیں اور شاعری سے بھی بعض سے مغربی ممالک کے سفر کا حال بھی کھلتا ہے
اور روپوشی کی زندگی بھی سامنے آتی ہے لیکن ابھی زخم ہرے ہیں۔ اس کی یاد دل پر تیر وسناں کا کام کرتی ہے۔ اگر یہ
دیکھنا ہو کہ مخدوم کیسے کیسے ادیبوں اور شاعروں کو عزیز تھے اور کن کن کی آنکھوں سے ابھی آنسو نہیں تھمے ہیں تو نیا آدم
کا یہ مخدوم نمبر ملاحظہ فرمائیے۔ نیا آدم کا ادارہ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے مخدوم کی بارگاہ میں ایک نذرانۂ عقیدت
پیش کیا۔ مستقبل کے لئے یہ ایک اہم دستاویز ثابت ہوگا۔ قیمت دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑا کہ نرخ بڑھانے کی ضرورت
تھی۔

غالب کی کہانی

محمد شفیع الدین نیر - نیر کتاب گھر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
۱۲۸ صفحے خوبصورت گٹ اپ - قیمت دو روپے۔

جناب نیر صاحب بچّوں کے شاعر کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں۔ غالب کی کہانی انھوں نے فوقانی جماعت کے بچوں کے لئے لکھی ہے۔ اس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں زندگی کے حالات اور شوق شاعری کا حال ہے۔ دوسرے میں ان کی غزل گوئی اور شاعری سے بحث ہے۔ تیسرے میں ان کے قصائد مثنویاں اور دیگر اصناف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان کی نثر نگاری ان کی شوخی و ظرافت اور خطوط نگاری سے بحث ہے۔

بچوں سے غالب کی روشناسی پر یہ پہلی کتاب ہے جو اتنی جامع اور عام فہم انداز میں لکھی گئی ہے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی گئی اور ان کی پسندیدگی حاصل کر چکی ہے۔ ذاکر صاحب بھی بچوں کیلئے لکھتے رہے ہیں اس لئے ان کی رائے بیحد اہمیت کی حامل ہے۔ بچوں ہی میں نہیں بلکہ بڑوں میں بھی یہ کتاب مقبولیت حاصل کرے گی۔

بھاگ متی کے دیس میں

فاطمہ یزدانی۔ مطبوعہ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چادر گھاٹ حیدرآباد۔ صفحے ۲۶۴
مجلد، خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت ۶/۰۰

فاطمہ یزدانی ڈاکٹر غلام یزدانی او' بی' ای سابق ناظم آثار قدیمہ کی صاحبزادی ہیں۔ اونچے معاشرے میں ابھریں اور اعلیٰ تعلیم پانے سے انسان دوستی یک جہتی حب الوطنی اور ترحم پرستی کے جذبات نے پرورش پائی۔ پیش نظر کتاب انھیں کا ناول ہے۔ جو مذکورہ جذبات کا آئینہ دار ہے۔ ناول کے پہلے صفحے پر لکھا گیا ہے کہ تمام کردار فرضی ہیں۔ لیکن جب ہم کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں تو جانی پہچانی شخصیتیں سامنے آتی ہیں اور مصنفہ کا دعویٰ جسارت بے جا معلوم ہوتا ہے۔ ناول میں نوجوان طبقہ کی ذہنیت کی بڑی خوبی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے اور چونکہ اکثر و بیشتر واقعات کا ماحول حیدرآباد کی گلیاں ہیں اسلئے مقامی رنگ بہت چوکھا ہو گیا ہے۔ حیدرآباد کے رہنے والوں اور دیکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی اور ممکن ہے کہ جن لوگوں نے نہ دیکھا ہو اور ناول پڑھیں تو اُن کے دِل میں حیدرآباد کے دیکھنے کی تمنّا جاگ جائے۔

اُمید ہے کہ یہ ناول دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ چھ روپے میں کتاب گراں ہے۔ اُردو پڑھنے والے اتنی گراں قیمت کی کتاب خصوصًا ناول خرید کر نہیں پڑھتے۔

محمد اکبرالدین صدیقی

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۴ شمارہ (۵)

مئی ۱۹۷۱ء

ماہنامہ

سب رس

زرسالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے پندرہ روپے
ششماہی چار روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے
پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد

ترتیب

مجلسِ مشاورت:—

پروفیسر سید علی اکبر نگران

میر حسن

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر غلام عمر خاں

محمد منظور احمد

محمد اکبرالدین صدیقی مرتب

محمد جمال الدین مہتمم

وقار خلیل منتظم

ڈاکٹر نورالسعید اختر

قدیم اُردو کے چند شہ پارے

قدیم اُردو ادب کے شہ پارے مختلف کتب خانوں میں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ انھیں تلاش و جستجو کے بعد یکجا کر دینا ایک اہم کام ہے۔ مجھے دورانِ قیام علی گڑھ میں انجمن کے کتب خانے سے جو دکنی کلام دستیاب ہوا ہے وہ شائقین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

انجمن ترقی اُردو علی گڑھ کے کتب خانے میں ایک بیاض (نمبر ۴ ت) ہے جس میں فارسی اور اردو کلام موجود ہے۔ اس بیاض میں سب سے پہلے انتخاب دیوان علیم اللہ شاہ منقول ہے۔ اس کے بعد سوال و جواب علیم اللہ شاہ بہ ارادت خاں کے عنوان سے چند اشعار موجود ہیں۔

اس بیاض میں میری نظر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متخلص بہ شہباز کی غزل، شغلی کی رباعی اور معظم بیجاپوری کی غزل پر پڑی۔ انھیں ذیل کی سطور میں مختصر نوٹ کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱) دکن میں قدیم اُردو کی شعاعیں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ۱۳۲۱ء تا ۱۴۲۲ء کے صوفیانہ اذکار کے باعث نور و ضیاء سے منور ہوئیں۔ خواجہ بندہ نواز کی نثری تصانیف قدیم اُردو کے مذہبی دور کی اولین تخلیقات سمجھی جاتی ہیں۔ مذہبی رنگ اور صوفیانہ رموز سے بھرپور آپکی ایک غزل جس کا پہلا مصرعہ ہے " تر توں صحیح ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں" ہے۔ اکثر بیاضوں میں ملتی ہے۔ اور تاریخ ادب کی کتابوں میں بھی موجود ہے۔

(۲) معظم بیجاپوری:۔ اسی بیاض میں معظم تخلص کرنے والے شاعر کی ایک غزل بھی ہے۔ معظم سے متعلق مختصر سی معلومات ہمیں قدیم اُردو کی جلد اول (۱۹۶۵ء) سے فراہم ہوتی ہیں۔ ابو النصر محمد خالدی، استاد شعبہ تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، معظم سے متعلق رقمطراز ہیں:۔

"بیجاپور میں معظم تخلص کے صوفی بزرگ ہوئے ہیں۔ متعدد مثنویاں، چند قصیدے اور کچھ مخمس و مسدس ان کی یادگار ہیں۔ اِن کی غزلوں کا ایک دیوان بھی پایا جاتا ہے۔[1]"

"نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ "معظم سکندر عادل شاہ کے زمانے میں موجود تھا اور امین الدین اعلیٰ کے

۱؎ قدیم اُردو: جلد اول سن ۱۹۶۵ء ص: ۲۲۲ مۓ محمد حسینی معظم بیجاپوری (اکبر)

مرید اور خلیفہ قادر کی شاگردی کی[1]

خالدی صاحب نے اپنے مقالے میں اندرونی شہادتوں کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کہ "معظم کا زمانہ گیارھویں صدی ہجری کا تقریباً نصف آخر اور بارھویں صدی کا ثلث اول ہے"[2]

مندرجہ بالا بیانات کی روشنی میں معظم کے کلام کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ خالدی صاحب نے اپنے اسی مقالے میں صفحہ ۲۵۰ تا ۲۵۴ معظم کا ایک قصیدہ تصحیح متن کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مجھے جو غزل دستیاب ہوئی ہے وہ دراصل اسی قصیدے کے اشعار ہیں۔ میں ان اشعار کو خالدی صاحب کے مرتبہ متن کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔

خالدی صاحب کے مرتبہ معظم کے قصیدے میں ۲۱ اشعار ہیں۔ ان میں سے صرف نمبر ۱-۲-۳-۴-۸-۹-۱۰-۱۹-۲۱ اشعار زیر بحث ہیں۔ علاوہ ازیں مجھے اس قصیدے کا ایک ایسا شعر بھی دستیاب ہوا جو خالدی صاحب کے پیش کردہ متن میں نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معظم کا قصیدہ اکیس ۲۱ اشعار پر نہیں بلکہ ۲۲ اشعار پر مبنی ہے۔

بحر ہزج مثمن سالم

غزل معظم ماخوذ از بیاض انجمن ترقی اردو علی گڑھ	خالدی صاحب کے مرتبہ قصیدہ معظم کے اشعار
(۱) محباں فرض ہے بوجنا امر اللہ اکبر کا	محباں فرض ہے بوجھنا امر اللہ اکبر کا
جو افلا تیعروں بوزیا سو کیا ہے راز دلبر کا	جو افلا تیعرو بوزیا سو کیا ہے رمز دلبر کا
(۲) لوازم سب پوآیا ہے پچھانت یہاں جچو کتا	لوازم سب پوآیا ہے پچھانت یہاں چ کر کتا
جو یہاں اندھا سو وہاں اندھا خبر ہے روز محشر کا	جو یاں اندھا سو واں اندھا خبر ہے روز محشر کا
(۳) غرض ہے پھر کر آتا نیں اس تے عرض کرتا ہوں	غرض ہے پھر کے آتا نیں اسی تے عرض کرتا ہوں
نیاڑا بیگے کر لینا عزیزاں پیش و پشتر کا	نیاڈا بیگ کر لینا عزیزاں پیش و پستہ کا
(۴) جو طالب طلب دھرتا ہے خدا سوں وصل ہونا کر	جو طالب طلب دھرتا ہے خدا سوں وصل ہونا کر
پچھلے پڑھو عرف کی ہور درس لے راہ رہبر کا	پٹی پڑھ من عرف کے ہور درس لے راہ رہبر کا
(۵) مقاماں ہور منزل کر جو لاوی چار رہبر سوں	مقاماں ہور منزل کو جو لیاوے چار رہبر سوں
رفیق ایسا اچھے رہبر جو واقف خیر ہور شر کا	رفیق ایسا اچھے رہ پر جو واقف خیر ہور شر کا
(۶) کہ یہ تن نفس دل روح ہے الگ راستیل یاوے	
بزلن ۲۲ ایسر نفی ثابت عیاں ہور خیر ہور شر کا	

---

[1] دکن میں اردو، ہاشمی ص: ۲۶۹		[2] دکن میں اردو، ہاشمی ص: ۲۴۴

(۷) نفس و دل روح سوں جھلکوں کرے سر نوریں آشنا
تو بعد از نور میں دیکھو تو دستا ذات انور کا
(۸) ہوائیں حق ستی واصل علم تحصیل کیا تو کیا
پچھانت ایک نکتہ ہے عبث کیا کام دفتر کا
(۹) زہد کر زاہداں مرتے عجب ہیں مشرب رنداں
تفکر ساعت کا کرتے عبادت برس ستر کا
(۱۰) فنا فی اللہ ہوا اوّل توں او شاہد ہو رہیا باقی
نقاب کبریا میانے وصل ماہِ منور کا
(۱۱) ہوا تر لوک پر غوغا جو آیا یوسفِ ثانی
نویلا شہنشہ شاہ قادری صورت لسب پیمبر کا
(۱۲) معظم توں جدا ہو رہو خدا ہونا تو مشکل ہیں
سمج محیطِ مطلق کوں ان مدد لے دارِ داور کا

نفس و دل روح سوں جھلکوں کرے سر نور سوں اشنا
سو بعد از نور میں دیکھے تو دستا ذات انور کا
ہوائیں حق ستے واصل علم تحصیل کیا تو کیا
پچھانت ایک نکتہ ہے عبث کیا کام دفتر کا
زہد کر زاہداں مرنے عجب ہے مشرب رنداں
تفکر ساعت کا کرنے عبادت برس ستر کا
فنا فی اللہ ہوا اوّل توں و شاہد ہو رہتا باقی
نقاب کبریا میانے وصل ماہِ منوّر کا
ہوا تر لوک پر غوغا کہ ثانی آئیا یوسف
نویلا لال قادر شاہ صورت لے سب پیمبر کا
معظم تو بندہ ہو رہ خدا ہونا تو مشکل نئیں
سمجھ محیط مطلق کوں مدد لے دارِ داور کا

---

(۶) شعر نمبر ۵، مصرعہ ثانی (۷) شعر نمبر ۶ - خالدی صاحب کے متن میں نہیں ہے۔ (۸) شعر نمبر ۷ - مصرعہ اولیٰ (۹) شعر نمبر ۹ مصرعہ اولیٰ (۱۰) شعر نمبر ۱۰، مصرعہ اولیٰ (۱۱) شعر نمبر ۱۱، مصرعہ اولیٰ و ثانی (۱۲) شعر نمبر ۱۲ مصرعہ اولیٰ۔

(۳) **پیر پاشاہ حسینی** :- دسمبر ۱۹۶۰ء میں اردو ادب ص: ۴۷ کے شمارے میں جناب سخاوت مرزا صاحب کا ایک مضمون پیر پاشاہ حسینی اور ان کے دیوان سے متعلق شائع ہوا تھا۔ سخاوت مرزا صاحب نے لکھا ہے کہ پیر پاشاہ حسینی ۱۰۶۰ھ اور ۱۰۸۰ھ کے درمیان عہد عادل شاہیہ میں بیجاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد اور سلسلہ خلافت سے متعلق حوالے شاہ تراب چشتی کی تصانیف میں موجود ہیں۔ حال ہی میں مجھے شاہ تراب چشتی کی ایک نظم "سلسلہ چشتیہ اور بیان چہار پیر چہاردہ خانوادہ" دستیاب ہوئی ہے۔ جس میں شاہ تراب رقمطراز ہیں:-

(۴۹) اونکے فرزند جانشین ولی — شاہ شاہاں امین الدین علی
(۵۰) اونکے فرزند نور عینی ہے — حضرت باباشاہ حسینی ہے
(۵۱) اونکے فرزند و جانشین حق — ہیں علی پیر ہادی مطلق
(۵۲) اونکے فرزند و جانشین ہمراز — پیر پادشاہ مرشد ممتاز
(۵۳) او خلافت او خرقہ او مطلب — شاہ بخشے تراب کے تیں سب

میرے پاس پیر پادشاہ حسینی کے دیوانؔ کی نقل بھی موجود ہے جس میں ذیل کی غزل نہیں ہے۔

غزل پیر پادشاہ حسینی

رو بروئے شہر درسن بے نقاب — دیکھ ناسک بولتے ہیں در حجاب
تس اپر رکھتے ہیں خواہش دید کی — دیدہ کراپس کا مانند حباب
اس عبادت ہیچ نیں سیے حق ابی — حوض و مسجد کا کریں پانی خراب
حق رسی کی عین عبادت مین دید — جوں صنم کا مبتلا مست شراب
دل ترا از آب دریا طاہر نئی ہٹ — بہر استنجا رہیں دربیچ و تاب
گھر سے نکلیں رگذر کے دید کون — وقت جاتا کر جماعت کا شتاب
طعنہ زن نیں ہے حسینی کر عبادت دو — دل سیں کرتا ہے اپس کے یوں خطاب

ا؎ ناحق ا؎ نہیں ۳؎ ؟

۴: شغلی کی رُباعی :- شغلی کے ذکر سے تذکرے ساکت ہیں۔ مولانا باقر آگاہ نے دیباچہ گلزار عشق میں شغلی کو عادل شاہی عہد کا شاعر بتایا ہے۔ شغلی کی ایک مثنوی بنام "پندنامہ" ملتی ہے جس میں ۱۰۵ اشعار ہیں یہ کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "دکن میں اُردو" میں شغلی کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ یہ انتخاب شغلی کی مثنوی اور غزلوں سے کیا گیا ہے۔ ذیل کی رباعی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شغلی رباعی گو بھی تھا۔

العلم نکتہ لبس تجے بر تا عبث تحرف
گر پوچھتا ہے توں مجھی لو عشق کا یکحرف
ذات علم جیاول ا؎ ؟ ا؎ توا در تعلم بہو نستا ہوا
کہروے پہاڑ پکڑے جوا اس علم کا ہے شرف

---

(۱) مجھے (۲) ؟ (۳) بھوسا (۴) پہاڑ (۵) چوہا

۵۔ جانم کے دوہرے :- اردو ادب کا ابتدائی دور جن ادیبوں کا مرہون منت ہے ان میں شاہ برہان الدین جانم متوفی ۱۵۸۲ء (؟) کو اہم مقام حاصل ہے ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی نظم و نثر کی

ا؎ نقل دیوان پیر پادشاہ حسینی مملوکہ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد

تابیں یادگار ہیں۔ نثر میں "کلمتہ الحقائق" اور نظم میں "ارشاد نامہ" کافی اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد کے دو محققین نے جانم کی کلمتہ الحقائق کو علیحدہ علیحدہ طور پر ترتیب و تدوین سے آراستہ کیا ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف پر تصوف اور مذہبی خیالات کی چھاپ بہت گہری ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ جانم کی تمام تصانیف تصوفانہ رنگ و آہنگ میں ڈوبی ہیں۔ انھوں نے اپنے مریدوں اور پیرووں کی تعلیم و تلقین کے لئے طویل نظموں کے علاوہ چھوٹی چھوٹی نظمیں، دوہے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے ان نظموں میں ہندی بحروں کا عام استعمال کیا ہے اور بکثرت ٹھیٹھ و سنسکرت الاصل الفاظ سے صوفیانہ خیالات میں گہرائی پیدا کی۔

کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ میں میراں جی شمس العشاق متوفی ۹۰۲ھ کی مناجات[1] موجود ہے۔ جس مخطوطے میں مناجات منقول ہے اسی میں مناجات کے بعد جانم کے دوہرے ملتے ہیں۔ دوہرہ ہندی اصناف شعری میں سے ہے۔

شاہ برہان الدین جانم کے والد میراں جی شمس العشاق کی مناجات کی کتابت شیخ حیات ولد شیخ اولیاء نے کی ہے۔ کاتب نے مناجات کے ترقیمے کے بعد یہ عبادت لکھی ہے۔

"ایں دوہرہ ہائے پیر دستگیر حضرت شاہ برہان الدین صاحب قدس سرہٗ و کعب مبارک جانم فرمودہ اند"۔

اس جلد میں مناجات اور دوہروں کے ساتھ " محمد امین ابن مصطفےٰ ۔ ۔ ۔ اولاد شیخ حمیدالدین ناگوری" کا ایک فارسی رسالہ شیرازہ بند ہے۔ اس رسالے کی کتابت درگاہ امین الدین اعلیٰ بیجاپوری کے مشہور کاتب جان محمد محرمی چشتی۔ نے کی ہے۔ پروفیسر اکبرالدین صدیقی کی تحقیق کے مطابق جان محمد محرمی چشتی کی تاریخ وفات "قطب المشائخ" سے برآمد ہوتی ہے۔ اس فقرے سے ۱۰۹۳ھ سن نکلتا ہے اس لحاظ سے محمد امین کے فارسی رسالے کی کتابت کافی قدیم ہے۔ البتہ شمس العشاق کی مناجات اور جانم کے دوہروں کی کتابت کے سن کا تعین مشکل ہے۔ حالانکہ اس مخطوطے کا کاغذ دیسی اور بہت قدیم معلوم ہوتا ہے۔

اس مخطوطے کی حسب ذیل خصوصیات ہیں

(۱) گ پر ایک ہی مرکز ہے۔

(۲) ٹ پر چار نقطے ہیں۔

---

[1] مناجات از میراں جی شمس العشاق : مخزونہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ : نمبر ۲۴/۹۱ (قبل ۱۰۹۳ھ)

(۳) ہندی اور اُردو کے الفاظ پر صحیح نقطے نہیں دے ہیں۔

(۴) جو الفاظ صحیح طور سے پڑھے نہیں جا سکے انکے آگے سوالیہ نشاں لگا دے ہیں۔

(۵) میری تحقیق کے مطابق ان دوہروں کا کاتب بھی شیخ حیات ولد شیخ اولیا ہی ہے۔ جو کم سواد اور بدخط ہے۔ تحریر اس امر کی غمازی ہے کہ شیخ حیات نے یہ دوہرے کمسنی میں نقل کئے ہوں گے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نورِ محمدؐ جگ موہا سب بھیو ندہان — نینو کینکی پُتلی تہاں بو جھیں نور نشاں

نورِ محمدؐ زیب ہے اس نینو میں پرکاس — بن گرو کھونجہ نا پاسی دیکہت اپنے پاس

نورِ محمدؐ کا زیب ہے ہور سب جگ محمدؐ نور — او نور علیؓ ہے جو نینو دیٹھا پور ر

یوں ہے سب جگ نورِ محمدؐ گھٹ گھٹ دیکھو ایک — وہ تو نور نرنجن ہے کیا بھیو بھیک

یو تو یک ا کھو جبرائی بن بر لا کرے بچار — بن گر ماگ نہ پاوسی مرشید ملہ بچار

پیئو کون دسٹھا اپ ہیں ہوا پس دیسیا بیئو — یا دو آنکھیں ایکہ کون جو سگند کپور کا جیئو

جیئس نین دھراھیں درشت انکھو حیرانگہ — یوں سب جگ میں موہ رہیا ایا کیا بوہ جگ

نینو مینکی پو تلی تخنجھو نیں کر دکھیائے — ننگنا ہو کر آپ رہیا پو تلی ماؤ بسائے

سائیں سیتی مل رہنا اس نینو کرے نہار — دو ئی چکہ لیئو ن گی جھانکہ نا جانے دیونگی بچار

بہتہ کا ہیسنا سجکوں را کیا توک دیا نا دیکہ بہے — اجگ کا ہانسا سنجہ کیا ہو نا کو ر سجن کہاں بسے

واسینی پیا میں چیر نو لاگی بھاتگوں کٹ پائے — ایہ دھنورا بھیرون تیرا اور رون کالی ستائے

مور کہیر کیمی دیاد پر بھو لیا ہے سب سنسار — والیس میں کھو یکر ہور دھندن لاگے نہار

دنیا اڑ ندی جھو ہور کیو تا کر اجری یار — ھلکے تہے سو پار لاتر ے ڈوبے جن سر بہار

جوں اندھیاں کیرا قافلہ ہو رہا گسا جو ر نہار — ایکہ گرے سب گرے نا دیکہیں انکہی غار

جا ہم دیکھیا نور کو ن اس نینو کرے تہار — اس نور میں بیو سون ملے ہوے قرار قرار

شاہ میرانجی میگہ ہمارے برسیں ساکیں مل جونی — سینب سمندر دل ہمارا کہا نکے ہم ہے موتی

---

(۱) محبت (۲) گھر (۳) میں کی (۴) پتلی (۵) وہاں (۶) سمجھتے (۷) پرکاش (۸) کچھ (۹) دیکھیا (۱۰) جگہ جگہ (۱۱) بھگوان کا نام (۱۲) سنسار (۱۳) دکھا (۱۴) ظاہر جاری (۱۵) ؟ (۱۶) ؟ (۱۷) مرشد (۱۸) راستہ (۱۹) مرشد (۲۰) خاص (۲۱) نظر آتا (۲۲) آپ میں (۲۳) کافور (۲۴) جیسے (۲۵) نظر (۲۶) آنکھیں (۲۷) سنسار (۲۸) سنبھالو (۲۹) ننگا (۳۰) ؟ (۳۱) آنکھ (۳۲) باہر (۳۳) برکا (۳۴) پیاسا (۳۵) [illegible] (۳۶) دنیا (۳۷) ہنسی (۳۸) ؟ (۳۹) بھاگوں (۴۰) ؟ (۴۱) راگ الاپنا (۴۲) ؟ (۴۳) [illegible] (۴۴) بھلا (۴۵) مکر (۴۶) دھندوں (۴۷) باہر (۴۸) ؟ (۴۹) سنسار (۵۰) کیسے (۵۱) اسکو (۵۲) ڈوبے (۵۳) دوزخی (۵۴) چھوڑ (۵۵) جل گئے (۵۶) تیرے (۵۷) بخشے (۵۸) ؟ (۵۹) [illegible] (۶۰) سیپ

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

انارکلی

اُردو میں ڈرامہ نگاری کا فن ابھی تک اتنا ترقی یافتہ نہیں ہے جتنا کہ دوسرے فنون نے ترقی کی ہے۔ لیکن بہت سے فنکاروں نے اس کمی کا احساس کرلیا ہے اُردو ڈرامہ نگاری کی تاریخ میں انارکلی کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے امتیاز علی تاج نے اس ڈرامہ میں فنِ درو فن کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے انھوں نے ایک غیر معتبر رومانی قصہ کو ایک نئے انداز سے پیش کیا اور اس کو نئی زندگی بخشی فن کار نے اس میں خونِ جگر کی نمائش کی ہے۔

اس ڈرامے میں کردار نگاری ایک خاص انداز سے کی گئی ہے۔ اکبرؔ شہزادہ سلیمؔ انارکلی اور دلارام اس کے بنیادی کردار ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح ہے یا غلط لیکن ادب کے حسن زار میں پہنچ کر کوئی شخص اس کتاب کی صداقت اور عظمت میں شبہ نہیں کرسکتا۔ اِن کرداروں میں زندگی کا عکس ہے۔ بیانِ محبت کے ساتھ حقیقت کی جلوہ سامانی میں انسانی زندگی کی عکاسی ہے محبت اور رقابت کی کشمکش ہے۔ فطری انسانی جذبات میں ڈوبا ہوا یہ ڈرامہ ادبی حیثیت سے ممتاز ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک رومانی ڈرامہ ہے اس کے اندر زمانہ کے ردو بدل، عوامی زندگی کی جھلکیاں، معاشی اور سیاسی کشمکش بکشاکش کی ترجمانی اور زندگی کی متنوع رنگینیاں نہیں ہیں۔ جاگیردارانہ دور کی محبت کا ایک نقشہ اس میں مرقوم ہے جس وقت یہ ڈرامہ لکھا گیا اس زمانے کے لحاظ سے اسکو ضرور اہمیت حاصل ہے لیکن ڈرامہ بہت آگے بڑھ چکا ہے اس کے اندر مختلف رجحانات کیفیات سیاسی، معاشی اور دوسرے نظریاتی نقطہ ہائے نظر جگہ پاگئے ہیں۔

تاریخی ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں ان ڈراموں میں اس دور کے رجحانات اور طرزِ فکر پر روشنی ڈالی گئی ہے مگر انارکلی میں تاریخی نکات کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ ڈرامہ نگار نے سختی سے ایک ہی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے حالانکہ بعض مکالموں میں ایسے موضوعات پر بحث ممکن تھی جس سے اس دور کے طرزِ فکر اور رجحانات کا اندازہ ہوتا۔

جہاں تک اِس ڈرامے کا تعلق ہے اس کی باتیں ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو مناظر پیش کیے گئے ہیں وہ اتنے پُر تکلف ہیں کہ شاید ان کا اہتمام ممکن نہ ہو سکے۔

جہاں تک مکالموں کا سوال ہے اس میں مصنف نے بے تکلفی، روانی اور عورتوں کے خاص احساسات کو ملحوظ رکھا ہے، مگر یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عورتوں کی زبان کا لطف اس کے اندر نہیں ہے وہ الفاظ

در محاورے نہیں ملتے جن کو پڑھ کر زبان چٹخارے لیا کرے۔ انار کلی کے مکالمے یا تو شاہی گھن گرج کے ہیں کنیزوں کی زبان سے ادا ہوئے ہیں ان مکالموں میں ادبی لطافت نام کو نہیں حالانکہ ایک ایسے ڈرامہ میں جو خالص محبت سے تعلق رکھتا ہو اظہار محبت کے وقت ضروری تھا کہ جذبات میں ڈوبے ہوئے ادبی جملے وجدان میں سرشار ہو کر فریقین کی زبان سے نکلتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اشعار فارسی کے پیش کئے گئے ہیں مصنف نے مکالمہ نگاری میں معتدل انداز اختیار کیا ہے اس نے سادگی زبان کو ترجیح دی ہے خصوصاً جو زبان کنیزوں نے استعمال کی ہے اس میں بے تکلفی اور سادگی کا لحاظ رکھا گیا ہے، وہ زبان بول چال سے قریب ہے۔

جہاں تک منظر نگاری کا تعلق ہے وہ بھی اس ڈرامے میں پوری طرح نہیں ملتی اس دور کے لحاظ سے بعض اچھے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ منظر نگاری ڈرامے میں ناولوں اور افسانوں کی طرح ممکن بھی نہیں۔

اس ڈرامے میں بعض انسانی فطرت کی تصویریں دلکش انداز سے کھینچی گئی ہیں۔ اس میں ماں کی محبت کا بیان اور اکبر سے سلیم کی مدافعت میں اس کی ماں نے جو گفتگو کی ہے وہ بڑی اثر انگیز ہے۔ ڈرامہ پڑھکر اکبر کے متعلق اچھا اثر نہیں ہوتا سلیم کی ماں نے جس طرح اپنی ممتا کا اظہار کیا ہے اور اپنے بیٹے کی خواہش پوری کرنی چاہتی ہے وہ ایک ماں کا حق تھا لیکن انار کلی کی ماں نے جس طرح نیم بسمل ہو کر تڑپتے، رونے، فریاد کرنے اور آہ و زاری کا منظر پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے اندر سوز دروں اور نوجوان بیٹی کی بربادی کا تصور ہے اور اس بن کھلی کلی کے مرجھانے پر ماتم ہے۔ ایک ماں کی ممتا کی آگ ہے۔ مصنف نے اس منظر کو بڑے دلکش اور صبر آزما انداز سے پیش کیا ہے۔ ماں ایک طرف بیٹی کی محبت سے مجبور ہے اور دوسری طرف بادشاہ کے دبدبہ سے بے اختیار ہے۔

جہاں تک کشمکش سازش اور رقابتوں کا تعلق ہے ان کا بیان بھی بہت فطری ہے محبت کے معاملات میں ایسی سازشیں اور رقابتیں پیش آتی ہیں کبھی کوئی دوست بن کر دھوکا دیتا ہے اور کبھی دشمن بن کر سامنے آتا ہے اور وہ دشمن بڑے خطرناک ہوتے ہیں جو دوست کے لباس میں آتے ہیں ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ دو چاہنے والوں میں ایک منافق گھس کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے اس ڈرامے میں اسی قسم کی سازشیں پیش کی گئی ہیں جن کے بغیر ڈرامے کا ارتقاء ممکن نہیں تھا۔

ڈرامہ کے آخر میں جو منظر پیش کیا گیا ہے وہ بہت کامیاب ہے اس کے اندر سارے جذبات اور احساسات کا دریا رواں ہے جذبات میں وہ کیفیت موجود ہے جو فن کار کے خون جگر کی غمازی کرتی ہے ماں کی محبت سب سے بڑھ کر ہے۔ سلیم کی تڑپ سوزش اور اضطراب دلوں میں ہلچل پیدا کر دیتا ہے یہاں ہم کو ڈرامہ نگار کا فنکارانہ معیار اپنی انتہائی سطح پر دکھائی دیتا ہے اس نے ایک خاص انداز سے اس منظر میں

ظالم و مظلوم اور عاشق و رقیب کو یکجا کر دیا ہے۔ یہاں کردار کے بنیادی نقائص کا تجزیہ ملتا ہے اور ہر کردار نفسیاتی طور پر وہ محسوس کرتا ہے جو ضمیر کی آواز اور محبت کی پکار ہے۔ اندر سے ایک سوز دروں کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فضا میں سوگواری پھیلا دی گئی ہو غلطی کرنے والوں کو ضمیر کی خلش کانٹے کی طرح چبھتی معلوم ہوتی ہے اسی طرح سلیم کو اپنی ناکامی کا احساس ہوتا ہے اس کی ناکامیوں نے زندگی کو ایک جوئے کم آب بنا دیا ہے اس کے یہاں افسوس اور قلق کا احوال ملتا ہے وہ انتقام لینا چاہتا ہے لیکن کس سے؟ خود اپنے والد سے؟ ایسا ممکن نہیں۔

اکبر کو اپنے ظلم کا احساس ہوتا ہے مگر یہاں ایک خلش ڈرامہ نگار نے باقی رکھی ہے کہ اکبر نے ان اسباب و علل کو وضاحت سے بیان نہیں کیا۔ اس امر کی تشریح کے لئے دو مواقع تھے اس وقت جب مہارانی نے بیٹے کی خواہش کا اکبر سے اظہار کیا تو اس کے جواب میں اکبر نے مبہم الفاظ کہے انھوں نے یہ نہ بتایا کہ کونسے خواب تھے جو کنیز سے شادی کے بعد مکمل نہ ہوتے۔ انارکلی سے رشتہ ہو جاتا تو ہندوستان کی حکومت پر اکبر کے خوابوں پر اور اسکی آرزوؤں پر کونسے غلط اثرات مرتب ہوتے۔ اس نے اس رشتہ کے نقصانات کے مدلل و معقول اسباب پیش نہ کئے۔

دوسرا موقع وہ تھا جب کہ اکبر سلیم کے اس محل میں گیا جہاں وہ نظر بند تھا اس نے سلیم کو سمجھانے اور اس محبت کے غلط اثرات بتانے کے بجائے خود اپنے کو خاطی تسلیم کر لیا اور جو ظلم انارکلی اور سلیم پر ہوا تھا اس پر وہ رونے لگا یہ بات کچھ معقول معلوم نہیں ہوتی کہ وہ ایک طرف اتنی سخت سزا دیتا ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کا پاس نہیں کرتا ماں کی امتا کا بھی تصور نہیں کرتا اور دوسری طرف اپنے موقف کو صحیح سمجھنے اور اس کی مدافعت کرنے کے بجائے سلیم کے موقف کو صحیح تصور کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نے آخر میں باپ کی حیثیت سے اپنے بیٹے کے حال زار کو محسوس کیا مگر صرف اتنا کہنا کافی نہ تھا کہ انتقام لیا جائے گا اکبر کے فیصلہ میں تفصیلات نہیں ملتیں اس نے اس وقت حقیقت سمجھی جب کہ سلیم نے کہا لیکن اس نے اس بارے میں نہ کوئی تحقیق کی اور نہ کوئی تفتیش بلکہ بڑی سادہ لوحی سے دلارام اور داروغۂ زنداں کے جرم کو تسلیم کر لیا لطف تو جب تھا کہ اکبر یا تو اپنے موقف کو صحیح ثابت کرتے یا تو راز حقیقت منکشف ہونے کے بعد اس کی تفتیش کرتے مطلب یہ ہے کہ اکبر اسم محبت کو جرم سمجھتے تھے تو یہ سزا صحیح تھی اور اگر بیٹے سے ملنے کے بعد انھوں نے اپنا موقف بدلا تو کیوں؟ اس لئے کہ داروغہ زنداں اور دلارام نے جو بات کہی تھی وہ جھوٹ تو نہ تھی صرف دلارام نے اپنی عیاری سے اپنی محبت کو چھپا کر سارا الزام انارکلی کے سر تھوپ دیا تھا اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اکبر کے اندر یہ تغیر کیسے پیدا ہوا۔ اور کیوں مصنف کی عبارت سے اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا؟

پھر اتنے بڑے واقعہ میں باپ نے بیٹے سے کوئی خاص گفتگو نہیں کی نہ اسے سمجھایا اور نہ اسے راہ راست پر

لانے کی کوشش کی اور جس کام کو وہ بیٹے کے مستقبل کے لئے اتنا خطرناک سمجھتا تھا کہ جس کے لئے اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قید کر دیا اور اپنی بیوی کو ناراض کیا اس کام کے انجام و عواقب کا کبھی اس نے ذکر نہیں کیا۔ اگر اس سلسلہ میں شاہی قدغن مانع تھی تو پھر بعد میں سلیم کی اتنی گستاخانہ گفتگو کیونکر روا ہو سکتی ہے۔ اگر ثریا و سلیم بادشاہ کے حضور ایسی جرات سے اظہار رائے کر سکتے ہیں تو پھر بادشاہ کے سامنے سلیم کو خود اپنے موقف کو پہلے ہی پیش کرنا چاہیئے تھا یا اکبر کو اس سلسلہ میں سلیم سے مفصل گفتگو کرنی چاہیئے تھی میرے خیال میں اس ڈرامہ میں ایک خلا ہے جس انداز سے سلیم اور ثریا نے اکبر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اکبر نے جو کچھ کیفیت اس پر ظاہر کی ہے وہ عقلی طور پر اکبر کے پچھلے کردار سے میل نہیں کھاتی۔

ڈرامہ کے سلسلہ میں ایک مسئلہ یہ بھی قابل غور ہے کہ انارکلی سلیم کی محبوب نظر تھی یا اکبر کی یا دونوں کی۔ پھر کیا یہ ٹریجڈی سلیم کی ہے یا اکبر کی؟ بہرحال مصنف نے دو ایک جگہ اشارہ تو کیا ہے کہ اکبر بھی انارکلی سے محبت کرتا تھا مگر یہ اظہار برائے نام ہے اس کے برعکس سلیم کی محبت ظاہر ہے اس لئے اگر یہ سمجھا جائے کہ چونکہ اکبر انارکلی کو چاہتا تھا اس لئے بیٹے کا عشق اس سے برداشت نہ کر سکا اس لئے اس کو زندہ دیوار میں چنوا دیا یعنی رقابت میں تو اس کے لئے ڈرامہ کے اندر پیش کردہ واقعات ساتھ نہیں دیتے۔ اکبر کبھی انارکلی کو بلاتا نہیں اس سے کبھی کوئی خاص گفتگو نہیں کرتا ۔ اس سے اظہار تعلق نہیں کرتا۔ پھر وہ بادشاہ تھا چاہتا تو اپنے پاس رکھتا اور سلیم سے ملنے ہی نہ دیتا۔ زندہ چنوا دینے کی ضرورت نہ تھی۔ اس وجہ سے میرا ذاتی خیال ہے کہ مصنف کے ذہن میں یہ واقعہ مبہم تھا اسی بنا پر ڈرامہ میں یہ ابہام اور زیادہ پیچیدہ ہو گیا کہ اکبر و سلیم میں رقابت تھی یا نہیں۔ میرے خیال سے رقابت نہ تھی بلکہ بادشاہ ایک معمولی کنیز سے اپنے لاڈلے بیٹے کا عشق ناپسند کرتا تھا وہ اس کے اندر بلندیٔ عظمت اور اعلیٰ آفاقی اقدار اور عزیمت سے پُر کردار کا متمنی تھا جب اس نے دیکھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا جو ایک کنیز کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے تو اس نے غصہ میں آکر کنیز کو ختم کر دیا۔ اس لئے یہ ڈرامہ سلیم کی ٹریجڈی ہے۔ اکبر کی نہیں۔ البتہ یہ مصنف کا فنی نقص ہے کہ اس نے کیوں اس شبہ کو راہ دی کہ خواہ مخواہ قاری کے ذہن میں یہ تصور پیدا ہو کہ اکبر انارکلی سے محبت کرتا تھا حالانکہ اس کے لئے واقعات و دلائل فراہم کئے گئے۔ ہاں اگر واقعات سے مکالمات سے اور ڈرامہ کی فضا سے اکبر کا عشق اتنا ہی زوردار ہوتا جتنا کہ سلیم کا تھا تو پھر اس کو اکبر کی ٹریجڈی کہا جا سکتا تھا مگر موجودہ صورت میں وہ صرف سلیم کی ٹریجڈی ہے نہ کہ اکبر کی۔

انارکلی

شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر کی کنیز انارکلی کی یہ عبرت ناک کہانی دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ انارکلی جو ایک کنیز ہے۔ ہندوستان کے ہونے والے شہنشاہ سلیم سے عشق کرتی ہے چھپ چھپ کر

انارکلی اور سلیم کی ملاقاتیں ہوتی ہیں مگر انارکلی　جیسے جیسے پیچھے جاتی ہے ویسے ویسے سلیم اس کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے اس نے اظہار محبت ابتدائی دور میں احتیاط سے کیا اس ڈرامہ میں ڈرامہ نگار نے ایک عورت کی صحیح تصویر پیش کی ہے عورت کی فطرت میں خدا نے شرم وحیا کی دولت رکھی ہے اکبر کے جور و جبر کے بوجھ سے دبی ہوئی مظلوم انارکلی کو سلیم سے عشق کرنے کے بدلے میں موت کا تحفہ ملا دلارام اس پوشیدہ راز کو افشا کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے جشن کے موقعہ پر انارکلی کو نشہ آور چیز پلا کر اس کے دلی جذبات کو بھڑکایا جس سے انارکلی کو نشہ کی حالت میں یہ محسوس ہوا کہ سلیم اور اس کے سوا کوئی اس محفل میں موجود نہیں ہے اور انارکلی محبت کے جوش میں بھری بزم میں سلیم سے آنکھیں لڑانے لگی اس طرح اکبر کے روبرو دلارام نے انارکلی کا عشق ثابت کر دیا۔ انارکلی نے ایک محبوبہ کا کردار بڑے معتدل انداز سے پیش کیا۔ اس کے اندر محبت کا طوفان موجزن تھا مگر باہر سے فضا خاموش تھی سلیم کی طرح نہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑا نہ اپنی عادت و حالت میں کچھ تغیر پیدا کیا انارکلی نے اپنی محبت کے بارے میں اظہار کرنے سے گریز کیا بلکہ وہ بدنامی سے بچنا چاہتی تھی اور بچتی رہی چنانچہ ایک جگہ انارکلی کہتی ہے کہ مجھ سے نہ ملا جائے گا۔ اصل میں انارکلی کا کوئی قصور ثابت نہیں ہوتا وہ ایک معصوم لڑکی ہے جس کو سلیم نے اظہار محبت کر کے محبت کے بھنور میں پھنسا دیا۔

انارکلی کا کردار شریفانہ انداز کا حامل ہے اس نے اپنی رقیب دلارام کا ذکر بھی بہت کم کیا ہے اور اس کی برائیاں بھی نہیں کیں حالانکہ اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ دلارام پوری طرح سلیم سے اظہار محبت کر چکی ہے۔

انارکلی ایک مظلوم اور مجبور کردار ہے جس نے ڈرامہ میں رنگ بھرا ہے اس نے ظالم کی آواز کو دبانے کے بجائے خود اپنے نفس کو دبا دیا اور اس طرح اپنے کردار میں عظمت کا جادو جگا دیا ہے۔ انارکلی ان واقعات سے پریشان تھی گھبراتی تھی اور اُس کا مستقبل کے بارے میں یاس کن تصور تھا۔ اس نے سلیم سے بھی کوئی شکایت نہیں کی۔ حالانکہ وہ کہہ سکتی تھی کہ اس نے اس کو محبت میں پھنسا کر مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ انارکلی سلیم کے ساتھ بھاگنا نہیں چاہتی تھی اور دنیا میں رسوائی و ذلت کو پسند نہیں کرتی تھی بلکہ انارکلی نے شرافت سے محبت کی راہ میں اپنی جان دینا گوارہ کر لیا۔ انارکلی کی یہ عظمت اور جرات اس کے کردار کا ایک روشن باب ہے۔

انارکلی کو چاہیے تھا کہ ان واقعات سے اپنی ماں کو واقف کرا دے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی ماں یا تو اس کو لیکر کہیں بھاگ جاتی یا پھر مہارانی سے خود اس کے بارے میں گفتگو کرتی جس سے حالات اتنے بُرے نہ ہوتے۔ جب داروغہ زندان انارکلی کو قید خانہ سے لے جاتا ہے تو انارکلی نہ تو ماں کو پکارتی ہے اور نہ سلیم کو حالانکہ اس کو پتہ تھا کہ لوگ اُسے زندہ دیوار میں چنوانے لئے جا رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ اس ڈرامے میں انار کلی کا کردار بہت موثر ہے اس کا پورا کردار وفا اور سچی محبت کا آئینہ دار ہے۔ انار کلی نے اپنے کردار کو بہت اچھی طرح نبھایا ہے۔

سلیم

اس ڈرامے میں سلیم کا کردار ایک مجبور عاشق کا کردار ہے وہ انار کلی کو ہر طریقہ سے اپنے پاس بلانا چاہتا ہے رفتہ رفتہ یہ تعلق بڑھتا ہے محبت کا اظہار جذبات کی وجہ سے عاقبت اندیشی کا ترجمان ہے یہی کیفیت سلیم کے ہاں بھی ہے اور انار کلی کے ہاں بھی اگر سلیم تھوڑے ضبط سے کام لیتا اور اپنی بے قراری کو روک کر یہ چھپ چھپ کر ملنے کا انداز اختیار نہ کرتا تو شاید معاملات اس حد تک نہ پہنچتے مگر سلیم کے اندر جو جذبۂ عشق تھا وہ بے قرار تھا اور وہ اپنی کاوش کے باوجود راز کو چھپانے کی قدرت حاصل نہ کر سکا۔

جشن کے موقع پر سارا راز فاش ہو جاتا ہے تب سلیم کو چاہیئے تھا کہ اکبر سے اپنے اس تعلق کے بارے میں بتا دے۔ پورے ڈرامہ میں بہت کم ایسے واقعات ہیں جہاں سلیم نے اپنی ماں سے گفتگو کی ہو۔ سلیم کا زندان میں جانا اور خفیہ گفتگو کرنا انار کلی کی موت کا پہلا سبب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم کی سادہ لوحی نے اس کو کسی سازش یا عقل مندانہ رول ادا کرنے سے قاصر رکھا اور نہ اس نے کوئی کوشش کی اس نے بس عشق کا دعویٰ کیا اور مجبور ہو کر بیٹھ گیا اگرچہ اس نے ایک جرأت ضرور کی تھی کہ انار کلی کو لیکر زندان سے فرار ہو جائے۔

سلیم کی مجبوری ہر عاشق کی مجبوری ہے اس کی معشوقہ مصائب کا شکار ہوئی۔ سلیم نے ایک بڑی طاقت کے سامنے سپر ڈالی اس نے خودکشی کرنی چاہی مگر کسی نے اس کو خنجر نہ دیا البتہ اتنی جرأت نہ کر سکا کہ محل کے اوپر سے نیچے کود پڑتا۔ سلیم ایک ایسا عاشق ہے جس نے اپنے معشوق کی فرقت میں اور اس کی موت کے بعد بھی نہ کھانا پینا چھوڑا اور نہ عام آدمیوں سے دور رہا۔ اگرچہ اثر اس کی طبیعت پر بہت زیادہ تھا اس دلارام سے تھوڑا سا انتقام لینا چاہا اور خاموش رہ گیا اس نے ثریا کے تلخ اور غم سے بھرے جملوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے اپنے وعدے کو پورا کرنے کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ اس کو یہ اختیار ضرور تھا کہ اکبر سے کہلا بھیجتا کہ اگر انار کلی کو آپ نے نہ رہا کیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اگرچہ وہ عملاً نہ سہی دھمکی کے لئے تو ایسا کر سکتا تھا اس کے نتیجے میں بادشاہ محل اور مہارانی سب دہل اٹھتے اور اکلوتے بیٹے کو بچانے کی کوشش کرتے۔ اگرچہ سلیم نے اپنی حد تک وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور کسی موقعہ پر انار کلی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی۔ سلیم کو چاہیے تھا کہ داروغۂ زندان (جو رشوت لینے پر آمادہ تھا) کی بات پر بھروسہ نہ کرے۔ مختصراً ڈرامہ میں کسی حد تک سلیم کی بزدلی ظاہر ہوتی ہے۔ اس کا کردار ایک جرأت مند عاشق کا نہیں بلکہ ایک عیش پسند کا ہے جو محل میں رہ کر کوہ کنی سے نا آشنا ہے۔

اکبر

اکبر نے اس ڈرامے میں ایک ظالم اور جابر کا رول ادا کیا ہے جس نے محبت کی کومل آرزؤں کو پژمردہ کر دیا۔ انسانی فطرت کی مخالفت کی اور ایک معصوم و رنگین کلی کو پھول بن کر متبسم ہونے کے قبل خاک آلود کر دیا۔ اکبر کا کردار ایک بے حس کھردرے اور متکبر انسان کا کردار ہے جس کے پاس دماغ ہے مگر دل نہیں وہ سادہ اور فطری انداز سے ایک نوجوان دل کی آرزو کو سمجھنے سے قاصر رہا وہ رانی کا مشورہ لینے سے بھی انکار کرتا رہا۔ بے سوچے سمجھے فیصلہ کی بنیاد پر ایک معصوم لڑکی کا خون اپنے سر لے لیا بلکہ ایک ادنیٰ ملازم داروغۂ زنداں کی بات پر بغیر غور کئے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر لیا اور انارکلی کو دیوار میں چنوا دیا۔ دلارام اور داروغۂ زنداں اکبر کے کان بھرتے ہیں پہلے دلارام جاتی ہے اور وہ اس انداز سے معاملات کو پیش کرتی ہے کہ سارا قصور انارکلی ہی کا ہے اور صاحب عالم بے قصور ہیں معصوم ہیں۔ پھسلائے گئے ہیں بہکائے گئے ہیں اگر سلیم نے اکبر کی نظر میں یہ ثابت کر دیا ہوتا کہ اس محبت کا آغاز خود اسی سے ہوا ہے تو شاید انارکلی کو کچھ ہلکی سزا ملتی اور وہ موت کے بھنور میں نہ پھنستی۔ اکبر نے ایک ادنیٰ ملازم داروغۂ زنداں اور ایک حقیر کنیز دلارام کی باتوں پر اعتبار کر لیا اکبر کو چاہئیے تھا کہ ان کی باتوں پر تحقیق کرے جہاں رقابت کا طوفان برپا ہو وہاں ضروری ہے کہ بربادی کا طوفان اٹھے اور حسد کی ندیاں بہہ نکلیں۔ اکبر کو دلارام کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے تھا وہ بھی ایک کنیز تھی اور سلیم نے وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ ہر قیمت پر انارکلی کو بچائے گا اس پر داروغہ کی بدنفسی اور رشوت خوری نے غضب کر دیا اگر دلارام اکبر پر یہ اثر نہ ڈالتی کہ سارا قصور انارکلی کا ہے اور اگر داروغہ منافقت نہ کرتا تو یقین تھا کہ شاید انارکلی کو ایسی سزا نہ ملتی۔ ایسے پست ذہنیت رکھنے والے انسان ہر سوسائٹی میں موجود ہیں جنھیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر خوشی حاصل ہوتی ہے اور انارکلی بھی ایک کنیز انارکلی جو کہ سارے شہر میں مشہور اور شہنشاہ ہند کی منظور نظر کنیز ہے بھلا کون ہوگی جو اس سے حسد نہ کرے۔ انارکلی کا درجہ اونچا اور دلارام کا نیچا اس موقع پہ ضروری ہے کہ کم رتبہ والے اونچے اور عالی رتبہ والے سے حسد ہو جائے اور ایسا ہوا بھی اکبر کو دلارام کی باتوں پر یقین نہ کرنا چاہیئے تھا اسی طرح داروغۂ زنداں بھی اکبر کے کان بھرتا ہے جو قابل اعتبار سہی مگر قابل تحقیق ضرور ہیں اکبر کے دل پر انارکلی کا غصہ اچھی طرح جگہ کر چکا تھا چنانچہ اس نے انارکلی سے بدلہ لے لیا مگر اس نے وہ کام نہیں کیا جو ایک سچے و انصاف پسند عادل کو کرنا تھا مختصراً اکبر اس ڈرامے میں جابرانہ اور ظالمانہ رول ادا کرتا ہے مگر آخر میں اس کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔

دلارام

دلارام کا کردار انسانی سوسائٹی میں تہلکہ مچانے کے لئے کافی مدد کرتا ہے انارکلی کی رقیب انارکلی کو ختم کرنا چاہتی ہے اور وہ اس مقصد میں کامیاب ہوئی آخر وہ بھی مجبور تھی اس کی محبت نے اس کو رقیب بننے پر آمادہ کیا زندگی میں کچھ تخریب پسند عناصر ہوتے ہیں ایسے بدنفس لوگوں کو

آپس میں اختلاف پیدا کرنے میں لطف آتا ہے دلارام نے رقابت کا رول ادا کیا ہے وہ ایک مکار اور سازشی طبیعت رکھتی ہے اس نے سلیم سے اظہارِ عشق اسی وقت کیا جب کہ انار کلی سلیم کی محبت میں اور سلیم انار کلی کی محبت میں گرفتار ہوئے تھے حالانکہ اس کو موقعہ تھا کہ اس سے قبل اظہار عشق کرتی جب کہ سلیم کا دل ابھی انار کلی کی محبت کے جام سے سرشار نہ تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم اور انار کلی کی محبت دیکھکر اس کو رشک پیدا ہو گیا اور اس کے جذبات بھڑک اٹھے اس لئے اس نے ہر طریقہ سے انار کلی کو زک پہنچانے کی کوشش کی۔

سب سے پہلے اس نے سلیم کو توڑ کر اپنا لینا چاہا اس کی خاطر اس نے موقعہ پاکر تنہائی میں سلیم سے اپنی بے پناہ محبت کا اظہار کیا مگر اس کا یہ داؤں الٹا پڑ گیا سلیم نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا اور اس کو تنبیہ کی اس ناکامی کے بعد اس نے انتقام کے لئے دوسری کامیاب راہ تلاش کی۔

جشن کے موقع پر دلارام نے انار کلی کو دھوکہ سے شراب پلا کر بے ہوش بنا دیا اور انار کلی مجمع عام میں سلیم سے اظہار عشق کر بیٹھی اس طرح دلارام کی ایک سازش کامیاب ہوگئی اور انار کلی گرفتار ہوگئی۔

دلارام کو اس پر بھی اطمینان نہ ہوا اور اس نے اکبر کے سامنے انار کلی کی داستان اس طرح حرف بہ حرف بیان کردی کہ جس سے اکبر پر یہ اثر پڑا کہ سلیم بے قصور ہے اور انار کلی قصوروار ہے — حالانکہ واقعہ اس کے برعکس ہے عشق کی ابتدا سلیم نے کی تھی۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۲ سے آگے) (۸) اس کی درسی ضرورتوں سے چشم پوشی طلبا کو ادب کے صحیح اور حقیقی پس منظر سے بے خبر رکھنے کے مترادف ہوگا۔

(۹) وسیع و عمیق مطالعہ ترتیب و ترکیب اور حسب ترکیب اور حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ کے بعد داستانوں سے ہر سطح اور ہر معیار کیلئے درسی اسباق کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

(۱۰) مطبوعہ وغیر مطبوعہ اور نایاب مگر اہم داستانوں کی تدوین جدید اور طویل داستانوں کی تلخیص اشاعت نصاب کیلئے انتہائی مفید ہوگی۔

(۱۱) اس کیلئے پوری تیاری اور منصوبہ بندی ضروری ہے۔ استاد کو اسکی تدریس کے وقت تعلیم کے ان تینوں مرحلوں کا پورا پورا خیال رکھنا پڑے گا۔ یعنی لکچر یا مضمون کی تیاری۔ ان کا پڑھانا یا سمجھانا اور آخر میں اپنے اطمینان کیلئے یہ معلوم کرنا کہ وہ جو کچھ پڑھا اور سمجھا چکا ہے اسے شاگردوں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے یا نہیں۔

احمد سجاد

اردو کی نثری داستانیں اور اس کے تعلیمی و تدریسی مسائل

(بقیہ سلسلہ مارچ ۱۹۷۱ء سے آگے)

داستانوں سے قبل اردو نثر بعض صوفیائے کرام کی تبلیغی تصانیف، رسائل وعظ و پند تک محدود تھی۔ ادبی تصنیفات مفقود تھیں۔ پہلی باضابطہ ادبی نثر اب تک کی تحقیق کے مطابق ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) مانی جاتی ہے۔ شمال میں فارسی غلبہ کی وجہ سے حالت اور بھی خراب تھی بے دسے کے کربل کتھا، نوطرز مرصع قسم کی فارسی زدہ نثر تھی اور بزرگان دین کے وعظ و پند تھے۔ صاف سادہ اور بے تکلف ادبی نثر یہاں اردو میں معیوب تھی لیکن داستانوں نے بقول ڈاکٹر گیان چند میں اس نظریہ کو چیلنج کیا۔ یہ جم غفیر کے ساتھ اردو میں آئیں اور شاندار طریقے سے آئیں۔ پھر فورٹ ولیم کالج اور اس سے دہلی، لکھنؤ، رامپور اور عظیم آباد وغیرہ میں صدیوں تک جس نثری صنف کا سکہ چلتا رہا وہ یہی صنف تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ داستانوں ہی کے ذریعہ پہلی بار ہمیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ اردو کے ممکنات کیا ہیں ——— ۱۸۵۷ء کے بعد اردو ادب اور اردو نثر کو ہم جس طرح آسمان ترقی پر پرواز کرتے ہوئے دیکھتے ہیں وہ محض انگریزی اور سائنسی تہذیب کا کوئی جادو یا معجزہ نہ تھا۔ اس نے اس کی ترقی کو مہمیز ضرور کیا۔ صنف داستان اگر زمین ہموار اور زرخیز کرکے نہ رکھتی تو یہ ترقی ممکن ہی نہ تھی۔ داستان کے قالب میں صدیوں تک اردو نثر منجھتی نکھرتی اور سنورتی رہی۔ تب جاکے کہیں یہ ممکن ہوا کہ جملہ اصناف نثر میں طبع آزمائی کی جائے۔ طوالت سے بچنے کیلئے میں تفصیلی مباحث اور دلائل پیش کرنے سے گریز کر رہا ہوں۔ حالیہ تحقیق نے تو ثابت کر دیا ہے کہ اگر داستان نہ ہوتی تو صنف ناول بھی نہ ہوتی نہ مولانا محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی اور خوش ادائی ہوتی نہ سرشار و شرر کی خاکہ نگاری و منظر کشی ——— اگر غور کیجئے تو ابتدا میں اردو نثاروں نے دراصل داستان ہی کے ذریعہ مختلف اسالیب بیان کی مشاقی کی ہے۔

چونکہ جنوب سے کسی روز مرہ نثر کا شمال پر زیادہ اثر نہ ہوا اس لئے اصناف شاعری کی طرح اردو نثر پر بھی مروجہ فارسی اسالیب بیان نے بھرپور اثر کیا۔ اس زمانہ میں فارسی انشا کے دو طرز مروج تھے۔ ایک سادہ پر زور اور حقیقت آمیز۔ اس اسلوب کی معیاری تصانیف چہار مقالہ از نظامی عروضی اور سفر نامہ از حکیم ناصر خسرو وغیرہ مشہور رہیں۔ دوسرا نہایت پر تکلف، رنگین اور مبالغہ آمیز اسلوب جس میں زندگی کے بڑھتے ہوئے تکلفات اور پیچیدگیوں کا رنگ جھلکتا تھا۔ اس دوسرے اسلوب کے شائقین نے سہ نثر ظہوری رسائل طغرائے مشہدی وغیرہ کو نمونہ بنایا۔ یہ مادھو رام اور عزت اللہ بنگالی وغیرہ کا مرغوب اسلوب رہا۔

یہی سادہ اور مرصع انداز اردو نثر کے دو ممتاز اسالیب بیان بن گئے۔ اردو داستان نویسوں اور نثاروں نے بعد میں اپنے اپنے ذوق کے مطابق انہیں اسالیب بیان کو اختیار کیا۔ چنانچہ اردو میں ایک طرف اگر باغ و بہار، طوطا کہانی، خرد افروز اور رانی کیتکی کی داستان امیر حمزہ کی سادہ کاری ہے، تو دوسری طرف نو طرز مرصع، فسانہ عجائب۔

طلسم حیرت اور تصدق حسین لکھنوی کی داستان امیر حمزہ کی عجوبہ مرصع کاری۔ بعد میں ان دو اسالیب بیان کے حسین امتزاج سے اُردو نثر کے دامن میں بہت سے گل بوٹے جمع ہوگئے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں کی اپنی جگہ پر پوری اہمیت ہے۔

یہی نہیں، داستانوں نے اُردو نثر میں بے شمار تلمیحات، علامتیں، اشارے، استعارے اور اور تصاویر نقش ہائے رنگا رنگ کا اضافہ کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یونانی اساطیر اور یونانی دیوی دیوتاؤں کی کہانی سے یورپ کے ہر ادب نے نمایاں اثر لیا۔ داستان امیر حمزہ کے ایک کردار عمرو عیار ہی کو لیجیے۔ ان کی صورت، زنبیل، گلیم عیاری، دام الیاسی، لحن داؤدی، ان کی بخالت، لاف زنی اور خساست، ساتھ ہی ساتھ ہفت در بند بیابان گل ریز، پردۂ ظلمات، قصر ہفت رنگ، گنبد اصفی، دیو جامہ سے مزید بے شمار نقوش و استعارے اخذ کیے جا سکتے ہیں۔

ان گذارشات کی روشنی میں اس کی تعلیمی ضرورت اور اہمیت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ ہو کہ ادب محض خیال موضوع یا مواد ہی سے نہیں بلکہ زبان و بیان طرز ادا، ہیئت اور اسلوب کے حسین اور فنکارانہ، امتزاج سے وجود میں آتا ہے۔ کالج و یونیورسٹی کی سطح پر طلباء کے درمیان ہم انھیں بنیادی حقائق کو مختلف طریقے سے پیش کرتے ہیں اس نقطہ نظر سے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ داستانوں کی تعلیم و تدریس اردو نصاب کا جز ولاینفک ہے۔ چنانچہ اس سطح پر باغ و بہار اور فسانۂ عجائب جیسی داستانوں کا تنقیدی مطالعہ انتہائی مفید ہوگا۔ بعض یونیورسٹیوں میں بی اے اور ایم اے میں یہ داستانیں داخل نصاب بھی ہیں ضرورت اس کی ہے کہ ان مختصر داستانوں کو اس کے صحیح پس منظر میں پڑھایا جائے اور طویل داستانوں کی تلخیص داخل نصاب کرکے ان کے ادبی قدر و قیمت کا وضاحت سے تجزیہ کیا جائے۔

اُردو نثر کے ارتقاء میں داستانوں نے ایک بہت بڑا رول یوں بھی ادا کیا کہ سادۂ سلیس اور نثر نگاری کو عام کرکے ناول کی سب سے موزوں زبان کی بنیاد ڈال دی اور محض زبان ہی نہیں، ٹکنیک کے اعتبار سے بھی اس صنف نے اُردو ناول کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب کا تاثر یہ ہے۔

"اگر قدیم داستانیں وجود میں نہ آتیں تو غدر کے بعد کے معاشرتی ناول ٹکنیک کے اعتبار سے بالکل صفر ہوتے"

اور یہ حقیقت ہے کہ اُردو کے تمام ابتدائی ناول نگاروں پر داستانوں کا گہرا اثر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مولوی کریم الدین، ڈپٹی نذیر احمد، سرشار، شرر حتی کہ پریم چند کے ناولوں میں اس کے

نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں۔

یہ محض اردو کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ناقدین نے یورپین ناول نگاروں کے ذہنی ارتقا کا تجزیہ کرنے کے بعد واضح طور پر بتایا ہے کہ۔

"یورپ کا کوئی بھی اوّل درجہ کا ناول نگار نہیں جسے الف لیلیٰ سے یا اسی قسم کی اپنے ملک کی داستانوں سے دلچسپی نہ رہی ہو"۔

کریوتھر (CARRU THER) جیسا فن ناول نگاری کا ناقد بھی اپنی تصنیف "شہرزاد یا ناول کا مستقبل" میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ناول کو پھر زندہ کرنے کے لئے شہرزاد کی الف لیلیٰ والی راہ پر لانا ضروری ہے۔ آپ غور فرمائیں ناول کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو وہ ہرگز دلچسپ نہیں ہوسکتا جبتک کہ اس میں تخیل کی آمیزش نہ ہو اور کوئی داستان ایسی نہیں دکھائی جاسکتی جس میں تخیل کی فراوانی کے ساتھ کچھ نہ کچھ حقیقت نہ ملی ہو۔ فسانۂ عجائب اور فسانۂ آزاد کی مماثلتوں پر غور کیجئے اس طرح پریم چند کے ابتدائی افسانے مثلاً "دنیا کا سب سے انمول رتن" سوز وطن، شیخ مخمور وغیرہ داستانی فضا اور سرشاری رنگ سے معمور ہیں۔ مقصد خواہ اصلاح معاشرہ ہو یا حب وطن، ان افسانوں کی فضا، ان کی شعریت، رنگینی، رمزیہ انداز بیان، ان سب پر طلسمی اور داستانی فضا پوری طرح حاوی ہے۔

سرشار نے تو مستقل داستان خود بھی لکھی ہے لہذا ان کے ناول داستانی اثر سے تہی دامن کیسے رہ سکتے تھے۔ نذیر احمد کے ناول بھی واضح طور پر داستانی ماحول کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے تمثیلی کردار بہت حد تک داستان کے تمثیلی کردار سے ملتے جلتے ہیں۔ یہاں بطور نمونہ داستان امیر حمزہ اور نذیر احمد کے ناولوں کے چند کرداروں کے نام دیئے جارہے ہیں جو اپنے کارناموں کے اعتبار سے خاصے اسم بامسمیٰ معلوم ہوتے ہیں۔

داستان امیر حمزہ کے کردار: — ملکہ لالاں خونی قبا۔ فولاد آتش ریز، مفتاح الحکمت، عمرو عیار، لندھور بن سعدان، کوکب روشن ضمیر، خداوند لقا وغیرہ۔

نذیر احمد کے کردار: — ابن الوقت، فہمیدہ، نعیمہ، محمد عاقل، صالحہ، کلیم، مبتلا، ہریالی، مرزا ظاہر دار بیگ وغیرہ۔

مقامات کے نام میں بھی اس اثر کو دیکھا جاسکتا ہے، کلیم کی عشرت منزل اور خلوت خانہ داستان امیر حمزہ کے ہفت در بند، پردۂ ظلمات، بیابان گل ریز اور چاہ نیلوفر سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ سرشار کے یہاں بھی یہ اثرات نمایاں ہیں عمرو عیار اور خوجی، ملکہ لالاں خونی قبا اور حسن آرا و سپہر آرا۔

میاں آزاد اور امیر حمزہ کی روح میں آخر فرق ہی کیا ہے۔ یہی حال طرز بیان اور اسلوب نگارش کا بھی ہے میں طوالت کی وجہ سے اس کی مثالیں یہاں نظر انداز کرتا ہوں۔

غرض یہ کہ داستانوں کے اس گرانقدر سرمایہ، مخصوص ٹکنیک اور تخیل کی اس وسیع و عریض اور بوقلموں دنیا سے اردو کو بعض ایسی روایتیں ملیں، جس نے نہ صرف اردو ناول و افسانہ بلکہ پورے ادب کو گل صد رنگ بنا دیا۔ تراشیدہ مکالمے، خوبصورت منظر کشی، اثر آفریں جذبات نگاری، مزاح و ظرافت کی چاشنی، زنگارنگ اسالیب بیان، پر تماش کی معاشرتی تصویر، ہر رنگ کے کردار، رچی ہوئی مقصدیت ایسی نعمتیں ہیں جن سے اردو ادب آج تک فیضیاب ہو رہا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اردو افسانوں اور ناولوں سے داستانوں کا سرمایہ کچھ کم قیمتی نہیں۔ کلیم الدین احمد کے الفاظ اگر مستعار لئے جائیں تو۔

"یہ سرمایہ کسی دوسری زبان کی داستانوں کے مقابلہ میں بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی دوسری زبان کے سرمایہ کے مقابلہ میں ہیچ نہیں" (فن داستان گوئی ص ۱۳۰)

وقار عظیم، علی عباس حسینی، گیان چند جین اور عزیز احمد وغیرہ نے بھی اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

اندازہ فرمائیے اگر ان خصوصیات، مماثلتوں اور فرق و امتیاز کو کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر طلبا کو اچھی طرح نہ بتایا گیا تو نہ صرف وہ صرف داستانوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں گے بلکہ جدید نثری اسالیب بیان اور اردو ناول و افسانہ کے حقیقی پس منظر سے بھی نابلد رہ جائیں گے اور طوطے کی طرح یہی رٹتے رہیں گے کہ یہ محض انگریزی ادب سے ماخوذ اور ان کا چربہ ہیں۔

ایک آخری بات اور ہے۔ ہمیں داخل نصاب داستانوں کو اقبول نیلسن "لعنت" اور "خطرناک بیماری" ہرگز نہ بنا دینا چاہیئے۔ فرض کیا نصاب میں فسانہ عجائب ہے تو اس کے الفاظ تشبیہ و استعارے، صنائع بدائع ترکیبوں اور بندشوں کی چستی یا فرسودگی کا تجزیہ کرنے ہی میں ہمیں سارا وقت صرف نہیں کر دینا چاہیئے۔ اس طرح نہ اس داستان کے ساتھ انصاف ہوگا اور نہ طلبا صحیح معنوں میں اس صنف کی حقیقت و ماہیت سے لطف اندوز ہو سکیں گے اس طرح کلاس انتہائی بے لطف اور غیر دلچسپ رہے گی

سوال یہ ہے کہ ایسا طویل کورس کیسے تیار کیا جائے؟

پہلی ضروری کاروائی یہ ہونی چاہیئے کہ الفاظ اور حسن بیان کا خشک تجزیہ کرانے کا کام کم کرکے تشریحی لکچروں اور مذاکروں میں اضافہ کیا جائے اس کے بعد تعلیم دہی کے کاموں میں تنوع پیدا کرنا ہوگا۔ تاکہ کلاس یہ نہ سمجھے کہ وہ ایک ہی قسم کا کام کرتی رہی گی۔ تیسرا کام یہ ہوگا کہ نصاب کی کتاب کو علم البلاغت یا لغت کا

یک بے ہنگم مجموعہ نہ سمجھا جائے۔ جن کی تعریف و توضیح اور لغوی ترجمہ کرنے میں پورا قیمتی وقت ضائع کر دیا جائے بلکہ یہ خیال رکھا جائے کہ وہ مختلف اجزاء سے مل کر ایک مکمل ذہنی اور فنی تخلیق ہے۔

نصاب شروع کرتے وقت دو یا تین لکچر دیئے جائیں اور ان کے دوران میں جو سوالات ہوں ان پر بحث کی جائے۔ ان لکچروں میں معلم کلاس کو سال بھر کے کام کا خاکہ اور مطالعہ کرنے کے طریقے سمجھا کر یہ بتائے کہ اس سلسلے میں کون کون سی کتابیں ضروری ہیں اور ان کے علاوہ اور کون کون سی کتابیں مفید ثابت ہوں گی۔ اس کے بعد وہ مثلاً باغ و بہار کی پوری داستان پر لکچر دے جس میں پہلے اس کی تاریخ (جہاں تک معلوم ہے) پھر اس کی نوعیت اور طرز اور پھر اس کی زبان پر روشنی ڈال کر آخر میں اس کے پلاٹ یا اجزائے قصہ کا خلاصہ بیان کر دے۔

جب یہ کام ہو چکے تو اصل پڑھائی کا آغاز کرے اس سلسلے میں معلم کو جن باتوں کا خیال رکھنا چاہئے وہ یہ ہیں:-

پہلے داستان کے پلاٹ کا سیر حاصل خلاصہ اور کرداروں کے خصائص بیان کر کے متن کو ایسے حصوں میں تقسیم کرے جن پر آسانی، اختصار اور دلچسپی کے ساتھ عبور ہو سکے۔ پھر کلاس کو پورا متن کہیں کہیں سے پڑھائے اور اس دوران طرز ادا، فن داستان یا پلاٹ کا کوئی خاص جزو زیر بحث آ جائے تو ان پر کبھی خود اور کبھی شاگردوں سے اظہار خیال کرنے کو کہے اور بیچ بیچ میں ایسے سوالات اٹھائے جن کی صحت یا عدم صحت معلوم کرنے میں دماغ لڑانے کی ضرورت پڑے۔

ظاہر ہے پوری داستان طویل اور اس کے بعض حصے بوجھل ہوتے ہیں، ان میں تکرار ہوتی ہے۔ لہذا وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے انکا خلاصہ احتیاط کے ساتھ بیان کر دے تاکہ کوئی اہم بات بالکل ہی نظر انداز نہ ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی شاگردوں کو مشورہ دے کہ جو حصے چھوڑ دیئے گئے ہیں ان کو خود دیکھ لیں

اس کے بعد معلم اگر باغ و بہار پر لکچر دے رہا ہے تو تقابلی مطالعے کیلئے فسانۂ عجائب کے حوالے دیتا چلے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتا کر کہ فسانہ عجائب اور باغ و بہار کے قصے اور انداز بیان میں جہاں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں وہیں فنی اعتبار سے بہت سی مشابہتیں بھی ہیں۔ نقادوں کے بعض عمدہ اور دلچسپ ریمارکس بھی سنائے (خصوصاً کلیم الدین اور وقار عظیم کے) جب خاتمے پر پہنچ جائے تو اس پوری داستان پر تبصرہ کرے اور شاگردوں سے اس کے متعلق مختلف سوالات کرنے کیلئے کہے۔ یاد رہے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار دونوں ہماری مشرقی ادب و تہذیب اور اردو نثر کے عظیم ترین اور زندۂ جاوید کارنامے ہیں۔

پھر پڑھائی ختم ہونے پر معلم ایک لکچر دے جس میں ان دونوں داستانوں سے تو یہ ملکتہ اور

کانپور میں لکھی گئیں مگر ایک پر دہلویت غالب ہے تو دوسری پر لکھنویت۔ گذشتہ صدی سے آج تک کسی نے باغ و بہار کو بے اصل بتایا تو کسی نے فسانۂ عجائب کو مہمل قرار دیا ان کی بدولت ہیئتی اور دبستانی تنقید کے فن کو بڑا کمال حاصل ہوا۔ ان کی تقلید میں جواب الجواب بہت سی داستانیں لکھی گئیں اور مضحکہ خیز نقلیں بھی اتاری گئیں۔ داستانیں پسند اور کبھی ناپسند کی گئیں مگر ہمیشہ زیر مطالعہ اور زیر استعمال رہیں اور آج تک یہ ہمارے ادب کو فیضیاب کر رہی ہیں۔۔۔ اگر یہ کام عمدہ ترتیب کے ساتھ کیا جائے تو پوری کلاس فن داستان پر ایک صنف ادب کی حیثیت سے بحث کرنے پر مائل ہو جائیگی اس صورت میں معلم کو چاہیئے کہ اس بحث کو اپنے ارتقائے کار کے دوسرے اسباق اور ادب کے دوسرے مسائل اور پہلوؤں کے ساتھ (جن کی تعلیم اس کی کلاس پا نی ہو) مربوط کر دے۔

جب معلم کلاس کو اس داستانی صنف کا ایک سرسری جائزہ دلادے تو بہت سے سوالات کا جواب دے کر بعض سوالات کو ادھ کھلے دروازے کی طرح تشنہ چھوڑ دے تاکہ ان کی دلچسپی تا دیر برقرار رہے اور مستقبل میں وہ اپنی خواہش سے اس سلسلے کی اگلی باتوں اور مسائل کو حل کریں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

ظاہر ہے اس طرح کے لکچرز بڑی محنت اور جانکاہی چاہتے ہیں اس کیلئے بڑی تیاری اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ سچ پوچھئے تو بغیر اس کے نہ ہم ادب کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں نہ آنے والی نسل کی علمی و ادبی تربیت کر سکتے ہیں۔

ہماری ان گذارشات کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔۔۔

(۱) صنفِ داستان اُردو نثر اور تاریخ ادب کی ایک بنیادی اور اہم ترین صنف ہے۔

(۲) یہ واحد صنف ہے جس نے مسلسل تین صدیوں تک اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی پوری نمائندگی کی ہے۔

(۳) تعلیمی نقطۂ نظر سے یہ ایسی صنف ہے جو ابتدائی درجات سے لے کر کالج و یونیورسٹی بلکہ ریسرچ اسکالر تک کے لئے یکساں مفید ہے۔

(۴) آج سے تقریباً دوسو سال پہلے درسی ضرورت کیلئے فورٹ ولیم کالج میں یہ صنف کامیابی سے استعمال کی جا چکی ہے۔

(۵) داستان کا سرمایہ اُردو نثر کا انتہائی جامع اور وقیع اثاثہ ہے۔

(۶) اس صنف کی ایک مکمل اور واضح ٹکنیک ہے۔

(۷) تکنیکی، ہیئتی اور اسلوب بیان کے اعتبار سے داستان نے اُردو ادب کو ہر نوع اور ہر جہت ترقی دی ہے۔

(باقی سلسلہ صفحہ ۱۲ پر)

قاضی عبید الرحمن ہاشمی

سودا بحیثیت مرثیہ گو

مرزا محمد رفیع سودا کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ صرف قصیدہ یا غزل کے شاعر ہیں حالانکہ ان کا شمار اچھے مرثیہ گو شعرا میں بھی ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ قیاس بھی صحیح نہ ہوگا کہ وہ مرثیے کی طرف محض روایتی انداز میں یا عقیدتاً رجوع ہوئے ان کا عقیدہ ان کے مراثی کے لئے وجہ تحریک ضرور بنا لیکن اس وابستگی نے انہیں صرف بین تک محدود نہ رکھکر اردو مراثی میں وسعت و تنوع کی جانب متوجہ کیا۔

سودا نے اپنے دور میں مرثیئے کی جو روایت پائی تھی اس سے ہٹ کر اسے ایک نیا موڑ فراہم کرنے کی کوشش کی اور اس کی تنگ دامانی کو ختم کرنے کے لئے انہوں نے ہیئت و موضوع کے گرانقدر تجربے کئے۔ سودا کے مراثی کا آغاز دلی میں ہوا۔ اس کا سلسلہ فرخ آباد میں بھی قائم رہا لیکن آخری دور کے سبھی مراثی دوران قیام لکھنؤ لکھے گئے۔ سودا جس وقت لکھنؤ پہونچے اس وقت ان کا ایک مزاج بن چکا تھا۔ طبیعت میں سنجیدگی اور متانت آچکی تھی اس لئے لکھنؤ کا رنگ شاعری ان پر غالب نہ آسکا البتہ انکی شاعری میں لکھنؤ کے کچھ عناصر ضرور پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خارجیت، نشاطیہ آہنگ، صناعی زبان و صحت زبان کا خیال وغیرہ۔ سودا کی مرثیہ نگاری کا صحیح طور سے جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اجمالاً سودا سے قبل دلی میں لکھے گئے مراثی کی روایت بھی اپنے سامنے رکھیں تاکہ اس پس منظر میں سودا کے مرثیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے۔

شمالی ہند سے قبل دکن میں مرثیئے کی ایک توانا اور زندہ روایت ملتی ہے لیکن بدقسمتی سے شمالی ہند میں منتقل نہیں ہو پائی چنانچہ دونوں جگہ بالکل الگ الگ حالات میں مرثیہ پروان چڑھتا ہے۔ دلی میں مرثیے کا وجود ہند ایرانی معاشرت کی دین ہے۔ اس جگہ درگاہ قلی کا ذکر مناسب ہوگا اس لئے کہ وہ ایک ایرانی نژاد شاعر تھا جس نے اپنا شباب دکن میں آصف جاہ کے ساتھ گزارا اور درمیان میں وہ چار سال کے لئے دلی بھی آیا اس کے بیشتر مراثی دکن کی قدیم روایت کے برخلاف دہلوی انداز کے نمائندے ہیں

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عہد عالمگیر سے قبل سیاسی سرپرستی سے محرومی اور غزلیہ شاعری میں محدود دلچسپی کے سبب شمالی ہند میں مرثیے برگ و بار نہ لاسکے۔ البتہ اس سلسلے میں کوئی بات پورے

وثوق کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی اس لئے کہ اس دور کی تمدنی، ادبی اور ثقافتی زندگی ابھی بہت کچھ تاریخ کے دھندلکے میں ہے البتہ چند تاریخی شواہد ایسے ہیں جنکی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان ادوار میں عزاداری اور مرثیہ خوانی کسی نہ کسی شکل میں ضرور ہوتی رہی ہوگی۔ ہندوستان میں ہمایوں کے دور سے ایرانیوں کا آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور وہ امور سلطنت میں دخیل بھی ہو رہے تھے اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ عزاداری ان کی تہذیبی زندگی کا ایک جزو لاینفک ہے خصوصاً جہاں بیرم خاں۔ شیخ مبارک۔ فیضی، ابوالفضل، نور جہاں اور آصف جاہ جیسی مقتدر ہستیاں موجود ہوں وہاں عزاداری کا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے اورنگ زیب کے دور میں ان کی مذہبی سخت گیری کے باوجود عزاداری کا برابر بالا ہونا تھا مجلسیں ہوتی تھیں اور جلوس نکالے جاتے تھے ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد اس کے جانشین بیٹے بہادر شاہ اول کی سرپرستی میں شیعیت کو فروغ حاصل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں نے پروفیسر مسعود حسین رضوی کے حوالے سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ چند مرثیے سترھویں صدی کے نصف آخر یعنی عالمگیری دور کے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے تقریباً ۶۴ مرثیے صلاح کے بتائے جاتے ہیں اور بقیہ دوسرے مرثیہ نگار ہوں گے۔ چنانچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اس سلسلے میں صلاح کو اولیت نہیں حاصل ہے بلکہ اس سے پیشتر بھی لکھنے والے موجود تھے۔ صلاح کے بعد شاہ مبارک آبرو اور مصطفیٰ خاں یکرنگ کے وہ مرثیے ملتے ہیں جو انہوں نے خواص کے لئے تحریر کئے تھے محمد شاہ کے دور میں فضلی کی کربل کتھا ۱۱۴۵ھ میں ملتی ہے جو فارسی کی روضۃ الشہدا کو سامنے رکھ کر لکھی گئی درگاہ قلی نے اپنے سفر نامے میں پسر لطف علی خاں، ندیم، مسکین، مزین اور غمگین کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے صرف مسکین کا کلام دستیاب ہوا ہے۔ مسکین کے مرثیے صلاح اور ان کے معاصرین، قربان علی، خادم اور کلیم وغیرہ کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہیں۔ مسکین کا زور زیادہ تر بین اور شہدائے کربلا کی مظلومیت کو واضح کرنے پر ہے۔ اس کے بعد ان کے ایک دوسرے ہمعصر محبؔ کا مرثیہ ملتا ہے انہوں نے مرثیہ کو فنی طور پر ترقی دینے کی کوشش کی۔ مربع میں فارسی اور برج بھاشا سے الگ اردو میں بین کا اضافہ کیا۔ ان کے یہاں ہمیں سماجی زندگی کی جھلکیاں بھی مل جاتی ہیں اور واقعہ نگاری بھی۔

اٹھارہویں صدی شمالی ہند کے لئے بے حد اہم ہے اس لئے کہ اس دور میں ایک طرف اردو میں شعر کہنے کی طرف توجہ دی گئی دوم عالمگیر کی وفات کے ساتھ اہل تشیع کو اپنے عقائد کے اظہار کی آزادانہ فضا نصیب ہوئی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں دلّی میں مصطفیٰ خاں یک رنگ قیام الدین قائم۔ مرزا ہوشدار عاصمی۔ میر تقی تقی اور اشرف الدولہ کے مراثی ملتے ہیں اور اسی زمانے سے

میر اور سودا کا بھی تعلق ہے۔ چنانچہ اس مختصر سے جائزے سے ہم نے یہ دیکھا کہ شمالی ہند میں سودا سے قبل ہیئت و موضوع دونوں کے اعتبار سے مرثیئے کی جو روایت ملتی ہے وہ اگرچہ بہت زیادہ جاندار اور رچنتہ نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی شعرائے ماسلف کی کاوشوں اور تجربات کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے ہئیت کے اعتبار سے مربّع، ترجیع بند، ترکیب بند، مخمس، مستزاد اور مسدس کی صورتیں مل جاتی ہیں اور موضوع کے اعتبار سے ابتدا میں حضرت قاسمؓ کی موت کو سلسلے وار بیان کیا جاتا ہے لیکن ان کا اصل مطمع نظر صرف ایسے مضامین پر طبع آزمائی ہوتی ہے جس کو سن کر آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑیں، اسی لئے بیٹے کی لاش پر ماں کا بین، حضرت امام حسینؓ کا بہنوں یا اہل حرم سے رخصت وغیرہ کے مضامین نظم کئے جاتے ہیں۔

سودا کو اپنے دور میں مرثیئے کی جو روایت ملی تھی وہ اگرچہ اس سے بہت آگے نہ بڑھ سکے لیکن انہوں نے اس سے مصالحت بھی گوارہ نہ کی۔ ان کی حیثیت اردو مرثئے میں ایک سنگ میل کی ہے جس سے مستقبل میں انیس و دبیر نے بھی اپنی منزل کا سراغ پایا۔ سودا کے تقریباً ۲، مرثیئے ان کی کلیات میں ملتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان میں کچھ مراثی ان کے شاگرد مہربان کے بھی شامل ہو گئے ہیں۔ یہ مراثی ۸۰ مربع ۶ مفرد ۶ مخمس اور ۱۲ سلام پر مشتمل ہیں۔

کلیات سودا میں جو مراثی ملتے ہیں ان کی تین اقسام ہیں، اول وہ جن پر عوامی ہونے کا اعتراض کیا جاتا ہے اس لئے کہ ان کا لب و لہجہ مع تخیلات و جذبات کے روزمرہ کی بول چال سے بہت قریب ہے اور اظہار کی سطح بھی بہت بلند نہیں ہے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ وہ مرثیے شامل ہیں جو دکنی، برج بھاشا، پنجابی دوہروں اور اشعار سے معمور ہیں اور ایسے بھی ہیں جو عوامی کی بولی ٹھولی میں لکھے گئے ہیں۔ دوسری قسم کے وہ مراثی ہیں جس میں قصیدہ کا حسن موجود ہے اور ان میں ادبیت پیدا ہو گئی ہے۔ تخیل کی رنگ آمیزی سے اندازِ بیان میں ایک طرح کا جوش پیدا کرنے کیلئے سودا نے ان میں وہی ٹکنیک استعمال کی ہے جو قصائد میں ملتی ہے۔ اِن مراثی میں تشبیب و گریہ کے سارے آداب موجود ہیں اور شہدائے کربلا کی مدح وستائش کے جا بجا مضمون ملتے ہیں ان میں سودا نے قدم قدم پر غزل کا سا لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، غزل کی کیفیات، مخصوص لغات اور علامتوں کا استعمال ایک عجیب انداز میں کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

اشجار غم سے ہو گئے بے برگ د بر صبا　　گل شبنم الم سے ہوئی چشم تر صبا

یا یہ شعر جو قیاس ہے کہ سودا نے اپنے بیٹے کے بارے میں کہا ہو ؎

پھول سا مکھڑا یکایک اس کا یوں کمھلا گیا　　بند بند اس کا برنگ شاخ گل کاٹا گیا

یا ان کے ایک مرثیے کا یہ بند جس میں بھرپور غزل کی رمزیت اور رومانیت موجود ہے ؎

گردوں پُر از خروش و فغاں وا مصیبتا
آفاق بزم ماتمیاں وا مصیبتا
عالم تمام گریہ کناں وا مصیبتا

خلقت نے شکل جوں مہِ نو خاک سے ملی
دُنیا کی جیب چاک ہے جوں گل کی ہو کلی
روح الامیں کی خوں سے ہے آغشتہ ہر پلک
حوروں کے ہے یہ وردِ زباں وا مصیبتا

اک بدترین خلق کی خنجر سے رن میں آج
بے سر ہے شجرِ ہر دو جہاں وا مصیبتا

ایک دوسرے مرثیے کا پہلا بند ملاحظہ ہو جو قصیدہ کی تشبیب سے مشابہ ہے ؎

ابر روتے کو اٹھا ہے آج کہساروں کے بیچ　　ساغرِ خونِ جگر چلتا ہے میخواروں کے بیچ
خاک سر پہ کرتے آتے مست ہشیاروں کے بیچ　　گھر گیا باغِ رسالت کا وہ گل خاروں کے بیچ

سوداؔ کے تیسرے قسم کے مراثی وہ ہیں جن میں وہ واقعہ نگاری کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ کسی ایک واقعے کو لیتے ہیں اور اس کو مع اسکی جزئیات کے بیان کرتے ہیں حالانکہ ان کے مراثی میں واقعہ نگاری کی وہ شان نہیں ملتی جس سے لکھنؤ میں انیسؔ و دبیرؔ کا فنِ عبارت ہے لیکن پھر بھی سوداؔ واقعات کے انتخاب میں ایک سلیقہ مندی اور ترتیب کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ وہ زیادہ تر اہلِ بیت کے ان مصائب کا ذکر کرتے ہیں جو واقعۂ شہادت کے بعد اہلِ بیت کو پیش آئے یا پھر شام میں ان کی قید و بند کی سختیاں اور مظالم اور پھر مدینے کی طرف مراجعت کے واقعات کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ سوداؔ کے یہاں بھی بعض ایسی روایتوں کا تذکرہ مل جاتا ہے جن کی صحت پر شبہ کیا جا سکتا ہے مثلاً دشتِ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کی لاش کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے شیر کا نمودار ہونا یا شہادت حسینؓ کے بعد خاک مدینہ کا سُرخ ہو جانا۔

سوداؔ کے مرثیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ چاند نے لکھا ہے کہ ....

اس میں شبہ نہیں کہ سوداؔ کے مرثیوں میں مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے، مرثیے کی بڑی غرض و غائت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے میں بیان کرکے رُلانا ہے سوداؔ کے مراثی میں یہ جوہر نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو یہاں پر مرثیے کی غرض و غائت ہی کے سلسلے میں شیخ چاند کے خیالات قابلِ [illegible] ہیں۔ مثلاً ان کا یہ خیال کہ مرثیے کا بنیادی فریضہ سامعین کو رُلانا ہے۔ صحیح نہیں۔ اس کے برخلاف ادبی مطالعے میں مرثیہ بھی دوسری اصناف کی طرح ایک احساسی (SENSUOUS) اور جمالیاتی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مرثیے میں ایک پہلو انسان کے انفعالی جذبات کو بھی تحریک میں لاتا ہے۔ اس کے علاوہ سوداؔ کے یہاں مرثیت کی بھی خاطر خواہ کمی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دوسرے مقاصد سے قطع نظر اُن کے سامنے مرثیے میں بین کا پہلو بہرحال زیادہ اہم تھا جس پر انھوں نے خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ چہرے کی ضمن میں انہوں نے جتنے مضامین باندھے ہیں وہ انہیں خصوصیات کے آئینہ دار ہیں۔

سوداؔ سے قبل چہرہ یعنی مرثیے کی تمہید کی روایت نہیں ملتی اور براہ راست واقعات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ سوداؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بیشتر مرثیوں کی ابتدا چہرے سے کی لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ انہوں نے مرثیے کے جدید فنی معیار اور ٹکنیک سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ سوداؔ چونکہ قصیدہ کی تشبیب کے ماہر تھے جس میں انہوں نے حیرت انگیز دلکشی پیدا کر دی تھی اس لئے مرثیے میں بھی اس کا مظاہرہ ہوا اور حسنِ اتفاق سے یہی عمل ان کا ایک کارنامہ بنکر ابھرا۔ مرثیے کی تمہید میں سوداؔ نے بڑا تنوع پیدا کیا۔ کامیاب مرثیہ نگاری کے لئے ضروری ہے کہ مرثیے کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ شدید تاثر کا حامل ہو جو ہمارے جذبات کی دُنیا میں ہلچل مچا دے۔ چنانچہ اس خصوصیت کو پیدا کرنے کے لئے تمہیدوں کے ذریعہ سوداؔ رقت کا ایک سماں باندھنے کا اہتمام کرتے ہیں اس کے لئے وہ مظاہر کائنات کا سہارا لیتے ہیں جس کی ایک بھرپور اور جاندار روایت ہمیں دکنی مرثیوں میں ملتی ہے البتہ اس روایت سے سوداؔ کوئی استفادہ نہ کر سکے اور جب ویسی ہی ایک اور روایت انہوں نے اُردو مرثیے کو نئے سرے سے عطا کی تو یہ یقیناً ان کی اپنی تخلیق ہوئی اور اس کی عظمت کے ضامن وہی قرار پائے۔

ایک مربع مرثیے کے چند اشعار میں انہوں نے تمہید کی ابتدا چاند اور آسمان کی غم انگیزی کی کیفیت بیان کر کے کی ہے۔ ان اشعار میں ایک عجیب و غریب فنکاری کا مظاہرہ ہوا ہے جس سے شدتِ تاثر کی گرہ نہ بڑھ گیا ہے ؎

نہیں ہلال فلک پر مہِ محرم کا　　چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا
دل اطرح سے یہ گھائل کریگا عالم کا　　کہ واں نہ لگ سکے ٹانکا نہ پھایا مرہم کا

تمہید میں تنوع پر ان کی نظر ہمیشہ رہتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ کی موسم گرما میں سفر کی دشواریوں کا بڑا ہی موثر انداز میں بیان ملتا ہے ؎

کہا اسا نے یوں جیٹھ کے مہینے سے — تپش یہ پوچھ نبی کے سرور سینے سے
کیا ہے بلدیہ پیدا فلک نے کینے سے — چھپے نکال کے اس دھوپ میں مدینے سے

تمہیدی اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے وہ زیادہ تر مظاہر کائنات کا سہارا لیتے ہیں۔ اِن اشعار سے دراصل وہ ایک ایسی فضا تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو غم و اندوہ کی شدت میں اضافے کی موجب ہو۔ چند مسلسل اشعار سے اس کیفیت کی بھرپور نمائندگی ہوتی ہے ؎

بولے ہے مرغ چمن آج کہ نالاں ہیں ہم — کہتے ہیں گل کہ سدا چاک گریباں ہیں ہم
ہے یہ سنبل کے زباں زد کہ پریشاں ہیں ہم — نرگستاں کا سخن یوں ہے کہ حیراں ہیں ہم
جامۂ ماتمیاں ہے بہ تن نیلو فر — آتش غم کا ہے لائے کا نت اٹھ داغ جگر
قمری کو سمجھو کہ اختر ہے تہ خاکستر — سرو کہتا ہے یہی آہ گلستاں ہیں ہم
نہیں آتا نہیں یہ خوشہ بتاک انگور — باغ کا آبلۂ غم سے ہوا دل معمور
جگر غنچہ کو ماتم نے کیا چکنا چور — گل پہ شبنم یہی کہتی ہے کہ گریاں ہیں ہم
صبح کو باد صبا ڈالے تھی سر اپنے پہ خاک — سینہ ہے آج بھی پھولوں کی کلیوں کا چاک
جسکو میں ان میں سے پوچھا کہ تو کیوں ہے غمناک — بولے ہے تعزیہ دارانِ شہیداں ہیں ہم

ایک اور جگہ شاعر غم و الم کے کچھ اسی طرح کے تاثر پیش کرتا ہے جو ہمارے جذبات کو اپیل کئے بغیر نہیں رہتے ؎

اشجار غم سے ہو گئے بے برگ و بر صبا — گل شبنم الم سے ہوئی چشم تر صبا
پھر کس خوشی سے کرتی ہے تو اب گزر صبا — یہ چمن کو آج سے موقوف کر صبا
ہے گلشن جہاں میں قیامت کی اب سحر — غنچے ہوئے خروش گریباں کو چاک کر
جائے عبیر ملتے ہیں گل گرد نہ ادپر — بلبل کا آہ و نالہ سے تڑپا جگر صبا

غم و اندوہ کی ایک دوسری تصویر ان اشعار سے ابھرتی ہے جس میں شاعر کو اشجار شبنم و صبا سبھی گریہ کناں نظر آتی ہیں ؎

کیوں مضطرب الحال نسیم سحری ہے — گل میں طرح لال کے داغِ جگری ہے
بلبل کو ترانے کی بدل نوحہ گری ہے — اس باغ سے کیا آل محمد سفری ہے
شبنم جو رو رہا چاہے سو تو رو شب تار — کر باد سحر خاک سرا پنے پہ تو ہر بار
لوٹا یہ رسالت کا ستم کیشوں نے گلزار — ٹہنی چمن دیں میں نہ سوکھی نہ ہری ہے

سودا غم والم کے مجسمے تراشنے میں کمال درجہ مہارت رکھتے ہیں۔ وہ غم والم کی کیفیت کو شدید سے شدید تر کرنے کے لئے ایسی تشبیہات، استعارات، علائم اور شاعرانہ لوازمات اکٹھا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر سودا کی استادی، مہارت فن اور عظمت کا لازوال نقش دل پر مرتسم ہو جاتا ہے

اُن کی فنکاری کا یہ عالم ہے کہ وہ ہر مضمون میں ایک نادر خیال پیش کرنے پر قادر ہیں ؎

دکھتی ہے داغ غم شاہ نمایاں آتش　　شمع کے بھیس میں راتوں کو ہے گریاں آتش

بھڑکی جس دم خس و خاشاک سے سوزاں آتش　　کر نظر شعلہ پہ ہے چاک گریباں آتش

ان چند اشعار سے جہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر مختلف طریقوں سے ہمارے جذبات غم والم میں ایک طوفان برپا کر سکتا ہے وہیں اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی فنکاری اور مہارت کے ذریعہ جدت و ندرت کے ایسے جادو جگانے پر بھی قادر ہے جس کے سبب اس کے مراثی کی تمہیدیں لازوال کشش کی حامل ہو گئی ہیں۔

تمہید کے بعد سودا نے مرثیے میں جس چیز کو اہمیت دی ہے وہ بین کے مضامین ہیں۔ ان کی جولانی طبع اور پرواز تخیل کا اندازہ بھی یہیں پر ہوتا ہے۔ مرثیے میں بین کی اہمیت مسلم ہے۔ جس شاعر میں اس فرض سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت ہے وہ زیادہ قابل قدر سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جو مرثیے شیعہ حضرات کی محفلوں میں پڑھے جاتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو سامعین کو گریہ و زاری پر مائل کر سکیں۔ چنانچہ یہ بات سودا کے بھی پیش نظر تھی غالباً اسی واسطے انہوں نے اس طرف زیادہ خلوص فن کے ساتھ توجہ دی۔ وہ ایک مرثیے میں شیون و شین کی اس طرح تاویل پیش کرتے ہیں ؎

کریں نہ اہل جہاں کس طرح سے شیون و شین　　سروں کو اپنے نہ پیٹیں سو وہ کرکے بین

ہوا ہے آج کے دن قتل کربلا میں حسینؑ　　یہ تعزیہ ہے رسول خدا کے محرم کا

بڑا کیا تھا محمدؐ نے جس کو گود میں پال　　پھرے تھا ساقیٔ کوثر کے دوش پر مہ و سال

گیا جہان سے پیاسا وہ فاطمہؓ کا لال　　عطش ہے تن سے ہوئی روح کی سبیل اس کا

سودا کے بین کی کامیابی کی ایک وجہ ان کی نظر انتخاب بھی ہے۔ وہ حصول مدعا کے لئے صرف ایسے مضامین اور کیفیات کا سہارا لیتے ہیں جو کربلائے معلی کے انتہائی ہنگامی حالات کے مصور اور ترجمان ہوتے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے سنگین حالات اور مظالم کی تاب لانا محال ہے۔ یہ وہ مواقع ہیں جب ایک شقی القلب آدمی بھی انسانیت کا خون ہوتا ہوا دیکھ کر چشم تر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے وقت جو ڈرامائی حالات پیدا ہو جاتے ہیں، ان کے اور حضرت زینبؑ کے درمیان جو گفتگو

ہوتی ہے وہ واقعتاً بڑی لرزہ خیز ہے ؎

نہیں رہا کوئی باقی کہ وہ کرے یاری
سبھوں کو مار قضا لائی ہے مری باری
سلاح دو کہ اپنی کروں میں تیاری
مجھے نظر نہیں آتا بغیر اس کے گریز
دیا جواب یہ زینب نے رو کے اے بھائی
ہمیں بھی آج کے دن ہائے کیوں نہ موت آئی
کہ تیرے بعد نہ ہم کھینچتے یہ رسوائی
خدا ہی جانے کہ کس کس کے ہاتھ ہونگے اسیر
تب اس گھڑی یہ کہا رو کے شاہ نے جوں ابر
کہ میرے بعد ہو کیسا ہی تم پہ جور و جبر
کچھ اور چارہ نہ تم ڈھونڈیو بغیر از صبر
تمہارے حق میں یوں ہی چاہیئے ہے اب تدبیر

سودا درد و کرب کا ایک دوسرا منظر اس وقت پیش کرتے ہیں جب کمسن اصغرؑ حضرت حسینؑ کی گود میں دشمنوں کے تیروں سے چھلنی ہو جاتے ہیں۔ یہ اندوہ ناک خبر کس طرح لوگوں کو بے تاب کر دیتی ہے ؎

یہ سن کے مادر اصغر تو ہو رہی خاموش
یہ اقربا سے گیا تا فلک فغاں و خروش
کہا سکینہ نے اس لاش کو لگا کے گلے
بہت شتاب تم اے بھائی ہم کو چھوڑ چلے
نہ ماں کی گود میں شش ماہ سے زیادہ پلے
تمہیں نہ دیکھ سکا ہائے یہ فلک بے پیر
بیاں یہ کرتی تھی رو رو سکینہ بادل زار
سنے تھا جو کوئی اسکی بھی چشم تھی خونبار
جگر ہر ایک کا مجروح اور سینہ فگار
کرے بھی دم بدم اسکی زباں کی تقریر

بین کی دو قسمیں بتائی جاتی ہیں۔ ایک وہ جس میں شہدا کے اعزا شریک ہوتے ہیں، دوسری قسم کی بین کی کچھ مثالیں تمہید کی ذیل میں دی جا چکی ہیں اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں سودا نے انسان و حیوان سے لیکر جن و ملک تک کو خون کے آنسو رلائے ہیں ؎

پیٹے ہے سر کو کہ یہی آج انس و جاں
خورشید آسمان و زمیں نور مشرقین
یہ اور وہ کنار رسول خدا حسینؑ

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

آج وہ دن ہے کہ سب اہل جہاں روتے ہیں
جتنے ہیں زیر فلک پیر و جواں روتے ہیں
خاک میں نور جہاں دیکھو وہاں روتے ہیں
مرغ ہر گز بجھا ں بال فشاں روتے ہیں

ایک اور شعر اس ضمن میں یادگار ہو کر رہ گیا ہے ؎

ابر روئیگا سدا ایسا بھرینگے خوں کے جام
ہوشیار و مست سر پر خاک ڈالیں گے مدام

مظاہر کائنات میں سودا نے خصوصیت کے ساتھ اشجار، پھول اور پتوں کو شہدائے

کربلا کے غم میں زیادہ غمزدہ دکھایا ہے ؎

جو پھول باغ میں ہیں آج سو ہیں اسکے پھول　　　ہے نرگس آج پیالے کا ارگجی کے اصول
صلواۃ بھیجے ہے بوٹی بھی اس پہ ہو کے ملول　　　چمن میں جو کوئی بلبل ہے نوحہ گر ہے آج

اسی ردیف و قافیے میں سودا نے　چند اشعار اور کہے ہیں جو غم والم کا ایک لافانی نمونہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ سودا نے ان اشعار میں اس اعلیٰ فکر اور بلند قوتِ متخیلہ کا مظاہرہ کیا ہے جو صرف عظیم فنکاروں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ غم کی شدت کا اس سے زیادہ موثر اظہار اور کیا ہو سکتا ہے کہ آبشارِ چمن پتھریلی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنی جان قربان کئے دے رہا ہے ؎

روئے ہے سنگ سے سر مار آبشارِ چمن　　　جگر کے خون سے لبریز ہے کلی کا دہن
سوائے نالہ نہیں باغباں کے لب پہ سخن　　　ثمر نہال محمدؐ کا خاک پر ہے آج

اِن چند اشعار میں سودا کی قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی ان کے فن کی عظمت اور خصوصاً بین کے مضامین میں سوز و گداز کے وافر سرمائے کا جو مظاہرہ ہوا ہے وہ سودا کو اردو مرثیے میں حیاتِ دوام عطا کرنے کے لئے کافی ہے۔

سودا کے موضوعات کا سلسلہ بے حد وسیع ہے۔ اہلِ حرم کے مصائب اور حضرت قاسمؑ کی شادی اور پھر یکایک اس کا غمی میں تبدیل ہو جانا یہ سب کچھ سودا کے مراثی میں موجود ہے۔ حضرت قاسمؑ کی شادی وغیرہ کی تصدیق اگرچہ تاریخ سے نہیں ہوتی لیکن اسے دکنی مرثیوں میں بھی ایک محبوب موضوع کی حیثیت سے برتا گیا ہے اور سودا نے بھی اس کو ہو بہو تسلیم کرکے اپنے مرثیے میں جگہ دی ہے۔ حضرت قاسمؑ کی شادی کے موقعہ پر رسم و رواج، جزئیات اور گفتگو کا جو سلسلہ ملتا ہے وہ کلی طور پر اٹھارھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی معاشرتی زندگی سے اخذ کیا گیا ہے اس سلسلہ میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ عرب کی پہلی صدی ہجری کی تہذیبی و تمدنی زندگی سے ہمارے اردو شعراء آگاہ نہ تھے اس لئے ان کے پاس علاوہ اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان واقعات کو ہندوستانی رنگ میں پیش کرتے حالانکہ یہ بات کلیتہً صحیح نہیں ہے۔ شعراء نے اس طریقۂ کار کو اپنا کر اور کربلا کے سارے واقعات کو ایک مقامی رنگ دیکر اس بات کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ جو واقعات ہم سے ہزاروں میل دور کربلا کی سرزمین میں واقع ہوئے وہ ہم سے قریب تر ہو جائیں اور اس میں دوری کے سبب غربت کی جو دیوار حائل ہو گئی ہے وہ باقی نہ رہے اور ایک کائناتی غم ذاتی غم کی حیثیت میں ہمارے سامنے آئے تاکہ ہم اسمیں بھرپور طریقے پر شریک ہو سکیں۔ سودا کی طباعی، ذہانت و فطانت اور فنکاری کی یادگار مثال یہ چند اشعار ہیں جس میں وہ حضرت قاسم کے خونچکاں حادثے سے

پہلے ان کی شادی کا بیان کرتے ہیں ؎

کیا کروں شادی قاسم کا میں احوال رقم — واسطے دیکھنے کے آرسی مصحف جس دم
بیاہ کی رات رکھا تخت پہ نوشہ نے قدم — لگائے تقدیر و قضا نے یہ بدھاوے باہم
قاسم مرگ جوانانہ مبارک باشد — جلوۂ شمع بہ پروانہ مبارک باشد

سوداؔ کے مراثی میں لاشعوری طور پر کربلا کے بہانے ہندوستانی معاشرت اور تہذیبی زندگی معہ اپنی تمام بوقلمونیوں کے در آئی ہے جس سے اس دور کے سپاہیوں کے حالات، سماج میں عورتوں کا مقام، مشاغل رسم و رواج، ملبوسات و مشروبات، شادی بیاہ کی تقریبات، عورتوں کے فرائض و حقوق اور اخلاقی معیار وغیرہ جیتے جاگتے انداز میں ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہاں عورت اپنے تین روپ ماں، بہن، بیوی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

حضرت قاسمؑ کی شادی کے موقع پر ہندوستانی رسم و رواج کے چند نقوش ان اشعار میں دیکھے جاسکتے ہیں ؎

کہیں یہ بیاہ کا دیکھا ہے معمول — کہ شہ کی جو تھی کو تیجے کے ہوں پھول
بنی سر خاک کر منہ سے ملے دھول — کہیں یوں کھیلنے میں چوتھی آئی

ان اشعار میں لفظ "چوتھی" "تیجے کا پھول" وغیرہ خالص ہندوستانی رسوم سے مستعار ہیں۔ ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

کیا کروں شادی ماتم کا میں احوال رقم — واسطے دیکھنے کو آرسی مصحف جس دم
بیاہ کی رات رکھا تخت پہ نوشہ کے قدم — تخت چڑھتے ہی اتاری یا رسولؐ

یہاں بھی آرسی میں مصحف دیکھنے کی رسم 'دلہن کا تخت پر بٹھانا' قابل توجہ ہیں۔ بعض جگہ سوداؔ نے نیگ، سمدھن، کنگن، ساچق وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کئے ہیں جو ہندوستانی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ حضرت قاسمؑ سے متعلق ہر مضمون میں اس قسم کی جزئیات ملتی ہیں جن سے شاعر کا مقصد ایک ہندوستانی فضا کی تعمیر کرکے واقعات بیان کرنا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو ظاہر ہے کہ عربوں کی زندگی اور ہندوستانیوں کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ ذیل کے چند اشعار میں ہندوستانی عناصر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے ؎

سر چھاتی نقارے ہیں فریاد و فغاں شہنائی ہے — سوز جگر ہے آتش بازی ہر ایک آہ ہوائی ہے
عجب طرح کا وقت سواری نوشہ آگے پھولا باغ — روشنی کے جھاڑوں کے بدلے گھر کو آگ لگائی ہے
جلوے کی رات اور دوں کے گھر میں نہ سر سہو دلہن تو آرہیں — ناک سے نتھ ہاتھ سے بندیاں دود و کے اتارے ہیں
بنے قاسم کو مہندی لگانے کی نہ دی فرصت — سوائے عقد سر سہرا بندھانے کی نہ دی فرصت

کروں کیا ذکر اس نوشہ کے گھر شادی کے آنے کا — بغیر از زخم کیا مذکور تھا واں پان کھانے کا
تیری مگن کے دن اے بنرے سوت مشاطہ ہو کر آئی — جس نے بیوہ بنری کو ماتم میں تیرے بٹھلائی
کنگنائی میں باندھ کے کنگنا ہاتھ کی اپنے آج کلائی — کیوں کر منہ اب اس کو دکھاؤں تیری بنری چلی جائی

ان اشعار میں ہندوستان میں شادی کے موقع پر ہونے والی متعدد رسومات کا تذکرہ ہوا ہے جس کے سبب قاسمؑ کے مرثیے کی پوری فضا مقامی رنگ سے سرشار ہے مثلاً نقارے، شہنائی، آتش بازی، ہوائی، باغ، پھلتا جھاڑ، جلوہ کی رات، دلہن سنوارنا، ناک کی نتھ، ماتھے کی بندیا، مہندی لگانا، سہرا باندھنا، پان کھانا، مگن کا دن، مشاطہ، ہاتھ میں کنگنا وغیرہ جیسے الفاظ اور محاورے ان چند اشعار میں موجود ہیں جو خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ شاعر ایک اجنبی فضا کو مانوس انداز میں پیش کرنے کے لئے بڑے خلوص کے ساتھ اپنی سرزمین سے جزیات جمع کرتا ہے اور بڑی سبک روی کے ساتھ انہیں ایک طرح کی اپنائیت کے قالب میں ڈھال دیتا ہے۔

سوداؔ کے یہاں جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا گیا ہے مرثیوں میں رقت آمیز جذبات و تاثرات کو بڑھانے کے لئے بڑے مؤثر الفاظ و تراکیب تشبیہ و استعاروں کا استعمال ملتا ہے۔ حضرت قاسمؑ کی دلہن کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

سر نگوں بیٹھی ہے غمگیں منہ ماری — دم بدم آنکھوں سے ٹپکے ہیں لہو کے قطرات

اسی طرح قافلۂ اہل بیت جب شام کی جانب روانہ ہوتا ہے تو سوداؔ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ہمارے جذبات کو اپیل کرتے ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جن سے ایک طرح کا گداز (PATHOS) ابھرتا ہے اور ہمارے ذہنی افق پر چھا جاتا ہے ؎

شام جب اہل حرم ہو کے گرفتار چلے — چشم گریاں دل بریاں جگر افگار چلے
بکیہ مقتل کی طرف کرتے یہ گفتار چلے — مرنے کو تم جو چلے کیوں نہ ہمیں مار چلے
کسی کے طوق گلے ڈال کسی کے زنجیر — شام کو لے کے ہمیں شکل گنہگار چلے
تن نازک پہ اب ایسے کے روا تھا یہ غضب — تیر و خنجر تبر و دشنہ و تلوار چلے
ساکن عرش بریں کرتے تھے جس کی پابوس — دھوپ اور آنچ سے سینکے یہ اور شکوہ اوس
پا برہنہ سر عریاں کو دل بریاں افسوس — قریہ و دشت و دہ و کوچہ و بازار چلے

سوداؔ کے نزدیک مرثیہ رزمیہ نہیں بلکہ ایک عظیم المیہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی صعوبتوں کو انگیز کرنے کیلئے مالک رب الموات نے اہل بیت کا انتخاب کیا۔ کربلا میں ہونے والے خونچکاں واقعات میں سوداؔ کو بجائے خیر و شر کے درمیان ایک کشمکش نظر آنے کے چند مجبوروں و مظلوموں کی آہوں کا دھواں نظر آتا ہے جو بلا کسی تصور کے مرگ مفاجات کے عمل سے گزر رہے ہیں۔
سوداؔ کے مراثی سر زمین ہندوستان کے تخیل کی بلند پروازی، محاکات، جذبات نگاری، ندرت ادا، تشبیہ و استعارے کے اعلیٰ نمونے ہیں۔
اس جائزے کے اختتام پر ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ آسمان مرثیہ نگاری میں سوداؔ ایک ایسے ستارے کی مانند ہے جو کاروان انحطاط کو ایک نئی سمت اور نئی تگ و تاز سے آشنا کرتا ہے۔

ایم۔اے۔نصر

میر کے بہتّر نشتر

"میر کے بہتر نشتر" کے بارے میں متضاد رائیں ہیں۔ اس باب میں، اصحاب رائے نے مکمل خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اگر کبھی کسی طرف سے ہلکی سی آواز سنائی بھی دیتی ہے، تو اس کا اظہار بیان الجھا ہوا ہوتا ہے جیسا مقصد الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانا نہیں، بلکہ گول مول، بات کہکر محض اپنی جان چھڑانا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر کے نشتروں نے ایک مسئلے کی شکل اختیار کر لی ہے، وہ بھی ایک ایسا مسئلہ جس میں کوئی الجھنا نہیں چاہتا اگر کوئی اس الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی سعی کرتا بھی ہے، تو پرانے تذکرہ نویسوں کے متضاد بیانات کا شکار ہو جاتا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ جن تذکرہ نویسوں سے متاثر ہوتا ہے، اُن کے خیال کی مناسبت سے خود بھی اظہار خیال کر دیتا ہے اور اپنی ذاتی رائے کو پیش کرنے سے گھبراتا ہے اور اپنی اس خامی کو چھپانے کے لئے، اپنے سحر طراز قلم سے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے کہ لوگ، اس کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں اور مصنف کی ذاتی رائے جاننے کا خیال اُن کے ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ میر تقی میر کے بارے میں، بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مختلف انداز سے، اُن کی زندگی کے لطیف گوشوں اور ان کی حیات و شاعری پر موثر انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے مگر چند باتوں میں، قدیم تذکروں کی تحریر کو سچ مان لیا گیا ہے اور مختلف و نمایاں لہجے میں اُن ہی کے الفاظ کی تائید کی گئی ہے۔ "بہتر نشتر" بھی اُن بہت سی غلط لیکن مشہور روایتوں میں سے ایک ہے۔

میر جیسا شاعر، جس نے اپنی تمام زندگی کو شاعری کے لئے، وقف کر دیا تھا اور شاعری اس کی زندگی کا اہم جزو بن گئی تھی، جس پر یہ مقولہ حرف بہ حرف صادق آتا ہے کہ تصنیف، مصنف کی زندگی ہوتی ہے اور بقول مولوی عبدالحق "جو شخص میر کے حالات اور اُن کے اخلاق و سیرت۔ سے واقف نہ ہو، وہ اُن کے تمام کلام کو پڑھ کر بغیر کسی تذکرے کی مدد کے خود بخود اُن کی طبیعت کی اُفتاد اور مزاج کو تاڑ جائیگا" اور رام بابو سکسینہ کے بقول "میر کی زندگی درد والم کی زندگی ہے" اور سکسینہ نے انگریزی شاعر شیلی کی یہ سطور بھی نقل کی ہیں کہ "حرماں نصیب لوگ غلطی سے گہوارہ میں ڈالدیئے جاتے ہیں، جو مصیبت تو خود جھیلتے ہیں، مگر وہی مصیبت نظم میں دوسروں کو سناتے ہیں"۔

ایسا شاعر، جو اردو غزل کا سرتاج ہو اور جس کی مدح و ستائش میں بقول نثار احمد فاروقی

(ترجمہ ذکرِ میر) "اُن کی خدائی کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی بندگی کا اظہار کیا ہے، جن کا مسلک مختلف ہی نہیں، بلکہ متضاد ہے۔" ایسے پُرعظمت شاعر کے کلام کی عظمت کو صرف "بہتر اشعار" میں مقید کر دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؛ ممکن ہے میر کے کلام کے بارے میں آزردہ کی یہ رائے درست ہو کہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" لیکن اس بات سے، شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ میر کے پست کلام تک بھی دوسروں کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

اگر میر نے اپنے زمانے کے ماحول سے متاثر ہو کر فارسی کی تقلید کی ہے اور نتیجتاً کچھ بہت اشعار کہے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اُن کی شاعری میں تصنع زیادہ ہے اور صرف آورد ہی آورد ہے، "آمد" کا پتہ ہی نہیں ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں، یہ کہنا کہ آورد کا غلبہ ہے، صحیح نہیں ہے۔

اس نظریے کے زیر اثر کوئی رائے قائم کر کے اُن کے اچھے اشعار کی تعداد کو محدود کر دینا ایک بے معنی سی بات ہے اور میر کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ زندگی ہمیشہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ہر آنے والا لمحہ، انسانی زندگی میں انقلاب کا باعث بنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ادبی زندگی کا بھی حال ہے۔ یہ بھی ہر دور کے اثرات کو قبول کرتی ہے اور اس پر زمانے کی بدلتی ہوئی روش کا خاطر خواہ اثر پڑتا ہے اور یہ اپنے ذہن پر اُن کے اثرات کو مرتب کرتی ہے۔ اور اس طرح ہر آنے والا زمانہ، ایک نئے اضافے کا سبب بنتا ہے اور اپنے ماضی و حال کے اِن اثرات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، جو اس کے مزاج کے موافق ہوتے ہیں۔

شاعر بھی انسان ہوتا ہے اور اس کی زندگی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ہوائے سرد و گرم سے متاثر ہوا کرتی ہے اور میر بھی ایک انسان تھے۔ اگر انہوں نے اپنی ڈگر سے ہٹ کر ماحول کا کہیں ساتھ دیا تو، یہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ بے حسی ہوتی اور کوئی بھی، شاعر بے حس نہیں ہوتا۔ کیونکہ جذبات ہی اس کا قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جس کی بدولت وہ بلندی پر پہنچتا ہے اور "جزو یست از پیغمبری" کا لقب پاتا ہے۔

اُردو تذکروں میں، آبِ حیات، کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس تذکرے میں میر کے نشتروں کے بارے میں آزاد نے ان لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے "اردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں کہ ستر اور دو بہتر نشتر باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔" لفظ، جوہری۔ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آزاد کے پاس اپنے الفاظ کی تائید میں کوئی مستند ثبوت نہ تھا۔ بلکہ انہوں نے سنی سنائی باتوں پر نشتروں کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر اُن کے ذہن میں کوئی ایسی مستند تحریر ہوتی، جو ان کے قول کی تائید کرتی تو وہ ضرور نقل کرتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انشا پردازی کی دھن میں آزاد نے اس باب میں بھی مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور ایک غلط بات میر سے متعلق بیان کر دی ہے۔

دراصل یہ اُپج محمد حسین آزاد کی رنگین بیانی کی دین ہے۔ آزاد کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ انہوں نے ایسے فرضی واقعات کو بھی اپنا لیا، جو سراسر غلط باتوں ہی پر مشتمل کیوں نہ ہوں۔ بقول شخصے "آزاد کا بیان،

سو فیصدی حقیقت پر مبنی نہیں ہے" نشتروں کے بارے میں بھی آزاد نے سنی سنائی باتوں کو مد نظر رکھا ہے اور
بنیاد بھی ان ہی غلط مگر مشہور مروجہ باتوں پر رکھی ہے۔

اور آزاد کا یہ کہنا کہ "........ لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے" کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا
جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغے میں یہی سنا جاتا ہے کہ" دیکھئے یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے
آزاد کا اس طرح کھلے لفظوں میں بہتر نشتروں سے منسوب روایت کو فرضی گرداننا اس بات کا شاہد ہے
آزاد خود بھی اپنی اس بات سے مطمئن نہیں تھے اور اسی بے اطمینانی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے بوکھلا کر ڈھکے چھپے
لفظوں میں اپنی غلط بیانی کو تسلیم کر لیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد نے ایسا کیوں کہا ؟ بظاہر تو اس میں کوئی خاص وجہ نظر نہ
آتی ہے، مگر ذہن پر زور ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اس غلط بیانی کا محرک کون ہے؟ یہ بات
کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ آب حیات میں آزاد نے ذوق کو کس قدر بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ
ذوق سے ان کا دلی لگاؤ ہے اور ذوق، سودا سے بہت متاثر تھے۔ لہذا یہ قدرتی بات ہے کہ آزاد بھی ان
سے متاثر ہوئے۔

میر کے سامنے، سودا کی شمع شاعری مدھم تھی۔ سودا خود کو میدان غزل کا لاکھ بڑا شاعر سمجھیں
ان کے معتقد ان کے خیال کی تائید میں لاکھ سر پٹکیں، مگر یہ حقیقت ہے کہ میدانِ غزل میں میر نے سودا کو
مات دے دی تھی اور ان کا رتبہ بلند ہے۔ ممکن ہے میر کی گرفت کو کمزور کرنے اور ان کے زور کو گھٹانے اور
سودا کو ان کا ہم پلہ بنانے کی جستجو میں آزاد سے ایسی حرکت سرزد ہوئی ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔

تاریخ ادب اردو کے مصنف کے بقول" ان (میر) کے وہ اشعار جو بہتر نشتر کے فرضی نام سے
مشہور ہیں، سب خود انہیں کے سچے اور دلی جذبات کا پر تو ہیں.... مگر سچ پوچھیے تو ان کے صدہا ایسے اشعار ہیں
جن میں حقیقی شاعروں کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں"۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے تذکرہ نویسوں نے ڈھکے چھپے اور صاف لفظوں میں اس کو فرضی
گردانا ہے اور ان حضرات نے اس بات پر بھی افسوس ظاہر کیا ہے کہ میر کے اچھے اشعار کو اس قدر محدود کر
میر کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کے مترادف ہے۔

پرانے اہل قلم حضرات کے علاوہ، ابھرتی ہوئی نئی پود نے بھی اس کی مذمت کی ہے، جن میں
صاحبان کی رائے مجھے بہت پسند آئی ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ "دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے، سمندر کو
اور میر ایک بیکراں سمندر ہیں اور اس باب میں دوسری رائے یہ ہے "میر کی شاعری ایک ایسے سمندر کی مانند

اپنے دامن میں خس و خاشاک کو سمیٹے ہوئے بہتی ہے"۔

واقعی میر کی شاعری ایک بیکراں سمندر ہے جو اپنے دامن میں انتھاہ گہرائی رکھتی ہے محض اس سے ابھرتے ہوئے چند بلبلوں کو دیکھکر کوئی رائے قائم کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اگر سمندر کی سی وسعت رکھنے والی شاعری میں کچھ خس و خاشاک آگئے ہیں۔ تو اس کے لئے شاعر کو کم تر تو نہیں گردانا جا سکتا اور نہ ہی اس کے فن کو محدود کہا جا سکتا ہے۔ نہ ہی کچھ خامیوں کے پیش نظر اس کے کلام کی خوبیوں کے بارے میں غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے بلکہ کوئی بھی رائے قائم کرتے ہوئے ایک ترازو کے دو پلڑوں پر اس کی خوبیوں اور خامیوں کو رکھکر یہ دیکھنا ہوگا کس کا پلہ بھاری ہے۔

ہمارے ادب کے کرم فرماؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حقیقت اور مجاز کو اس طرح الگ کر دیں جیسے دودھ اور پانی — کیا ہمارے دانشور حضرات میر کے بہتر نشتر پر روشنی ڈالنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟

(بقیہ صفحہ ۴۸ سے آگے) اعتبار سے اس نمبر کی قیمت قطعاً زیادہ نہیں۔ اس نمبر کے آخری صفحات میں "بیاد ادیب" کے عنوان سے ڈاکٹر مغنی تبسم کا ایک نوحہ ہے جس پر ن۔م۔ راشد کا پرتو ملتا ہے ہو سکتا ہے۔ یہ نوحہ راشد نمبر کی تیاری کے دوران کہا گیا ہو۔ ادیب کی آخری نظم "کڑوی خوشبو" بھی شامل ہے بہرحال ن۔م۔ راشد نمبر گھریلو اور عوامی لائبریریوں کیلئے لال قدر ثابت ہوگا۔ کیا میں اُمید کروں کہ "میراجی نمبر" بھی نکالا جائیگا تاکہ میراجی کی شخصیت کے ساتھ بھی انصاف ہو سکے۔

(بقیہ صفحہ ۲۱ سے آگے)

نغمۂ بلبل جو سننا ہے تو اہل چمن
مثل گل ہر دم سراپا گوش رہنا چاہیئے
موسم گل جا چکا عثماں مگر کہتا ہے دل
اور ابھی کچھ دن جنوں کا جوش رہنا چاہیئے

غم رقیب میں ہم کو نہ خاک اڑانی تھی
ہمارے دل سے یہ جائے غبار مشکل ہے
جو برق کہ گرتی ہے وہ ہے نگہ جاناں
جو دل کو بناتی ہے وہ زلف معنبر ہے

حمیرہ جلیلی
(ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی)

شاہانِ دکن کی اُردو شاعری

بہمنی سلطنت کے انتشار کے بعد پانچ خود مختار ریاستیں گولکنڈہ کی قطب شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی احمد نگر کی نظام شاہی، بیدر کی برید شاہی اور برار کی عماد شاہی قائم ہوگئیں۔ ان سلطنتوں کے فرمانرواؤں نے نہ صرف بہمنی سلطنت کی تہذیبی قدروں کو برقرار رکھا بلکہ تہذیب و تمدن کے اعلیٰ ترین معیار کو قائم کیا۔ خصوصاً قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے علاوہ دوسری قدروں کے علم و ادب کی زبردست سرپرستی کی شاعروں کو نہ صرف درباروں سے وابستہ کیا بلکہ گاہے بہ گاہے انعام و اکرام سے سرفراز کرکے ان کی حوصلہ افزائی بھی کرتے رہے۔ چنانچہ اُردو کا ابتدائی گہوارہ یہی سلطنتیں ہیں جہاں کے تاجداروں نے اس کم سن زبان کو نہ صرف نگاہ التفات سے نوازا بلکہ دوسری کہنہ زبانوں کے روبرو لا کھڑا کیا۔ چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور میں بہت جلد اس زبان کے اچھے ادبی شہ پارے جمع ہوگئے۔

دکن کے سلاطین نے نہ صرف اُردو شاعروں کی ہمت افزائی کی بلکہ خود بھی انہوں نے اُس زبان میں کلام موزوں کیا ہے۔ چنانچہ ان دونوں سلطنتوں میں بہت سے اچھے فرمانروا اچھے شاعر بھی گزرے ہیں جنکی ادبی حیثیت کسی بھی طرح اپنے معاصر بلند مرتبت شاعروں سے کم نہیں میں اپنے اس مختصر مضمون میں ایسے ہی سخنور حکمرانوں کی حیات شاعرانہ پر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گی۔

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے پانچویں حکمران محمد قلی قطب شاہ (۹۸۹ھ تا ۱۰۲۰ھ) کو اس طرح بھی اولیت حاصل ہے کہ اب تک کی معلومات کی رو سے وہ اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ کسی بھی شاعر کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں اُس کے اطراف و اکناف کے ماحول کا بڑا دخل رہتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ نے عیش و عشرت کی آغوش میں آنکھ کھولی طبیعت بچپن سے رنگین پائی تھی۔ فارسی شاعروں کے کلام کا گہرا مطالعہ کامل اور صاحبِ ذوق اساتذہ اور اتالیقوں کی نگرانی نے طبیعت کو جلا دی اُس پر کمسنی میں ہی خوبیٔ قسمت نے سر پہ تاج لا رکھا۔ ان سب حرکات نے بہت جلد اس کو ایک بہترین شاعر بنا دیا۔ اس کو اپنے ہم عصر شعراء پر اسطرح بھی فوقیت حاصل ہے کہ کوئی صنف سخن ایسی نہیں جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو اور کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اس نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ میں محلات کی رنگینی حسینوں کی عشوہ طرازی باغات کی سرسبزی و

شادابی، عیدوں کی دھوم دھام سالگرہ کی رسومات عوام کے رہن سہن کے طریقے یہ سب چیزیں نہ صرف قلی قطب شاہ کی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیتی ہیں بلکہ اپنے دور کی زندہ تاریخ بھی بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ ساتھ ہی اس نے حمد، نعت، منقبت و مرثیہ کے میدان میں بھی اپنے قلم کی جولانیاں دکھلائی ہیں جو اس کے دلی جذبات و احساسات کا نمونہ ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ کی زبان نہایت سلیس، مترنم و سادہ ہے جسکو ہر شخص نہایت مزہ لیکر پڑھ سکتا اور لطف اندوز ہو سکتا ہے اس کی زبان کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نہ تو فارسی کی آمیزش زیادہ ہے اور نہ سنسکرت کا عنصر حد سے بڑھا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی زبان میں ایسی شیرینی پیدا ہوگئی ہے کہ چار صدیاں گذر جانے کے بعد بھی آج ہم اُس کی زبان کو نہ صرف بخوبی سمجھ سکتے ہیں بلکہ محظوظ بھی ہو سکتے ہیں ؎

بندا ہوں گنہ گار خدا میرا گنہ بخش	تج لطف کیرا فیض خدا مج کو سدا بخش
تج لطف تھے موجود ہوا جیو منے میں	آپ رحم کے نوراں سوں مرے دل کو جلا بخش
اسم محمد تھے اہے جگ میں سو خاقانی مجھے	بندہ نبیؐ کا ہم رہے سہتی ہے سلطانی مجھے
شاہاں غروری ٹھاؤں تھے کرتے ہیں ہی دھاواں مجھے	متی مری تج ناؤں تھے کہتی ہے دیوانی مجھے
نازک نھنی بالی محبت میں سرنا جانے ہنوز	لو جن کجل جھمکیں دے باز نہ پچانے ہنوز
منبر پر سوسی دھرنے ہیں شیشے سرا بجر تہ میں	پیالی میں مدکر تے ہیں مج عرض نامانے ہنوز
چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا	کہ اُس بن نئیں ہمن یک تل قرارا
صبوری کو نہیں ہے ٹھار دل میں	صبوری کیوں کر سو کر لینہا رارا !!
ہے پھول کا ہنگام مدسوں باراں حاضر	پھولاں کے نمن سارے ہیں یاراں حاضر
اس وقت پہ کیوں تو بہ کیا جائے مجے	تو بہ شکناں ہور نگاراں حاضر

سُلطان محمد قطب شاہ ظل اللہ سلطان محمد قطب شاہ اِس سلسلہ کا دوسرا شاعر ہے جو سلطان محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور جانشین تھا ۱۰۳۵ھ میں اس نے انتقال کیا افسوس کہ اب تک اس کا دیوان نہ مل سکا۔ لیکن تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی، قصیدہ اور غزلیات میں اس نے طبع آزمائی کی تھی۔ ظل اللہ اس کا تخلص تھا۔ محمد قطب شاہ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اپنے چچا اور پیشرو بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلیات مرتب کر کے ایک طویل منظوم دیباچہ لکھا ہے۔ ذیل میں اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس سے انداز بیان اور زبان کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے ؎

سو کچھ شاعری بیچ شہ دھر کمال	بچن کہہ کے موتیاں نمن صدف ڈھال

کہے بن کئیں شعر میں وصف اپس	جو بوجھ شعر کے فن میں ریتا سرس
جو بھی کوئی اچھے شاعر اس دھات وہ	تو بن وصف اپس کے نہ ہے سات وہ
رہیا جائے نا شاعراں من منیں	بتا کے وصف شعر کے فن میں
جو خاصا ہے یو شاعراں کا ہر ایک	نہ اس بن کہے وصف بیتاں کیتک
اگر شاہ کہے بیت پچاس ہزار	دھرے وصف آپس مول کیں بہت عار

عبداللہ قطب شاہ عبداللہ سلطان محمد قطب شاہ کا بیٹا و جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا۔ وہ شاعری و موسیقی کا قدر دان اور اپنے نانا محمد قلی قطب شاہ کی طرح عیش و عشرت کا متوالا تھا۔ علماء اور اہل فن کی قدر دانی میں کسی بھی طرح اپنے پیش رو سلاطین سے کم نہ تھا۔ نہ صرف ہند بلکہ عرب و عجم کے علماء بھی اس کے دربار سے منسلک تھے۔ چنانچہ برہان قاطع جیسی مشہور لغت اور سب رس جیسی شاہکار کتاب اسی کے دور کی یادگار رہیا۔ فارسی و اُردو ہر دو زبان میں اس کا دیوان موجود ہے۔ تقریباً ہر صنف میں اس نے بھی طبع آزمائی کی۔ زبان کہیں کہیں قلی قطب شاہ سے زیادہ رواں اور سلیس ہے ؎

نیچے نوروز تھے اگلا صفائج کمہ جُدا دیتا	صفا جیسا جو نکتا تھا سو ویسا ج خدا دیتا
ترا قد پھول کی ڈالی نمن کھل کھل کمانے تھے	خوشی پا جیو کا بلبل ہو غم کوں سب ولا دیتا
بغیر ساقی بغیر پیالا بغیر پیرت بغیر پیالے	دُنیا کچ بن کر نج قلقل صراحی کا صدا دیتا
تول بہاری عشق بھی تیرا ہے پیارا	لگیا ہے بھوت تج سوں دل ہمارا
سکھی آمل کر مل مل ذوق کریں	دنیا میں کوئی نیں آیا دو بارا
سکھی کچ بھی سج توں دل میں اپنے	کتا منت کرے عاشق بچارا

سلطان ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈہ کا آخری تاجدار سلطان ابوالحسن تانا شاہ بھی شاعر تھا۔ اس کا کوئی دیوان اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ اس کا دور حکومت انتشار اور لڑائی جھگڑوں کا دور تھا اور اُسے اطمینان سے کلیات مرتب کرنے کا موقع نہ مل سکا ہو۔ کلام کا نمونہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے ؎

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ	جیوں گل شگفتہ ہو کے مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن	اے شوق خود پسند توں ٹک بھی سخن میں آ

۱؎ دکن میں اُردو بار ششم نصیرالدین ہاشمی ص۹۱ ۲؎ دکن میں اُردو بار ششم نصیرالدین ہاشمی ص۹۳ ص۱۴۰

قطب شاہی سلاطین کی طرح عادل شاہی فرمانرواؤں نے بھی اُردو کی دل کھول کر سرپرستی کی اس ابھرتی ہوئی زبان کو جو بہمنی دور تک خانقاہوں اور صوفیاء کے اطراف گھومتی رہی دربار میں مدعو کیا۔ سر آنکھوں پر بٹھایا اور اس طرح عزت افزائی کی کہ نہ صرف اردو شاعروں کی سرپرستی کی بلکہ خود بھی اس زبان میں کلام موزوں کرنے لگے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ) اس زبان کا ایک اچھا شاعر تھا۔ لیکن سوائے اس کی تصنیف نورس کے باقی کلام ابھی تک روپوش ہے لیکن تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ غزل و قصیدہ وغیرہ میں اس نے اپنے قلم کی جولانی دکھائی تھی۔ نورس فن موسیقی پر مبنی ایک کتاب ہے جس میں مختلف راگ اور راگنیوں کے تحت گیت لکھے گئے ہیں پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اس کو مرتب اور شائع کیا ہے نمونہ یہ ہے ؎

ابراہیم سب سندری دیکھا یو چین ہے کہاں — جات چاند سلطان ناٹوں کھلے جہاں
ابراہیم سنو جاگ ایسا پیو کہاں پاوے گا — مندجیاں کو سنگار کو سب کنٹھ لاوے گا
رات تھوڑی دن بہوت بنا اٹھو جاوے گا[1]

مست شیں ہور اجیل اموے یوں رے — سرل رالکیں جیو ساتھ تو اول ہوں دیوں رے
جے کن سب توں ہیں گون کر گن لائے رے — ابراہیم دے گن میں تجھے اس بیالے آئے رے[2]

علی عادل شاہ ثانی شاہی

علی عادل شاہ ثانی (۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ) کا کلیات وشائع ہو چکا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے بھی جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ شاہی تخلص کرتا تھا۔ کلیات کے مطالعہ سے انداز اور زبان کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ اس کے کلام میں شاہی طمطراق اور سادگی سلاست بین بین ہیں۔ اور قصیدے شکل و ادق بحروں میں کہے گئے ہیں تو دوسری طرف غزلیات میں سلاست روانی و سادگی نظر آتی ہے۔ مثنویاں مرقع نگاری کا بہترین نمونہ ہیں ؎

سارے جہاں کے یار کہی پر کہوں رتن کیوں کر کہو — یاقوت ہور مرجان میں کوہی رتن برتر کہو
بولے جہاں کے یار کہی ہمتا نہ آوے بولنا — تمنا کہا تا بولتا اے شاہ بحر و بر کہو
بولیا ہوں نت میں فکر تے یو دو رتن کا فرق کر — گر سمجھ اچھے انصاف تو اس بول کوں خوشتر کہو[3]

قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کی طرح سلطنت آصفیہ نے بھی اس زبان کی نہ صرف ناز برداری کی بلکہ اسکو منظور نظر ٹھیرایا۔ شعراء کی سرپرستی اور قدردانی کا یہ حال رہا کہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے ماہرین یہاں کھنچے چلے آئے۔ گو گلکنڈہ و بیجاپور کے سلاطین کی طرح اس حکومت کے بادشاہ بھی اچھے شاعر گزرے ہیں۔

---

۱ تا ۳ دکن میں اُردو نصیر الدین ہاشمی ص ۱۸۹، ص ۱۹۰، ص ۲۲۱

نواب میر قمرالدین شاکر ان میں سب سے پہلے نواب میر قمرالدین آصف جاہ اول کا نام آتا ہے جو فارسی کے اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اُردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔ آصف و شاکر اپنا تخلص تھا سے

شمیم کا کل شکیں سے جب میں ارنگ گیا	تو آئے کہنے لگے اسکو سانپ سونگ گیا
ہوں تنہا نہ تن بلکہ جان بیچتا ہوں	یہ ہستی کی ساری دکان بیچتا ہوں
اس گلبدن کے غم میں رونا ہے عین حکمت	کرتی ہیں ضعف دل پر آنکھیں گلاب پاشی[1]

میر محبوب علی خاں آصف میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم بھی شاعری کا خاص ذوق رکھتے تھے اہل فن کے قدرداں تھے اور حضرت داغ کے شاگرد۔ آصف تخلص کرتے تھے۔ زبان سلیس و رواں ہے فصاحت

روزمرہ محاورہ اور رنگین خیالی کا غلبہ۔ اس درجہ ہے کہ صاف طور پر داغ کا رنگ نظر آتا ہے[1] سے

وہ شاہ حسن بھی شہریار ہم بھی ہیں	کبھی نہ دب کے ملیں گے ہم ان سے اے آصف
لائے تھے وہ رقیبوں کو میرے مزار پر	اٹھ کر غبار سامنے دیوار ہو گیا[1]
بے تاب دل کے ہاتھ سے ہے میری لاش بھی	اندر مزار کے کبھی باہر مزار کے[1]

ان کی اخلاقی نظمیں بھی غزلوں ہی کی طرح مشہور ہیں۔ مختلف سپاس ناموں کے جواب ہیں اور اپنی سالگرہ کے موقع پر نہایت عمدہ نظمیں آپ نے لکھی ہیں جو تعلیم اصلاح فوج وفاداری علم و عمل وغیرہ کے مختلف موضوعات پر مبنی ہیں اور زور بیان و نکتہ آفرینی کی وجہ سے خوب ہیں۔

نواب میر عثمان علی خاں عثمان دور عثمانی کے ادبی کارناموں سے کون واقف نہیں اپنے والد میر محبوب علی خاں آصف سے شاعری کا جو ہر ورثہ میں پایا۔ والیٔ دکن آصف سابع عثمان کی شاعری نے حیدرآباد میں ذوق سخن کو پروان چڑھانے میں بڑا اہم حصہ لیا ہے۔ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں آپ کی قادر الکلامی کا سکہ آج بھی بازار سخن میں بڑی قیمت رکھتا ہے۔ امام الفن فصاحت جنگ جلیل سے مشورہ سخن کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ بے ساختگی اور روانی آپ کے کلام کا جوہر ہے۔ زبان و بیان کی پاکیزگی دل پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔

ابتدائی کلام کے سات دیوان طبع ہو چکے ہیں باقی دیوان زیر ترتیب ہیں نمونہ کلام یہ ہے سہ

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و تواں باقی	ابھی جھے میں کیا جانے ہیں کیا کیا سختیاں باقی
زبان شمع سے سنتا ہوں قصہ سوز الفت کا	شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستاں باقی
درد دل آہ و فریاد کرتا ہے مجھے	ضبط کی تاکید ہے خاموش رہنا چاہیے

(باقی صفحہ ۴۷ پر)

[1] تاریخ دکن میں اُردو۔ نصیرالدین ہاشمی ۱۹۵۸ء آصف کی شاعری پر ایک نظر۔ نصیرالدین ہاشمی ملاپ حیدرآباد ۱۹۶۲ء

نواب سعادت جاہ سعادت

کیا کہیے بات بات پہ بندش اگر ہوئی
پائے ثبات کو مرے لغزش اگر ہوئی

دل میں اترتی جاتی ہے تصویر نازنیں
موہوم سی نگاہ کو جنبش اگر ہوئی

لگ جائے دیکھ سینۂ کون و مکاں میں آگ
زخم جگر میں خیر سے سوزش اگر ہوئی

اک پل میں کائنات کا نقشہ بدل ہی جائے
ہلکی سی چشم یار کو گردش اگر ہوئی

میں گاہ گاہ پر امید ہوں اور گاہ محو یاس
لب پہ ہنسی کبھی آئی ہے رنجش اگر ہوئی

رکنے لگے بیک آن میں ارض و سما کی سانس
اک بار ضبط نالہ کی کوشش اگر ہوئی

دل بیٹھ جائے ہستئ ناپائیدار کا
اندوہ و اضطراب میں جوشش اگر ہوئی

گردن سعادت آپ کی بار گنہ سے خم
اور اس کے بعد حشر میں پرسش اگر ہوئی

کریم اسدی

کوئی دیکھے تو یہ جرأت کہ ہے کیا دل مانگے
آئینہ ساز کو آئینہ مقابل مانگے

کوئی مجھ سا بھی تو یوں زیست کا حاصل مانگے
اور اک درد بھرا درد بھرا دل مانگے

کشتئ دل کی ستم ظرفی تو کوئی دیکھے
موج طوفان تلاطم سر ساحل مانگے

اس کی شمشیر ادا وہ ہے کہ جس پہ چل جائے
اٹھکے پانی بھی نہ دو گھونٹ وہ بسمل مانگے

کیا کروں اے دل ناداں کہ وہ اب تو مجھ سے
داد ہر طرز جفا ہے سر محفل مانگے

سر بکف کوئی بھی دیوانہ نہیں میرے بعد
کس سے اب خون وفا خنجر قاتل مانگے

کون یاں دولت الفت سے ہے آسودہ کریم
کس سے بھیک اکی بھری بزم میں سائل مانگے

حباب ہاشمی

عشق میں اندیشۂ سود و زیاں کچھ بھی نہیں
راہِ الفت میں متاعِ نقدِ جاں کچھ بھی نہیں

عاشقی میں مہرباں نامہرباں کچھ بھی نہیں
اے دلِ ناداں خیالِ این و آں کچھ بھی نہیں

رو بروِ منزل تجھے جہدِ مسلسل چاہیئے
عزم محکم ہو تو میرِ کارواں کچھ بھی نہیں

دو مبارکباد میرے سجدہ ہائے شوق کو
بس نہ چاہوں تو یہ سنگِ آستاں کچھ بھی نہیں

اک زمانہ تھا کہ دنیا گوش برآواز تھی
اک زمانہ ہے کہ اپنی داستاں کچھ بھی نہیں

دانا و بینا فقط اک ذاتِ واحد ہے وہی
اُس پہ ہے سب کچھ عیاں اُس سے نہاں کچھ بھی نہیں

زندگی کی بے ثباتی کہہ رہی ہے اے حباب
غم بھی ہے اک عارضی شے جاوداں کچھ بھی نہیں

شمس فریدی

ہوگئے کیوں سب کے چہرے زرد سے
پوچھتا ہوں آج ایک اک فرد سے

سو رہا تھا کل یہی فٹ پاتھ پہ
مرگیا شاید ہوائے سرد سے

ساری دنیا سو رہی ہے بے خبر
رو رہا ہے کون فرطِ درد سے

مختصر ذکر مداوا کیجیے
سر پھٹا جاتا ہے میرا درد سے

قافلے کے لوگ منزل کا پتہ
پوچھ لیتے رہگزر کی گرد سے

کس قدر کمھلا گیا ہے دیکھنا
چاند سا چہرہ تمہارا گرد سے

شمس بولو کون ہے اپنا یہاں
ہم بھی لیں تو مرے ہمدرد سے

نثار عباسی

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں کون ہوں کیا ہوں
فنکار کی تخئیل ہوں میں ذہن رسا ہوں

اس طرح کبھی ذہنی کشاکش سے چھٹا ہوں
اک الجھی ہوئی ڈور کا جیسے کہ سرا ہوں

اس طرح کبھی فیصلہ کرتے ہیں رکا ہوں
تابانی سے محروم ہوں اور جل بھی رہا ہوں

جیسے کسی کاشانۂ مفلس کا دیا ہوں
خالی ہے کبھی ذہن کبھی سوچ رہا ہوں

الجھی ہو مسائل کی اگر زلف گرہ گیر
میں ناخنِ تدبیر ہوں میں عقدہ کشا ہوں

کاوش سے مری سنورے ہیں یہ گیسوئے گیتی
میں شانۂ ادراک ہوں آئینہ نما ہوں

میں شاعر و فنکار کی بالغ نظری سے
کیا تم کو بتاؤں کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں

دیکھے ہیں بہت قرن مری دیدہ وری نے
میں وقت کے ماتھے کی شکن دیکھ رہا ہوں

تاریخ کے اوراق پہ ہوں زندہ حقیقت
تخئیل میں ڈھل کر کبھی افسانہ بنا ہوں

یوں ہی نہیں پہونچا ہوں نثار اوجِ ادب پہ
خود اپنی ہی گہرائیوں میں ڈوب گیا ہوں

کمال جعفری

روش روش پہ انہیں گلستاں میں پھول ملے
مگر ہمیں تو ہر اک گام پہ ببول ملے

خدا کے نام پہ کرتے ہیں گمرہی پیدا
جہاں میں ایسے بھی کچھ نائبِ رسول ملے

حیاتِ شوق چمک جائے کہکشاں بن کر
اگر جبیں کو ترے آستاں کی دھول ملے

نثار جایئے اس اہتمامِ گلشن کے
قدم قدم پہ یہاں خار بن کے پھول ملے

کریں تو کیسے کریں تجھ پہ ہم یقیں ساقی
کہ تیری بزم کے بگڑے ہوئے اصول ملے

یہی مقامِ جنوں ہے یہی مقامِ خرد
نہ بھول کر بھی یہاں ٹوکئے جو بھول ملے

نہ پوچھ مکتبِ دیوانگی کا فیض کمال
جو شورے بھی ملے قابلِ قبول ملے

پروفیسر عابد عالمی

زندگانی شکستوں کا انبار ہے

کیا ہوئیں وحشتوں کی جواں وادیاں
میں کہاں تھا، تمناؤں کے پاسباں
اے دلِ غمزدہ! میں کہاں آگیا؟
میں نے چاہا تھا، لیکن نہ چاہا تھا یوں
انقلاب اتنا افسردہ، اتنا حزیں!
ہائے اے میری حسرت زدہ جستجو!
کیوں تری کاوشوں کو زوال آگیا؟
میرے قدموں سے مانوس راہِ جنوں
اے فضا کی تمنا شکن خامشی!
کس طرف مڑ گئی، کس جگہ کھو گئی؟
کیا ہوئے آج افکار کے کارواں
جن کے سائے نگاہوں سے مانوس تھے؟
ظلمتوں کے دیاروں کو کیا ہو گیا
آشنا جن سے تھیں میری تنہائیاں؟
دل کہاں آرزوؤں کا مدفن لئے
کوئی جائے بھی آخر تو جائے کہاں؟

میرا جوشِ سفر، میری بے باکیاں
وہ بیاباں نوردی کی آزادیاں
وہ تخیل کی اک کائناتِ حسیں
وہ تصور کا عالم، وہ سرگوشیاں
لمحہ لمحہ وہ گھٹتے ہوئے فاصلے
میری رفتار پر نقشِ حیرت بنے
منزلوں کے فسردہ نظر سلسلے
آج کیوں میرے ماضی کی تقدیر ہیں؟

آج میں ہوں، جہاں ہے اور افسردگی
بزمِ ہستی کی نالہ کناں محفلیں
یاس کی وادیاں، درد کی مجلسیں
ہر قدم پر ارادہ شکن حادثے
ہر نظر میں الم پوش خاموشیاں!
ایسے غمناک عالم میں گھبرا کے پھر
کیا تعجب اگر آج دل مان لے
زندگانی شکستوں کا انبار ہے!

فرحت قمر

دو پہلو

جسم اک امانت ہے
اک طلسم پیچیدہ، اک حسیں عمارت ہے!
ایک سانس آتا ہے، ایک سانس جاتا ہے،
اور اس امانت کو برقرار رکھتا ہے!
ایک سانس لاپرواہ ——
اور یہ طلسمی شے
ایک خاک کا تودہ!

زندگی مسلسل ہے!
ایک نسل آتی ہے، ایک نسل جاتی ہے
زندگی کی راہوں کو پربہار رکھتی ہے
ایک نسل بے پرواہ
اور منزلِ ہستی
گم پسِ غبارِ راہ!

نور الحسن انور ادیب

کس کو معلوم ہوئی بات یہ کیا آخر شب
تلخیٔ مے کا مزہ اور بڑھا آخر شب
شیخ جی کو بھی ہوئی مے کی ضرورت محسوس
چلی اس رنگ سے کل بادِ صبا آخر شب
جب ترے عارض و کاکل کا خیال آیا مجھے
خود بخود اٹھ گئے یہ دستِ دعا آخر شب
نالہ و گریہ کا اک شور تھا اور کچھ بھی نہیں
کون دیوانہ ترے در سے اٹھا آخر شب
آہ بھر لیتا ہوں لڑ لیتا ہوں چپ رہتا ہوں
یاد آجاتی ہے جب تیری جفا آخر شب

نقد و نظر

ن۔م۔راشد نمبر

قیمت سات روپے۔
پتہ۔ مکتبۂ "شعر و حکمت" ۲۲-۲-۷۶۷ بازار زرالامرا، حیدرآباد۔ ۲۴

ن۔م۔راشد نمبر واقعی راشد کے شایانِ شان ہے۔ مواد کے اعتبار سے اس نمبر کی اہمیت بہت زیادہ ہے تمام لکھنے والے اُردو کے اُستاد اور موجودہ دور کے بہترین نقاد ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر عالم خوندمیری، سلیم احمد، شمس الرحمٰن فاروقی، حسن عسکری، وارث علوی اور خود ڈاکٹر مغنی تبسم ان کے علاوہ صفدر میر کی فارسی تحریر کے مترجم ہیں منظور سجاد و رفیق علی۔

ڈاکٹر مغنی تبسم نے انھیں مرتب کرکے اپنے قاری کے ساتھ ہی نہیں بلکہ ن۔م۔راشد کے ساتھ بھی پورا پورا انصاف کیا ہے۔ تمام مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ یہ نمبر ن۔م۔راشد کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے جسے عام قاری نظرانداز کرتا رہا ہے اگر وہ راشد کو خلوص کے ساتھ پڑھے تو وہ اس کا قائل ہو جائیگا۔ دراصل راشد کے ساتھ زیادتی کی جاتی رہی ہے۔ ویسے بھی راشد نے اتنی جدید شاعری اس وقت کی جب لوگ جدید شاعری کے نام ہی سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے تھے۔ راشد اصل میں ہمارے دور کا شاعر ہے اس دور کا قاری بھی چونکہ بہت باشعور ہو چکا ہے اس لئے اب راشد کا مطالعہ اس کے مطلب کو سمجھنے کی مخلص کوشش ہے راشد بہت ہی غیر معمولی ذہنیت رکھنے والا شاعر ہے یوں بھی راشد اور میراجی کو جدید شاعری کا بانی کہا جاتا ہے جدید شاعری کے اولین بانیوں میں محمد حسین آزاد، حالی اور نظم طباطبائی کا بھی نام لیا جاتا ہے مگر صرف ردیف و قافیہ سے ہاتھ اُٹھا لینا جدید شاعری کی صف میں شامل ہونے کیلئے کافی نہیں۔ اس طرح اگر جدید شاعری کو کسی نے واقعی جدید شاعری کا مقام دیا ہے تو وہ راشد اور میراجی ہی ہیں۔ یہاں میں یہ وضاحت بھی کرتا چلوں کہ لفظ جدید کو میں نے محدود معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے کہ غالب بھی اپنے دور کا جدید شاعر تھا۔ اس لفظ کو میں نے اپنے دور کے جدید ترین اور وسیع ترین مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ اس نمبر میں راشد کے ..... فن کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں راشد کی فارسی تحریروں کے تراجم بھی شامل ہیں۔ ان کا ایک شاندار خطبہ جو حلقۂ اربابِ ذوق کی "......" سولھویں سالگرہ پر پڑھا گیا تھا، شامل ہے۔ رسم الخط کے بارے میں ن۔م۔راشد کا ایک بہترین معلومات افزا مضمون شامل ہے جس پر غور تو کیا جا سکتا ہے لیکن عمل نہیں (راشد نے اردو کیلئے بھی لاطینی رسم الخط اپنا لینے کا مشورہ دیا ہے)

راشد کی تحریروں سے قاری کو یہ اندازہ ہوگا کہ ان کی شعر [illegible] ہے۔ [illegible]

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد (۳۵) شمارہ (۲)

فروری ۱۹۷۲ء

ماہنامہ

سب رس

([illegible] نمبر)

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مجلسِ مشاورت

میر حسن - ڈاکٹر گوپی چند نارنگ - رمن راج سکسینہ -
ڈاکٹر غلام عمر خاں - محمد منظور احمد

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زرِ سالانہ	آٹھ روپے	غیر ممالک سے	پندرہ روپے
زرِ ششماہی	چار روپے	فی پرچہ	۵۵ نئے پیسے

نمونے کے پرچے کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اُردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

صفحہ

تاثرات :-

مصروفیات ادارہ :-

تاثرات

دوران سنہ ۱۹۷۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کے بارے میں جن اصحاب یا اخباروں نے اپنے تاثرات تحریر یا شائع کئے اُن کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں۔ (ادارہ)

۱- مسٹر رچرڈ۔ یم۔ ایٹن۔ یونیورسٹی آف وسکانسن۔ یو۔ ایس۔ اے۔

ادارہ کے معائنہ سے اس امر کا یقین ہوا کہ درحقیقت ادارہ کے کتب خانہ میں مفید اور نادر کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ ۱۲/۱/۱۹۷۰ء

۲- جناب گورکھ سنگھ جیتا (نئی دہلی)

آج میں یہاں آیا ہوں تو بدقسمتی سے زور صاحب اس جہان میں نہیں ہیں مگر ادارہ دیکھ کر اُن کے کام کی بدولت میرے دل میں اُن کی عزت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ اس ادارہ نے جو کام کیا ہے اُس کا جائزہ صرف وقت ہی لے سکے گا۔ ۲۲/۱/۱۹۷۰ء

۳- محترمہ خانم مہری اہری صحیفہ نگار و شاعرہ (ایران)

ایوانِ اردو کی آج کی پرکیف ادبی محفل میں جس پرخلوص جذبات محبت کا اظہار کیا گیا ہے ناممکن ہے کہ میں ان کو فراموش کردوں؟

۴- شریمتی وی۔ سرلا راؤ (وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند)

ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ اور میوزیم کو دیکھنے سے معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ مسٹر محمد اکبرالدین صدیقی نے مجھے تفصیلی معلومات بہم پہنچائیں میں دست بدعا ہوں کہ ادارہ کے کاروبار بہتر طور پر انجام پاتے رہیں۔ ۲۸/۲/۱۹۷۱ء

۵- ایس۔ اے۔ رحمٰن (اسسٹنٹ فینانشیل اڈوائزر وزارت فینانس حکومت ہند)

ادارہ کے بارے میں مذکورۂ بالا جن پاکیزہ جذبات کا اظہار کیا گیا ان سے میں متفق ہوں اور ادارہ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ ۲۸/۲/۱۹۷۰ء

۶- جناب عبدالقدوس چاند بخش قادری (پروفیسر اسلامیہ کالج بدایوں)

"مجھ جیسے طالب علم کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہو سکتی ہے کہ اس ادارہ کو دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ شمالی ہندوستان میں بھی ایسے کئی اداروں کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس کہ ہماری طرف کوئی توجہ نہیں۔ میں اس عظیم انسان کو جو اردو ادب کا شیدائی تھا اپنا خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔" ۲۲/۸/۱۹۷۰ء

اگر آپ

اردو اور ادارۂ ادبیات اردو سے ہمدردی رکھتے ہوں تو

۱- اپنے کتب خانے کیلئے ادارہ کی مطبوعات خریدیئے۔ فہرست بلا قیمت طلب کیجئے۔

۲- ادارہ کے امتحانات میں شریک ہو کر اپنے علمی معیار کو بلند کیجئے اور گریجویٹ ہو جائیے۔ تفصیلات کیلئے معتمد شعبہ امتحانات سے ربط پیدا کیجئے۔

۳- سب رس کے خریدار بنئے اور بنائیے اور تاجر ہوں تو اشتہار دے کر تعاون فرمائیے۔

۴- قلمی کتابوں کا تحفظ چاہتے ہوں تو تحفتاً ادارہ کے کتب خانہ کو عنایت کیجئے۔ تاکہ آپ کا عطیہ اور نام ادارہ میں محفوظ رہیں۔

۵- مصنف ہوں تو اپنی کتابیں تبصرہ کیلئے بھیجئے کہ کتاب کتب خانہ کی زینت بنے اور اس کی تشہیر ہو۔

مصروفیاتِ ادارہ

علمی ـــــ ادبی اور ـــــ ثقافتی

(ادارے کی ۱۹۷۰ء کی ڈائری سے)

جنوری ۱۹۷۰ء

۲۶ جنوری:- بائیسویں یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر ادارہ کی عمارت "ایوان اردو" پر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد دفتر نے صبح ۸ بجے قومی پرچم لہرایا۔

فبروری ۱۹۷۰ء

(خانم مہری اہری اور حسن نعیم کے خیر مقدم میں محفل شعر۔)

دوشنبہ ۲ فبروری:- (۷ بجے شام) ادارۂ ادبیات اُردو کی طرف سے ایوانِ اُردو میں ایران کی ممتاز صحیفہ نگار اور شاعرہ محترمہ خانم مہری اہری اور اُردو کے ممتاز شاعر جناب حسن نعیم دہلی (وزارتِ خارجہ حکومت ہند) کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ہر دو مہمانوں نے ایوان اُردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ وقار خلیل اور ترصیص الدین انصاری صاحبان نے ادارہ کی سیر کرائی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اردو جامعہ کشمیر کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی۔ ادارہ کی طرف سے میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد دفتر نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ موصوفہ وزیر اعظم اندرا گاندھی پر فارسی میں سوانح لکھ رہی ہیں اور اسی سلسلے میں وہ وزیر اعظم کی دعوت پر ہندوستان کے دورے پر آئی ہیں۔ ...... خانم مہری کی علمی، ادبی اور صحافتی و ثقافتی مصروفیات سے بھی فاضل مقرر نے روشناس کرایا۔ محفل شعر میں خانم مہری نے فارسی میں نظمیں اور غزلیں سُنا کر داد حاصل کی۔ مہمان شاعر جناب حسن نعیم نے بھی کلام سُنایا۔ حیدرآباد کے میزبان شعراء میں جناب شاذ تمکنت۔ جناب سعید شہیدی۔ پرنس میر نقی علی خاں ثاقب۔ جناب راشد آذر۔ وقار خلیل۔ محترمہ عظمت عبدالقیوم۔ جناب عشرت کرتپوری اور آقائی فرخ شیرازی نے کلام سنایا۔ جناب احمد جلیس لکچرار دارالعلوم نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ پروفیسر سروری نے صدارتی تقریر کے علاوہ پہلی بار غزل کے اشعار سُنا کر سامعین کو حیرت میں ڈالا۔ محترمہ خانم اہری اہری نے استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "میں اس خوبصورت شعری محفل سے

بہت متاثر ہوں، حیدرآباد کا علمی و ادبی ماحول "شیراز" کی طرح ہے۔ فارسی اور اُردو میں جو یگانگت کا جذبہ یہاں نظر آیا اُس سے ایران، ہندوستان کے استحکام میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس موقع پر حیدرآباد میں مقیم ایرانی باشندوں نے بھی .... شرکت کی اور یہ یادگار محفل ۹ بجے شب اختتام کو پہنچی۔

۱۲ر فروری: — "ماہنامہ صبح اُمید" بمبئی بابتہ جنوری ۱۹۷۰ء میں ادارہ کے ترجمان "سب رس" کے غالب نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۲ر فروری: — ادارہ کی طرف سے "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی سہ روزہ تقاریب کی تفصیلات مقامی اخبارات میں شائع ہوئیں۔

۲۵ر فروری: — جناب حیدر صدیقی صاحب چیف آرکیٹک حکومت جموں و کشمیر نے ایوانِ اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور اُردو میوزیم کے تعلق سے چند اہم مشورے بھی دیئے۔ اس موقع پر جناب رضی الدین قادری (فرزند ڈاکٹر زورؔ) بھی ایوانِ اُردو میں تھے۔

۲۶ر فروری۔ جمعرات: — (۶ بجے شام) ایوانِ اُردو کے کمیٹی روم میں مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں ادارے کے مواز نے اور دیگر انتظامی و علمی اُمور زیر بحث رہے۔ جناب حامد علی عباسی، نواب عنایت جنگ، پروفیسر ہندراج سکسینہ، جناب عارف الدین حسن، جناب محمد اکبر الدین صدیقی۔ جناب رن راج سکسینہ اور جناب میر سراج الدین علی خاں نے شرکت کی۔

۲۸ر فروری: — (۱۱ بجے دن) جناب ایس اے رحمٰن صاحب اسسٹنٹ ٹیکنکل ایڈوائزر وزارتِ فینانس حکومت ہند دہلی اور شریمتی سرلا اور ڈرامہ سیکشن وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومت ہند دہلی نے محمد قلی قطب شاہ پر ایک ڈرامہ کی تیاری اور مواد کے سلسلے میں ایوانِ اُردو سے استفادہ کیا۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی معتمد کتب خانہ و رکن مجلس انتظامی ادارہ نے ہر دو حضرات کو متعلقہ مواد فراہم کیا۔ مہمانوں نے ایوانِ اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا اور ادارہ کے علمی، ادبی اور تہذیبی ذخیرہ کی ستائش کی۔

مارچ ۱۹۷۰ء

۲ر مارچ: — مجلس انتظامی ادارہ کے فیصلوں کی بموجب یوم محمد قلی قطب شاہ کی سہ روزہ تقاریب جو ۷ تا ۹ر مارچ کو منعقد ہونے والی تھیں، ملتوی کر دی گئیں۔

۴ر مارچ: — ممتاز طنز و مزاح نگار ادیب اور صحافی جناب مجتبیٰ حسین (مصنف تکلف برطرف) اور جناب عباس موسوی معتمد انیس اکیڈیمی نے ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔

۸ر مارچ: — نئی غزل کے ممتاز شاعر جناب خورشید احمد جامیؔ کی وفات پر صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر نے

تعزیتی بیان جاری کیا۔ ادارہ کی طرف سے جامیؔ مرحوم کی ایک کتاب "شگاف عطا" شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

۱۴ مارچ:۔ جناب مرزا حسین علی وارث معتمد اردو امتحانات مرکز بنگلور نے پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی کے ہمراہ ادارہ کے تمام شعبوں کی سیر کی۔ ادارہ کے امتحان اردو عالم بابتہ ڈسمبر ۱۹۶۹ء میں بنگلور سنٹر کے اول درجہ میں کامیاب ہونے والے اُمیدوار ثناء اللہ صاحب کا معلنہ انعام بھی اس موقع پر معتمد امتحانات ادارہ مولوی عارف الدین صاحب کے ہاتھوں موصوف کو دیا گیا۔

۱۵ مارچ:۔ بچوں کے مشہور شاعر اور مصنف پروفیسر شفیع الدین صاحب نیرؔ (جامعہ نگر نئی دہلی) نے ایوان اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا اور نظیر اکبرآبادی پر ریسرچ کے سلسلے میں کئی بار ادارہ کے کتب خانے سے استفادہ فرمایا حیدرآباد میں بچوں کے ادب کے موضوع پر آپ نے ایوان اُردو میں وقار خلیل، حمید اُر موری اور بشیر انور صاحبان سے تبادلۂ خیال کیا۔ ادارہ کی طرف سے بچوں کا سب رس شائع ہوا کرتا تھا۔ نیرؔ صاحب نے قدیم رسائل کو دلچسپی سے دیکھا اور ادب اطفال کے سلسلے میں ادارہ کی ستائش کی۔

۱۷ مارچ:۔ پندرہ روزہ "مصحف" حیدرآباد بابتہ ۱۵ مارچ میں سب رس کے غالب نمبر (حصہ اول اور دوم) پر تبصرہ شائع ہوا۔

اپریل ۱۹۷۰ء

۴ اپریل:۔ ادارہ کا ترجمان سب رس کے غالب نمبر پر ماہنامہ "تجلی" دیوبند میں جناب شکیل احمد عالم کا محررہ تبصرہ شائع ہوا۔

۹ اپریل:۔ ممتاز شاعر اور ادیب جناب علی جواد زیدی صاحب انفارمیشن آفیسر پریس انفارمیشن بیورو دہلی نے ایوان اُردو کا معائنہ کیا۔ جناب سریداس لاہوتی، وقار خلیل اور فرزندان ڈاکٹر زورؔ اس موقع پر ایوان اُردو میں موجود تھے۔

مئی ۱۹۷۰ء

اتوار ۲۴ مئی:۔ جناب محمود خاور ایڈیٹر ہفتہ وار "برگ آوارہ" نے اُردو کے ممتاز شاعر جناب خورشید احمد جامیؔ مرحوم کی عکسی تصویر فریم کروا کر ایوان اُردو کے آڈی ٹوریم کے لئے تحفتہً دی۔ جسے وقار خلیل صاحب نے علم دوستوں کی موجودگی میں "ایوان اُردو" میں آویزاں کیا۔

۲۷ مئی:۔ ماہنامہ "ہمایون" دہلی بابتہ مئی ۱۹۶۹ء میں سب رس میں مطبوعہ مضمون "اُردو زبان کی داستان" از مولوی غلام رسول بحوالہ "ڈائجسٹ" ہوا۔

۲۹ مئی:۔ ادارۂ کے اُردو امتحانات اردو عالم، اردو دانی اور اردو زباندانی شہر کے مرکزوں

انوار العلوم کالج، سنٹرل جیل کے علاوہ اضلاع تلنگانہ، مہاراشٹرا اور مدراس و میسور کے ۱۸ مقامات پر ۲۹ تا ۳۱ مئی کو .... منعقد ہوئے۔ ان مرکزوں پر ادارہ کی طرف سے صدر نگران کار صاحبان بھیجے گئے تھے

جون ۱۹۷۰ء

۹ر جون: — جناب بشیر احمد طاہر (آئی اے ایس) سابق معتمد رسد اور جناب مظہر حسین صاحب سابق ناظم بندوبست نے ایوان اُردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معاینہ کیا۔ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اور جناب عارف الدین حسن نے ان اصحاب کو ادارہ کی کارکردگی سے روشناس کرایا۔

۱۰ر جون: — پیرزادہ حکیم محمود بخاری صاحب (محل شریف چیتور) اور مولانا ابو العرفان سید خوندمیری معتمد جمعیۃ العلمائے مہدویہ (حیدرآباد) نے جناب محمد اکبر الدین صدیقی کے ہمراہ ادارہ کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا

۱۱ر جون: — محترمہ حمیدہ جلیلی ایم اے، ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ نے ایوان اُردو کے آڈی ٹوریم کیلئے اپنے دادا حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ مانکپوری کی تصویر عنایت کی، جسے میر سراج الدین علی خاں صاحب نے آڈی ٹوریم میں آویزاں کیا۔

۱۲ر جون: — (۶ بجے شام) کمیٹی روم ایوان اُردو میں مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس ہوا۔ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے صدارت کی۔ انتظامی اور دیگر علمی و اشاعتی اُمور پر فیصلے کئے گئے۔ مولوی حامد علی عباسی، جناب پی بی گپتا، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، جناب میر حسن، جناب عارف الدین حسن اور جناب میر سراج الدین علی خاں نے شرکت کی۔

۲۸ر جون: — (صبح ۱۰½ بجے) مجلس انتظامی ادارہ کی میٹنگ صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ادارہ کے بجٹ اور دیگر اُمور پر غور کیا گیا اور فیصلے کئے گئے۔ جناب حامد علی عباسی، جناب پی بی گپتا، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ، ڈاکٹر ہاشم امیر علی، جناب میر حسن، پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، جناب رمن راج سکسینہ، نواب میر لیئق علی خاں، جناب عارف الدین حسن اور جناب میر سراج الدین علی خاں نے شرکت کی۔

جولائی ۱۹۷۰ء

۵ر جولائی: — ادارہ کے اردو امتحانات منعقدہ مئی ۱۹۷۰ء کے نتائج مجلس امتحانات ادارہ کے اجلاس میں توثیق کے بعد برائے اشاعت جاری کئے گئے اور مرکزوں کو بھجوائے گئے۔

۸ر جولائی: — روزنامہ رہنمائے دکن اور روزنامہ ملاپ میں ادارہ کے امتحانات کے نتائج شائع ہوئے۔

اگست ۱۹۷۰ء

ہفتہ ۱۵ اگست :- معتمد دفتر جناب میر سراج الدین علی خاں نے یوم آزادی ہند کے موقع پر صبح ۸ بجے ایوانِ اردو پر قومی پرچم لہرایا۔

۱۶ اگست :- ہفتہ وار "سحر" جو ناندیڑ اور پربھنی (مہاراشٹرا) سے شائع ہوتا ہے مورخہ ۱۵ اگست کی خاص اشاعت میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع کیا۔

۲۲ اگست :- جناب عبدالقدوس حامد بخش قادری صاحب لکچرار شعبۂ اردو اسلامیہ کالج بدایوں نے ۱۱ بجے ایوانِ اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا اور پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی اور وقار خلیل صاحبان سے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا۔

۲۴ اگست :- ماہنامہ "مانیر" کریم نگر بابتہ ماہ اگست میں سب رس کے ادارہ نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

۲۷ اگست :- اترپردیش کے سرکاری اردو ماہنامے "نیا دور" اگست ۷۰ء میں ڈاکٹر زور پر جناب سید حرمت الاکرام کا مضمون شائع ہوا۔

۳۱ اگست :- ماہنامہ پیام تعلیم دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں ادارہ کی مطبوعہ سلسلۂ ادب اطفال کی دو کتابوں مولانا ابوالکلام آزاد (از وقار خلیل) اور مہینوں کی کہانیاں (از حبیب ابراہیم) پر جناب محمد حسین حسان ندوی کا آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر شدہ تبصرہ شائع ہوا۔

ستمبر ۱۹۷۰ء

۵ ستمبر :- ماہنامہ جمالستان دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں سب رس سے جناب حباب ہاشمی کی غزل کا ڈائجسٹ ہوئی۔

اتوار ۱۳ ستمبر :- اردو کے نامور شاعر سلیمان اریب (۵ اپریل ۱۹۲۲ء - ۷ ستمبر ۱۹۷۰ء) کی وفات پر اردو ہال میں ادارۂ ادبیات اردو انجمن ترقی اردو، اردو مجلس انجمن ترقی پسند مصنفین اور مخدوم سوسائٹی کی طرف سے رکن مجلس انتظامی ادارہ جناب ایل۔ این۔ گپتا کی صدارت میں جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔

اکتوبر ۱۹۷۰ء

یکم اکتوبر :- متحدہ عرب جمہوریہ کے صدر جمال عبدالناصر کی تدفین کے سبب ایوان اردو کے دفاتر بند رہے۔

۳ اکتوبر :- ماہنامہ "کتاب نما" دہلی بابتہ ستمبر ۱۹۷۰ء میں جناب جے کرشن چودھری کا سب رس پر

مطبوعہ مضمون "اردو شاعری میں جذبۂ قومیت" بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

۱۰ر اکتوبر: — ماہنامہ "جمالستان دہلی" بابتہ اکتوبر ۱۹۷۰ء میں سب رس سے جناب رحمٰن جامی کی نظم "شہر نگاراں" بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

۲۴ر اکتوبر: — پندرہ روزہ "نغمۂ حیات" حیدرآباد بابتہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر محمد عبدالمنان کا مضمون "بہمنی عہد کا فنِ تعمیر" بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

نومبر ۱۹۷۰ء

۱۸ر نومبر: — ماہنامہ "شاہجہاں دہلی" بابتہ دسمبر ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی کا مضمون "ادب اور مذہب" مطبوعہ سب رس بحوالہ ڈائجسٹ ہوا۔

۲۳ر نومبر: — روزنامہ "ملاپ" حیدرآباد میں ادارہ کی سالانہ رپورٹ مرتبہ وقار خلیل پر جناب شاہد عظیم کا تبصرہ شائع ہوا۔

دسمبر ۱۹۷۰ء

۲۵ر دسمبر: — ادارہ کے اردو امتحانات بابتہ دسمبر ۱۹۷۰ء حیدرآباد اور اضلاع کے مرکزوں پر ۲۵ر تا ۲۷ر دسمبر ایک ساتھ منعقد ہوئے۔

رپورٹ شعبہ امتحانات ادارہ ادبیات اردو

بابتہ مئی و ڈسمبر ۱۹۷۰ء

سب سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان امتحانات کا تعلق ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے موسس اول جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی لندن ہیں جنہوں نے اپنی تعلیم اعلیٰ (جامعہ عثمانیہ) کے بعد یورپ کی تعلیم حاصل کی۔ ڈاکٹر زورؔ اس مایہ ناز سپوت پر فخر ہے جس نے اپنی ساری زندگی اس ادارہ و زبان اردو کیلئے وقف کر دی۔ حتیٰ کہ زبان اردو کی خدمت کیلئے کشمیر جا کر وہیں پیوند خاک ہوئے۔ اللہ پاک ان کو جوار رحمت میں فردوس اعلیٰ نصیب کرے (آمین)۔

اس ادارہ کے سرپرست اعلیٰ و اولیٰ ہز ہائنس نواب میر حمایت علی خاں اعظم جاہ بہادر و سرپرست رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر صدر اعظم باب حکومت و عالیجناب نواب یوسف علی خاں بہادر سالار جنگ ثالث مدار المہام سلطنت آصفیہ عالیجناب نواب معین الدولہ بہادر امیر پائیگاہ عالیجناب راجہ شام راج راجونت بہادر سابق صدر المہام تعمیرات دولت آصفیہ رہے ہیں۔

اس ادارہ کے ۱۲ شعبہ جات قائم ہوئے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زبان ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب۔ ایم اے، پی ایچ ڈی معتمد

۲۔ تنقید پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری۔ ایم اے، ایل ایل بی۔

۳۔ تالیف و ترجمہ جناب ظہیر الدین احمد صاحب۔ ایم اے۔ ایچ سی ایس

۴۔ تاریخ دکن پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے، ال ال بی۔

۵۔ شعراء و مصنفین دکن پروفیسر سید محمد صاحب۔ ایم اے۔

۶۔ سائنس ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم ایس سی۔ پی ایچ ڈی۔

۷۔ نسواں محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ۔

۸۔ اطفال محترمہ معزز یار جنگ بہادر بی ایس سی (آنرز)

۹۔ طلباء معین الدین احمد انصاری

۱۰۔ امتحانات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ۔ ایل ایل بی ۔

۱۱۔ کتب خانہ نواب مرزا یوسف علی خاں صاحب ۔

۱۲۔ اُردو انسائیکلو پیڈیا ۔ مولوی فیض محمد صاحب بی اے، ڈیپ ایڈ ۔

اِس ادارہ کی تشکیل کا خیال سب سے پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کے دِل میں پیدا ہوا انھوں نے یورپ سے واپسی کے بعد محسوس کیا کہ حیدرآباد میں مصنفین و مولفین کیلئے ایک مرکز کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر عبدالمجید صدیقی صاحب پروفیسر عبدالقادر صاحب صدیقی اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی مدد سے ۱۹۳۱ء میں اس مفید خیال کو عملی صورت حاصل ہوئی ۔ ادارہ کا فنڈ بھی ان ہی اصحاب کے عطیوں سے شروع کیا گیا اور ابتدائی سات سالہ دور ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۸ء میں عمل کی ایک مستحکم اساس قائم کرلی چنانچہ ۱۹۳۸ء سے ایک ماہنامہ سب رس کے نام سے جاری کیا اور ۱۹۳۱ء سے اب تک خاموشی کے ساتھ یہ ادارۂ ادبیات اُردو سرگرم عمل ہے ۔

ابتدا ابتدا میں ماہنامہ بچوں کا سب رس بھی شائع ہوتا رہا ان ۱۲ شعبہ جات صدر کی تفصیل کے لیے سرگذشت ادارہ ادبیات اُردو مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد مدیر سب رس و مہتمم ادارہ ۱۹۶۰ء ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔

میں بھی اس ادارہ سے مانوس ہوتا رہا چنانچہ اگست ۱۹۴۰ء میں جبکہ ادارہ کے امتحانات کا آغاز ہوا تو میں نے بھی قیام شاخ پربھنی بہ سلسلہ ملازمت سرکار مہتم آبکاری پربھنی پر ایک مرکز امتحان قرار دلوایا جس کے نتیجہ امتحان میں ایک امیدوار اردو عالم پورے امتحان میں درجہ اول کامیاب ہوا نتیجہ ۹۳٪ رہا

شعبۂ امتحانات کے اولین صدر جناب سید علی اکبر صاحب ایم اے (کینٹب) ہیں جو ۱۹۴۰ء سے ہمارے صدر شعبۂ امتحانات ہیں ۔ ان کی بہترین رہنمائی میں یہ شعبہ کام کررہا ہے ۔ اس شعبہ کے ابتدا میں (۵) امتحانات (۱) اُردو دانی (۲) اردو پروفیشنسی یعنی اُردو عالم (۳) اعلیٰ پروفیشنسی یعنی اردو فاضل (۴) خوشنویسی (۵) خطاطی و کتابت قائم ہوئے خواجہ حمید الدین صاحب شاہد معتمد شعبۂ امتحانات عرصہ تک رہے جن کے ساتھ میں بحیثیت شریک معتمد کام کرتا رہا ان کے بیرون دکن جانے کے بعد یہ ذمہ داری جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور مرحوم نے میرے سپرد کی اور اس وقت سے یعنی تقریباً دس سال سے اس شعبہ کی خدمت انجام دے رہا ہوں ۔

.... ادارہ ادبیات اُردو اس وقت

(۴) اردو امتحانات سال میں دو مرتبہ جون، و ڈسمبر میں منعقد کرتا ہے ۔ اس کے مراکز نہ صرف آندھرا پردیش میں بلکہ آندھرا پردیش سے باہر شمالاً مدراس، میسور، بنگلور، اورنگ آباد رہے ہیں یہ امتحانات عموماً جون و ڈسمبر میں ہوتے ہیں

اور ان تمام مراکز پر ادارہ کی جانب سے صدر نگران کار صاحبان بھیجے جاتے ہیں جنہیں سفر خرچ کے علاوہ تبعتہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ادارہ ان تمام حضرات کا شکر گزار ہے جنھوں نے بحیثیت معتمد مراکز و بحیثیت صدر نگران کار ان امتحانات میں تعاون فرمایا۔

نتائج امتحانات بابتہ مئی ۱۹۷۰ء

نمبر شمار	نام مرکز	نام امتحان	تعداد			تعداد شرکائے امتحان			تعداد کامیاب			فیصد کامیابی	کیفیت
			طلباء	طالبات	میزان	طلباء	طالبات	میزان	طلباء	طالبات	میزان		
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱	مرکز بلدہ	اردو دانی	۱۳	۵	۱۸	۱۰	۴	۱۴	۱۰	۴	۱۴	۱۰۰ %	
	صدر نگران کار (ذکور): — محمد عبد الستار صاحب بی ایس سی	زباندانی	۲	-	۲	۲	-	۲	۲	-	۲	۱۰۰ %	
	صدر نگران کار (اناث): جنابہ سعیدہ جہاں صاحبہ ایم اے	عالم	۴۲	۲۳	۶۵	۳۲	۱۸	۵۰	۲۹	۱۲	۴۱	۸۲ %	
۲	جالنہ	اردو دانی	-	۲	۲	-	۱	۱	-	۱	۱	۱۰۰ %	
	معتمد: — بشیر احمد صاحب	زباندانی	۱	-	۱	۱	-	۱	۱	-	۱	۱۰۰ %	
	صدر نگران کار: شیخ چاند صاحب	عالم	۱۴	۳	۱۷	۷	۳	۱۰	۷	۳	۱۰	۱۰۰ %	
۳	جے سی اسکول چمپا پیٹ	اردو دانی	۲۱	-	۲۱	۲۱	-	۲۱	۱۴	-	۱۴	۱۰۰ %	
	معتمد: — فضل الرحمن صاحب	زباندانی	۶	-	۶	۶	-	۶	۲	-	۲	۱۰۰ %	
	صدر نگران کار: — سید محمد پاشاہ صاحب قادری ایم اے ایل	عالم	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	
۴	سنٹرل جیل	اردو دانی	۲۰	-	۲۰	۱۴	-	۱۴	۱۴	-	۱۴	۱۰۰ %	
	معتمد شری منیش پرشاد صاحب و صدر مدرس	زباندانی	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	
	صدر نگران کار: — عارف الدین قریشی صاحب	عالم	۱	-	۱	۱	-	۱	۱	-	۱	۱۰۰ %	
۵	چک بالاپور (بنگلور)	اردو دانی	۱	۱	۲	۱	۱	۲	۱	۱	۲	۱۰۰ %	
	معتمد: — مشتاق احمد خاں صاحب عادل	زباندانی	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-	
	صدر نگران کار: — حمید الدین صاحب	عالم فاضل	۱۱ / ۴	۱۴ / ۵	۲۵ / ۹	۱۱ / ۴	۱۴ / ۵	۲۸ / ۹	۹ / ۴	۹ / ۲	۱۸ / ۶	۶۴ % / ۶۶.۶۶ %	

۶	شمس آباد	اردودانی	۳	۰	۳	۱	۰	۱	۰	۰	۰	۰
	معتمد: — محمد حیدر علی خاں صاحب	زباندانی	۲	۴	۶	۱	۴	۵	۱	۴	۵	۱۰۰ %
	صدر نگرانکار: — محمد الیاس صاحب	عالم	۱۳	۵	۱۸	۱۱	۵	۱۶	۱۰	۳	۱۳	۷۲ %
۷	کاغذ نگر سرپور	اردودانی	۷	۲	۹	۵	۲	۷	۵	۲	۷	۱۰۰ %
	معتمد: محمد عبدالحی صاحب	زباندانی	۳	۰	۳	۳	۰	۳	۳	-	۳	۱۰۰ %
	صدر نگرانکار: — محمد تقی حسین صاحب	عالم	۱۳	۶	۱۹	۹	۵	۱۴	۸	۲	۱۰	۷۱٫۴ %
۸	کلدا کرتی	اردودانی	۱۱	۱	۱۲	۷	۱	۸	۷	۱	۸	۱۰۰ %
	معتمد: — سید قطب الدین صاحب سررشتہ دار	زباندانی	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
	صدر نگرانکار: — نصیر الدین صاحب ایم اے	عالم	۴	۷	۱۱	۳	۷	۱۰	۳	۶	۹	۹۰ %
۹	نارائن پیٹھ	اردودانی	۲	۳	۵	۲	۳	۵	۲	۳	۵	۱۰۰ %
	معتمد: — میر احمد علی صاحب بی او ایل	زباندانی	-	-	-	-	-	-	-	-	-	-
	صدر نگرانکار: — محمد عبدالقدوس صاحب	عالم	۱۳	۶	۱۹	۱۳	۶	۱۹	۱۰	۱	۱۱	۵۷ %
۱۰	[illegible] مال	اردودانی	۴	۳	۷	۴	۳	۷	۴	۳	۷	۱۰۰ %
	معتمد: — عبدالسلیم صاحب	زباندانی	۲	۳	۵	۱	۳	۴	۱	۳	۴	۱۰۰ %
	صدر نگرانکار: — عارف احمد صاحب	عالم	۷	۲	۹	۶	۱	۷	۵	۱	۶	۸۵٫۷ %
۱۱	رائچور	زباندانی	۴	۳	۷	۳	۲	۵	۳	۲	۵	۱۰۰ %
	معتمد: — سید امین الدین صاحب عالمی	عالم	۱۵	-	۱۵	۹	۰	۹	۹	۰	۹	۱۰۰ %
	صدر نگرانکار: — نثار احمد صاحب											
۱۲	کریم نگر	زباندانی	۱	۲	۳	۱	۲	۳	۱	۱	۲	۶۶٫۶ %
	معتمد: — ریاست علی صاحب تاج ایم اے	عالم	۹	۱۰	۱۹	۵	۷	۱۲	۵	۵	۱۰	۸۳٫۳ %
	صدر نگرانکار: — انور کمال خوندمیری صاحب											
۱۳	نظام آباد	زباندانی	۳	۲	۵	۰	۱	۱	-	۱	۱	۱۰۰ %
	معتمد: — حافظ سید معظم علی صاحب	عالم	۲۰	۱۷	۳۷	۱۹	۱۶	۳۵	۱۴	۱۳	۲۷	۸۴٫۳۸ %
	صدر نگرانکار: مرزا فرخند حسین صاحب											

۱۴	اورنگ آباد معتمد:۔ غلام جیلانی صاحب صدر نگرانکار:۔ سراج محمد صاحب	عالم	۱۸	۸	۲۶	۱۵	۸	۲۳	۱۲	۷	۱۹	%	۸۲٫۶
۱۵	بنگلور معتمد:۔ حسین علی مرزا صاحب صدر نگرانکار:۔ احسن علی خاں صاحب	عالم	۳	۷	۱۰	۱	۵	۶	۰	۳	۳	%	۵۰
۱۶	مدراس معتمد: ریاض نیلوری صاحب صدر نگرانکار:۔ محمد اکبرالدین صاحب صدیقی	عالم	۱۲	۶	۱۸	۹	۴	۱۳	۸	۳	۱۱	%	۸۴٫۳
۱۷	محبوب نگر	اردودانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
	معتمد:۔ غلام حیدر صاحب	زباندانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
	صدر نگرانکار:۔ محمد جہانگیر صاحب	عالم	۴۱	۱۶	۵۷	۳۶	۱۵	۵۱	۳۵	۱۲	۴۷	%	۹۲
۱۸	میسور	اردودانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
	معتمد: سلیم تمنائی صاحب	زباندانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
	صدر نگرانکار:۔ محمد افضل صاحب بی ایس سی' بی ایڈ	عالم	۱۸	۱۴	۳۲	۷	۷	۱۴	۷	۷	۱۴	%	۱۰۰
	جملہ میزان		۳۶۴	۱۸۰	۵۴۴	۲۸۱	۱۵۳	۳۴۴	۲۴۷	۱۱۸	۳۶۲	%	۸۳٫۴

نتائج امتحانات دسمبر ۱۹۷۰ء

۱	مرکز بلدہ	اردودانی	۱	۳	۴	۱	۳	۴	۱	۳	۴	%	۱۰۰
	صدر نگرانکار (ذکور):۔ عبدالستار صاحب	زباندانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
	صدر نگرانکار (اناث) جناب سعیدہ جہاں صاحبہ ایم اے	اردو عالم	۲۹	۲۵	۵۴	۲۴	۲۱	۴۵	۱۲	۱۰	۲۶	%	۶۰٫۴

۲	جے.سی. اسکول چمپاپیٹ	اُردودانی	۰	۱۹	۱۹	۰	۱۸	۱۸	-	۱۸	۱۸	۱۰۰ %
	معتمد: فضل الرحمٰن صاحب	زباندانی	۲	-	۴	۵	-	۵	۴	۰	۴	۸۰ %
	صدر نگرانکار: عارف احمد صاحب	عالم	۰	۰	۰	-	-	۰	۰	۰	۰	۰ ۰
۳	جنیسہ	اُردودانی	-	۱۹	۱۹	۰	۱۸	۱۸	-	۱۸	۱۸	۱۰۰ %
	معتمد: احمد علی خاں صاحب	زباندانی	۳	۹	۱۲	۳	۹	۱۲	۰	۴	۴	۳۳٫۳ %
	صدر نگرانکار: سید رزاق علی صاحب	اردو عالم	۳	۱۳	۱۶	۳	۱۱	۱۴	۳	۳	۶	۴۲٫۸ %
۴	اورنگ آباد	اردودانی	۲	۰	۲	۲	-	۲	۲	-	۲	۱۰۰ %
	معتمد: غلام جیلانی صاحب	زباندانی	۳	۲	۵	۳	۲	۵	۳	۲	۵	۱۰۰ %
	صدر نگرانکار: محمد فضل صاحب	عالم	۱۳	۵	۱۸	۱۳	۵	۱۸	۱۱	۵	۱۶	۸۸٫۸ %
۵	شکر نگر (ضلع میدک - اے پی)	اردودانی	۲۷	۲۰	۴۷	۲۷	۲۰	۴۷	۲۶	۱۵	۴۱	۸۷ %
	معتمد: خواجہ حمید الدین صاحب	زباندانی	-	۰	۰	-	۰	۰	-	-	۰	۰ ۰
	صدر نگرانکار: انور کمال خوندمیری صاحب	عالم	۲۶	۱۶	۴۲	۲۴	۱۶	۴۰	۱۸	۳	۲۱	۵۲٫۵ %
۶	بودھن	اردودانی	۳۳	۴۴	۷۷	۳۰	۴۴	۷۴	۳۰	۱۳	۴۳	۹۸ %
	معتمد: محمود عالم صاحب	زباندانی	۲۵	-	۲۵	۲۵	۰	۲۵	۲۲	-	۲۲	۸۸ %
	صدر نگرانکار: منہاج الدین صاحب	عالم	۳	۱	۴	۳	۱	۴	۳	۱	۴	۱۰۰ %
۷	محبوب نگر	اردودانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰ ۰
	معتمد: غلام حیدر صاحب	زباندانی	۰	-	-	-	۰	۰	۰	۰	۰	- ۰
	صدر نگرانکار: نظیر الدین احمد صاحب	اُردو عالم	۴۰	۱۴	۵۴	۳۵	۱۴	۴۹	۳۵	۱۳	۴۸	۹۷٫۷ %
۸	نرمل	اردودانی	۰	۰	۰	-	۰	۰	۰	۰	۰	- ۰
		زباندانی	۰	۰	-	-	۰	۰	۰	۰	۰	۰ ۰
	صدر نگرانکار: سید جمیل احمد صاحب	اردو عالم	۲۳	۲۱	۴۴	۲۲	۲۰	۴۲	۲۰	۷	۲۷	۶۳٫۸ %
۹	چک بالاپور (بنگلور)	اردودانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰ ۰
	معتمد: مشتاق احمد خاں صاحب عادل	زباندانی	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰ ۰
	صدر نگرانکار: سید احمد پاشا قادری ایم اے	اُردو عالم	۷	۹	۱۶	۷	۹	۱۶	۵	۳	۸	۵۰ %
		جملہ میزان	۲۶۶	۱۹۸	۴۶۴	۲۴۹	۱۹۱	۴۴۰	۲۱۵	۱۳۰	۳۴۵	۸۳ %

استفادۂ کتب خانہ

۱۹۷۰ء

ادارۂ ادبیات اردو کے گرانقدر اور وسیع کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات، مخطوطات اور دارالمطالعہ عام) ایوانِ اردو سے اردو زبان و ادب کے شیدائی، دیگر زبانوں کے محققین، طلبار و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور مطالعہ کی غرض سے دور نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں، جنھوں نے مختلف اوقات میں یا متواتر کئی روز ادارہ کے کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور دواوین کے سلسلے میں اُن کی نقلیں لیں یا ایم اے کے نصاب سے متعلقہ یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے ضمن میں یا پھر اخبارات و رسائل کے فیچروں کی تیاری کے سلسلے میں اردو کی علمی، ادبی اور تاریخی مطبوعات کے ذخیرۂ کتب خانہ سے مواد حاصل کیا (ادارہ)

(۱) محترمہ حمیرہ جلیلی ایم اے، ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
(۲) ڈاکٹر رشید موسوی لکچرار ویمنٹ لالا لینڈی ریمنس کالج حیدرآباد۔
(۳) جناب رفیع الدین صاحب حیدرآباد۔
(۴) جناب عبدالوہاب تسنیم ایم اے، ریسرچ اسکالر۔
(۵) پروفیسر آر ایم، اینس، وسکانسن یونیورسٹی امریکہ
(۶) جناب احمد عبدالقادر ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
(۷) محترمہ رضیہ صدیقی ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
(۸) جناب جگن لال گوڑ ریسرچ اسکالر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد
(۹) محترمہ نجمہ صدیقیہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
(۱۰) مولوی شفیع الدین نیر دہلی۔
(۱۱) ڈاکٹر محمد جمال شریف مددگار اے جی آفس حیدرآباد
(۱۲) ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
(۱۳) جناب افضال احمد صاحب حیدرآباد
(۱۴) جناب محمد یسین قدوسی ریسرچ اسکالر جامعہ ناگپور
(۱۵) جناب سید محی الدین صاحب سابق مددگار اسٹیٹ آرکیوز حیدرآباد
(۱۶) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید شعبۂ اردو وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی
(۱۷) جناب نذیر احمد صاحب ریسرچ اسکالر جبل پور
(۱۸) محترمہ زبیدہ یسین علی خاں صاحبہ ریڈر شعبۂ تاریخ جامعہ عثمانیہ

(۱۹) محترمہ رفیق فاطمہ صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ

(۲۰) جناب انجم عرفانی صاحب ریسرچ اسکالر گورکھپور یونیورسٹی

(۲۱) جناب داؤد عادی صاحب حیدر آباد

(۲۲) جناب اسلم عمادی صاحب عمادی منزل ہمایوں نگر حیدرآباد

(۲۳) جناب ریاست علی تاج کریمنگری۔ یم اے ایل حیدرآباد

(۲۴) محترمہ رخسانہ سمیع اللہ بیگ یم اے حیدرآباد

(۲۵) جناب محمد منظور احمد صاحب لکچرار آرٹس کالج کریمنگر

(۲۶) محترمہ نسیم اقبال صاحبہ یم اے، جامعہ عثمانیہ

(۲۷) جناب غیاث متین صاحب یم اے، جامعہ عثمانیہ

(۲۸) صفدر شفیق صاحب معتمد بزم سعدی حیدرآباد

(۲۹) جناب محمد لیسین صاحب ریسرچ اسکالر کاشی (یو پی)

(۳۰) محترمہ اختر محبوب صاحبہ متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

(۳۱) محترمہ بانو طاہرہ سعید گرین ویو سیف آباد۔ حیدرآباد

(۳۲) محترمہ بلقیس علاء الدین "علاء الدین بلڈنگ" سکندرآباد

(۳۳) جناب احمد علی ادیب۔ اُستاد اُردو فوقانیہ اُردو شریف حیدرآباد

(۳۴) جناب فرحت وہاب صاحب متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

(۳۵) جناب مخدوم علی صابر متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

(۳۶) جناب سید عبدالحفیظ متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

(۳۷) جناب خواجہ عظیم سب ایڈیٹر روزنامہ ملاپ حیدرآباد

(۳۸) جناب جعفر حسین جعفری ایڈیٹر پندرہ روزہ مصنف حیدرآباد

(۳۹) جناب صلاح الدین نیر۔ حیدرآباد

(۴۰) جناب نظام الدین مغربی لکچرار اُردو کالج حیدرآباد

(۴۱) ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اُردو کالج حیدرآباد ۲۹

(۴۲) جناب سید محمد خاں ایڈوکیٹ و ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ

(۴۳) جناب افتخار علی عباسی۔ تارا پور رین سرائی گرہ حیدرآباد

(۴۴) جناب خلیق الزماں فاروقی لکچرار

(۴۵) پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی ریڈر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

(۴۶) محترمہ قدر بانو صاحبہ متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

(۴۷) جناب قطب سرشار (اُردو پنڈت) ناگر کرنول (محبوب نگر)

اِدارہ کا اِشاعتی پروگرام

(۱) ادارہ سنہ ۱۹۶۸ء تا سنہ ۱۹۶۹ء میں مرتبہ وقار خلیل ۷۶ صفحات
(۲) اِدارہ سنہ ۱۹۷۰ء میں " " " زیر طبع
(۳) برق و آشیاں (مجموعہ کلام) سعید شہیدی زیر طبع
(۴) تذکرہ نوادر ایوانِ اُردو (جلد دوم) مرتبہ میر سراج الدین علی خاں (زیر ترتیب)
(۵) فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ (جلد چہارم) مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی (" ")

اعداد و شمار

استفادہ دارالمطالعہ عام و کتب خانہ "ایوانِ اُردو"

جنوری تا ڈسمبر سنہ ۱۹۷۰ء

جنوری	(۳۳۵)	افراد	جولائی	(۳۳۰)	افراد
فروری	(۳۷۷)	"	اگست	(۲۶۴)	"
مارچ	(۳۷۵)	"	ستمبر	(۲۶۵)	"
اپریل	(۳۷۸)	"	اکتوبر	(۳۶۶)	"
مئی	(۳۴۰)	"	نومبر	(۳۷۸)	"
جون	(۳۶۱)	"	ڈسمبر	(۳۴۹)	"

امداد و اعانت

سنہ ۱۹۷۱ء میں حسب ذیل اصحاب اور اداروں نے کتب خانہ اور دارالمطالعہ کو اپنے گرانقدر عطایا سے نوازا جس کے لئے ادارہ اِن اصحاب اور اداروں کا دلی شکر گذار ہے خصوصًا ادارہ کی لائبریری کے شعبۂ مخطوطات اور مطبوعات کو اقطاع ہند کے قدیم و جدید مختلف فنون کی کتابیں، رسالوں کی فائلیں کتب خانے کے لئے اور سب رس میں تبصرہ کی غرض سے وصول ہوتی رہی ہیں۔ ہم اپنے علم دوست قارئین سے خواہش کریں گے کہ وہ اپنے علمی و ادبی ذخیرے کو تلف ہونے سے بچائیں اور ایسی کتابیں، علمی و ادبی اور تہذیبی نادر اشیاء "ادارۂ ادبیات اردو" کو تحفۃً مرحمت فرما کر محفوظ فرمائیں ادارے کو ملنے والے ایسے ذخیرہ کی سالانہ فہرست، معطی کے نام کی صراحت اور شکریہ کے ساتھ ادارے کے ترجمان ماہنامہ سب رس کی خاص اشاعت "ادارہ نمبر" میں شائع کی جاتی ہیں تاکہ ان عطایا سے دیگر ارباب نظر، ریسرچ اسکالر اور اردو دوست حضرات واقف ہو سکیں (ادارہ)

(۱) بشیر انور صاحب نے ۵۰ عدد رسالہ جات بطور عطیہ عنایت فرمائے (۲) جناب شفیع الدین صاحب نیر نے اپنی مطبوعہ کتابیں ادارہ کو عنایت فرمائی ہیں (۳) ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ نے اپنی مطبوعہ کتب کا سٹ عنایت فرمایا ہے۔ (۴) جناب بشیر احمد صاحب طاہر نے اپنی تصانیف ادارہ کو عنایت فرمائیں (۵) جناب اقبال کرشن صاحب نے تقریبًا دو سو اردو فارسی اور انگریزی کتب وغیرہ کا پارسل کلکتہ سے روانہ فرمایا (۶) جناب سید خورشید احمد صاحب کلکتہ سے ذریعہ اقبال کرشن صاحب ۲ کتابیں روانہ فرمائی ہیں (۷) جناب سید محمد یونس صاحب چیف انجینیر نے دیوان باقر کا نایاب نسخہ عنایت فرمایا (۸) جناب عبداللہ شریف نے ہماری زبان کے فائل عنایت فرمائے (۹) محترمہ بیگم حبیب احمد خاں صاحب گتہ دار مرحوم نے اپنا کتب خانہ جس میں اردو، فارسی، انگریزی کی تقریبًا ۳۰۰ کتابیں ذریعہ مولوی اسمٰعیل خاں صاحب کتب خانہ ادارہ کو عنایت فرمائی ہیں (۱۰) جناب ریاست علی صاحب تاج نے صدق جدید کے قدیم فائل عنایت فرمائے (۱۱) روشن عبدالاحد صاحب نے ۱۵ کتب ارسال فرمائے (۱۲) جناب پروفیسر محمد اکبر الدین صاحب صدیقی نے اخبار سیاست کے فائل [illegible] تا [illegible] عنایت فرمائے (۱۳) ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں صاحب نے تین کتب کتب خانہ کو عنایت فرمائیں (۱۴) جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب نے قدیم رسالہ جات از قبیل ادیب، تاج وغیرہ عطا فرمائے (۱۵) جناب منظور احمد صاحب جرنیر الکٹرک کریم نگر نے قومی زبان اور اخبار سیاست وغیرہ کے قدیم فائل عنایت فرمائے (۱۶) ساہتیہ اکیڈیمی نے اپنی مطبوعات کا سٹ (۱۱ کتب) ارسال فرمایا (۱۷) جناب عارف الدین حسن صاحب نے دو نایاب کتابیں عنایت فرمائیں (۱۸) جناب وقار خلیل صاحب نے پیکرِ خیال کے چند نسخے عنایت فرمائے (۱۹) نوکل اتھارٹی کی رقمی امداد سے (۵۰) کتابیں خریدی گئیں۔ (۲۰) جناب مبارز الدین صاحب رفعت، ڈاکٹر میر محمد ملی الدین صاحب، مولوی سید محمد صاحب، بیگم حبیب احمد خاں صاحب اور نواب عنایت جنگ مرحوم نے چند قلمی کتابیں عنایت فرمائیں۔

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس"

ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، جنوری ۱۹۷۱ء سے یہ اپنی عمر کے ۳۴ سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح "سب رس" نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر زبان کی تین دہائیوں کی سرحد عبور کرکے اپنی چوتھی دہائی میں رواں دواں ہے۔ ادارہ کے بانی اور معتمد اول "سب رس" کے مؤسس اور نگران ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی ادبی یادگار ہونے کا اعزاز بھی "سب رس" کو حاصل ہے، ڈاکٹر زورؔ کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ جناب پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مشاورتی کمیٹی کے اراکین میں جناب میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب رن راج سکسینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب محمد منظور احمد صاحب شامل ہیں، وقار خلیل سب رس کے تنظیمی امور کے انچارج ہیں۔ مجلس مشاورت کے معتمد جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ہیں جو ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں اور کتب خانہ اور دار المطالعہ کے معتمد بھی۔ ترتیب و کتابت و طباعت کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں مراسلت کے فرائض کی انجام دہی بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۷۰ء میں سب رس نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ شمارے دیئے جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۶۱۶) ہوتی ہے۔ سب رس کو دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جہاں جہاں دکنیات پڑھائی جاتی ہے وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ادارہ نمبر کے علاوہ دیگر پابندی سے شائع ہونے والے گیارہ شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں، جنھیں دیگر معاصرین نے افادیت کے پیش نظر اپنے اخبارات و رسائل میں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ کیا ہے۔

ایک سال میں "سب رس" نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں، جن میں (۶۲) مضامین (۲۰) نظمیں (۶۷) غزلیں اور طرحی مشاعرہ یوم زور کا انتخاب کے علاوہ (۴۸) نئی کتابوں اور (۱۰) رسالوں یا ان کے خاص نمبروں پر تبصرے وغیرہ شائع کئے۔

مضامین کی ایک جامع فہرست اور دیگر تفصیلات اگلے صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کی غرض سے اطلاعاً پیش کی جا رہی ہیں۔

(وقار خلیل)

فہرست مضامین مطبوعہ سب رس حیدرآباد دکن

جلد (۳۳) شمارہ (۱ تا ۱۲) جنوری تا دسمبر ۱۹۷۰ء

نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ	نمبر	عنوان	مضمون نگار	ماہ
۳۹	جاورہ میں غالب کی تین تحریریں	ڈاکٹر خلیل احمد مشیر	اگست	۴۰	گرو گرنتھ صاحب اور عقیدۂ وحدت	محمد ایوب واقف	اگست
۴۱	اقبال اور تصوف	محمد بدیع الزماں	″	۴۲	سرغلام بھیک اور قومی ملکیت	سلطان احمد صدیقی جیتا	″
۴۳	اردو شعراء کی تعلّی کا ایک مطالعہ	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	″	۴۴	ڈاکٹر زور — ایک تاثر	ساحل مانکپوری	ستمبر
۴۵	ڈاکٹر زور کی ادبی شخصیت	میر یٰسین علی خاں	ستمبر	۴۶	ڈاکٹر زور اور تاریخ گولکنڈہ	نجمہ صدیقہ	″
۴۷	عہد بہمنیہ کا فن تعمیر (سلسلہ)	ڈاکٹر محمد عبدالمنان	″	۴۸	قطب شاہی دور میں دکن کا نظام تعلیم	میر نجم الدین علی خاں	″
۴۹	ندوی صاحب ایک عکس جمیل	حامد اللہ ندوی	″	۵۰	مقالات نجیب اشرف ندوی	محمد ایوب واقف	″
۵۱	مرزا عظیم بیگ عظیم سودا کا شاگرد	ڈاکٹر خلیل احمد مشیر	اکتوبر	۵۲	بہمنی عہد کا فن تعمیر	ڈاکٹر محمد عبدالمنان	″
۵۳	ضیاء الدین عبرت اور مثنوی شمع و پروانہ	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب	″	۵۴	ہندوستان میں بے روزگاری کا مسئلہ	محمد عبداللہ خاں	″
۵۵	جمالیات ایک فلسفہ ایک تحریک	ظہور الدین	″	۵۶	قادر باری اور اس کا مصنف	میر محمود حسین	نومبر
۵۷	فرانس میں اشاریت پسند شعراء	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	″	۵۸	جمالیات ایک فلسفہ ایک تحریک (سلسلہ)	ظہور الدین	″
۵۹	مقالات نجیب اشرف ندوی (سلسلہ)	محمد ایوب واقف	″	۶۰	آل احمد سرور کا انداز بیان	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	″
۶۱	علامہ قوس حمزہ پوری	ناوک حمزہ پوری	″	۶۲	میر حیات میسوری	میر محمود حسین	ڈسمبر
۶۳	شیخ نور محمد عاصی	پروفیسر شیخ فرید	ڈسمبر	۶۴	علامہ قوس حمزہ پوری (سلسلہ)	ناوک حمزہ پوری	″
۶۵	کلکتہ ۔ اردو نثر کا پہلا اہم مرکز	ایم اے نصر	″	۶۶	٭	٭ ٭	٭

نظمیں: — سب رس جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۰ء میں جملہ (۲۷) نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں ان کے عنوانات اور شعراء صاحبان کے نام بلحاظ ترتیب اشاعت درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) تیرے بعد (مخدوم کی جدائی پر) وقار خلیل — (۲) المیہ از علی عباس اُمید۔

(۳) دو ماں از علی عباس اُمید۔ — (۴) گیتوں کی فتح اختر بستوی

(۵) ایک سوال از اختر بستوی — (۶) پرنم از ادمان شیام نگری

(۷) کشمیر۔ از جگن ناتھ آزاد — (۸) اندھیرے اُجالے از اختر بستوی

(۹) خراج تحسین (گاندھی جی، پنڈت نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، زبانِ اردو، اہل حیدرآباد) از شفیع الدین نیّر

(۱۰) خورشید آرزو ہے کہاں (یاد جامی) از وقار خلیل — (۱۱) سانپ از عنوان چشتی

(۱۲) سمتہ از عنوان چشتی — (۱۳) احساس تنہائی از اختر بستوی

(۱۴) شکوہ خاتون ہند از اختر بستوی — (۱۵) سرزمین حیدرآباد از عظمت عبدالقیوم

(۱۶) شہرِ نگاراں از رحمان جامی
(۱۷) حیدرآباد (سائنٹفک) از برق یوسفی
(۱۸) حیدرآباد از قطب سرشار
(۱۹) حیدرآباد اور نذرِ کہ از قدر عریضی
(۲۰) ڈاکٹر زور از مرزا سرفراز علی
(۲۱) ایک آواز (زور اور محبوب کے نام) از وقار خلیل۔
(۲۲) محسنِ اردو از علی سرور
(۲۳) تلک از رونق دکنی سیمابی
(۲۴) رنگِ زرد - از اختر بستوی
(۲۵) کرنوں کا سفر از اختر بستوی
(۲۶) یاس از عابد عالی
(۲۷) رباعیات از انیس امام

غزلیں:۔ سب رس سنہ ۱۹۸۱ء کے شماروں میں (۶۷) شعراء صاحبان کی غزلیں شائع ہوئیں اور بعض شعراء کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی چھپیں۔ ان کے علاوہ طرحی مشاعرۂ یومِ زورؔ کے اقتباسات بھی سب رس کے ادارہ نمبر میں شائع ہوئے۔ ذیل میں شعراء کے نام نامی ترتیب اشاعت کے لحاظ سے درج کیے جاتے ہیں:۔

یاقر منظور، علی عباس امید، انیس امام، تاج پیامی، اختر بستوی، کیف احمد صدیقی، یوسف جمال، محمد منظور احمد منظور، ساحل امکپوری، نازش پرتاب گڈھی، مہدی پرتاب گڈھی، مظفر حنفی، واحد پریمی، غلام مرتضیٰ راہی، عادل جعفری، حباب ہاشمی، طرب میرٹھی، نثار عباسی، شکیل دسنوی، حنیف کیف بریلوی، طالب قریشی، افتخار احمد فخر، حفیظ صدیقی، یعقوب راہی، قمر صدیقی، قمر بسوانی، بیتاب سوملی بھیتی، معصوم شرقی، گووند در رشک، میر تقی علی خاں ثاقب، رونق دکنی سیمابی، مرزا خلیل، ڈاکٹر زور، میر یٰسین علی خاں، ریورنڈ ربانی، حسن فرخ، رؤف خلش، غیاث متین، ناز حیدر، ثریا، رؤف خیر، جلیل مینا بادی، فراست حسین فراست، یوسف قادری، احمد اللہ حسینی احمد، حیرت بدایونی، مسعود عابد، ڈاکٹر اشرف رفیع، اسحٰق ملک، سعادت جاہ سعادت، لیے کرشن چودھری حبیب، شکیل مظہری، صلاح الدین نیر، نظیر علی عدیل، کریم سعدی، کلونت سنگھ جانی، عبدالمتین نیاز اور شمس فریدی۔

تبصرے:۔ سب رس نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو شائع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ سنہ ۱۹۸۱ء میں جملہ (۲۸) نئی کتابوں اور (۱۰) رسائل وجرائد یا اُن کے خاص نمبروں پر تبصرے شائع ہوئے۔ تبصرہ کرنے والوں میں ادارہ کے خصوصی مبصر پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ ڈاکٹر سلام سندیلوی، مولوی غلام رسول، جناب افتخار علی عباسی، وقار خلیل، طیب انصاری، احمد جلیس، قدیر امتیاز اور احتشام اختر شامل ہیں۔

ذیل میں تبصرہ شدہ مطبوعات کی تفصیلات بلحاظِ اشاعت درج کی جاتی ہیں:۔

کتب:۔ (۱) کلیاتِ احسان مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ۔
(۲) انتخابِ نثرِ اردو (یونیورسٹی امریکہ) مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔

(۳) انتخاب قصائد اردو (معہ مقدمہ و حواشی) ڈاکٹر ابو محمد سحر۔
(۴) جدید اردو نظم اور یوروپی اثرات از ڈاکٹر حامدی کاشمیری۔
(۵) بہادر یار جنگ کا سفرنامہ بلادِ اسلامیہ مرتبہ نذیرالدین احمد۔
(۶) نیم باز (مجموعۂ کلام) عنوان چشتی۔
(۷) صبوحی (") مہر چند کوثر۔
(۸) بوئے گل (") نظر برنی۔
(۹) تذکرۂ اولیائے حیدر آباد (حصّہ اول) سید شاہ مراد علی طالع۔
(۱۰) سازینہ (مجموعہ کلام) مرتبہ ساحل مانکپوری۔
(۱۱) جوئے کہکشاں (مجموعہ کلام) امجد نقوی۔
(۱۲) ابتدائی اردو (تین جلدیں) ڈاکٹر عبدالرحمان بارکر۔
(۱۳) اردو اخباری زبان مرتبہ " " " "
(۱۴) اردو اخباری زبان کی الفاظ شماری مرتبہ ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر۔
(۱۵) بزمِ نو (انتخاب کلام) مرتبہ ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر۔
(۱۶) قیمتِ عرضِ ہنر مرتبہ محمود خاور، حسن فرخ۔
(۱۷) نغمۂ شب (شاعری) اختر بستوی۔
(۱۸) دنیا کہیں جسے (شاعری) ڈاکٹر عشرت انور۔
(۱۹) حسنِ ادب (") چراغ چینوٹی۔
(۲۰) تحریر و تنقید (مضامین) ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔
(۲۱) صحرا میں اذاں (شاعری) گوپال متل۔
(۲۲) یاد برگِ گل (تذکرہ) مخدوم علی تائب گلبرگوی
(۲۳) خطابِ تائب (شاعری) " " " " "
(۲۴) طابِ تائب (") " " " " "
(۲۵) تحفۂ جذب (رباعیات) راگھویندر راؤ جذب۔
(۲۶) مکتوبات بہادر یار جنگ مرتبہ نذیرالدین احمد۔
(۲۷) شہیدِ اکبر (سلام کا مجموعہ) گھائل فریدی۔

(۲۸) رسالہ محمود خوش دہاں بیجاپوری مرتبہ خواجہ حمیدالدین شاہد۔

(۲۹) آریہ ابھ وِنے۔ از بشیشور پرشاد منور لکھنوی

(۳۰) جلیان والا باغ ۔ مرتبہ مرکزی محکمۂ اطلاعات دِتی۔

(۳۱) کاروان خیالوں کے (شاعری) نوبہار صابر۔

(۳۲) لکیریں (شاعری) نازش پرتاب گڈھی۔

(۳۳) بھول ہی بھول (ڈرامے) مرزا اظہرانسر

(۳۴) اسلام اور امن کا آئین جنگ از غلام محمد۔

(۳۵) مزاج آب و گل (شاعری) حسن شبیر۔

(۳۶) دکنی لغات مرتبہ ابو تراب خطائی ضامن

(۳۷) تاثرات سفر ایران از ڈاکٹر رضیہ اکبر

(۳۸) اُلجھی لڑکی کالے بال (افسانے) کرشن چندر

(۴۰، تما[illegible] کی [illegible] شفیع الدین نیر

(۴۰) سہاگ ملی ہے دیس میں (ناول) فاطمہ یزدانی ۔

(۴۱) اکائی (شاعری) بشیر بدر۔

(۴۲) غالب نکہ دن ۔ مرتبہ : شعبۂ اُردو گورکھپور یونیورسٹی۔

(۴۳) سرور سرمدی (شاعری) ناشاد کانپوری۔

(۴۴) اُردو کا محضرنامہ مرتبہ ، مرزا جمیل احمد بیگ ۔

(۴۵) شورشِ پنہاں (شاعری) کالی داس گپتا رضا۔

(۴۶) چراغ کا اندھیرا (ناولٹ) شبنم قیوم۔

(۴۷) دکنی کی ابتدا تحقیق کی نظر میں از ڈاکٹر آمنہ خاتون۔

(۴۸) غزل انسائی کلو پیڈیا مرتبہ ذکی کاکوروی

رسائل:- (۱) ماہنامہ تجلی رام پور کا خاص نمبر ۱۹۶۹ء مدیر: عامر عثمانی (۲) پندرہ روزہ مصنف حیدرآباد ۲ مدیر: جعفر حسین جعفری۔ (۳) ہفتہ وار سحر ناندیڑ (۴) ماہنامہ نیا دور لکھنؤ گاندھی جنم صدی نمبر، مدیر: خورشید احمد (۵) فضل الرحمن اسلامیہ کالج میگزین بریلی (غالب نمبر) (۶) ہفتہ وار نیا آدم حیدرآباد (مخدوم نمبر حصہ دوم) مدیر امجد باقی (۷) انسکار نو، گورکھپور یونیورسٹی کا مجلہ ، مرتبہ ، افغان اللہ خاں (۸) سفینہ (مجلہ سیفیہ کالج بھوپال ، غالب نمبر) (۹) پگڈنڈی امرتسر کا تلوک چند محروم نمبر مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (۱۰) پندرہ روزہ برگِ آوارہ ، حیدرآباد ۲ مدیر محمود خاور۔

"سب رس" کے تبادلے میں آنیوالے رسائل و جرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل و جرائد ایوان اردو کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل و جرائد کو چھوڑکر "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جنکی مجموعی تعداد (۱۲۰) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علیگڈھ) ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں میں نے اس قدر تعداد میں معیاری رسائل و جرائد یکجا نہیں دیکھے۔ اس طرح "ایوان اردو" کا دارالمطالعہ اردو دنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے۔

ہم تمام ہند و پاک اور بیرون ہند کے مدیران جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے رسائل و جرائد ارسال فرماتے ہیں امید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہیگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل و جرائد کی اچھی اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کرکے استفادہ کیلئے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم عنواری فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اب تک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد زیر ترتیب ہے۔ ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل و جرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں۔

۱۹۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر اور علمی ادبی وغیرہ کے حامل اس کتب خانے سے آئے دن ادب دوست اصحاب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱۰ تا ۷ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں جمعہ کو ایوان اردو بند رہتا ہے۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیران رسائل و جرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا ایسا ادبی ذخیرہ قدیم و جدید کتب و رسائل چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفتہً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریہ کے ساتھ کتب خانے میں داخل کرلئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسم گرامی کے ساتھ درج بھی ہوگا۔

امید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست اصحاب اور مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاون عمل فرماکر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے (ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرِ سالانہ
		(سالانہ)			
۱	انوار	شعبۂ اردو انوار العلوم کالج ملے پلی - حیدر آباد ۱	ڈاکٹر خالدہ بیگم	۶۴	۰ ۰
۲	جرنل آف ریسرچ (انگریزی)	پنجاب اگریکلچرل یونیورسٹی - لدھیانہ (پنجاب)	ہرکرت سنگھ	۱۰۰	۸=۰۰
		(سہ ماہی)			
۳	اردو ادب	انجمن ترقی اردو ہند - علی گڑھ	پروفیسر آل احمد سرور	۱۴۴	۱۲=۰۰
۴	امریکن ریویو (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس - سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	آر آر برکس	۱۱۶	۶=۰۰
۵	امریکن پیپر ریویو (انگریزی)	〃 〃 〃 〃 〃	〃	۹۸	۴=۰۰
۶	پرابلم آف کمیونزم (انگریزی)	یو ایس انفارمیشن ایجنسی - واشنگٹن (ڈی سی)	ایرام برگ	۸۰	۰ ۰
۷	سنگیت ناٹک (انگریزی)	رابندرا بھون - دہلی	〃	۸۰	۰ ۰
۸	شاخسار	بخشی بازار - کٹک (اڑیسہ)	امجد نجمی	۱۰۰	۶=۰۰
۹	شعر و حکمت	۴۶۷-۲-۲۲ بازار نور الامراء - حیدر آباد ۲	ڈاکٹر مغنی تبسم شہریار	۳۰۰	۱۶=۰۰
۱۰	صبح	انجمن ترقی اردو - علی منزل - کوچہ پنڈت دہلی	عبد اللطیف اعظمی	۲۰۰	۱۰=۰۰
۱۱	نوائے ادب	انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ - ۸ شیفرڈ روڈ - بمبئی	ڈاکٹر عبد الرزاق قریشی	۷۴	۶=۰۰
۱۲	ورتا وہار (انگریزی)	سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز - ماناسا گنگوتری - میسور ۶	ڈی پی پٹنایک	۳۰	- !
۱۳	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاؤس - پیرس	ناظم یونسکو	۳۲	۰ ۰
		(دو ماہی)			
۱۴	تحریر	علمی مجلس ۲۹۱۴، چھتہ نواب صاحب - فراش خانہ - دہلی	مالک رام	۲۵۰	۱۲=۰۰
۱۵	شیرازہ	جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر (کشمیر)	محمد یوسف ٹینگ	۱۰۰	۱۰=۰۰
		(دو ماہی)			
۱۶	شگوفہ	۲۷، پیسچلر س کوارٹرس - معظم جاہی مارکٹ حیدر آباد ۱	سید مصطفیٰ کمال احمد	۶۴	۱۰=۰۰
		(ماہنامے)			
۱۷	آج کل	پٹیالہ ہاؤس - نئی دہلی ۱	شہباز حسین	۶۴	۸=۰۰
۱۸	آندھرا پردیش	محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ - گرہا کلپا - مکرم جاہی روڈ حیدر آباد ۱	کنول پرشاد کنول	۴۸	۶=۰۰

۱۹	آہنگ	کلچرل اکیڈمی۔ جگجیون روڈ۔ گیا (بہار)	کلام حیدری	۷۲	۱۲=۰۰
۲۰	اسپان (انگریزی)	بہاولپور ہاؤس۔ سکندرا روڈ نئی دہلی	ڈی کے براؤن	۵۸	۵=۰۰
۲۱	اشارہ	صادق پور سروے۔ پٹنہ۔ بہار	قیوم خضر	۴۸	۶=۰۰
۲۲	الحق	۳۹۷-۱-۱۴ روبرو گیان باغ۔ سیتارام پیٹھ۔ حیدرآباد	سید عبدالجلیل	۴۸	حسب استطاعت
۲۳	القریش	نامپلی حیدرآباد ۱	محمد ابراہیم مدنی	۳۰	۴=۰۰
۲۴	الفاروق	بنگلہ آزاد خاں۔ رام پور (یو پی)	عابد رضا بیدار	۴۸	۵=۰۰
۲۵	امریکن ریسرچ ریویو (انگریزی)	چانکیہ پوری۔ شانتی پتھ نئی دہلی ۱۲	پی ایچ ہیلین	۲۲	۱=۰۰
۲۶	انڈین لٹریچر (انگریزی)	۸/۲ رام نگر۔ نئی دہلی ۱	لکشمن شاستری	۳۲	۶=۰۰
۲۷	بانو	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی	زینت کوثر	۶۴	۱۰=۰۰
۲۸	برہان	جامع مسجد اردو بازار دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۸=۰۰
۲۹	بلٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانس اسٹڈیز۔ راشٹرپتی نواس" شملہ	وینکٹ رامن	۲۰	۰ ۰
۳۰	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ، دریا گنج دہلی	خوشتر گرامی	۱۲۰	۱۵=۰۰
۳۱	پونم	۳۰۱-۷-۱۲ اعظم پورہ، حیدرآباد (اے پی)	طاہر کرنوی	۶۰	۱۰=۰۰
۳۲	پیام تعلیم	جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	محمد حسین حسان ندوی	۶۴	۶=۰۰
۳۳	تجلی	دیوبند ضلع سہارن پور (یو پی)	عامر عثمانی	۶۴	۸=۰۰
۳۴	تحریک	۹-انصاری مارکٹ، دریا گنج دہلی ۶	گوپال متل	۶۴	۱۰=۰۰
۳۵	جاسوسی پنجہ	پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں۔ دہلی ۶	وی، دہلوی	۱۲۰	۸=۰۰
۳۶	ٹوکیو ٹوڈے (انگریزی)	حکومت جاپان (محکمہ اطلاعات) ٹوکیو۔	- -	۸۰	۰ ۰
۳۷	جامعہ	جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶=۰۰
۳۸	جاں نثار	۶۸ سبھاش نگر، کٹرہ شیر سنگھ۔ امرتسر (پنجاب)	میلارام وفا	۵۶	۱۰=۰۰
۳۹	جستجو	اندرون پنج محلہ۔ حیدرآباد ۲	سید عبداللہ	۲۴	۴=۰۰
۴۰	جمالستان	۳۶۴۔ بازار مٹیا محل دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۸=۰۰
۴۱	حریم	تسیم بکڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ، یو پی	نسیم انہونوی	۴۸	۷=۰۰
۴۲	خاتون دکن	۳۳۹-۳-۲۲ گھر کی باولی۔ حیدرآباد ۲ (اے پی)	صالحہ الطاف	۴۸	۶=۰۰
۴۳	دوام	پوسٹ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یو پی)	مختار احمد مظاہری	۶۴	۷=۰۰

۴۴	دیروحرم	بازار نخاسہ، سہارن پور (یوپی)	اقبال احمد	۳۲	۰۰
۴۵	زبان وادب	آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی ۶	صدرالدین احمد	۲۴	۰۰=۸
۴۶	زیور	سبزی باغ پٹنہ ۴ (بہار)	رضوان احمد	۶۵	۰۰=
۴۷	ساہتیہ اکیڈمی جرنل (انگریزی)	"رابندر بھون" ۳۵ فیروز شاہ روڈ نئی دہلی ۱	پی ماچوے	۸۰	۰۰=۱
۴۸	سروج	صدر بازار دہلی ۶	سیفی پریمی	۴۸	۰۰=۱
۴۹	سنٹر کالیننگ (انگریزی)	فیملی پلاننگ ڈپارٹمنٹ حکومتِ ہند کوٹلہ روڈ نئی دہلی	اے، ایس، کپور	۱۲	۰۰
۵۰	سوویت لٹریچر (انگریزی)	۷/۱ کوتوزووسکی پروسپیکٹ۔ ماسکو (یو، ایس، ایس، آر)	ویلنٹینا جیکب	۲۰۰	۰۰
۵۱	سہیل	باری روڈ۔ گیا (بہار)	ادریس سنسناروی	۳۲	۴=۰۰
۵۲	شاعر	پوسٹ بکس ۲۶۵۴ بمبئی ۸ (بی آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	۱۰=۰۰
۵۳	شانِ ہند	فلیٹ ۸۔ انصاری مارکٹ، دریا گنج دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	۸=۰۰
۵۴	شاہکار	۱۱۰۔ مدن پورہ بنارس (یوپی)	محمود احمد ہنر	۱۴۰	۱۵=۰۰
۵۵	شب خون	۳۱۲ رانی منڈی۔ الہ آباد۔ ۳ (یوپی)	عقیلہ شاہین	۸۸	۱۲=۰۰
۵۶	شمع	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۱۳۲	۱۵=۰۰
۵۷	شمعِ ملت	"ادارہ تحریک سیرۃ النبی" امر پیٹ۔ حیدرآباد (اے پی)	حکیم غوث محی الدین	۸	۲=۰۰
۵۸	شاہجہان	قاسم جان اسٹریٹ۔ بلی ماران دہلی ۶	محمد عتیق صدیقی	۳۲	۳=۰۰
۵۹	صبا	R.T. ۲/۲۷۴ وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد۔ ۲۸ (اے پی)	صفیہ اریب	۷۰	۱۱=۰۰
۶۰	صبحِ امید	بلاسیس روڈ۔ بمبئی ۸	عبدالحمید بربیر	۴۸	۶=۰۰
۶۱	صبحِ نو	قطب الدین لین۔ پٹنہ ۴ (بہار)	وفا ملک پوری	۴۸	۷=۰۰
۶۲	فارن افیئرس ریکارڈ (انگریزی)	شعبۂ تشہیر وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند۔ دہلی	"	۶۴	۰۰
۶۳	فروغِ اردو	۳۷۔ امین آباد پارک لکھنؤ (یوپی)	پروفیسر احتشام حسین	۴۸	۵=۰۰
۶۴	کتاب	کیسر مارکٹ۔ لکھنؤ ۳ (یوپی)	عابد سہیل	۸۰	۴=۰۰
۶۵	کتاب نما	مکتبہ جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	شاہد علی خاں	۴۰	۳=۰۰
۶۶	کتابِ [illegible]	۱۷/۱۸ کلائیو روڈ۔ الہ آباد (یوپی)	ڈاکٹر جعفر رضا	۳۲	۳=۰۰
۶۷	کشاف	اسٹیٹ ہیڈ کوارٹرس دول گوڑہ۔ حیدرآباد ۲۹	دستگیر عرمی	۲۴	۱=۰۰
۶۸	کوریا (انگریزی)	عوامی جمہوریہ کوریا۔ پیانگ یانگ۔ کوریا۔	"	۶۰	۰۰

نمبر	نام رسالہ	پتہ	مدیر	صفحات	قیمت
۶۹	کوریا ٹوڈے (انگریزی)	عوامی جمہوریہ کوریا - پیانگ یانگ - کوریا	دستگیر عزمی		۰
۷۰	کھلونا	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۵۸	۸=۰۰
۷۱	گگن	بلڈنگ نمبر ۱۱/۱۰ ہینس روڈ - بمبئی ۱۱	الشمس کنول	۸۰	۱۲=۰۰
۷۲	گلِ کو	۴۴۶-۷-۲۲ چھتہ بازار - حیدرآباد ۲	انور نظامی	۳۲	۶=۰۰
۷۳	مانیر	مانیر اشاعت گھر - کریم نگر (اے پی)	اکمال کریم نگری	۴۰	۶=۰۰
۷۴	مجرم	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	ادریس دہلوی	۱۲۰	۱۲=۰۰
۷۵	معارف	دارالمصنفین - اعظم گڑھ (یو پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸=۰۰
۷۶	مُنادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۶=۰۰
۷۷	میڈیکل ڈائجسٹ (اردو)	شفا پبلی کیشنز نیا جابر - کانپور ۱	ڈاکٹر ضیا احمد انصاری	۱۴۸	۲۵=۰۰
۷۸	نوری کرن	بازار صندل خاں - بریلی (یو پی)	اقبال احمد نوری	۴۸	۶=۰۰
۷۹	نیا دور	محکمہ اطلاعات اترپردیش لکھنؤ	خورشید احمد	۵۲	۶=۰۰
۸۰	ویت نام میگزین (انگریزی)	ویت نام کونسل آف فارن ریلیشن - سائیگان (ویت نام)	وائی پاؤ	۳۲	۰۰۰
۸۱	ہمایوں	A-۶۰/۱۲ تلک نگر - دہلی ۱۸	شاہجور سامری	۴۸	۱۰=۰۰
		(پندرہ روزہ)			
۸۲	امریکن رپورٹر (انگریزی)	یونائیٹیڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ - نئی دہلی	مورلیس وی بانبر	۲۸	۰۰
۸۳	العرب (انگریزی)	۲۷ سردار پٹیل روڈ نئی دہلی ۱۱	محمد وہبی	۱۶	۱=۰۰
۸۴	برگِ آوارہ	ترپ بازار - حیدرآباد ۱ (اے پی)	محمود خاور	۱۲	۵=۰۰
۸۵	بھودان تحریک	راج گھاٹ - وارانسی (یو پی)	احمد فاطمی	۸	۴=۰۰
۸۶	پریس ریلیز ندر لینڈ (اردو)	ندر لینڈ ایمبیسی - شانتی پتھ چانکیہ پوری - نئی دہلی	"	۸	۰۰
۸۷	خبرنامہ	شعبۂ اردو قومی کمیٹی گاندھی پیدائش صدی - دریاگنج دہلی	گوپی ناتھ امن	۱۲	۰۰
۸۸	[illegible] حیات	۹۷-۱-۱-۱۰ اے سی گارڈ حیدرآباد (اے پی)	[illegible]		۵=۰۰
۸۹	سوویت دیس (اردو)	۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	[illegible]	۴۸	۶=۰۰
۹۰	کرنٹ سائنس	یونائیٹیڈ اسٹیٹس انفارمیشن سروس - نئی دہلی	[illegible]	۲۰۰	۵=۰۰
۹۱	نغمۂ حیات	[illegible] حیدرآباد ۱۶ (اے پی)	احمد [illegible] خوند میری	۶	۴=۰۰
۹۲	فلمی دنیا	نامپلی روڈ - حیدرآباد ۱ (اے پی)	عثمان شیدا	۱۲	۶=۰۰

نمبر	نام	پتہ	مدیر	صفحات	قیمت
۹۳	کرنٹ ڈیفنس (انگریزی)	یو ایس انفارمیشن سروس - سکندرا روڈ - نئی دہلی ۱	مینارڈ ایچ ٹورڈ	۲۸	
۹۴	مغربی بنگال	نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت مغربی بنگال - کلکتہ	" "	۱۶	۲=۰۰
۹۵	منصف	چار محل حسینی علم، حیدرآباد ۲ (اے پی)	جعفر حسین جعفری	۸	۵=۰۰
۹۶	ہماری منزل	۵-۰۷-۸ ولم نامپلی مارکٹ - حیدرآباد ۱ (اے پی)	شفیع اقبال	۸	۵=۰۰
۹۷	ہمدرد	ہمدرد منزل - لال کنواں - دہلی ۶	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	۳=۰۰
	(ہفتہ وار)				
۹۸	آدرش	آبگلہ - بنیاد گنج - گیا (بہار)	معین شاہد	۴	۷=۰۰
۹۹	آندھرا پنچ	اوپل کلاں - حیدرآباد ۱۳ (اے پی)	ملک محمد علی خاں	۸	۶=۰۰
۱۰۰	ادبی خبریں	روسی سفارت خانہ ۲۵، بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	" "	۸	[illegible]
۱۰۱	امریکن رپورٹر (اردو)	امریکن انفارمیشن سروس ۱۵ سکندرا روڈ - نئی دہلی ۱	ڈی این مست	۱۲	۱=۰۰
۱۰۲	" (تلگو)	" " " "	ڈینیس ڈی ڈوناہو	۱۲	۱=۰۰
۱۰۳	" (انگریزی)	" " " "	" "	۱۲	۱=۰۰
۱۰۴	افکار و جائزے	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	" "	۱۲	[illegible]
۱۰۵	ایشیا	اردو بازار جامع مسجد - دہلی	برنارڈ	۱۲	۹=۰۰
۱۰۶	بلٹز (اردو)	۱۷/۱۷ ایچ کاوس جی پٹیل اسٹریٹ بمبئی	آر کے کرانجیا	۲۰	[illegible]
۱۰۷	پرجا	اعظم روڈ - نظام آباد (اے پی)	عابد انصاری	۸	۶=۰۰
۱۰۸	پرچم ہند	گلی قاسم جان - دہلی ۶	انیس الرحمن	۲۴	۱۲=۰۰
۱۰۹	پریس بلیٹن (اردو)	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند - برٹی روڈ - حیدرآباد ۲۵	شیخ محمد	۱۲	[illegible]
۱۱۰	تعمیر	کالج روڈ - محبوب نگر (اے پی)	محمد عبدالعزیز	۸	۸=۰۰
۱۱۱	تھرل (انگریزی)	نیو ملک پیٹھ - حیدرآباد ۳۶ (اے پی)	علاء الدین حبیب	۱۲	۱۵=۰۰
۱۱۲	حیدرآباد گزٹ	ببری الاوا - حیدرآباد ۲ (اے پی)	رحیم فریادی	۸	۶=۰۰
۱۱۳	ذوالقرنین	نظامی بکڈپو - بدایوں (یو پی)	وحیدالدین نظامی	۸	۶=۰۰
۱۱۴	رہنمائے تلنگانہ	سروج نگر - یوسف گوڑہ حیدرآباد ۴۵ (اے پی)	یوسف ندیم	۸	۸=۰۰
۱۱۵	سحر	ناندیڑ (مہاراشٹرا)	احمد علی بیگ چغتائی	۸	۵=۰۰
۱۱۶	سوویت جائزہ	۲۵، بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	احمد معظم	۲۰	۵=۰۰

۱۱۷	شعور	مدینہ منشن نارائن گوڑہ حیدرآباد ۲۹ (اے پی)	نعیم قریشی	۱۲	۸=۰۰
۱۱۸	طب کی خبریں	روسی سفارت خانہ ۲۵ - بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	-	۸	برائے صحافت
۱۱۹	فارم نیوز بلیٹن (انگریزی)	مرکزی وزارت اغذیہ - دہلی	-	۸	″
۱۲۰	فصاحت	چنبیلی کا منڈوا کوٹلہ عالیجاہ حیدرآباد ۲	سید غضنفر علی نقوی	۸	۱۰۰
۱۲۱	قومی محاذ	جنابازار اورنگ آباد (مہاراشٹرا)	اثر فاروقی	۸	۶=۰۰
۱۲۲	مورچہ	بیراگی - گیا (بہار)	کلام حیدری	۱۲	۶=۰۰
۱۲۳	مکت دھارا (ہندی)	۱۲۴ E بھگت سنگھ مارگ نئی دہلی ۱	نریندر شرما	۲۲	۱۲=۰۰
۱۲۴	نیا آدم	۴-۶-۴۸ کٹل منڈی - اسٹیشن روڈ حیدرآباد ۱	امجد باغی	۱۲	۱۰=۰۰
۱۲۵	نیا ٹیگ	۲۰ - بازار لین - راجندر نگر نئی دہلی ۱	سودیش کمار	۱۲	۶=۵۰
۱۲۶	نیوز فرام رومانیہ	سفارت خانہ حکومت رومانیہ ۴۰ گلف روڈ - نئی دہلی	-	-	برائے صحافت
۱۲۷	واقعات و تبصرے	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	-	۱۲	″
۱۲۸	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند - علی گڑھ (یوپی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۵=۰۰
		(دو روزہ)			
۱۲۹	آج کا امریکہ	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	-	۸	برائے صحافت
۱۳۰	پریس ریلیز (اردو)	تاس ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	-	۱۲	″
۱۳۱	سوویت یونین کی خبریں		-	۱۲	″
۱۳۲	″ فیچر		-	۸	″
۱۳۳	میڈیکل نیوز (اردو)	یو ایس - انفارمیشن سروس - سکندرآباد روڈ - دہلی	-	۸	″
		(روزنامے)			
۱۳۴	انگارے	ونائک لاڈ بلڈنگ جام باغ روڈ حیدرآباد ۱	معین فاروقی	۲	۲۴=۰۰
۱۳۵	ترجمان	پنڈی اسٹریٹ لدھیانہ (پنجاب)	امرداس بھاٹیہ	۲	۲۴=۰۰
۱۳۶	خدمت	دی بنڈ - سری نگر (کشمیر)	پی - این - ورکل	۴	۲۴=۰۰
۱۳۷	رہنمائے دکن	افضل گنج - حیدرآباد دکن (اے پی)	سید لطیف الدین	۸	۲۰=۰۰
۱۳۸	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ - حیدرآباد (اے پی)	میر عابد علی خاں	۸	۲۰=۰۰

اِدارۂ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد

تختۂ آمد بابتہ سال ۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء ختم ۳۱ مارچ ۱۹۷۰ء

سلک افتتاحی (رقوم نقد و بنک)

الف - نقد رقوم	4764 = 14	
ب - رقم در کرنٹ اکاؤنٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر	6,262 = 6	
ج - اسپیشل سیونگس بنک اکاؤنٹ (در کنرا بنک لمیٹڈ)		
۱- ادارہ اکاؤنٹ	27 = 78	
۲- سب رس اکاؤنٹ	144 = 16	
د - کلکشن اکاؤنٹ جی رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ حیدرآباد	34 = 16	
ھ - فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر		
بشمول انٹرسٹ مبلغ 982 = 73	7,461 = 92	18,694 = 93

امداد - از حکومت ہائے ہند و آندھرا پردیش

امداد وصول از حکومت آندھرا پردیش محکمہ تعلیمات جی او نمبر ۷۶ کے م ۳۱ ر ۳ ر ۱۹۷۰ء	5,400 = 00	
آمدنی از فروخت مطبوعات	824 = 50	
آمدنی از چندہ سالانہ سب رس	499 = 20	
آمدنی از فروخت قدیم شمارہ جات	34 = 60	
آمدنی از فروخت غالب نمبر	446 = 85	
آمدنی از اشتہارات	101 = 00	1,080 = 65

منافع بابتہ سیونگس بنک اکاؤنٹس

(۱) ادارہ اکاؤنٹ	0 = 50
(۲) سب رس اکاؤنٹ	4 = 75

اردو امتحانات

فیس میمورنڈم، عارضی صداقت نامہ، قواعد، پرچہ جات سوالات وغیرہ	4,576 = 04	- - -
متفرق - ٹیلیفون کالس وغیرہ	8 = 10	. . .
ادائی پیشگی برائے عملۂ دفتر ادارہ (بصورت قرض)	110 = 00	- - -
قرض جو اسٹیٹ بنک سے لیا گیا	4,500 = 00	- - -
فرق حسابات	12 = 14	- - -

میزان = 35,311 = 61

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد

تختۂ خرچ بابتہ سال ۱۹۶۹ء تا ختم مارچ ۱۹۷۰ء

تفصیل	رقم	میزان
اخراجات اشاعت مطبوعات و خریدی کتب برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ		216=12
معاوضۂ مصنفین		55=00
اخراجات اشاعت ماہ نامہ سب رس طباعت و قیمت کاغذ	1515=00	
ڈاک خرچ و متفرق	283=54	
اخراجات طباعت غالب نمبر	1166=72	2965=26
اخراجات اردو امتحانات		3548=82
کتب خانہ (۱) خریدی کتب و جلد بندی	125=75	
(۲) صادر و متفرق	13=38	
(۳) تنخواہ عملہ کتب خانہ	1200=00	1339=13
علمی و ثقافتی مصروفیات و تقاریب۔		
۱۔ یوم محمد قلی قطب شاہ	123=29	
۲۔ یوم زور	175=64	
۳۔ علمی و ثقافتی مصروفیات اور کمیٹیوں کے اخراجات	29=66	
اخراجات دفتر :- (۱) تنخواہ عملۂ دفتر	4740=00	
۲۔ ٹیلیفون، بجلی، پانی	450=95	
۳۔ متفرق اخراجات	417=92	
۴۔ صادر، طباعت، ڈاک خرچ و اجرت ٹائپ	114=12	
۵۔ داغ دوزی و مرمت عمارت ادارہ	267=98	
۶۔ بنا چارجز و کمیشن	1=60	
۷۔ اخراجات آمد و رفت آفس سکریٹری	360=00	
۸۔ پیشگی برائے عملۂ دفتر	100=00	
۹۔ انٹرسٹ اکاونٹ (اسٹیٹ بنک صدر دفتر)	99=85	6642=32
سلک اختتامی نقد و بنک		
ا۔ نقد رقم در اسٹیٹ بنک کرنٹ اکاونٹ صدر دفتر	1242=41	
ب۔ نقد رقم بشمول چیک نمبر A.75009 رقمی Rs.5,400/00	11089=62	
ج۔ اسپیشل سیونگس بنک اکونٹ		
ا۔ ادارہ اکاونٹ 28=28 } ب۔ سب رس اکاونٹ 311=04 }	311=04	
د۔ کلکشن اکاونٹ دی رگھوناتھ مل بنک	11=48	
ھ۔ فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر	7,461=92	20,116=47

صدر میزان = 35311=61

ادارہ ادبیات اُردو

صدور ادارہ

نواب مہدی یار جنگ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء
نواب لیاقت جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء
نواب زین یار جنگ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر سید علی اکبر ۱۹۶۱ء

نائب صدور ادارہ

نواب لیاقت جنگ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۷ء
نواب زین یار جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء
پروفیسر سید علی اکبر ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء
پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۵ء
سید دلدار حسین ۱۹۶۱ء
رائے جانکی پرشاد ۱۹۶۳ء تا ۱۹۶۵ء
محترمہ تہنیت النساء بیگم زور ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء
حامد علی عباسی ۱۹۶۵ء

اعزازی سرپرست

محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور

مجلس اُمنا

۱۔ پروفیسر سید علی اکبر (صدر)
۲۔ لکشمی نارائن گپتا (نائب صدر)
۳۔ سید دلدار حسین
۴۔ نواب عنایت جنگ
۵۔ محمد اکبر الدین صدیقی
۶۔ ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ (معتمد عمومی)

مجلس انتظامی
بہ شمول مجلس اُمنا

۷۔ حامد علی عباسی نائب صدر
۸۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں
۹۔ سری کرشنا سنہا
۱۰۔ عارف الدین حسن
۱۱۔ میر حسن
۱۲۔ رمن راج سکسینہ شریک معتمد
۱۳۔ میر یسین علی خاں
۱۴۔ میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری

ادارہ کی ذیلی مجالس

۱۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن
۲۔ مجلس تعلیم بالغان و اردو امتحانات
۳۔ مجلس مشاورت "سب رس"
۴۔ مجلس نشر و اشاعت
۵۔ مجلس انتظامی کتب خانہ
۶۔ مجلس ادب المقال
۷۔ مجلس انتظامی اُردو انسائیکلوپیڈیا

عملۂ دفتر

میر سراج الدین علی خاں اعزازی آفس سکریٹری۔
محمد جمال الدین۔ منتظم ادارہ
ترصیص الدین انصاری۔ لائبریرین
وقار خلیل۔ منتظم سب رس و دارالمطالعہ
محمد نذیر الدین۔ کارپرداز
محمد عبداللہ۔ چوکیدار

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۵ شمارہ (۵)

مئی ۱۹۷۲ء

ماہنامہ

سب رس

نگران
پروفیسر سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ آٹھ روپے — غیر ممالک سے پندرہ روپے
ششماہی چار روپے — فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپ کر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

مولوی عارف الدین حسن صاحب کے انتقال کے بعد شعبہ امتحانات کا کام جناب صدر صاحب نے عارضی طور پر پیش نظر کیا تھا لیکن ادارہ کی مجلس انتظامی نے اس کام کا بار مستقل طور پر مجھ پر ڈال دیا۔ اب امتحانات کا انعقاد ۲۷ مئی ۱۹۷۲ء مختلف مراکز پر ہوگا۔

۲۹ اور ۳۰ اپریل کو یوم محمد قلی قطب شاہ جو ادارہ کا ایک مستقل جشن بن گیا ہے۔ منایا گیا جناب شام راؤ صاحب وزیر آثار قدیمہ و امور ثقافت مہمان خصوصی تھے۔ ۳۰ اپریل کو صبح میں ادبی اجلاس ہوا اور رات میں جناب اقبال چند صاحب آئی اے ایس کی صدارت میں محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔ تیسرے دن جناب ڈی راما نج راؤ صاحب کی صدارت تلنگی اجلاس ہوا۔ اس کی روداد اور ادبی اجلاس میں جو مضامین پڑھے گئے اور شعراء کے کلام کا انتخاب اگلے شمارے میں شایع ہوں گے

محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر مرحومہ ادارہ کی بہت قدیم معاون اور رفیق کار تھیں دکن کے مشہور شعراء میں ان کا بھی شمار تھا۔ ادارہ نے طے کیا ہے کہ ان کی یادگار کے طور پر ایک خاص نمبر شائع کیا جائے ممکن ہے کہ جولائی کا نمبر ہی بشیر نمبر ہو۔

اس سال ادارہ ادبیات اردو نے جناب سعید شہیدی کے کلام کا مجموعہ "برق و آشیاں" شائع کیا ہے۔ سعید صاحب نے شاعری ورثہ میں پائی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں شستہ اور پاکیزہ خیالات کی ایک رنگین اور دلآویز دنیا پیش کر دیتے ہیں شعر میں برق و آشیاں کا ارتباط ایک علامت کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ سعید شہیدی صاحب کی مقبولیت کتاب کی نکاسی کا باعث ہوگی۔ دو روپے پچاس پیسے اس مجموعہ کلام کی قیمت کچھ زیادہ نہیں۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

امراؤ جان ادا میں سماجی زندگی کی جھلکیاں

امراؤ جان ادا ایک ایسا ناول ہے جس میں زندگی کے حقائق کا نور پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔ یہ کتاب لکھنؤ کی معاشرہ کا صحیح مرقع پیش کرتی ہے۔ اس کے اندر سماجی معاشرتی اور اقتصادی حالات کی ترجمانی خوبی انداز سے کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس میں تاریخی حالات کے اثرات منعکس نظر آتے ہیں۔ اس ناول میں فنکار نے سماج کے مختلف طبقات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس دور کی سماجی زندگی رہن سہن اور زندگی کے متعدد پہلو پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ اس میں معاشرتی زندگی کا بیان ایسے انداز سے کیا گیا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اسی ماحول میں پہونچ گیا ہے۔

امراؤ جان جب اکبر علی خاں کے یہاں رہنے کے لئے گئی تو اس نے اس مکان کی بڑی جاندار تصویر کشی کی ہے کہ کس طرح اکبر علی کے احباب آتے تھے بیٹھتے تھے پان کھاتے، پریشان کرتے تھے اور اسطرح دراصل رسوا نے اس معاشرہ کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

ناول کے آخری حصہ میں امراؤ جان ادا جب نواب چھبن صاحب کے ساتھ تفریح کے لئے بخشی کے تالاب گئی تو وہاں رسوا نے بڑا اچھا منظر دکھایا ہے کہ کس طرح سے جھلکیاں ملتی گئی ہیں۔ اسی طرح جب لکھنؤ والی بیگم کے یہاں سے بڑی بی مجرے کے لئے کہنے آئی تھیں تو کس طرح سے حقہ سے ان کی ضیافت کی گئی اور ان کو الائچی کے دانے پیس کر دئے گئے اسلئے کہ ان کے دانت نہیں تھے۔ بڑی بی نے چلتے وقت کہا کہ ہمارے شہر کی تہذیب کی کیا بات اس طرح نواب سلطان سے امراؤ جان کے تعلقات میں بھی معاشرتی زندگی نمایاں ہے۔ یہاں علمی زندگی پوری طرح سے معمور ہے۔ جو اس دور کے صاحب ذوق لوگوں میں رائج تھی۔ شعر و سخن کے تذکرے مزے کی باتیں اور احباب کے مجمعے کا بیان بڑے اچھے انداز سے اس دور کے سماج کے مطابق دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں سفر میں کیا دشواریاں پیش آتی تھیں اور کتنا خطرناک سفر ہوتا تھا اس کی تصویر بھی کتاب میں موجود ہے۔ پہلا سفر جو امراؤ جان نے فیض آباد سے لکھنؤ تک بیل گاڑی پر کیا وہ اس دور کے سفر کی بہترین ترجمانی ہے۔ پھر دوسرا سفر اس نے فیض علی کے ساتھ کیا۔

اس سفر میں بھی بہت سے سماجی حالات جھانکتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکہ بھی سفر میں عام تھا مصنف نے ان تمام مذکورہ بالا سماجی تصویروں کو اس فنی انداز سے پیش کیا ہے کہ قاری کی نگاہوں میں وہ رقصاں نظر آتی ہیں۔

اکبر علی خاں کے گھر میں ان کی بیگم سے اور بڑھیا سے جو لڑائی ہوئی اور بیگم نے اس کی پٹائی کی وہ گفتگو درحقیقت سماجی زندگی کا ایک اہم پہلو پیش کرتی ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ کس انداز میں بدکار عورتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں اس کی یہ اچھی مثال ہے۔

سب سے زیادہ موثر اور انسانی زندگی سے قریب تر انسانی فطرت سے بھرپور اور نفسیاتی حقائق سے لبریز معاشرتی زندگی کی ایک مثال ہمیں امراؤ جان کے اس بیان میں ملتی ہے جس میں وہ بتاتی ہے کہ کس طرح اسکے والد یعنی جمعدار شام کو جب نوکری پر سے لوٹتے تو ہاتھ میں مٹھائی کا دونا کھلونے اور بچوں کی دلچسپی کی دوسری چیزیں لیکر آتے۔ اس وقت باپ کو دیکھ کر بچوں کو کیا خوشی ہوتی اور باپ بچوں کو دیکھ کر کس طرح محظوظ ہوتے یہ تصویر بڑی ہی فطری کھینچی گئی ہے۔ یہ تصویر کم وبیش ایسی ہی ہے جیسے ٹیگور نے دودھ کے غم میں گوئٹے نے بچوں کے بارے میں جاندار تصویریں پیش کی ہیں۔ لکھنؤ میں میلوں ٹھیلوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے بیان میں بھی رسوا نے بڑی جاندار تصویر کشی کی ہے۔ خصوصاً عیش باغ کے میلے کا ذکر۔ اس میں سماج کے مختلف افراد کا بیان بڑا دلچسپ ہے کوئی اپنے لڑکے کو کندھے پر بٹھائے کوئی بچوں سے اپنی بیوی کے متعلق بات کرتا ہے کہ امی اب یہ کرتی ہوں گی وہ کرتی ہونگی۔ اس موقعہ پر بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ان چند مثالوں سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس میں سوسائیٹی کے حالات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ خاص طور سے اوسط یا اس سے کم درجہ کے طبقہ کو مصنف نے پیش نظر رکھا ہے۔ مثلاً نوچندی جمعرات کو مزار پر جانا' سوزخوانی محرم اور اس قسم کی دوسری رسوم کا تذکرہ کتاب میں کئی جگہ ہے۔ یہ واقعات جو سماجی زندگی سے متعلق ہیں درحقیقت تخیلی نہیں بلکہ ان کے اندر رسوا کے دور کا لکھنؤ اپنی اصل شکل کے ساتھ موجود ہے اس میں جو واقعات ہیں ان میں جہاں بہت سے سماجی حالات کا پتہ چلتا ہے۔ وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس ناول میں سب سے زیادہ ترجمانی سماج کے اس طبقہ کی ہے جو سوسائیٹی کا اخلاقی اعتبار سے سب سے گرا ہوا طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی طوائفوں کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسوا کے دور میں اور اس سے ذرا قبل ان کا طرز زندگی کیا تھا۔ یہ عجیب سی بات تھی کہ رسوا نے اس طبقہ کی ترجمانی کا بیڑا اٹھایا۔ کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ خود رسوا کے مراسم بھی جوانی میں طوائفوں سے رہے ہوں اور ان کے طرز زندگی اسنے جانے والوں کے حالات اور اس طبقہ کے بارے میں معلومات کا ماخذ خود ان کا اپنا تعلق ہو۔ اس ناول میں صرف امراؤ جان ہی کے حالات نہیں ہیں بلکہ دوسری طوائفوں کے بارے میں بھی نفسیاتی تبصرے موجود ہیں۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ اس نے ایک گھناؤنی کہانی کو اس طرح

پیش کیا ہے کہ سوسائٹی کے داغ و دھبے نمایاں ہو گئے ہیں اور اس طرح کہ جس سے ان سے تنفر پیدا ہو۔ مصنف نے کہیں بھی وہ انداز بیان اختیار نہیں کیا جس سے سستی اور جنسی لذتیت کا قاری کو احساس ہو۔ اس کے برعکس جگہ جگہ رسوا نے طوائف کی نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے اور ایسے واقعات نقل کئے ہیں جن سے ان کا اخلاقی دیوالیہ پن، بے رحمی، حیوانیت اور خود غرضی ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً خانم کا وہ واقعہ جب وہ نواب چھبن سے دوشالہ کی فرمائش کرنے آتی ہے اور نواب کی معذرت کے باوجود ان سے یہاں تک کہہ دیتی ہے کہ جب آپکے پاس پیسے نہیں تو طوائف کے یہاں کیوں آتے ہیں۔ حالانکہ نواب صاحب کو بسم اللہ کے ساتھ پھانسنے میں بھی خانم کا ہاتھ تھا۔ مرزا نے بڑی خوبی سے یہ بتایا ہے کہ کس طرح طوائفیں لوگوں سے جھوٹا اظہار عشق کرتی ہیں اور ان کے جیبوں پر ڈاکے ڈالتی ہیں۔ اور لوگ کس طرح قلاش ہونے کے بعد ان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ سوسائٹی طوائفوں کو کیا سمجھتی ہے اس کا جواب بھی اس کے اندر موجود ہے۔ طوائفوں کے بارے میں جو امراؤ جان نصیحت کرتی ہے وہ بھی بڑی موثر اور حقیقت سے پُر ہے۔

جہاں تک اس ناول میں سماجی پہلو کا تعلق ہے اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ یہ مختصر طور پر اس دور کے رسم و رواج، لباس، زیور اور مختلف سماجی حالات کی ترجمان ہے۔ مثلاً لکھنؤ والی بیگم صاحب کے بارے میں مصنف نے بڑے اچھے انداز سے امراؤ جان ادا کی زبان سے بیان کیا ہے کہ "لباس و زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا مہین بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا گلی کا شلوکا چنسا چنسا، سُرخ گرنٹ کا پاجامہ، کانوں میں صرف بالیاں اور ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق، ہاتھوں میں موتیوں کی سمرنیاں، بازوؤں پہ نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں، چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقش حیرت بنی بیٹھی تھی" اس طرح یہ محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے مختلف موقع پر اس دور کے رسم و رواج، لباس اور وضع قطع کے بارے میں کچھ نہ کچھ تفصیلات پیش کی ہیں۔

اُس دور میں حقہ پینے کا رواج تھا۔ چنانچہ جب کوئی امراؤ جان کے یہاں آتا تو اُس کے لئے حقہ بھرا جاتا تھا۔ دیہاتی سفر کرتے ہیں تو راستہ میں بھونے چنے لیکر کھاتے ہیں اس کا بیان دلاور کے سفر میں کیا گیا ہے۔ لکھنؤ میں گرمیوں کے موسم میں جو کیفیت ہوتی ہے اس کا بیان بڑا دل آویز ہے۔ صراحیاں بھر دی جاتی ہیں۔ پانی کا چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ کھلی جگہ پر نشست ہوتی ہے۔ برف کا انتظام رہتا ہے اور گرمی سے بچنے کی مختلف تدبیریں کی جاتی ہیں۔ رسوا نے مختلف جگہ پر پان کا ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ میں پان اور تمباکو کا رواج زیادہ تھا۔ مذکورہ بحثوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنف نے بڑی باتوں سے لے کر چھوٹی باتوں تک کو اس طرح پیش کیا ہے کہ معاشرہ کی ترجمانی کا حق ادا ہو گیا ہے۔

اتفاقات

اس ناول میں سب سے زیادہ دلچسپ اور اثر انگیز احوال اُن واقعات نے پیدا کیا ہے جو اتفاقات سے ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ مرزا رسوا بڑی پتے کی بات کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے عجیب و غریب چیز انسانی زندگی کے واقعات ہیں۔ انہی واقعات کا مطالعہ فنکار نے بڑی ژرف نگاہی سے کیا ہے۔ مرزا رسوا کے مکالمات اور واقعات میں کوئی انوکھی بات نہیں لیکن اِن واقعات کا باہم اتفاقی طور پر سلسلہ مِل جانا نہایت فنکارانہ ہے۔

اُمراؤ جان کا طوائف بننا ایک اتفاقی امر ہے۔ جس میں اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں یہ زندگی اور زمانہ کا ظلم ہے کہ ایک معصوم بچی کو زندگی کے گہرے ترین گڑھے میں پھینک دیا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ دلاور خاں مار ڈالنا چاہتا ہے مگر امام بخش اُس کو نئی راہ سکھاتا ہے اور بیچ کر پیسے دام کھرا کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ کاش دلاور نے اُسے مار دیا ہوتا اور یہ ناپاک زندگی اسے نصیب نہ ہوتی۔

غیر ممکن تھا کہ امیرن بک جاتی مگر قسمت دیکھئے کہ بکی بھی تو کہاں ایک رنڈی کے یہاں۔ یہ بھی اتفاق تھا یہ قاری کے لئے اتفاق ہے۔ مگر فنکار کے لئے عمداً مادہ ہے۔ یہی رسوا کا فنی کارنامہ ہے کہ وہ واقعات کو اتفاقات میں بدل دیتے ہیں۔ جنکو پڑھ کر قاری متعجب اور متحیر رہ جاتا ہے۔ واقعات کا سلسلہ اتنے دور دراز جا کے ملتا ہے کہ آنکھیں کھلی کی رہ جاتی ہیں۔ اِن اتفاقات میں رام دئی کا واقعہ ہے جو امیرن کے ساتھ بکنے آئی تھی اور بیگم بن گئی اس لئے کہ ایک بیگم نے خرید کر اپنے بیٹے کی اس سے شادی کر دی۔ دوسرا اتفاق یہ ہوا کہ رام دئی بیگم سے امیرن رنڈی کی ملاقات اس کان پور میں ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو نہ کچھ پتہ چلتا ہے اور نہ شبہ ہوتا ہے۔ پھر امیرن کی ملاقات رام دئی سے لکھنؤ میں ہوتی ہے اُس وقت کہ جس میں گفتگو کے دوران یہ راز فاش ہوتا ہے کہ یہ وہی دونوں لڑکیاں تعجب ہوا کیا تو بکنے کے لئے امام بخش کے سالے کے گھر میں ایک کمرہ میں بند ہی تھیں مگر اتفاقات نے دونوں کی زندگی کے دھارے پلٹ دیئے۔

یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ نواب سلطان صاحب جن سے امراؤ جان کا شروع میں رسم تھا وہ اتفاق سے رام دئی یعنی بیگم صاحبہ کے شوہر نکلے جس کا علم امراؤ کو لکھنؤ آ کر ہوا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔

سب سے آخری اتفاق دلاور خاں کی ملاقات ہے۔ مرزا رسوا نے بڑے ہی انوکھے انداز سے دلاور خاں کی ملاقات کا منظر اُس وقت پیش کیا جب نہ قاری کے ذہن میں اُس کا کوئی تصور تھا اور نہ تفریح گاہ میں اُس کے وجود کا کوئی امکان ہو سکتا تھا مگر رسوا نے یہ اتفاق بہت ہی فطری اور فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔

اتفاق میں سب سے دلچسپ اور عبرت انگیز وہ واقعہ ہے جبکہ اُمراؤ خود اپنے ہی دروازہ پر مجرا کرنے جاتی ہے۔ اِس کو شبہ و پریشانی ہوتی ہے۔ اس کی ماں اِس کو گھر بلاتی ہیں اور محلہ میں چرچا ہوتا ہے۔ اُس اتفاق پر قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اِس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ رسوا کا فن اتفاقات نگاری کا

فن ہے اور اس میں اُن کو ایسا ملکہ حاصل ہے کہ جسکی مثال اردو کے کسی ادیب اور قصہ نگار کے یہاں نظر نہیں آتی۔
ان اتفاقی کیفیات کو پورے قصہ میں مختلف مواقع پر پیش کیا گیا ہے۔ کانپور میں لکھنؤ کی بیگم صاحب کے یہاں ڈاکہ کے موقعہ پر اتفاق سے فیض علی کا دوست فضل علی سامنے آتا ہے اور اس طرح بیگم صاحب کا گھر ڈاکہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ محض اتفاق تھا چنانچہ بیگم صاحبہ نے کہا کہ کبھی کبھی پرانے تعلقات کام آجاتے ہیں۔

تاریخی حالات کا عکس

رسوا نے لکھا ہے کہ میرے ناول میرے دور کی تاریخ ہیں۔ یہ تاریخی عکس بڑے ہی فنی انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں سیاسی انقلاب اتنے سادہ انداز سے اختصار کے ساتھ کہیں کہیں بیان ہوئے ہیں کہ جن سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ناول نگار زمانے کی رفتار کو ناپ رہا ہے یا اُن کا عکس پیش کر رہا ہے۔ لیکن کسی کے سامنے رسوا کا مقصد پیش نظر ہو تو وہ تاریخ و سیاست کے انقلاب کی کہانی اس ناول کی زبانی سن سکتا ہے۔ غدر کے حالات' نوابی کے زمانے کی کیفیات اور لکھنؤ میں ان تغیرات کا بیان رسوا نے دو تین جگہ امراؤ جان کی زبان سے کیا ہے۔ اس میں حقائق کی جھلک ہے اُن تباہیوں کی جھلک ہے جو غدر میں وقوع پذیر ہوئیں۔ اُس نے ان تبدیلیوں کو خاص طور سے بیان کیا ہے جو شہر کی زندگی میں انگریزی عملداری کے باعث پیدا ہوئیں۔ ان سماجی تغیرات کی نشان دہی بھی سرسری طور سے اس نے کر دی ہے جو اس نئے راج میں ظہور پذیر ہوئے۔ اس نے غدر کے واقعات کا بھی ذکر کیا ہے کہ کیا قیامت لوگوں پر ٹوٹی اور کس طرح لوگوں کو پناہ کیلئے شہر سے بھاگنا پڑا۔ اگرچہ اس کا اپنا مال ضائع نہ ہوا مگر ہزاروں کی دولت لٹ گئی لوگ تباہ و برباد ہو گئے مرزا کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عمداً تفصیل سے احتراز کر کے سیاسی اثرات کو مختصر اور اس قدر بیان کیا ہے جس کو ناول کی فضا سنبھال سکے اور قاری کو اور اُکتاہٹ محسوس نہ ہو۔

امراؤ جان ادا

امراؤ کا کردار اس ناول کا بنیادی کردار ہے جسکے گرد دوسرے کردار گھومتے ہیں دنیا کے بعض مشہور ناول نگاروں کے کرداروں کی طرح امراؤ جان کا کردار بھی اتفاق سے ٹریجڈی بنتا ہے ورنہ اس میں خود اس کی کوئی خطا نہیں چنانچہ ایک موقع پر وہ کہتی ہے کہ نہ مجھے اس پیشہ کی برائی بھلائی معلوم تھی اور نہ مجھے کسی نے بتایا اور نہ میں اپنے اختیار میں تھی۔ امراؤ جان کی کہانی بڑی عبرت انگیز ہے۔ اس میں اس دور کے سماجی نظام کی عکاسی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک شریف النفس عورت تھی جو زمانے کے مظالم کا شکار ہو گئی اصل میں امراؤ جان کے اندر امیرن کی شخصیت چھپی ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے اسکے اندر رنڈیوں کی خو بو نہیں نظر آتی وہ گاہکوں سے دھوکہ دے کر پیسہ مارنے یا زمائش کرنے کو ناپسند کرتی ہے۔ وہ کتابوں کی شوقین ہے آخر میں وہ مجرے پر گذارہ کرتی ہے اور اس ملعون پیشہ سے تائب ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ کربلائے معلی زیارت کرنے کے لئے بھی جاتی ہے اور تمنا کرتی ہے کہ کاش وہیں سپرد خاک ہو جاتی۔ وہ اکی بھی خواہش کرتی ہے کہ

کسی پاکباز انسان سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جاتی۔ مگر پھر ڈرتی ہے کہ سماج اس کو بدنام کر دیگا اور لوگ کہیں گے "آخر بدطینتی تھی نا کفن کا چور لنگا کیا" امراؤ جان ادا کا کردار عام رنڈیوں سے مختلف ہے وہ اس پیشہ کو اچھا نہیں سمجھتی جب اس کو احساس ہوا کہ یہ طرز زندگی صحت مندی نہیں تو اس نے رفتہ رفتہ آلائشوں سے اپنا دامن پاک کرنا شروع کیا اور ایک عام عورت کی طرح پاک زندگی بسر کرنے لگی۔

اس کو شعر و سخن کا بھی اچھا ذوق تھا۔ اس نے فارسی کی تعلیم اچھی طرح پائی تھی۔ اردو میں طبع آزمائی کرتی تھی اور کبھی کبھی غزلیں بھی کہتی تھی۔ اس نے اپنا تخلص ادا رکھا تھا۔ اکثر محفلوں میں وہ خود اپنی کہی ہوئی غزلیں گاتی۔ اس انداز کی رنڈی عام طور پر پائی نہیں جاتی وہ خلوص کے ساتھ محبت کرتی۔ چنانچہ گوہر مرزا سے اس کو تعلق خاطر تھا۔ آخر تک اس نے اس تعلق کو نبھایا۔ اس نے گوہر مرزا سے کبھی کوئی لالچ ظاہر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ الٹا نقصان اٹھایا۔ اس کی پوری زندگی ایسی گذری کہ اس میں اس کی طرف سے جعل بازی اور بازاری انداز کا پتہ نہیں چلتا اس کے یہاں ایسی علامتیں ملتی ہیں جن سے محسوس ہوتا ہے کہ طبعًا وہ ایک شریف النفس عورت تھی یہ شرافت مختلف انداز سے ظاہر ہوتی ہے وہ اُن عورتوں کی تعریف کرتی ہے جو ایک مرد کے علاوہ پوری عمر دوسرے کا منہ نہیں دیکھتیں وہ پردہ کو پسند کرتی ہے مگر اپنی عادت سے مجبور ہو کر پردہ والیوں میں نہیں بیٹھ سکتی۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ اس کا ضمیر زندہ تھا۔ اس کی طبیعت میں جو خلش تھی اور سوز دروں تھا اس کا اندازہ کئی واقعات سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جب وہ لکھنؤ میں بیگم صاحب سے باتیں کرتی ہے اور اس کو اپنی پیدائش کے بارے میں کہنا پڑتا ہے تو بات ٹال جاتی ہے اور بعد میں جب سارا واقعہ کھلتا ہے تو دل میں سوچتی ہے کہ ایک یہ ہے کہ نواب کے یہاں بکی اور ایک میں ہوں کہ بھڑیا کے یہاں بکی۔ اسی طرح جب امراؤ جان فیض آباد میں اس کی ماں اور بہن بلا کر پوچھتی ہیں کہ کیا تم ذات کی بھڑیا ہو۔ تو فورًا غم سے اس کا دل بھر آتا ہے وہ لوٹ کر جب اپنے گھر سے آتی ہے تو پورا دن اور رات سماج کے ظلم پر روتی رہتی ہے اسی لئے جب اسکو اس برائی کا احساس ہوا تو اس نے اس سے دور ہونے کی کوشش کی دراصل آغاز جوانی میں نہ وہ خود ان برائیوں کو سمجھ سکتی تھی اور نہ کوئی سمجھانے والا تھا بلکہ جس ماحول میں رہی اس میں رنگ گئی۔

امراؤ جان اپنے دور کے سماج کی ایک حقیقی تصویر پیش کرتی ہے۔ اس کے یہاں بہت سے نشیب و فراز ہیں لیکن اسکی زندگی کے نشیب برائے نام اور فراز کی کیفیت غالب نظر آتی ہے۔ اس کی زندگی میں ایک عام انسان کی طرح بہت سے مسائل آئے لیکن یہ مسائل آسانی سے دور ہو گئے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصائب تو انسان کو لائے ہوئے تھے۔ مگر ان کی گرہ کشائی قدرت کے ہاتھوں نے کی۔ اس کے ہوش آنے کے بعد پہلی مصیبت جو اس کو پیش آئی وہ فیض علی کے ساتھ مفرور ہونے کی تھی۔ اسی فساد سے اس نے بڑی

مصیبتیں اٹھائیں لیکن راجہ صاحب مل گئے جنہوں نے تمام تکالیف کا مداوا کیا۔ جب وہاں سے نکلی تو پھر فیض علی اس کو کان پور لے گیا کان پور میں دو چار دن کافی زحمتوں سے گذرے مگر اچھے دن جلد لوٹ آئے۔ پھر ایک مصیبت اس وقت بھی پڑی جب وہ نواب محمود علی خاں کے دعویٰ کا شکار ہوئی۔ ۶ برس تک مقدموں میں پھنسی رہی لیکن خدا خدا کر کے نجات حاصل کر لی۔ یہاں تھوڑا سا امراؤ کا کردار اس چوکھٹے میں بیٹھتا نظر نہیں آتا جو پورے ناول سے قاری کے ذہن میں ابھرتا ہے مثلاً جب محمود علی خاں امراؤ کو صرف اپنی ذات تک محدود کرنا چاہتے ہیں اور دوسروں سے ملنے کو منع کرتے ہیں تو یہ بات امراؤ کو پسند نہیں آتی اور وہ اپنے قدیم ملنے والوں سے رسم کو توڑنا نہیں چاہتی۔ اسی طرح کا ایک سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ اُس نے عہد جوانی میں کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ فیض آباد جا کر اپنا گھر تلاش کرے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جو کچھ واقعہ اس کو پیش آیا وہ اُس کے ہوش و حواس کے دور میں ہوا۔ اُس کو اپنے باپ کا نام "جمعدار" یاد تھا جو اپنی نوکری کی وجہ سے معروف تھا۔ اپنا گھر یاد تھا جب اُس کے پاس پیسے بھی ہو گئے تو بھی اُس نے اس زندگی کی اہم کشمکش کو حل کرنے کی کوشش نہ کی جب کہ وہ آسانی سے جا کر اپنے گھر والوں کا پتہ لگا سکتی تھی اور اس پیشہ سے نجات حاصل کر سکتی تھی یا جب اُس کی ملاقات اتفاقاً مجرے کے بعد اپنی ماں اور بہن سے ہوئی تب بھی اُس نے کبھی یہ نہ سوچا کہ اب سے سہی اپنے گھر آ کر بیٹھ جائے اور پاکیزہ زندگی اختیار کرے یہی نہیں ماں نے بھی اس کی کوشش نہ کی کہ کھوئی ہوئی بیٹی کو پائے جانے کے بعد اپنے گھر رکھ لیتی اور روکھا سوکھا جو کچھ ملتا خود بھی کھاتی اور اُس کو بھی کھلاتی۔ ممکن ہے کہ سماج کا ڈر رہا ہو مگر جذبات اور ماں کی ممتا کو سوسائٹی کے اِن تصورات پر غالب آنا چاہیئے تھا۔

اُمراؤ جان کا کردار انسانی زندگی کے انقلاب کا ترجمان ہے۔ اُس کی زندگی میں معصومیت ایک اہم عنصر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مہذب با ذوق، باشعور اور حساس عورت تھی جسے مال و دولت کی طمع نہ تھی اس کے پیش نظر خودی اور احترام انسانیت تھا۔ قسمت اور قدرت نے جن حالات میں اُس کو گرفتار کر دیا تھا اُس میں بھی اُس نے اپنے کردار کی بلندی ثابت کی اور بالآخر اس پیشے سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جن حالات میں معاشی اور سماجی طور پر گھر جاتا ہے اُن سے نکلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اگر کسی کے اندر صحیح اور تعمیری رُخ غلط فضا میں رہ کر پیدا ہوتا ہے تو یہ فطرت کی خوبی کا نشان ہے۔ امراؤ جان اپنے کردار کے لحاظ سے بُری نہ تھی۔ سماج نے اُس کے ساتھ ظلم کیا۔ حالات سے نپٹنا آسان نہیں۔ بہرحال اُس نے اپنی زندگی اُسی پیشے میں گذاری مگر اُس حد تک محتاط اور بلند رہ کر جتنا ایک رنڈی ہو سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آخری زندگی میں وہ رنڈی باقی نہ رہی تھی۔ وہ زندگی پر گہری اور تنقیدی نظر رکھتی ہے وہ صاف کہتی ہے کہ رنڈی کا

کوئی درست نہیں لوگ اپنے مطلب کے ساتھی ہیں۔ اُس نے بہت سے واقعات حالات، حادثات اور اپنی زندگی کے متعلق اشخاص کا بیان اس طرح درج کیا ہے جس سے اُس کی عظمت نمایاں ہوتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس نے عام رنڈیوں کے برخلاف کسی کو دھوکہ نہیں دیا اور کسی کی دولت پر ہاتھ نہیں صاف کیا۔ امراؤجان کے کردار میں بڑی شرافت اور بلندی ہے جس سے عام طوائفوں کو تعلق نہیں —— اس کا کردار رنڈیوں کے کردار سے بلند ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ امراؤجان کے اندر امیرن کی شخصیت پوری طرح جلوہ گر اگر امیرن کا کردار اسی ناول میں بیچ بیچ جھانکتا نہ ہوتا تو شاید یہ اتنا بلند نہ ہو پاتا۔ یہ کردار اردو ناول کے کرداروں کی آبرو ہے۔ رسوا نے اس کو بڑے فنی انداز سے پیش کیا ہے۔ امراؤ نے جو عورتوں کو نصیحت کی ہے وہ بڑی عمدہ ہے اسی نے کہا کہ اگرچہ میں خود پردہ نہیں کرتی مگر پردہ کرنے والیوں کو اچھا سمجھتی ہوں جو ایک شخص کے علاوہ پوری عمر کسی دوسرے کا منہ نہیں دیکھتیں۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ عام عورتیں جس طرح زندگی گذارتی ہیں وہ اسی طرح زندگی بسر کرتی۔

گوہر مرزا

گوہر مرزا کا تعلق بچپن سے امراؤ جان سے تھا۔ دونوں خانم کے مقرر کردہ مولوی صاحب سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ گوہر مرزا ایک نواب کی نسل سے تھا۔ مگر اُس کی ماں نیچ ذات کی تھی۔ بہرحال عنفوان شباب میں ہی امراؤ جان کا تعلق گوہر مرزا سے ہو گیا تھا۔ گوہر مرزا اس کا گلچین اول تھا۔

گوہر مرزا شریر اور بے وفا انسان تھا۔ اس نے کبھی وفاداری کا ثبوت نہیں دیا۔ بلکہ ہمیشہ لوٹ کھسوٹ اور بے وفائی پر آمادہ رہتا۔ اس کے برخلاف امراؤ جان کو اس سے محبت تھی اور دل سے اُس نے اپنی وفاداری میں کبھی فرق نہ آنے دیا۔ اِس طرح گوہر مرزا نے لوٹنے میں اور بے وفائی میں کبھی کمی نہیں کی۔ امراؤ جان ایک بامروت عورت تھی اس نے جو انداز اختیار کیا تھا اُس کو پوری عمر نبھایا۔ گوہر مرزا نے ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی حرکت کی، طالب علمی کے زمانے میں مار نا پیٹنا اور پریشان کرنا اس کا کام تھا بعد میں جب جنسی تعلقات ہو گئے تو امراؤ جان سے روپیے پیسے بھی حاصل کرنے لگا۔ سب سے زیادہ بے وفائی اُس نے اُس وقت کی جب فیض علی کا دیا ہوا اندوختہ جو اُس نے غدر میں بھاگتے وقت ایک پڑوسن کے ہاں رکھا دیا تھا، اور جو غدر میں محفوظ رہ گیا تھا۔ گوہر مرزا نے اڑا لیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اور اُس کی بے وفائی کو سمجھنے کے بعد بھی امراؤ جان نے کبھی اُس سے بے رخی نہ کی اور کبھی خفگی نہ دکھائی۔

گوہر مرزا کا کردار "امراؤ جان ادا" ناول کا کردار نہیں ہے بلکہ یہ کردار ہر انسانی سوسائٹی میں نظر آتا ہے ایسے انسانوں کی کمی نہیں جو خود پرست اور دل آزار ہیں۔ گوہر مرزا کے کردار میں درحقیقت زمانے اور ہر سماج کے لالچی اور بے وفا کرداروں کا آئینہ ملتا ہے۔ انسانی زندگی میں ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں

جو انسان کا بدلہ برائی سے دیتے ہیں ان کی سرشت میں بھلائی نہیں ہوتی اس لئے ان کا انداز اور ان کا عمل سب خود پرستی اور مفاد پرستی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس لئے گوہر مرزا کا کردار حقیقی انسانی سوسائٹی کا کردار ہے جس میں منفی تصورات نظر آتے ہیں لیکن گوہر مرزا سے کوئی انسانی معاشرہ خالی نہ ملے گا۔

خانم

خانم کا کردار ایک رنڈی کا پختہ کردار ہے۔ اُس کے یہاں وہ تمام رذائل اخلاق موجود ہیں جو ایک بوڑھی رنڈی میں ہونے چاہئیں۔ مثل مشہور ہے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ خانم خود رنڈی تھی اور پھر اُس نے آمدنی کے لئے رنڈی خانے کھولے اور باقاعدہ نوچیاں رکھنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا کاروبار نہایت وسیع تھا لاکھوں کی دولت اِس حرام پیشے سے اُس نے جمع کرلی تھی اور نئی نئی لڑکیوں کو خرید کر اُن سے پیشہ کرواتی تھی۔

خانم کا کردار اُس دور کے اُن مفاد پرستوں اور سرمایہ داروں کی ذہنیت کو پیش کرتا ہے جو ہر طرح سے دولت کے نشہ میں سرشار تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبھی کبھی خانم کا ضمیر زندہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ جس وقت امیرن وہاں بیچی اُسکو دیکھکر سودا ہو چکنے کے بعد خانم نے کہا یہ کیسی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ اِس کے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خانم کے اندر شعور تھا مگر زندگی کی کثافتیں اُس پر غالب تھیں اُسکو معلوم تھا کہ یہ ظلم ہے۔ مگر پیسے کی خاطر اُس نے اپنے ضمیر کو دبا رکھا تھا۔ وہ ذات کی رنڈی تھی اور اُس نے اپنی بیٹی بسم اللہ جان سے بھی یہی پیشہ کروایا اُس نے نوچیاں حصول دولت کے لئے رکھی تھیں۔ اِس پیشے سے اُس کی نگاہوں کو دولت پر مرکوز کر دیا تھا چنانچہ اگر کوئی رنڈی بیمار ہوتی تب بھی اُس کو مجرا کرنے کے لئے جانا پڑتا۔ اِسی بنا پر ایک بار امراؤ جان بددل ہوگئی اُس کو دردِ سر تھا پھر بھی خانم نے اُن کو مجرے کے لئے مجبور کرنا چاہا اِس پر امراؤ نے رقم اپنے پاس سے واپس کردی مگر مجرے میں نہ گئی۔

اِن سب باتوں کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خانم کے اندر وفاداری ضرور تھی۔ اس نے اپنے ایک عاشق کو شادی سے روکا تھا اور پھر تا عمر اُس کے اخراجات اپنے ذمے کرلئے اور اپنی وفاداری میں کوئی کمی نہ آنے دی آخر میں دولت کی لالچ خانم کو کم ہو گئی تھی۔

خانم کا کردار بتاتا ہے کہ اُس دور میں ایسے عیاشی کے بہت سے اڈے تھے جو نفع کمانے کے لئے چلائے جاتے تھے رنڈیاں نوچیاں آمدنی کی خاطر رکھتی تھیں۔ خود امراؤ جان نے "آبادی" کو اپنے پاس رکھا تھا مگر اچھا ہوا کہ اُس کی بربادی جلد ہوگئی۔ خانم کے کردار اور اس کے رنڈی پن کا سب سے کریہہ منظر وہ ہے جب وہ نواب چھبن سے دوشالہ کا مطالبہ کرتی ہے اور اتنے کمینہ پن سے کہ اسکی رنڈیت پوری دنائت کے ساتھ ظاہر کی جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتی کہ اس نے ہزاروں روپے ان سے حاصل کئے ہیں وہ صاف کہتی ہے کہ جب آپ کے پاس پیسہ نہیں ہے تو رنڈی کے پاس کیوں آتے ہیں۔ بیسوں ہیں چار پیسے کی

میت ہوتی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نواب چھبن نے خودکشی کر لی۔

بوا حسینی امراؤ جان ادا میں جو چھوٹے چھوٹے کردار ملتے ہیں ان میں ایک کردار بوا حسینی کا ہے۔ بوا حسینی اُس وقت سامنے آتی ہے جب امراؤ جان خریدی جاتی ہے۔ خانم کہتی ہے کہ اس بچی کے ماں باپ کا حال کیا ہوگا۔ "بیچنے والے موئے نہ جانے کہاں سے پکڑ لاتے ہیں" اس پر بوا حسینی کہتی ہے کہ "آپ پر کیا گناہ آپ تو پیسے دیکر خریدتی ہیں۔ گناہ تو ان پر ہے جو پکڑ کر لاتے ہیں"۔ یہ بات نہایت خوش آمدانہ انداز سے کہی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ بوا حسینی مکھن لگا رہی ہے۔ جیسا کہ عام نوکر اپنے مالک کی خوشنودی کے لئے باتیں کرتے ہیں۔ اسی قسم کی بات یہ بھی ہے۔ اس کے ذمہ امراؤ جان کی تربیت اور دیکھ بھال تھی جس کو اس نے بخوبی نبھایا۔ بوا حسینی امراؤ جان سے محبت کرتی تھی اور جب وہ بھاگ کر کان پور چلی گئی تو بوا حسینی گوہر مرزا کو لیکر اس کے پاس گئی اور اس وقت جبکہ بوا حسینی کے عاشق مولوی صاحب بیمار تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے دل میں وفا و خلوص کا جوہر موجود تھا۔ بہرحال بوا حسینی کے کردار میں کوئی خاص بات نہیں۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر خلیل احمد شبیر

اُردو شاعری میں انسانی المیے
۱۹۴۷ء کے بعد

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء ہمارے خوابوں کی تعبیر کا ایک اہم دن تھا۔ یہی وہ دن تھا جب سیاسی آزادی کی جدوجہد شرمندۂ تعبیر ہوئی اور ہم آزاد قوموں کی صفوں میں جا کھڑے ہوئے۔ یہ آزادی ہماری زندگی میں کئی مسائل اور کئی انقلابات لیکر رونما ہوئی۔ اب ہر فرد یہ سمجھ رہا تھا کہ اسکی زندگی سے تمام مصائب کافور ہو جائیں گے۔ علوم و فنون میں ترقی ہوگی۔ اطمینان و سکون کا دور دورہ ہوگا۔ محبت و یگانگت کے چراغ روشن ہونگے غرض انسانیت بام عروج پر ہوگی مگر آزادی کے اعلان نامہ کے بعد جو صبح ہمارے سامنے نمودار ہوئی وہ خاک و خون میں لتھڑی ہوئی تھی جو آزادی بغیر کشت و خون کے حاصل کی گئی تھی اس کا حسین دن قتل و غارت گری، لوٹ مار، آتش زنی، اغوا اور عصمت دری کے انسانیت سوز المیوں میں تبدیل ہو گیا۔ یہ انسانی تاریخ کا ایک ایسا المیہ ہے جس کی مثال آزاد قوموں کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔

آزادی کے نغموں کی جگہ انسانیت کراہ رہی تھی، معصوم بچے ماؤں کی گودوں سے چھین کر قتل کئے جا رہے تھے عورتوں کا سہاگ لٹ رہا تھا۔ بہو بیٹیوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کو اغوا کیا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا انسانیت ختم ہو چکی ہو۔ بہیمیت و بربریت کا دور لوٹ آیا ہو۔ بھائی چارہ، ہمدردی، رحم و کرم، نیک خلقی اور شرافت جیسی تمام چیزیں انسان سے چھین لی گئی ہوں۔ شہر، کوچے، قصبہ و دیہات سب ویران و تباہ ہو گئے ہوں، بازاروں کی رونق تمام ہو گئی ہو، کھیتوں کی لہلہاہٹ اور شادابی جاتی رہی ہو۔ غرض ہر طرف تباہی و بربادی کا سامان نظر آ رہا تھا۔

ہمارے حساس شعرا نے ان پُر درد اور المناک حالات کی مکمل تصویریں قلمبند کی ہیں۔ جن میں ہمارا باطن کھل کر سامنے آتا ہے اور ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم پر کیا کچھ نہیں گزرا۔ غرض ان شعراء کے کلام میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ہم نے دیکھا محسوس کیا یا ہم پر گزر گیا۔ سیماب اکبر آبادی کی زبان سے انسانیت کا یہ المیہ سنئے :-

لتھڑی ہوئی ہے خون میں آزادئ وطن — اچھے رہے وہ لوگ جو زنداں میں رہ گئے
[illegible] — صحرا سے اڑ کے آئے گلستاں میں رہ گئے

جگر مراد آبادی کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جو انسانی المیوں کے پردرد ترجمان ہیں ؎

ساز حیات ساز شکستہ ہے ان دنوں　　بزم خیال جنت ویراں ہے آجکل
دل کی جراحتوں سے کھلے ہیں چمن چمن　　اور اسکا نام فصل بہاراں ہے آجکل
ہے زخم کائنات جو ہندو ہے ان دنوں　　ہے داغ زندگی جو مسلماں ہے آجکل
کیسا خلوص کس کی محبت کہاں کا دیر　　خود زندگی متاع گریزاں ہے آجکل

جگر کا ایک قطعہ جو فسادات کے بعد لکھا گیا ملاحظہ ہو ؎

کام ادھورا اور آزادی　　نام بڑے اور تھوڑے درشن
شمع ہے لیکن دھندلی دھندلی　　سایہ ہے لیکن روشن روشن

علم ہی ٹھہرا علم کا باغی
عقل ہی نکلی عقل کی دشمن

غرض جگر نے انسانی بربریت اور وحشیانہ مظالم پر خون کے آنسو بہائے ہیں۔ ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا یا ان کے حساس دل پر ان المیوں کا جو تاثر مرتب ہوا اس کی تفصیل ان کے اشعار میں موجود ہے انھوں نے آزادی کے حصول کے بعد جو انسانیت سوز واقعات دیکھے اور جو ظلم و ستم انسانی برادری پر ہوئے ان کی ترجمانی خون دل سے کی ہے۔ جگر ہی کے کچھ اشعار اور پیش خدمت ہیں جو [illegible] ان المیوں کی بے مثال اور رلانے والی تصویریں ہیں ؎

ہمیں ملا کر بھی خاک وطن میں نہیں ہیں وہ مطمئن ابھی تک　　ہماری خاک لحد کے ذرے ہیں ان کے دامن پہ بار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے　　کہ خون مخلوق سے خدا کی زمین ہے لالہ زار اب بھی

احسان دانش نے اپنے خاص انداز میں یہ المیہ تصویریں پیش کی ہیں ؎

ہمارا ہو گیا وہ دشمن جاں کون کہتا ہے　　کبھی یک جا ہوئے ہیں کفر و ایماں کون کہتا ہے
کہیں جھلسی ہوئی شاخیں کہیں کچلی ہوئی کلیاں　　تباہی ہے اسے حسن بہاراں کون کہتا ہے
میسر ہے مجھے صبح وطن بے تو بجا لیکن　　نہیں یہ سر بسر شام غریباں کون کہتا ہے
ہے جن کا ہاتھ تخریب تمدن کی مساعی میں　　بنائیں گے یہ مستقبل کے ایواں کون کہتا ہے

خونی دور کے کچھ اور المیے حفیظ ہوشیارپوری کے یہاں ملاحظہ ہوں ؎

جنوں میں شیخ و برہمن ہیں کس قدر کامل　　ہزار قافلہ بے نشاں و بے منزل
کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے　　ہوائے لالہ و گل سے چراغ دیدہ و دل
رواں ہے قافلہ بے درا و بے مقصد　　جو دل گرفتہ ہیں راہی تو رہنما غافل

حدیثِ دردِ جگر، قتلِ عمض کچھ بھی نہیں ۔ نہ چھیڑ قصۂ مقتول و مقتل و قاتل

آزادی کے بعد بہت سی اُمیدیں دلوں میں جاگزیں تھیں لیکن بہیمیت و بربریت کے حیاسوز المیوں نے ہرکس وناکس کو نا اُمید اور غیر مطمئن بنا دیا تھا۔ ہلاکت اور تباہی کے عام مناظر سامنے تھے۔ اس کی زد میں صرف الحاد ہی نہیں آیا بلکہ علمائے بھی خون میں نہائے۔ جنہیں زہد و اتقا پر ناز تھا وہ بھی خوار ہوئے۔ ساحر کے ذیل کے اشعار اس حقیقت کے ترجمان ہیں ؎

طرب زادوں پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری ۔ دلِ زندہ ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گزری

زمیں نے خون اگلا آسمان نے آگ برسائی ۔ جب انسانوں کے دن بدلے تو انسانوں پہ کیا گزری

مرا الحاد تو خیر ایک لعنت تھا سو ہے اب تک ۔ مگر اس عالمِ وحشت میں ایمانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کون سا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا ۔ سیہ خانوں سے کچھ پوچھو شبستانوں پہ کیا گزری

انسانی المیئے یہیں ختم نہیں ہوئے بلکہ وہ آزاد مرتوں کے متلاشی جب سرحدوں کو پار کر کے اپنے خوابوں کے رنگیں ملک میں پہنچے تو انہیں وہاں جن آلام کا مقابلہ کرنا پڑا وہ بھی انسانی دنیا کا ایک بڑا المیہ ہے۔ مہاجرین کو غریب الوطنی کا احساس، فاقوں کا سنگ گراں بیماریوں کے ناگہانی حملے۔ غرض مہاجرین زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے۔ مثلاً احمد راہی کہتے ہیں ؎

کانٹوں میں دامن الجھا یا سایۂ گل بھی راس آیا ۔ ہم من مانی کر کے رہے گو لاکھ زمانے نے سمجھایا

تیرے دلکش وعدوں کا سراب گوارا کون کرے گا ۔ تو نے کس کا دکھ جھیلا ہے تو نے کس کا درد اپنایا

تجھکو ہماری بربادی کا آج بھی کچھ احساس نہیں ہے ۔ تیری ضد پر سادہ لوحوں نے اپنا سکھ چین لٹایا

تجھکو خبر کیا کتنے نغمے زخموں میں تحلیل ہوئے ہیں ۔ تجھکو خبر بھی ہو تو کیوں کر تو نے جو چاہا وہ پایا

فیض نے بھی اپنے عہد کے انسانی المیوں کی ترجمانی کی ہے۔ جنکی تصویریں آج بھی دھندلی نہیں ہوئی ہیں انسان شدائد و آلام کا مرقع ہے۔ جو صدیوں سے کشاکش اور آلام میں گرفتار ہے۔ جس کی زندگی کسی نہ کسی شکل میں ایک بڑا المیہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے ۔ آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے

موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی ہے ۔ ہم پہ کیا گزرے گی اجداد پہ کیا گزری ہے

ان دمکتے ہوئے شہروں میں فراواں مخلوق ۔ کیوں فقط مرنے کی حسرت پہ جیا کرتی ہے

یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

(باقی آئندہ)

احتشام اختر

اقبال اور غزل

غزل میں جو تازگیٔ ذہن اور ندرتِ اظہار غالب کے اثر سے پیدا ہوئی اس میں وسعت اور جامعیت پیدا کرنے کا سہرا اقبال کے سر ہے غالب نے پامال روش سے ہٹ کر ایک نئی راہ غزل کے میدان میں نکالی اور روایتی اور رسمی طرزِ اظہار کی بجائے جدید طرزِ بیان کو اپنایا اس طرح غزل کے امکانات کو غالب نے وسیع کیا اور اسے نیا رنگ و روغن عطا کیا۔ اقبال غالب سے براہِ راست متاثر ہوئے لیکن حالی سے بھی انھوں نے استفادہ ضرور کیا اور اس طرح غالب کے بعد اقبال دوسرے بڑے شاعر ہیں جنھوں نے زمینِ غزل کو آسمان بنا دیا۔

اقبال کی شروع کی غزلیں تو بہت ہی روایتی اور رسمی معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں تقلیدی رنگ نمایاں ہے۔ چنانچہ اس قسم کے اشعار ؎

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

داغ کے رنگ کو ظاہر کرتے ہیں۔ چونکہ یہ اشعار تقلیدی اور رسمی ہیں اس لئے ان میں اقبال کا منفرد لہجہ نمایاں نہیں ہوا ہے۔ لیکن اس قسم کے اشعار کہنا اقبال کے لئے ضروری بھی تھا کیوں کہ اس طرح انھوں نے غزل کی روایات کو اپنے میں جذب کیا اور یہ چیز ان کے فنی ارتقاء کے لئے بہت ضروری تھی۔ داغ کا سلسلہ ذوق سے ملتا ہے۔ چنانچہ زبان و بیان کے سلسلے میں اقبال نے ایک بہت بڑی روایت کو اپنے اندر جذب کیا غزل کی روایات کا یہ پختہ شعور آگے چل کر ان کی غزل میں تہہ داری اور رنگینی پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔

اقبال زیادہ عرصہ تک داغ کے اثر میں نہیں رہے بلکہ جلد ہی انھیں اس کا احساس ہو گیا کہ کسی کی تقلید سے انفرادیت ختم ہو جاتی ہے چنانچہ جلد ہی وہ روایتی غزل سے منحرف ہو گئے دورِ اول کی آخری غزل کا شعر اس کا غماز ہے ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اب انھیں احساس ہو گیا کہ تقلید کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ خودکشی کر لی جائے کیونکہ تقلید کرنے والا اپنی اپنی پہچان (IDENTITY) کھو بیٹھتا ہے۔ پھر چونکہ اقبال شروع ہی سے ایک غیر معمولی ذہن رکھتے تھے اس لئے انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کی صلاحیتوں کو اس طرح زنگ لگ جائے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ ان کے ہاں کشادگیٔ نظر اور وسعتِ فکر

ان کے یورپ جانے کے بعد پیدا ہوئی اور اس سلسلہ میں بعض نقاد سر عبد القادر اور پروفیسر آرنلڈ کے مشوروں کو بھی اہم قرار دیتے ہیں لیکن فتح محمد ملک کی رائے ہے۔

" اقبال یورپ روانہ ہونے سے پیشتر ہی رسمی اور تقلیدی شاعری ترک کر چکے تھے جس نے بزم سخن کو بزم ماتم بنا رکھا تھا۔"

فتح محمد ملک کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے کیونکہ اقبال کا ذہنی ارتقاء تو ہندوستان میں ہی شروع ہو گیا تھا یورپ کا سفر ان کے ذہنی ارتقاء کی ایک کڑی تو ہو سکتا ہے لیکن پوری تعمیر یا مکمل سلسلہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ اقبال مغرب کی روشنیٔ علم کی بہ نسبت مشرقی روایات اور مشرقی علوم و فنون سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں اسی لئے انھیں انسان کی بقا اور اس کی عافیت کا راز مغرب کی مادیت کی بجائے اسلامی روحانیت میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ حدیثِ دلبری کو صحیفۂ کائنات سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ بتانا مقصود ہے کہ اقبال کا ذہنی اور فنی ارتقاء ہندوستان میں ہی شروع ہو گیا تھا اور "بال جبریل" تک آتے آتے ان کے ـــــ فن میں تہہ داری اور پختگی پیدا ہو گئی تھی اور اب ان کا منفرد اسلوب بن گیا تھا۔ چنانچہ اقبال کی غزلوں کا فنی تجزیہ کرتے وقت "بالِ جبریل" کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہ مجموعہ اقبال کی شاعری کی معراج ہے۔

اقبال نے غزل کو ایک نیا لہجہ ایک نیا آہنگ عطا کیا۔ غزل میں یہ لب و لہجہ اقبال سے پہلے نہیں ملتا انھوں نے غزل کے کینوس کو وسیع کیا اور اسے فرش کی بجائے عرش کی چیز بنا دیا۔ غزل میں انھوں نے وقار جلالی اور آفاقیت پیدا کی " غزل صرف حسن و عشق کی رسمی باتوں کے اظہار اور عورتوں سے باتیں کرنے یا عورتوں کی باتیں کرنے کا نام ہے" اس مفروضے پر اقبال نے ضرب لگائی اور اسے ہر طرح کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا غزل کو انھوں نے قومی ملی بین الاقوامی اور مذہبی افکار و کوائف کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اقبال سے پہلے اتنے وسیع پیمانے پر غزل کو استعمال نہیں کیا گیا۔ موضوعات کی وسعت نے غزل میں تنوع تہہ داری اور تمکنت پیدا کی اقبال نے غزل میں ایک مخصوص اور منفرد اسلوب پیدا کیا جو ان کی شاعری کی بنیادی پہچان ہے ۔ مثلاً

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا ۔ میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں ۔ کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم ۔ اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ۔ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں ۔ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

اقبال سے پہلے ہمیں غالب کے ہاں تفلسف ملتا ہے لیکن غالب کے فلسفے میں بقول

ڈاکٹر عبداللطیف کے روحانی ہم آہنگی اور مربوط فلسفۂ فکر کی کمی ہے۔ اقبال کے ہاں مربوط اور منظم فکر ملتی ہے اس فکر میں اسلامی نظریات کو کافی دخل ہے۔ ادیب کا کسی نظریہ سے وابستہ ہونا برا نہیں لیکن فکر جب تک جذبہ نہیں بنتی ادب پارہ یا فن پارہ نہیں بن سکتی۔ اقبال نے نظریہ کو نظر بنایا اور اس طرح اسے ادب پارہ بنایا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔ اقبال حکمت میں سوز و تپش کو ضروری سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ صرف فکر کو ہی نہیں بلکہ جذبہ کو بھی اہمیت دیتے ہیں ویسے بھی ان کے اسلامی نظریات عقلیت سے زیادہ عقیدے پر مبنی ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں میں قلندرانہ شان ملتی ہے ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں　　　　ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں گردش خون ہے اگر تو کیا حاصل　　　　حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں
علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا　　　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر　　　　مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

اقبال کا فلسفہ فلسفۂ تصوف سے مختلف ہے تصوف انسان کی خودی کی نفی کرتا ہے وہاں تو قطرہ کا دریا میں فنا ہو جانا ہی قطرے کی معراج ہے لیکن اقبال اس کے قائل نہیں وہ خودی کا تحفظ ضروری سمجھتے ہیں بلکہ خودی کو ہی انسان کا وقار اور اس کی آب سمجھتے ہیں اس طرح فرد کی آزادی کا تصور اقبال کے ہاں ملتا ہے اور یہ چیز جدید غزل پر بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ جدید غزل سے پہلے ترقی پسندوں نے اپنے مسلک اور مشن کی ترویج و اشاعت کے لئے اقبال کے نظریۂ خودی سے اثر قبول کیا اور اس کی اپنے طور پر تشریح و توضیح کی۔ اس خودی کے سلسلہ میں اقبال کے ہاں ایک قسم کی اکڑ اور انانیت بھی ملتی ہے یہ انانیت یگانہ کی انانیت سے مختلف ہے یگانہ کے ہاں جھلاہٹ اور خفگی ہے اور غم و غصے کا انداز ہے یگانہ کی انانیت ان کے احساس کمتری کا نتیجہ ہے اور اقبال کی انانیت ان کے مغرب و مشرق کے وسیع مطالعے اور مشاہدہ کا نتیجہ ہے یگانہ کے ہاں کھرا لہجہ ملتا ہے اور تو تکار کا انداز بھی پایا جاتا ہے یہ انداز اقبال کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن اقبال کے لہجے میں صلابت ہے قطعیت اور تمکنت ہے۔ یہ آواز اقبال سے پہلے ہمیں غزل میں سنائی نہیں دیتی ؎

گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ　　　　گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں
خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے
عالم آب و خاک و باد سر عیاں ہے تو کہ میں　　　　وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں
میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں　　　　غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں
نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے　　　　جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک　　ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کیلئے

اس لب و لہجے نے غزل کے فن کو نقصان بھی پہنچایا۔ چنانچہ اس طرح خطابت کا انداز غزل میں پیدا ہو گیا۔ غزل کی بنیادی خصوصیت رمزیت اور ایمائیت ہے اور خطابت اس سے محروم ہے غزل بالواسطہ اظہار کو پسند کرتی ہے اور خطابت بلاواسطہ اظہار کو۔ چنانچہ جہاں جہاں اقبال نے ناصحانہ انداز اختیار کیا ہے اور بلاواسطہ اظہار سے کام لیا ہے وہاں غزل کا حسن ماند پڑ گیا ہے ؎

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے　　کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں　　تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اقبال کے بلاواسطہ طرزِ اظہار سے ان کی غزلوں میں نظم کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ کلیم الدین احمد نے غزل پر ریزہ خیالی کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ اقبال کی مسلسل غزلوں میں ریزہ خیالی نہیں ہے لیکن غزل کا تسلسل غزل کی خوبی کی بجائے خامی ہے غزل میں نظم کی فضاء پیدا کرنا غزل کی انفرادیت کو مجروح کرنے کے مترادف ہے۔ بقول فراق گورکھپوری، ۔

" اقبال نے غزل کے تمام اشاروں اور علامتوں کو توڑ لیا لیکن غزل کو اتنا مقصدی بنا دیا کہ ہم یہ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اسے غزل کہیں یا نظم "

اس طرف دوسرے نقادوں نے بھی اشارہ کیا ہے چنانچہ سرور صاحب اور وزیر آغا نے لکھا ہے کہ اقبال کے بلاواسطہ طرزِ اظہار اور نظم کی فضا پیدا کرنے سے غزل کا لوچ اور لطافت کم ہو گئی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ اشعار غزل سے زیادہ نظم کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں صحیح ہے کہ غزل میں قطعہ بند اشعار ملتے ہیں لیکن ان میں ایمائیت اور رمزیت ضرور ہوتی ہے دراصل اس میں اقبال کا قصور نہیں ہے بلکہ ان کے مخصوص نظریے کی وجہ سے ان کی غزل میں کہیں کہیں بوجھل پن پیدا ہو گیا ہے۔ وزیر آغا نے صحیح لکھا ہے ؎

" اقبال نے غزل کو ایک مخصوص فلسفۂ حیات اور انداز نظر کے لئے استعمال کرنے کی کوشش کی تو اس سے غزل کا لوچ دھیمے لے اور سرگوشی میں بات کرنے کا انداز قایم نہ رہ سکا "

اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے غزل میں ایک مخصوص نظریہ پیدا کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پرانی تلمیحات اور تشبیہات و استعارات کو نئی معنویت عطا کی اور نئے الفاظ اور نئے استعاروں کو

دریافت کیا۔ چنانچہ تیغ ہلال کنجشک شاہیں شاہبازہ آتش رومی صور اسرافیل اور تاجران افرنگ جیسے استعاروں کو دریافت کیا اور انھیں معنی پہنائے ہے

کرہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشادِ شرق و غرب — تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گذر

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

تازہ پھر دانش حاضر نے کیا سحر قدیم — گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوب کلیم

اقبال کے ہاں حسن و عشق کا تصور نہیں ملتا یہ کہنا غلط ہو گا۔ اقبال کے تصورِ عشق میں جامعیت ہے ان کے ہاں جنسی محبت کا اکہرا پن نہیں ہے۔ ان کا عشق بندے کو خدا کا ہمسر بناتا ہے اور حسن مطلق کے آگے سر بہ سجدہ ہونے کا شوق بھی پیدا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اقبال کا تصور عشق آفاقی ہے۔ ان کے اس تصور میں خالص تغزل بھی ملتا ہے۔ لیکن اقبال نے جنسی پہلوؤں سے گریز بھی کیا ہے۔ وزیر آغا کا کہنا صحیح ہے کہ اقبال نے حسن و عشق کے تجریدی رنگ کو اپنایا ہے ہے

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق — عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

نقطہ نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا — نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذرا سی آبجو — یا مجھے ہم کنار کر یا مجھے بے کنار کر

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

اقبال الفاظ کی نشست اور ان کے دروبست سے ایک خاص صوتی آہنگ پیدا کرتے ہیں اس سلسلہ میں وہ فارسی کی ادق تراکیب بھی استعمال کرتے ہیں لیکن یہ تراکیب بوجھل اور ثقیل معلوم نہیں ہوتیں بلکہ ان کے آہنگ میں غنائیت ملتی ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں پروقار اور پیغمبرانہ انداز ملتا ہے جس میں آبشاروں کے نغموں کا جلال ہوتا ہے ہے

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی — مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی

نگاہ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے — شکار مردہ سزاوار شاہباز نہیں

اک اضطراب مسلسل غیاب ہو کہ حضور — میں خود کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

[illegible] ایمائیت کی طرح غنائیت بھی غزل کی ایک خصوصیت ہے اور اس اعتبار سے

اقبال کے ہاں بڑا رچاؤ پایا جاتا ہے۔ ان غزلوں میں نغمگی کا ایک عملی ثبوت یہ ہے کہ ان کی غزلیں قوالوں نے بھی گائی ہیں اور فلم میں بھی ریکارڈ کی گئی ہیں بعض مصرعے اپنی غنائیت کی وجہ سے زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں لیکن اقبال کی غزلوں کا غنائی پہلو بنیادی چیز نہیں ہے بلکہ ضمنی ہے اور بنیادی خصوصیت ان کے اظہار کی ندرت اور خیال کی طرفگی اور پاکیزگی ہے فکر کا جذبہ بننا مشکل ہوتا ہے اور اسی لئے فکر کو فن بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ فکر ذہن و دل میں رچ بس جائے۔ چنانچہ کسی نظریہ سے ایمان اور عقیدے کی حد تک لگاؤ پیدا نہ ہو جائے اور وہ جب تک ذاتی احساس نہ بن جائے فن پارہ نہیں بن سکتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کا نظریہ ان کا ایمان بن گیا تھا۔ اقبال کی غزلوں کی اس اعتبار سے یقیناً اہمیت ہے کہ معاملہ بندی چھیڑ چھاڑ اور الفاظ اور محاوروں کی الٹ پھیر اور بازی گری جیسی بدعتیں غزل میں ہونے کے باوجود انھوں نے ایک نئی اور منفرد آواز پیدا کی۔ اس آواز کے منفرد ہونے میں ان کے نظریے یا عقیدے کو بھی دخل ہے۔

ادب میں فلسفہ کی کارفرمائی بری نہیں چنانچہ ہمارے ہاں غزل میں تصوف کا عمل دخل شروع سے ہی رہا ہے لیکن فلسفہ جب وردِ زبان بن جائے گا اور تسبیح کی طرح ہمیشہ ہاتھ میں رہے گا تو وہ اپنی تازگی اور رعنائی کھو بیٹھے گا۔ ہمیں یہ چیز اقبال کے ہاں بھی شاق گزرتی ہے کہ ان کی غزلوں میں جگہ جگہ ایک ہی خیال یا ایک ہی نظریے کا اعادہ اور تکرار ملتی ہے۔ چنانچہ شاہین کا استعارہ جھپٹنے پلٹنے اور برتری ظاہر کرنے کیلئے اتنی بار استعمال ہوا ہے کہ بعض اوقات یہ استعارہ بے معنی نظر آنے لگتا ہے اسی طرح لا الہ اور کن فیکون جیسے اسلامی مسلمات کا اتنی بار اعادہ ہوا ہے کہ غزل کے اشعار بجائے شعر ہونے کے قرآن مجید کی آیتیں نظر آتی ہیں۔ در اصل غزل میں اس قسم کی انتہا پسندی اقبال کے راسخ العقیدہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے چنانچہ اس قسم کے اشعار بہت سپاٹ نظر آتے ہیں۔

کفر و الحاد شرک، بدعت اور اسرار معرفت کا اظہار اصغر کے ہاں بھی ہوا ہے لیکن اصغر اس کے لئے بلاواسطہ اظہار پسند نہیں کرتے اور نہ ہی عربی کی پوری پوری آیتیں نقل کرتے ہیں چنانچہ ان کے بعض اشعار باوجود متصوفانہ خیالات کے حامل ہونے کے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں اور بالواسطہ اظہار کی وجہ سے جامع اور تہہ دار ہو گئے ہیں اور اس طرح غزل کی رمزیت بھی برقرار رہی ہے چنانچہ [illegible]

نمودِ جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

نظر وہ ہے جو اس کون و مکاں کے پار ہو جائے — مگر جب روئے تاباں پر پڑے بیکار ہو جائے

غزل کے خوبصورت شعر ہیں اور بظاہر کسی خاص فلسفے یا نظریہ سے متعلق معلوم نہیں ہوتے چنانچہ

ان کی ہر طرح توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ اقبال کے کلام میں بھی یہ خصوصیت ضرور ہے لیکن اکثر جگہ اقبال کے ہاتھ سے احتیاط کا دامن چھوٹ گیا ہے اور وہ مولانا روم کے اس قول پر کاربند ہونا بھول گئے ہیں

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں   گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اقبال کے ہاں کورا فلسفہ ہے اور اسی کی تکرار جگہ جگہ ہوئی ہے۔ بلکہ ان کی غزلوں میں ہمیں ذوقِ نظر بھی ملتا ہے ذوقِ نظر ہر چیز میں حسن تلاش کرنے کا نام ہے اور یہ تڑپ اقبال کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ اقبال مفکر تو تھے ہی لیکن ایک حساس شاعر بھی تھے چنانچہ ان شاعری کا احساسی پہلو ان کے فلسفہ کو زیادہ روشن اور تابناک بنا دیتا ہے۔ ان کا ذوقِ نظر جب ذوقِ حکمت سے ہم آہنگ ہو گیا ہے تو وہاں اس میں بڑا تنوع پیدا ہو گیا ہے ؎

ناصبوری ہے زندگی دل کی   آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو   کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

بنایا عشق نے دریائے ناپیدا کراں مجھکو   یہ میری خود نگہداری مرا ساحل نہ بن جائے

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے پیمانے   یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ "اردو شاعری کا دین اقبال پر کمل ہو گیا" اس میں ممکن ہے رشید صاحب نے مبالغہ سے کام لیا ہو لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ غالب کے بعد اقبال اردو کا دوسرا سب سے بڑا شاعر ہے جس نے نہ صرف اپنے عہد کو متاثر کیا بلکہ آئندہ نسلوں کے متاثر ہونے کا سامان بھی چھوڑ گیا۔ عموماً اردو کے تین بڑے شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ غالب، اقبال اور انیس۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی عظمت مسلم ہے اس کی عظمت کا اعتراف اس کے مخالفوں نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ ترقی پسندوں نے اقبال کی مخالفت کی اور اسے فسطائی اور قنوطی ذہنیت کا شاعر ظاہر کیا لیکن اسی کے کلام سے خوشہ چینی بھی کی چنانچہ ترقی پسند شاعری کا رجائی اور [illegible] انداز اقبال کی شاعری سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔ جدید غزل نے بھی اقبال سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ فرد کی سالمیت اور اس کی بقا کیلئے جدید غزل نے اقبال کے فلسفۂ خودی سے کسبِ نور کیا ہے کیونکہ اس فلسفۂ خودی کا سلسلہ وجودیت سے بھی ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تشبیہات و استعارات سے بھی جدید غزل متاثر ہوئی ہے لیکن ان سب چیزوں کو اس نے اپنے طور پر قبول کیا ہے۔ چنانچہ اس اعتبار سے غالب کی غزل اور حالی کی تنقیدِ غزل کے مطالعہ کے بعد اقبال کی غزلوں کا تنقیدی مطالعہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے۔

مفتوں کوٹوی

جگر مرحوم کی وطن پرستی

جگر مرحوم کے جذبات و تاثرات کی شدت سے جہاں انکار ممکن نہیں وہاں ان کے خلوص و صداقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا، ظاہر و باطن کی یکسانیت نے انھیں ایک ایسا عظیم المرتبت انسان بنا دیا تھا جس کی مثال آج کی دنیا میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ وہ بڑے خود دار اور بے باک انسان تھے، جیسا کچھ وہ محسوس کرتے تھے، جو کچھ وہ سوچتے تھے اسے بہ انداز بے باکانہ بے کم و بیش ظاہر کردیا کرتے تھے اور اس میں انھیں کوئی چیز مانع نہ آتی تھی، نہ کسی کی امارت و سیاست نہ کسی کا وقار و اقتدار۔ وطن دوستی کا اظہار ہندوستان میں ہی نہیں، ہندوستان سے باہر پاکستان میں بھی کیا جاتا رہا وہاں فرمائش کے باوجود اس نظم کے سنانے سے انھوں نے انکار کردیا جس میں ارباب وطن کی خامیوں کا اظہار کیا گیا تھا اور ملک کے انقلابی ہنگاموں کا تذکرہ تھا، صاف کہدیا گیا کہ یہ نظم ہندوستان والے، ہندوستان کے اندر سن سکتے ہیں وہاں اس نظم کے سننے سنانے کا مطلب غیر ملکیوں کے سامنے اپنے وطن کی اہانت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا اور یہ جگر کو کسی صورت میں بھی گوارا نہ تھا، پاکستان کے مشاعرہ میں مقامی شاعر کی اس نظم کے خلاف جس میں جہاد کے لئے کشمیر چلنے کی ترغیب و دعوت دی گئی تھی، اس کا برسر مشاعرہ احتجاج کرنا اور اس مشاعرہ سے اٹھ کر چلا جانا ان کی وطن پرستی کا ایک بین ثبوت تھا۔ خیالی طور پر فعل کتنا ہی حسین و خوشگوار سہی، عملی طور پر ایک ایسے شخص کی جانب سے اس کا مظاہرہ جو مشاعرہ میں نمایاں حیثیت و ممتاز شخصیت رکھتا تھا، اور معزز مہمان کے بہ طور مدعو تھا، بڑے زبردست کردار کا مظہر ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جگر کے دل میں اپنے وطن کی محبت و عظمت کس شدت و خلوص کے ساتھ جاگزیں تھی۔ پاکستان میں ان کے کئی محبوب ترین دوست موجود تھے، عزیز تھے، وہاں کے ارباب حل و عقد ان کے لئے چشم براہ تھے۔ جگر مرحوم کے سامنے کئی مثالیں ایسی تھیں کہ ترک وطن کر کے لوگ وہاں چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے، نہ کسی کو شکوہ نہ کسی کو شکایت، تاہم انھوں نے خاک وطن کو ملک سلیماں سے خوشتر ہی سمجھا۔ پاکستان میں "سواد ساحل گنگا" و "گلگشت چمن" کہاں میسر آسکتی تھی، لہٰذا بقیہ زندگی انھوں نے یہیں بسر کی اور بس ہندوستان جنت نشان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

خلوص و صداقت کی اثر اندازیاں رنگ لائے بغیر نہیں رہتیں۔ ارباب حکومت نے ان کی وطن پرستی پر نہ کبھی شک کیا نہ انھیں کوئی شک کا موقع مل سکا اگرچہ وہ اپنی بے باک طبیعت کے تحت حکومت کی

خامیوں اور بدنظمیوں کی طرف اپنی نظموں میں اہلِ حکومت کو توجہ دلاتے رہتے تھے۔ ان کا آخری مجموعہ "آتشِ گل" چھپا پاکستان میں اور قدر افزائیوں کی بہاریں لایا ہندوستان میں ۔ اس مجموعہ میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن کی جانب اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی نے ۱۹۵۸ء میں پانچ ہزار کا انعام ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء ۱۹۵۷ء کی بہترین اردو کتاب مانتے ہوئے' انھیں دیا' حکومت نے انھیں علمی وظیفہ بھی دیا' اور اب وہ وظیفہ ان کی بیوہ کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ علاج کے لئے انھیں مالی امداد دی گئی۔ وطن دوستی کے جذبۂ پر خلوص کی قدر و قیمت ان شاعر سے صاف واضح ہے۔

اگرچہ وہ شہنشاہِ غزل تھے' یعنی محض غزل گو شاعر تھے' وہ غزل' حسن و عشق کے معاملات جس کی روح ہیں اور جس کی رونق انھیں تاب ناکیوں سے ہے' لیکن وہ گرد و پیش کے حالات سے بے خبر اور اپنے ماحول سے بے پروا ہو کر گذرنے والے انسانوں میں سے نہیں تھے' اسی زمین پر رہتے تھے' اس زمین کے حادثات و واقعات سے متاثر کیوں نہ ہوتے' جب کہ وہ فطری شاعر تھے' حساس طبیعت اور دردِ انسانی سے لبریز دل رکھتے تھے جذبۂ وطن پرستی کے تحت انھوں نے جہاں جہاں اس کی خلاف ورزیاں پائیں یا اس جذبہ میں جہاں انھیں عناد و نفاق اور فتنہ و شر کی برائی وہ فوراً ٹوک بیٹھے۔ ایسے انسان نما درندوں اور دوست نما دشمنوں کی نقاب کشائی وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

ہندوستاں میں خیر سے ان کی کمی نہیں — لب پر ہیں جو خلوص کا دفتر لئے ہوئے
دیتے ہیں بات بات پر انسانیت کا درس — دل میں ہزار دشنہ و نشتر لئے ہوئے
چہرے جنونِ حبِّ وطن سے دھواں دھواں — سینے غبارِ کلفتوں کا سمندر لئے ہوئے
ظاہر میں اک مجسمۂ امن و آشتی — باطن میں لاکھ فتنۂ محشر لئے ہوئے
کہتے ہیں بھائی بھائی ہیں اہلِ وطن تمام — پھرتے ہیں آستینوں میں خنجر لئے ہوئے

اسی طرح ایک دوسری نظم کے چند اشعار ہیں :-

زبانوں پہ اصلاحِ قومی کے نعرے — مگر نیتیں بیشتر مفسدانہ
غریبوں پہ جو کچھ گذرتی ہے گذرے — سمٹ آئے جیبوں میں لیکن خزانہ
مجسم خود اک پیکرِ مادیت — مگر درسِ روحانیت عارفانہ

یہ اشعار ایسے آئینے ہیں جن میں اگر ہمارے اربابِ وطن صدقِ دل اور ایمان داری سے اپنے چہرے دیکھیں تو ان میں سے اکثر ویسے نظر نہیں آئیں گے۔ جو دنیا انھیں سمجھے ہوئے ہے' یا جیسا وہ دنیا کو ظاہر کرانا چاہتے ہیں۔ حقیقت میں ایسے منافق اور گندم نما جو فروش انسان عالمِ انسانیت پر بار ہیں۔ ایسی زندگی سے

خودکشی ہی بہتر ہے ؎

یہی ہے زندگی تو زندگی سے خودکشی اچھی کہ انساں، عالمِ انسانیت پر بار ہو جائے

وطن پرستی کے سلسلہ میں جناب جگر نے یہ شعر بھی خوب کہا ہے ؎

بہ شکلِ ناخدا جس بزم میں اب تک جعفر و صادق وہ کشتی غرق ہو جائے تو بیڑا پار ہو جائے

اربابِ وطن پر وہ جب غیر ملکی حکومت کے مظالم دیکھتے ہیں تو بے اختیار تڑپ اٹھتے ہیں۔ غزل کہہ رہے ہیں لیکن مقطع میں بے قرار ہو کر فرما ہی بیٹھے ؎

حکومت کے مظالم جب سے ان آنکھوں نے دیکھے ہیں جگرؔ ہم بمبئی کو کربلا قاتل سمجھتے ہیں

اربابِ وطن کو جب خاک و خون میں لتھڑا ہوا دیکھتے ہیں تو ان کا جذبۂ وطن پرستی بھڑک اٹھتا ہے، وہ بے قرار ہو جاتے ہیں، دیکھیے ان اشعار کا کیا جواب ہو سکتا ہے ؎

چشم کشا و جانبِ رزم گہ وطن نگر مقتل کا بنور بیں، لاشۂ بے کفن نگر
خونِ حیات سو بہ سو، خاک سرشتہ مو بہ مو حلق بریدہ کو بہ کو، بچہ و مرد و زن نگر
بر تنِ حسنِ نازنیں آہ ز فرق تا قدم زخم شفق شفق ببیں داغ چمن چمن نگر
طفل و جوان و پیر را صف بہ صف بہم بہم دست جدا ز ساعد و فرق جدا ز تن نگر
بچہ شیر خوار را پیش نگاہ مادرش چاک ز سینہ تا کمر کشتہ و بے کفن نگر
باز بیا بہ آگرہ و جلوۂ خوں نظارہ کن باز برو بہ کاشمر، کشتن و سوختن نگر
ہائے از ایں گزندگاں وائے ازیں درندگاں ہند و بہار ہند را بسمل و خستہ تن نگر

بہت طویل نظم ہے جو شاعرانہ اندازِ بیان کے ساتھ وطن پرستی کے تمام احساسات و جذبات سے لبریز ہے واقعات و حادثات کے جزوی جزوی بیانات اگرچہ شاعرانہ مشاہدات اور واردات قلبی کے تحت ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ لیکن انھیں سے شاعر کی وطن پرستی اور وطن دوستی کے بلند معیار اور خود اس کے اعلیٰ وقار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے" قحط بنگال" میں بھی یہی جذبہ بڑے شدت خلوص کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے ؎

افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ بے گور و کفن خاک بہ سر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا، وہ سسکنا ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں
بے مہری و بے دردی و افلاس و غلامی ہے شامتِ اعمال جدھر دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

اور پھر اس نظم کا انجام جس تابناک امید پر ختم ہوا وہ بھی جذبۂ وطن پرستی کا ایک درخشاں عنوان ہے ؎
[illegible] ہیں

ارباب وطن کو ہری جانب سے ہو مژدہ — اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیّرِ تاباں — ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
بیداری و آزادی و اخلاص و محبت — اک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں

"آج کل" کے عنوان سے جو طویل نظم مجموعہ میں شامل ہے، اس میں بھی وقتی حالات ملکی انتشار اور ماحول کی ابتری کا نقشہ بہترین انداز میں کھینچا گیا ہے، اس سوزِ قلبی کے ساتھ جو ایک مخلص وطن پرست شاعر سے ہی ممکن ہے ؎

سازِ حیات، سازِ شکستہ ہے ان دنوں — بزمِ خیال جنت ویراں ہے آج کل
آنکھیں تمام مشہدِ عشق و جمال ہیں — سینہ تمام گنجِ شہیداں ہے آج کل
دل کی جراحتوں کے کھلے ہیں چمن چمن — اور اس کا نام فصلِ بہاراں ہے آج کل
کیسا خلوص، کس کی محبت، کہاں کا درد — خود زندگی متاعِ گریزاں ہے آج کل
سازش، دغا، فریب، سخن پروری، دروغ — ہر درد کا یہ نسخۂ آساں ہے آج کل
وہ قومیت کہ جس سے ہے انسانیت ذلیل — ہندوستاں میں کس قدر ارزاں ہے آج کل
دہلی و دہرہ دون نواکھالی و بہار — انساں ہے اور ماتمِ انساں ہے آج کل
مقدار ایک فرقے کی جتنی بھی گھٹ سکے — کارِ ثواب و کارِ نمایاں ہے آج کل
کانٹے کسی کے حق میں کسی کو گل و ثمر — کیا خوب اہتمامِ گلستاں ہے آج کل

اس نظم کے آخر میں شعر میں جو بعض طعن کی تندی و تیزی، جذبات و تاثرات کی تلخی و ناگواری لب و لہجہ کی جھلاہٹ اور بیزاری موجود ہے اس سے شاعر کے ان وارداتِ قلبی کا اندازہ لگائیے، جو اس وقت وطن دوستی کے تحت اسے بے قرار و مضطرب کئے ہوئے تھے ؎

اس سے تو خودکشی ہی غنیمت ہے اے جگر — وہ سلطنت جو پیشۂ مرداں ہے آج کل

آزادی کے بعد ملک کے حالات نے جو خونیں رخ اختیار کیا وہ حساس طبیعتوں کے لئے آسانی سے گذر جانے والی چیز نہ تھی، ملک کا ہر شاعر کم و بیش اس سے متاثر ہوا ہے، ہر خیر خواہ وطن اور ہر پرستارِ ملک ان واقعات پر خون کے آنسو بہا رہا ہے۔ اس وحشت و بربریت پر لعن طعن کر رہا ہے۔ آزادیٔ وطن کو ایک سال گذر چکا ہے لیکن فضا اب تک بھی اربابِ وطن کے لئے سازگار نہیں ہو سکی ہے۔ اس موقع پر ہمارے حساس شاعر نے ایک لمبی طویل نظم حوالۂ قلم کی ہے۔ کچھ اشعار اس کے بھی ملاحظہ کیجئے ؎

اگرچہ آزادیٔ وطن کو گذر چکا ایک سال کامل — مگر خود اہلِ وطن کے ہاتھوں فضا ہے ناسازگار اب بھی
اسی کا ہے نام اگر ترقی تو اس ترقی سے باز آئے — کہ خونِ مخلوق سے خدا کی زمیں ہے لالہ زار اب بھی

نہ وہ مروت نہ وہ صداقت نہ وہ محبت نہ وہ شرافت زہینِ خوف و خطر ہیں یعنی سکون و امن و قرار اب بھی
زبان و دل سے نہ ربط صادق نہ باہمی وہ خلوص کامل جو تھے غلامانہ زندگی میں وہی ہیں لیل و نہار اب بھی

جشنِ نظامِ نو منایا جا رہا ہے لیکن ہمارے بے باک شاعر کے دل میں وطنی خلفشار کے تحت آگ بھڑک رہی ہے، یہی وطن پرستی کا جذبہ ہے جس کے تحت وہ پکار پکار کر بے باکانہ کہہ رہا ہے کہ ؎

جو محو جشنِ نظامِ نو ہیں پکار کر ان سے کہہ رہا ہوں یہ جان ہے سوگوار اب بھی یہ دل ہے ماتم گسار اب بھی
غلط یہ جمہوریت کے دعوے، دروغ یہ زندگی کے نقشے دلیل اس کی یہی ہے کافی کہ ذہن ہے تنگ و تار اب بھی
یہ جشنِ آزادیٔ وطن ہے مگر اسی جشن و سرخوشی میں بہت ہیں سینہ فگار اب بھی بہت ہیں بے روزگار اب بھی

حقیقت و صداقت سے اب تک گریز کیا جا رہا ہے، ذہن ابھی تک تنگ و تار ہیں طبیعت کی یہ کراہن، شکووں کی یہ تلخی۔ شکایت کا یہ تیکھا پن، شاعر کو منصب شاعرانہ سے ہٹا نہیں سکا ہے، چونکہ شکایت اپنوں سے ہی ہے۔ اس لئے محض شکایت و شکوہ پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے۔ اس تلخ و ناگوار انداز بیان کے ساتھ دکھوں، شکووں اور شکایتوں کا مداوا بھی خود ہی پیش کیا جا رہا ہے ؎

وسیع مسلک و وسیع فطرت، خلوص ایماں، خلوص نیت انھیں فضائل پہ ہے وطن کے وقار کا انحصار اب بھی
خلوص نیت سے صرف اپنی ہی زندگی پہ کریں اگر توجہ خلوص نیت کی منتظر ہے سعادت کردگار اب بھی

خلوص و صداقت اگر ارباب وطن میں پیدا ہو جائے اور ؎ چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی
تو ؎ چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی۔

اس امر کی وضاحت کے لئے یہ شکایت محض دوستانہ ہے، اور اس میں اپنوں ہی کو اصلاح پر لانے کی دوستانہ کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے، اس نظم کے اخیر کا شعر قابل توجہ ہے، جس میں شاعر کے شعار حیات پر بھی روشنی پڑتی ہے ؎

جگر کی ہے زندگی محبت، نہیں ہے اس کو کسی سے نفرت جگر کے دل میں ہے سب کی عزت جگر ہے یاروں کا یار اب بھی

حقیقت فی الواقع یہی ہے کہ اپنوں سے شکایت، اپنی حکومت سے حقوق طلبی ارباب حل و اقتدار کی خامیوں کی نشان دہی جہاں خود کی زندگی بیداری، جرأت اور خودداری کی آئینہ دار ہے وہاں اس حب الوطنی اور صدق نیتی کی بھی مظہر ہے جس کے تحت ایک وطن پرست اپنے باغ میں ہر طرف بہار جاوداں دیکھنا چاہتا ہے اور ہر اس تند و تیز جھونکے پر چیں بہ جبیں ہوتا ہے جو گلشن کے نازک پھولوں کی افسردگی و پژمردگی کا باعث ہو سکتا ہے

جشن جمہوریت منایا جا رہا ہے۔ ملک کے بڑے بڑے لیڈر تشریف فرما ہیں وہ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں میں

اب عنان حکومت آگئی ہے۔ وہ بھی ہیں جو ابھی ابھی ملک کا دستور بنا چکے ہیں اور عوام کے جمہوری حقوق مان چکے ہیں، اعلان جمہوریت کا یہ جشن اس شان و شوکت کا حامل ہے۔ اپنی نظیر آپ ہے ہمارا شاعر اس موقع پر جس انداز سے ترنم ریز ہے اس کے لب و لہجہ طرز اور تحریر کو ملاحظہ کیجئے۔ الفاظ سے باطنی کیفیات کا سراغ لگائیے، اور شاعر کا حقیقی منصب و مقام معلوم کر کے اس کے جذبات وطن دوستی کی داد دیجئے ؎

خدا کرے کہ یہ دستور سازگار آئے		جو بے قرار ہیں اب تک انھیں قرار آئے
وہ سرخوشی ہو کہ خود سرخوشی بھی رقص کرے		وہ زندگی ہو کہ خود زندگی کو پیار آئے

یہ دعائیہ کلمات ہیں اور آمین میں ہم سب آج بھی شامل ہیں لیکن ساتھ ہی یہ یاد دہانی اور نشان دہی، شکوہ کی جرأت و بے باکی بھی قابل غور ہے ؎

چمن چمن ہی نہیں جس کے گوشہ گوشہ میں		کہیں بہار نہ آئے۔ کہیں بہار آئے
یہ میکدہ کی یہ ساقی گری کی ہے توہین		کوئی ہو جام بکف کوئی شرمسار آئے
خلوص و ہمت اہل چمن پہ ہے موقوف		کہ شاخ خشک میں بھی پھر سے برگ و بار آئے

یہ کیونکر ممکن ہے اور اسکا طریق کار کیا ہے ساتھ ہی اس کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے کہ ؎

جنون عشق ہو حالم اگر تو ممکن ہے		کہ پھر سے اجڑے گلستاں میں بھی بہار آئے

دستور سازوں سے ایک حساس طبیعت وطن پرست، شاعرانہ انداز میں پند و نصیحت کر رہا ہے یہاں شاعر کے مقام و منصب کو بھی پہچانئے اور اس کی بلندی و عظمت کو بھی۔ کیا ٹھوک بجا کر بات کہی ہے ؎

خلوص و عدل و مساوات دل میں گھر کر لیں		نہ یہ کہ ذکر زباں پر ہی بار بار آئے

کاغذی دستور سازی سے کیا ہوتا ہے زبان کی تسلی و تشفی سے کیا بنتا ہے، جب تک عمل و کردار اسکی ہم نوائی نہ کریں، کتنا جچا تلا شعر ہے ؎

زباں و دل میں بہم ارتباط ہو ایسا		کہ جو زبان کہے دل کو اعتبار آئے

آخر میں کہا ہے ؎

نہ ہو جو عام مسرت۔ محال ہے اے دوست		کہ زندگی کو کسی حال میں قرار آئے

یہی وہ شاعر ہے جو رئیس المتغزلین ہے، شہنشاہ غزل ہے، غزل ہی جس کی جولاں گاہ ہے، جنون عشق و تاب جمال تک جسکی دنیا محدود ہے، لیکن وطن دوستی اور وطن پرستی کے جذبات کی شدت کا بھی اندازہ لگائیے کہ شاعر کو کہاں سے کہاں لا ڈالا ہے، ادھر تو شاعر کے کمال کی داد دیجئے کہ اپنے پیمانوں میں ہی یعنی غزلوں میں ہی اپنے جذبات و تاثرات کی شراب ڈھال رہا ہے۔ ادھر غزل کے ظرف و وسعت پر نظر ڈالئے کہ جو

شراب ان پیمانوں میں بھر دیجیے انھیں سے رنگین و سرشار ہو جائے گی اور اپنا کردار و وقار بھی قائم رکھے گی۔

اب ذرا "ساقی سے خطاب" ملاحظہ کیجیے ـــــ "عصر جدید کے حالات سے متاثر ہو کر رند میخانہ کی زندگی ترک کرتا اور جد و جہد کی دُنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے اور ساقی سے اجازت کا طالب ہوتا ہے"۔

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاک وطن ساقی　　خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

سلامت تو ترا میخانہ، تیری انجمن ساقی　　مجھے کرنی ہے اب کچھ خدمت دار و رسن ساقی

رگ و پے میں کبھی صہبا ہی صہبا رقص کرتی تھی　　مگر اب زندگی ہی زندگی ہے موج زن ساقی

کبھی میری بھی تھا شاہد در بغل تو بہ شکن مئے کش　　مگر بننا ہے اب خنجر بکف ساغر شکن ساقی

یہ عزائم، ضروریات و مطالبات، اس سبب سے ہیں کہ "خاک وطن" پیاسی ہے، ایک سبب اس اجازت طلبی کا اور بھی ہے ؎

وہی انساں جسے سرتاج مخلوقات ہونا تھا　　وہی اب سی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

لباس حرّیت کے اُڑ رہے ہیں ہر طرف پرزے　　بساط آدمیت ہے شکن اندر شکن ساقی

یہ نصب العین اور یہ مطمع نظر بہت وسیع ہے ۔ ان وجوہات کے ساتھ طبیعت کے یہ اندیشے بھی لگے ہوئے ہیں ۔ جو انسان نوازی اور انسانیت پرستی کی وسعت میں ہی سمائے ہوتے ہیں ؎

مجھے ڈر ہے کہ اس ناپاک تر دورِ سیاسی میں　　بگڑ جائے نہ خود میرا مذاق شعر و فن ساقی

کہیں ملحد نہ بن جائیں مرے افکار سنجیدہ　　کہیں مرتد نہ ہو جائے مرا ذوقِ سخن ساقی

کہیں خود حسن رہ جائے نہ قومی ملکیت بن کر　　کہیں خود عشق ہو جائے نہ محدودِ وطن ساقی

حب الوطنی کے کن سرشار جذبات اور پر کیف تاثرات کے ساتھ اس نظم کا اختتام ہوا ہے ؎

بدہ جام مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت　　سواد ساحل گنگا و گلگشت چمن ساقی

شاہد در بغل، رند میکش شاعر جب یہ دیکھتا ہے کہ اپنے وطن میں ؎

غضب کہ چھائی جا رہی ہیں ظلمتوں کی بدلیاں　　ستم کہ زد میں آندھیوں کی شمع رہ گزار ہے

تو نوائے وقت بن کر پکار اٹھتا ہے ؎

اٹھو اٹھو کہ زندگی ہی زندگی پہ بار ہے　　بڑھو بڑھو ! کہ چار سو پکار ہی پکار ہے

وہ وقت ہے کہ علم حق ہے عالم شیطنت میں گم　　وہ وقت ہے کہ آدمی کا آدمی شکار ہے

کہاں کے مطرب و غزل کہاں کے شاہد و چمن　　کہ زندگی تمام تر بساط کارزار ہے

زمیں کو روندتے ہوئے صفوں کو چیرتے ہوئے — بڑھے چلو بڑھے چلو! یہ وقت کی پکار ہے

اس غوغائے بیداری کا مقصد کیا ہے سے اٹھ اور اک جنت جاوید نہیں پیدا کر' اور سے پھر اسی خاک سے فردوس بریں پیدا کر - اور یہ کس طرح ممکن ہے۔

خس و خاشاک توہم کو جلا کر رکھ دے — یعنی آتش کدہ سوز یقیں پیدا کر

دل کے ہر قطرہ میں طوفان تجلی بھر دے — بلکہ ہر ذرہ سے اک مہر مبیں پیدا کر

حقیقت میں وہ اسی دنیا کو جنت بنانے کے متمنی تھے سے

آسماں مرکز تخیل و تصور کب تک! — آسماں جس سے خجل ہو وہ زمیں پیدا کر

جناب جگر کا یہ وہ جذبۂ وطن دوستی ہے جس کے سبب اب بھی ان کی وطن پرستی ہمارے لئے موجب صد افتخار ہے' آج اگرچہ وہ ہمارے درمیان میں نہیں لیکن یہ ان کی حب الوطنی کے ترانے ہمارے جذبات حب الوطنی کی آتش کو ہمیشہ تیز تر کرتے رہیں گے۔ گلشن پسندی کا یہ درس کہ پھولوں سے ہی محبت نہ ہو کانٹوں سے بھی نباہ ہوتا ہے ہمارے لئے ہمیشہ درس عمل بنا رہے گا۔ ساتھ ہی سے میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر بھی ہمارے پیش نظر رہے گا اور اس حق کے اظہار میں ہم کسی موقع پر کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔

جناب جگر کو زندۂ جاوید رکھنے والے جہاں ان کی زندگی کے اور پہلو ہیں۔ وطن دوستی کا یہ پہلو بھی انہیں ہمیشہ زندۂ جاوید رکھے گا اور میرے خیال سے انھیں یہ فرماتے کا بجا طور پر حق ہے سے "فنا گشتم و لیکن جاودانم"

عبدالقوی دسنوی

اُردو میں ببلیوگرافی

اُردو میں ببلیوگرافی (کتابیات) یا فہرست مرتب کرنے کا کام بہت پرانا نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے سب سے پہلے اس کی ابتدا بمبئی کے سہ ماہی رسالہ "نوائے[1] ادب" میں "مقالہ نما" سے جنوری ۱۹۵۰ء میں ہوئی اس سلسلے کو دنیائے اہل نظر نے پسند کی نگاہوں سے دیکھا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۵۰ء کے "عرضِ[2] حال" میں اس کا اظہار اس طرح کیا گیا ہے:-

"نوائے ادب کی ایک امتیازی خصوصیت مقالہ نما ہے۔ اردو ادب کی دنیا میں یہ بہت ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے اس جدت پر نوائے ادب کو ہر گوشہ سے مستحق آفریں و تحسین سمجھا گیا ہے۔"

اس طرح کے کام کی ابتدا کرنے کے سلسلے میں مرتبین مقالہ نما تحریر کرتے ہیں:-

"امریکہ کے سہ ماہی رسالہ "مڈل ایسٹ" میں مشرق وسطیٰ کے متعلق اجتماعی اقتصادی اور علمی مسائل پر بہت پُر مغز مقالات شائع ہوتے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے متعلق تمام دستاویزوں کا جمع کرنا اور ان ممالک کے تمام اہم واقعات کا تاریخ وار اندراج اس رسالہ کی اہم خصوصیت میں سے ہے اس مجلہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے آخر میں ایک ضمیمہ بنام "ببلیوگرافی آف پریاڈیکل لٹریچر آن دی نیر اینڈ دی مڈل ایسٹ" ملحق ہوتا ہے اور اس ضمیمہ میں مشرق وسطیٰ کے متعلق جتنے مقالات انگریزی، فرانسیسی، اطالوی، جرمنی، روسی، عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کے معیاری رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں ان کی توضیحی فہرست پیش کی جاتی ہے اس اہتم بالشان کارنامہ

---

[1] نوائے ادب - ایڈیٹر ظہیرالدین مدنی - انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی - جنوری ۱۹۵۰ء

[2] نوائے ادب ص ۲

دیکھ کر ہمیں یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر اردو رسالوں کے مقالات کی فہرست اسی
نہج پر تیار کی جائے تو بہت مفید ثابت ہوگی[1]

چنانچہ مقالہ نما کے پہلے مرتب و مدیر پروفیسر باقر علی ترمذی ہوئے۔ دوسرے شمارے سے ان کے مددگار کی حیثیت سے پروفیسر عالی جعفری اور عصمت جاوید کام کرنے لگے بعد میں مختلف اوقات میں مندرجہ ذیل حضرات اس کے مرتبین کی فہرست میں شامل ہوتے رہے۔

نیرہ شباب، پروفیسر ابراہیم ڈار، احمد ملک، فضل اللہ فاروقی، سید جمیل الدین، ابوالفضل محمود قادری۔ حامد اللہ ندوی، عبدالقوی دسنوی۔ عبدالستار دلوی۔ علاؤالدین جینابڑے، سید مجاہد حسین حسینی، عبدالحلیم سالک محمد شعیب اعظمی، خورشید مظہر الحق نعمانی اور قیوم صادق وغیرہ۔

مقالہ نما میں عام طور سے ہندوستان پاکستان کے تمام رسائل کے مقالات مختلف موضوعات، مذہبیات، جغرافیہ، تاریخ و سیاست، تذکرہ سیرت نگاری، لسانیات و ادب و تنقید ادب، آرٹ (علوم و فنون) اقتصادیات معاشرتی حالات، سائنس، فلسفہ، نفسیات، حربیات، تبصرہ، کتابیات متفرقات، وفیات، نسائیات، تعلیمات وغیرہ کے تحت ترتیب دیئے جاتے رہے ہیں اور مقالہ نما کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور مقبول ہے اس کے پہلے ہی شمارے کے مطالعہ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا :-

"مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ بمبئی سے نوائے ادب جاری کیا گیا ہے۔
بعض انگریزی رسائل کے طریقہ پر اردو کے رسائل کے مضامین کا خلاصہ رسالے
کے آخر میں درج کیا گیا ہے وہ نہایت مفید اور دلچسپ ہے ابھی تک
اردو کے کسی رسالے نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا"

قاضی عبدالودود صاحب نے اظہار خیال اس طرح کیا :-

"...... مقالہ نما بڑی مفید چیز ہے "میں نے" معیار" میں اس قسم کی
ایک چیز رکھی تھی، لیکن فرق یہ تھا کہ "معیار" میں صرف ان مضامین کا ذکر ہوتا
تھا جن کا تعلق ادب و زبان اردو سے ہے یا تاریخ کے اس عہد سے
جس میں اردو کی نشو و نما ہوئی ہے۔ ایک فرق یہ بھی تھا کہ معیاری واقعات کی
جو غلطیاں تھیں ان کی تصحیح کر دی جاتی تھی"

---

[1] مقالہ نما۔ نوائے ادب اپریل ۱۹۵۰ء ص ۶۲

اور رسالہ اردو کراچی کے تبصرہ میں اسے اس طرح سراہا گیا ہے۔

"آخر میں مقالہ نما کے عنوان سے ڈاکٹر سید باقر علی ترمذی نے مختلف عنوانات کے ماتحت اردو کے تمام رسائل میں مختلف موضوعات پر شائع شدہ مقالات کی فہرست (ببلیوگرافی) دی ہے اور ان کے موضوعات سے متعلق نوٹ لکھے ہیں جو نہایت مفید اور کارآمد ہیں"

نوائے ادب اور معیار کے بعد اس قسم کے مضامین کی فہرست رفتار ادب (سید ابن حسن قیصر زاہد خاتون) اور نئے خزانے (ابو سلمان شاہجہاں پوری) کی سرخی سے قومی زبان کراچی میں شائع ہوتے رہے۔

بعض رسائل کے مضامین کی فہرست سازی کا کام بھی کچھ لوگوں نے کیا ہے:۔

الندوہ کا اشاریہ	عابد رضا بیدار	شبلی نمبر ادیب	ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء
الہلال کا انڈکس	محمد عتیق صدیقی	اردو ادب	۱۹۶۱ء شمارہ نمبر ۲
مضامین نوائے ادب کی دہ سالہ فہرست	〃	نوائے ادب بمبئی	جنوری سنہ ۱۹۶۱ء
رسالہ ادیب الہ آباد	بشیر الحق دسنوی	اردو ادب	۱۹۶۴ء شمارہ ۱
رسالہ نقاد آگرہ	〃	〃	۱۹۶۳ء شمارہ ۱
اشاریہ مضامین اردو (مصنف وار)	(۱۹۲۱ تا ۱۹۶۳ء)	سہ ماہی اردو کراچی	اپریل سنہ ۱۹۶۷ء
مقالہ نما نوائے ادب	مرتبہ مس رقیہ انعامدار	نوائے ادب بمبئی	

ادھر چند رسالوں پر بعض فہرستیں اس قسم کی شائع ہوئی ہیں:۔

اردو ادب کے تحقیقی مقالات	انصار اللہ نظر	اردو ادب	۱۹۶۵ء شمارہ ۱
اردو ادب میں تنقید و تحقیق	〃	〃	〃 〃 ۱۲
اردو ادب میں تبصرے	〃	〃	〃 〃 ۳۰
اردو ادب کے قلمی معاونین	〃	〃	〃 〃 ۱۱
ہماری زبان کے تبصرے	〃	〃	〃 〃 ۱۲

کسی واحد شخص کے مضامین کی فہرست سازی کا کام اب تک شروع نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے میں نے خود علامہ سید سلیمان ندوی کے مضامین کی فہرست "مقالات[1] علامہ سید سلیمان ندوی" مرتب کی جس میں تقریباً پونے پانچ سو تحریریں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئی تھیں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

(۱) مقالات علامہ سید سلیمان ندوی عبداللہ دسنوی معارف نمبر جلد ۹۷ مئی سنہ ۱۹۶۶ء

نقوشِ[1] امام الہند کے عنوان سے ابوسلمان شاہجہاں پوری نے مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق تحریروں کی تفصیلی فہرست اردو دو شماروں میں شائع کی ہے۔ آزاد کے مطالعہ کیلئے یہ فہرست بہت اہم ہے۔ اس مضمون میں "مولانا ابوالکلام آزاد پر مضامین و مقالات" مرثیات (اخذ و ترتیب دیئے ہوئے مضامین) متفرقات، ستر ارکا خراجِ عقیدت، پاکستانی صحافت کا اعتراف عظمت، منقولات؟ ادبیات (نظم) قرآن، سیرت و سوانح۔ دعوت و اصلاح، مباحث، تاریخ و سیاست۔ مکاتیب۔ خطبات و تقاریر۔ الہلال سنہ ۱۹۱۲ء۔ چند تعزیت کرنے والے۔ عام تعزیتی جلسے اور اجلاس ہائے خصوصی۔ ہڑتال اور ادارے بند۔ نمازِ جنازہ غائبانہ۔

دوسرا مضمون "نقوشِ[2] امام الہند۔ مولانا ابوالکلام آزاد پر کتابیں اور رسالے" دو قسطوں میں شائع ہوا ہے جس میں مولانا آزاد پر چھوٹی بڑی ۳۶ اردو کتابوں، گیارہ انگریزی کتابوں، ۲۹ اردو رسالوں کے خاص نمبر، دو انگریزی نمبر اور ایک عربی رسالے کے نمبر کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔

اس طرح شخصیات سے متعلق مضامین کے اشاریہ کے سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی اور مولانا عبدالحق پر بھی کام ہوئے ہیں جو اہم ہیں۔ مولوی عبدالحق پر مضامین کا اشاریہ "اشاریہ عبدالحق" اشرف علی نے قومی زبان بابائے اردو نمبر سنہ ۱۹۶۲ء میں شائع کیا ہے اور اسحق نعمانی نے "مقالہ نما برائے شبلی" اور "کتب نما برائے شبلی" ادیب شبلی نمبر ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء میں پیش کیا ہے۔ پاکستان میں علامہ اقبال سے متعلق مضامین کا اشاریہ "کلیدِ اقبال" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ شخصیات کے سلسلے میں "اشاریہ" کے کام کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں مرزا غالب پر بہت اور اچھے کام ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے مولانا میر مہر دی نے "اشارات" کے عنوان سے عالمگیر مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں اشاریہ مرتب کیا جس میں مرزا غالب پر اس وقت تک جو کچھ کام ہو چکا تھا اس کا اشاریہ پیش کیا گیا ہے۔ مرزا غالب کے سلسلے میں اس قسم کا سب سے اہم کام "غالب نما"[3] ہے۔ جس میں مقالات کو ان عنوانات کی تحت

---

[1] نقوشِ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (پاکستان میں) ابوسلمان شاہجہاں پوری اردو ادب سنہ ۱۹۶۴ء شمارہ ۱
" " " " " " " (دوسری قسط) " " " ۲
" " " " " " (ضمیمہ) " سنہ ۱۹۶۵ء " ۱

[2] نقوشِ امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد پر کتابیں اور رسالے " " سنہ ۱۹۶۷ء " ۱
" " " " " (دوسری قسط) " " " " ۲

[3] غالب نما۔ محمد فیق الرحمٰن قدوائی۔ عبدالقوی دسنوی۔ ادارہ اردوئے معلیٰ۔ اردوئے معلیٰ غالب نمبر ۲
غالب نما۔ نثار احمد فاروقی تحریک دہلی۔ برہان دہلی (فروری سنہ ۱۹۶۰ء اپریل سنہ ۱۹۶۰ء۔ جنوری سنہ ۱۹۶۱ء)

ترتیب دیا گیا ہے۔ حیات۔ احباب و اعزہ، تلامذہ، سیرت و شخصیت، تصانیف نثر، غالب سے متعلق تصانیف، مکاتیب شاعری۔ غالب کے بارے میں مکالمے، نظمیں، ڈرامے، فیچر۔ متفرقات۔

نثار احمد فاروقی نے بھی "غالب نما" مرتب کیا تھا جو برہان اور تحریک میں شائع ہوا۔ صبح دہلی جنوری، فروری ۱۹۶۹ء عبداللطیف اعظمی نے غالبیات ترتیب دیا۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری نے "قومی زبان میں" غالب پر مقالوں، تبصروں اور خبروں کا اشاریہ "اشاریۂ غالب" مرتب کیا جو قومی زبان کے غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء میں چھپا۔

غالب سے متعلق کتابی صورت میں پہلی ببلیوگرافی "غالبیات"[1] کے نام سے جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ جس میں جون ۱۹۶۸ء تک غالب سے متعلق تحریروں کی ببلیوگرافی مرتب کی گئی ہے اور جسے مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے تصانیف غالب و برائے غالب۔ نثری مجموعے (بہ ترتیب مضمون نگار) نثری مجموعے (بہ ترتیب موضوع) رسائل و اخبارات (بہ ترتیب مضمون نگار) رسائل و اخبارات (بہ ترتیب موضوع) مکالمے، خاکے، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں (بہ ترتیب قلمکار) مکالمے، خاکے، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں (بہ ترتیب نگارشات) نظمیں، غزلیں (بہ ترتیب شعراء) نظمیں غزلیں (بہ ترتیب موضوع) تبصرے (بہ ترتیب تصانیف) ضمیمہ۔ کتابیات (کتابیں۔ رسائل۔ اخبارات)

عابد رضا بیدار کی کتاب "غالبیات نو"[2] اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۶۹ء کے آخر میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ۱۹۷۰ء میں۔ پہلے حصے میں آٹھ کتابوں روزمرہ اور محاورہ غالب از پریم پال اشک۔ محاورات غالب از نریش کمار شاد۔ غالب اور ابوالکلام از عتیق صدیقی۔ بھوپال اور غالب از عبدالقوی دسنوی۔ قاطع برہان و رسائل متعلقہ از قاضی عبدالودود۔ اصحار الغالب از صاحبزادہ ناصرالدین احمد خاں عرف خسرو مرزا تصویر کا دوسرا رخ۔ تجنیس اعجازی مزاحیہ شرح دیوان غالب از فرقت کاکوروی اور شاعر و جامعہ کے غالب نمبر کا تفصیل سے تعارف پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے حصے[3] میں ہندوستان و پاکستان کی اہم کتابوں کا مختصر تعارف اور ۲۹ انتیس مختلف رسائل کے غالب نمبروں کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا ہے۔

پاکستان میں اس سلسلے کی پہلی کتاب "غالب نما"[4] مارچ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں صرف پاکستان کے رسائل و جرائد میں ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۸ء تک شائع شدہ مضامین کا وضاحتی اشاریہ ہے۔

---

(۱) غالبیات۔ عبدالقوی دسنوی ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۳۱۸ ناشر نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔
(۲) غالبیات نو حصہ اول۔ عابد رضا بیدار صفحات ۳۲ پبلشر رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز
(۳) غالبیات نو حصہ دوم ″ ″ ۱۱۴ ″ ″ ″ ″ ″ ″
(۴) غالب نما۔ سید ابن حسن قیصر صفحات ۱۴۸ + ۲ = ۱۵۰ ادارۂ یادگار غالب کراچی۔

یہاں دوسری کتاب "اشاریہ غالب[1] حصّہ اوّل ۱۹۶۹ء کے آخر میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے

پہلا باب: تصانیف غالب (ا) مطبوعات در حیات (۱۸۶۹ء) اولین نقوش (قلمی) (ب) نظم و نثر فارسی (ج) برہان کا مباحثہ (د) نظم و نثر اردو۔

دوسرا باب: تصانیف غالب (ا) تعارفات مابعد (ا) مرتبات و مطبوعات مابعد (ب) مرتبات ابعد غیر مطبوعہ (ج) معدوم تصنیفات (د) سرگزشت، نکات و لطائف۔

تیسرا باب: متفرقات غالب (ا) کلام غالب (ب) مکاتیب غالب (ج) غالب کی دیگر تحریریں (د) معاصر خطی نسخے، اہم ایڈیشن۔

چوتھا باب: تراجم غالب، (ا) فارسی نگارشات اردو میں (ب) قومی اور علاقائی زبانوں میں (ج) انگریزی تراجم غالب (پاک و ہند) (د) پاک و ہند سے باہر غالب کا مطالعہ۔

ضمیمہ: اضافات (متعلق بہ تصانیف غالب)

یہ کتاب ترتیب اور مواد ہر اعتبار سے بہت خوب ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس کے باقی دو حصے بھی مفید معلومات فراہم کریں گے اور ترتیب، مواد اور طباعت ہر اعتبار سے پچھلے سے اور زیادہ بہتر ہوں گے" سید معین الرحمٰن قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس خوبی کے ساتھ "اشاریہ غالب حصّہ اوّل" کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی پاکستان ہی کے رسالہ لاہور کا غالبیات نمبر[2] بھی اس سلسلے میں اہمیت کا درجہ رکھتا ہے۔ غالبیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مندرجہ ذیل مضامین بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

پنجاب یونیورسٹی کے سرسٹھ مطبوعات	محمد حنیف خالد
روس میں غالب کی اہمیت	مجاوائی علی روف
غالب کی کتابیں اور ان پر کتابیں	عبدالستار چودھری
(۱۸۲۸ء تا ۱۹۷۰ء تک شائع ہونے والی ۱۵۹ کتابوں کی ردیف وار فہرست)	
غالب پر کتابیں	شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
(سن ۱۹۶۹ء کے دوران شائع ہونے والی ۴۱ کتابوں کا مختصر تعارف و تبصرہ)	
(برصغیر پاک و ہند میں شائع ہونے والے ۱۰۲ رسائل و جرائد کے غالب نمبروں کا تعارف)	

---

[1] اشاریہ غالب۔ سید معین الرحمٰن صفحات ۴۰۰ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

[2] غالبیات نمبر۔ ماہنامہ کتاب لاہور جلد ۱۴ شمارہ ۵، ۶ فروری، مارچ ۱۹۷۰ء مدیر سید قاسم محمود

غالب نمبروں کے مضامین ۱۹۶۹ء شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

(مختلف رسائل کے غالب نمبروں میں چھپنے والے ۱۲۷۰ مضامین کی فہرست)

متفرق مضامین ۱۹۶۹ء شیخ محمد اسماعیل

(غالب نمبروں کے علاوہ دوسرے رسائل کے عام شماروں میں چھپنے والے ۷۰۰ مضامین کی فہرست)

"غالبیات کے سلسلے میں یہ نمبر بھی بے حد اہم ہے اس میں غالب سے متعلق بہت سی کتابوں، غالب نمبروں اور مضامین و دوسری تحریروں کے حوالے مل جاتے ہیں لیکن بعض جگہ معلومات کی فراہمی میں صرف خبروں یا اشتہاروں پر اکتفا کیا گیا ہے جس سے بعض ایسی کتابوں کے حوالے بھی درج ہو گئے ہیں جو اب تک شائع نہیں ہوئی ہیں۔

سب سے آخری اور سب سے زیادہ مکمل کتاب محمد انصار اللہ کی "غالب ببلیوگرافی"[1] ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں غالب کی تمام تحریروں، کتابوں اور ان سے متعلق تمام تحریروں اور کتابوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور انصار اللہ نظر اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ببلیوگرافی کا کام اس سے پیشتر بھی انہوں نے مضامین کی صورت میں کیا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے لیکن یہ کام ان کے پہلے کے اس قسم کے کاموں پر بہت بھاری ہے اور وقیع بھی۔ اس سلسلے میں انصار اللہ قابل مبارکباد ہیں۔ البتہ اس کی ترتیب کے مطالعہ سے اس کا احساس بار بار ہوتا ہے کہ ترتیب میں حروف تہجی کا خیال رکھنا چاہیئے تھا۔ اسی طرح بعض اندراج مکرر ہو گئے ہیں یا بعض جگہ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ بعض جگہ اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ یہ کتاب جبکہ طویل مدت کے بعد شائع ہوئی ہے تو اس کی طباعت اور کتابت کے معیار کو اور زیادہ بہتر بنایا جا سکتا تھا۔

بہر حال یہ بات بلا جھجک کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں اپنے موضوع کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہم اور غالبیات پر کام کرنے والوں کے لئے بے انتہا مفید ہے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ "غالب کی اور غالب سے متعلق کتابیں" پر مشتمل ہے جس میں حسب ذیل عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔

غالب، حیات اور خدمات۔ دیوان غالب (بنیادی مخطوطات۔ غالب کی زندگی کے نسخے۔ غالب کے بعد دیوان کی اشاعتیں جدید ترتیبیں۔ انتخاب کلام غالب۔ متفرق کلام غالب) خطوط غالب (عام اشاعتیں، انتخاب خطوط، جدید ترتیبیں) تصانیف متعلق معرکۂ برہان قاطع۔ مرقع کلام غالب، شرح کلام غالب۔ غالب سے متعلق فیچر ڈرامے وغیرہ غالب تذکروں اور تاریخوں میں۔ غالب مضامین کے مجموعوں میں۔ تبصرے غالبیات پر۔ غالبیات دیگر زبانوں میں

---

[1] غالب ببلیوگرافی۔ محمد انصار اللہ۔ ضخامت ۹۵ + ۱۹۲ + ۱۷۶ + ۸ = ۴۶۲ص۔ ناشر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ سن اشاعت ۱۹۷۲ء

غالب پر فلمیں۔ ضمیمہ تصحیح و اضافہ۔

دوسرا حصہ: رسالوں کے غالب نمبر پر مشتمل ہے جس میں تقریباً ۴۸ غالب نمبروں یا ان رسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن میں غالب سے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب نمبروں پر تبصرے۔ کتابیں جو رسائل میں بالاقساط شائع ہوئے' غالب نام کے رسالے" کے عنوانات بھی قائم کئے گئے ہیں۔ یہ حصہ بہت حد تک مکمل ہے البتہ بعض نمبروں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے اردو کراچی۔ غالب نمبر ۲' نقوش غالب نمبر ۲ و نقوش غالب ۳ - صحیفہ لاہور غالب نمبر ۲۔ غالب نمبر ۳ غالب نمبر ۴ - کتاب لاہور غالبیات نمبر وغیرہ۔

تیسرا حصہ: رسالوں کے مضامین پر مشتمل ہے جس میں حسب ذیل عنوانات قائم کیے گئے ہیں۔ نسب و ولادت۔ اعزا۔ غالب کا ماحول۔ غالب قدیم ماخذ میں' وفات' غالب اور مختلف مقامات۔ معاملات مزاج اور مسلک وغیرہ' غالب کی علمیت' فارسی اور متعلقات' غالب اور اساتذہ فارسی۔ غالب اور اساتذہ اردو' ادبی معرکے' تلامذہ غالب' اصلاحات غالب' شاعری اور نظریہ شاعری' دیوان غالب' انتخاب کلام' منظومات غالب' شرح کلام غالب' کلام غالب کے مختلف پہلو' مختلف اصناف سخن۔ کلام فارسی' غالب کے تذکرہ نگار' ناقدین غالب' خارجین غالب' غالب اور بعد کے اردو شعراء' نثری تصانیف غالب' خطوط غالب' مطالعہ خطوط غالب' مطالعہ نثر غالب' مقام غالب' غالب کے بعد۔ متفرقات' اشاریہ غالب' غالب کے ڈرامے فیچر وغیرہ' غالبیات دوسری زبانوں میں' ضمیمہ: یونیورسٹیوں میں غالبیات کا مطالعہ نو دریافت مخطوطہ دیوان غالب۔

مندرجہ بالا فہرست مشمولات سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ "غالبیات" کے سلسلے میں یہ کتاب کس قدر اہم اور غالبیات پر کام کرنے والوں کے لئے کس حد تک مفید ہے۔

اردو میں ببلیوگرافی کا یہ مختصر جائزہ ہے اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو امید ہے کہ آئندہ اچھے ببلیوگرافی مرتب ہو کر شائع ہونگے جن سے تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بڑی آسانیاں پیدا ہو جائینگی۔

نوٹ: سب رس ... [illegible] ... میں ڈاکٹر زور کا مقالہ تھا اور ہاشمی نمبر ... میں نصیر الدین ہاشمی کا مقالہ شائع ہوا ... [illegible]

وحید النسار

شعلہ مائلی

ریاست میسور میں اردو فارسی اور عربی کا ذوق عام رہا ہے۔ ہاسن اس ریاست کا ایک اہم ادبی مرکز ہے۔ برقؔ علوی، دلؔ اور باقرؔ کے سوا کئی اور شاعر اس مقام سے متعلق رہے ہیں۔ میر عبدالوہاب شعلہ کا تعلق بھی اسی مقام سے تھا۔

شعلہ کی زندگی کے حالات و واقعات بہت کم معلوم ہو سکے۔ آپ کے والد کے نام میر شاہ قادر علی تھا۔ فارغ البال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانی پیشہ درس و تدریس تھا۔ آپ کی والدہ بھی اپنے زمانے کی پڑھی لکھی خواتین میں شمار ہوتی تھیں۔ شعلہ کی عمر صرف ایک سال کی تھی کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ شعلہ کی تاریخ ولادت باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکی۔ تاریخ وفات ۱۴ اگست ۱۹۶۹ء ہے۔ آپ کے عزیزوں سے معلوم ہوا کہ آپ کا انتقال ۵۰ پچاس سال کی عمر میں ہوا۔

چودہ سال کی عمر میں آپ نے میٹرک کا امتحان دیا۔ آپ کے والد میر شاہ قادر علی کی دلی خواہش تھی کہ آپ کو انجینیر بنایا جائے۔ مگر قسمت میں کالج کی تعلیم کے بجائے کلکتہ کا سفر لکھا تھا۔ یونیورسٹی میں داخلے کے کچھ ہی دن پہلے آپ کی ملاقات پرنس دارا سے بنگلور میں ہوئی پرنس کو شعلہ کی ذہانت، خوش مزاجی، بذلہ سنجی اور شاعرانہ صلاحیتوں نے بہت متاثر کیا اور وہ شعلہ کو اپنے ساتھ کلکتہ لے گئے۔ مٹیا برج کی شاعرانہ فضا نے شعلہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارا اور وہاں کی ادبی محفلوں میں نادر حسین شعلہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی بیاض کے پہلے صفحے پر :—

"میر عبدالوہاب عرف نادر حسین شعلہ مائلی"

لکھا ہے۔ پورے پندرہ سال کلکتہ میں قیام رہا اور وہیں کنیز بانو سے آپ کی شادی ہوئی جس کی تفصیلات فراہم نہ ہو سکیں۔ صرف ایک قطعہ "دنیائے محبت" کنیز بانو کے نام سے اس بیاض میں ہے۔

کنیز بانو کے انتقال کے بعد سکینہ بیگم سے شادی ہوئی۔ ہاسن آنے کے ایک سال بعد وہ بھی انتقال کر گئیں۔ شعلہ صاحب خود کہا کرتے تھے کہ سکینہ بیگم بہت ہی سلجھا ہوا ادبی ذوق رکھتی تھی۔ وہ شاعرہ بھی تھی اور تمنا تخلص کرتی تھی۔ شعلہ صاحب کہتے تھے کہ وہ کیف لکھنوی کی بہن تھی۔ تمنا لکھنوی کی وفات نے شعلہ پر بہت اثر ڈالا۔ سکینہ بیگم خلد آشیانی کے نام ایک قطعہ اس بیاض میں موجود ہے جس کا عنوان ہے "اس کی یاد میں" شعلہ صاحب کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے معلوم ہوا کہ آخری وقت میں شعلہ نے سکینہ بیگم تمنا لکھنوی کو بہت یاد کیا تھا۔

سکینہ بیگم کے انتقال کے بعد تیسری شادی شریفہ بیگم سے ہوئی۔ اس بیوی سے چار لڑکیاں اور ایک لڑکا ہوا لڑکے کی عمر ایک سال کی تھی کہ شریفہ بیگم انتقال کر گئیں۔ اب یہ لڑکا جاوید سات سال کا ہے اور اپنی بہن کے ساتھ ہے بیوی کی موت نے شعلہ کو بہت کمزور بنا دیا اور آپ کی صحت گرتی چلی گئی۔ آخر مرنے سے دو سال پہلے فالج کے حملے نے انہیں بالکل ہی مجبور کر دیا۔ لاٹھی کے سہارے بڑی مشکل سے چلا کرتے تھے۔ زبان کی روانی بھی جاتی رہی اور لکنت پیدا ہو گئی تھی۔ آخر اسی بیماری نے ۲۹ اگست ۱۹۶۹ء کو آپ کا خاتمہ کر دیا۔

شعلہ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔۔۔۔۔ ابتدا میں آرزو لکھنوی سے اپنے کلام کی تصحیح کرائی۔ مگر کچھ عرصے بعد اثر ردولوی اور مائل لکھنوی سے شرف تلمذ رہا۔ شعلہ کو ہمیشہ اپنے تلمیذ مائل ہونے پر فخر تھا۔

آپ اپنے ہم عصروں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ریاست کے مشاعروں کی جان تھے۔ جناب عبدالواسع عصری اور جناب مولوی عبدالقادر فیاض جو ملناڈ کے نامی شاعروں میں شمار ہوتے ہیں شعلہ کے قدر دانوں میں سے ہیں۔ زیر نظر بیاض میں "وداعِ عصری" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں عصری کے سسرال بروانگی کا حال لکھتے ہوئے عصری کی ادب شناسی اور ادب نوازی کا ذکر کیا ہے۔ فیاض صاحب کا ذکر بھی اسی نظم میں کیا گیا ہے۔

شعلہ بلا کے ذہین اور زود فہم تھے۔ مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اساتذۂ دہلی اور لکھنؤ کا کلام ازبر تھا۔ قدرت نے حافظہ غیر معمولی عطا کیا تھا۔ چنانچہ ایک عرصے تک اپنے اشعار کو کاغذ کا رہین منت نہ ہونے دیا۔ سارا کلام نوک زبان تھا۔ جہاں کسی نے فرمائش کی غزل پر غزل سناتے چلے جاتے مشاعروں میں کبھی ترنم کا سہارا نہیں لیا ہمیشہ تحت اللفظ سناتے تھے۔ انتقال سے کوئی چار چھ سال قبل سے سخن فہم دوست احباب کے اصرار پر ایک چھوٹی سی بیاض میں اپنا کلام درج کرنا شروع کیا آج شعلہ کا سارا سرمایہ یہی بیاض ہے جو تقریباً سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ جس میں دو نعتیہ قصیدے تقریباً ۱۵۰ غزلیں گیارہ نظمیں اور کچھ قطعات ہیں بیاض کے ابتدائی کچھ اوراق پر نمبر لگے ہوئے ہیں۔ بعد میں نمبر لگانے سے غفلت برتی گئی ہے۔ کچھ اوراق درمیان سے نکل گئے ہیں جس کی وجہ کئی غزلیں ادھوری رہ گئی ہیں۔ صرف ایک غزل کے آخر میں سنہ ۱۹۶۰ء لکھا ہوا ہے۔ غزل یہ ہے:—

ہر ایک اظہار مدعا کا جواب لے کر میں کیا کروں گا
پیام مہر و وفا کے بدلے عتاب لے کر میں کیا کروں گا

مجھے تو یہ دیکھنا ہے رحمت کا تیری کوئی شمار بھی ہے
مرے گناہوں کا میرے مالک حساب لے کر میں کیا کروں گا

مآلِ عجز و نیاز ظاہر تمہاری چشم عتاب سے ہے
تو پھر سوال و جواب کیسا جواب لے کر میں کیا کروں گا

ہے نامرادی کا نام الفت بجھے بجھے سے ہیں دل کے ارماں
نہ اب وہ پہلے سے ولولے ہیں شباب لے کر میں کیا کروں گا

فسردگی ہی فسردگی ہے شکستہ ہیں دل کے تار سارے
نہ کوئی نغمہ نہ سوز باقی رباب لے کر میں کیا کروں گا

نہ جام و مینا کی کوئی حاجت نہ میکدے کی مجھے ضرورت
تمہاری آنکھوں سے پی رہا ہوں شراب لے کر میں کیا کروں گا

مجھے جو دینا ہے دینے والے تو مستقل رنج و غم ہی دیدے ۔ یہ دو گھڑی کی ہنسی خوشی ہے حباب لیکر میں کیا کروں گا
یہ زندگانی کی جگمگاہٹ یہ پُر کشش جلوے اس جہاں کے ۔ فریب دیتے ہیں ہر نظر کو سراب لے کر میں کیا کروں گا
کبھی گھڑی بھر جو مسکرایا تو خون رونا پڑا ہے برسوں ۔ کتاب عشق و وفا کا شعلہؔ یہ باب لیکر میں کیا کروں گا

شعلہ کی چند غزلیں بہت ہی پُر درد و پُر تاثیر ہیں۔ نظموں میں نئے تقاضوں کا شعور موجود ہے۔ شاعری میں آورد کم اور آمد زیادہ ہے۔ غزلوں کے چند شعر اور نظموں کے کچھ بند اور کچھ قطعات ملاحظہ ہوں :-

محبت میں وفا کے امتحاں تک بات پہنچی ہے ۔ مفر جس سے نہیں کوئی وہاں تک بات پہنچی ہے
کہیں ایسا نہ ہو ترکِ وفا تک بات بڑھ جائے ۔ وہیں تک بات اچھی ہے جہاں تک بات پہنچی ہے
زباں زد تھی کہانی قیس اور فرہاد کی لیکن ۔ یہ قصہ بڑھ کے اپنی داستاں تک بات پہنچی ہے

جو داغ ملے ہیں الفت میں ہم ان کو نمایاں کیا کرتے ۔ یہ راز نہانی ہیں ان کی تشہیر کا ساماں کیا کرتے
ہر پاؤں اُٹھا پڑتا تھا ہر گام پہ ٹھوکر کھائی تھی ۔ تھا اپنا مقدر ہی پھوٹا ہم شکوۂ یزداں کیا کرتے
منت کش درماں ہو جانا جب درد کو خود منظور نہ تھا ۔ پھر اتنا بتا دے کوئی ہمیں ہم درد کا درماں کیا کرتے
معمور تھی جلوؤں سے دنیا پر خانۂ دل ویراں ہی رہا ۔ جو بخت سیہ کے مالک ہوں وہ لے کے چراغاں کیا کرتے

اتنا قابو ہو خیالِ رُخِ جاناں ہو جائے ۔ جب میں چاہوں مری دنیا میں چراغاں ہو جائے
کہتے کو سارا جہاں عیسئ دوراں ہو جائے ۔ جب میں جانوں کہ مرے درد کا درماں ہو جائے
تم جو یہ چاہو کہ ہو قصۂ الفت رنگیں ۔ سرخئ خونِ وفا زینتِ عنواں ہو جائے
روکو روکو مرے اشکوں کی روانی روکو ۔ جوشِ گریہ نہ کہیں باعثِ طوفاں ہو جائے

جلوہ افگن بزم میں جب ساقئ گلفام تھا ۔ موجِ بادہ کہکشاں تھی ماہ ہر اک جام تھا

کب بھی حوادث میں پھنس کر ہم شکوۂ دوراں کرتے ہیں ۔ طوفاں سے الجھنے والے کیا اندیشۂ طوفاں کرتے ہیں
واقف نہ مزاجِ گل سے ہیں نہ رنگ چمن کو پہچانیں ۔ اس عقل و خرد کے برتے پر تنظیم گلستاں کرتے ہیں
کیا جانیں بہاریں آنے تک گلشن نہ رہے یا ہم نہ رہیں ۔ ہم دورِ خزاں میں اس لئے اک جشنِ بہاراں کرتے ہیں

زلف کو عارضِ تاباں پہ ہنسی آتی ہے ۔ کفر کو صاحبِ ایماں پہ ہنسی آتی ہے
رنگتِ لالہ و گل میں ہے خزاں جلوہ نما ۔ آمدِ فصلِ بہاراں پہ ہنسی آتی ہے
زندگی آ گئی اس موڑ پہ آخر اپنی ۔ کہ جہاں گردشِ دوراں پہ ہنسی آتی ہے
برق کی نذر ہوا جب سے نشیمن اپنا ۔ تب سے ہر حالِ پریشاں پہ ہنسی آتی ہے
معصیت کو ہے شفاعت کا بھروسہ توبہ ۔ مجھ کو خوش فہمئ انساں پہ ہنسی آتی ہے

آپ اور عشق بتاں واہ جناب شعلہؔ — آپ کے چاک گریباں پہ ہنسی آتی ہے

آج لب پر جو میرے نالہ و فریاد نہیں — وہ سمجھتے ہیں مجھے طرزِ فغاں یاد نہیں

سنو! میری اسیری کی کہانی یہ ہے — ہوں وہ قیدی جسے میعادِ قفس یاد نہیں

واہ یہ خوب کبھی عشق کو رسوا کردوں — بندہ پرور میں تو مجنوں نہیں فرہاد نہیں

میری تکمیل محبت کی تمنا ظالم — کون کہتا ہے کہ منت کشِ بیداد نہیں

واہ اے بانٹنے والے غم و آلامِ جہاں — اچھی تقسیم ہے اک شاد ہے اک شاد نہیں

بڑے ارمان سے بابِ اجابت تک جسے بھیجا — وہ آہِ نارسا اب لوٹ کر ناکام آتی ہے

مری بربادیاں ہی وجۂ شہرت بن گئیں ان کی — غنیمت ہے کہ بربادی کسی کے کام آتی ہے

دلِ وحشت زدہ کو راس تاریکی نہیں آتی — الٰہی خیر ہے اب دن ڈھلا پھر شام آتی ہے

نقوش لوحِ محبت مٹا رہے ہیں وہ — چراغِ معبدِ الفت جلا رہا ہوں میں

سنو سنو نہ سنو میری داستاں نہ سنو — دلِ شکستہ کی پُر درد اک صدا ہوں میں

وہ مدعا ہوں میں شعلہؔ جو شاد کام نہیں — اثر سے دور بھٹکتی ہوئی دعا ہوں میں

سرمایہ داروں کی تضحیک میں لکھی ہوئی ایک نظم "خداوند" اور "خدا کا خلیفہ" کے کچھ بند ملاحظہ ہوں ؎

"خداوند"

یہ خزانوں کے محافظ یہ امیری کے غلام
سیم و زر ان کا خدا اور ہے قارون امام
جھنجھناتے ہوئے سکوں کے پرستار ہیں یہ
چوسنا خون غریبی کا نہیں ان کو حرام

جان دیدیتے ہیں یہ دھن کی حفاظت کیلئے
ہیں وفادار یہ لکشمی کے نمسکار کرو
ہیں غریبوں کے خداوند انہیں کچھ نہ کہو

یوں تو مزدور کی الفت کا سدا بھرتے ہیں دم
کھائے جاتا ہے انہیں بیکس و مجبور کا غم
کام پردے میں وفا کے ہیں جفا کا لیتے
گو بظاہر ہیں کرم اور بہ باطن ہیں ستم

"خدا کا خلیفہ"

ہوئی جب سے دنیا میں تخلیقِ آدم
کبھی خیر اور شر کا دیکھا نہ سنگم
کہیں پر زیادہ کہیں پر ہے کم کم
ہمیشہ سے نیکی بدی سے ہے برہم
یہ انسان یعنی خلیفہ خدا کا

کہیں نور یزداں کہیں پر ہے شیطاں
کہیں بن کے موسیٰ سرِ طور ہے یہ
کہیں دار پر چڑھ کے منصور ہے یہ
جو مسجودِ نوری تھا وہ نور ہے یہ
مگر اب خدا سے بہت دور ہے یہ
یہ انسان یعنی خلیفہ خدا کا

قوم کے غم میں یہ دن رات گھُلے جاتے ہیں
کتنے ہمدرد ہیں غمخوار ہیں یہ مجھ سے سنو
ہیں غریبوں کے خداوند انہیں کچھ نہ کہو

کہیں فاقہ کش اور نادار ہے یہ
کہیں سیم و زر کا پرستار ہے یہ
کہیں پر خداؤں کا اوتار ہے یہ
کہیں خود خدائی سے بیزار ہے یہ
یہ انسان یعنی خلیفہ خدا کا

ان میں فرعون بھی نمرود بھی شداد بھی ہیں
بانیِ ظلم بھی ہیں بانیِ بیداد بھی ہیں
بیچتے رزق ہیں چاہے ہو کسی قیمت پر
یعنی خود دانہ بھی ہیں دام بھی صیاد بھی ہیں
دانہ ظاہر ہے مگر دام ہے پوشیدہ یہاں
کان دیوار کے ہیں غل نہ کرو چپ بھی رہو
ہیں غریبوں کے خداوند انہیں کچھ نہ کہو

آخر میں قصیدے کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ کیوں اٹھلا کے چلتی ہیں ہوائیں باغِ رضواں کی — یہ کیوں کلیاں چٹک کر کھلکھلاتی ہیں گلستاں کی
نظامِ عالمِ فطرت نے لی کیوں مست انگڑائی — فضا کے ساتھ کیوں تقلید کرتے ہیں غزل خواں کی
ہر اک شاخِ شجر گلہائے رنگا رنگ سے پُر ہے — گھٹائیں چھا رہی ہیں چار سو گلشن پہ ایماں کی
گھٹا چھائی ہے گل کھلتے ہیں ساقی گنگناتا ہے — مزہ جب ہے کہ تیاری ہو مے نوشی کے ساماں کی
تو بسم اللہ کہہ کر جام اک ایسا پلا ساقی — کہ جس کی روشنی میں سیر ہو دنیائے عرفاں کی
اسے واعظ خلافِ شرع کہتا ہے تو کہنے دے — وہ کیا جانے کہ توبہ ٹوٹتی ہے کب مسلماں کی
نبوت کی صراحی ہو رسالت کا ہو پیمانہ — اک ایسا خم کدہ ہو مے جہاں ڈھلتی ہو عرفاں کی

مطلع ثانی

نوید جانفزا لائیں ہوائیں باغِ رضواں کی — ولادت آج دنیا میں ہوئی محبوبِ یزداں کی
جو خود ہو نور سے پیدا ہو جس سے نور اک پیدا — ہے آمد آج عالم میں اسی شمعِ شبستاں کی
مبارک ہو محبانِ محمدؐ کو مبارک ہو — کہ ہے یہ آخری زینت نبوت کے گلستاں کی
نظر بھر کر جسے دیکھا وہ مقبولِ خدا ٹھہرا — نہ دہشت پھر اسے باقی رہی کچھ بارِ عصیاں کی
رُخِ پُر نور کے پرتو سے دنیا جگمگا اٹھی — نظر میں کیا سمائے اب تجلی ماہِ تاباں کی
ثنا شعلہ ہو کیا انساں سے انساں پھر بھی انساں ہے — فرشتے کر نہیں سکتے ثنا محبوبِ یزداں کی

غلام مرتضیٰ راہیؔ

عکس چہرے کا سطحِ آب میں ہے
تہ نشیں موجِ اضطراب میں ہے

پائی پائی مرے حساب میں ہے
تو نے جو کچھ دیا ثواب میں ہے

مجھ سے انصاف چاہنے والو!
ایک زنجیر میرے باب میں ہے

جس نے اوروں کا انتخاب کیا
نام اُس کا بھی انتخاب کیا

میری آنکھوں میں دھول مت جھونکو
کوئی چہرہ ابھی نقاب میں ہے

آپ اپنی مثال ٹھہرا ہوں
نام میرا مرے جواب میں ہے

اس طرح دیکھتا ہوں میں گویا
کچھ حقیقت بھی میرے خواب میں ہے

پہلے شیشے کے حال پر تھا عکس
اور اب گرد کے عتاب میں ہے

آؤ راہیؔ دعائے خیر کریں
لامکاں سخت احتساب میں ہے

رونق کُنی بہابی

بات پتھر کی چلی ہے تو چلے پتھر بھی
غم نہیں اس کا کہ شیشے کا اِدھر ہیں گھر بھی

شدتِ پاسِ ادب ہے کہ عبادت کیا ہے
آنکھ جھکتی ہے تو جھک جاتا ہے خود ہی سر بھی

خونِ دل ہی سے نہیں پاتی ہے ضو شمعِ حیات
وقت آنے پہ لہو دیتی ہے چشمِ تر بھی

سنگ ریزوں کو بھی زعمِ صنم آرائی ہے
رہ گیا نقطۂ موہوم فنِ آذر بھی

دل کا آئینہ ہے شفاف و مجلّٰی، لیکن
کس نے دیکھا ہے مگر اِس کے کبھی اندر بھی

موت لافانی حیات اُس کی حیاتِ جاوید
آہ! جس کو نہ میسر ہو سکوں مر کر بھی

اُن کے کوچے سے جو لوٹے تو نہ تھے ہوش و حواس
اب یہ عالم ہے کہ ملتا نہیں اپنا گھر بھی

چاہیئے کچھ تو زمانے میں پنپنے کا شعور
زندگی جنتِ عشرت بھی ہے اور دوبھر بھی

تجزیہ تلخ حقائق کا ہو کیوں کر رونقؔ
وقت افسانہ سہی اس میں ہیں خیر و شر بھی

منظر حسن دسنوی

غمِ جہاں ہے حیات آفریں صبا کی طرح
وبالِ دوش نہیں پیرِ تسمہ پا کی طرح

عروسِ فن کے سنورنے کا کیا بھلا امکاں
جہاں غرورِ سخن عام ہو وبا کی طرح

نقاب رُخ سے اٹھاؤ ذرا اِدھر دیکھو
نگاہ شوق ہے پھٹی ہوئی قبا کی طرح

فتادگی ہے زمیں پر بصورتِ سایہ
بلند حوصلہ ہے عازمِ خلا کی طرح

کرم بھی شانِ تلوّن کی ایک صورت ہے
جفائیں ہوتی ہیں ہم پر مگر وفا کی طرح

ہمیں پہ جبر کرو اور ہمیں سے داد بھی لو
یہ ایک ظلم ہے ہر ظلمِ ناروا کی طرح

تلاشِ گلشن و گل میں رہا جنوں سرا
بہار جا بھی چکی رخشِ باد پا کی طرح

چمن میں آتشِ گل سے نہ آشیاں جلتا
نہ ہوتی گھات میں قسمت اگر قضا کی طرح

مہدی پرتاب گڈھی

دل کی محراب میں قندیل جلانے والا
ہے کوئی غم کے اندھیرے کو مٹانے والا

دل کا یہ شہر تو ہے آج کھنڈر کی صورت
اس خرابے میں نہیں اب کوئی آنے والا

اپنی تنہائی کو سینے سے لگا کر سو جاؤ
اب تو آنے سے رہا لوٹ کے جانے والا

اب سے پہلے تو نہیں تھی یہ فصیلِ نفرت
آ گیا کون یہ دیوار اٹھانے والا

ہوں اسی لمحے کا مشتاق جب وہ آئے گا
انگ دھرتی کی ستاروں سے سجانے والا

آج ہر غنچے کے سینے میں حرارت سی ملی
کون گلزار میں ہے آگ لگانے والا

عصرِ حاضر میں وہی مردِ مجاہد ٹھہرا
اک دیا بزمِ محبت میں جلانے والا

مندمل زخم کرو دو کہ یہ لمحے کٹ جائیں
کوئی ہنگامہ تو ہو رات جگانے والا

یہ فن و فکر کی معراج کہاں سب کو نصیب
کون مہدی کی طرح اشعار سنانے والا

نقد و نظر

سیرت بندہ نوازؒ | نور الحسینی سید غلام مصطفیٰ قادری چشتیؒ۔

خواجۂ دکن کی سیرت پر اب تک کئی کتابیں اور رسائل منظر عام پر آ چکے ہیں۔ خود حضرت خواجۂ دکن کی تصانیف سے بھی بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ فاضل مصنف نے متعدد کتابوں سے خواجۂ دکن بندہ نوازؒ کی سوانح حیات اور دینی خدمات قلمبند کی ہیں اور اس سے ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ سیر محمدی دوبارہ شائع ہو چکی ہے لیکن اس کے سوا دوسری کتابیں نایاب ہو گئی ہیں اس لئے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور قوی توقع ہے کہ یہ شائقین کیلئے اچھا تحفہ ثابت ہوگی۔

تازہ افسانے معہ حصّہ نظم | بشیر احمد طاہر۔ روڈ ۳ بنجارہ ہلز حیدرآباد ۳۴۔ ادبی ٹرسٹ بک ڈپو عابد روڈ حیدرآباد ۱۔ قیمت تین روپے

طاہر صاحب آئی اے ایس عہدہ دار رہ چکے ہیں اور ستھرا ادبی اور شعری ذوق رکھتے ہیں۔ انھیں عوام سے بہت قریب رہنے اور ان کی دشواریوں اور مشکلوں سے آگاہ ہونے کے مواقع حاصل ہوتے رہے ہیں اسی لئے معاشرہ کے حسن و قبح پر ان کی نظر گہری ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں ظرافت کا پہلو بھی پیدا کرتے ہیں اور طنز کا بھی درد و تاثر کی بھی کمی نہیں۔ ہر جگہ وہ اپنے تجربات کو جس کا انھوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے دلاویز پیرایہ میں بیان کرتے ہیں۔ آخری حصہ میں نظمیں بھی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر معاشرہ ہی سے ہے۔

مئے باقی | بشیر احمد طاہر۔ ناشر ولا اکیڈیمی۔ عزیز باغ۔ دار الشفا حیدرآباد۔ قیمت دو روپے پچھتر پیسے۔

یہ طاہر صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے۔ طاہر صاحب جبتک سرکاری ملازمت میں تھے کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ افسانہ نگار بھی ہیں اور شاعر بھی۔ انھوں نے اس دوران جو کچھ لکھا یا کہا وہ اپنے لئے تھا لیکن اب وہ سب کچھ عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ نظمیں شائستہ اور ستھرے مذاق کی غماز ہیں اور اس بات کی شاہد ہیں کہ شاعر نے فطرت کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ان نظموں میں بعض انگریزی سے ماخوذ بھی ہیں اور بعض ترجمہ بھی ہیں اور بیشتر طبعزاد۔ ترجمہ شدہ نظموں کے تعلق سے اگر وہ خود اس کا اظہار نہ کرتے تو انھیں بھی طبعزاد کہنے میں تامل نہ ہوتا وہ حرکت و حیات کے قائل ہیں اور ایک گونہ بے خودی اور سکون سے گریزاں اس لئے کلام میں گرمی ہے۔ جذبات کی رنگا رنگی نے بھی کلام کو دلکش بنا دیا ہے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

نیم کش (طنزیہ مضامین اور ڈراموں کا مجموعہ) مصنفہ بھارت چند کھنہ۔ ناشر: زندہ دلان حیدرآباد چوتھی پیشکش۔ صفحات: تین سو قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ ادبی ٹرسٹ بکڈپو۔

زیر نظر مجموعہ میں کرشن چندر کے پیش لفظ اور مصطفیٰ کمال کے حرف آخر کو چھوڑ کر (۲۹) مضامین اور سات ڈرامے شامل ہیں۔ قصۂ مختصر مصنف کے خود نوشتہ حالات زندگی ہیں ان سات ڈراموں میں زندہ شہید۔ ترپ کا پتہ۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اور کڑوی مٹھاس ہوا محل پروگرام میں نشر ہو چکے ہیں۔ زندہ شہید کا موضوع اچھوتا اور کسی عربی کہانی سے اخذ کیا گیا ہے۔ عہدہ دار کی پکار میں خواہ مخواہ کی تک بندی کی گئی ہے۔ "تین بھیا" کا موضوع فیملی پلاننگ ہے۔ ڈرامہ تین بھیاں اور ترپ کا پتہ پروپگنڈہ تحریریں ہیں۔ بیشتر ڈرامے تمثیلی یا ALLEGORICAL رنگ لئے ہوئے ہیں اور اپنے بانس بریلی ریڈیو کیلئے بہت ہی موزوں ڈرامہ ہے۔ ٹیلی فون میں حیدرآباد کی نسوانی زبان کا نمونہ ہے۔ حیدرآبادی نوجوان لڑکیوں کے کردار کی صحیح عکاسی کی گئی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی الھڑ جیتی جاگتی لڑکی کی گفتگو سن رہے ہیں۔ ان ڈراموں میں ہمیں بہت باذوق مزاح ملتا ہے۔ جو ابتذال سے دور اور اعلیٰ فن کاری کے قریب ہے۔ مضامین کے موضوعات متنوع ہیں۔ بعض مضامین پڑھکر ہنسی روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ قاری مزاح نگار کے فن اور شگفتہ انداز کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اب تک علامتی شاعری و مصوری پر جتنے مضامین لکھے گئے ہیں ان سب پر کھنہ کا مضمون بھاری ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ غلو و مبالغہ سے کام نہیں لیا گیا ہے نہ بے ڈھنگے پن سے ان چیزوں کا مذاق اڑایا گیا ہے یہ ان کے جذبہ ہمدردی کا ثبوت ہے۔ صرف واقعاتی بدحواسیاں کافی فطری انداز لئے ہوئے ہیں اگر آپ اپنا ذاتی گھر بنانے کے قائل نہیں ہیں تو ضرور بڑے پچھتاے گھر نہ بناکر۔ پڑھیئے۔ امید کہ آپ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرینگے۔

بھارت چند کھنہ اگلے وقتوں کے لوگوں کی صف میں آتے ہیں۔ غذائی اشیاء میں ملاوٹ کی شکایت جو انھوں نے جابجا اپنے مضامین میں کی ہے آج کی نسل کیلئے یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے (اور نہ اس نسل کے پاس اتنا زاید وقت ہے کہ وہ تھوڑی دیر ٹھہر کر اس بارے میں سوچے کیونکہ یہ نئی نسل اسی ملاوٹ کے زمانے کی پیداوار ہے یہ بات اور ہے کہ آج کا نوجوان تیس سال کی عمر کو پہونچ کر خود کو بڑھوں میں شمار کرنے لگا ہے۔

کبھی تو انھوں نے مالک مکان و پڑوسیوں کی شکایت کی ہے اور کبھی تو اپنے کلرکوں کی۔ انہیں سب سے قابل اعتراض بات یہ نظر آتی ہے کہ لوگ شہریت کے اصولوں سے واقف نہیں اور نہ صفائی کا خیال ہی

رکھتے ہیں۔ مصنف کی نازک مزاجی اور نفاست نے ان سے کئی دلچسپ مضامین لکھوائے ہیں اور کبھی یہ نفاست پسندی اپنی حدوں کو پار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب کبھی ان کی نظر نشست و برخاست کے غلط طریقوں یا بدتمیزی یا غیر معیاری اور بے ڈھنگی باتوں پر جاتی ہے تو ان کا قلم حرکت میں آجاتا ہے۔ ان کی طبیعت کی یہ نفاست نہ تو نانا شاہی دماغ کا نتیجہ ہے اور نہ مصنوعی یا خود پر طاری کردہ نفاست ہے بلکہ یہ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے یہ نفاست ایک نئی دنیا کی تشکیل میں مدد و معاون ہوسکتی ہے۔ ان کے اکثر موضوعات نچلے متوسط طبقے اور متوسط طبقے سے ان کی ہمدردی اور دلچسپی کا ثبوت ہیں۔ یہ ان طبقوں کی مشکلات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ یہ بات انہیں شیشے کے گھر سے نکال کر ہمارے اور آپ کے بیچ لا کھڑی کر دیتی ہے اگر ان کی تحریر کا سکوپ اور دائرہ اور وسیع ہوتا تو بہتر تھا۔ پھر بھی موصوف نے اپنے محدود تجربے روز مرہ گھر اور اپنے ذاتی و نجی ماحول کے جتنے بھی موضوعات ان کی دسترس میں تھے) کو شگفتہ و شوخ اور تیکھے انداز میں کامیابی سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے بعض اوقات ان کا جبر دآ فریں۔ ناصحانہ انداز اکتاہٹ کا باعث بن سکتا ہے مگر وہ اپنے مضامین میں کبھی بھی بالکل سپاٹ نہیں ہو جاتے اور نہ بسیار نویس و غیر محتاط ہونے کا الزام ان پر عاید ہوسکتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ سوچ بچار کر کے لکھا ہے۔ وہ اپنے مزاح کی مخصوص فضا کو پیدا کرنے کیلئے مسجع و مقفیٰ زبان استعمال کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ جیسے تھی خبر گرم ان کے آنے کی اور کئی دوسرے مضامین میر امن کی زبان میں لکھتے ہیں۔ خاندانی منصوبہ بندی۔ بڑھتی ہوئی آبادی۔ طلباء میں نظم و ضبط کی کمی۔ ٹیکسوں کی بھرمار ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ اکثر و بیشتر مضامین میں نہ صرف ان موضوعات کی تکرار ہے بلکہ بعض الفاظ اور بعض محاوروں کو بار بار استعمال کرتے ہوئے نہیں تھکتے۔ ان کی شخصیت کا پر تو ہر ایک سطر میں نظر آتا ہے۔ خیالات کی تکرار کی موجودگی شاید اس وجہ سے ہو کہ مزاح نگار نے اپنے مزاح کو اپنی ذاتی زندگی سے الگ نہیں کیا ہے۔ یہ ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذکر اس پری وش کا قصہ مختصر۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ایک دوسرے کی سراسر نقل اور ان کی نجی زندگی کا نقش معلوم ہوتے ہیں۔

انھوں نے اپنے فن کا غلط استعمال نہیں کیا ہے۔ مگر ہمارا یہ پرخلوص مشورہ ہے کہ پروپگنڈہ قسم کی تحریروں سے احتراز ہو تو بہتر ہے۔ ورنہ فن اور کالم نگاری اور اشتہار بازی میں کوئی فرق نہ رہے گا۔

بھارت چند کھنہ کی تخلیقات کا یہ چوتھا مجموعہ ہے جو منظر عام پر آیا ہے۔ یقیناً اس آخری مجموعے (ترنیم کش) نے ان کے مقام کو متعین کر دیا ہے اور انہیں جنوبی ہند کا سب سے بہتر و باسلیقہ طنز و مزاح نگار بنا دیا ہے۔ انتیس مضامین اور سات ڈراموں کے اس مجموعے کی قیمت صرف پانچ روپیہ رکھی گئی ہے۔ (یہ بہت کم ہے) ادارۂ زندہ دلان حیدرآباد اس سلسلے میں قابل مبارکباد ہے۔ ڈسٹ کور کا سہ رنگی ٹائیٹل اور کچھ واضح ہوتا تو مناسب تھا کیونکہ ایک نظر میں کتاب کا نام پڑھ لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

([illegible])

سب رس

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہانہ

جلد ۱۰ شمارہ ۹ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۷ء

زیر نگرانی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
زیرِ ادارت۔ معین الدین احمد انصاری

چندہ سالانہ بچوں کا سب رس عہ
فی پرچہ دو آنے

اس پرچے کے مضامین

محمد الرحمن [illegible] کے اہتمام سے دستگیری پریس میں طبع ہو کر خیرت آباد سے شائع ہوا

آپ کی ہماری باتیں

لیجئے یہ ستمبر کا سب رس ہے۔ سب سے پہلے آپ ہماری طرف سے پیاری عید کی پیاری اور دلی مبارک باد قبول فرمائیے، خدا آپ کو اور ہمیں ایسی ہزاروں اور لاکھوں عیدیں نصیب کرے اور ہر روز ویسی ہی خوشی اور لطف کے ساتھ گزرے جیسا عید کا دن گزرتا ہے۔ اب آپ اپنے پیارے سب رس کے مضامین پڑھیے۔ میٹھی میٹھی نظمیں گنگنائیے اور دلچسپ کہانیوں کو مزے لے لیکر پڑھیے۔

اس پرچے میں آپ ایک خاص چیز دیکھیں گے وہ ہے "برسات پر نظمیں"۔ یہ نظمیں وقت اور موسم کے لحاظ سے خوب ہیں، برسات کی رم جھم، رم جھم کی لے کے ساتھ آپ ان پیاری پیاری نظموں کو گائیے اور جھوم جائیے۔ اس پرچے سے ایک طویل قسط وار کہانی چھپنے والی تھی مگر برسات پر نظمیں کی وجہ سے اسے روک لینا پڑا۔ امید ہے آپ اسے گوارا کرلیں گے۔ انشاءاللہ آئندہ پرچے سے وہ دلچسپ کہانی شروع کر دی جائے گی۔ اس دفعہ سب رس معموں کے حل بھی چھپ رہے ہیں جن کا آپ کو بڑے دنوں سے انتظار تھا۔ صحیح حل سے ملا کر دیکھئے آپ نے کہاں بھول کی ہے اور اگر بالکل صحیح ہے تو ہماری جانب سے انعامی کتابوں کے حقدار ٹھیرائے جانے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ اچھا اب خدا حافظ۔ آئندہ مہینے ملاقات ہوگی۔

معین الدین احمد انصاری

عید مُبارک

آیا ہے پھر آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے
عیدی ویدی دھوم دھڑکا دودھ سویّاں لایا ہے
آیا ہے پھر آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے

صبح سویرے جلتا پانی امّی نے نہلایا ہے
نیلی بُند کی والا کرتا آپا نے پہنایا ہے
اچھے کپڑے رومی ٹوپی میری اچکن لایا ہے
آیا ہے جی آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے

پیلے پھولوں والا کرتا رضّو نے بنوایا ہے
کالا دوری والا جوتا شمّو نے منگوایا ہے
آپا کا بھی لال دوپٹہ عید ہی نے تو لایا ہے
آیا ہے پھر آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے

منّے نے سینڈل کا تسمہ ابّا سے بندھوایا ہے
دادی کی آنکھوں کا سرمہ بہہ کہاں تک آیا ہے
کچھ ہو بھیّا عید کا دن تو میرے من کو بھایا ہے
آیا ہے جی آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے
عیدی ویدی دھوم دھڑکا دودھ سویّاں لایا ہے   آیا ہے پھر آیا ہے ہاں عید کا دن پھر آیا ہے

چرواہے کا لڑکا

کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کی ملکہ بڑی عقلمند اور نیک دل عورت تھی۔ بادشاہ اور ملکہ کو خدا نے دھن دولت، حکومت اور سلطنت غرض سب ہی کچھ دیا تھا۔ مگر ان کے ہاں اگر کمی تھی تو اولاد کی۔ ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا۔ ملکہ بھی بادشاہ کے ساتھ تھی۔ بادشاہ اور ملکہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گڈریے کا بچہ بھینسوں اور گائیوں کو پانی پلانے کے لئے تالاب کے کنارے لایا اور وہ جانوروں کے ساتھ خود بھی چوپایوں کی طرح پانی پی رہا ہے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ نے ملکہ سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اس کی ماں چوپایہ تھی یا باپ چوپایہ تھا جب ہی تو اس میں یہ جانوروں کی خصلت ہے۔ ملکہ نے کہا نہیں بلکہ یہ صحبت کا اثر ہے دراصل وہ بچہ انسان ہی کا ہے۔ بادشاہ اپنی ضد پر تھا اور ملکہ کا کہا نہیں مانتا تھا۔ اس پر ملکہ نے کہا اگر اجازت ہو تو میں اس بچے کی پرورش کروں۔ بادشاہ نے اجازت دیدی۔ ملکہ نے بچے کے ماں باپ کا پتہ لگا کر بچے کے عوض میں ان کو کافی رقم دی اور بچے کو اپنے ساتھ شہر لے آئی۔ ملکہ اس بچے کو خاص اپنی نگرانی میں پرورش کرنے لگی۔ بچے کے لئے استاد اور نگران کا تقرر کئے گئے۔ سپاہیوں کے فن سکھلائے گئے۔ غرض ملکہ نے چار پانچ سال میں اسے ہر فن میں طاق کر دیا۔ ملک کی تمام

زبانیں وہ اچھی طرح بول اور سمجھ سکتا تھا۔ ملکہ نے اس کو تمام بادشاہی طریقے، مجلسوں کے آداب اور دربار کے آداب سکھلائے مگر اس تمام عرصے میں ملکہ نے اس بچے کو بادشاہ کی نظروں سے اوجھل رکھا۔ جب وہ ہر فن میں ماہر ہوگیا تو ایک دفعہ سالگرہ کے موقعہ پر دربار میں اس بچے کو شاہانہ لباس میں ملکہ نے روانہ کیا تاکہ وہ بادشاہ کو نذر گزرانے۔ جب وہ نذر دینے کے لئے آیا تو بادشاہ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ اس پر لڑکے نے جواب دیا کہ "جہاں پناہ کا ایک ادنیٰ نمکخوار۔ دربار کے بعد جب بادشاہ محل میں آیا تو اس نے ملکہ سے اس لڑکے کی بڑی تعریف کی۔ ملکہ نے کہا اگر آپ اس کا امتحان بھی لیتے تو اچھا تھا چنانچہ ملکہ کے اشارے پر لڑکا حاضر کیا گیا۔ بادشاہ نے اس کا مختلف علوم وفنون میں امتحان لیا اور پھر فنون سپہ گری میں اس کو ماہر پاکر بہت خوش ہوا اور بے اختیار بول اٹھا "تم تو شہزادے معلوم ہوتے ہو"۔ اس پر ملکہ نے کہا "یہ وہی لڑکا ہے جو کسی دن تالاب میں منہ لٹکا کر پانی پی رہا تھا"۔ بادشاہ کو یہ سن کر حیرت ہوئی اور اس نے کہا "واقعی صحبت اور تربیت انسان کے لئے بڑی چیز ہے"۔ اور ملکہ کی عقلمندی کی بادشاہ تعریف کرنے لگا۔ آخر ملکہ کی سفارش پر بادشاہ نے اس چرواہے کے لڑکے کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ تربیت کی بدولت ایک چرواہے کا لڑکا ایک بڑی سلطنت کا مالک اور عقلمند ملکہ کا بیٹا بن گیا۔ تمام بھائیوں اور بہنوں کو اس کہانی سے یہ سبق حاصل کرنا چاہیے کہ اچھی اور بری تربیت سے آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے۔

سید صفی اللہ حسینی

آئی لو برسات پھر آئی

بادل کا آنچل لہراتی
بجلی کے کنگن چمکاتی
دامن کی نمناک ہوا سے
دل کو آتش زار بناتی
آئی لو برسات پھر آئی

ویرانوں میں آئی بہاریں
جنگل جنگل مور پکاریں
دھرتی کے پیاسے ہونٹوں پہ
امرت کی پڑتی پھواریں
آئی لو برسات پھر آئی

عزیز فاطمہ

برسات آئی ہے

گھنگور گھٹا اب چھائی ہے
برسات کی رت اب آئی ہے
باغوں میں کوئل بولے ہے
کچھ اپنا بھی دل ڈولے ہے
گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں
برسات کا موسم لائی ہے

شمشاد احمد خاں
(فرخ آباد)

بارش کے بعد

جس سمت دیکھو بچو!
غنچے ہیں کھلکھلاتے
پیڑوں کی ڈالیوں پر
طائر ہیں چہچہاتے — فصل بہار آئی فصل بہار
یہ ڈالیاں چمن کی
جو پہلے جھک گئی تھیں
اب کیسی تن گئی ہیں
کیسی ہری بھری ہیں — فصل بہار آئی فصل بہار
جس سمت دیکھتا ہوں
کچھ رنگ ہے نرالا
بچوں نے ڈالیوں پر
آکر ہے جھولا ڈالا — فصل بہار آئی فصل بہار
کیوں بیٹھے ہو گھروں میں
اٹھو مزے اڑاؤ
چل کے باغ جاؤ
دکھ درد کو بھلاؤ — فصل بہار آئی فصل بہار

وحیدہ

برسات کا موسم

لو بارش کا موسم آیا | اپنے ساتھ وہ پانی لایا
ہاتھ میں سب کے اب چھتری ہے | اور سیکل پر اک گٹھڑی ہے
نام ہے گٹھڑی کا برساتی | پانی میں وہ کام ہے آتی
اک دن وہ بیزار سا ہو کر | ساتھ اپنے برساتی لے کر
نکلے باہر جب ہم گھر سے | ننھے ننھے قطرے برسے!
زور سے اک دم پانی آیا | چھوٹے چھوٹے اولے لایا
چُن کے ان کو گھر لے آئے | سب نے مل کر اولے کھائے

محمود معین الدین سلیم

برسات

ٹھنڈی ٹھنڈی آئی ہوائیں | کالی کالی چھائی گھٹائیں
کالے نیلے بادل آئے | پانی اپنے ساتھ ہیں لائے
کالی کالی صورت لے کر | گاتے ہیں یوں خوش وہ ہو کر
برسیں گے برسائیں گے | کوڑی کھیت لگائیں گے
کوڑی گئی ریت میں | پانی گیا کھیت میں

عبداللہ خاں شاد
(آگرہ)

برسات کا ایک دن

دو تین روز سے پھر   بادل کڑک رہے ہیں
بادل کے ساتھ تارے   اب بھی چمک رہے ہیں
بارش نہ رکنے سے اب   بچے پھڑک رہے ہیں
اوڑھے ہوئے ہیں چادر   آنکھیں جھپک رہے ہیں
جھینگر بھی گا رہے ہیں   مینڈک پھدک رہے ہیں
جھولے پڑے ہوئے ہیں   کڑھاؤ پک رہے ہیں
بجلی کا سن کے کڑکا   سب دل دھڑک رہے ہیں

کوکب کے گھر کو چھوڑو
سب گھر ٹپک رہے ہیں

کوکب قدر سجاد (کلکتہ)

سنہرے پھول

۱۔ کسی کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے دو!
۲۔ اپنے دشمن کو بھی ہمیشہ دوست سمجھو!
۳۔ اپنا احسان کسی پر نہ جتاؤ!
۴۔ یہ یاد رکھو کہ دولت عقل سے بہتر نہیں ہوسکتی!
۵۔ ہر بات میں انصاف اور ہر کام میں اعتدال قائم کرو

محمد فہیم صدیقی

سفید سانپ

جاڑے کا موسم تھا۔ اندھیری رات تھی اور بارہ بجے کا وقت۔ سب مزے سے اپنے اپنے بستر میں سو رہے تھے۔ صرف میں قسمت کا مارا بستر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ میرا امتحان سر پر کھڑا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی، میں چارپائی سے اٹھا۔ مفلر گلے سے لپٹا اور "اچھا" کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا "کون ——؟" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "ارے بھئی کھولو تو!" آواز کچھ پہچانی سی معلوم دی۔ دروازہ کھولا تو چچا کو دروازے پر موجود پایا۔ چچا جان چار سال کی جنگی خدمت کے بعد خیر سے گھر لوٹے تھے، میری تو خوشی کی حد نہ رہی۔ سچ مچ اگر اکیلا ہوتا تو پاگلوں کی طرح ناچنے لگتا۔

میں زور زور سے پکارا "چچا جان آ گئے!!" اب کیا تھا، سب کے سب آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ چھوٹے بھیا اور دیدی تھے، کہ ان کے گلے سے لپٹے جا رہے تھے۔ امی اور ابا بھی خوشی سے رو دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سب چپ ہو گئے، اور چچا جان اپنی رام کہانی بیان کرنے لگے۔ امی نے سوچا سردی میں آ رہے ہیں پہلے چچا جان کے لئے چائے بنوائی جائے۔ انھوں نے سلمیٰ کو پکارا۔ "سلمیٰ بیٹی—— ذرا چچا جان کے لئے چائے تو بنا دو۔ سردی میں آ رہے ہیں نا!" سلمیٰ بڑی فرمانبردار تھی، فوراً اپنی جگہ سے اٹھی اور باورچی خانے کی طرف چلی، اس نے

ابھی بڑے کمرے سے قدم باہر رکھا ہی تھا کہ اسے اندھیرے کی وجہ سے ڈر لگنے لگا۔ باورچی خانہ یوں بھی کمرے سے الگ تھلگ مکان کی پرلی نکڑ میں تھا۔ آخر اس نے ثریا کو ساتھ لیا، اور اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ پچھلے کچھ دنوں میں تھوڑی سی بارش بھی ہوئی تھی اس سے باورچی خانے کا دروازہ بہت سخت ہوگیا تھا۔ سلمیٰ اور ثریا نے ملکر بہتیرا زور لگایا مگر وہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ ثریا کی تجویز پر سلمیٰ نے اب زور سے لات دروازے پر ماری، اور دروازہ کھل گیا۔ "اوئی سانپ!" دروازہ کھلتے ہی انھیں فرش پر کوئی چیز نظر آئی، جس سے ڈر کر وہ فوراً بھاگ آئیں۔ باورچی خانے کا دروازہ آپ سے آپ بند ہوگیا۔ اور وہ دونوں ہانپتیں کانپتیں اسی بڑے کمرے میں پہنچیں جہاں سب بیٹھے ہوئے تھے۔

"سانپ سانپ" کی آواز سنی تو سب چونک پڑے۔ "میرے اللہ!" ـــ امی گھبرا کر بولیں "اب کیا ہوگا!......

میرے خدا" ـــ چچا جان بڑے بہادر تھے، بولے "تم سب ٹھیرو۔ میں اٹھتا ہوں میں نے اکیلے ہی برما کے جنگلات میں سیکڑوں سانپ مارے تھے۔ اور وہ بھی اس اکیلی تلوار سے ــ" ایک تلوار ان کی میان سے نکلی اور ان کے دائیں ہاتھ میں چمکنے لگی۔ "یوں کرو" ابا جان بولے "ایک تپائی لے چلو۔ اس پر چڑھ کر پہلے کھڑکی میں سے ہاتھ ڈالیں گے اور باورچی خانے کی بتی کا بٹن دبالیں گے"۔

ایک تپائی اٹھا کر اباجان اور چچاجان دونوں باورچی خانے کے پاس آئے۔ پیچھے پیچھے سب سہمے ہوئے بچے اور ان کی لیڈر امی تھیں۔ اباجان نے تپائی باورچی خانے کی دیوار کے پاس رکھی، اور پھر اوپر چڑھ کر کھڑکی میں سے اپنا ہاتھ بڑھایا، اور اندر کی بتی کا بٹن دبا دیا۔ اس کے ساتھ ہی چچاجان بھی تپائی پر چڑھ گئے اور دونوں نے اندر دیکھا، سانپ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا، ہاں شمع دان کے پاس دودھ کی پتیلی اوندھی پڑی تھی، اور دودھ کی ایک موٹی تہہ بہتی ہوئی دروازے کی طرف آ رہی تھی۔ شاید یہ بلی کا کرشمہ تھا۔

"سفید سانپ" پر جب نظر پڑی تو سب سہمے ہوئے چہرے کھلکھلا اٹھے۔

عبدالباسط نعیم

نصیحت کے پھول

۱۔ وقت ایک قیمتی سونا ہے، ہر پل کا حساب رکھو۔
۲۔ محنت ہی ترقی کا گر ہے۔
۳۔ علم دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔
۴۔ جو کام آج ہو سکے اسے کل پر نہ ڈالو۔
۵۔ لوگوں سے ایسا سلوک کرو جیسا تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔
۶۔ جو کام تم خود کر سکتے ہو اسے اوروں پر نہ چھوڑو۔

شاہد علی خاں

سب رسی معمہ نمبر ۵

(بابتہ ماہ ستمبر)

■	ر		۸ م		۱ س
۱۰ ب		ب	۲	■	
	■			۹ ن	۳
	۷	■	ان		۴ ھ
م	ر	۶	■		۵

اشارے دائیں سے بائیں

۱۔ یہ ...... کے مہینے کا سب رسالہ
۲۔ گوشت کو سکھا کر بھی ...... بنائے جاتے ہیں
۳۔ ...... کی بری عادت ہے۔
۴۔ بال
۵۔ انگریزی زبان کا ایک حرف
۶۔ روٹی ...... ہوتی ہے۔
۷۔ انسان کا ایک حصۂ جسم۔

اشارے اوپر سے نیچے

۱۔ ...... کا رنگ کالا ہے۔
۲۔ انسان کا ایک عضو۔
۷۔ انسان کا ایک حصہ جسم۔
۸۔ آج کل ...... نہیں ملتے۔
۹۔ ...... کاغذ کی صد اچھی ہے۔
۱۰۔ بعض آدمیوں کے یہ بھی نام ہوتے ہیں۔

قواعد

۱۔ معمہ کا صحیح حل وہی سمجھا جائے گا جو دفتر سب رس میں محفوظ ہے۔

۲۔ صحیح حل بھیجنے والے تمام بچوں کو انعامی کتابیں روانہ کی جائیں گی۔

۳۔ بچے ایک سے زائد حل بھیج سکتے ہیں۔

۴۔ معمہ کے ہر حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ بھیجنا لازمی ہے۔

۵۔ معمہ کے تمام حروف روشنائی سے پُر کئے جائیں اور خوش خط ہوں۔

۶۔ حل دفتر سب رس رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

۷۔ حل بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۴۶ء ہے۔

ادارہ

سب رسی معمہ نمبر۲ کا حل

ن	ا	۶ پ	۵ ا	۱ ج
▨	ا	ل	د	۲ گ
ل	د	ا	۳ ب	▨
▨	ر	و	ے	ز
د	▨	▨	ا	و
و	ل	ا	ت	ر

سب رسی معمہ نمبر۲ کا صحیح حل ہے جو ماہ مئی ۷۲ء کے سب رس میں چھپا تھا۔ اس معمے کے کل ۸۰ حل مقابلے میں شرکت کے قابل سمجھے گئے۔ ایسے حل جو مشتبہ یا مشکوک تھے انھیں قبول نہیں کیا گیا۔ اس طرح کل (۱۸) سب رسی بہن بھائیوں کے حل بالکل صحیح ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ محمد مسعود حسن خاں (حیدرآباد) ۲۔ پنڈھری ناتھ سرشار (اشرآباد) ۳۔ نازنین راؤ (اشرآباد) ۴۔ چھدرنا متعلم چہارم (جانبلی دلیور) ۵۔ سید علی حسن نقوی (حیدرآباد) ۶۔ افتخار احمد اقبال (حیدرآباد) ۷۔ سید ابرار حسین اظہر (امراؤتی) ۸۔ کنیز زینب (مدرسہ نسواں گرہلی) ۹۔ مصطفیٰ علیخاں (ناندیڑ) ۱۰۔ سید عزیز الرحمٰن غازی پاشا (حیدرآباد) ۱۱۔ جنھوں نے اپنا نام لکھا ہے پتہ نہیں لکھا۔ اور پتہ لکھا نام نہیں لکھا ۱۲۔ فضل مرزا صاحب محاسب تعمیرات کرینگر ۱۳۔ غوثیہ بیگم (محبوب نگر) ۱۴۔ زاہدہ سلطانہ (شاہ پور) ۱۵۔ شہاب الدین (کاماریڈی) ۱۶۔ محمد عتیق اللہ (حیدرآباد) ۱۷۔ نجمہ تسنیم صمدانی (مدرسہ تحتانیہ نسواں گلبرگہ) ۱۸۔ احمد محی الدین (جنگاؤں) ۱۸۔ قادر محی الدین جدی (جنگاؤں)

ان تمام (۱۸) سب رسی بھائی بہنوں کے نام بہت جلد انعامی کتابیں روانہ کردی جائیں گی۔ نمبر (۱۱) اپنا نام جلد سے جلد ہمیں بھیج دیں تاکہ ان کے پتہ پر کتاب روانہ کی جا سکے۔

ادارہ

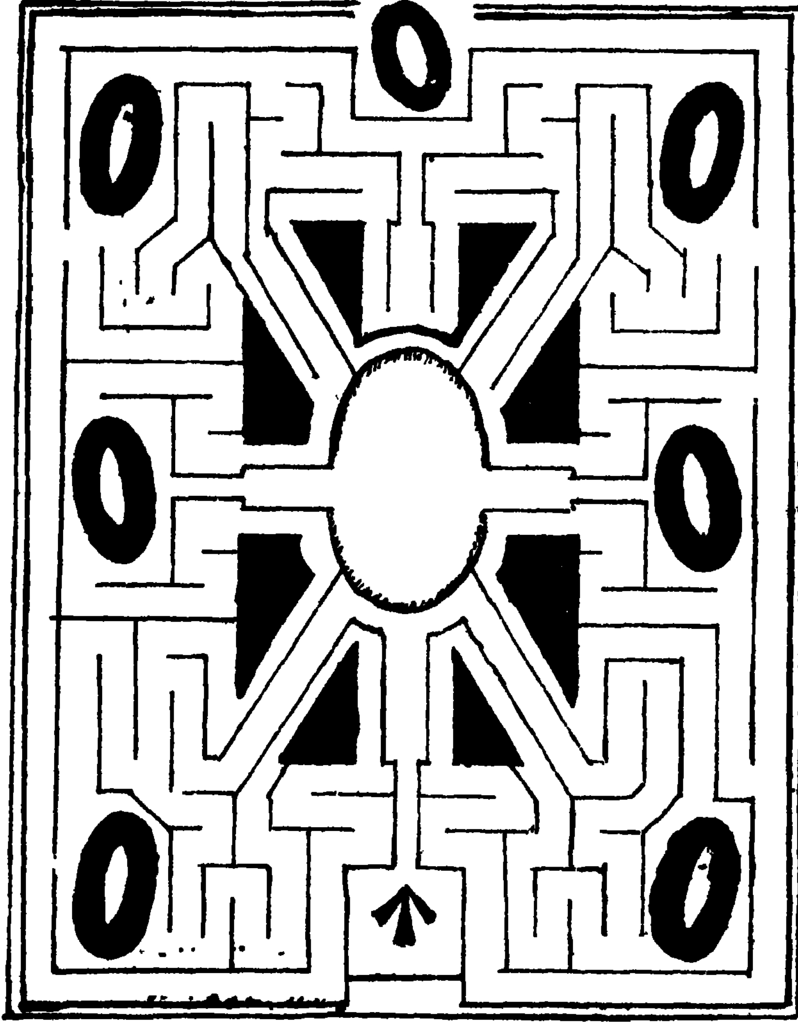
سب رسی معمّہ نمبر (۳) کا حل

یہ سب رسی معمّہ نمبر۳ کا صحیح حل ہے جو جون کے پرچے میں چھپا تھا۔

چ	ا	ن	د	■	ا
و	ن	■	ا	■	ک
ک	■	■	ن	ق	ب
■	ا	ن	ہ	ت	ر

تمام شرکت کرنے والے بھائی بہنوں میں سے صرف ۳ بچوّں کے حل اس سے بالکل مطابق ہیں ان بچوں کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ این آر بھوج جلے بتوسط خریدار نمبر۸۳۹ ناوندگی۔ ۲۔ قدرت نبی محسن خریداری نمبر۳۔ اقبال نواب کوچہ صورت مونث۔ ان کو بہت جلد انعامی کتابیں روانہ کردی جائیں گی سب رسی بھائی ہماری جانب سے صحیح حل اور انعامی کتابوں کے حقدار ٹھیرائے جانے پر مبارکباد قبول کریں۔ ہم چند ایسے نام بھی لکھتے ہیں جن کے حل صحیح حل سے بہت ہی قریب تھے۔ وہ قادر محی الدین جدّی۔ حاجی احمد۔ بی رمیش چندرا۔ ین پنڈھرنی ناتھ سرشار۔ محمد فہیم صدیقی رام چندرا ریڈی۔ نعیم ارشد مسولی (یو۔پی) زہرہ رحمت اللہ۔ کلیم صدیقی۔ اظہر الدین انصاری۔ افتخار احمد اقبال۔ حمید الماس۔ غلام نبی (قندھار شریف) محمد منظہر الدین احمد۔ ناہد سلطانہ (شاہ پوری) اور باقی تمام بچوں کے حلوں میں بہت زیادہ غلطیاں ہیں۔

انگوٹھیوں کا چکر



پاروں طرف ان بکھری ہوئی سونے کی انگوٹھیوں کو آپ درمیان والے حلقہ میں پہنچا دیں
ڑی مہربانی ہوگی. کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟ آزما دیکھیے۔

ادارہ

ہنڈ کلھیا

کیک۔ سب رسی بہنو آج ہم کیک بنائیں۔ آپ بھی کھائیں اور ہم بھی کھائیں۔ بنانے کی ترکیب یہ ہے۔

تعداد اشیاء :۔ ایک چمچہ بیکنگ پوڈر۔ پاؤ سیر میدہ، پاؤ سیر شکر، پاؤ سیر گھی یا مسکہ، چار انڈے۔ پہلے انڈوں کو خوب پھینٹ لیں اس کے بعد اوپر لکھی ہوئی چیزوں کو ڈال کر فوراً اور پھینٹ لیں بعد ازاں سانچوں میں ڈال کر بڑی بڑی سینوں میں رکھ کر دم دیں اور گرم گرم ہی کیک سانچوں سے نکال لیں۔ لیجئے مزے دار کیک تیار ہیں کھاتے وقت ہمیں نہ بھول جائیے۔

عزیز فاطمہ (معین منزل)
(کرینگر)

کریم پڈنگ۔ تعداد اشیاء :۔ خوبانی ۱۵ عدد۔ انڈا ایک عدد۔ دودھ پاؤ سیر۔ شکر ۳ چھٹانک۔ میدہ ۲ بڑے چمچے (چوٹی دار نہ لیں) ونیلا ایسنس حسب پسند۔ ترکیب :۔ خوبانیوں کو خوب دھو کر پاؤ سیر پانی میں ابال لیں۔ جب وہ بالکل گھل جائیں تو بیج نکال لیں اور انھیں پھوڑ کر بادام پانی میں بھگو لیں۔ تین چھٹانک شکر کے دو برابر حصے کر کے ایک حصہ میں سے دو چمچے چار کے شکر کم کر کے چھوٹا حصہ خوبانیوں میں ڈال کر پکائیں۔ گاڑھا شیرہ ہونے پر بھگوئے ہوئے بادام کو چھیل کر آدھے آدھے کر کے پکی ہوئی خوبانیوں پر بچھا دیں۔ اب انڈے کی صرف سفیدی لیکر خوب پھینٹیں جب کف آ جائے تو زردی بھی ڈالکر پھینٹ لیں اور دودھ کو جوش دیکر اس میں میدہ اچھی طرح گھول لیں۔ پھینٹا ہوا انڈا اور بچی ہوئی شکر ڈالدیں۔ چولھے پر چڑھا کر چمچہ برابر چلاتی رہیں۔ لئی کا سا گاڑھا ہونے پر اتار لیں اور ونیلا ایسنس ملا کر پکی ہوئی خوبانیوں پر اس کو ہموار بچھا دیں۔ ٹھنڈا ہونے پر رکھا جائیے۔ بہت لذیذ پڈنگ ہوگی۔

امت الوحید خالد

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۵ شمارہ (۹)

ستمبر ۱۹۷۲ء

ماہنامہ

سب رس (ادارہ نمبر)

زر سالانہ آٹھ روپے زر ششماہی چار روپے غیر ممالک سے پندرہ روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونہ کے پرچہ کے لئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر ۔ سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ملک ۵۰۰۰۰۴ اے پی سے شائع ہوا۔

ترتیب

تاثرات :—

مصروفیات ادارہ :—

تاثرات

دوران ۱۹۷۱ء ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات بالتحریر شائع کئے اُن کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں (ادارہ)

۱- جناب ڈاکٹر محمد عبدالرحمن بارکر صدر شعبۂ اُردو مکگل یونیورسٹی مانٹریال (کناڈا)

السلام علیکم رحمۃ اللہ، عرض ہے کہ اِس ادارے میں ایسی خوبصورت اور نایاب نوادرات محفوظ ہیں جن سے دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ، کاش کہ میں ایک زندگی یہاں گزار سکتا تاکہ اِن کتب، نسخ، فرامین وغیرہ سے پوری طرح استفادہ ہو سکتا۔ ایک دن میں دیکھنا تو نا ممکن ہے لیکن اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ اِس ادارے میں ہزاروں کی تعداد میں ایسی نادر چیزیں موجود ہیں جن سے ہر اُردو داں اور ادیب کا دل خوش ہو جاوے گا۔ اُمید ہے جو نادر اور نایاب نسخے ہیں وہ دوبارہ شائع ہو جاویں گے اور بر سرِ عام آویں گے۔ ادارہ کے لیے اور اس کے منتظمین اور ملازمین کے لئے تہہ دل سے دعا ہے اور ان سے توقع ہے کہ وہ پوری طرح اُردو کی خدمات سرانجام دیتے رہیں۔" آمین"

(۲۲ مئی ۱۹۷۱ء)

۲- جناب انور کمال حسینی صاحب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی ۲

میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ آج "ایوانِ اُردو" دیکھنے کا موقع ملا۔ اُردو کا اتنا زبردست کام۔ قابلِ تعریف ہیں وہ لوگ جو اس کام میں شریک تھے اور شریک ہیں اور شریک رہیں گے۔ نادر اشیاء کا کلکشن ایک عظیم کارنامہ ہے۔ لائبریری بے مثل ہے، خاص طور سے قدیم اُردو اخبارات کا کلکشن اُردو صحافت سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ زندگی میں اگر موقع ملا تو انشاءاللہ دوبارہ حاضر ہو کر فیض یاب ہونے کی کوشش کروں گا۔ دعا ہے اور نیک، خواہش ہے کہ ادارہ ہمیشہ قائم و دائم اور ترقی کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ (۳ جولائی ۱۹۷۱ء)

۳- ہز اکسلینسی ڈاکٹر محمد تقی مقتدری صاحب کنسل شہنشاہی ایران متعینہ حیدرآباد۔

اُردو کے اِس عظیم مرکز اور کتب خانے کو دوبارہ دیکھکر بے حد مسرت ہوئی۔ میں تہہ دل سے ادارہ کے کارکنوں کے خلوص اور لگن کا شکر گزار ہوں کہ یہاں علمی و ادبی ذخیرہ اچھی حالت میں محفوظ ہے اور ریسرچ اسکالرس اُن سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ ادبیاتِ فارسی کا گرانقدر سرمایہ جو یہاں ہے ہند ایران ادبی تعلقات کو آگے بڑھانے میں مدد و معاون

ثابت ہوگا۔ میں اِس ادارہ کی ہمہ جہتی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔ (۲۷؍ جولائی ۱۹۷۱ء)

۴۔ جناب ڈاکٹر محمود وفا القائف - تاجکستان - سوویت یونین۔

"ادارہ ادبیاتِ اردو میں آنے کی عزت حاصل ہوئی اور یہاں کے ادبی ذخیرہ، کتب خانہ، مخطوطات، تہذیبی میوزیم کو دیکھکر بہت محظوظ ہوا۔ کارکنوں کے خلوص سے میں بے حد متاثر ہوں۔ ادبی تحقیق کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ میں نایاب اور نادر چیزیں اچھی حالت میں محفوظ ہیں۔ اِس ادارہ کی جو شہرت سنی تھی، دیکھنے پر بہت زیادہ اہم ادبی مرکز معلوم ہوا"۔ (۵؍ اکتوبر ۱۹۷۱ء)

۵۔ جناب پروفیسر آر ایرپ - اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف کیلی فورنیا (برکلے)

"آج میں نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ کتب خانہ اور میوزیم کے نوادر دیکھے، یہاں کے مخطوطات اور نایاب ذخیرہ کو دیکھنے سے بڑی مسرت ہوئی۔ ادارہ ادبیاتِ اردو میں جو اردو کی ترقی اور اشاعت کیلئے کام ہو رہا ہے اُس سے میں بہت متاثر ہوا۔ ڈاکٹر زور بہت بڑا کام کر گئے ہیں اور آپ لوگ اِسے فروغ دے رہے ہیں، یہ جان کر بڑی خوشی اور اطمینان ہوا۔" (یکم دسمبر ۱۹۷۱ء)

۶۔ جناب حبیب حسن صاحب بالفقیہ سابق رکن بلدیہ، حیدرآباد

"ادارہ ادبیاتِ اردو کا دکن کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر یہ عظیم احسان ہے کہ اس نے تلاش و جستجو کرکے جس قدر میسر آسکے اُن جواہر پاروں کو جمع و محفوظ کرنے میں بڑی محنت کی ہے۔ حتیٰ کہ قدیم بیاضیں تک حاصل کرکے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ اِن میں کرم خوردہ بھی ہیں اور بعض بیاضوں میں کہیں نصف صفحہ غائب ہے کہیں پورا صفحہ غائب ہو گیا ہے۔ ادارہ نے اِنہی اوراقِ پارینہ کو جوڑ کر اُن کی حفاظت کا پورا پورا اہتمام کیا ہے۔ جتنا حصہ بھی بچ گیا اب وہ لاقیمت ہو گیا۔ ورنہ خاندانی کتب خانوں سے نکل کر قدیم مخطوطات انگلستان، جرمنی، فرانس اور ایشیا تک پہنچ جاتے۔"

(اقتباس مطبوعہ روزنامہ "سیاست" حیدرآباد مورخہ ۱۲- اپریل ۱۹۷۱ء)

مصروفیاتِ ادارہ

علمی ——— ادبی اور ——— ثقافتی

ادارے کی ۱۹۷۱ء کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۷۱ء

۲۶ر جنوری: — "تیسویں" یوم جمہوریۂ ہند" کے موقع پر ادارہ کی عمارت" ایوانِ اردو" پر جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد دفتر نے صبح ۸ بجے ترنگا پرچم لہرایا۔

فبروری ۱۹۷۱ء

پنجشنبہ ۴ر فبروری: — مجلس ادور امتحانات ادارہ کا اجلاس صبح ۹ بجے صدر ادارہ جناب سید علی اکبر صاحب کی قیام گاہ واقع ہمایوں نگر پر منعقد ہوا جس میں نتائج امتحانات منعقدہ دسمبر ۱۹۷۰ء کی منظوری دی اور نتائج بغرض اشاعت پریس کے حوالے کئے گئے اور ادارہ کے نوٹس بورڈ پر چسپاں کئے گئے۔

سہ شنبہ ۹ر فبروری: — ادارہ کی مجلس انتظامی کے رکن نواب عنایت جنگ کی ۵ر فبروری ۱۹۷۱ء کو عراق میں وفات کی اطلاع ملتے ہی ایوانِ اردو مرحوم کے سوگ میں ایک دن کے لئے بند کر دیا گیا۔ صدر ادارہ جناب سید علی اکبر صاحب اور معتمد اعزازی ڈاکٹر مہندر راج صاحب سکسینہ کی طرف سے تعزیتی بیان پریس کے حوالے کیا گیا جس میں نواب صاحب کی وفات کو ادارہ کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کہا گیا ہے۔ اور ادارہ کے تعلق سے اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔

ہفتہ ۱۳ر فبروری: —

جلسۂ تعزیت نواب عنایت جنگ مرحوم

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے" ایوانِ اردو میں ۵½ بجے شام جناب سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں نواب عنایت جنگ کا جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔

جناب پی ین گپتا (آئی۔ اے۔ یس) رکن مجلس انتظامی ادارہ نے تقریر کرتے ہوئے نواب صاحب کی

گرانقدر تہذیبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ وہ ادارہ کے کاموں میں سرگرم حصہ لیتے تھے دکن کی تہذیبی اور سماجی معلومات کا گویا وہ سرچشمہ تھے، ادارہ کے میوزیم اور مخطوطات کی ترتیب و تنظیم میں نواب صاحب کا شغف اور اُن کی عنایات بھلائی نہیں جا سکتیں ادارہ کے لئے اُن کا انتقال بہت بڑا صدمہ ہے

جناب مولوی محامد علی عباسی صاحب رکن مجلس انتظامی ادارہ نے بھی نواب صاحب کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور معلومات اس قدر رکھتے تھے کہ دکن کی صدیوں کی تاریخ پر جب بولتے تو سننے والے متحیر ہو جاتے۔ ادارہ کی اکثر کمیٹیوں میں نواب صاحب کے مشوروں اور معلومات سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔ اُنھیں اُردو زبان و ادب اور دکنی کلچر سے عشق سا تھا۔ عرصے تک اُن کی کمی محسوس ہو گی۔

جناب میر ممتاز حسین خاں نے نواب صاحب کے خاندانی حالات پر روشنی ڈالی اور اُن کے وطنی اور قومی جذبات کو خراج عقیدت ادا کیا اور کہا کہ اُنھوں نے اپنی کوٹھی "حسینیہ" کو عزاداری کے لئے وقف کر کے نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔

جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب آفس سکریٹری ادارہ نے ایوانِ اُردو کے میوزیم کے لئے نواب صاحب نے جو نادر اور نایاب اشیاء مرحمت فرمائی تھیں اُن کی تفصیلات سے واقف کراتے ہوئے اُن کی ادارے سے وابستگی کا ذکر کیا۔

جناب راحت عزمی اور وقار خلیل نے نظموں کے ذریعہ نواب صاحب کو خراج عقیدت ادا کیا۔

صدر ادارہ جناب سید علی اکبر صاحب نے صدارتی تقریر میں فرمایا کہ ادارہ کا اُردو میوزیم نواب صاحب کی قیمتی یادگار بن گیا ہے۔ مرحوم دکن کی تاریخ کے حافظ تھے اکثر اسکالر دکنی تاریخ اور ادب کے مختلف گوشوں پر رہنمائی کی غرض سے رجوع ہوتے تھے اور نواب صاحب خوش اسلوبی اور فراخ دلی سے اِن موضوعات کے بارے میں نہ صرف معلومات بہم پہنچاتے تھے بلکہ اپنے کتب خانہ کے نادر ذخیرہ سے کتابیں، استفادہ کے لئے مرحمت فرمایا کرتے تھے۔

جناب علی اکبر صاحب نے کہا کہ ادارہ کے کتب خانہ میں کئی قلمی اور مطبوعہ کتابیں ایسی ہیں جو نادر اور نایاب ہیں، اِن میں ایک بڑا اور قابلِ قدر ذخیرہ نواب صاحب کے عطایا کا ہے۔ مرحوم کو ڈاکٹر زورؔ سے جو قلبی لگاؤ رہا ہے۔ اُس کو اُنھوں نے آخر دم تک پروان چڑھایا اور ادارے کے میوزیم کی تنظیم جدید اور ٹرسٹ بنانے کے سلسلے میں کافی شفقتیں جھیلیں۔ غرض وہ آصفی تاریخ اور تہذیب کی نمائندہ اور روشن شمع کی طرح زندہ رہے اور اربابِ دکن کو اپنے وسیع معلومات اور علم سے فیض یاب کیا۔

آخر میں کرسئ صدارت سے قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد فاتحہ پڑھی گئی

اس جلسہ میں نواب صاحب کے چاہنے والوں، ادیبوں و دانشوروں، اسکالروں اور اردو دوستوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

۱۵ فروری:۔ ادارہ کے ترجمان ماہنامہ سب رس کا ایک خصوصی شمارہ نواب عنایت جنگ کی یاد میں شائع کئے جانے کے بارے میں پریس نوٹ اخبارات کے حوالے کیا گیا۔

جمعہ، ۱۹ فروری:۔

خصوصی خیر مقدمی محفل اور مشاعرہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو اور سہ ماہی مجلہ شعر و حکمت کی طرف سے ایوانِ اردو میں ۷ بجے شام حضرت اعجاز صدیقی ایڈیٹر ماہنامہ "شاعر" بمبئی کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ پروفیسر سید محمد صاحب سابق ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ ممتاز نقاد اور ادیب ڈاکٹر مغنی تبسم ایڈیٹر شعر و حکمت نے اعجاز صاحب کا خیر مقدم کیا۔ جلال ادیب رشید الدین نے حضرت اعجاز صدیقی کی شخصیت اور فکر و فن پر مضمون سنایا جس میں اعجاز صاحب کی ادبی، شعری اور صحافتی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا تھا۔

جناب اعجاز صدیقی نے اس محفل کے انعقاد پر کہا کہ "حیدرآباد سے میرا اور میرے گھرانے (سیماب اسکول) کا گہرا تعلق رہا ہے۔ اردو شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کے میدان میں حیدرآباد نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور یہاں کی نئی نسل بلاشبہ اسلاف کے نام اور کام کو نہ صرف آگے بڑھا رہی ہے بلکہ اور ترقی دے رہی ہے۔

حضرت اعجاز صدیقی نے حیدرآبادیوں کے خلوص پر اظہار ممنونیت کرتے ہوئے کہا کہ یہاں میں نے اردو کے لئے کام کرنے کا حوصلہ پایا۔ ڈاکٹر زورؔ نے ادارہ کی صورت میں اردو کے لئے بہت بڑا اور صدیوں زندہ رہنے والا مدرسۂ فکر قائم کر کے جنوب میں اردو زبان اور ادب کو حیات جاوداں بخشی ہے۔

صدر جلسہ پروفیسر سید محمد صاحب نے کہا کہ اس دلچسپ ادبی محفل میں شریک ہو کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ نے ڈاکٹر زورؔ کے کارناموں پر تفصیل سے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر زورؔ نے دکن میں علم و ادب، تہذیب و ثقافت کی سربلندی کے لئے جو بیج بویا تھا وہ آج ایک شجر سایہ دار بن گیا ہے۔ پروفیسر سید محمد نے حضرت اعجاز صدیقی اور سیماب اسکول کی مخلصانہ ادبی خدمات کی ستائش کی۔

پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب معتمد اعزازی کتب خانہ و سب رس نے شکریہ ادا کیا۔ محترم مہمان کے اعزاز میں عصرانہ کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ مختصر وقفہ کے بعد محفل شعر کا آغاز ہوا۔ وقار خلیل نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت اعجاز صدیقی کو بار بار سنا گیا۔ میزبان شعراء میں علامہ حیرت بدایونی، جناب

(مقیم لندن)، جناب اختر حسن ایڈیٹر 'آندھرا پردیش' جناب شاذ تمکنت، ڈاکٹر مغنی تبسم، نواب میر یسین علی خاں،
حکیم یوسف حسین خاں، ڈاکٹر غیاث صدیقی، محترمہ عظمت عبدالقیوم، پرنس نقی علی خاں ثاقب، وقار خلیل،
جناب رحمٰن جامی۔ جناب محمود خاور، جناب سعید بن محمد نقش، جناب صلاح الدین نیر، جناب فیض الحسن خیال،
جناب رؤف خیر، جناب مرزا حسن بیگ سیمابی، جناب برق آشیانوی، جناب شاغل ادیب، جناب ضیاء ساحری،
جناب ستار چشتی، جناب شمیم نصرتی اور جناب جگجیون لال سحر نے کلام سنایا۔ ایوان اردو میں باذوق اصحاب
کی بڑی تعداد نے شرکت کی اور اس خیر مقدمی محفل کو کامیاب بنایا۔

مارچ ۱۹۷۱ء

یکشنبہ ۱۴ر مارچ :- (دریچہ شام) "اردو کے ممتاز ادیب، مصنف اور نقاد پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب
صدر شعبہ اردو جموں و کشمیر یونیورسٹی سری نگر کی وفات (۱۱ر مارچ ۱۹۷۱ء) پر ادارہ ادبیات اردو، انجمن
ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین اور ادارۂ شعر و حکمت کی طرف سے ......" اردو ہال میں جلسۂ تعزیت
منعقد ہوا۔ جس میں مقررین نے پروفیسر سروری کی گراں بہا اور ٹھوس علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت
ادا کیا۔ آخر میں قرارداد تعزیت منظور ہوئی اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔ ادارہ کی طرف سے پروفیسر سید محمد صاحب
اور وقار خلیل نے نمائندگی کی۔

۱۶ر مارچ :- جناب ایس، ایم، اقبال کرشن (کلکتہ) نے ادارہ کے کتب خانہ کے لئے (۱۸) اردو مطبوعات تحفۃً
بذریعہ ڈاک روانہ کیے۔

۱۸ر مارچ :- ماہنامہ سہیل گیا (بہار) بابتہ مارچ میں سب رس میں شائع شدہ وقار خلیل
کی نظم "تیرے بعد (مخدوم کی جدائی پر)" ڈائجسٹ ہوئی۔

۲۲ر مارچ :- جناب پرنس نقی علی خاں ثاقب نے اپنا دوسرا شعری مجموعہ "کتاب سحر" ادارہ کے
کتب خانے کے لیے مرحمت فرمایا۔

اپریل ۱۹۷۱ء

۲ر اپریل :- "دکنی تہذیب پر صوفیائے کرام کا اثر" کے زیر عنوان جناب حبیب حسن صاحب بالفقیہ کا
ایک مضمون روزنامہ سیاست حیدرآباد میں شائع ہوا جس میں موصوف نے ادارۂ ادبیات اردو کی
خدمات کے بارے میں اظہار اطمینان کیا گیا ہے، اپنے تاثرات تحریر فرمائے۔

۴ر اپریل :- ماہنامہ "شاہکار" ادبی ڈائجسٹ بنارس بابتہ مارچ، اپریل ۱۹۷۱ء میں سب رس سے
جناب ہاشمی کی غزل بحوالہ ڈائجسٹ ہوئی۔

۱۵؍اپریل :۔ سب رس کا خصوصی شمارہ نواب عنایت جنگ مرحوم کی یاد میں شائع ہوا۔ جس میں پروفیسر سید محمد، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی، جناب اختر زیدی، جناب شہریار کاوس جی، جناب احمد علی ادیب، جناب باقر کاظمی اور جناب رائے محبوب نارائن گوڑ کے مضامین اور جناب سعید شہیدی اور جناب باقر رضوی امانت خانی کا منظوم خراج عقیدت کے علاوہ "گوشۂ سروری" میں پروفیسر عبدالقادر سروری کی شخصیت اور فکر و فن پر ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کے تاثرات بھی شامل ہیں۔

اتوار ۲۵؍اپریل :۔ ایوان اردو کے کمیٹی روم میں ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس ۴ ½ بجے شام صدرِ ادارہ جناب سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ موازنے، انتظامی امور اور سب رس نیز امتحانات سے متعلق مسائل زیر بحث آئے۔ جناب محامد علی عباسی صاحب نائب صدر، ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ معتمد، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب، جناب امن راج سکسینہ صاحب، جناب میر لیسین علی خاں صاحب، جناب میر حسن صاحب، جناب عارف الدین حسن صاحب اور جناب امیر الدین علی خاں صاحب (اراکین مجلس انتظامی) نے شرکت کی۔

مئی ۱۹۷۱ء

۱؍مئی :۔ جامعہ ملیہ دہلی سے شائع ہونے والے بچوں کے ماہنامہ "پیام تعلیم" بابتہ مئی ۱۹۷۱ء میں ادارہ کے شعبۂ ادب اطفال کی شائع شدہ کتاب "ہیبوں کی کہانیاں" از جناب حبیب ابراہیم پر جناب محمد حسین حسان ندوی ایڈیٹر پیام تعلیم کا تبصرہ شائع ہوا۔

۱۶؍مئی :۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے چوتھے عظیم الشان سالانہ کل ہند مشاعرہ کے موقع پر شائع شدہ ، سوونیر میں ادارہ ادبیات اردو اور اس کے کتب خانہ پر دستاطیل کے دو معلوماتی اور تعارفی مضامین شائع ہوئے۔

۲۱؍مئی :۔ ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات اردو دانی، زباندانی، اردو عالم اور اردو فاضل ۲۱ تا ۲۴ مئی کو ایک ساتھ اضلاع، تعلقوں اور شہر حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم جونیر کالج اور سنٹرل جیل چنچل گوڑہ میں منعقد ہوئے۔

ہفتہ ۲۲؍مئی :۔ (۱۱ بجے صبح) مشرقی و مغربی علوم کے مستشرق اور باکمال ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد عبدالرحمن صاحب بارکر صدر شعبۂ اردو میکگل یونیورسٹی (کناڈا) نے اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ ادارۂ ادبیات اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ .... پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی معتمد شعبہ کتب خانہ، ادارہ نے ڈاکٹر بارکر کو کتب خانہ کے قلمی اور مطبوعہ شعبوں اور ایوان اردو میوزیم کی سیر کرائی۔ اس موقع پر ادارہ میں موجود ادیبوں، شاعروں سے ڈاکٹر بارکر کو متعارف کرایا گیا ایک مختصر سی محفل شعر میں۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی

جناب محمد منظور احمد، وقار خلیل اور جناب ادا ن قریشی نے سلام سنایا۔ بیگم بارکر نے کہا کہ حیدرآباد لکھنؤ سے زیادہ خوبصورت شہر اور اردو کا وسیع مرکز ہے۔ ڈاکٹر بارکر نے اپنے احساسات ادارہ کی کتاب الرآے میں تحریر کئے۔

۷½ بجے شام "ایوانِ اردو" میں ادارہ کے ترجمان "ماہنامہ سب رس" سے متعلق چند انتظامی اُمور پر غور کرنے کے لئے کمیٹی کی نشست جناب سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں ہوئی جس میں جناب میر حسن صاحب، جناب میر یسین علی خاں صاحب، جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب اور معتمد سب رس جناب محمد اکبرالدین صاحب صدیقی نے شرکت کی۔

جون ۱۹۷۲ء

شنبہ، ۱۱ر جون (۵ بجے شام) :- ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر کا خیر مقدم اور محفل شعر:-

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے ایوانِ اردو کے آڈیٹوریم میں ایک عظیم الشان ادبی محفل میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر اور بیگم عنبرین بارکر کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ صدر ادارہ جناب سید علی اکبر صاحب نے ممتاز مستشرق اور ماہر تعلیم ڈاکٹر بارکر کا تعارف کرایا اور اُن کی شخصیت اور فکر و فن کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ ڈاکٹر بارکر نے امریکی جامعات میں اردو درس و تدریس کے مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ مغربی ممالک میں اُردو سیکھنے کا ذوق روز بروز ترقی کر رہا ہے اور اس سلسلے میں عمدہ نصاب بھی مرتب و شائع ہو چکا ہے۔

محترمہ عظمت عبدالقیوم خاں کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی ....

اس موقع پر جناب سعید شہیدی، جناب ریورنڈ محسن ریحانی، نواب میر یسین علی خاں، وقار خلیل، جناب خیرات ندیم، محترمہ خورشید نذیر، جناب ضیاءالدین احمد شکیب، جناب غیاث متین، جناب برق یوسفی، جناب علی الدین نوید، جناب روف خلش، جناب حسن فرخ، جناب رؤف خیر، جناب فیض الحسن خیال۔ ڈاکٹر اسد انصاری، ڈاکٹر رشید الحسن رشید، جناب مظفرالدین صاحب، جناب بیجس الہ آبادی، جناب فکری بدایونی، محترمہ شاہدہ محبوب اور جناب نعیم زاہی کے علاوہ صدر شاعرہ محترمہ عظمت عبدالقیوم نے کلام سنایا۔

ممتاز اور با ذوق شرکاء میں ڈاکٹر خسرو (دہلی یونیورسٹی) ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر و بیگم ہاشم امیر علی، مسٹر و مسز ہاشم علی اختر، جناب میر حسن، جناب رمن راج سکسینہ، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی اور مولوی سعادت اللہ حسن کے علاوہ اسکالر، ادیب، شاعر اور اساتذہ نیز اردو دوستوں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

دوشنبہ، ۱۴ر جون : (۱۱ بجے دن) :- جناب مظہر علی صاحب صدر شعبۂ اردو و فارسی گورنمنٹ کالج اجمیر نے ایوانِ اردو کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب ترصیص الدین انصاری لائبریرین نے ... کتب اور مطبوعات و مخطوطات کے بارے میں بتایا کر ...

۱۵؍جون:۔ پندرہ روزہ اخبار "منصف" حیدرآباد میں "ادارۂ ادبیات اردو" پر وقار خلیل کا محررہ مضمون شائع ہوا۔

۲۲؍جون:۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہفت روزہ "ہماری زبان" علی گڈھ میں ڈاکٹر بار کر کے ایوانِ اردو میں خیر مقدم کی تفصیلات اور اُن کی تقریر کے اقتباسات بحوالہ روز نامہ "سیاست" شائع ہوئے۔

جولائی ۱۹۷۱ء

۳؍جولائی:۔ جناب انور کمال حسینی صاحب (نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا) دہلی نے ایوانِ اردو کا معاینہ کیا۔ اس موقع پر پروفیسر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ بھی موصوف کے ہمراہ تھیں۔ وقار خلیل نے ادارہ کے تمام شعبوں کی سیر کرائی۔

سہ شنبہ، ۲۷؍جولائی: (۱۱ بجے دن) ہز اکسیلینسی ڈاکٹر محمد تقی مقتدری سر قونصل شہنشاہی ایران متعینہ حیدرآباد نے ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معاینہ کیا۔ نواب میر یسلین علی خاں صاحب شریک معتمد ادارہ نے موصوف کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر مقتدری نے کتب خانہ کے فارسی ذخیرۂ ادبیات کو توجہ سے دیکھا نایاب اور اہم مخطوطات و مطبوعات پر حیرت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر آقائی حسین ضابطہ اور جناب حسن طبسی نیّر بھی ادارہ میں موجود تھے۔

اگست ۱۹۷۱ء

یکشنبہ، ۱۵؍اگسٹ:۔ (صبح ۸ بجے) ایوانِ اردو پر یوم جمہوریۂ ہند کے موقع پر جناب "میر سراج الدین علی خاں" معتمد دفتر نے قومی پرچم لہرایا۔

ستمبر ۱۹۷۱ء

۲۰؍ستمبر:۔ ماہنامہ "معارف" اعظم گڈھ بابتہ ستمبر میں سب رس کے "غالب نمبر" پر تبصرہ شائع ہوا

اکتوبر ۱۹۷۱ء

سہ شنبہ، ۵؍اکتوبر:۔ (۱۱ بجے دن) سوویت یونین کے ریسرچ اسکالر جناب ڈاکٹر محمود ونا لقا لف (تاجکستان) نے ایوانِ اردو کا معائنہ کیا۔ تاریخ ہند کے موضوع پر کتب خانہ سے استفادہ کیا۔ ادارہ کے اردو میوزیم کے ذخیرۂ فرامین و تہذیبی آثار سے موصوف نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ جناب ترصیف الدین انصاری اور جناب محمد جمال الدین صاحب نے ڈاکٹر لقا لف کو ادارہ کی سیر کرائی۔

نومبر ۱۹۷۱ء

یکم نومبر:۔ ماہنامہ "تحریک" دہلی بابتہ نومبر میں سب رس سے جناب باقر کاظمی کا مضمون "حیدرآبادی اردو"

بول چال اور محاورے حوالہ کے ساتھ "مانگے کا اُجالا" کالموں میں ڈائجسٹ ہوا۔

دسمبر ۱۹۷۱ء

یکم دسمبر: (۱۱ بجے دن) پروفیسر برس - آر - پرسے (ساوتھ ایشین لنگویجز یونیورسٹی آف کیلی فورنیا (برکلے) نے ادارہ کے تمام شعبہ جات کا تفصیلی معائنہ کیا۔ آفس سکریٹری میر سراج الدین علی خاں صاحب نے موصوف کو ایوانِ اُردو کی سیر کرائی۔

۲ دسمبر: آزاد مطالعہ گھر ہوڑہ (ویسٹ بنگال) کی خواہش پر حیدرآباد سے شائع ہونے رسائل و جراید کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئیں۔

۵ دسمبر: جناب اے، آر، جاوید ایڈیٹر ماہنامہ "معاد" آرمور (نظام آباد) کو رسالہ کی اجرائی کے سلسلے میں ادارہ کی طرف سے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کے پتے دیئے گئے اور رسالہ کی اشاعت میں معلومات بہم پہنچائیں گئیں۔

۱۱ دسمبر: دو ماہی ادبی رسالہ شاخسار کٹک (اوڑیسہ) شمارہ ۴۷ سال ۱۹۷۱ء میں سب رس کے غالب نمبر پر تبصرہ شائع ہوا۔

استفادہ کتب خانہ

۱۹۷۱ء

ادارۂ ادبیات اردو کے گرانقدر اور وقیع کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات، مخطوطات اور دارالمطالعہ عام) ایوانِ اردو سے اردو زبان و ادب کے شیدائی دیگر زبانوں کے محققین، طلبا و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور مطالعہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں۔ ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے مختلف اوقات میں یا متواتر کئی روز ادارہ کے کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور حوالوں کے سلسلے میں اُن کی نقلیں لیں یا ایم اے کے نصاب سے متعلقہ یا پی ایچ ڈی کی ڈگری کے حصول کے ضمن میں یا پھر اخبارات و رسائل کے لئے فیچروں کی تیاری کے سلسلے میں اردو کی علمی، ادبی اور تاریخی مطبوعات کے ذخیرۂ کتب خانہ سے مواد حاصل کیا (ادارہ)

۱- جناب نذیر احمد انصاری ریسرچ اسکالر جبل پور
۲- جی ذوگراف ریسرچ اسکالر سوویت یونین ماسکو
۳- محترمہ حمیرہ جلیلی صاحبہ ایم اے ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۴- جناب اسلم عمادی صاحب ہمایوں نگر، حیدرآباد۔
۵- جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب
۶- جناب رحمت اللہ صاحب لکچرار شبلی کالج اعظم گڈھ (یوپی)
۷- پروفیسر عتیق احمد صدیقی لکچرار علی گڈھ مسلم یونیورسٹی
۸- ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج حیدرآباد۔
۹- جناب محمد شریف الدین صاحب لکچرار اے وی کالج۔
۱۰- محترمہ رضیہ صدیقی ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۱۱- جناب جگن لال گوڑ ریسرچ اسکالر مرہٹواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد
۱۲- جناب بدیع حسینی صاحب لکچرار اردو آرٹس کالج حیدرآباد
۱۳- ڈاکٹر محمد جمال شریف صاحب سپرنٹنڈنٹ اے جی آفس حیدرآباد
۱۴- محترمہ سعیدہ سلطانہ ظہور علی پرنسپل جی وی جی آئی کالج اورنگ آباد
۱۵- جناب مرزا اکبر علی بیگ صاحب لکچرار سٹی کالج حیدرآباد۔

۱۶- پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

۱۷- جناب رؤف خیر صاحب متعلم اردو کالج حیدرآباد

۱۸- جناب محمد منظور احمد صاحب اسسٹنٹ لکچرار گورنمنٹ کالج ارم بگر

۱۹- وقار خلیل ۱۴-۸-۲۴۳ سلطان شاہی حیدرآباد ۲۰

۲۰- جناب افضل اقبال صاحب لکچرار ممتاز کالج حیدرآباد

۲۱- ڈاکٹر مغنی تبسم ایڈیٹر سہ ماہی شعر و حکمت حیدرآباد

۲۲- جناب ابراہیم خلیق صاحب بی اے ایل ایل بی جرنلسٹ حیدرآباد

۲۳- جناب محمد داؤد عمادی سپروائزر اسٹیٹ سنٹرل لائبریری حیدرآباد

۲۴- جناب یحییٰ حسن صاحب سابق اسٹیشن ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو مدراس۔

۲۵- جناب سید احمد صاحب متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۲۶- محترمہ خورشید سلطانہ صاحبہ یم اے جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

۲۷- جناب ہارون ایوب صاحب ریسرچ اسکالر علی گڈھ مسلم یونیورسٹی

۲۸- جناب سید شمس حیدر صاحب حسینی علم حیدرآباد۔

۲۹- جناب ظہیر الحق صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمہ صحت عامہ حیدرآباد

۳۰- جناب ضیاء الحق صاحب سابق آرکائیوسٹ- دفتر ریاستی اسناد حیدرآباد

۳۱- محترمہ میمونہ بانو صاحبہ متعلم یم اے عثمانیہ یونیورسٹی

۳۲- محترمہ حمیدہ ریاض صاحبہ یم اے ودربھا مہا ودیالیہ ناگپور۔

۳۳- جناب عظمت اللہ صاحب ڈائرکٹر اسمال اسکیل انڈسٹریز حیدرآباد

۳۴- جناب مقبول فاروقی صاحب متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

۳۵- ڈاکٹر انور معظم صاحب ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی

۳۶- جناب احمد حسین خاں صاحب یم اے ریسرچ اسکالر حیدرآباد

۳۷- محترمہ عزیزہ سلطانہ صاحبہ یم اے جامعہ عثمانیہ

۳۸- جناب محمد عبدالرحمٰن سعید صاحب حیدرآباد

۳۹- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب لکچرار ایس وی یونیورسٹی ترو پتی۔

۴۰- محترمہ اقبال صابرہ صاحبہ متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

۴۱- جناب سید امیرالدین صاحب متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ

۴۲- جناب قطب سرشار صاحب (اردو پنڈت) ناگر کرنول

۴۳- محترمہ امتہ الرحیم صاحبہ متعلم یم اے عثمانیہ

۴۴- جناب مرزا ذبیح اللہ بیگ صاحب ایڈیٹر دکن نیوز حیدرآباد

۴۵- جناب محمود خاور صاحب ایڈیٹر برگ آوارہ ویکلی حیدرآباد

۴۶- جناب کریم زاہد صاحب یم اے عثمانیہ یونیورسٹی

۴۷- جناب ڈاکٹر غیاث صدیقی- کالی کمان حیدرآباد

۴۸- جناب طیب انصاری صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج گلبرگہ

۴۹- جناب عبدالکریم ماہر صاحب ملے پلی حیدرآباد

۵۰- جناب مرزا ظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد

۵۱- جناب صلاح الدین نیر صاحب حیدرآباد۔

۵۲- جناب سید مصطفیٰ کمال صاحب لکچرار انوار العلوم کالج حیدرآباد

۵۳- جناب تجمل حسین صاحب یم اے- جامعہ عثمانیہ

۵۴- جناب معین الدین صاحب یم اے جامعہ عثمانیہ

۵۵- محترمہ فاطمہ النساء صاحبہ یم اے جامعہ عثمانیہ

۵۶- جناب نظیر علی صاحب صدر شعبہ اردو و فارسی گورنمنٹ کالج اجمیر

۵۷- ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر صدر شعبہ اردو مانیٹریال یونیورسٹی کینیڈا

۵۸- ڈاکٹر محمد تقی مقتدری سرکرنسل شہنشاہ ایران مقیم حیدرآباد

۵۹- ڈاکٹر محمد دونا لقائف ریسرچ اسکالر تاجکستان [illegible]

اعداد و شمار

استفادہ دارالمطالعہ عام و کتب خانہ ایوان اردو

جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۱ء

جنوری	۳۱۹	افراد
فبروری	۳۲۶	"
مارچ	۳۹۴	"
اپریل	۳۹۹	"
مئی	۵۴۱	"
جون	۲۹۹	"
جولائی	۴۰۱	"
اگست	۳۵۴	"
ستمبر	۳۸۷	"
اکتوبر	۳۵۸	"
نومبر	۳۶۰	"
ڈسمبر	۵۷۲	"

ادارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس"

ادارہ ادبیات اردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے جنوری ۱۹۷۲ء سے یہ اپنی عمر کے ۳۴ ویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اس طرح "سب رس" نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر زبان کی تین دہائیوں کی سرحد عبور کر کے اپنی چوتھی دہائی میں رواں دواں ہے۔ ادارہ کے بانی اور معتمد اول "سب رس" کے موسس اور نگران ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی ادبی یادگار ہونے کا اعزاز بھی "سب رس" کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر زور کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ عالی جناب سید علی اکبر صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مشاورتی کمیٹی کے اراکین میں جناب میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب رمن راج سکسینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب محمد منظور احمد صاحب شامل ہیں
.... اس مجلس مشاورت کے معتمد جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ہیں جو ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں اور کتب خانہ اور دار المطالعہ کے معتمد بھی۔ ترتیب و کتابت و طباعت کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں مراسلت کے فرائض کی انجام دہی بھی کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

سنہ ۱۹۷۱ء میں "سب رس" نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ شمارے دیئے۔ ان میں ضخیم سالنامہ (جنوری) اور خاص شمارہ عنایت جنگ نمبر ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۷۶۲) ہوتی ہے" سب رس کو دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جہاں جہاں دکنیات پڑھائی جاتی ہے، وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں سب رس کے بارہ شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں، جنھیں دیگر معاصرین نے افادیت کے پیش نظر اپنے اخبارات و رسائل میں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ کیا ہے۔

ایک سال میں "سب رس" نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کیں ہیں جن میں ۸۷ مضامین (۲۱) نظمیں (۸۹) غزلوں کے علاوہ (۱۰) نئی کتابوں اور (۵) رسالوں یا ان کے خاص نمبروں پر تبصرے وغیرہ شائع کئے۔

مضامین کی ایک جامع فہرست اور دیگر تفصیلات اگلے صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کی غرض سے بصراحت پیش کی جا رہی ہیں۔

فہرست مضامین

مطبوعہ سب رس حیدرآباد دکن

جلد (۳۴) شمارہ (۱ تا ۱۲)

جنوری تا دسمبر ۱۹۷۱ء

نمبر	عنوان	مصنف	ماہ
۳۳	نواب عنایت جنگ	پروفیسر سید محمد	″
۳۴	″ ″	احمد علی خاں ادیب	″
۳۵	″ ″	اختر زیدی	″
۳۶	″ ″	شہریار کاوس جی	″
۳۷	نواب عنایت جنگ اور ادارہ	محمد اکبرالدین صدیقی	″
۳۸	آسامی زبان و ادب	احمد علی شاہ	″
۳۹	پروفیسر سروری (ایک تاثر)	ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	″
۴۰	قدیم اردو کے چند شہ پارے	ڈاکٹر نورالسعید اختر	مئی
۴۱	انارکلی	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	″
۴۲	اردو کی نثری داستانیں اور ان کے تعلیمی و تدریسی مسائل (قسط ۲)	احمد سجاد	″
۴۳	سودا بہ حیثیت مرثیہ گو	قاضی عبیدالرحمان ہاشمی	″
۴۴	میر کے بہتر نشتر	ایم اے نصر	″
۴۵	شاہانِ دکن کی اردو شاعری	حمیرہ جلیلی	″
۴۶	جب ہم پڑھتے تھے	جناب سید علی اکبر	″
۴۷	اردو شعراء معاشی زندگی کے آئینے میں	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	جون
۴۸	مولانا شبلی کی نگہ جوہر شناس	ابو علی اعظمی	″
۴۹	اردو ادب کی تنقیدی روایات	ندیم الواجدی	″
۵۰	فراق کی شاعری	عبدالغفار محشر	″
۵۱	کچھ غزل کے بارے میں	ایم عبدالاحد	″
۵۲	سروری ادب سے زبان تک	حامد اللہ ندوی	جولائی
۵۳	آزادی کے بعد بنگال میں اردو کے کام کا محاسبہ	جاوید نہال	″
۵۴	ادب اور صحافت	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	″
۵۵	محمد قلی قطب شاہ کے کلام کی ادبی اہمیت	قاضی عبیدالرحمن ہاشمی	″

نمبر	عنوان	مصنف	ماہ
۵۶	ساحر اور راشٹرا گیت	جمال کڑپوی	″
۵۷	بیانِ غالب کا ایک پہلو	عبدالرؤف	″
۵۸	پریم چند کی ناولوں کے نسوانی کردار	شاہدہ پروین	″
۵۹	ڈاکٹر یارکر ایوانِ اردو میں	(خبرنامہ) ادارہ	″
۶۰	شاہ تراب کا کچھ نایاب کلام	ڈاکٹر نورالسعید اختر	اگست
۶۱	شہر حیدرآباد کی دکنی بول چال	باقر کاظمی	″
۶۲	شاہ صادق اورنگ آبادی	امین چند شرما	″
۶۳	مغربی بنگال میں اردو افسانہ نگاری	ایم اے نصر	″
۶۴	یحییٰ اعظمی کی شاعری	محمد ایوب واقف	″
۶۵	درگاہ میاں شاہ حیدرآباد کے نادر کتبے	ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی / سید سجاد حسین	ستمبر
۶۶	داغ کی شاعری میں معاشی کرب	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	″
۶۷	حیدرآبادی اردو بول چال	باقر کاظمی	″
۶۸	اقبال اور عشق رسول	محمد بدیع الزماں	″
۶۹	اردو مرثیے میں رزم و بزم کے عناصر	ناز قادری	″
۷۰	تلگو میں عربی فارسی اور اردو کے دخیل الفاظ	(مولوی) غلام رسول	اکتوبر
۷۱	نسخہ بھوپال ثانی سے متعلق تحریریں	عبدالقوی دسنوی	″
۷۲	اردو ادب کی جامعیت	ڈاکٹر غلام رسول	″
۷۳	پریم چند (جنگ آزادی کا عظیم مصنف)	خورشید نعمانی ردولوی	″
۷۴	نقش بیخود	عبدالرؤف	″
۷۵	اردو شاعری میں انسانی المیہ کا دور	ڈاکٹر خلیل احمد نیر	نومبر
۷۶	اردو ڈرامہ میں عورت کا کردار	ممتاز احمد	″
۷۷	مرآۃ الانسان از شاہ عبدالقادر	سید ابوتراب خطائی ضامن	″
۷۸	شہر حیدرآباد کی اردو بول چال	باقر کاظمی	″
۷۹	غالب اور تارد	حشم الرمضان	″
۸۰	محمد قلی قطب شاہ اور نظیر اکبرآبادی	نادر علی	″

۸	تیر مینائی کا ایک شعر دیوانِ غالب میں	ڈاکٹر ابو محمد سحر	ڈسمبر	۸۵	جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا	قاضی عبید الرحمن ہاشمی	ڈسمبر
۸	مومن کا سیاسی آہنگ غزل	ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی	"	۸۶	محمد قلی قطب شاہ اور نظیر اکبر آبادی	قادر علی	"
۸	حضرت شاہ امین کا کلام	فہمیدہ بیگم	"	۸۷	ایوانِ اُردو میں نمائش مخطوطاتِ فارسی	وقار خلیل	"
۸	اختر مرحوم کی شاعری	ایم اے نصر	"				

نظمیں:۔ سب رس جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۱ء میں جملہ (۲۱) نظمیں شائع ہوئیں۔ ذیل میں نظموں کے عنوانات اور شعراء صاحبان کے نام لحاظ ترتیب اشاعت درج کئے جاتے ہیں:۔

۱- حیدرآباد از سعادت نظیر
۲- صدیوں کی بولتی آواز (ڈاکٹر زور) صلاح الدین نیر
۱. صدائے زور از ڈاکٹر غیاث صدیقی
۴- شامِ طرب از عزیز احمد
۱. کربِ فطرت از اختر لبتوی
۶- آخری خواہش از اختر لبتوی
۱. ٹیس از عابد عالی
۸- قطعات از سید مظفر الدین صاحب
۱. قطعہ تاریخ وفات عنایت جنگ از سعید شہیدی
۱۰- قطعہ تاریخ وفات از باقر رضوی امانت خانی
۱- زندگانی شکستوں کا اک نیا نام ہے از عابد عالی
۱۲- دو پہلو از فرحت قمر
۱۱- مقبرۂ نورجہاں از شاہ ابوالحسن ادیب
۱۴- خواہش اتفاق از قطب سرشار
۱۱- کردار کے ناسور از اختر لبتوی
۱۶- ادائے شرم اختر لبتوی۔
۱۱- شاعر از ڈاکٹر غیاث صدیقی
۱۸- فریاد از فیض الحسن خیال
۱۱- نورِ مجسم از فیض الحسن خیال
۲۰- لہریں از عبدالرؤف
۲- مانعِ عمل از اختر لبتوی

غزلیں:۔ سب رس جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۱ء کے شماروں میں (۸۹) غزلیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض شعراء کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی چھپیں۔ لحاظ ترتیب اشاعت شعرائے کرام کے نام نامی درج کئے جاتے ہیں۔ دکنی کے برگزیدہ شعراء ملا وجہی اور نصرتی کی غزلیں بھی پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب کی توجہ اور ریسرچ کے سبب پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا دہلوی کے کتب خانہ مخطوطات سے حاصل کر کے پہلی بار شائع ہوئیں۔

محمد مظفر الدین خاں صاحب - نذیر علی عدیل - شاہ ابوالحسن ادیب - علی احمد جلیلی - حافظ آثم - راز دکنی سیمابی - طرب میرٹھی - واحد پریمی - مہدی پرتاب گڈھی - حباب ہاشمی - کرامت علی کرامت - ملا وجہی - کسوانی - باقر منظور - نصرتی - سعادت جاہ سعادت - کریم اسدی - شمس فریدی - مختار عباسی - کمال جعفری - نورالحسن انور ادیب - رؤف خیر - اختر لبتوی - محمد منظور احمد منظور - عبدالمتین نیاز - صفدر عزمی - راحت گوالیاری -

شاکر کرتپوری ۔ نجیب راشد، ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خاں منشا ۔ عاتم برہانپوری ۔ ساحل احمد بنگلوری ۔ سیدہ نذر ریحانہ۔ معصوم شرقی ۔ تاج پیامی ۔ تاباں واسطی ۔ غلام مرتضیٰ راہی ۔ قمر صدیقی ۔ عظمت عبدالقیوم خاں ۔ صلاح الدین نیر۔ مفتون کوٹوی ۔ امجد نجمی ۔ وفا سکندر پوری ۔ حشم الرمضان ۔ حنیف کیفی ۔ مظفر النساء ناز ۔ محسن جلگانوی ۔ مشتاق احمد خاں عادل ۔ محمد یعقوب یعقوب ۔ حفیظ فضا ۔ انوار الحق حافظ ۔ وقار احمد خاں ۔ نمائندہ شرقی ۔ شکیل دسنوی ۔ منظر حسن دسنوی ۔ بشیر احمد طاہر ۔ افتخار احمد فخر اور رفیع الزماں۔

تبصرے :- سب رس نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصروں کو شائع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ سال ۱۹۹۱ء میں جلد (۵۴) نئی کتابوں اور (۵) رسائل و جرائد یا ان کے خاص شماروں پر تبصرے شائع کئے۔ تبصرہ کرنے والوں میں ادارہ کے خصوصی مبصر پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ وقار خلیل، اسلم عمادی، رؤف خیر اور قطب سرشار شامل ہیں ۔ ذیل میں تبصرہ شدہ مطبوعات کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

کتب

۱ ۔ ابراہیم نامہ (قدیم اردو جلد سوم) تصحیح ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۲ ۔ گلِ رعنا (تذکرہ) مرتبہ مالک رام
۳ ۔ انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب از پروفیسر جاوید نہال
۴ ۔ دکن میں مرثیہ اور عزا داری از ڈاکٹر رشید موسوی
۵ ۔ بمبئی میں اردو ۱۹۱۴ء تک از ڈاکٹر میمونہ دلوی
۶ ۔ جامِ جم (مجموعۂ کلام) مضطر حیدری
۷ ۔ شرح دیوان غالب از بیخود موہانی
۸ ۔ قوس قزح (مجموعۂ کلام) قوس حمزہ پوری
۹ ۔ پیکرِ خیال (قطعات) اختر بستوی
۱۰ ۔ گلوب (شعری انتخاب) مرتبہ سید احمد شمیم و شمس فریدی
۱۱ ۔ سالنامہ ندرسا نیس مرتبہ اصغر نقوی
۱۲ ۔ نظم سائیکلو پیڈیا مرتبہ ذکی کاکوروی
۱۳ ۔ انتخاب کلام اکبر الہ آبادی مرتبہ ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی
۱۴ ۔ انتخابِ کلام میر تقی میر مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن
۱۵ ۔ دیوانِ درد مرتبہ رشید حسن خاں
۱۶ ۔ نقشِ قدم (مجموعہ کلام) علی احمد جلیلی۔
۱۷ ۔ منور لکھنوی شخصیت اور شاعری ۔ مرتبہ راج نرائن راز
۱۸ ۔ آب و سراب (شاعری) جمیل مظہری
۱۹ ۔ چراغِ راہ (نثر) از ایم ۔ اے ۔ نصر
۲۰ ۔ آبگینہ (نثر) از سید محمد ٹونکی
۲۱ ۔ بانیٔ جامعہ مولانا محمد علی جوہر از سید محمد ٹونکی
۲۲ ۔ کتابِ سحر (شاعری) میر تقی علی خاں ثاقب ۔
۲۳ ۔ یاد کی خوشبو (مجموعۂ کلام خورشید احمد جامی) مرتبہ محمود خاور
۲۴ ۔ رازِ محبت (ولادتِ مسیح پر نظمیں) مرتبہ سیدہ نذر ریحانی
۲۵ ۔ کتاب کی کہانی (ادبِ اطفال) احمد حسن نقوی
۲۶ ۔ شوخیٔ تحریر (شاد عارفی کی نظمیں) مرتبہ مظفر حنفی
۲۷ ۔ دو غنڈے (افسانے) از مظفر حنفی
۲۸ ۔ لامکاں (شاعری) از غلام مرتضیٰ راہی

۲۹- نغمہ ارمان (شاعری) از عزیز الدین عشرت انصاری
۳۰- ارج (شاعری) از داور ذکی شاکر
۳۱- ہماری تہذیبی میراث (نثر) اسفار حسین رضوی
۳۲- نسخۂ مجوزہ اعلیٰ حضرت بھوپال ثانی (غالبیات) عبدالقوی دسنوی۔
۳۳- شہرت غالب بہ گیتی مرتبہ سید حیدر عباس رضوی
۳۴- غالب پر تنقیدی مضامین (مضامین) مرتبین عمر حیات خاں غوری۔ ظہور الاسلام، اقبال مسعود۔
۳۵- قادر نامۂ غالب مرتبہ عبدالقوی دسنوی
۳۶- دین یار جنگ (زندگی اور کام) مرتبہ برق موسوی۔
۳۷- تذکرۂ نظامی از خواجہ حسن ثانی نظامی دہلوی
۳۸- سحر نغمہ (شاعری) ساحر ہوشیار پوری۔
۳۹- زہر حیات (شاعری) زاہدہ زیدی
۴۰- سخن در سخن (رباعیات و قطعات) سید مظفر الدین صاحب

رسائل

۱- ماہنامہ "کتاب" لکھنؤ (افسانہ نمبر) مدیر عابد سہیل
۲- سہ ماہی "شعر و حکمت" حیدرآباد (ن م راشد نمبر) مرتب: ڈاکٹر مغنی تبسم اور شہریار۔
۳- ماہنامہ "شاعر" بمبئی (ناولٹ نمبر) مدیر اعجاز صدیقی
۴- ماہنامہ "پیام تعلیم" دہلی، غالب نمبر، مدیر محمد حسین حسّانی ندوی
۵- ہفت روزہ "برگ آوارہ" حیدرآباد (خورشید احمد جامی نمبر) مرتبہ محمود خاور

بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۲ سے آگے

سب رس کے تبادلے میں آنیوالے رسائل وجرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل وجرائد ایوانِ اُردو کے دار المطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل وجرائد کو چھوڑ کر "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جنکی مجموعی تعداد (۱۴۱) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علیگڈھ) ہندوستان کے کسی دار المطالعہ میں میں نے اس قدر تعداد میں معیاری رسائل و جرائد یکجا نہیں دیکھے اس طرح "ایوانِ اُردو" دار المطالعہ اُردو دُنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے۔

ہم تمام ہند وپاک اور بیرون ہند کے مدیران جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے "رسائل جرائد" ارسال فرماتے ہیں اُمید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہیگا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل وجرائد کی اچھی اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کرکے استفادہ کیلئے محفوظ کر دیا جاتا ہے اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانے کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم تفصیلی فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ابتک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب چوتھی جلد مرتب ہو چکی ہے، ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل وجرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر اور علمی ادبی رسائل اور کتابوں سے آئے دن ادب دوست اصحاب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱½ تا ۴½ ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں جمعہ کو ایوانِ اُردو بند رہتا ہے۔

اِس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اُردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیران رسائل و جرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا ایسا ادبی ذخیرہ قدیم و جدید کتب و رسائل چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفۃً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریہ کے ساتھ کتب خانے میں داخل کر لئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اِسم گرامی کے ساتھ درج بھی ہونگے۔

اُمید ہے کہ معاصرین اور دیگر ادب دوست اصحاب اور مختلف علمی و ادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاونِ عمل فرماکر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے (ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
		(سہ ماہی)			
۱	اُردو ادب	انجمن ترقی اُردو ہند۔ علی گڈھ (یو پی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۴۴	۱۵=۰۰
۲	امریکن ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ۔ نئی دہلی ۱	مارگریٹ کلاپ	۱۱۶	۴=۰۰
۳	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	″ ″ ″	″ ″	۹۶	۴=۰۰
۴	پرابلم آف کمیونزم (″)	یو، ایس، انفارمیشن ایجنسی۔ واشنگٹن (ڈی، سی)	ابرام برگ	۸۸	— —
۵	پوئٹ (انگریزی)	ٹی، نگر۔ مدراس ۱۷	ڈاکٹر کرشنا سرینواس	۳۲	۳۰=۰۰
۶	تجدید	شاستری نگر، موتی ہاری (چمپارن۔ بہار)	شعیب شمس	۴۰	۴=۰۰
۷	سنگیت ناٹک (انگریزی)	رابندرا بھون۔ دہلی	—	۸۰	— —
۸	شعر و حکمت	۲۲-۲-۶۷۴ بازار نورالامرا۔ حیدرآباد ۲۴	ڈاکٹر مغنی تبسم، شہریار	۳۲۰	۱۶=۰۰
۹	صبح	انجمن ترقی اردو، علی منزل، کوچہ پنڈت دہلی ۶	عبداللطیف اعظمی	۲۰۰	۱۰=۰۰
۱۰	نوائے ادب	ادبی پبلشرز، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۸	عبدالرزاق قریشی	۸۰	۶=۰۰
۱۱	ورتاوہا (انگریزی)	سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز۔ ماناسا گنگوتری، میسور ۶	ڈی، پی، پٹنایک	۳۰	— —
۱۲	ہندستانی زبان (ہندی، اردو)	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، نیتاجی سبھاش روڈ۔ بمبئی ۲	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۱۲۰	۱۲=۰۰
۱۳	ہما لکھنو	ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ، ناپلی اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد	ڈاکٹر عطاء اللہ شاہ آبادی	۴۰	۴=۰۰
۱۴	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاؤس پیرس	ناظم یونسکو	۳۲	— —
		(دو ماہی)			
۱۵	تحریر	"علمی مجلس" ۲۹۴۱، حویلی نواب صاحب۔ فراش خانہ دہلی	مالک رام	۱۵۰	۱۵=۰۰
۱۶	شیرازہ	کلچرل اکاڈمی، شہید گنج سری نگر	محمد یوسف ٹینگ	۱۰۰	۱۰=۰۰
		(دیڑھ ماہی)			
۱۷	شگوفہ	۴۷، بھیلی سی کوارٹرس، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱	سید مصطفیٰ کمال احمد	۶۴	۱۰=۰۰
		(ماہنامے)			
۱۸	آج کل	پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱	[illegible]	۴۰	۹=۰۰

۱۹	آندھرا پردیش	محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ گرہا کلپا کرم چاری اردو حیدرآباد	اختر حسن	۴۸	۲=۰۰
۲۰	آہنگ	کلچرل اکیڈمی۔ جگ جیون روڈ گیا (بہار)	کلام حیدری	۴۲	۱۲=۰۰
۲۱	اسپان (انگریزی)	بہاول پور ہاؤس۔ سکندرا روڈ نئی دہلی	ٹی وی کے براون	۵۸	۵=۰۰
۲۲	اشارہ	صادق پور سمائے پٹنہ (بہار)	قیوم خضر	۴۸	۲=۰۰
۲۳	الحق	۳۹۷-۱-۱۴ اردو بگیان باغ بستیارام پیٹھ حیدرآباد	سید عبدالجلیل	۴۸	حسبِ استطاعت
۲۴	الفاروق	بنگلہ آزاد خاں۔ رام پور (یو پی)	عابد رضا بیدار	۴۸	۵=۰۰
۲۵	امریکن ریویو (انگریزی)	جانکیہ پوری۔ شانتی پتھ۔ نئی دہلی ۱۱	پی اے ج ہیلن	۴۴	۱=۰۰
۲۶	انڈین لٹریچر (انگریزی)	۲/۶ رام نگر نئی دہلی ۱	لکشمی شاستری	۳۲	۲=۰۰
۲۷	بانو	آصف علی روڈ اجمیری گیٹ۔ نئی دہلی ۱	زینت کوثر دہلوی	۶۴	۱۰=۰۰
۲۸	برہان	جامع مسجد اردو بازار۔ دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۶۰	۸=۰۰
۲۹	بلیٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز راشٹرپتی نواس شملہ	وینکٹ رامن	۲۰	—
۳۰	بنتِ حوا	۱۴ کمرشیل چیمبرس کارنر محمد علی و یوسف مہر علی روڈ بمبئی ۳	مفیدہ خاتون	۴۴	۱۲=۰۰
۳۱	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ، دریا گنج دہلی ۶	خوشتر گرامی	۱۲۰	۱۵=۰۰
۳۲	پونم	۱/۳۴/۱-۷-۱۶ اعظم پورہ حیدرآباد ۲۴	ناصر کرنولی	۳۲	۱۰=۰۰
۳۳	پیامِ تعلیم	جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	محمد حسین خاں ندوی	۶۴	۸=۰۰
۳۴	پیکر	۲۱۴-۶-۳ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹ (اے پی)	اعظم راہی	۸۴	۱۲=۰۰
۳۵	تجلی	دیوبند ضلع سہارن پور (یو پی)	عامر عثمانی	۶۴	۸=۰۰
۳۶	تحریک	۹ انصاری مارکیٹ۔ دریا گنج۔ دہلی ۶	گوپال متل	۶۴	۱۰=۰۰
۳۷	تعارفِ ادب	مکتبۂ شاہراہ اردو بازار دہلی ۶	سید جعفر عباس	۲۰	۴=۰۰
۳۸	جاسوسی پنجہ	پنجابی پستک بھنڈار۔ دریبہ کلاں۔ دہلی ۶	وی دہلوی	۱۲۰	۸=۰۰
۳۹	جامعہ	جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶=۰۰
۴۰	جانثار	۶۸ سبھاش نگر۔ کٹرہ شیر سنگھ۔ امرت سر (پنجاب)	میلا رام وفا	۵۸	۱۰=۰۰
۴۱	جمالستان	۳۶۴ بازار سٹیا محل۔ دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۸=۰۰
۴۲	حریم	نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ (یو پی)	نسیم انہونوی	۴۸	۷=۰۰
۴۳	خاتونِ دکن	۲۲-۳-۴۳۹ گڑکی باولی حیدرآباد ۲	صالحہ الطاف	۴۸	۶=۰۰

۴۴	دوام	پوسٹ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یو پی)	مختار احمد مظاہری	۶۴	۷=۰۰
۴۵	زبان و ادب	آزاد کتاب گھر۔ کلاں محل۔ دہلی ۶	قاضی معز الدین احمد	۳۰	۳=۰۰
۴۶	زیور	سبزی باغ۔ پٹنہ ۴ (بہار)	رضوان احمد	۶۵	۸=۰۰
۴۷	ساہتیہ اکیڈمی قصص جرنل (انگریزی)	رابندر بھون، فیروزشاہ روڈ نئی دہلی ۱	پی۔ ماچوے	۴۸	۶=۰۰
۴۸	سنٹر کالینگ (انگریزی)	فیملی پلاننگ ڈپارٹمنٹ حکومتِ ہند۔ کرزن روڈ۔ نئی دہلی	ایس اے کپور	۱۲	— —
۴۹	سوویٹ لٹریچر (انگریزی)	۲۲ کوتوزووسکی پروسپیکٹ۔ ماسکو (یو ایس ایس آر)	ساوا ڈنگوو	۱۴۴	— —
۵۰	سیکولر ڈیموکریسی (اردو)	A-۱۹ تعمیر کمیونی کیشن بلڈنگ۔ کناٹ سرکس نئی دہلی ۱	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۸	۱۰=۰۰
۵۱	سہیل	باری روڈ۔ گیا (بہار)	ادریس نہساروی	۳۲	۴=۰۰
۵۲	شاخسار	بخشی بازار۔ کٹک (۱) اڑیسہ	امجد نجمی	۷۰	۶=۰۰
۵۳	شاعر	پوسٹ بکس ۴۵۲۶ بمبئی ۴ (بی آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	۱۰=۰۰
۵۴	شانِ ہند	فلیٹ ۸۔ انصاری مارکٹ دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	۷=۰۰
۵۵	شاہکار	۱۱۰ مدن پورہ۔ بنارس (یو پی)	محمود احمد ہنر	۱۴۰	۱۵=۰۰
۵۶	شب خون	۳۱۳ رانی منڈی۔ الہ آباد ۳ (یو پی)	عقیلہ شاہین	۸۰	۱۲=۰۰
۵۷	شمع	آصف علی روڈ۔ اجمیری گیٹ نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۱۳۲	۱۵=۰۰
۵۸	شمع ملت	ادارۂ تحریک سیرت النبی۔ ایرپیٹ حیدرآباد	عرش محی الدین	۸	۲=۰۰
۵۹	شاہجہاں	قاسم جان اسٹریٹ۔ بلیماران دہلی ۶	عتیق صدیقی	۳۲	۳=۰۰
۶۰	صبا	R T-۳/۴/۲۷ وجے نگر کالونی۔ حیدرآباد ۲۸ (اے۔ پی)	صفیہ ادیب	۷۰	۱۲=۰۰
۶۱	صبحِ امید	پلاسیس روڈ۔ بمبئی ۸	عبدالحمید بوہرے	۴۸	۶=۰۰
۶۲	صبحِ نو	قطب الدین لین۔ پٹنہ ۴ (بہار)	وفا ملک پوری	۴۸	۷=۰۰
۶۳	فارن افیئرس ریکارڈ (انگریزی)	شعبۂ تشہیر۔ وزارتِ خارجہ حکومتِ ہند۔ دہلی	〃	۶۴	— —
۶۴	فروغِ اردو	۳۷۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ (یو پی)	پروفیسر احتشام حسین	۴۸	۵=۰۰
۶۵	کتاب	کیور مارکٹ۔ لکھنؤ ۳ (یو پی)	عابد سہیل	۸۰	۱۲=۰۰
۶۶	کتاب نما	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	وامق شاہجہاں پوری	۲۴	۳=۰۰
۶۷	کشاف	اسٹیٹ اسکاوٹ ہیڈکوارٹرس دولی گوڑہ حیدرآباد ۲۹	دستگیر عزمی	۲۰	۱=۰۰
۶۸	کنول	سیمرا۔ دھن باد (بہار)	شتان بارقی	۴۰	۴=۰۰

نمبر	نام	پتہ	مدیر	صفحات	قیمت
۶۹	کوریا (انگریزی)	عوامی جمہوریہ کوریا - پیانگ یانگ (کوریا)	شان بھادتی	۴۰	۹=۰۰
۷۰	کوریا ٹوڈے (انگریزی)	〃 〃 〃	〃	۶۰	— —
۷۱	کھلونا	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۸۰	۱۲=۰۰
۷۲	گگن	۵واں منزلہ، سوپ پیلیس ۱۳۲ کالبہ کاز اسٹریٹ بمبئی ۳ (ڈی آر)	شمس کنول	۶۸	۱۲=۰۰
۷۳	گل نو	۴۶-۷-۲۲ - چھتہ بازار حیدرآباد ۲	انور نظامی	۳۲	۶=۰۰
۷۴	امنیر	امنیر اشاعت گھر کریم نگر (اے پی)	کمال کریم نگری	۴۰	۶=۰۰
۷۵	ماہر	محفل شعر و ادب - عیدی بازار - حیدرآباد - ۲۳	سعادت پرویز	۱۱۲	۱۲=۰۰
۷۶	مجرم	آصف علی روڈ - نئی دہلی ۱	ادریس دہلوی	۱۶۰	۱۲=۰۰
۷۷	محب وطن	چشتی چمن - حیدرآباد ۶ (اے پی)	شبیر قادری افتخاری	۴۰	۶=۰۰
۷۸	معارف	دار المصنفین - اعظم گڈھ (یوپی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸=۰۰
۷۹	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیا - نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۶=۰۰
۸۰	میڈیکل ڈائجسٹ	شفا پبلی کیشن بنیا چھابر - کان پور ۱	ڈاکٹر ضیا احمد انصاری	۱۴۴	۱۵=۰۰
۸۱	نگارشات	ایک کارنر - دانشمندان اسٹریٹ امروہہ (یوپی)	ایم ایچ رضوی	۱۲	۲=۰۰
۸۲	نوری کرن	بازار صندل خاں بریلی (یوپی)	اقبال احمد نوری	۴۸	۶=۰۰
۸۳	نیا دور	محکمہ اطلاعات اتر پردیش - لکھنو	خورشید احمد	۵۶	۶=۰۰
۸۴	ویت نام میگزین (انگریزی)	ویت نام کونسل فار فارن رلیشن - سائیگان - ویت نام	الائی پاؤ	۳۲	— —
۸۵	ہمایوں	۸ ۱۲/۶ تلک نگر - دہلی ۱۸	تاجور سامری	۴۸	۱۰=۰۰

(پندرہ روزہ)

نمبر	نام	پتہ	مدیر	صفحات	قیمت
۸۶	امریکن لیبر ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	مورس ویا نیر	۲۸	— —
۸۷	بھودان تحریک	راج گھاٹ - وارانسی (یوپی)	احمد فاطمی	۸	۴=۰۰
۸۸	پریس ریلیز نیدرلینڈ (اردو)	ندرلینڈ ایمبیسی - شانتی پتھ، چانکیہ پوری - نئی دہلی	〃	۸	— —
۸۹	روداد حیات	۷-۹-۱-۱-۱۰ اے سی گارڈ حیدرآباد	عمر بن علی	۸	۵=۰۰
۹۰	[illegible]		جمیل اختر	۴۸	۵=۰۰
۹۱	سوویت دیس (اردو)	۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	محمد غالب	۸	۵=۰۰
۹۲	کرنٹ سائنس (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس - نئی دہلی	ذہی قمر	۴۰	۵=۰۰

نمبر	نام	پتہ	مدیر		قیمت
۹۳	نغمۂ حیات	کالاڈیرہ - حیدرآباد ۲۷ (اے پی)	انور کمال خوندمیری	۲	۴ = ۰۰
۹۴	کرنٹ ڈیولپمنٹس (انگریزی)	پریس انفارمیشن سروس، سکندرا روڈ نئی دہلی	مینارڈ ایچ فورڈ	۲۰	— —
۹۵	مغربی بنگال	نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت مغربی بنگال کلکتہ	"	۱۲	۳ = ۰۰
۹۶	ہماری منزل	۵-۷۰/۹۸ نامپلی مارکٹ - حیدرآباد (اے پی)	شفیع اقبال	۸	۵ = ۰۰
۹۷	ہمدرد	ہمدرد منزل - لال کنواں - دہلی	حکیم عبدالحمید دہلوی	۸	۳ = ۰۰
		(ہفتہ وار)			
۹۸	آورش	آبگلہ - بنیاد گنج - گیا (بہار)	معین شاہد	۴	۷ = ۰۰
۹۹	القریش	نامپلی حیدرآباد ۱	محمد ابراہیم مدنی	۸	۵ = ۰۰
۱۰۰	آندھرا پنچ	اپل کلاں - حیدرآباد - ۱۳ (اے پی)	ملک محمد علی خاں	۲	۶ = ۰۰
۱۰۱	اردو خبریں	روسی سفارت خانہ - ۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	"	۸	برائے صحافت
۱۰۲	امریکن رپورٹر (اردو)	امریکن انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی ۱	ڈی پی مستا	۱۲	۱ = ۰۰
۱۰۳	" (تلگو)	" " " " " " " "	ڈیفنی ٹی ڈونالڈ	"	" "
۱۰۴	" (انگریزی)	" " " " " " " "	" "	"	" "
۱۰۵	افکار و جائزے	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	" "	۱۲	برائے صحافت
۱۰۶	ایشیاء	اردو بازار جامع مسجد - دہلی	برہما نارائن	۱۲	۹ = ۰۰
۱۰۷	برگ آوارہ	ترپ بازار - حیدرآباد ۱ (اے - پی)	سید محمود خاور	۸	۱۲ = ۰۰
۱۰۸	بلٹز (اردو)	۱۷/۱۷ کاوس جی پٹیل روڈ - بمبئی ۱	میش سکسینہ	۱۲	۲۰ = ۰۰
۱۰۹	پرچا	اعظم روڈ - نظام آباد (اے پی)	عابد انصاری	۴	۶ = ۰۰
۱۱۰	پرچم ہند	گلی قاسم جان - بلیماران - دہلی ۶	امیر الرحمٰن	۲۴	۱۲ = ۰۰
۱۱۱	پریس بلیٹن (اردو)	پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند لبرٹی روڈ حیدرآباد ۲۵	اسحٰق الدیقی	۱۲	برائے صحافت
۱۱۲	تعمیر	کالج روڈ - محبوب نگر (اے پی)	محمد عبدالعزیز	۸	۸ = ۰۰
۱۱۳	تھرل (انگریزی)	ہنو ملک پیٹ - حیدرآباد ۳۶	علاء الدین جیبا	۱۲	۱۵ = ۰۰
۱۱۴	جنگ	کنگ کوٹھی روڈ حیدرآباد ۱	مرتضیٰ مجتہدی	۱۲	۱۲ = ۰۰
۱۱۵	دلیر	جرن (سری نگر)	"	۱۲	۱۲ = ۰۰
۱۱۶	ذوالقرنین	نظامی بکڈپو - بدایوں (یوپی)	حمید الدین نظامی	۸	۶ = ۰۰
۱۱۷	رہنمائے تلنگانہ	سروج نگر - یوسف گوڑہ، حیدرآباد ۳۸	یوسف ندیم	۴	۸ = ۰۰

۱۱۸	رہنمائے وقت	نامپلی روڈ-حیدرآباد ۱	عثمان شیدا	۸	۱۰=۰۰
۱۱۹	رفیقِ ملت	مدارس	〃	۸	۶=۰۰
۱۲۰	سحر	ناندیڑ (مہاراشٹرا)	احمد علی بیگ حنفی	۶	۵=۰۰
۱۲۱	سوویت جائزہ	۲۵-بارہ کھمبا روڈ دہلی	احمد معظم	۲۴	۵=۰۰
۱۲۲	سماّمتا (اُردو)	جالندھر (پنجاب)	جیونت سنگھ کول	۸	۵=۰۰
۱۲۳	شعور	مدینہ منشن-نارائن گوڑہ حیدرآباد ۲۹	رحیم قمر قریشی	۸	۸=۰۰
۱۲۴	طب کی خبریں	روسی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ-نئی دہلی	〃	۸	برائے اشاعت
۱۲۵	فارم نیوز بلیٹن (انگریزی)	مرکزی وزارت اغذیہ - دہلی	〃	۸	〃
۱۲۶	قومی محاذ	جونا بازار - اورنگ آباد (مہاراشٹرا)	اشرف فاروقی	۴	۵=۰۰
۱۲۷	فصاحت	چینلی کامنڈوا-کوٹلہ عالی جاہ-حیدرآباد ۲	غضنفر علی النقوی	۸	۱۰=۰۰
۱۲۸	کوثر	اشوکا روڈ-میسور (کرناٹک)	خلیل بے باک	۴	۶=۰۰
۱۲۹	منصف	چار محل، حیدرآباد ۱ (اے پی)	جعفر حسین جعفری	۶	۵=۰۰
۱۳۰	مورچہ	بیراگی-گیا (بہار)	کلام حیدری	۱۲	۶=۰۰
۱۳۱	نیا آدم	۴۴۶ گنج منڈی-اسٹیشن روڈ-حیدرآباد ۱	امجد باغی	۱۲	۱۰=۰۰
۱۳۲	واقعات و تبصرے	روسی سفارت خانہ - بارہ کھمبا روڈ-نئی دہلی	〃	۸	برائے اشاعت
۱۳۳	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند-علی گڑھ (یو پی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	۶=۰۰
		(دوروزہ)			
۱۳۴	سوویت یونین کی خبریں	تاس ۲۵-بارہ کھمبا روڈ-نئی دہلی	〃	۱۲	برائے اشاعت
۱۳۵	سوویت فیچر	〃	〃	۸	〃
		(روزنامے)			
۱۳۶	انگارے	وشاکھا بلڈنگ-عام باغ روڈ-حیدرآباد ۱	معین فاروقی	۴	۲۴=۰۰
۱۳۷	ترجمان	پنڈی اسٹریٹ-لدھیانہ (پنجاب)	امر ناتھ سیالکی	۴	۲۴=۰۰
۱۳۸	خدمت	دی بنڈ-سری نگر (کشمیر)	پی این واتل	۴	۲۴=۰۰
۱۳۹	رہنمائے دکن	افضل گنج-حیدرآباد (اے پی)	سید لطیف الدین	۸	۶۰=۰۰
۱۴۰	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ-حیدرآباد ۱ (اے پی)	میر عابد علی خاں	۱۰	۶۰=۰۰

اِدارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد (اے پی)

تختۂ آمدنی سال سنہ ۱۹۷۰ء تا ختم ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۷۱ء

تفصیل آمدنی	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک افتتاحی (رقوم نقد و بنک)				
ا = نقد رقوم	11089	62		
ب = رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر	1242	41		
ج = اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ (کنرا بنک)				
۱- ادارہ اکاونٹ	28	28		
۲- سب رس اکاونٹ	282	76		
د = کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ حیدرآباد	11	48		
ہ = فکسڈ ڈپازٹس در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد صدر دفتر				
بشمول انٹرسٹ	7,461	92	20,116	47
امداد				
(۱) از حکومت آندھرا پردیش محکمۂ تعلیمات جی او نمبر ۵۱۰ مورخہ ۱۱/۳/۱۹۷۱ء	5,400	-		
(۲) " " " " جی او نمبر ۵۱۱ " ۱۱/۳/۱۹۷۱ء	450	-		
(۳) از سکریٹری حیدرآباد سٹی گرانڈ عالیہ مشتملہ 200، 340، 200 روپے	740	-		
(۴) از کمشنر محکمۂ بلدیہ حیدرآباد برائے امداد کتب خانہ	150		6,740	-
آمدنی از فروخت مطبوعات			1,484	53
آمدنی از ماہنامہ سب رس				
۱- چندہ سالانہ	553	85		
۲- از فروخت قدیم شمارہ جات	131	03		
۳- از " غالب نمبر	214	15		
۴- از اشتہارات	670	-	1,569	03
منافع بابتہ سیونگس بنک اکاونٹس				
۱- ادارہ اکاونٹ	-	50		
۲- سب رس اکاونٹ	-	-	-	50
اردو امتحانات				
فیس، میمورنڈم، عارضی صداقت نامہ، قیمت قواعد و پرچہ جات سوالات وغیرہ			4,120	55
متفرق آمدنی				
۱- ٹیلیفون کالس	3	60		
۲- آمدنی کار باغ	214	28		
۳- ادائی پیشگی برائے عملہ دفتر ادارہ (بصورت قرض)	145	-	362	88
فرق حسابات			5	90
میزان			34,399	81

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد (اے۔ پی)

تختہ خرچ سال ۱۹۷۰ء تا ختم ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ء

تفصیل خرچ	روپیے	پیسے	روپے	پیسے
۱۔ اخراجات اشاعت کتب، خریدی مطبوعات برائے فروخت بشمول ڈاک خرچ و متفرق	1,261	90		
۲۔ معاوضہ مصنفین	50	-	1,311	90
۱۔ اخراجات اشاعت سب رس، طباعت بشمول کاغذ	1,982	-		
۲۔ اخراجات ڈاک و متفرق	158	94	2,141	60
کتب خانہ				
۱۔ خریدی کتب و جلد بندی	200	-		
۲۔ جرائد و متفرق	38	25		
۳۔ تنخواہ عملہ کتب خانہ	1,200	-		
۴۔ خریدی و اخراجات درستی فرنیچر	382	80	1,821	05
علمی و ثقافتی۔ عرونیات و تقاریب				
۱۔ یوم محمد قلی قطب شاہ	1	-		
۲۔ اخراجات دفتر				
۱۔ تنخواہ عملہ دفتر	4,740	-		
۲۔ فون۔ بجلی۔ پانی۔	606	50		
۳۔ اخراجات طباعت جرائد و ڈاک	46	48		
۴۔ 〃 متفرق	191	95		
۵۔ 〃 ٹائپ	71	70		
۶۔ 〃 داغ دوزی و مرمت عمارت ادارہ	26	44		
۷۔ 〃 آمد و رفت آفس سکریٹری	544	-		
۸۔ 〃 پیشگی برائے عملہ دفتر	100	-		
۹۔ 〃 ادائی انٹرسٹ جو بنک کو قرض کے سلسلہ میں ادا کیا گیا۔	173	77	6,499	84
اخراجات اردو امتحانات			3,424	54
〃 کارب باغ			44	98
〃 آڈٹ فیس			100	-
سلک اختیاری نقد و بنک				
۱۔ نقد رقم دستی بشمول چک نمبر A-936996 مورخہ ۳۱؍۳؍۱۹۷۱ء	5,057	07		
۲۔ نقد رقم در اسٹیٹ بنک حیدرآباد صدر دفتر (کرنٹ اکاونٹ)	6,164	44		
۳۔ اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ (در کنرا بنک)				
الف۔ ادارہ اکاونٹ	28	78		
ب۔ سب رس اکاونٹ	331	26		
۴۔ کلکشن اکاونٹ (جی دگرناتھ مل بنک لمیٹیڈ)	11	48		
۵۔ فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک	7,461	92	1,9054	95
صدر میزان			34,399	86

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

صدور ادارہ

نواب سر مہدی یار جنگ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۷ء

نواب لیاقت جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء

جناب سید علی اکبر ۱۹۶۱ء

نائب صدور ادارہ

نواب لیاقت جنگ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۴۷ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء

جناب سید علی اکبر ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۷ء

سید دلدار حسین ۱۹۶۱ء

راے جانکی پرشاد ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۶ء

محترمہ تہنیت النساء بیگم زور ۱۹۶۶ء تا ۱۹۶۷ء

حامد علی عباسی ۱۹۶۷ء

اعزازی سرپرست

محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور

مجلس امنا

۱۔ جناب سید علی اکبر (صدر)

۲۔ لکشمی نارائن گپتا (نائب صدر)

۳۔ محمد اکبر الدین صدیقی

۴۔ ڈاکٹر حمید رراج سکسینہ (معتمد عمومی)

مجلس انتظامی
بہ شمول مجلس امنا

۵۔ حامد علی عباسی۔ نائب صدر

۶۔ ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں

۷۔ سری کرشنا سنہا

۸۔ میر حسن

۹۔ عارف الدین حسن

۱۰۔ رمن راج سکسینہ شریک معتمد

۱۱۔ میر لیسین علی خاں ”

۱۲۔ میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری

ادارہ کی ذیلی مجالس

۱۔ مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

۲۔ مجلس تعلیم بالغان و اردو امتحانات

۳۔ مجلس رسالہ ”سب رس“

۴۔ مجلس نشر و اشاعت

۵۔ مجلس انتظامی کتب خانہ

۶۔ مجلس ادب اطفال

۷۔ مجلس انتظامی اُردو انسائیکلو پیڈیا

عملۂ دفتر

میر سراج الدین علی خاں — آفس سکریٹری

محمد جمال الدین۔ منتظم ادارہ

ترصیص الدین انصاری۔ لائبریرین

وقار خلیل۔ منتظم سب رس و دارالمطالعہ

محمد نذیر الدین۔ کارپرداز

محمد عبداللہ۔ چوکیدار۔

ادارہ ادبیات اردو کی مطبوعات

تاریخ و سیاسیات

- تاریخ نامۂ دکن — 2/-
- ہندوستانی قومیت — 1/25
- ریاض مختاریہ — 5/-
- قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (تلگو) — 2/-
- حیدرآباد — -/75
- اشوک اعظم — -/50
- دادا بھائی نوروجی — -/25
- بلقان — -/40
- اسلامی عدل گستری — 1/75
- سلاطین شاہی خاندان — 5/-
- تاریخ گولکنڈہ — 4/-
- مقدمہ تاریخ دکن — 2/-
- تاریخ سیاسیات — 2/50
- بہمنی سلطنت — 2/50
- حیدرآباد کے بڑے لوگ — 2/-
- تاریخ باگکنڈہ — 2/50
- سالار جنگ اعظم — -/50
- عماد الملک — -/50
- ہن بکلی — 1/-
- اللہ وانو یکی تاریخ — 1/25
- سوانح سلاطین آصفی مکمل سٹ — 2/-
- میر محمد مومن — 3/-
- فرخندہ بنیاد حیدرآباد — 2/50
- قطب شاہی سلاطین اور آندھرا سنسکرتی (انگریزی) — 1/50
- ملکہ حیات بخشی بیگم — -/75
- حدیقۃ السلاطین فارسی — 10/-
- سروجنی نائیڈو — 4/-
- یورپ سے جنگ — 2/50

ادبی تاریخ

- تاریخ ادب اردو — 2/-
- محمد حسین آزاد — 2/50
- سرگزشت حاتم — 2/-
- سرگزشت غالب — 1/-
- نگارستان دکنی — 1/50
- داستان ادب حیدرآباد — 2/50
- تذکرہ اردو مخطوطات (سوم) — 4/-
- 〃 〃 چہارم — 4/-
- 〃 〃 پنجم — 4/-
- تذکرۂ نوادر ایوان اردو — 4/-
- مغربی تصانیف کے اردو تراجم — 1/50

تذکرہ و تنقید

- یادگار جشن سیمیں — 1/-
- ارمغان یوم محمد قلی — -/50
- مشاہیر قندھار دکن — 1/50
- کلمۃ الحقایق (جانم) — 2/-
- یادگار محمد قلی ۶۵ء — 1/-
- یادگار یوم محمد قلی ۶۶ء — 1/-
- یادگار زور — 6/-
- نذر علی — 3/50
- راہ رو اور کارواں — 2/-
- تحفۃ الشعراء (قاقشال) — 3/-
- یادگار صفی — 1/-
- ارمغان امجد — 1/50
- سرسید احمد خاں — -/25
- میاں داد خاں سیاح — 2/-
- اقبال کا تصور عشق — 2/-
- اقبال کا تصور خودی — 3/-
- مقام غالب — 2/-
- یاد معانی — 1/-
- دار العلوم سے بیرون — 1/-
- مرقع سخن (دوم) — 4/-
- نذر محمد قلی قطب شاہ — 5/-
- یادگار محمد قلی قطب شاہ — -/25
- شعرائے عثمانیہ — 4/-
- دکنی، ہندی اور اردو — 3/50
- نذر معانی — 1/-

خطوط اور مجموعہ مضامین

- نذر دکن — 1/50
- رسائل طیبہ — 3/-
- ادبی تحریریں نذر زور — 2/-
- یاد امجد — 2/-
- روح غالب — 3/-
- مکتوبات شاد عظیم آبادی — 3/-

شعری مجموعے

- مجموعہ نظم حالی — 1/-
- دیوان عشق — 2/-
- آبگینۂ شعر — 6/-
- دیوان ہاشمی بیجاپوری — 6/-
- دیوان داؤد اورنگ آبادی — 1/50
- ارمغان جذبی — 1/-
- رباعیات الہام — 2/-
- آہ لقا اور دوسری نظمیں — 1/50
- نظم پروین — 1/50
- انوار — 2/-
- نمود زندگی — 2/-
- ترجمان زندگی — 2/50
- معانی سخن (محمد قلی) — 1/50
- رمز سخن (بہاری لال) — 1/50
- آشوب تخیل — 3/50
- گنج طلسم — 1/-
- طالب و موہنی — 1/50

ناول، افسانے اور ڈرامے

- سانولی اور دوسرے ڈرامے — 2/-
- ٹھنڈی بجلیاں — 2/-
- ملک گوہرین — -/50
- برف میں آگ — 2/-
- تماشائے اہل ہنر — 1/50
- من کی دنیا — 1/-
- نکہت گرو — 2/-
- رم جھم — 1/50
- کاغذ کی ناؤ — 1/50
- محبت کی چھاؤں — 1/50
- لیلیٰ — 1/50
- سچ کا جادو — -/50
- ہلینیا — 1/-
- سیر گولکنڈہ — 1/50
- طلسم تقدیر — 1/-
- نیل کنول مسکائے — 2/50



ادارۂ ادبیات

درجہ سوم ۲
[illegible] ۳ محمد مقصود علی
[illegible] ۶ محمد شرف الدین اختر
[illegible] خان ۱۰ امیر محمد علی حامد
[illegible] الرحمٰن ۱۷ سید برہان الدین
[illegible] ۲۲ غلام حبیب
[illegible] خواجہ ۳۱ ریحانی بیگم
[illegible] بیگم ۳۸ سعادت بیگم
[illegible] ۴۳ عبداللطیف [illegible]
[illegible] درجہ دوم
[illegible] ۴۵ میر یوسف علی
[illegible] رضوی ۴۸ مرزا [illegible]
[illegible] ۳۲ سید خان [illegible]
[illegible] مسعود خاں ۵۰ مشتاق [illegible]
[illegible] علی ۵۵ محمد شفیع الدین [illegible]
[illegible] ۵۷ جشن عالم خاں
[illegible] ۶۰ سید [illegible]
[illegible] بیگم [illegible]
[illegible] درجہ دوم [illegible] محمد علی
[illegible] مشتاق احمد

۶۲ عبدالرزاق ۶۶ عبدالسلیم
۶۷ محمد عبدالقیوم ۶۸ محمد شمیم الدین
۶۹ سید اظہر اشرف نعیم ۷۰ محمد وہاب الدین
۷۲ محمد فاروق علی ۷۴ احمدی بیگم
۷۶ ممتاز بیگم ۸۰ پرتم سلطان ۸۱ عائشہ صدیقہ بیگم

مرکز سرپور کاغذنگر درجہ دوم

۸۶ عبدالوہاب ۹۷ محمد عبدالودود
درجہ سوم ۲ عبدالرحیم ۸۳ محمد ظہیر علی
۸۴ محمد ریاض الدین ۸۵ سراج الدین احمد
۸۷ قاسم خان ۸۸ محمد منتخب الدین صابر
۸۹ محمد جمال الدین ۹۰ محمد صاحب خان
۹۲ محمد رفیع الدین ۹۳ سید احمد [illegible] اللہ

مرکز کریم نگر درجہ دوم

۱۲ غلام افضل بیابانی ۹۸ [illegible]
افضل پاشاہ ۹۹ [illegible] بیگم
۱۰۰ منیرہ بیگم ۱۰۷ سید احمد [illegible]
۱۰۸ محمد عبدالرشید ۔ درجہ سوم
۱۰۳ محمد سالار ۱۰۹ حمیرہ [illegible]
۱۱۱ [illegible] حسین

مرکز [illegible]
۱۱۴ [illegible]

مرکز محبوب نگر درجہ [illegible]
درجہ سوم ۱۳۳ محمد احمد خاں ۱۳۵ [illegible]
سید قمر الدین ۱۳۶ محمد [illegible]
۱۳۹ محمد عبدالشکور ۱۴۲ محمد [illegible]
۱۴۳ سیدہ امۃ الحفیظ ۱۴۴ سیدہ امۃ [illegible]
۱۴۵ قمر النساء بیگم ۱۴۷ آمنہ بیگم

مرکز ناگر کرنول درجہ سوم ۱۴۹
خواجہ قطب الدین ۱۵۰ محمد معین الدین
۱۵۳ حلیم النساء بیگم ۱۵۶ سید [illegible]
۱۵۹ [illegible] النساء بیگم ۱۶۰ محمد [illegible]

مرکز نظام آباد درجہ دوم
۱۶۴ [illegible] ۱۶۵ سید [illegible]
۲۲۵ قیصر جہاں ۔ درجہ سوم ۱۶۱ شیخ [illegible]
۱۶۴ محمد عبدالرزاق ۱۶۸ محمد عبد [illegible]

مرکز گلواکرتی درجہ سوم
۱۷۰ سید ریاض الدین ۱۷۱ [illegible]
۱۷۲ خورشید علی ۱۷۳ محمد کریم [illegible]
۱۷۴ [illegible] ۱۷۶ مرزا [illegible]
[illegible]
۱۷۹ [illegible]

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد (۳۶) شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۷۳ء

ماہنامہ سب رس

احتشام نمبر

زر سالانہ آٹھ روپے — غیر ممالک سے پندرہ روپے

زر ششماہی چار روپے — فی پرچہ پچھتر پیسے

نمونے کے پرچہ کے لیے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر نے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ سے شائع ہوا۔

REG.D: H-1264

ترتیب

نقد و نظر

اپنی بات

پروفیسر احتشام صاحب سے متعلق مضامین پیش ہیں۔ ادارہ کا مالی موقف ایسا نہیں کہ وہ کوئی ضخیم شمارہ پیش کرتا۔ یہ محض ایک حقیر خراجِ عقیدت ہے۔ اردو ادب کے ایک بلند پایہ نقاد کی خدمت میں۔ ان کا علم، ان کی سادگی، ان کے اندازِ تحریر، اردو ادب کو ان کی دین اور سب سے بڑھ کر ان کی انسان دوستی اور انسانیت نے سبھی ملنے جلنے والوں کو متاثر کیا ہے۔ خواہ وہ ان کے عزیز اقارب ہوں یا طلبا یا ہم دستار اور ملاقاتی۔ جناب شرف الدین صاحب سرخی استاد شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج گلبرگہ کا بھی ایک مضمون شریک ہے "آزادی کے بعد ادب کے پچیس سال" اس مضمون کے حصۂ تنقید میں احتشام صاحب کی خدمات کا ذکر ناگزیر تھا۔ توقع ہے کہ یہ مضامین دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

ان مضامین کی وجہ سے سلسلہ وار شائع ہونے والا ایک مضمون "باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ" اور "دیوان حسینی" اپریل کے شمارے میں پیش کئے جائیں گے۔

"دیوان حسینی" کے بعد شعلی کا دیوان شائع ہوگا۔ شعلی کا نام شاہ عالم تھا۔ یہ سلطان ثانی کے مرید تھے۔ دیوان میں روایتی شاعری کی بجائے متصوفانہ غزلیں ہیں۔ اس میں ریختی کی بھی چند غزلیں ہیں۔ جو غالباً ہاشمی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ مئی کو مختلف مراکز پر منعقد ہوں گے۔ تمام مراکز کے معتمد صاحبان سے خواہش کی جاتی ہے کہ وہ فیس اور درخواستوں کے فارم ۱۵ اپریل تک بھیج دیں۔ فارموں کی تنقیح کے موقع پر بعض خانے معرا نظر آتے ہیں ... اور اس کی بعد کو تکمیل کرانی پڑتی ہے۔ درخواستیں بھیجتے وقت ہی اگر اس کی تنقیح کر لی جایا کرے تو بہتر ہوگا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

حامد اللہ ندوی

احتشام صاحب

"۱۹۳۰ء میں تعلیم کے لئے میں الہ آباد پہنچا الہ آباد اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک کا مرکز تھا بدیسی اور خاص کر برطانوی مال کا بائیکاٹ ستیہ گرہ اور سیاسی چہل پہل اپنے شباب پر تھی میں بھی فطری طور پر قومی آزادی کے جذبہ سے معمور ہو گیا الہ آباد میں جو بیداری تھی میں نے اسے جذب کرنے کی کوشش کی . . . یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں میں نے لکھنا شروع کیا افسانے ڈرامے نظمیں تنقیدی مقالات علمی مضامین سب کچھ۔ پڑھنے کا یہ حال تھا کہ کسی خاص ترتیب یا خیال سے نہیں پڑھتا تھا لیکن ادب تاریخ فلسفہ سیاست نفسیات جنسیات سبھی سے دلچسپی لیتا تھا تاکہ میں زندگی کے مسائل کو پوری طرح سمجھ سکوں......
تحریباً میرا سارا وقت تنقید سے دلچسپی لینے اور تنقیدی مضامین لکھنے میں صرف ہونے لگا ۱۹۳۶ء میں میرے خیالات ایک نئے سانچے میں ڈھلنے لگے ملک میں جو ترقی پسند جمہوری لہریں اٹھ رہی تھیں اور یورپ میں جو فاشزم کی مخالفت کا زور بڑھ رہا تھا۔ میں خود کو ان سے ہم آہنگ کرنے لگا میں نے اپنی تحریروں کی مدد سے اس کشمکش کو سمجھنے کی کوشش شروع کی جو بہت ہی تند و طوفانی لیکن بہت ہی پیچیدہ شکل میں ملک کے اندر رونما ہو رہی تھی اور جس کے اندر جمہوری ترقی کے تقاضے چھپے ہوئے تھے مختلف گروہوں اور طبقوں کے عمل میں یہ باتیں جس طرح ظاہر ہو رہی تھیں میں ان کی حقیقت جاننا چاہتا تھا . . .

. . . میرا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی ملک اور قوم کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی جڑیں اس کے سماجی نظام میں پیوست ہو گئی ہیں اور ان کو اس سے الگ کر کے دیکھنا کبھی صحیح نتائج تک نہیں پہنچا سکتا . .
میں نے اپنی تمام تحریروں میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے ایسا آئینہ نہیں جس میں صرف زندگی کے ٹھہرے ہوئے نقش دیکھے جا سکیں بلکہ ادب متحرک بن کر ہمیں زندگی کے اعلیٰ مقاصد تک پہنچانے اور انہیں حاصل کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے میرا خیال ہے کہ انسان کی فطرت میں بدی نہیں ہے بلکہ حالات اسے ایسا بناتے ہیں اور اگر ہم تمام قوموں کو مطمئن اور آسودہ حال زندگی بسر کرنے کا موقع دیں تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے انسان دوستی پر مبنی بین الاقوامیت جو ہر ملک اور ہر قوم کو برابری کا درجہ دینا قبول کرتی ہے اور ہر قوم کی شخصیت کو برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ ہماری اصل منزل ہے میرا عقیدہ ہے کہ دائمی امن قائم ہو سکتا ہے اور انسان ترقی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔

دنیا کے اچھے انسان اور اچھے ادیب اس جانب رہنمائی کرتے رہے ہیں ..... اس طرح جب ادب کا مطالعہ کرتا ہوں تو اس میں انسان کے سیاسی، معاشی، تاریخی، سماجی، مذہبی سبھی حالات کو لے لیتا ہوں تاکہ صحیح تصویر بن سکے۔ میں نے اسی طریقہ کو مفید پایا ہے اور اسی کی اشاعت کرتا رہا ہوں ... ... میں جس زبان میں لکھتا ہوں وہ اُردو ہے جسے ابھی بیسویں صدی کی ابتدا تک ملک کی عام زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن حالات اس قدر تیزی سے بدلے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست نے وہ ابتری پھیلائی ہے کہ ہندوستان میں اس کی زندگی مشکل ہو رہی ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میں اعلیٰ ادب موجود ہے اور اب بھی پیدا ہو رہا ہے اور میں اس کی حیثیت منوانے کی کوشش کرتا رہوں گا ......"

یہ تھیں وہ باتیں جو احتشام صاحب نے ۱۹۵۲ء میں راک فیلر فاؤنڈیشن کی فیلو شپ کے لئے درخواست دیتے وقت اپنے متعلق مختصراً قلمبند کی تھیں۔

(۲)

۱۹۵۲ء احتشام صاحب کی زندگی کا بڑا اہم سال تھا، یہی وہ سال تھا جس میں احتشام صاحب کو زندگی میں پہلی بار ہندوستان سے باہر قدم رکھنے اور اپنے نظریات و معتقدات کو حقائق زندگی کے آئینہ میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب انگریزوں نے ہندوستان خالی کر دیا تو اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے دو نئے ملک آگے بڑھے، ایک روس تھا دوسرا امریکہ، روس اس وقت کچھ زیادہ طاقتور نہ تھا لیکن اس کے ہاتھ میں کمیونزم کے نام سے ایک منظم تحریک تھی جس کے ذریعہ وہ پس ماندہ ممالک میں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے اثرات کو بڑھا رہا تھا، کمیونزم کے نام لیوا اور ہمدرد ادب، سیاست، معیشت غرض کہ زندگی کے ہر میدان میں موجود تھے جو خونین انقلاب لانے اور سرخ سویرا پھیلانے کی باتیں کیا کرتے تھے۔

امریکہ کمیونزم کے اس پھیلاؤ سے خائف تھا لیکن اس کے پاس ایسی کوئی طاقتور تحریک نہ تھی جو کمیونزم کا توڑ ثابت ہوتی، وہ جماعت کے مقابلہ میں فرد کی آزادی کو زیادہ اہم سمجھتا تھا، اس کے ہمدرد بھی جگہ جگہ پھیلے ہوئے تھے جو بااثر لوگوں سے رابطے قائم کرتے اور انھیں اشتراکی نظام کی خرابیوں سے آگاہ کرتے، وہ ہر شعبۂ زندگی سے ایسے افراد کو ڈھونڈھ نکالتے جن کا سماج پر اثر تھا انھیں مختلف اعزاز بخشتے اور ضرورت ہوئی تو سال دو سال کے لئے اپنے اخراجات سے امریکہ کا دورہ کرواتے تھے۔

اُن دنوں اُردو کے ادبی افق پر جو شخصیتیں ابھر رہی تھیں ان میں احتشام صاحب بہ حیثیت معلم اور منقید نگار نمایاں تھے، ان کا اپنا ایک حلقۂ اثر تھا اور اُردو دنیا میں ان کے پرستاروں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، اتنی اہم علمی ادبی شخصیت پر امریکہ نواز حلقوں کی نظر نہ پڑے۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ ان کے ایک محسن یونیورسٹی کے ایک

مدد سے انھیں سفر امریکہ کے لئے تیار کر لیا گیا اور وہ ۱۹۵۲ء میں ایک سال کے تعلیمی سفر پر روانہ ہو گئے ۔

امریکہ سے واپس آنے کے بعد جن لوگوں کو سب سے پہلے ان کے تاثرات سفر سننے کا موقع ملا وہ شاید ہم ہی لوگ تھے۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کے موجودہ رفیق عبدالرزاق قریشی ان دنوں انجمن اسلام ہائی اسکول میں اردو فارسی کے استاد تھے، اسکول کی علمی ادبی سرگرمیوں کا انتظام بھی انھیں کے ذمہ تھا۔ وہ احتشام صاحب کے خاص مداحوں میں تھے، جب انھیں معلوم ہوا کہ احتشام صاحب اپنے سفر امریکہ سے لوٹ آئے ہیں اور بمبئی ہی ان کا قیام ہے تو انھوں نے فوراً ان سے رابطہ قائم کیا اور انھیں انجمن اسلام ہال میں اپنے تاثرات سفر بیان کرنے پر رضامند کر لیا۔ احتشام صاحب کا نام سن کر باہر کے بھی بیسیوں عقیدت مند جمع ہو گئے، ہال پرنسپل، اساتذہ، طلبہ اور دیگر پرستاروں سے کھچا کھچ بھر گیا۔

صبح کے ٹھیک گیارہ بجے احتشام صاحب تشریف لائے، شیروانی اور پاجامہ میں ملبوس، ساری وضعداریاں وہی مشرقی، نہایت باوقار انداز میں تقریباً ایک گھنٹہ تک اپنے سفر اور تاثرات سفر کی تفصیلات سناتے رہے لفظ سے لفظ جملے سے جملہ مل کر پھولوں کی لڑی کی طرح چلا آ رہا تھا۔ سامعین سراپا گوش تھے، شاید انھوں نے کہا ہو :۔

"مجھے امریکہ اندھیرے اجالے کا ایک عجیب امتزاج نظر آیا، بار بار تاریکی کے اندر روشنی دکھائی دی اور بار بار تمدنی ارتقا کے پیچھے دنیا پر چھا جانے کی خواہش کا بھیانک چہرہ سامنے آیا، جنگ کی تمناؤں کے بیچ ایماندار ادیبوں کا امن کا نعرہ بھی سنائی دیا اس لئے نہ تو میں مایوس ہوا اور نہ مجھے اس سے نفرت ہوئی"[1]

دوسرا موقع انھیں قریب سے دیکھنے، انھیں سننے اور ان سے ملنے کا تقریباً بیس سال بعد ۱۹۷۲ء میں ملا۔ اب کی وہ بمبئی، مہاراشٹر دیانند کالج بمبئی کے اردو کے استاد ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی کے ممتحن کی حیثیت سے تشریف لائے تھے ڈاکٹر عالی جعفری کے ہاں ان کا قیام تھا، مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر کے سینئر ریسرچ آفیسر ڈاکٹر عبدالستار دلوی بھی ان کے دیرینہ عقیدت مندوں میں تھے، انھیں پتہ چلا تو ایک شام وہ انھیں اپنے ادارہ میں لے آئے اور "اردو ہندی قومی یکجہتی" پر ان کے خیالات سننے کا ہم سب کے لئے ایک موقع فراہم کر دیا، اب کی احتشام صاحب [illegible] بش شرٹ اور پتلون میں تھے لیکن ان کے آداب مشرقی میں کوئی فرق نہ آیا تھا وہ صاف گو تھے۔ اور بس بات کو سچ سمجھتے تھے بلا جھجک کہہ ڈالتے تھے، انھوں نے اردو ہندی کی ملی تاریخ کا بڑی خوبصورتی سے [illegible] بتایا کہ اصل زبان اردو ہے اور ہندی اس کی [illegible] پر بننے والی نئی حویلی، اردو والے خوش تھے اور [illegible] تھا لیکن ان کی شخصیت کا جادو سب پر برابر جاری تھا۔

---

[1] ساحل و سمندر ص ۳۶۳

(۳)

احتشام صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز شعروشاعری سے ہوا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مضمون "میں کیوں لکھتا ہوں" میں خود ہی بتایا ہے کہ "میں نے پہلے شاعری کی دیوی کو پوجا۔ شعر سنے، شعر پڑھے، انھیں اپنی زندگی کا جز بنایا اور اگر اس سے تسلی نہ ہوئی تو کچھ شعر کہے بھی۔ ان سب میں اکثر و بیشتر اپنی ذات کے گرد جال بن سکا۔ زیادہ تر اشعار اور نظموں کی حیثیت سوانحی ہے لیکن میں نے اپنے تجربات کو عام سماجی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ میں اس میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں"[1]

انھوں نے اپنے ایک افسانہ "بیزاری" میں بھی گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنو کے مشاعروں میں شرکت کرنے کا بار بار خود ہی ذکر کیا ہے۔ دوستوں کی نجی محفلوں میں بھی وہ اپنا کلام اکثر سناتے تھے لیکن ان کی کوئی شعری تخلیق یا نمونۂ کلام مطبوعہ صورت میں نظر سے نہیں گزرا۔ صرف ایک انتخاب "نئی امنگیں" میں "تغیر" کے نام سے ان کی ایک دس شعر کی نظم... ملتی ہے اس کے حسب ذیل دو شعر ہے

پہلے:- تھا محبت میں وہ بھی دور کبھی — رات دن چاندنی برستی تھی

اور اب: اب لرزتے ہیں ہر قدم پر پاؤں — اب محبت سبک خرام نہیں[2]

ان کے اس فکری و جذباتی تغیر کی داستاں سناتے ہیں جو ان کے تصور محبت و زندگی میں واقع ہوا تھا

احتشام صاحب کے کلام کی نایابی کی صورت میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بحیثیت شاعر اردو ادب میں ان کا کیا مقام ہے۔ البتہ ان کی شعر فہمی اور سخن سنجی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ ان کے تنقیدی مجموعوں میں ہمیں خسرو، آتش، غالب، حالی، اکبر، اقبال، حسرت، اختر شیرانی، جگر، مجاز، جمیل مظہری اور متعدد دیگر نئے پرانے شعرا پر بڑے اچھے مضمون ملتے ہیں۔ ان تنقیدوں کو پڑھ کر ان کے نظریۂ شعر کے بارے جن باتوں کا ہمیں شدید طور پر احساس ہوتا ہے یہ ہیں:-

الف:- احتشام صاحب کو فن سے زیادہ مقصد عزیز ہے اسی لئے انھوں نے اپنی شعری تنقیدوں کیلئے زیادہ تر ایسے شعرا کو چنا ہے جو اپنا کوئی مقصد کوئی پیام رکھتے تھے اور قدیم و پامال راہوں سے ہٹ کر شاعری کی ہے چنانچہ غالب، اقبال، اکبر وغیرہ کو وہ نئے اقدار کا علمبردار سمجھتے ہیں اور ان کی مخصوص خوبیوں کی نشاندہی بڑی فراخدلی سے کرتے ہیں۔

(ب) مقصدیت سے ان کی مراد محض سیاسی، معاشی یا سماجی نہیں بلکہ وہ مذہبی، اخلاقی اور صوفیانہ

---

[1] ذوق ادب اور شعور ص ۲۱ [2] نئی امنگیں مرتبہ پرشوتم سنگھ سیٹھی۔

بھی ہو سکتی ہے، اسی لئے انھوں نے آتش، حالی، اقبال اور اکبر سبھی کی تخلیقات کو سراہا ہے۔

(ج) بعض ترقی پسند نقادوں کی طرح وہ غزل کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے، بلکہ غزل کے میدان میں بھی جن شاعروں نے انقلاب لانے یا اس کو سماجی مقاصد کا ترجمان بنانے کی کوشش کی ہے ان کو خراج تحسین پیش کیا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے حسرت، جگر، مجاز وغیرہ کی غزلیہ شاعری اور اس کی خوبیوں کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

(د) لیکن جدید حالات میں وہ نظم کے مخصوص رول کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور اس کو اردو شاعری کا ایک اہم اور ترقی پسند حصہ سمجھتے ہیں چنانچہ انھوں نے اپنے ایک مضمون "اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقا" میں صاف طور سے اعتراف کیا ہے کہ "اقتصادی بدحالی، معاشرتی نا انصافی، سیاسی انقلاب پسندی اور فکری انتشار کے بطن سے ترقی پسندی کی تحریک پیدا ہوئی جس نے زندگی اور ادب کے گوناگوں تعلقات کو قائم رکھنے، انھیں وسیع پیمانے پر آزمانے اور ان سے حیات کی شیرازہ بندی میں کام لینے پر زور دیا، اس طرح نظم گوئی کو پر پرواز ملے نظم نگاری کی یہ تحریک زندگی اور فن کے ان اقدار کی تلاش تھی جو انفرادی اور اجتماعی توازن اور آسودگی کے ضامن ہوں"[1]

ویسے انھوں نے متعدد نظم نگاروں پر مستقل مضامین لکھے لیکن شاید وہ جوش کی نظموں کو ان سارے اقدار کا نمائندہ سمجھتے تھے، اسی لئے انھوں نے ان کو مستقل طور پر اہمیت دی ہے اور مسیح الزماں کے تعاون سے "انتخاب جوش" کے نام سے جوش کی منتخب نظموں کا مجموعہ شائع کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ "جوش کو سمجھنے میں جو دشواری ہوتی ہے اس کا سبب ان کی جذباتیت اور شاعرانہ انفرادی مزاج ہے"[2]

۱۹۵۲ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے ۱۹۵۱ء میں چھپے ہوئے مضامین نظموں اور غزلوں کا انتخاب "منتخب ادب" کے نام سے شائع کیا۔ اس کے مرتبین سید احتشام حسین اور .... غلام ربانی تاباں تھے۔ مقدمہ میں جس کا سرنامہ "عنوان انتخاب" ہے لکھا ہے کہ ادیبوں کے شعور سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطمح نظر انسان دوستی ہوتا جارہا ہے۔ انسان دوستی بہت وسیع معانی پر حاوی ہے۔ ربع صدی پہلے بھی احتشام صاحب کا تنقیدی نظریہ وہی تھا جو آخر تک رہا۔

(۴)

احتشام صاحب کی ادبی زندگی کا دوسرا نقطۂ آغاز افسانہ نگاری تھا، چنانچہ انھوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں اپنی شاعری کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "پھر افسانے لکھے وہ جیسے بھی ہیں میرے خیال ناقص میں زندگی کے بہت

۱۔ عکس اور آئینے　　۲۔ انتخاب جوش ص ۳۰

اہم مسائل کے ترجمان ہیں، بات میں اور تم میں ہے لیکن یہ میں اور تم سماجی حقائق کے نمائندے ہیں۔

احتشام صاحب کے افسانوں کا اول و آخر ایک ہی مجموعہ ملتا ہے جو "ویرانے" کے نام سے ادارۂ فروغ اردو لاہور کی طرف سے شائع ہوا ہے اس میں ان کے ۱۹۳۳ء سے ۱۹۴۲ء تک کے سترہ افسانے ہیں، یہ بتانا کہ ان کے یہ افسانے افسانہ نویسی کے جدید اصولوں پر کہاں تک پورے اترتے ہیں، بہت مشکل ہے کیونکہ خود مصنف کا کہنا ہے کہ "ان افسانوں کا مصنف افسانہ نگار سے زیادہ نقاد ہے بلکہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنی افسانہ نگاری کو تنقید نگاری پر قربان کر دیا، اس سے اسے کوئی فائدہ حاصل ہوا ہو نہ ہوا ہو ایک بات ضرور ہوئی کہ اس نے خود انتقادی میں کسی طرح کی کمی نہیں کی ہے، اس کی فنی صلاحیتیں بہت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوں، اس کی تخئیل اچھے فن کار کی نہ ہو، اس کے نقوش اور خطوط گہرے نہ ہوں، اس کی تصویروں میں رنگ دھندلے ہوں اس کے کردار بے جان ہوں، اس کے اشارے مبہم ہوں اور اس کی زندگی کی ترجمانی ناقص ہو پھر بھی اپنی بساط بھر اس نے اس کی کوشش کی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں زندگی کی وہ جھلک تھوڑی بہت ضرور دکھا سکے جیسے اس نے دیکھا اور سمجھا ہے اس لئے شاید خلوص سے پڑھنے والوں کو ان افسانوں میں خلوص اور تاثیر دکھائی دے اور یہی احساس اس کی مسرت کے لئے کم نہیں ہے"[1]

البتہ ان کے فکری انقلاب کو سمجھنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے۔ اس میں ۱۹۳۶ء سے پہلے کے ان کے جو افسانے ہیں جیسے رہزنی، ایثار، قطرے میں طوفان، ہنگامۂ ہستی سے دور، اور مقناطیس، ان میں نہ کوئی مقصد ہے نہ پیغام یہ سب محض ایک رومان پسند نوجوان کے حسین خواب لگتے ہیں، ان سے محض دل کے بہلانے کا کام لیا جا سکتا ہے۔
لیکن ۱۹۳۶ء کے بعد کے جو افسانے ہیں جیسے دوسرا نکاح، بیزاری، مجبوریاں، اس کا بچہ، حرارت، دعوت، جنگ، ردعمل، اس کا کیا قصور، تھا وغیرہ چند با مقصد افسانے ہیں، ان میں جگہ جگہ سماجی بندھنوں سے نفرت، مزدور کسان غریب کی آہ وزاریاں، زمینداروں اور ساہوکاروں کے مظالم، ملوں، کارخانوں اور دکانوں کی ہڑتالیں، جنسی بھوک، یتیموں اور بیواؤں کی خستہ حالی، آگ خون اور جنگ کی باتیں، روٹی کپڑا مکان کے سہانے خواب غرض کہ اس دور کے سارے ہندوستانی ہنگاموں کی تصویریں ان میں موجود ہیں، جن کو مصور نے اپنے جذبات کے رنگ میں رنگ کر اور موثر بنا دیا ہے

(۵)

احتشام صاحب نے شاعری اور افسانہ نگاری کے بعد تنقید کے میدان میں قدم رکھا اور ان کے حسب ذیل مجموعے ایک کے بعد ایک ہمارے سامنے آتے رہے۔

۱۔ تنقیدی جائزے ۱۹۴۴ء

---
[1] ویرانے ص ۹۱

۲- روایت اور بغاوت ۱۹۴۷ء

۳- ادب اور سماج ۱۹۴۸ء

۴- تنقید اور عملی تنقید ۱۹۵۲ء

۵- ذوق ادب اور شعور ۱۹۵۵ء

۶- عکس اور آئینے ۱۹۶۲ء

۷- افکار و مسائل ۱۹۶۳ء

۸- اعتبار نظر ۱۹۶۵ء

اپنے ایک مضمون "مقدمہ کے طور پر" میں انھوں نے اپنی تنقید نگاری کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے "تنقید نگاری سے میرا مقصد ادب کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا شاعر اور ادیب کو اس کی تخلیقی کاوشں پر نقاد کو اس کے صحیح شعور اور ادراک پر داد دینا اور ادب کو زندگی کے تہذیبی رشتے میں دیکھنا ہے' اس سلسلے میں تاریخ ادب کے بعض پہلو بھی واضح ہوجاتے ہیں اور ہم عصر ادب کے بارے میں بعض خیالات کا اظہار بھی اس طرح ہوجاتا ہے کہ سنجیدہ مطالعہ کرنے والے ان سے متاثر بھی ہوسکیں۱"

اس طرح ایک تنقید نگار کو دوران تنقید میں کن کن مسائل اور مباحث کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے بتایا ہے کہ "تنقید میں خود تنقید کے اصول و نظریات کا مطالعہ بھی شامل ہے اور ادبی تصانیف کا مطالعہ بھی اصول و نظریات میں ادب اور زندگی کا رشتہ' حقیقت اور تخیل' افادیت اور پروپیگنڈا' مواد اور ہیئت کا تعلق' حسن کا مفہوم' تنقید نگار کا نقطۂ نظر' ادیب اور عوام' شعر و ادب میں زبان کی جگہ' اسلوب' فنی اصول اور روایات فن چند اہم مباحث ہیں جن کے ضمن میں اور بہت سے معاشی' سماجی اور نفسیاتی پہلو آئیں گے' اگر نقاد ان مسائل پر واضح رائے نہیں رکھتا اور اپنی رایوں کو کسی مخصوص نقطۂ نظر سے متفقانہ طور پر ہم آہنگ نہیں کر سکتا تو اسے عملی تنقید کے میدان میں قدم رکھنے کا حق حاصل نہیں ہے۲"

یہی وجہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین اور موضوعات میں بے انتہا تنوع اور وسعت ہے انھوں نے شاعروں پر لکھا ادیبوں پر لکھا' ناول' افسانہ' ڈرامہ پر لکھا' تنقید' اصول تنقید اور اس کے نظریات و اقدار پر لکھا' غزل' نظم' قصیدہ' مرثیہ پر لکھا' زبان' تہذیب اور رسم خط پر لکھا' فرقہ پرستی اور حب الوطنی پر لکھا' طنز و مزاح' نفسیاتی و رومانی عناصر پر لکھا' شخصیات و تاثرات پر لکھا' شاعروں اور ادبی محفلوں پر لکھا' مصوری اور ستاروں پر لکھا' غرض کہ ہر موضوع اور ادب کے

---

۱ اعتبار نظر ص ۷　　۲ تنقید اور عملی تنقید ص ۲۸

ہر مسئلہ پر لکھا اور جو بھی لکھا نہایت دیانت داری کے ساتھ لکھا مبالغہ، انتہا پسندی اور تعصب سے گریز کیا۔

احتشام صاحب کے ان تنقیدی مضامین کی نمایاں بات یہ ہے کہ وہ زیادہ تر موجودہ ادب کے مقابلے میں گزشتہ ادب سے متعلق ہوتے ہیں اس کی وجہ خود انھوں نے اس طرح بیان کی ہے" مجھے ہم عصروں پر لکھنے میں اکثر جھجک محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے۔ یہ میری فطری کمزوری ہو مجھے آبگینوں کو ٹھیس لگانے میں لطف نہیں آتا جہاں تک ہوسکتا ہے اس سے بچتا ہوں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے کسی کا دل دکھے کوشش کرتا ہوں کہ ہم عصروں کی تخلیقات کے زیادہ سے زیادہ اچھے پہلوؤں کا ذکر کروں انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتا ہوں اور کمزوریوں پر ہمدردانہ نگاہ ڈالتا ہوں اگر کبھی ایسی باتوں کا ذکر کرنا ہی پڑتا ہے جو مجھے درست نہیں معلوم ہوتیں تو ان کا اظہار بھی دل آزاری کے انداز میں نہیں کرتا۔"[1]

(۶)

احتشام صاحب نے بمبئی کی ایک ادبی نشست میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ" مجھے زبان اور اس کے مسائل سے ہمیشہ ہی دلچسپی رہی، لیکن اس سلسلہ میں میرا مطالعہ زیادہ تر تاریخی لسانیات سے متعلق ہے اور آج لسانیات کا لفظ علم اللسان کے جس سائنٹیفک پہلو کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اس سے میری واقفیت بس واجبی سی ہے"

یہ صحیح ہے کہ لسانیات کا لفظ آج جن معنوں میں جس عصری علم کے لئے بولا جاتا ہے اس سے وہ واقف نہیں تھے لیکن اس سے یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ انھوں نے لسانی مسائل سے سرے سے دلچسپی ہی نہیں لی بلکہ سچ یہ ہے کہ زبان کا ارتقا، اس کی سماجی اہمیت اور اس کے بنیادی مسائل سے نہ صرف انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی بلکہ ان پر وہ پابندی کے ساتھ اظہار خیال بھی کرتے رہتے تھے اس سلسلہ میں ان کے حسب ذیل مضامین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو کا لسانیاتی مطالعہ	ادب اور سماج
قطب مشتری کی لسانی خصوصیات	ذوق ادب اور شعور
زبان اور رسم الخط	" " "
صحت زبان کے لسانیاتی پہلو	افکار و مسائل
زبان اور تہذیب	" " "

ان مضامین میں انھوں نے علم اللسان کی اہمیت کا کھل کر اعتراف کیا ہے، چنانچہ وہ" اردو کا لسانیاتی مطالعہ کیا

۱۔ احتشام نمبر ص ۹

فرماتے ہیں. بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ...... "آم کھانا چاہئے گٹھلیاں گننے سے کیا فائدہ" ہم زبان بولتے اور استعمال کرتے ہیں ہمیں یہ جاننے کی ضرورت کیا ہے کہ زبان کی ماہیت کیا ہے اس کے ارتقا اور تغیرات کے محرکات کیا ہیں، اس کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں لیکن یہ خیال علمی حیثیت سے صحیح نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کی بقا اور ترقی کے اصول کا علم حاصل کئے بغیر ہم اس چیز کا تحفظ بدلے ہوئے حالات میں نہیں کرسکتے" علم اللسان کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زبان سماج کی ضرورت کے ماتحت پیدا ہوتی اور نطق و گویائی کی جو طاقت انسان میں پائی جاتی ہے وہ جانوروں کی قوت گویائی سے کس طرح مختلف ہے، اس نے ابتدائی انسانوں کو کس طرح اپنا تہذیبی سرمایہ اکٹھا کرنے اور اس کو ورثہ کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا راز بتایا"۔

شاید علم اللسان کی اسی اہمیت کا احساس تھا جس نے انھیں جان بیمز کے مشہور رسالہ "این آوٹ لائن آف انڈین فیلالوجی" (AN OUTLINE OF INDIAN PHILOLOGY) کے ترجمہ پر آمادہ کیا یہ ترجمہ "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کے نام سے ۱۹۶۳ء میں تیسری بار دانش محل لکھنؤ سے شائع ہوا ہے اس کے مقدمہ میں بڑی تفصیل اور خوش اسلوبی کے ساتھ انھوں نے لسانیات کی اہمیت، ہندوستانی لسانیات کے مسائل، ہند آریائی زبانیں، اردو کا ارتقا اور قومی زبان کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے، جان بیمز کی کتاب سے زیادہ یہ مقدمہ سائنٹفک اور اہم ہے، یہ نہ صرف یہ کہ جدید لسانیات کی اہمیت اور اس کے بنیادی عناصر کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے بلکہ موجودہ ہندوستانی لسانیات اور اس کے مسائل کے بارے میں بھی ہمیں اعتدال کی راہ دکھاتا ہے۔

(۷)

ترجمہ نگاری بھی ایک مستقل فن ہے جو ہر ادیب اور شاعر کے بس کی بات نہیں، اس میں نہ صرف مترجم کو متن کی زبان سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے بلکہ اس زبان پر بھی اس کو کامل عبور ہونا چاہئے جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے اور پھر اگر متن افسانوی و شعری صنف ادب سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ [illegible] اور [illegible] ہو تو ترجمہ نگاری کی دشواریاں اور بڑھ جاتی ہیں، ان ساری [illegible] کا [illegible] کسی کتاب کا [illegible] اس کی [illegible] باقی رکھے اور زبان ترجمہ کی خوبیوں اور باریکیوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دے یہ ترجمہ نگار کے بس کا روگ نہیں یہ فن بظاہر آسان دکھائی دینے کے باوجود طبعزاد تخلیق سے زیادہ مشکل ہے [illegible] اس میدان میں بے دھڑک قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرتے [illegible] ترجمہ نگار چند ہی گنے جاسکتے ہیں۔

[illegible] ادب اور سماج ص ۴۷ – ۴۸

احتشام صاحب نے ترجمہ نگاری کو پیشہ تو نہیں بنایا البتہ انھوں نے جہاں ادب کے اور میدانوں میں قدم رکھا ہے۔ وہاں اس کو بھی نہیں چھوڑا ہے چنانچہ جان بیمز کی کتاب کا ترجمہ "اردو لسانیات کا خاکہ" رادھا کرشنن کی کتاب "کلکی" کا ترجمہ اور جان بیٹر سن کے ناول کا ترجمہ "ہماری سڑک" یہ سب ان کی اسی خداداد صلاحیت کے ترجمان ہیں ان سب میں ترجمانی کا فرض اس خوبصورتی سے انھوں نے ادا کیا ہے کہ اگر کتاب کے سرورق پر یہ لکھا نہ ہو کہ یہ ترجمہ ہے تو قاری اس کو ان کی طبع زاد تصنیف سمجھے الفاظ کا انتخاب ترکیبوں کی چستی اور زبان کی روانی غرض کہ اس کے ہر نقش پر اصل کی چھاپ موجود ہے۔

یہاں مزید تفصیل میں جانے کا موقع نہیں لیکن ان کی اس فنی صلاحیت کا اندازہ کرنے کے لئے بطور نمونہ ایک ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو انھوں نے دوران سفر امریکہ میں فرانس کے مشہور ترقی پسند شاعر پال ایلوا کے انتقال کی خبر سے متاثر ہو کر اسی کی ایک نظم کا فی البدیہہ کیا تھا۔

"میں سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔
مجھ میں سبھی سے محبت کرنے کی اہلیت تھی مگر وہ ناکافی تھی۔
آسمان سمندر اور زمین نے مجھے نگل لیا تھا۔
انسان نے دوبارہ جنم دیا۔
یہاں وہ محو خواب ہے جو اس میں شک کئے بغیر زندہ رہا۔
کہ صبح ہر عہد کے لئے اچھی چیز ہے۔
اسے موت آئی تو اسی کے دل میں دوبارہ زندہ ہونے کی خواہش تھی۔
جیسے سورج پھر طلوع ہو جاتا ہے۔
میں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے اس طرح جیا گویا تھکا ہوا ہوں۔
لیکن میری ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اپنے کندھے کا بار ہلکا کروں۔
اور اپنے غریب سے غریب بھائی کا بوجھ بٹا دوں۔
جسے اپنے اوپر لادے ہوئے وہ قبر تک چلا جاتا ہے۔
اس امید کی محبت میں میں نے اپنا نام تاریکی کے مخالفوں میں لکھا لیا ہے۔
ٹھہر جاؤ اور ہرے بھرے جنگلوں کو یاد کرو۔
چمکتی ہوئی دھوپ میں کھڑی لہلہاتی ہوئی کھیتوں کو یاد کرو۔
ان مناظر کو یاد کرو جن پر سایہ کی تاریکی اور غم کا بوجھ نہ تھا۔

میری زندگی مٹی تو اس جگہ تمہاری زندگی آگئی۔
موسموں کی آمد و رفت اور زندہ رہنے میں ہمارا سلسلہ جاری ہے۔
ہم زندہ رہنے اور پائدار بنجانے کی تکمیل کرتے ہیں۔[۱]

(۸)

احتشام صاحب نے ترجمہ نگاری کی طرح انتخاب، تلخیص اور ترتیب کی طرف بھی وقتاً فوقتاً توجہ دی ہے چنانچہ حسبِ ذیل کتابیں ان کی انہی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔

۱۔ اردو کی کہانی ۱۹۵۶ء
۲۔ انتخاب جدید نثر اردو ۱۹۶۳ء
۳۔ تنقیدی نظریات ۱۹۶۴ء

اُردو کی کہانی انھوں نے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی کے مشہور عالم اور ادیب "ڈاکٹر رچرڈس کی گفتگو سے متاثر ہوکر آسان اردو میں لکھی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بچے اور اَن پڑھ بالغ کم سے کم وقت میں اپنی زبان کی سلسل تاریخ سے واقف ہوجائیں۔

تنقیدی نظریات :- اردو میں تنقیدی اصول، تصورات اور نظریات کے متعلق مفصل کتابوں کی بڑی کمی ہے یہ کتاب اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دی گئی ہے، اس میں اُردو کے تقریباً پندرہ مانے ہوئے نقادوں کے مضامین ہیں جو تنقید کے متعلق مختلف مکاتیب فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔

احتشام صاحب نے اُردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انگریزی میں اُردو زبان وغیرہ پر ان کے چیدہ چیدہ مضامین ہیں اور ہندی میں اردو ادب کی تاریخ پر دو مستقل کتابیں۔

(۱) اُردو ساہتیہ کا اتہاس (۲) اُردو ساہتیہ کا اُرجنا تمک اتہاس ۱۹۶۹ء

اُردو ساہتیہ کا اُرجنا تمک اتہاس میں خود احتشام صاحب نے لکھاہے کہ میری یہ موجودہ کتاب میری پہلی کتاب "اُردو ساہتیہ کا اتہاس" پر مبنی ہے جو کئی برس پہلے شائع ہوئی تھی جس کا روسی ترجمہ بھی ہوچکا ہے۔ لیکن اپنی بدلی ہوئی صورت میں یہ کتاب بھی نئی کتاب بن گئی ہے۔

علاوہ ازیں انھوں نے بتایا ہے کہ اردو ادب کی اب تک جو تاریخیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ کمی ہے کہ ان کے لکھنے والوں نے ادب اور سماج کے باہمی تعلق کو اپنی نظر میں نہیں رکھا محض لسانی اسالیب اور اس کے اختلافات کو

---

[۱] ساحل و سمندر ص ۲۳۸

اہمیت دی ہے۔ یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔

(۹)

اوپر ہم نے احتشام صاحب کو ایک شاعر کی حیثیت سے، افسانہ نگار کی حیثیت سے، نقاد کی حیثیت سے، ماہر علم اللسان کی حیثیت سے، مترجم کی حیثیت سے اور ادبی مورخ و مرتب کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تفصیلات کو پڑھ کر ان کے ادب اور ان کے فکر و فن کا تو اندازہ ہوتا ہے لیکن ان کی اصلی شخصیت کے واضح خط و خال اور ان کے ذہنی سفر کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آتا۔ اس مقصد کے لیے ہمیں خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل چیزوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

۱۔ دیباچے:۔ احتشام صاحب نے اپنے ہر مجموعے اور ہر تحقیق کو ایک اہم دیباچہ سے شروع کیا ہے۔ ان دیباچوں میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت ہی نہیں کی بلکہ تخلیقی و تنقیدی ادب کے تعلق پر بھی نگاہ ڈالی ہے۔

۲۔ سنین:۔ ہر افسانے، ہر مضمون اور ہر تقریر کے آخر میں انھوں نے سنہ بھی پابندی سے دیا ہے۔ ان سے بڑی آسانی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ کس سنہ میں کس موضوع پر ان کے خیالات کیا تھے اور کب کن حالات میں وہ بدلے۔

۳۔ شخصی تاثرات:۔ ان کے حسب ذیل مضامین بجائے تنقید کے شخصی تاثر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(الف) نیاز فتح پوری: چند تاثرات — اعتبار نظر
(ب) ڈاکٹر اعجاز حسین: ایک تاثر — افکار و مسائل
(ج) مرزا محمد عسکری مرحوم — [illegible]
(د) جگر مراد آبادی: شخصیت کے چند نقوش — ذوق ادب اور شعور

ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہنی تربیت میں خصوصیت کے ساتھ کن لوگوں نے حصہ لیا۔

۴۔ ساحل اور سمندر:۔ یہ ان کے سفر امریکہ کی داستان ہی نہیں بلکہ ان کی پوری شخصیت کا عکس ہے۔

ان ساری تحریروں کا ایک خاص ترتیب سے مطالعہ کرنے پر احتشام صاحب کی شخصیت اور ان کے ذہنی ارتقاء کی جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے۔

انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ سماجی اور اقتصادی طور پر پست نہ تھا۔ بڑی تکالیف اور مشکل سے اپنی تعلیم پوری کی اور جب یونیورسٹی کی ملازمت مل گئی تو وہ اسی کے ہو کے رہ گئے۔ انھیں بھول کے بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ مزید تحصیل علم کے لیے باہر جا سکیں گے لیکن ان کے چاہنے والوں نے ان کے دورۂ امریکہ و یورپ کا موقع فراہم کیا۔

جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو سماجی، سیاسی، معاشی، ادبی غرض کہ ہر شعبۂ زندگی انقلاب پذیر تھا۔ پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی قدریں ان کی جگہ لے رہی تھیں۔ وہ ان انقلابی تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے بھی پرانے بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی اور ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا لیکن ترقی پسندوں کی طرح ان میں تشدد، انتہا پسندی اور مذہب بیزاری نہ تھی۔ انھوں نے اس کی صرف اچھی قدروں کو اپنایا۔ شخصی طور پر وہ نیاز، ڈاکٹر اعجاز حسین، مرزا محمد عسکری وغیرہ سے زیادہ متاثر تھے۔ مگر ان کے ذہن کو بنانے میں

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

محمد ایوب واقف

"لیلائے اُردو کا عاشقِ صادق"

احتشام حسین صاحب کا مستقل قیام الہ آباد میں رہا کرتا تھا۔ میں ۱۹۶۵ء میں اعظم گڈھ سے بمبئی آگیا۔ ۱۹۶۵ء سے قبل جب اعظم گڈھ میں تھا تو ان سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں ہوتیں۔ کبھی الہ آباد میں، کبھی لکھنؤ میں اور کبھی ہمارے آبائی وطن قصبہ ماہل میں۔ یہ شاید ۱۹۶۶ء کی ہی بات ہے کہ میں موسم گرما کی تعطیلات میں اپنے وطن پورہ نورم بیگ (جو ماہل سے دو میل مشرق میں پڑتا ہے) گیا ہوا تھا۔ وطن جانے سے قبل میں نے احتشام صاحب کو الہ آباد لکھا کہ میں اس سال چھٹیوں میں گھر آرہا ہوں۔ آپ سے کب کب اور کہاں کہاں ملاقاتیں ہوں گی تفصیل سے لکھیے۔ میں ابھی بمبئی ہی میں تھا کہ ان کا ایک تفصیلی خط وصول ہوا۔ خط کی وصولی کے دو روز بعد ہی ایک پیکٹ ملا۔ اور بھیجنے والے کا نام پروفیسر احتشام حسین درج تھا۔ اُنھوں نے ساحل اور سمندر کا ایک نسخہ اپنی دستخط کے ساتھ ارسال فرمایا تھا اور کتاب میں ایک چٹھی۔

"تم اس کتاب کے متعلق جو رائے رکھتے ہو میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں صداقت کہاں تک ہے۔ لیکن تمہارے خلوص اور سعادت مندی کی میں قدر کرتا ہوں ساحل اور سمندر کا ایک نسخہ جو میرے پاس محفوظ تھا دستخط کے ساتھ تمہیں ارسال کر رہا ہوں دوبارہ پڑھو شاید اس میں کوئی خامی نظر آجائے۔ تم گرمی کی چھٹیوں میں آرہے ہو یہ ایک اچھی بات ہوگی آجاؤ فیصلہ بھی کرلیں گے کہ ہم کہاں کہاں ملیں گے۔"

میں وطن پہنچا۔ گرمی میں پورے ماہل کا علاقہ نہ صرف کربلا کی دھوپ سے تپ اٹھتا ہے بلکہ لو کی شدت سے زندگی دوبھر بن جاتی ہے۔ اسی لئے جہاں جانا ہوتا یا تو دس بجے صبح تک پہنچ جاتا یا پھر شام میں پانچ بجے گھر سے باہر قدم رکھتا۔

ایک بار احتشام صاحب سے ملنے کی غرض سے ان کے وہاں (قصبہ ماہل) پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ الہ آباد رک گئے ہیں۔ دو چار روز کے بعد میں خود ہی الہ آباد کے لئے پابہ رکاب ہوا۔ وہاں پہنچا تو ان سے ملاقات ہوئی ملاقات کے بعد جب اعظم گڈھ جانے کو تیار ہوا تو انھوں نے کہا کہ آج کا دن بیکار تھا تمہیں الہ آباد میں ہی رکنا ہوگا۔ شام میں کچھ اور لوگ رہیں گے ادھر ادھر کی باتیں ہوں گی۔ تم گھبراؤ نہیں صبح سویرے میں تمھیں اعظم گڈھ کی بس پر بٹھا دوں گا۔ یہ احتشام صاحب کا حکم تھا۔ مجھ میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ اس سے اختلاف کرتا اور پھر ان کے خلوص اور ان کی وضعداری میں اتنی کشش ہوتی کہ انھیں چھوڑنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ میں رک گیا۔

ہم سب لوگ تقریباً ساڑھے آٹھ بجے دسترخوان پر بیٹھے کھانے۔ سب سے پہلے احتشام صاحب نے سب سے میرا تعارف کرایا۔ تعارف سے پہلے میں کسی سے واقف نہیں تھا لیکن جب تعارف ہوا تو بعض لوگ جانے پہچانے نکلے اور بعض لوگ تو ایسے بھی ملے جن سے میری خط و کتابت رہی تھی لیکن شکل و صورت سے ہم لوگ ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ واقعتاً وہ بڑی بے تکلف دعوت تھی۔ زندگی میں پہلی بار میں اپنے بزرگوں کے سامنے اتنا بے تکلف ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد تقریباً بارہ ساڑھے بارہ بجے تک ہم سب باتیں کرتے رہے۔ کبھی خاص ادبی موضوعات پر کبھی سیاسی اور سماجی مسئلے پر اور کبھی اردو کے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں بات دوسرے لوگ کرتے۔ احتشام حسین صاحب ہر بات کو غور سے سنتے جہاں انھیں کسی کی بات سے اختلاف ہوتا بول پڑتے اور ایسی جچی تلی رائے دیتے کہ سب متفقہ طور پر اسے تسلیم کر لیتے۔ صبح ہوئی احتشام صاحب نے مجھے جگا کر ایک پیالی چائے اور کچھ بسکٹ کا ہلکا سا ناشتہ کرایا اور اعظم گڈھ کے لئے رخصت کر دیا۔ میں جب تک یو۔پی کے کسی مقام پر رہتا کوئی نہ کوئی صورت نکال کر ان کی خدمت میں حاضری دیا کرتا اور جب یو۔پی کے باہر ہوتا تو خط و کتابت کے ذریعہ ان سے ہمکلام ہوتا۔ کبھی مشکل آن پڑتی تو بس ان ہی کو خط لکھتا ان کے مفید اور کارآمد مشوروں سے گاڑی دلدل سے بخوبی باہر نکل آتی۔ یہ غالباً ۱۹۶۵ء ہی کی بات ہے۔ میں ایک زندہ شاعر کی شاعری اور شخصیت پر مختلف مکتب فکر کے ارباب ذوق کے مقالات کا مجموعہ ترتیب دے رہا تھا۔ اس سلسلے میں علی گڈھ گیا جہاں آل احمد سرور، خورشید الاسلام، خلیل الرحمن اعظمی اور معین احسن جذبی صاحبان سے ملکر ان سے قلمی اعانت کی درخواست کی کچھ حضرات نے تو مضمون دینے کا وعدہ کیا اور کچھ لوگوں نے مصلحتاً یا پھر عدیم الفرصتی کے باعث معذرت کر دی۔ سب سے پہلے اپنے کام کے سلسلے میں ان کو بھی صاف صاف لکھا اس کا جواب انھوں نے فوراً لکھا اس یادگار خط کی چند سطور حسب ذیل ہیں۔

عزیزی السلام علیکم!

"تمہارا خط ملا تم اس کام کو جلد از جلد مکمل کر لو۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کتاب پر مقدمہ تم خود ہی لکھو۔ تم نے اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ اصولی طور پر تمھیں مقدمہ بھی قلمبند کرنا چاہئیے۔ یہ کام میرے ذمہ نہ کرو تو بہتر ہوگا۔ البتہ کچھ سے اس موضوع پر مضمون لکھوا سکتے ہو اور اس کے لئے میں حاضر ہوں ...."

ابھی دو ماہ قبل ان کا ایک خط ملا تھا جس میں انھوں نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آج کل میں کن کن موضوعات پر لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں انھیں تفصیلی خط لکھ ہی رہا تھا کہ ریڈیو نے یہ خبر دی کہ پروفیسر احتشام حسین کا حرکت قلب بند ہو جانے سے اچانک انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؕ دل سہم گیا، دو چار منٹ تک تو بالکل سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ابھی کل ہی ڈاکٹر عبدالستار دلوی ملے تھے انھوں نے نینی تال میں احتشام صاحب سے

اپنی ملاقات کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ وہ بالکل تندرست ہیں اور آج یہ منحوس خبر کیسے پھیل گئی۔ لیکن قدرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ اس سانحۂ عظیم پر یقین کرنا ہی پڑا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے احتشام صاحب میرے سامنے کھڑے ہیں۔ عقل و دانش سے تمتاتی ہوئی چوڑی پیشانی، خوبصورت اور روشن آنکھیں، متبسم چہرہ، سینہ چوڑا چکلا، دہانہ کشادہ، داڑھی صاف اور ٹھہری ہوئی بھرپور شخصیت کے مالک احتشام صاحب! میں ان سے ان کی خیریت پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ذہن میں انکی غیر موجودگی کا احساس جاگزیں ہوگیا بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے میرے سامنے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی موتیں واقع ہوئیں۔ مگر احتشام صاحب کی موت نہ جانے کیوں مجھے حد سے زیادہ کھل گئی اس وقت اقبال کا یہ شعر میرے ذہن میں گونج گیا ؎

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

لوگ کہتے ہیں کہ احتشام صاحب کی موت ایک عظیم ادبی المیہ ہے یہ بھی درست ہے لیکن میں تو اپنے محسن و ہمدرد کے اٹھ جانے سے آہوں اور آنسوؤں میں ڈوب کر رہ گیا ہوں سمجھ میں نہیں آتا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور کہاں پر ختم کروں بہر حال میں اتنا جانتا ہوں کہ اس دور میں جب کہ ہر کس و ناکس مصلحت پسندی کا شکار ہوگیا ہے۔ ان کے جیسا وسیع قلب، وسیع ذہن، سنجیدہ، حسین، ملنسار، مخلص دماغ اور خوش نفس انسان ہم سب کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھا وہ کسی ایک صفت کے انسان نہ تھے ان کی زندگی گوناگوں خوبیوں کا مرقع تھی۔ وہ کسی سے دوستی کرتے تو بصد شوق اس کے ناز بھی اٹھاتے اور ان کو یہ فکر ہر وقت رہتی کہ کہیں ان کا دوست ان سے خفا نہ ہو جائے۔ وہ صحیح معنوں میں ایک مرد قلندر تھے۔ انکی طبیعت میں حد درجہ توکل، تحمل، وضعداری، بردباری اور قناعت تھی۔ اردو تنقید نگاری میں شخصیت پرستی اس کے ہر دور پر حاوی رہی ہے چاہے وہ "مخزن نکات" کا عہد ہو یا ذکر غالب اور آب حیات" کا سب میں ہیرو ورشپ کا جذبہ کارفرما ہے۔ لیکن احتشام صاحب نے اس غیر مستحسن رسم تنقید سے اپنے قلم کو ہمیشہ آزاد رکھا۔ وہ شخصیت سے نہیں قلمکار کی تحریر سے متاثر ہو کر لکھتے تھے۔ انھوں نے ادب کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی مگر ان کے قلم سے کسی مقام پر لغزش نہیں ہوئی۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے وہ اردو کے پہلے ادیب ہیں جن کے خیالات داستان سے اختلاف کی گنجائش کم ہی نکلی ہے۔ وہ تا دم زیست مصلحت اور خوف سے بالاتر ہو کر ایک قلندرانہ شان و عظمت کے ساتھ حق بات کہتے رہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حق گوئی اور بے باکی کو انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا شعار بنایا اور پھر اسے مزاج زمانہ کے علی الرغم آگے بڑھایا۔ ایک بار میں نے یوں ہی ان سے سوال کیا کہ "ادب سے آپ کی مراد کیا ہے؟ تو انھوں نے برجستہ جواب دیا" حق گوئی اور اعلائے کلمۃ الحق" در اصل یہی وہ خوبی تھی جسے مرحوم احتشام صاحب نے حرز جان بنایا تھا:-

" آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے "

نئے اذہان کی تعمیر میں احتشام صاحب نے جو ٹھوس کام کیا اس کی مثال اس پوری صدی میں شاید ہی ملے میرے استاد محترم سید نجیب اشرف ندوی مرحوم و مغفور اکثر کہا کرتے تھے" ایسے احتشام حسین دو چار اور پیدا ہو جائیں تو ہندوستان

اردو ادیبوں سے بھر جائیگا" ندوی صاحب مرحوم کا یہ بیان غلط نہیں حقیقت ہے انھوں نے اپنی زندگی میں بہتوں کو باذوق بنایا ان کے بہت سے شاگرد تو آج ادیب و نقاد کی حیثیت سے صفِ اوّل کے ادباء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ احتشام صاحب کے حلقۂ احباب میں نئے اور پرانے ادیبوں کا جم غفیر تھا۔ اصولی طور پر ان دو گروہوں میں ادبی چشمک یا تصادم ہو سکتا تھا اور خود احتشام صاحب کسی خاص گروہ کی طرف جھک سکتے تھے لیکن انھوں نے وہ راہ اختیار کی۔ جو دونوں کے درمیان میل ملاپ اور باہمی تعلقات کی استواری میں ممد ثابت ہوتی۔ ان کے پاس ایک مضطرب دل تھا جو سب کے لئے یکساں طور پر دھڑکتا تھا کچھ ان ہی وجوہ کی بناء پر وہ اپنے حلقۂ احباب میں بے پناہ عزت کے مالک تھے۔ ہر شخص انھیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ انکی ذات کی طرح انکی دوستی بھی عظیم تھی انھیں جس نے دیکھا وہ دل و دماغ کے اجلے ملے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کو اپنے کردار کی چمک اور افکار کی روشنی سے منور کرتے رہے۔

نوجوان نسل جتنا احتشام صاحب سے قریب تھی اتنا شاید ہی کسی ادیب سے رہی ہو۔ اس کی وجہ میرے خیال سے یہ تھی کہ نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک بار میں نے اردو کے کچھ نام نہاد ٹھیکیداروں کے دل شکن رویوں سے تنگ آکر انھیں لکھا کہ حضور میں لکھنا بند کردوں گا مجھ سے لوگوں کے مظالم سہے نہیں جاتے۔ احتشام صاحب نے اس کے جواب میں لکھا:۔

" ..... لکھنا اور پڑھنا اپنا مشن بنا لیجئے لوگوں کی غیر متوازن تنقید اور بے تکی آراء پر کان ہی کیوں دھرتے ہیں۔ پھر آپ کچھ مستثنیٰ تو نہیں ایسے سخت حالات سے بہتوں کو —— گذرنا پڑا ہے لیکن میری دانست میں ان میں سے شاید ہی کسی نے لکھنا بند کیا ہو۔ یہ جان لیجئے بزدلی کفر ہے اور حوصلہ مندی مستحسن چیز۔ اب فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ کسکو اپنائیں گے اور کسے ترک کریں گے . . . "

ہمدردی اور رواداری میں ڈوبے ہوئے یہ الفاظ آج بھی میرے ذہن میں گونج رہے ہیں اور شاید زندگی بھر گونجتے رہیں گے اور ناظرین کی معلومات کے لئے میں یہ بھی صاف صاف لکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی ہی تاکید کا نتیجہ ہے کہ میں برابر کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں اور جب تک دم باقی ہے لکھتا رہوں گا شاید میرے محترم بزرگ کی روح کو اس سے تشفی ملے۔ احتشام صاحب کی حوصلہ افزائی کا یہ بہتر طریقہ کچھ میری ہی ذات تک محدود نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی روح کی حرارت کو بغیر کسی امتیاز کے یکساں طور پر تقسیم کیا۔ انھوں نے اپنی فکر کا گداز، اپنے کردار کی روشنی اور محبت و خلوص کا خزانہ دل بھر کے لٹایا۔ بغض و عداوت اور اپنے اور پرائے کی تمیز تو ان کی فطرت میں تھی ہی نہیں۔ قید و بند کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ خود آزادی کے مسلک پر عمل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے رہتے۔ ظ انصاری نے اپنی تعزیتی تقریر میں یہ بڑی اچھی بات کہی کہ "انھوں نے اپنے قلم کو عمر بھر آزاد رکھا۔ اسی وجہ سے بہترین چیزیں ان سے ملیں"۔

اس عہد میں ہمارے معاشرے میں شرافت اور عزت کے بہت سے مضحکہ خیز اصول رائج کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جس کے پاس ڈھیر سی دولت ہو، یا بیرونی گاڑی اور کارخانے کا مالک ہو یا سیاسی اقتدار کا مالک ہو کوٹھی اور بنگلے میں رہتا ہو وہی بڑا شخص ہے اور شرافت اسی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ہمارے احتشام صاحب بحمد اللہ شرافت کے اس معیار سے پست تھے نہ وہ کسی کارخانے کے مالک ہی تھے اور نہ ہی کسی سیاسی اقتدار پر حاوی، نہ حویلیوں کی عشرت انھیں نصیب تھی اور نہ ہی کسی بنگلے کا حسن و وقار، وہ ہمارے جیسے لاکھوں سیدھے سادے انسانوں کی طرح جی کر اللہ کو پیارے ہوئے اور اب ان کی غیر موجودگی میں ہم بلا تکلف یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ غریب ہو گیا ہے ہمارے دکھوں ہماری آہوں کو سننے والا نہیں رہا لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھنے والا کہیں کھو گیا ہے ہمارا یہی احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ ہم نے احتشام صاحب کو عظیم اور بڑا انسان سمجھا اور معاشرے کے جھوٹے معیار پر اترنے والے بڑے انسان کے مقابلے میں وہ بدرجہا باوقار تھے۔

احتشام صاحب ہمہ گیر ادبی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ وہ ہندوستان کے ایسے اولو العزم دانشور تھے جن کی عدم موجودگی پر قافلۂ علم و ادب مدتوں روتا رہے گا۔ انھوں نے ہماری ثقافت اور طرزِ زندگی کی بہتر طور پر نمائندگی کی۔ ان کے بعد اب تنقید نگاری کا تصور ہی ادھورا ہو کر رہ گیا ہے وہ بظاہر ایک فرد تھے لیکن ان کی جامع کمالات شخصیت کسی ادارہ سے کم نہ تھی۔ انھوں نے اپنی گرانقدر تحریروں کے ذریعہ سلجھی ہوئی انشا پردازی، عالی ظرفی، متوازی تنقید نگاری کی داغ بیل ڈالی اور اسے فروغ دیا۔ ان کے قلم کے کھلائے ہوئے حسین و جمیل اور رنگ برنگ کے پھول رہتی دنیا تک مشام جاں کو تر و تازہ و معطر رکھیں گے بقول

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

ہمارے ادب میں لکھنے والوں کے بہت سے مکتبِ فکر قائم ہوئے ہیں ایک مکتبِ فکر کے صدر نشین مرحوم ابوالکلام آزاد تھے۔ دوسرے مکتبِ فکر کے نمائندے علامہ نیاز فتح پوری ایک مکتب اور ہے جس کے حامی مولانا شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی مرحوم تھے۔ ان دو بزرگوں نے ادب میں علمی وقار کو سادگی اور صفائی کے سانچے میں ڈھال کر اردو ادب دوستوں کے سامنے پیش کیا احتشام صاحب اس آخر الذکر مکتبِ فکر کے زبردست نمائندے تھے۔ ادب میں انھوں نے شبلی اور حالی کے طرزِ نگارش کو اپنایا اور اس میں اپنے خونِ جگر کے افسانے سے رنگ بھرا۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔ آپ کی دوسری زبردست اور نمایاں خوبی انکا "سماجی نصب العین" تھا جسے انھوں نے کارل مارکس کے توسط سے اپنایا تھا۔ اپنے سماجی نصب العین کو واضح کرنے کی غرض سے ہی انھوں نے آخری زمانہ تک ادب کی ترقی پسند تحریک سے اپنا ناطہ جوڑے رکھا مگر افسوس کا مقام ہے کہ کچھ خود غرض اور مصلحت پسند ادیبوں نے اس تحریک کے گلے پر بے دردی سے چھری پھیر دی اور مزید یہ کہ ایسے ہی لوگوں نے خود کو تحریک کا اہم ستون بھی سمجھا۔

احتشام صاحب گہرے غور و خوض کے مالک تھے۔ اسی چیز نے انھیں ایک روح پرور ادیب بنا دیا تھا۔ وہ اپنی

بلند تر اور منفرد تخلیقی اور تنقیدی فکر کی میزان لئے قدیم و جدید ادب کے سنگم پر ایک عظیم نقاد کی طرح کھڑے تھے۔ انھوں نے اردو کے شیدائیوں کے لئے ایک معیار چھوڑا ہے جس میں اعتدال و توازن ہے۔ اُن کی یاد منانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کی محبوب زبان کو دل و جان سے اپنالیں۔ جس زبان کے گیسو وہ عمر بھر سنوارتے رہے اور جس کی ترقی کے لئے عمر عزیز ختم کر دی اُس کی بقا و تحفظ اپنے لئے فرض کر لیں۔ اُن کی جملہ نگارشات کو محفوظ کر کے ان کے خیالاتِ عالیہ، اخلاقِ حسنہ اور ان کی علمی انکساری کو اپنا شعار بنا کر ہی ہم اُن کی روح کو سکون پہنچا سکتے ہیں۔ احتشام کا جسم ہم سے الگ ہوا ہے ان کے علم کی مشعل ہمارے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ؎

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۴ سے آگے)

دارالمصنفین کا کتب خانہ، حبیب گنج، براورا ان کی دوستی اور خواجگان اعظم گڈھ کو بھی نہ بھلا سکا تھا۔ ان کی ساری علمی ادبی سرگرمیوں کا مرکز لکھنؤ تھا۔ تقریباً ۳۰ سال وہاں گزارنے کے بعد وہ الہ آباد پہنچے۔ الہ آباد نے انھیں معاشی طور پر نسبتاً زیادہ خوش حالی دی، لیکن جذباتی اور ذہنی طور پر ان کو پژمردہ کر دیا۔ ان کی تحریروں میں دولفظ ظاہری کثرت سے استعمال ہوئے ہیں سفرنامہ میں "پیچش" اور تنقیدی مضامین میں "آسودگی" شاید سماجی اور معاشی پس ماندگی نے زندگی بھر انھیں پیچ و تاب میں رکھا ہو اور آسودگی ہی کی تلاش میں وہ ان ساری منزلوں سے گزرتے ہوئے چلے گئے۔

غم ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اعلان : بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو
پرنٹر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی

پتہ: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
پبلشر کا نام: سید علی اکبر
قومیت: ہندوستانی
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد
نام و پتہ مالک: ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

میں سید علی اکبر تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم کے مطابق صحیح ہیں

دستخط
سید علی اکبر

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

احتشام حسین کی سماجی تنقید نگاری

پروفیسر احتشام حسین کی تنقید نگاری سے اردو تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ان کی شخصیت تنقید کے میدان میں عہد آفریں ثابت ہوئی۔ انھوں نے اردو نثر کو ایک نئے علمی وقار سے نوازا۔ انھوں نے زندگی اور اس کے مسائل سے براہ راست ادب کا رشتہ قائم کیا انھوں نے ادب کی تصویریں سماج کے آئینہ میں خود دیکھیں اور دوسروں کے سامنے پیش کیں۔ انھوں نے تنقید کے میدان میں ایک قائد کا رول ادا کیا۔ ان کی عظمت ان کے خیالات، نظریات اور انسانی ہمدردی سے وابستہ ہے۔ وہ ادب کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

وہ ادب اور زندگی میں اشتراکیت کے علمبردار تھے مگر دوسروں کی باتیں بھی سنتے تھے تنقید میں برداشت کرنے کا ظرف رکھتے تھے مگر اپنے اصولوں سے کسی قیمت پر دست بردار ہونے پر تیار نہ تھے۔ وہ عام جدید ادیبوں کی بے راہ روی سے ناخوش تھے۔ انھوں نے ادب کی خدمت استقلال اور خلوص سے پوری عمر کی انھوں نے ان موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے جو اختلافی تھے مگر ہمیشہ وقار و علمی عظمت کو پیش نظر رکھا ہے وہ کبھی معیار سے نیچے نہیں اترے۔

احتشام صاحب نے ادب اور تنقید کو زندگی اور اس کے مسائل سے قریب تر کر دیا۔ انھوں نے اردو تنقید کو اشتراکیت کی حقیقت پسندی سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اشتراکیت کی تبلیغ ضرور کی مگر نہایت متانت اور فنی تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر۔ انھوں نے زیادہ آگے بڑھانے یا گرانے کا کام نہیں کیا۔ البتہ کہیں کہیں فطری میلان طبع کے باعث وہ بعض ادیبوں کو ان کی عظمت سے زیادہ اہمیت دے ہی گئے ہیں اسلئے کہ وہ ان کے گرویدہ تھے اگرچہ ایسی مثالیں کم ہیں۔ ان کے خلوص اور ان کی مسلسل جدوجہد سے ایک طرف ترقی پسندوں میں فن کا احساس باقی رہا اور دوسری طرف عام ادبی حلقہ میں مسائل حیات سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

احتشام صاحب کی تنقید کے ارتقا کے متعلق ڈاکٹر محمود الٰہی نے یہ تصور پیش کیا ہے کہ ان کی تنقید کے پہلے مجموعے ان کے فن و فکر کے ارتقا کا پتہ دیتے ہیں۔ ان کے یہاں "تنقیدی جائزے" سے لیکر "تنقید اور عملی تنقید" تک ان کی تنقید ترقی کے منازل طے کرتی رہی مگر بعد میں جو احتشام صاحب کے چار مجموعے شائع ہوئے ان میں فکری انحطاط محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں محمود الٰہی صاحب رقمطراز ہیں کہ: —

"تنقید اور عملی تنقید احتشام صاحب کے نظریاتی سفر کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخری منزل ہے۔ اس کے بعد ان کے یہاں کیفیت کا واضح زوال ملتا ہے۔ یہ زوال بہ تدریج آیا ہے اور ہر مجموعہ پہلے مجموعہ سے کم وزن نظر آتا ہے

اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے انحراف کر چکے ہیں۔ دراصل تنقید کے جن اصول و ضوابط کی وہ وضاحت کر رہے تھے۔ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی[1]۔

فاضل مقالہ نگار احتشام صاحب کے بارے میں ایک بنیادی غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو قدرتی طور پر جوش و خروش زیادہ ہوتا ہے۔ احتشام صاحب نے جب ترقی پسند مصنفین سے متاثر ہو کر تنقید کی راہ اپنائی تو انھوں نے اپنے مضامین سے ایک نئے پیام کو ادبی مباحث میں پوری قوت و عظمت کے ساتھ روشناس کرایا۔ جب خیالات میں اعتدال پیدا ہوا تو انھوں نے نظریات کے علاوہ عام موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب انسان کوئی پیام دیتا ہے۔ کسی نظام زندگی کی تشریح کرتا ہے کسی اصول کی طرف دعوت دیتا ہے یا اپنے نقطۂ نظر سے کچھ اونچے معیارِ حیات و کائنات کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ ایک داعی کے مقام سے گفتگو کرتا ہے۔ اس وقت اس کی بات میں زیادہ وزن و عظمت ہوتی ہے مگر جب وہی آدمی اپنے نظریات کو خود عمل میں لاتا ہے تو وہ عملی مشکلات اس کو اکثر اپنے معیار سے نیچے اُتار دیتی ہیں۔ یہی منزل ہے جس کو احتشام صاحب کے فن یا فکر کے زوال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ انحطاط نہیں ہے۔ بلکہ اُصولوں کو عملی شکل میں پیش کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ناقد اس بلندی پر نظر نہیں آتا جس پر وہ اپنے نظریاتی مضامین میں ہم کو دکھائی دیتا تھا۔

علاوہ ازیں طبیعت اور نظریہ کے اعتدال نے احتشام صاحب کو اس جانب مائل کیا کہ وہ اپنی تنقیدوں کا دائرہ وسیع کریں اور ایسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھائیں جو عام زندگی اور ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور تہذیبی انداز کے ہیں۔ جس آخری دور کے بارے میں احتشام صاحب پر زوالِ فن کا الزام لگایا جاتا ہے وہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس دور میں وہ عملی تنقید کی جانب زیادہ متوجہ ہو گئے تھے۔

کسی دانشور نے کہا ہے کہ جو شخص ۴۰ برس کی عمر سے قبل اشتراکی نہ بنے۔ اِس کے پاس دل نہیں مگر جو ۴۰ کے بعد اشتراکی باقی رہ جائے، اس کے عقل نہیں۔" میرا خیال ہے کہ احتشام صاحب نے ۴۰ کے بعد نظریاتی مباحث کے بجائے اپنی توجہ عملی تنقید پر مرکوز کی اور عام ادبی مسائل پر دلکش بحثیں کی ہیں۔ اُن کی عملی تنقیدوں میں نقطۂ نظر کی تبدیلی کہیں معلوم نہیں ہوتی وہ خوجی پر تنقید کرتے ہیں تو اپنا مخصوص اشتراکی نظریہ اپنے سامنے رکھتے ہیں گو نہایت مناسب اور ادبی انداز سے وہ تصوف پر گفتگو کرتے ہیں تو بھی نظریات کے پس منظر میں۔ آخر میں احتشام صاحب کے خیالات پختگی اور عظمت کی اعلیٰ منزل پر پہنچ گئے تھے۔

---

[1] قومی زبان، انجمن ترقی اردو، کراچی مقالہ از ڈاکٹر محمود الٰہی ص ۴۴۔

یہ وہ مقام حکمت ہے جہاں کسی قدغن کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ احتشام صاحب کا وہ زمانہ جو تنقید اور عملی تنقید کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس میں وہ اشتراکیت کے مبلغ کم اور ادب شناس زیادہ نظر آتے ہیں۔ ان کا ظرف اس دور میں وسیع سے وسیع تر ہوگیا اور ان کے اندر عملی تنقید کی قوت ابھر کر سامنے آگئی تھی۔ ان کی قوتِ برداشت اور ظرفِ تحمل تنقید کے اعلیٰ اصول تک پہونچ گیا اور انھوں نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جن پر اس سے قبل انھوں نے نہیں لکھا تھا۔ مثلاً قطب مشتری کی لسانی خصوصیات' آتش کی صوفیانہ شاعری' قدیم ایرانی تہذیب' امیر خسرو' ہندوستانی تہذیب اور مسلمان' غالب کے غیر مطبوعہ خطوط' مشاعرہ کی افادیت' داغ کا رامپور اور نیا ہندی ناٹک وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کو اپنے پہلے دور میں چھونا پسند نہ کرتے تھے مگر بعد میں انھوں نے ان موضوعات پر قلم اٹھایا۔ اب یہ شکایت کہ ان موضوعات پر احتشام اس بلندی پر نظر نہیں آتے جس معیار تک وہ نظریاتی مضامین میں پہونچ چکے تھے' اس بنا پر صحیح نہیں کہ قول اور عمل میں ہمیشہ فرق ہوتا ہے۔

اصل میں احتشام صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار ایک منظم طریقہ سے اپنی عملی تنقیدوں میں اس امر کی کوشش کی کہ وہ جو کچھ بھی لکھیں اس میں نظریاتی اصولوں کو پیش نظر رکھیں میں سمجھتا ہوں کہ اس عظمت پر کوئی دوسرا ناقد پورا نہیں اترتا۔ سماجی تنقیدوں سے بھرپور عملی تنقیدوں میں ایک طرف تو انھوں نے اپنے نظریات کو عمل سے پرکھا ہے اور دوسری طرف ہمارے گذشتہ ادب میں سماجی قدروں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے اس امر کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ ان کے مضامین طویل نہ ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے آخری دور کے مضامین تو اور بھی مختصر و جامع ہونے لگے تھے۔ احتشام صاحب اپنی سماجی تنقیدوں میں نہ اشعار کی بھرمار کرتے ہیں اور نہ مثالوں کی۔ وہ ایک مخصوص انداز سے کچھ اشعار' کچھ مغربی اقوال حسب ضرورت اور پھر اپنا مخصوص فکر اس فن کار یا اس مسئلہ کے بارے میں پیش کرتے ہیں جس پر قلم اٹھاتے ہیں۔

احتشام صاحب کی تنقید کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی عملی یا نظری تنقیدوں میں ایک فلسفیانہ ماحول پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے مارکس کے مادی جدلیاتی اور سیاسی فلسفہ کو بڑی ژرف نگاہی اور حسن بیانی کے ساتھ ادب میں ڈھالا ہے۔ یہی بات جب دوسرے کہتے ہیں تو کھل جاتے ہیں ان کی باتیں پروپگنڈا معلوم ہوتی ہیں۔ مگر احتشام صاحب کے قلم سے مارکسی فلسفہ کی ادب میں ترجمانی فلسفیانہ بلندی اور حکیمانہ انداز بیان کی حامل ہے جس پر فن اور ادب کی گہری چھاپ ہے۔

احتشام صاحب کی تنقیدوں نے مارکسی تنقید کو وزن اور علمی وقار بخشا اور اسکو پروپگنڈے سے بلند کر دیا۔ انھوں نے مارکسی فلسفہ کو سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ ادبی زاویہ نگاہ سے دیکھا اور اگر کہیں انھوں نے معاشی تعلق کو واضح کرنے کی کوشش کھل کر کی ہے تو پھر وہ ہی غیر ادبی کیفیت ان کے یہاں بھی نمایاں ہونے لگی ہے۔

جو اکثر اشتراکی ناقدوں کے یہاں ہے۔ کہیں کہیں ان سے بھی لغزشیں ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مندرجہ ذیل مضامین تعصب، بے جا طرفداری اور سطحی پروپیگنڈے کے حامل ہیں۔

سجاد ظہیر ادیب کی حیثیت سے، علی سردار جعفری، اقبال بہ حیثیت شاعر اور فلسفی، سحر البیان پر ایک نظر اور اختر شیرانی کی رومانیت وغیرہ۔

ایک ناقد نے ان پر تنقید کرتے وقت ان کی جانب داری اور تعصب کے نمونے بھی پیش کئے ہیں، مثلاً اردو شاعری میں غزل کے رواج کا جواز تلاش کرتے ہوئے تمام ذہنی و ثقافتی عناصر سے صرف نظر کرکے ایرانی و ہندوستانی نظامِ معیشت کا تلا بہ ملانا اسی طرح آزاد نظم اور نظم معری کی نامقبولیت کی توجیہہ میں ذاتی ملکیت اور مادی انقطاع کا سوال اٹھانا، احتشام صاحب کی یہ طبقاتی جانبداری نفسیاتی بیچارگی یا ذہنی مجبوری کی حد تک پہونچ گئی تھی۔ اصل میں ناقد ہر فن پارہ میں اپنے مادی و جدلیاتی نظریہ کی جڑیں تلاش کرتا ہے یہ اعتراض مارکسزم پر ہو سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ناقد کی عظمت اس کی نظریاتی تنقیدوں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ خصوصاً احتشام صاحب نے جس تنقید کی ترجمانی کی ہے اس میں اردو والوں کے لئے ندرت ہو سکتی ہے مگر اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ یہ مارکسی تنقید انگریزی ادب ہی نہیں بلکہ عالمی ادب میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکی تھی۔ جس وقت احتشام صاحب نے اس کی ترجمانی شروع کی مارکسی تنقید ایک معروف نظریہ تھا۔ اس میں ان کا کوئی اجتہاد نہیں۔ انھوں نے مغربی افکار اور اشتراکی نظریات کا مطالعہ کرکے ان کو اپنے انداز سے اردو کے قالب میں ڈھالا۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں مارکسی تنقید وجود میں آ چکی ہے۔ انگریزی تنقید کا مطالعہ کرنے والا طبقہ اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ جدید تنقید میں جدلیاتی نقطۂ نظر پر اس میں ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے؛ جہاں تک میں سمجھتا ہوں احتشام صاحب نے جو کچھ نظریاتی تنقید پر لکھا ہے اس میں کوئی ندرت نہیں ہے انھوں نے ایک ایسے فلسفۂ ادب کی تشریح کی ہے جو عالمی اور آفاقی بن چکا تھا اور دوسری زبانوں میں ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا۔ البتہ میں یہ ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ انھوں نے ہماری زبان میں اس فلسفہ کو خلوص، سنجیدگی اور فلسفیانہ قالب میں روشناس کرایا۔ انھوں نے ایک علمی اسلوب بھی ہم کو عطا کیا مگر اس فلسفہ اور اسلوب میں ایک ہی بات کو بار بار دہرانے کی عادت اور چند مخصوص اصطلاحات سے ڈرانے یا شوق دلانے کی کیفیت بھی موجود ہے۔

میں اس کے مقابلہ میں ان کی عملی تنقید کے متعلق مضامین کو زیادہ اہمیت کی نظر سے دیکھتا ہوں اس لئے کہ ان کے اندر احتشام صاحب کا ذاتی فکر کارفرما ہے۔ وہ فکر و کاوش سے فن کار کے اندر ادب اور سماج کے رشتے

ہماری زبان علی گڑھ اپریل ۱۹۶۷ء ص ۱۸

تلاش کرتے ہیں۔ یہاں ان کا نظریاتی مارکسی مطالعہ عملی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہاں ان کی عظمت نقلی نہیں اکتسابی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ احتشام صاحب کے تمام مضامین دو حصّوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ ایک وہ جو نظریاتی تنقید سے متعلق ہیں اور دوسرے حصّہ میں وہ مضامین شامل کئے جائیں جو عملی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر ناقدوں کا خیال ہے کہ احتشام صاحب کی عظمت ان کے نظریاتی مضامین سے ہے۔ لیکن ان کے عملی تنقید سے متعلق مضامین اسی بنا پر اہم ہیں کہ ان میں ناقد کے ذاتی اور مجتہدانہ افکار نظر آتے ہیں ان کا زاویۂ نظر دوسرے ناقدوں سے بالکل مختلف دکھائی پڑتا ہے۔

بلاشبہ ان کی نظریاتی تنقیدوں میں سماجی زندگی اور ادب کے رشتوں کو مضبوط و مستحکم کیا گیا ہے۔ مگر ان کی عملی تنقیدوں میں ان سماجی رجحانات کی نشان دہی بڑی خوبی اور کامیابی سے کی گئی ہے۔ جو ہمارے ادب میں کار فرما رہے ہیں ظاہر ہے کہ جو تاثیر اور عظمت عمل کو حاصل ہے وہ قول کو کہاں نصیب۔ ان کی ہر تنقید میں عوامی زندگی اس کا ادب سے تعلق، معاشرے کے اثرات اور ادب و زندگی کے باہم رشتوں کی توضیح، اعلیٰ قدروں کی حمایت، غریبوں، مزدوروں اور کسانوں سے ہمدردی کے جذبات نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ خیر کی قوتوں کو بڑھانا اور شر کو ختم کرنا چاہتے ہیں وہ ادب کو زندگی اور زندگی کو ادب سے ملانے کا کام پوری عمر کرتے رہے۔ ان کی زبان میں ایک قوت اور فکر میں ایک روشنی نظر آتی ہے۔ ان کی عملی تنقید ان کی نظریاتی تنقید کا منطقی نتیجہ ہے جس کی انھوں نے پہلے دور میں ترجمانی کی تھی۔

اُردو تنقید نگار اپنی تحریروں میں مغربی مصنفین کے حوالے دیتے ہیں۔ ان کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ کبھی کسی کی عبارت نقل کرتے ہیں کبھی کسی فن کار کی رائے کو پیش کرتے ہیں مگر حوالے کبھی نہیں دیتے۔ دراصل اُردو تنقید نگاری ایک تنقیدی انشائیہ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ناقد نہ حوالہ دینے کی زحمت کرتا ہے نہ ماخذ بتاتا ہے نہ کتاب کا نام لیتا ہے اور کبھی کبھی جس کی رائے پیش کرتا ہے۔ اس کا نام بھی نہیں بتاتا۔ اس لئے میرے خیال سے یہ تنقیدی مضامین جنھیں ہم آجکل نظر آتی ہے۔ دراصل تنقیدی انشائیے ہیں جو ہلکے ہوتے ہیں اور جن میں تحقیق و حوالے نہیں ہوتے۔ احتشام صاحب کی تنقید نگاری بھی اس زمرے میں آتی ہے جو اپنے کسی مقالہ کا ماخذ کبھی نہیں بتاتے کسی اقتباس کا حوالہ کبھی نہیں لکھتے۔ یہ تن آسانی اردو کے تمام ناقدوں میں عام ہے اور اب یہی رجحان قبول عام اختیار کر چکا ہے۔ جہاں تک میں نے مغربی تنقید کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے وہاں کثرت سے حوالے اور ماخذ پائے ہیں خواہ وہ کسی پر تنقید ہو یا خود تنقید کی تاریخ ہو۔ حوالہ دینے میں شاید ناقدوں پر یہ خوف طاری ہو کر کہیں سارا بھانڈا پھوٹ نہ جائے۔ لہٰذا تنقیدی مقالات سے عام تحقیق، ریسرچ اور تنقید نگاری کا بنیادی معیار ترک کر دیا گیا اور بڑے بڑے مقالے بلکہ تنقیدی کتابیں تک بلا حوالہ سامنے آنے لگی ہیں۔ صرف ان تنقیدی

کتابوں میں حوالے فروٹنا دیئے جاتے ہیں جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے لکھے جاتے ہیں اس لئے کہ بغیر حوالوں اور ماخذ کے مقالہ ممتحنین کی نظر میں بے وقعت ہو جائے گا اور ڈگری نا مل سکے گی۔ میرا تو خیال ہے کہ تنقیدی انشائیے میں بھی انگریز ناقدوں نے کہیں کہیں حوالے پیش کئے ہیں[۱]۔

پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پروفیسر کلیم الدین احمد وغیرہ جیسے اہم ناقدوں کی تنقیدوں میں بلکہ انگریزی ست کر حوالوں کا فقدان ہے۔ یہ ایک غیر علمی انداز ہے جس کو قائم نہ رہنا چاہیے۔ اس کی ابتداء مولانا حالی نے فرمائی تھی جب بنیاد کج ہو گئی تو پھر پوری عمارت کج ہوتی چلی گئی۔

رشید صاحب اپنی تنقیدوں میں فکر انگیز جملے لکھتے ہیں سرور صاحب فن کار کی مجموعی قدر و قیمت کا مطالعہ کرتے ہیں۔ کلیم الدین احمد فن کار کے جملہ عیوب کا مطالعہ مبالغہ کے ساتھ کرتے ہیں احتشام صاحب فنکار کے بارے میں اپنا مخصوص نظریہ پیش کرتے ہیں جو اکثر حقیقت پسندی کے آئینہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ ویسے احتشام صاحب کا میلان زیادہ تر نظریاتی تنقید کی جانب رہا ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے ان کے بارے میں بڑی عمدہ رائے کا اظہار کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

احتشام صاحب "ادب کی تنقید میں میرے نزدیک سماجی پہلو پر زیادہ زور دیتے تھے اور ادب کے جمالیاتی پہلو پر نسبتاً کم مگر اس کے باوجود اردو تنقید میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور ان کی تنقیدیں ہمارے ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔ جدیدیت کی رو سے وہ متاثر نہ تھے ان کا ایک خاص مزاج بن چکا تھا اور وہ اس عمر میں اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے تھے اس لئے اپنے راستہ پر گامزن رہے۔ ان کی نظر اردو کے کلاسیکل ادب پر بھی تھی مگر انہیں زیادہ شغف ہم عصر ادب سے تھا انھوں نے زیادہ تر نظریاتی تنقید لکھی ہے۔ یا تنقید لکھی ہے یا تنقید کے منصب کی اہمیت واضح کی ہے۔ عملی تنقید کے نمونے نسبتاً کم ہیں مگر جو ہیں وہ بھی قابل قدر ہیں وہ موضوع اور نظریہ زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے مگر ہیئت کے تقاضوں اور فن کے مطالبات سے بیگانہ نہ تھے۔"

وہ خواہ نظری تنقید پر قلم اٹھائیں یا عملی تنقید پر مگر ان کی دلچسپی ہر جگہ سماجی مسائل سے تھی۔

احتشام حسین نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ انھوں نے خیر و بھلائی کی قدروں کو اپنی تنقیدوں میں ابھارا ہے[۲] کہ انھوں نے ادب میں نچلے طبقے، مزدوروں اور کسانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے اور اس کو ادب کا مخاطب و وارث بنانا چاہا ہے۔ اور اسی انسانیت کی ہمدردی و بہبودی میں اپنے فن کے جوہر دکھائے ہیں اگرچہ یہ "خیر کا

۱؎ ہماری زبان، اداریہ از آل احمد سرور۔ ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۱ ۲؎ دیباچہ "تنقید اور عملی تنقید"۔

وہ تصور ہے جو اشتراکیت سے مستعار ہے۔

اسی تصور کے تحت وہ اخلاقی قدروں کو مستقل نہیں سمجھتے چنانچہ روحِ اقبال مصنفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ قدریں زندگی کے باہر کہاں ہیں؟ جب زندگی بدلتی ہے تو قدریں بھی بدلتی ہیں۔ میں نے اس موضوع پر دلی یونیورسٹی میں ایک کانفرنس کے موقع پر گفتگو کی اور ان کے سامنے یہ سوال رکھا کہ مساوی تقسیم اور مزدور و کسان کی مدد ایک اخلاقی قدر ہے کیا کبھی یہ قدر بھی بدل سکتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یہ قدر بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آج پچاس برس روس میں اشتراکیت کو قائم ہوئے ہو چکے ہیں مگر اب تک یہ قدر جوں کی توں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ بھی بدلے گی۔

اصل میں مادہ کے حرکی ہونے کے اعتقاد سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے جو عملی زندگی سے متصادم ہے یہ عالی نقطۂ نظر ہے۔ نہ مادہ کے حرکی ہونے سے کسی کو انکار ہے اور نہ ... زندگی کے تغیرات سے مگر زندگی کے چند پہلو ایسے بھی ہیں جو کبھی نہیں بدلتے اور آفرینشِ عالم سے اب تک جاری و ساری ہیں۔ بیماروں، کمزوروں اور سماج کے پست کردہ لوگوں کی مدد کرنا، دوسروں کی بھلائی کے لئے کام کرنا اور سچ بولنا اسی طرح کی اخلاقی قدریں ہیں جو ہر سماج میں معیاری تصور کی جاتی ہیں۔ اگر کوئی طبقہ اپنے ذاتی نفع کی غرض سے ان قدروں کو بدلتا ہے تو دوسرے طبقے اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح چوری، ظلم، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا اور بے حیائی وغیرہ ایسے رذائلِ اخلاق ہیں جو ہر دور اور ہر معاشرہ میں معیوب سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح غریبوں کی مدد کرنا، پریشان حال لوگوں کے کام آنا، بھلائی اور رفاہِ عام کے کام انجام دینا ہمیشہ محمود تصور کیا جاتا ہے۔ یہ خیر و شر کی ابدی قدریں ہیں اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ اشتراکیت کی اصل بنیاد اسی اخلاقی قدر پر ہے۔ اشتراکیت کا مطالبہ ایک عالمگیر اور بنیادی طور پر اخلاقی مطالبہ ہے۔ یہ اخلاقی مطالبہ ممکن نہیں کہ کبھی بدل سکے اس لئے کہ اخلاقی قدریں ابدی ہیں جس طرح انسان کا جسم، شکل، صفات مثلاً رونا، ہنسنا، غصہ ہونا اور مختلف جذبات یکساں اور ابدی ہیں یعنی اگر انسان ہے تو اس کے اندر یہ صفات ہوں گی۔ اسی طرح فضائل و رذائلِ اخلاق کی بنیادیں ابدی قدروں پر ہیں جو بدلتی نہیں۔ اگر قدروں کو کوئی معاشرہ بدلنا چاہتا ہے تو وہ خود ختم ہو جاتا ہے جس معاشرہ نے مصنوعی طور سے ظلم اور قتل و غارت کو تاریخ کا ایک عمل قرار دیا ہو۔ وہ معاشرہ خود تباہ ہوگا اور نئے لوگ ابھر کر اس کی برائیوں کو واضح کریں گے۔ مثلاً ہندوستان کے زمیندارانہ نظام میں عوام پر مظالم عام تھے۔ مگر وہ معاشرہ سے اخلاقی عظمت حاصل نہ کر سکے اور ظلم اخلاقی قدر نہ بن سکا۔ ڈاکٹر عابد حسین نے ایک بار مجھ سے بڑی عمدہ بات فرمائی کہ بغیر اخلاقی عظمت کے کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اشتراکیت بھی اخلاقی عظمت کے سہارے قائم ہے۔ خیر و بھلائی کے تصورات اس کو توانائی و

تابندگی بخشتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ اخلاقی قدر ہے۔ احتشام حسین بقول خود اسی اخلاقی قدر، انسانی بھلائی اور عوامی خدمت کے علمبردار ہیں۔

ایک مسئلہ اور بھی اہم ہے کہ احتشام صاحب نے تنقید پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔ نہ تو انھوں نے کسی شاعر یا ادیب پر کوئی تنقیدی کتاب پیش کی اور نہ ادبی تنقید پر۔ مختلف موضوعات پر مختصر مضامین انھوں نے لکھے ہیں جو علمی، نظری و تہذیبی اور لسانی مسائل پر مشتمل ہیں اور خیالات میں غیر معمولی تکرار کی کیفیت ہے۔ کسی کتاب کے نہ لکھنے کا احساس خود احتشام صاحب کو بھی تھا۔ یہ تصور صحیح نہیں کہ ان کے مقالات تصنیف کا بدل ہیں یا انھوں نے تصنیف سے بہتر اثر چھوڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقالوں میں آدمی بھرپور بحثیں کر پاتا۔ مقالے اثر انداز ہوتے ہیں۔ مگر وہ تصنیف کا بدل ہرگز نہیں ہو سکتے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس بارے میں صحیح تنقید فرمائی ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد ذہنی محنت اور دماغی جدوجہد سے کتراتے ہیں، کسی مجبوری یا فرصت کے وقت بیٹھ کر مطالعہ کی وسعت کے باعث مختصر سا مقالہ لکھ لیا پہلے اسکو کسی جلسے میں پڑھ دیا یا ریڈیو پر پڑھا پیسے مل گئے یا کسی رسالہ میں شائع کرالیا اور بعد میں مختلف جنس کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع کر دیا۔ اب اس میں کوئی مضمون اسم الخط پر ہے تو کوئی شاعرے پر، کوئی آتش پر ہے تو کوئی اصولِ نقد پر۔ اس سے انتشار ذہنی اور سہولت پسندی دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔

احتشام صاحب نے اپنے مجموعوں کے نام بڑے دلکش رکھے ہیں اور مناسب بھی :—

(۱) تنقیدی جائزے۔　　(۲) روایت اور بغاوت۔
(۳) تنقید اور عملی تنقید　　(۴) ادب اور شعور۔
(۵) ادب اور سماج　　(۶) عکس اور آئینے۔
(۷) اردو کی کہانی (بچوں کیلئے مستقل کتاب)　　(۸) تنقیدی نظریات۔

ان کے علاوہ انھوں نے دو تصانیف غیر تنقیدی موضوعات پر پیش کی ہیں ایک ساحل اور سمندر دوسری اردو ادب کی تاریخ (ہندی) میں اور آبِ حیات کا خلاصہ۔ یہ کل سرمایہ ہے جو انھوں نے اردو کیلئے چھوڑا ہے۔

ان کے مندرجہ ذیل مضامین انقلابی کیفیت کے غماز ہیں۔ اردو ادب میں ترقی پسندی کی روایت، ادب اور اخلاق، قدیم ادب اور ترقی پسند نقاد، مواد اور حقیقت، ادبی تنقید کے مسائل افسانہ اور حقیقت، اصول نقد، اردو ادب میں آزادی کا تخیل۔

ان مضامین کی عظمت مسلم ہے مگر میں ہرگز ان کو تصنیف کا بدل تصور نہیں کرتا۔ تصنیف

دائمی عظمت کی حامل ہوتی ہے۔ یہ مضامین فکر انگیز ہیں مگر ان میں موضوع کی وحدت نہیں۔

احتشام حسین کا ادب دراصل مقصدی و اخلاقی ادب ہے وہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ جو مطالبہ ہم ایک شہری سے کر سکتے ہیں وہی ایک شاعر اور ادیب سے بھی کریں گے۔ اس طرح اس کی مزاجی شخصیت ختم ہو جاتی ہے ادیب جب کچھ لکھتا ہے تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کہنے کو ہوتا ہے کسی مقصد کے ماتحت وہ لکھتا ہے۔ اس لئے اس کو پراگندہ دماغ سمجھ کر چھوڑا نہیں جا سکتا۔ وہ کچھ لوگوں کیلئے لکھتا ہے اسلئے اس کو ہئیت کی غلطی سے احتراز کرنا لازم ہے اسی طرح اس کا فرض ہے کہ وہ کسی ایسے مواد کو پیش نہ کرے جو اس کی ذمہ دارانہ شخصیت کے منافی ہو اور سماج کو گمراہ کر دے۔ احتشام حسین یہاں تک لکھتے ہیں کہ " ادیب کی وہ انفرادیت پسندی جو سماج کی خواہشات سے ہٹ کر اس کو مختلف سمت میں لے جاتی ہو وہ ناقابل ستائش ہے اور" ضروری ہے کہ ایسے ادیب کا گلا گھونٹ دیا جائے جو گندگی پھیلاتا ہے جو عریانی کی اشاعت کرتا ہے جو فحاشی کی جانب مائل ہے"۔

وہ ادب اور اخلاق کے موضوع پر مزید بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں" ادب اور اخلاق دونوں کا مقصد یہی ہے کہ ایک ایسے نظام زندگی کی بنیاد ڈالی جائے جس میں گندگی، فحاشی نہ ہو، حسد نہ ہو، نفرت نہ ہو ایسا نظام نظریہ اور عمل کے اتحاد سے قائم ہو سکتا ہے اور بہت سے ادیب آج اس کے قیام کے متمنی ہیں[1]"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی تنقید اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدروں پر مشتمل تھی اگرچہ ان قدروں کا ماخذ مارکس کا فلسفۂ جدلیت تھا جس سے بہتوں کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مگر خیر و فلاح کی جن قدروں کو انھوں نے ادب میں ابھارا اور نکھارا ہے۔ وہ فکر و فن کی تعمیر میں ہمیشہ اخلاقی عظمت کا روشن مینار بن کر قائم رہیں گی۔

اب میں کچھ بحث ان کے مارکسی فلسفہ سے کرنا چاہتا ہوں۔ احتشام صاحب باوجود تمام احتیاطوں اور ادبی تقاضوں کے احساسات کے ایک سیاسی انقلاب کے اسی طرح داعی ہیں جیسے کوئی سیاست داں، فرق صرف اتنا ہے کہ ان کا انداز ادبی ہے۔ پروپگنڈے کا کم ہے" مارکسی ناقدوں کی صف میں صرف احتشام صاحب کی شخصیت ایسی نظر آتی ہے جن کے مضامین توازن اور سنجیدگی قائم رکھنے پر زور دیتے رہے اور ہر ایسی تخلیق کو ترقی پسندی کے دائرہ سے خارج سمجھتے رہے جو ادبی بے راہ روی کی

---

[1] تنقیدی جائزے۔

حاصل ہے"۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ ناقد اپنے مخصوص نظریات کی تشریح و تبلیغ کرے۔ احتشام صاحب اپنے خیالات کو حکیمانہ انداز سے اکثر پیش کیا کرتے ہیں، مگر کبھی کبھی اشتراکیت سے ذاتی عقیدہ اور وابستگی اس درجہ حاوی [illegible] طعنہ زنی تک آ جاتی ہے جو ان کے معیار و منصب کے مطابق نہیں۔ ایسا وقت [illegible] وہ [illegible] ماورائیت، جنسیت، مذہبیت، مابعد الطبیعیات، بورژوا، انتہا پسندی، سرمایہ داری، استحصال، ذاتی ملکیت، فرد، نظام، تجارت، روایت اور اسی طرح کی اصطلاحیں بطور الزام کے پیش کرتے ہیں، جو دیہاتی گالیوں کا مرتبہ رکھتی ہیں، اسی طرح وہ خوش گوار نظام کی تلاش اور اشتراکی نظام کی تائید میں یہ سماجی، مادیت، جدلیت، طبقاتی کشمکش، سماجی اقدار، اشتراکی حقیقت پسندی، ترقی، انقلاب، ترقی پسند، آزادی وغیرہ بہت سی اصطلاحیں اپنے اقدار کی ملیح کے [illegible] استعمال کرتے ہیں گویا اول الذکر اصطلاحیں گالیاں ہیں جو تجارت پرستوں [illegible] دی جاتی ہیں، اور وہ [illegible] کر دی ہیں اور [illegible] دنگا ہی ہے جسے انہی عمومیت، احتشام صاحب کو بھی الگ کئے ہیں اس [illegible] وہ ارتقائی مادیت کی سطح [illegible] نہیں اٹھ سکے۔ اس حکیمانہ فرقہ پرستی [illegible] [illegible] جو اپنے عقیدے والوں کو بار بار [illegible] رہتے ہیں۔ عینیت کی گالی، مادیت کی ستائش [illegible] علم و ادب میں کوئی معنوی [illegible] عقیدہ تحریر [illegible] فرمایا ہے کہ لیکن لفظی واقع ہوا ہے اور [illegible] پوشیدہ ہے۔"

ایسا [illegible] [illegible] [illegible] اعلیٰ درجے کی ادبی عظمت کا حامل [illegible] انسانی [illegible] شکل میں [illegible] [illegible] اس کی عظمت سے شناسائی نہیں ہو سکتی۔ [illegible] کو کھو دی۔ تجارت پرستی اور رجعت پسندی [illegible] الزام لگاتے ہیں مگر [illegible] عظمت [illegible] نمایاں نہیں کرتے۔ [illegible] وقیانوسی [illegible] قرار دیتے ہیں [illegible] اقبال کو حقیقت کے مقابلے میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کشمکش اور سامراج اور [illegible] [illegible] بھوک ننگی اور محدود زندگی [illegible]

[illegible] ص ۲۲ ۔ عزیز احمد، لاہور، اپریل ۱۹۶۱ء، ص ۱۹

ڈالی ہوتی تو وہ ہمیں بتا سکتے کہ روحانی ارتقا سے پہلے محض زندہ رہنے کیلئے اپنے ہی سماجی اور سیاسی نظام کے خلاف شدید کش مکش کی ضرورت ہے۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ احتشام صاحب نے اپنے پیام کی تشریح کی ہے کہ کسی کا دل نہیں دکھایا۔ رہ گیا اصطلاحات کا استعمال تو جس فلسفۂ تنقید کے وہ ترجمان تھے یہ اس کا تقاضہ تھا۔ علاوہ ازیں اگر کسی فن پارہ میں وہ سارے ادبی اقدار محسوس کرتے مگر وہ سیاسی نظام جس کے احتشام صاحب اعتقاداً پیرو تھے اس میں اس کی مخالفت ہوتی تو یقیناً وہ اس پر تنقید کرتے جیسا کہ اقبال اپنے فن، فکر اور فلسفہ میں اعلیٰ شعور اور ذہنی بلندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چونکہ ادب و نقد کو اشتراکیت کے حامی بطور ایک پلیٹ فارم کے استعمال کرتے ہیں اسی لئے وہ حرف و خامی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ حیات و کائنات کے بارے میں فن کار کے نظریات کو جانچتے ہیں مادی جدلیت کا مخالف ہو تو وہ اس کی تنقیص کرتے ہیں۔

احتشام صاحب پر اس بارے میں اعتراض صحیح نہیں انھوں نے واضح طور پر ایک مسلک اختیار کیا اس کی ترجمانی کی بلکہ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی افکار کو پورے ادبی حسن کے ساتھ اردو ادب کی زینت بنا دیا۔ عربی زبان میں ادب کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ — الادب لا موضوع لہٗ۔ ادب کا کوئی موضوع نہیں ہے — یہ بالکل حقیقت ہے کہ جس چیز کو ادبی قالب میں پیش کیا جائے وہ ادب ہے۔ تعمیری و تخریبی ادب کا مسئلہ دوسرا پہلو رکھتا ہے۔ پھر مارکسی نقطۂ نظر کے بارے میں مؤلف اور ان دونوں کے رو برو میں احتشام صاحب کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر ان کی جد و جہد، عالمانہ تنقیدی نظریات جس میں ان کو ایک حاشیہ ادب سے نوازنا اور اپنے نظریات کو اس طرح پیش کرنا کہ وہ ادب کا جز بن جائیں یہ سب احتشام صاحب کی ادبی صفات ہیں جن میں کوئی ناقد ان کا شریک نہیں۔ انھوں نے مدت دراز تک تنقید میں مارکسی نقطۂ نظر رکھنے والے فن کاروں کی قیادت کی اور اپنے فکر و شعور کو کامیابی کے ساتھ واضح کیا۔ جن لوگوں کو مارکسزم سے اختلاف ہے وہ اس فلسفہ ہی پر اعتراضات کر سکتے ہیں مگر جہاں تک اس سے متفرع اس ادبی تنقید کا سوال ہے۔ جس کی ترجمانی احتشام صاحب نے پوری عمر کی ہے اس پر کوئی اعتراض جاندار نہیں معلوم ہوتا اس لئے کہ انھوں نے دوسروں کو گالی دینے، دل آزاری کرنے اور مناظرانہ رنگ اختیار کرنے سے قطعاً پرہیز کیا ہے۔ وہ کیا مختلف موضوعات پر معاشی کشمکش کا۔ اٹھانا تو یہ اس نظریہ کا تقاضہ ہے جس کے وہ علمبردار تھے۔ ان کی عظمت کا یہ پہلو بھی بڑا حیرت انگیز کہ انھوں نے معترضین کے جوابات بھی دئے ہیں مگر اسی سنجیدگی، وقار، ضبط اور شعوری کیفیات کے ساتھ جس کا

۱۔ تنقید اور عملی تنقید، مقالہ اقبال کی رجائیت کا تجزیہ، ص ۱۷۱

حاصل ان کا پورا ادبی سرمایہ ہے۔ انھوں نے نظریاتی اور عملی دونوں طرز کی تنقیدوں میں اس مخصوص نظریہ کی بنیادیں تجزیہ اور تحلیل کے ذریعہ پیش کی ہیں جس کو وہ حاصل حیات تصور کرتے تھے۔ احتشام صاحب نے پہلی بار زندگی کے بنیادی مسائل کو تنقید کا موضوع قرار دیا ورنہ ہمارے ناقد زبان و بیان کی خصوصیات میں الجھے ہوتے تھے انھوں نے اقدار حیات کی عظمت سے اردو تنقید کے دامن کو پُر کر دیا اور بڑے منظم انداز سے تقریباً ۲۵ — ۳۰ برس تنقید میں زندگی کی روح پھونکنے اور اس کو لفظی بازی گری سے نکالنے اور اعلیٰ مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کا عظیم کام انجام دیا جو کسی بھی ادب کیلئے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ یہ کام انھوں نے کسی مادی نفع کیلئے نہیں کیا بلکہ ایک مشنری مقصد و جذبہ کے تحت اپنے آپ کو شاعری اور افسانہ نگاری سے الگ کر کے صرف تنقید کیلئے وقف کر دیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کے تنقیدی افکار کو خود ان کے الفاظ میں پیش کیا جائے جس سے ان کی عظمت کا حقیقی نقشہ نگاہوں میں آسکے۔

"وہ تمام شعرا اور نقاد جو زندگی کو نامیاتی مانتے ہیں، جو مقدار سے خصوصیتوں کے بدلنے کے قائل ہیں جو شاعری کو زندگی کا مظہر مانتے ہیں جو ادب کو سماجی ترقی کا ایک آلہ سمجھتے ہیں اور جو تمدن کو عام کرنا اور فنون لطیفہ کو عوام کی چیز بنانا چاہتے ہیں وہ کسی حالت میں بھی ہیئت اور اسلوب کو مواد پر اہمیت دینے کے لئے آمادہ نہ ہوں گے۔ شاعر کے پاس خیال ہوتا ہے خیال اسکے مادی وجود کی اس کش مکش سے پیدا ہوتا ہے جو وہ فطرت اور سماج (طبقاتی سماج) میں کر رہا ہے۔ اسی لئے آج تمام شاعروں کا یہ پہلا سماجی فریضہ ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو جائیں جو دنیا کو بدل دینا چاہتے ہیں انھیں اسی طرح آزادی نصیب ہو سکتی ہے[1]"

نقاد" ادیب کے ذہنی سفر کا تجزیہ کر کے اس کے حقیقی خیالات کا پتہ چلائے گا' ادیب کی جانب داری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تہذیب پر ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔ یہ سارے کام محض تشریح یا تاثر کے اظہار سے ممکن نہیں ہیں ان کے لئے نقاد میں خود ایک قوتِ تخلیق کی ضرورت ہے جو تنقید کو بھی ادبی حیثیت عطا کر دے جس میں نقاد کے انداز نظر سے جان آجائے اور جو کسی مصنف یا تصنیف کا تذکرہ ہونے کے باوجود انسان کے سماجی اور فلسفیانہ شعور میں اضافہ کا سبب بن جائے۔ ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اسکے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیاد کو ڈھونڈ کر اسکی ادبی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرے اور ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے۔ فن کی نزاکتوں پر نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے

---

[1] مقالہ ہیئت اور مواد۔

والوں کی رہنمائی کرے۔ اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔[۱]

"وہ نقاد جو ہر ادبی کارنامے پر سر دھنتا ہے ہر ادیب اور شاعر کو پسند کرتا ہے۔ کسی نقطۂ نظر سے تعرض نہیں کرتا بقول آسکر وائلڈ اس کا حال اس نیلام کرنے والے کا سا ہے جو ہر مال کی تعریف کرتا ہے اپنے سماج سے مخلص ہونے کیلئے نقاد کو ہر ادیب اور شاعر کا تجزیہ کرنا ہی پڑے گا۔[۲]

"ادب کی یہ حیثیت کہ اس میں سماجی حقائق اپنی طبقاتی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور ادیب کے سماجی رجحان کا پتہ اس کے خیالات سے چلتا ہے۔ ادیب زندگی کی کشمکش میں شریک ہو کر اسے بہتر بنانے کی راہ بتا سکتا ہے[۳]"

ناقد، علم کی روشنی میں ایک شاہراہ بنانے کی کوشش کرتا ہے، وہی اصول، اصول کہے جا سکتے ہیں جو صرف اصول بتانے والوں یا اس کے چند ساتھیوں کے کام نہ آ سکیں بلکہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کو روشنی دکھا سکیں جن میں ان جانی داخلیت اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے وجدان کے سہارے منزلیں طے نہ ہوں بلکہ جن میں تاریخ، منطق اور دوسرے علوم سے مدد کی جائے تاکہ نتیجہ میں غلطی کے امکانات کم ہوں۔[۴]

اعلیٰ ادب ادیب کی شعوری قوت کا نتیجہ ہوتا ہے اسے اس کے وقتی تجربات اور ہیجانات کا نتیجہ قرار دے کر نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہو سکتا۔ اچھا ادب وقت کی چیز ہوتے ہوئے بھی ہر وقت کی چیز ہوتا ہے۔[۵]

ادب یا تنقید ادب کو معاشیات کا ایک شعبہ نہیں سمجھنا چاہیئے اور نہ اس تعلق کو جو معاشیاتی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان قائم ہو جاتا ہے۔ ریاضیاتی تناسب سے بدلتا ہوا سمجھنا چاہئے کیونکہ جب ایک دفعہ ایک مخصوص ادبی نظریہ بن جاتا ہے تو وہ اپنے قوانین و ضوابط آپ بنا لیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق معاشی نظام سے بالکل نہیں ہے۔[۶]

ان مختلف اقتباسات کے ذریعہ میں احتشام صاحب کے تنقیدی اصولوں کا ایک خاکہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ان تنقیدی اصولوں کا اختصار یا خلاصہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ احتشام صاحب سماجی انصاف کے قائل ہیں وہ سماجی فلاح و بہبود کو اپنا نصب العین تصور کرتے ہیں اور اپنے ہر مقالہ میں انسانوں کی بھلائی کی گفتگو کرتے ہیں۔

۲۔ ادب کا ظہور طبقاتی و معاشی کشمکش کے باعث ہوتا ہے۔ اگرچہ ظہور میں آجانے کے بعد یہ ظاہراً ادبیہ

---

۱ تنقید اور عملی تنقید ۲ تنقیدی نظریات کا مقالہ ۳ تنقیدی نظریات کا مقالہ ۴ ادب اور سماج مقالہ اصولِ نقد۔ ۵ ادب اور سماج مقالہ اصول تنقید ۶ روایت اور بغاوت مقالہ ادبی تنقید کے مسائل۔

معاشی اثرات نظر نہیں آتے مگر ان کی تہہ میں تحلیل کرنے سے معاشی عوامل ہی بنیاد ہوتے ہیں۔

۳۔ تنقید کرتے وقت سماجی اثرات، نفسیاتی عوامل، سیاسی، معاشی اور تاریخی موثرات و علوم سے مدد لینی ضروری ہے۔

۴۔ ناقد کا کام یہ ہے کہ عوام کی رہنمائی کرے، ذوق و ذہن کے میدان میں اس کو سماجی حقائق میں طبقاتی کشمکش کا پتہ لگانا چاہیے۔

۵۔ ناقد کو ایسے اصول اپنانے چاہئیں جو کسی ایک طبقہ کی ترجمانی نہ کرتے ہوں بلکہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ان سے روشنی و حرارت مل سکے۔

۶۔ ناقد کو ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لینا ضروری ہے، عام قاری کی رہنمائی کرنا بھی اس کا فرض ہے اس کو ادیب کے خیالات کی بنیاد ڈھونڈ کر اس پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرنا چاہیے۔

۷۔ تنقید کرتے وقت ناقد اپنے ذوق سے بالکل دست بردار نہیں ہوسکتا۔ اس کو اپنے اصولوں کے تحت کرنی چاہیے۔

۸۔ اپنے سماج سے مخلص ہونے کیلئے اسکو ہر ادیب اور ہر تخلیق کا مدّاح نہ بن جانا چاہیے۔ جن قدروں کو اور جس نظریۂ حیات کو غلط سمجھتا ہے یا جن فنی خامیوں کو محسوس کرتا ہے ان کو بیان کرنا لازم ہے۔

۹۔ اعلیٰ ادب وقتی شئے نہیں بلکہ وہ حیات جاوداں کا مالک ہوتا ہے۔

۱۰۔ فنون لطیفہ کو خواص نہیں عوام کی چیز سمجھنا چاہیے جو لوگ ایسا یقین رکھتے ہیں زندگی کی تغیر پذیری کو صحیح تصور کرتے ہیں ادب کو سماجی ترقی کا آلہ جانتے ہیں ان کو متحد ہو کر انقلابی قوتوں کا ساتھ دینا چاہیے دوسرے الفاظ میں کمیونزم کی تحریک میں شریک ہو کر اشتراکیت کے قیام میں مدد کرنی چاہیے۔

۱۱۔ مواد کو ہئیت پر برتری حاصل ہے مگر ہئیت کے تقاضوں کو نظر انداز بھی نہ کرنا چاہیے۔

یہ اصول اپنی جگہ پر بڑے اعلیٰ ہیں اور احتشام صاحب کا ان کو پیش کرنے کا انداز اس سے بھی زیادہ بلند اور حکیمانہ ہے۔

یہ اصول اپنی جگہ پر بڑے قیمتی ہیں اور عام مارکسی تنقیدی نظریہ سے عبارت ہیں۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں کہ فن کار کی تخلیق میں سماجی، معاشی اور نفسیاتی عوامل کو تلاش کیا جائے۔ جس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ غریب طبقات کسانوں اور مزدوروں سے ہمدردی کے جذبات کو پیش نظر رکھا جائے۔ انسانوں کی خیر اور فلاح کے جذبات کو ابھارا جائے۔ ان کے مصائب اور زندگی کے مسائل میں ان کی رہنمائی کی جائے ان کے ذوق کی تربیت کی جائے۔ ادب میں فن کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ مواد کو ہئیت پر ترجیح

دی جائے۔ فحش نگاری سے اجتناب کیا جائے۔ اخلاقی قدروں کی اشاعت کی جائے۔ احتشام صاحب کے یہ اعلیٰ انسانی و اخلاقی افکار نہایت قابل قدر ہیں اور ان کو پیش کرنے کا ان کا اپنا اسلوب اور بھی زیادہ دلکش ہے مگر سوال صرف اس قدر نہیں ہے۔ ناقد اشتراکیت کو اپنانے اور کمیونزم کو قائم کرنے اور اسکے لیے ادیبوں کو جدوجہد کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسی نظام میں چند نہایت عمدہ خوبیاں ہیں مگر چند ایسی بنیادی باتیں بھی ہیں جو اہل نظر کیلئے اختلافات کا باعث ہیں مثلاً جمہوریت کا فقدان شخصی آزادی رائے کے حق کی نفی، مذہب پر قدغن، جنسی بے احتیاطی اور دینی پابندیوں کی پروا کئے بغیر پروپگنڈے کا طرز اشتراکی نظام اور اشتراکی ادب اس قسم کے اعتراض اپنے اندر وزن رکھتے ہیں۔

یہاں بحث نہ اشتراکی نظام سے ہے نہ سرمایہ داری سے نہ انقلاب سے یہ سب عالمی مسائل ہیں۔ فی الوقت ہم کو صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ احتشام صاحب کی تنقیدی کاوشوں نے اردو ادب کو کیا دیا؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تنقیدوں نے اردو کے سنجیدہ ادب میں علمی اضافہ کیا ہے۔ اس میں تعمیری قدروں کی روح پھونکی ہے اس کو زندگی سے قریب کیا ہے اس کو انسانی آرزوؤں اور تمناؤں کا ملجا بنایا ہے اور ادب کو تفریح کے بجائے زندگی کی بلندی اور ترقی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ انھوں نے نظریاتی بلندی سے اپنی تنقیدوں میں ایک ایسا ماحول پیش کیا ہے جس سے اردو تنقید آشنا نہ تھی۔ انھوں نے ادب کو عوام کی میراث قرار دیا ہے ناقد کو ذوق کی تعمیر و تعبیر کرنے والا معمار بنا کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے ناقد کے فرائض اور تنقید کی عظمت کو بار بار وضاحت سے پیش کیا۔ انھوں نے اپنی وسعت ظرف سے اس امر کا اعتراف کیا کہ تنقید میں "نقاد کی محدود نگاہی اور جذباتی کمزوری کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے اس لئے میں کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ یہ مضامین حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں تک ہو سکتا ہے۔ میں دیانت دار رہنے کی کوشش کرتا ہوں[1]۔"

یہ عبارت ان کی تنقیدی عظمت کا نشان ہے۔ انھوں نے غور و فکر کے ساتھ جو تنقیدی کام کئے وہ یقیناً اردو کا عظیم سرمایہ بن کر حیات جاوداں حاصل کریں گے۔ ان کی تحریروں نے ایک تنقیدی انقلاب پیدا کیا ہے انھوں نے نظریاتی تنقید کی بنیاد ہی نہیں رکھی بلکہ رہنمائی اور قیادت کا فرض بھی انجام دیا ہے۔

انھوں نے نظریات کو عمل کے قالب میں ڈھال کر عملی تنقید اس انداز سے پیش کی کہ اس میں زندگی اور سماج کے رشتے روز روشن کی طرح عیاں ہو گئے اور آئندہ تنقید نگاروں کیلئے ایک نمونہ بن گئے۔

---

[1] دیباچہ تنقید اور عملی تنقید۔

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

احتشام حسین سے چند ادبی ملاقاتیں

میں ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہا تھا اس زمانہ میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ابن فرید صاحب کی ادارت میں ماہنامہ "ادیب" نکل رہا تھا۔ اتفاق سے میں گرمیوں کی تعطیل میں علی گڑھ سے واپس ہوا تو لکھنؤ ٹھہر گیا اور ایک دن "دانش محل" میں پہلی بار پروفیسر احتشام حسین صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اپریل ۱۹۶۱ء کے رسالہ ادیب میں جناب عبدالمغنی صاحب کا مقالہ احتشام صاحب کی تنقید نگاری پر چھپا تھا وہ رسالہ میرے پاس موجود تھا۔ گفتگو کے دوران ذکر اسی مضمون کا آیا انھوں نے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا اور میں نے اپنے کاغذات سے رسالہ نکال کر ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ احتشام صاحب نے اچھا خاصہ طویل مقالہ وہیں بیٹھے بیٹھے پڑھ ڈالا اور پھر فرمایا کہ مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے۔ پڑھ کر لکھا ہے۔ ان کی اس خوشی پر مجھے تعجب ہوا اسلئے کہ وہ مقالہ اپنی روح کے لحاظ سے ان کے نظریات سے موافق نہ تھا اور اس میں ان کے مادی وجدلیاتی افکار پر سخت تنقید تھی مگر یہاں احتشام حسین کی علمیت اور ان کا معروضی انداز نظر واضح ہو جاتا ہے انھوں نے محض اس بنا پر مقالے کو سراہا کہ اس میں باتیں معقول انداز سے اور ان کے مضامین کے مطالعہ کے بعد پیش کی گئی تھیں یہ ظرف بلاشبہ ایک اعلیٰ درجہ کے ناقد ہی کا ہو سکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بعد میں انھوں نے اپنے کسی مجموعۂ مضامین کے دیباچہ میں اس مقالہ کا ذکر بھی کیا تھا۔

ان کی وسیع النظری کی ایک مثال اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب اپنی کتاب "تنقیدی نظریات" [illegible]ء لکھی تو پروفیسر احتشام صاحب سے مقدمہ لکھنے کی درخواست کی۔ انھوں نے فوراً قبول فرمائی اور کچھ دنوں میں مقدمہ لکھ کر روانہ فرما دیا۔ حالانکہ میں خوب جانتا ہوں کہ ان کو میرے تنقیدی مسلک سے اختلاف تھا اب یہ ان کی تنقیدی عظمت ہے کہ انھوں نے وسیع النظری سے مجھے نوازا۔ مقدمہ میں انھوں نے میری کتاب پر بھی نہایت عمدہ تنقید فرمائی۔ ان میں بعض نظریات پر بھی جو ان کے خیالات کے موافق نہ تھے مگر یہ سب کچھ اس محبت کے الفاظ میں کہ کسی کو تکلیف نہ پہونچے۔ تنقید میں شیشہ گری یہی ہے کہ دلوں کو توڑے بغیر حقیقت واضح کر دی جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اختلاف نظر کا ذکر ان سنجیدہ الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"میں جانتا ہوں کہ ان کے بہت سے خیالات اور ان کی تعبیرات سے اختلاف کیا جائے گا۔

شاید یہ بھی کہا جائے کہ انھوں نے بعض نقاط نظر کی صحیح نمائندگی نہیں کی ہے لیکن میں اس تصنیف کا خیر مقدم اس لئے کرتا ہوں کہ انھوں نے اپنے وسیع مطالعے کے نتائج سے ہمیں مستفیض کیا اور تنقید کے چند ایسے پہلوؤں سے روشناس کرایا جن سے اردو ادب کے طالب علم ابھی طرح واقف نہ تھے۔ جنھیں اختلاف ہوگا وہ اپنے خیالات اپنے انداز سے پیش کرکے تسکین حاصل کرسکتے ہیں[1]۔

احتشام صاحب نہایت سادہ دل اور سادہ طبیعت کے انسان تھے ان سے جلسوں میں بھی ملاقاتیں ہوئیں مگر ہمیشہ میں نے ان کو سادہ لباس میں پایا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہ سفید سوتی شرٹ اور ڈھیلا ڈھالا پینٹ زیب تن کئے تھے۔ دوہرے بدن کے آدمی تھے۔ چہرہ پر وجاہت مگر چیچک کے داغوں سے منقش تھا اور اس پر علم کا نور روشن تھا۔ وہ کلین شیو رہتے تھے۔ گفتگو نرمی اور سنجیدگی سے فرماتے تھے۔

احتشام صاحب سے دوسری بار تفصیل سے ملنے کا موقع مجھے انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے پہلے جلسہ دلی میں ملا۔ میں دکن سے دلی پہنچا۔ جلسہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب نے افتتاحی مقالہ پڑھا۔ دوسرے دن کا اجلاس احتشام صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شام کو کھانے کیلئے ہم لوگ ایک ہال میں گئے وہ عجب دلکش منظر تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر نجیب اشرف ندوی ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور پروفیسر احتشام حسین جیسے اصحاب علم و فضل اور اساطین ادب اردو کا مجمع تھا۔ اس موقع پر احتشام صاحب کا ساتھ ہو گیا اور انھیں کے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ان سے ایک بنیادی سوال کیا میں نے عرض کیا کہ آپ نے روح انتقاد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اخلاقی قدریں ابدی نہیں ہوتیں بلکہ بدلتی رہتی ہیں۔ قدریں زندگی کے باہر کہاں ہیں؟ جب زندگی بدلتی ہے تو قدریں بھی بدلتی ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ سماج میں پسے ہوئے طبقات کی مدد ایک اخلاقی مطالبہ ہے یا قدر ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کبھی نہیں بدلے گی؛ اشتراکیت کو نصف صدی وجود میں آئے ہو گئے۔ وہ اسی بنیادی اخلاقی قدر کے ذریعہ آگے بڑھ رہی ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ نہیں زمانہ کے ساتھ یہ قدر بھی بدلے گی۔ زندگی میں جب بنیادی تبدیلیاں ہوں گی تب یہ قدر بھی بدل جائے گی۔ تغیر پذیری زندگی کی بنیاد ہے۔ میں چونکہ اخلاقی قدروں کو زندگی کی بنیاد تصور کرتا ہوں اس لئے میں نے احتشام صاحب سے یہ سوال کیا کہ پچاس برس کی مدت میں اشتراکیت کی یہ قدر کیوں نہیں بدلی؛ بہرحال انھوں نے یہی کہا کہ

---

[1] تنقیدی نظریات کا مطالعہ از ڈاکٹر احتشام احمد ندوی ص ۱۰

وہ بھی بدلے گی۔

درمیان گفتگو میرے اس مقالہ کا ذکر آیا جو میں نے ۱۲ قسطوں میں فن موازنہ اور اس کی ماہیئت پر لکھا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس پر نظر ثانی کر کے شائع کرا دیجئے۔

احتشام حسین صاحب سے تیسری اور آخری ملاقات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں ضابط کی مجلس میں ہوئی جس میں پروفیسر آل احمد سرور بھی تشریف فرما تھے۔ محترم سرور صاحب نے مجھ سے کہا آپ اپنا نام بدل لیجئے اس لئے کہ آپ بھی احتشام لکھتے ہیں اور احتشام صاحب بھی احتشام کہلاتے ہیں آپ دونوں ہم نام ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں ڈاکٹر لکھتا ہوں پھر میرے نام کا جز حسین کے بجائے احمد ہے۔ احتشام صاحب نے صاد کیا اور بات آگے بڑھی۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ آپ عربی کے عالم ہیں مصنف ہیں آپ نے اردو کا مطالعہ کیا ہے یہ بتائے کہ اگر آپ اردو ادب کی تاریخ لکھیں تو اس کے کتنے ادوار قائم کریں گے میں نے کہا تین دور قدیم، دور متوسط اور دور جدید سرور صاحب نے فرمایا کہ ان ادوار کا تعین کیجئے۔

میں نے کچھ جواب دیا جس پر انھوں نے اعتراض کیا کہ اس طرح میر تقی میر عہد قدیم میں پہنچ جاتے ہیں اس موقع پر احتشام صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ جو تقسیم ہمارے یہاں ادب کی چلی آرہی ہے اس پر آپ کو کیا اعتراض ہے؟ ہم اردو ادب کے ادوار کو دکنی دور، دبستان دہلی، دبستان لکھنؤ اور دور جدید میں تقسیم کرتے ہیں میں نے عرض کیا کہ یہ تو بالکل مناسب ہے جس سے مقامی خصوصیات وعوامل کا ادب پر اندازہ بھی ہوتا ہے۔ البتہ دور جدید میں دو یا تین حصے کرنے پڑیں گے۔

سرور صاحب نے یہ مسئلہ چھیڑا کہ خالق باری کا مصنف کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اس کا مصنف امیر خسرو کو تصور کیا جاتا تھا مگر پروفیسر محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں اس خیال کی تردید دلائل قاطع سے کی ہے احتشام صاحب نے فرمایا ہے کہ پھر اس کا مصنف کون ہے میں نے کہا کہ اس کا مصنف ایک دوسرا خسرو (ضیاء الدین) ہے جو امیر کے بعد کے عہد کا تھا۔

احتشام صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ عربی ادب کا دور جدید کب سے شروع ہوتا ہے میں نے عرض کیا کہ مصر پر نپولین کے حملہ سے جو ۱۷۹۸ء میں ہوا تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں نے آپ کی ایک کتاب عربی شاعری کے جدید رجحانات پڑھی ہے۔ میں نے یہ بھی عرض کیا کہ دور جدید میں عربوں نے فرانسیسی اور انگریزی کے ذخائر ادب سے اپنا دامن پر کر لیا ہے اور بے شمار کتابوں کے عربی میں ترجمے کر لئے ہیں۔

یہ چند ملاقاتیں تھیں جن سے میں نے احتشام صاحب کی شخصیت سے تاثر قبول کیا۔ ان کا سنجیدہ مفکرانہ انداز، ان کی دلکش شخصیت اور پر وقار گفتگو دل پر اثر کئے بغیر نہ رہ سکی۔ میں نے اردو اساتذہ میں انھیں

جتنا معقول و مقبول پایا اتنا کسی اور کو نہیں۔ وہ نہایت نیک نام تھے ان کے شاگرد ان کے علم ہی کے نہیں، ان کی انسانیت کے بھی معترف تھے وہ طلبا کے مسائل میں اپنے کو الجھاتے تھے اور ان کی مدد کرتے تھے۔ احتشام صاحب کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان کی انسانیت پرستی اور آدمیت و شرافت نفس سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ ادیب کو ادیب بننے سے قبل انسان بننا چاہیئے۔ خصوصًا جب کوئی ادیب پروفیسر اور صدر شعبہ جیسے عہدہ پر فائز ہو تو اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنا حسن اخلاق کھو بیٹھتا ہے۔ اس کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ ؎

آدمیت احترام آدمی　　　باخبر شو از مقام آدمی

وہ اکثر ملنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اکثر اس کا مزاج معمول پر نہیں رہتا۔ علم کا بیجا غرور، شہرت کا نشہ اور عہدہ کی عظمت اس کے اخلاق کو مجروح کر دیتی ہے۔ میں نے احتشام صاحب کو ایک انسان ہی نہیں شریف انسان پایا جو حسن اخلاق کا مجسمہ تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ان کے بارے میں بڑی عمدہ رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

سابقہ میں گنتی کے جو چند افراد صف اول کے نکلے اور خوشگوار ترین ثابت ہونے کے باوجود اعتقاد و معاشری اختلافات کے ــــ ان میں ایک احتشام حسین بھی تھے (صدق لکھنؤ مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء ص ۳)

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۴ سے آگے)

بہترین کتابوں پر انعامات دیتی ہے سنہ ۱۹۷۱ء میں اُردو اخبارات و رسائل کی مجموعی تعداد ۸۰۹ تھی جو آج بھی کم و بیش وہی ہے۔ اُردو ادب گوناگوں مشکلات مسائل کے باوجود قومی دھارے کا ساتھ دے رہا ہے، رائے عامہ کی ترجمانی کر رہا ہے۔ قوم کے ذہن کی تشکیل کے کام میں معروف ہے۔ اُردو خود اردو والوں سے یہ سوال کرتی ہے کہ کیا کوئی اقبال جیسا شاعر، منٹو جیسا ناول نگار، ابوالکلام آزاد جیسا نثر نگار، قاضی عبدالغفار جیسا صحیفہ نگار، عبدالحق جیسا محقق، احتشام حسین جیسا تنقید نگار، اب میدان ادب میں داخل نہیں ہوگا اور اسے وہ نطق نہیں دیگا جو اس زبان کے ادب اور دورِ حاضر کی موثر ترجمانی کرے؟

شرف الدین ساحل

اُردو ادب کے پچیس سال

آزادی کے بعد اُردو ادب کے پچیس برس کے اس مختصر سے جائزے میں، ہر اہم شاعر، نثر نگار اور تنقید نگار کے الگ الگ رنگ کا احاطہ اور اس کی انفرادیت کی قدر و قیمت کا تعین ممکن نہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ پچھلے پچیس سال میں جو قابل ذکر تجربات و میلانات سامنے آئے ہیں۔ اُن کے جائزے تک اِس مقالہ کو محدود رکھا جائے۔

(۱)

اُردو فکشن: — آزادی کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل رونما ہوئی۔ اشفاق احمد، غیاث احمد گدی، حیات اللہ انصاری، رام لعل، اقبال متین، انتظار حسین، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر، قاضی عبدالستار، عابد سہیل، جیلانی بانو، کلام حیدری، واجدہ تبسم، جوگندر پال اور آمنہ ابوالحسن وغیرہ اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں، جنہیں آزادی کے بعد شہرت نصیب ہوئی۔ اِس دور کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے عروج و زوال، جدیدیت کے علامتی نقوش اور نظریاتی رنگ کی آمیزش کی جھلک ملتی ہے۔ اشفاق احمد کا "گڈریا" غیاث احمد گدی کا "پیاسی چڑیا" واجدہ تبسم کا "نتھ کا بوجھ" رام لعل کا "چاپ" جوگیندر پال کا "بازیافت" جیلانی بانو کا "روشنی کے مینار" قاضی عبدالستار کا "دو دِ چراغ محفل" کلام حیدری کا "روشنی" انتظار حسین کا "زرد کتا" اِس دَور کے قابل قدر افسانے ہیں۔

علامت جدیدیت کا عطیہ نہیں۔ علامت اظہار کی ایک مؤثر صورت اور تکنیک کا نام ہے جس کا انور سجاد، احمد ہمیش، اکرام باگ، بلراج کومل، کمار پاشی، خالدہ اصغر، حمید سہروردی، انور رشید وغیرہ نے اپنے افسانوں میں بکثرت استعمال کیا ہے۔ نئے افسانے علامتی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں نے فرد، سماج اور زندگی کے رشتوں کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنے فہم کی فنی ترسیل سے بخوبی واقف ہیں ۱۹۶۵ء کے بعد اردو افسانے میں نئے رجحانات اُبھر رہے ہیں۔ ترقی پسندی کی مخالفت، زندگی کے شعور کا تکری احساس، ارادہ و عمل کی آزادی اور نئے نئے تجربے رونما ہورہے ہیں۔ بعض افسانہ نگار اپنے پلاٹ اور اینٹی افسانے کے رجحان کو ہوا دے رہے ہیں۔ بعض خالص ادب کی تخلیق پر زور دے رہے ہیں تو بعض جدیدیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر رہے ہیں۔ یہ تمام عوامل ایک نئے افسانوی رجحان کی پیشگوئی کرتے ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں کو بدلے ہوئے رجحانات کے پیش نظر افسانے میں ایسی ہمہ گیری پیدا کرنی چاہیئے کہ وہ نفسیاتی، سماجی، سائنسی، انسانی اور علاقائی دلچسپیوں کی تسکین کا باعث بن سکے۔ ایسی ہمہ گیری، رنگا رنگی اور تنوع

(VARIETY) میں افسانہ کا مستقبل پوشیدہ ہے۔

عصری رجحانات کی نمائندگی اُردو ناول میں بھرپور انداز میں نہیں لیکن وہ اعلیٰ ادبی معیار کے حامل نہیں ہوتے۔ اِس دور کے اہم ناولوں میں شوکت صدیقی کی "خدا کی بستی" حیات اللہ کی "لہو کے پھول" واجدہ تبسم کی "شجر ممنوع" مہندر ناتھ کی "آدمی اور سکے" خواجہ احمد عباس کی "چار دل چار راہیں" قاضی عبدالستار کی "صلاح الدین ایوبی" عصمت چغتائی کی "معصوم" قرۃ العین حیدر کی "آگ کا دریا" اور جمیلہ ہاشمی کی "تلاش بہاراں" شامل ہیں۔ اِن ناولوں میں سماجی ناانصافی اور تہذیبی زندگی کی جھلک ملتی ہے۔ بیشتر کردار ٹائپ کردار ہیں۔ بعض ناولوں میں عصری شعور اور فنی خلوص کی کمی ہے۔ آزادی کے بعد کرشن چندر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے ناول نگار کو نصیب نہیں ہوئی۔ کرشن چندر کے ہاں طبقاتی کشمکش، روحانی افسردگی، سماجی جبریت اور جمالیاتی احساس کی بہترین تصویرکشی ملتی ہے۔ انہوں نے احتجاج کی جو آواز بلند کی ہے اُسی کے باعث انہیں ملک گیر مقبولیت اور محبوبیت حاصل ہوئی ہے۔ اُردو ناول کو ابھی عصری زندگی کی صحیح ترجمانی کرنے اور کئی نئے فنی تجربوں کو رواج دینا ہے۔ ناول کی قدر و قیمت اس کے فکری صحت اور عصری رجحان پر مبنی ہوتی ہے۔ عصری شعور کے بغیر ناول نگار کو نہ عظمت حاصل ہوسکتی ہے اور نہ ہی اہم انسانی مسائل و عقائد پر قلم اٹھا سکتا ہے۔ وہی ناول نگار "ماڈرن" کہلا سکتا ہے۔ جس کے پاس شدت اور وسعت کے ساتھ "حال کا شعور" ملتا ہے، ورنہ کہنے کو ہر ناول نگار "حال" ہی میں سانس لیتا ہے۔

(۲)

اُردو نظم: — گذشتہ پچیس سال میں اُردو نظم نے کئی کروٹیں بدلی ہیں۔ اس نے کئی وقتی رجحانات کی عکاسی کی ہے۔ آزادی کے بعد اُردو شاعری نے امن کے نعرہ کو بلند کیا۔ غلام ربانی تاباں نے امن ایشیا، اور افریقہ کی بیداری سے تعلق بہترین نظمیں منتخب کرکے "محور" کی شکل میں شائع کی ہیں۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو نظم کو واقعات زندگی کرادا کرنے کے مختلف گُر اور متنوع اسالیب سکھائے۔ ترقی پسندی کو مروجہ فیشن سمجھ کر بعض شعراء نے اِسے شہرت کا آسان ترین وسیلہ بنالیا جس کی وجہ اُن کی شعری تخلیقات ناپختگی کا شکار بن گئیں۔ آزادی کے بعد کے حالات و رجحانات کو مخدوم، فیض، سردار جعفری، کیفی اور خورشید احمد جامی وغیرہ نے اچھی طرح سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان شعراء کے عمل اور نظریہ میں ایک حد تک ہم آہنگی نظر آتی ہے سنہ ۱۹۵۵ء کے بعد شعراء کی ایک نئی نسل اُبھری جس نے آزادی کی جدوجہد میں عملی حصہ نہیں لیا تھا۔ وحید اختر، خلیل الرحمن اعظمی، قاضی سلیم، شاذ تمکنت، محمود ایاز، حمید الماس، عزیز قیسی، مظہر امام، محمود سعیدی، راہی [illegible]فا، رحمت الاکرام، کرامت علی کرامت وغیرہ اُردو نظم کے افق پر تابنا کی کے ساتھ نمودار ہوئے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد جدید نظم گوئی کا چرچا شروع ہوا جس کا طرز بیان ترقی پسند شاعری سے بالکل جداگانہ ہے

کلاسیکی روایت کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوا۔ جدیدیت کے نام میں کئی لسانی تجربوں کو فروغ حاصل ہوا شمس الرحمن فاروقی، ندا فاضلی، عمیق حنفی، کمار پاشی، وقار خلیل، زاہدہ زیدی، شہریار، شاہد عزیز، کرشن موہن، وہاب دانش، ساجدہ زیدی، مغنی تبسم، شعیب شمس، لطف الرحمن، ظفر حمیدی، آزاد گلاٹی، پرکاش فکری، بشر نواز، عادل منصوری، شکیب جلالی، مجید امجد، زحت قمر وغیرہ کو جدید نظم کے قابلِ قدر شعراء کہا جاسکتا ہے۔ جدید شعراء نے افلاطونی تصورات کے طلسم کو توڑ کر عشق کو تقاضۂ حیات سمجھ کر اس کی تمام تر نفسیاتی، جذباتی اور جسمانی واردات وکیفیات کی ترجمانی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کا رویہ زندگی کی طرف رومانی ہے مگر روایتی نہیں۔ رومانی لہجہ کے ساتھ جدید نظم نے ایک مخصوص فکری میلان کو بروئے کار لایا یہ تشکیک کا میلان ہے۔ معاشرہ کی رشوت ستانی، صنعتی انسان کا احساس تنہائی، مزدوروں کی بے اطمینانی، پرانے انسانی اقدار کی بے حرمتی، زندگی کی بے معنویت، وغیرہ جدید نظم کے موضوعات ہیں۔ کئی جدید شعراء نے اہم سیاسی وسماجی مسائل پر نظمیں لکھی ہیں۔ شاعری میں اب تبدیلی آگئی ہے۔ ماضی سے وابستگی بے معنی بن چکی ہے۔ عشق اب آسمانی نہیں رہا۔ انتہا تبسم کی حقیقت پسندی نے زندگی وادب، عاشق ومعشوق کے رشتوں کو یکسر بدل کر رکھدیا ہے۔ جدید نظم اپنی رومانی رویہ کی غمازی کرتی ہے۔

آزادی کے بعد اردو شعراء نے کلاسیکی اسالیب سے فائدہ ہی نہیں اٹھایا بلکہ پرانی اصناف کے امکانات کو وسعت بخشی۔ جدید شعراء نے ماضی کے روایات کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ گہرا داخلی تجربہ، پیکر تراشی، غیر مانوس تجربات، پرانی روایات کے حوالے، علامتی اشارے اور زبان کا چونکا دینے والا انداز وغیرہ جدید نظم کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ مختصر اور طویل دونوں قسم کی کامیاب نظمیں لکھی گئی ہیں۔ طویل نظموں میں سردار جعفری کی "ایشیاء جاگ اٹھا" کیفی کی "جمہورنامہ" نیاز حیدر کی "جمال ناصر" کمار پاشی کی "ولاس یاترا" اور خلیل الرحمن اعظمی کی "آئینہ خانے" کو قابلِ قدر اضافہ اور اہم تجربہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ عمیق حنفی کی "سلسلۃ الجرس" کو کامیاب نظم ہی نہیں بلکہ جدید مسدس حالی کہا جاسکتا ہے۔

غرض آزادی کے پچیس برسوں کو جدید نظم گوئی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ جدید نظم گوئی نے نئے اسالیب، موضوعات اور نئے طرز فکر سے ہمیں روشناس کرایا ہے۔ جدید نظم گوئی کو کئی اعتبار سے دورِ جدید کا بہترین ادبی عطیہ کہا جاسکتا ہے۔

(۳)

طنز نگاری:۔ اردو کی جدید طنز ومزاح نگاری کی ابتدا رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے ہوتی ہے۔ اپنے طرز پیشکش کے اچھوتے پن سے انھوں نے اردو مزاح نگاری کو ایک نئی معنویت عطا کی۔ کرشن چندر نے سیاسی بے اعتدالیوں، سماجی کوتاہیوں اور ملازموں کی بدعنوانیوں کو اپنا موضوع طنز بنایا۔ کنہیا لال کپور نے اردو

طنز نگاری کو ایک نئی شگفتگی عطا کی۔ غلام احمد فرقت کاکوروی نے جدید فیشن اور سماجی رسومات پر طنز کیا ہے جو چٹخارہ کا مزہ دیتا ہے۔

آزادی کے بعد عاقل علی خاں، زینت ساجدہ، فکر تونسوی، یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ، سلمیٰ صدیقی، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، جمال پاشا، عاتق شاہ، خوشتر گرامی، سرور جمال، وجاہت سندیلوی، عطیہ پروین، سرور ڈنڈا، مانک ٹولا، مسیح انجم، سگار لکھنوی، ہلال رامپوری، گرگٹ حیدرآبادی، بھباٹ حیدرآبادی، راہی قریشی، علامہ بے نام مزاح نگاری کے میدان میں نمایاں طور پر ابھرے ان طنز نگاروں نے ہر موضوع پر اعتماد کے ساتھ پھلجھڑیاں برسائی ہیں سلیمان خطیب موجودہ دکنی مزاحیہ اور طنزیہ شاعر کے امام کہے جاسکتے ہیں۔

(۴)

تنقید نگاری:۔ گذشتہ دو دہوں کی اُردو تنقیدی میلانات کے اعتبار سے تین واضح طرزوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ پہلا طرز پرانے نقادوں کا ہے جو فصاحت اور ادبیت کو پیمانۂ نقد سمجھ کر زبان و اسلوب کی نزاکتوں پر زور دیتا ہے۔ یہ رنگ جعفر علی اثر لکھنوی سے لیکر اختر تلہری تک سبھی نقادوں میں ملتا ہے۔ دوسرا رنگ تاثراتی تنقید کا رنگ ہے جو شاعر کے داخلی مزاج حسن کے تاثر اور شعریت کے نت نئے روپ کی نشاندہی کو معیار تنقید قرار دیتا ہے۔ نیاز فتح پوری سے لیکر خورشید الاسلام تک یہ رنگ نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ تیسرا رنگ مغربی تنقید کی بنیاد پر اُردو کے سرمایہ کو پرکھنے کا رنگ ہے۔ مغربی تنقید کی یہ آگہی و بصیرت ہمیں کلیم الدین احمد سے لیکر شمس الرحمٰن فاروقی تک سبھی نقادوں میں ملتی ہے۔ پھر اُردو تنقید کے افق پر ایک نیا گروہ نمودار ہوا جسے "ترقی پسند" کہا جاتا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے اُردو تنقید کو ایک نئی زندگی بخشی۔ ممتاز حسین، مجنوں، سجاد ظہیر اور احتشام حسین وغیرہ نے اپنے مضامین کے ذریعہ تنقید کا ایک نیا تصور پیش کیا۔ پہلی بار اُردو تنقید میں تصورات اقدار، سماجی عوامل اور تہذیبی محرکات کی بحث چھیڑی۔ ترقی پسند تنقید نے بالآخر ادب کو مارکسی بصیرت کی آگہی بخشی۔ احتشام حسین ترقی پسند تنقید کے امام کہے جاسکتے ہیں۔

اسی دور میں ایک نیا گروہ ابھرا جسے جمالیاتی گروہ کہا جاسکتا ہے۔ جمالیاتی گروپ کے نقادوں نے سماجی و معاشی عوامل سے قطع نظر اپنی توجہ جمالیات پر صرف کی جن کا سارا زور متن، صوتی ربط اور لسانی عناصر پر ہوتا ہے۔

رشید احمد صدیقی، اعجاز حسین، یوسف حسین خاں، احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، مسعود حسین خاں، اسلوب احمد انصاری، محمد حسن، ابواللیث صدیقی، خواجہ احمد فاروقی، سردار جعفری، مالک رام، عبادت بریلوی، خورشید الاسلام، مسیح الزماں، دیویندر اسر، وحید اختر، خلیل الرحمٰن اعظمی، اختر اورینوی، محمد عقیل، سیدہ جعفر، وقار عظیم، شمس الرحمٰن فاروقی، سلیمان اطہر جاوید، اطہر پرویز، عابد رضا بیدار، گوپی چند نارنگ، ہنس راج رہبر، انور سعید، اختر

اور طیب انصاری اس دور کے نقادوں میں شامل ہیں۔

مولوی عبدالحق، شیخ چاند، زور، سید سجاد اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے ادیبوں میں تحقیق و تدقیق کا نیا شوق و جذبہ پیدا ہوا۔ جہاں مولوی عبدالحق اور مسعود حسین نے شعبۂ اُردو کی نئی نسل کو تحقیق جیسے خشک اور محنت طلب کام کی طرف راغب کیا وہیں ڈاکٹر زور نے ادارۂ ادبیات اُردو کی مدد سے نئے پرانے ادیبوں کو قدیم ادب کی دریافت پر اُکسایا۔ اسی کی وجہ سے ہمارے قدیم ادب کے شہ پارے دوبارہ منظرِ شہود پر آئے۔ مسعود حسین خاں کی تحقیق نے اس فن کو آبرو بخشی ہے۔

. . . . دکنی لغت کی تیاری مسعود صاحب کا دوسرا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے تحقیقی کام کو دیکھ کر ملک کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں بھی تحقیق کی طرف خاص توجہ دی جارہی ہے۔ چنانچہ بمبئی، علی گڈھ اور دلّی اس وقت دوسرے اہم مراکز ہیں جہاں تیزی سے تحقیقی کام ہورہا ہے۔

اس دور کے ممتاز محققوں میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیرالدین ہاشمی، محمود شیرانی، احتشام حسین، شوکت سبزواری، مسعود حسین خاں، نجیب اشرف ندوی، حفیظ قتیل، مبارز الدین رفعت، عبدالقادر سروری، سید محمد، شیخ چاند، اکبرالدین صدیقی، جاوید وششٹ، گوپی چند، سیدہ جعفر، بدیع حسینی، گیان چند اور خلیق انجم شمار کئے جاتے ہیں۔

صورتِ حال یہ ہے کہ تنقیدی کتابوں کے ناموں کی یکسانیت آج بڑی گمراہ کن ہے۔ بیشتر نقاد تو فہرست سازی، کھتونی اور مردم شماری یا اقتباسات کی نقل کرنے سے آگے نہیں بڑھتے۔ بعض نقاد اہم معاملات میں اچھے یا بُرے کا فیصلہ جھٹ سے صادر کردیتے ہیں تو بعض مدح سرائی، پروپگنڈہ، نکتہ چینی اور تنقیص پر اُتر آتے ہیں۔ تنقید دراصل شخصی اور داخلی آرٹ کا نام ہے۔ تنقید کی قدروقیمت کا انحصار کسی خاص نظریہ یا طریقۂ کار کی اندھی تقلید پر نہیں ہوتا۔ نقاد کے ادراک، بصیرت، سمجھ بوجھ، بالغ نظری، معتدل رائے، متوازی لب ولہجہ، آفاقی اقدار کی پاسداری، منصفانہ نقطۂ نظر، وسعت مطالعہ اور صحتِ ذوق میں تنقید کی معراج پوشیدہ ہوتی ہے۔

بحیثیت مجموعی اُردو تنقید سنجیدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ تنقید نگاری کے آرٹ پر کئی کتابیں لکھی جارہی ہیں۔ تنقیدی مضامین کے سینکڑوں مجموعے منظرِ عام پر آرہے ہیں جن سے اُردو تنقید کے ارتقائی سفر کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۴)

پچھلے پچیس سال میں اُردو جس بحرانی دور سے گذرتی رہی ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے اُردو ادب کی ترقی کی رفتار اور معیار مایوس کن نہیں۔ اُردو کی ترقی و ترویج کیلئے حال ہی میں مرکزی حکومت نے ترقی اُردو بورڈ قائم کیا ہے جو بڑے پیمانے پر معیاری اور مستند کتابیں شائع کررہا ہے۔ اتر پردیش ساہتیہ اکاڈمی ہر سال اُردو کی

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۹ پر)

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

تنقید شعر ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔ ناشر۔ نیشنل بک ڈپو چار کمان حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲
۱۴۴ صفحے مجلد قیمت چار روپے۔

یہ ڈاکٹر جاوید صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان میں ابتدائی تین مضامین (۱) اردو شاعری میں رومانیت (۲) فرانس میں، اشاریت پسند شعراء اور (۳) حلقہ ارباب ذوق ہیں اور بعد کے مضامین ن۔م۔ راشد، مخدوم، فیض، یگانہ، نذر الاسلام نسیم میسوری، سرور ڈنڈا اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری پر تنقیدیں ہیں۔

رومانی شاعری میں نظیر اکبرآبادی کے بعد سے مثالیں پیش کی گئیں ہیں۔ اس کی مثالیں نظیر سے پہلے دکنی شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ اشاریت کی تحریک فرانس سے شروع ہوئی اور اس نے دنیا کے تمام شعراء کو متاثر کیا لیکن اس کو دوام حاصل نہ ہو سکا ڈاکٹر صاحب نے انگریزی اور فرانسیسی کے علاوہ اردو کے اشاریت پسند شعراء کا بھی ذکر کیا۔ حلقۂ ارباب ذوق لاہور میں ادیبوں کی انجمن تھی جس نے کافی نام پایا اور جس میں اردو کے مشہور ادیب شریک تھے، ادب برائے ادب کی تحریک انھیں سے چلی اور ادب برائے زندگی اور ترقی پسند ادب کے رہنماؤں سے ان حضرات نے اختلاف کیا۔ مضمون میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ شعراء پر نہایت تفصیل سے تنقید کی گئی ہے اور ان کے رجحانات کا نہایت صحیح انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ آخری دو مضامین سرور ڈنڈا کی شاعرانہ عظمت اور عبداللہ قطب شاہ کی شاعری پر ہیں۔ ڈنڈا کی شاعری میں سیاسی طنز ضرور ہے اور اس کی خاطر انھوں نے فن شعر سے بھی کہیں کہیں گریز کیا ہے۔ دکنی کے ساتھ عصر حاضر کی زبان مل جاتی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کا سرمایہ شعر بہت کم ہے پورے کلام تک ہماری رسائی نہ ہو سکی جو کچھ بچا ہے وہی ہمارے پیش نظر ہے اس لئے ہمیں اس میں محمد قلی قطب شاہ جیسا تنوع بھی نہیں نظر آتا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ جیسا آزاد تھا عبداللہ قطب شاہ نہیں تھا وہ اپنی والدہ حیات بخشی بیگم کے زیر سرپرستی ہی رہا۔ حیات بخشی بیگم نے عبداللہ قطب شاہ سے صرف تین سال پہلے انتقال کیا۔

بحیثیت مجموعی کتاب کے مضامین نہایت اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں اور امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔

گلستان عظمت حکیم غلام قادر سالک صدیقی۔ مرتب ابو محمد سید علی سرینہ

یہ ۸۰ صفحوں کا غزلوں کا مختصر مجموعہ ہے۔ سالک، صفی اورنگ آبادی مرحوم کے شاگرد ہیں، اور صفی کا

تعلق داغ کے اسکول سے تھا۔ اسی لئے زبان و بیان کی حلاوت کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی مل جاتی ہے۔
ابتداء میں مرتب اور یوسف الدین مرحوم سب ایڈیٹر رہنمائے دکن کا تعارفی مضمون بھی شامل ہے۔

گمنام گوشے | مرتبہ دلکش ساگری۔ ناشر مرکز ادب بھوپال
۱۰۰ صفحہ مجلد خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت 3/00

سرزمین مالوہ میں سرونج ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ جہاں ابھی نئی تہذیب نے اپنے قدم نہیں رکھے اس لئے اس کو شہر کہنا بھی موزوں نہیں جہاں ابھی پانی کے نل کا بھی گذر نہ ہوا ہو اس کو قصبہ ہی کہئے۔ لیکن اردو کے قدم وہاں جمے ہوئے ہیں اور شعر و شاعری کے چرچے ہیں۔ پیش نظر کتاب سولہ شعراء کی غزلوں کا مجموعہ ہے اکثر غزلیں روایتی طرز کی ہیں لیکن شعر چونکا دینے والے بھی ہیں۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ سرونج ادبی نقطہ نظر سے زمانہ سے الگ نہیں جو افتاد سارے ملک پر پڑتی ہے وہ بھی اپنا پرچھاں دیتا ہے۔ چند شعراء کے اشعار پیش ہیں۔

راتوں کا درد یہ کہ اب آنکھوں میں آ گیا	یہ کون میرے جسم کے اندر سما گیا	خالد محمود
دیکھو اس دور نے ہر چیز مجھ سے چھین لی	تم مجھے اپنا سمجھتے ہو میں اپنا بھی نہیں	وقار قاطمی
تراشا حادثوں نے مجھ کو لیکن	میں پتھر سے زیادہ کھردرا ہوں	اسماعیل ذبیح
ہم بنجارے ہم دکھیارے چھاؤں ملی تو آ بیٹھے	ہم پر کیا الزام تراشی ہم سے کیا تکھا بر تاؤ	دلکش ساگری
چاند تاروں پر ہے جن کی دسترس	ان کے دل میں وہ اندھیرا ہے کہ بس	دانش مالوی
ہم نے چاہا تھا چمن کو خود بخود نام دیں	آ گیا بے ساختہ ہونٹوں پہ ویرانے کا نام	طالب عرفانی

پیاسے لفظ | راہی پرتاب گڈھی۔ کچا پل۔ چوبٹیاں۔ لکھنؤ۔ ۹۶ صفحہ۔
مجلد خوبصورت گٹ اپ۔ قیمت 3/=

پیاسے لفظ راہی پرتاب گڈھی کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا مجموعہ ہے ایک منظوم افسانہ قرب عشق بھی ہے ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے شاعر کا تعارف کرایا ہے۔ نظموں اور غزلوں میں پختگی ہے۔ غزلوں میں روایتی انداز ہے۔ شخصی تاثرات زیادہ کارفرما ہیں جس میں درد و اثر موجود ہے۔

حروف | بدیع الزماں خاور۔ ۴۲ A فیملی مال۔ پوسٹ آفس ڈاپولی ضلع رتنا گیری۔ مہاراشٹرا۔
ناشر۔ پی کے پبلیکیشنز دہلی ۶۔ صفحہ ۱۱۲ قیمت: چار روپے پچاس پیسے۔

خاور صاحب کی نظموں کا یہ پہلا مجموعہ ہے اس میں بے قافیہ نظمیں بھی ہیں اور غزل بھی۔ نظموں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خاور صاحب موجودہ دور کے کرب، بے چینی، اضطراب اور بدحالی جو حصول آزادی کے بعد پیدا ہوئی ہے اس سے متاثر ہیں۔ ہندوستان آزاد ہوا لیکن ذہن سے غلامی کی بو نہیں گئی۔ جو واقعات دیکھنے

اور سننے میں آتے ہیں اس سے شاعر متاثر اور مایوس ہے۔ اس کی مایوسی جگہ جگہ جھلکتی ہے۔ خواہ نظم ہو یا غزلیں وہ اپنے ماحول کے حالات پر نظر رکھے ہوئے اور انہیں تجربات کو حروف کی شکل میں ڈھالتا جاتا ہے۔ لیکن مستقبل تاریکی میں ہے۔ غزل کے دو شعر ہیں ؎

پہنچ رہی ہے جہاں تک نگاہ سڑکوں پر　　نہ کوئی پیڑ نہ سایہ دکھائی دیتا ہے۔

ریل کی پٹڑی پہ سو جاتے ہیں لوگ　　کتنی آساں خودکشی ہے شہر میں

روشنی کے غم میں اپنا چور تھا　　عمر بھر میں بجلیاں پیتا رہا

مطالعہ کے دوران ایسے اشعار اور بھی ملیں گے۔ یہ صورت حال صرف خاور صاحب ہی ظاہر نہیں کرتے بلکہ ہمارے ہر شاعر کے سینے سے ایسی چنگاریاں نکلتی دکھائی دیں گی۔ زمانہ کی سختیوں نے انسان کو اتنا مجبور کر دیا ہے کہ آہوں کی نکاسی کے بغیر چارہ نہیں۔

والٹ وھٹ مین کی ۲۱ نظمیں

عبدالرؤف لکچرار یونیورسٹی۔ ناشر پبلشر لائبریری کلکتہ ۲۷
۷۰ صفحے۔ قیمت ایک روپیہ۔

والٹ وھٹ مین امریکہ کا بہت بڑا شاعر ہے۔ وہ بھی غالب کی طرح مستقبل کا شاعر بنا رہا اور غالب کے بقول "شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن" کہتا رہا۔ انتہائی سخت حالات میں اپنا بچپن اور جوانی گذاری۔ اخبار بیچے، اخبار نکالے، ایڈیٹریاں کیں شعر کہتا رہا اور شاعری میں عظمت انسان کے گیت گاتا رہا۔ اس کی نظموں کا رجائی انداز مقبولیت کے آڑے آتا رہا لیکن ایک وقت آیا کہ انسان کی عظمت کے ساتھ اس کی عظمت بھی تسلیم کر لی گئی۔ اس کا اظہار گنجلک اور مغلق ہے اور کہیں کہیں دور از کار خیالات بھی ہیں۔ جناب عبدالرؤف نے اس کی ۲۱ نظموں کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ سلیس، قریب الفہم اور اردو کے مزاج سے مطابقت رکھتا ہے۔ والٹ وہٹ مین سے غیر انگریزی داں طبقہ واقف نہیں۔ اس لئے جناب عبدالرؤف صاحب کا ممنون ہونا چاہیئے کہ انھوں نے اس کی نظموں کا کامیاب ترجمہ پیش کیا ہے۔

رنگ صہبا

ابوالخیر صہبا۔ ناشر ادبی مرکز نظام آباد۔ ۱۱۴ صفحے خوبصورت گٹ اپ
قیمت دو روپے۔

یہ صہبا صاحب کی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے۔ صہبا صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کے قدیم طلبا میں نمایاں مقام کے حامل ہیں یونیورسٹی سے نکل کر عملی دنیا میں قدم رکھا لیکن شعر و ادب کا مذاق جو انھیں ماحول نے لگا لیا تھا وہ ان سے علیحدہ نہ ہوا اور برابر شعر کہتے رہے اس سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے کیف صہبا اور جام صہبا چھپ چکے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ رباعیات اور قطعات کا ہے۔ غزل گوئی میں صہبا جس قدر پختہ کار نظر آتے ہیں

رباعی کہنے میں بھی مشاق نظر آتے ہیں۔ ایک رباعی پیش ہے ؎

شبنم بھی یہاں زار و نزار آتی ہے
ہر صبح صبا گل کو پکار آتی ہے
دامن کے ہر اک تار سے آتی ہے صدا
ہشیار! کہ اب فصل بہار آتی ہے

اس تشبیہ کو پڑھیئے ؎

آنکھوں کو نہ کیوں نرگس شہلا کہیئے
رخسار کو اوراق مطلا کہیئے
وہ کیا ہیں قصیدہ ہیں رباعی ہیں غزل
صہبا انھیں اردوئے معلیٰ کہیئے

ایسے ابھرتے اور نادر خیال اور بھی رباعیوں اور قطعات میں ملیں گے۔ مطالعہ شرط ہے۔

شہر سے دور

اختر بستوی۔ ناشر مکتبہ دین و ادب لکھنو۔
۱۶۰ صفحے مجلد قیمت چار روپے۔

شہر سے دور۔ شکسپیر کے ڈرامے As you Like it کا ترجمہ ہے۔ شکسپیر کے ڈراموں کو کہانیوں کی شکل میں بھی لکھا گیا اور انگریزی سے دیگر زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ اردو میں بھی چارلس اور میری لیمب کی کہانیوں کا ترجمہ کیا گیا اور ڈراموں کے بھی متعدد مترجمین نے مختلف ناموں سے ترجمے کئے اور بہتوں کو اسٹیج کرنے کی خاطر بھی لکھا گیا۔ ان میں بعض تراجم ایسے تھے جو مترجمین کے مقاصد کی تکمیل کرتے تھے اور بعض جو محض ادبی نقطۂ نظر سے لکھے گئے۔ ان میں مفہوم کو ادا کر دینے کی کوشش کی گئی۔

پیش نظر ترجمہ اختر بستوی صاحب نے لفظی کیا ہے اور نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں۔ پہلے تو انگریزی مزاج کو اردو کے قالب میں ڈھالنا مشکل ہے۔ پھر نظم کو نظم میں پیش کرنا اور زیادہ دقت طلب ہے لیکن اختر صاحب نے ایسا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شکسپیر کے اکثر ڈرامے ہمارے نصاب تعلیم کا جز ہیں اگر یہ ڈرامہ بھی کسی نصاب کا جز ہے تو طلبا سے ہم اس کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔ یوں تو کلاسیکل ادب میں شکسپیر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس لئے اس کے ادب کا مطالعہ خواہ کسی زبان میں ہو ضروری ہے۔ اختر بستوی صاحب نے As you Like it کو As it is پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۶ شمارہ (۴)

اپریل ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

نگراں

سید علی اکبر ایم اے (کینٹاب)

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم	مہتمم
وقار خلیل	محمد جمال الدین

زر سالانہ: آٹھ روپے — غیر ممالک سے پندرہ روپے

زر ششماہی: تین روپے — فی پرچہ: پچھتر پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۷ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن ۵..... سے شائع ہوا

ترتیب

اپنی بات

گذشتہ شمارہ احتشام نمبر کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ اگرچہ اس شمارہ کی خصوصیت صرف یہ رہی کہ اس میں احتشام صاحب سے متعلق مضامین شریک تھے لیکن ہم حجم میں اضافہ سے معذور رہے۔ اس لئے شمارہ اظہار عقیدت سے زیادہ نہ تھا۔

گذشتہ دو سال سے اُردو فاضل کا امتحان دینے والے امیدواروں کی کمی کے باعث یہ امتحان نہ ہو سکا لیکن اس دفعہ ۱۱ رمئی کو جو امتحان ہوگا۔ اس میں مختلف مراکز سے اردو فاضل کے طلبا کے زیادہ تعداد میں شرکت کرنے کی خواہش کا اظہار ہو رہا ہے۔ اس لئے یہ امتحان ۱۱ رمئی کو منعقد ہوگا۔ چونکہ اس کے سات پرچے ہیں اس لئے ۱۸ رمئی تک جاری رہے گا۔ اُردو دانی' اردو زبان دانی' اور اردو عالم کے امتحانات حسب سابق ہوں گے۔ مرکز کے معتمد صاحبان سے درخواست ہے کہ فارموں کی خانہ پری احتیاط کے ساتھ کروائیں اور بعد تنقیح ارسال فرمائیں نامکمل یا ناقص ہونے کی صورت میں فارموں کی واپسی اور بعد تکمیل دوبارہ ارسال کافی تاخیر کا باعث بنے گا اور ادارہ کو انتظامی دشواریاں لاحق ہوں گی۔ اُمید ہے کہ اس کا لحاظ رکھا جائے گا۔

ہماری زبان کے تازہ شمارہ میں شیخ محمد اکرام ایم' اے - ایم' آر' سی' اے' آئی' سی' ایس کے انتقال کی خبر شایع ہوئی ہے' وہ جنوری کے آخر یا شروع فروری میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر بجنوری اور مولوی مہیش پرشاد کے بعد امتیاز علی عرشی اور مالک رام کے ساتھ غلام رسول مہر اور شیخ محمد اکرام ماہرین غالبیات میں گنے جاتے تھے۔ مہر صاحب گذشتہ سال رخصت ہوئے اور شیخ صاحب نے بھی داغ مفارقت دیا۔ شیخ صاحب آئی' سی' ایس جیسے عہدہ دار ہونے کے باوجود علمی کاموں میں ہمیشہ مصروف رہے اور غالب نامہ یا آثار غالب کے بعد ان کی گراں قدر کتابیں آب کوثر ، موج کوثر ...... پھر چشمہ کوثر اور رود کوثر شایع ہوئیں۔ شبلی نامہ بھی ان کی ایک گراں قدر تصنیف ہے۔ اُردو کی محفل سے جو اٹھتا ہے اس کا کوئی بدل نہیں ملتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُردو اپنے ان جواہرات کو کھونے کے بعد مفلس ہو جائے گی۔

ادارہ کے ایک قدیم معاون جناب سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ) نے ۱۳ رمارچ کو رحلت کی۔ وہ ملک کے ایک مشہور ماہر تعلیم تھے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

ڈاکٹر نظام الدین ایس گوریکر

امیر خسرو دہلوی کی فارسی خدمات

یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اہل ہند و ایران ہم نژاد ہیں اور ان کی قدیم زبانیں ویدک اور اوستا ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی ہیں۔ جدید فارسی کا رواج ہندوستان میں اشاعت اسلام کے بعد اور بالخصوص دور غزنویہ میں ہوا ہے۔ یہ زبان فارسی تقریباً آٹھ سو سال تک ہندوستان میں برا جمان رہی اور اس عرصہ میں وہ نہ صرف دفتری اور سرکاری بلکہ ادبی اور ثقافتی زبان بھی رہی اور بالفعل مسعود سعد سلمان اور ابوالفرج رونی کی شاعری حکومت غزنی کی ادبی صحبتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ اور خواجہ نظام الدین اولیا اور امیر خسرو دہلوی کا کلام سلطنت دہلی کی تہذیبی زندگی کی آئینہ داری۔ اس خصوص میں یہ کہنا غیر ازضروری نہ ہوگا کہ امیر خسرو اپنے عہد کے اساتذۂ ایران کے معاصر ہونے کے باوجود ہند و ایران کے مابین ثقافتی سفیر کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کی تالیفات ایک طرف ہند و ایران کے تعلقات کو استوار اور مستحکم کرنے کا ذریعہ ہیں تو دوسری جانب ان کی تخلیقات قوم و ملک کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلانے کا وسیلہ۔

مولانا شبلی نعمانی اپنی تصنیف شعر العجم میں امیر خسرو کی جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں۔ لیکن ان کی حد حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھی۔ فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکے، سعدی قصیدہ کو ہاتھ نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتے، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع بدائع کا تو شمار نہیں۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو اس خصوصیت میں کسی کو ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا۔ فردوسی کے اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے۔ صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ کہا ہے۔ لیکن امیر خسرو کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں"

ابوالحسن یمین الدین خسرو معروف بہ امیر خسرو ۶۵۱ھ ہجری میں پٹیالی ضلع ایٹہ (آگرہ) میں پیدا ہوئے باپ کی طرف سے ترک اور ماں کی جانب سے ہندوستانی تھے اور ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے تھے۔ تینوں بھائیوں میں خسرو سب سے زیادہ ذہین و فطین اور ہونہار تھے بلکہ بچپن ہی سے غیر معمولی قابلیت و صلاحیت کا ثبوت دینے لگے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جب خسرو پیدا ہوئے تو ان کے والد بزرگوار امیر سیف الدین محمود جو

سلطان شمس الدین التمش فرمانروائے دہلی کے مقربین و ندماء میں سے تھے، بچہ کو ایک خرقہ میں لپیٹ ایک صوفی منش بزرگ کے پاس لے گئے۔ بچہ کو دیکھتے ہی بزرگ نے فرمایا۔ قیامت تک اس کا نام رہیگا اور خاقانی سے دو قدم آگے بڑھ جائیگا۔

امیر خسرو اگرچہ ہندوستانی نژاد تھے تاہم شعرائے ایران بھی ان کی زباندانی اور شعر و شاعری کے معترف تھے۔ مولانا جامی اپنی تالیف بہارستان میں رقم طراز ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ عرفی شیرازی خسرو کو طوطیٔ ہند کے نام سے یاد کرتے ہیں ؎

به روح خسرو از این پارسی شکر دادم | که کام طوطی هندوستان شود شیرین

اسی طرح حافظ شیرازی بھی ان کی شیرین کلامی کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

شکر شکن شوند همه طوطیان هند | زین قند پارسی که به بنگاله می رود

خسرو زمانہ طفولیت ہی سے شعر موزوں کر لیتے تھے۔ کیونکہ شاعری کا مادہ ان میں ازلی تھا۔ بقول خسرو جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد ماجد نے انھیں مکتب میں بٹھایا اور خوشنویسی کی مشق کیلئے قاضی اسدالدین خطاط کے سپرد کیا۔ خسرو کو خطاطی سے زیادہ شاعری کی دھن تھی۔ ان کی طبیعت کی روانی اور شاعری کا ملکہ دیکھکر قاضی اسدالدین خسرو کو اپنے ہمراہ خواجہ عزالدین کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ میرا شاگرد ہے۔ شاعری میں بلند پروازی کرتا ہے۔ اس کا امتحان لیجئے۔ خواجہ صاحب اپنے زمانے کی یگانۂ روزگار علمی شخصیت تھے۔ انہوں نے پہلے خسرو سے پڑھنے کیلئے کہا۔ خسرو نے خواجہ صاحب سے بیاض لی اور اس میں سے چند شعر خوش الحانی سے پڑھے خواجہ صاحب بہت متاثر ہوئے اور بعد میں کہا کہ مو، بیضہ، تیر اور خربزہ ان چار بے جوڑ چیزوں کو موزوں کرو۔ خسرو نے برجستہ کہا ؎

هر موئی که در دو زلف آن صنم است | صد بیضهٔ عنبرین بران موی ضم است
چون تیر مدان راست دلش را زیرا | چون خربزه دندانش میان شکم است

خواجہ صاحب خسرو کی رباعی سن کر از حد متحیر ہوئے اور خوب تعریف کی گلے لگایا اور کہا کہ تمہارا تخلص سلطانی ہونا چاہیئے۔ یہ تخلص تمہارے لئے فال نیک ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ پہلے دیوان تحفۃ الصغر کی اکثر غزلوں میں یہی تخلص ہے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ خسرو نے رسمی طور پر شاعری میں کسی کی شاگردی قبول نہیں کی کیونکہ یہ انھیں گوارا نہ تھا کہ وہ استادی شاگردی کے سلسلہ میں پابند ہو کر اپنے ذوق اور رجحان پر پابندیاں عاید کریں۔ انھوں نے فن شعر میں کمال حاصل کرنے کے لئے مشہور اساتذہ کا کلام پڑھا

حتیٰ کہ خود شعر بھی کہنے لگے۔ خسرو کے الفاظ میں "جو دیوان بھی مجھے مل سکا میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اس کی نقل بھی اپنے کلام میں ضرور کی" دوسرے لفظوں میں خسرو کسی استاد کی بجائے استاذہ کے دیوان کو سامنے رکھکر ان کا تتبع کرتے تھے اور ایک عرصہ تک بطور خود کہتے رہے۔ جس استاد کے کلام کا مطالعہ کرتے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے۔ لیکن آخر میں اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے۔ اس ضمن میں خسرو نے اپنی آخری مثنوی ہشت بہشت کے خاتمہ میں صراحت کی ہے کہ خمسہ تین سال کی مدت میں لکھا گیا اور اس زمانے کے ایک عالم و فاضل قاضی شہاب الدین نے ان کا مطالعہ کرکے تصحیح کی ہے۔ بقول خود ؎

یارب او چوں ز پنج نامۂ من　　برد بیرون خطائی خامۂ من
نامۂ او کہ حرز جانش باد　　در قیامت خط امانش باد

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خسرو نرے مقلد نہ تھے۔ جہاں ان کو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں استاد کی رائے کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ مگر ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے ؎

عیب آن بر من است نہ بروی

معاصر اساتذہ کے علاوہ خسرو نے قدیم استادوں سے بھی فیض حاصل کیا ہے۔ ان کے کلام کو سامنے رکھکر خسرو شعر کہتے تھے اور اس طرح فائدہ اٹھاتے جس طرح کوئی شاگرد زندہ استاد سے سیکھتا ہے۔ خسرو اپنی لیلیٰ مجنون میں خدائے سخن نظامی گنجوی کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں ؎

زندہ است بہ معنی استادم　　ور نیست منش حیات دادم

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں خسرو لکھتے ہیں کہ میں نظامی کا نہ صرف پیرو بلکہ شاگرد ہوں ؎

نظم نظامی بہ لطافت چو در　　وز در او سر بسر آفاق پر
پختہ از و شد چو معانی تمام　　خام بود پختن سودای خام
بگذر از این خانہ کہ جای تو نیست　　وین رہ باریک بہ پای تو نیست
کالبدی داری و جان اندر سفت　　ہر چہ تو دانی بہ ازان اندر است
تا بود این سکہ بہ عالم دولت　　بر تن تو کی بود این شقہ چیست
مثنوی او راست ثنائی بگوی　　بشنوش از دور و دعای بگوی

این ہمہ زانصاف نگر زور نیست
گر تو نہ بینی دگر کور نیست

اسی طرح شیخ سعدیؔ شیرازی سے استفادہ کرنے کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

خسروؔ سرمست اندر ساغر معنی بریخت　　　شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بود

اس ضمن میں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سعدی شیرازی بھی خسروؔ کا احترام کرتے تھے ا
اُن کی شاعری کے قدر دان تھے۔ شہزادہ محمد نے دو مرتبہ دعوت دی لیکن سعدی بڑھاپے کا عذر
کرکے ہندوستان نہیں آئے تاہم انھوں نے خسروؔ کے بارے میں اسی خط میں لکھا کہ در ہند خسرو کبس ا
تحفۃ الصغر میں انوریؔ کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

خہ کہ در عہد تو سلطان سخن　　　خسروؔ لاچین سلطانی شدہ است
تا کشد گردوں بہ چشم انوریؔ　　　خاکِ من کحل سپاہانی شدہ است

علیٰ ھذا ایک قصیدہ میں خاقانیؔ سے استمداد کرتے ہیں ؎

خاقانیؔ از ان خاک بر آید بہ صد زبان　　　انصاف این قصیدہ خسرہ بر آورد

بہرکیف خسروؔ نے کبھی بھی اُستادوں کی استادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام اساتذہ کا احترام
کرتے تھے۔ الغرض خسروؔ اپنے کلام کے بارے میں فرماتے کہ میں سرقہ نہیں کرتا اور نہ ہی میرا کلام صوفیوں اور
واعظوں کے انداز پر ہے۔ تاہم ان کی غزلیں سوز و گداز اور والہانہ محبت کا پیکر ہیں اور ان کی مثنویاں فطرت
نگاری اور منظر کشی کا مرقع ان کے قصیدے پُرشکوہ الفاظ اور نازک خیالی کا مخزن ہیں اور ان کے مرثیے
درد و الم اور غم و اندوہ کا البم۔ اس ضمن میں خسروؔ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ غزل میں سعدیؔ شیرازیؔ
مثنوی میں گنجویؔ قصیدہ میں خاقانیؔ شیروانی اور مواعظ و حکمت میں حکیم سنائیؔ جیسے اُستاد شعرائے قدیم کے
مقلد و پیرو ہیں۔

خسروؔ نے اپنی بہتر سالہ زندگی میں ہندوستان کے سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا ہے اور
بالفعل اپنے معاصرین میں انھیں ایک خاص حیثیت اور مرتبہ حاصل تھا۔ ایک طرف خسروؔ دربار شاہی سے متعلق تھے
تو دوسری طرف خواجہ نظام الدین اولیا کے معتقد تھے۔ امارت اور ولایت کے غیر معمولی امتیاز کے باوجود خسروؔ کے
کلام کی مسلمہ خوبیوں نے اُن کے کلام کے بیشتر اور قابل قدر حصے کو زمانے کی دستبرد سے بچالیا۔ خسروؔ نے اپنے کلام کے
بہت بڑے حصے کو اپنی زندگی ہی میں ترتیب کرلیا تھا اور اپنی تالیفات کے دیباچوں میں اشعار کی تعداد، سن
تصنیف، موقع ترتیب و تدوین جیسی بہت قیمتی معلومات بہم پہنچائی ہیں اور اس طرح یقینی طور پر کہا جاسکتا
ہے کہ نظم میں پانچ دیوان، نو مثنویاں اور غزلیات کے متفرق مجموعے موجود ہیں۔ نثر میں اعجاز خسروی، خزائن الفتوح
اور افضل الفوائد قابل قدر تصانیف ہیں۔

خسرو کے پہلے دیوان میں جوانی کا کلام شامل ہے جو انھوں نے ۶۷۱ ہجری میں مرتب کیا اور جو تحفتہ الصغر کے نام سے موسوم ہے۔ اس میں تقریباً وہی کلام ہے جو انھوں نے سولہ سال سے انیس سال کی عمر تک لکھا ہے۔ آغاز جوانی میں خسرو نے خاقانی انوری اور سنائی جیسے مسلم الثبوت اساتذہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی مگر انھیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ دیباچہ میں خسرو نے اپنی ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ ہر ایک قصیدہ کے شروع میں شعر ہے جو قصیدہ کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔ ان تمام شعروں کو جمع کرنے سے ایک قصیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ خسرو کی ایجاد ہے قصائد زیادہ تر سلطان غیاث الدین بلبن اور اس کے بڑے بیٹے سلطان نصیر الدین کی مدح میں ہیں۔ ایک ترکیب بند میں خسرو نے اپنے نانا عماد الملک کا مرثیہ لکھا ہے جو سلطان غیاث الدین بلبن کے مقربین میں سے تھے۔ اس دیوان میں خسرو اپنا تخلص سلطانی کرتے ہیں۔

دوسرا دیوان وسط الحیات ہے جو خسرو نے ۶۸۴ ہجری میں ترتیب دیا۔ اس میں بیس سے چوبیس اور تیس سے تینتیس سال کی عمر کا کلام ملتا ہے۔ اس میں خسرو اپنی زندگی کے بعض اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہیں اور دیگر تین دیوان مرتب کرنے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ قصائد زیادہ تر سلطان نصرت الدین محمد شہید (۶۸۳ ہجری) کی مدح میں ہیں اور ایک ان کا مرثیہ ہے۔ تاریخی اور فنی اعتبار سے وسط الحیات کے قصائد زیادہ دلچسپ ہیں۔ اکثر قصیدوں میں خاقانی شروانی کی پیروی کی گئی ہے۔ کمال اصفہانی کے انداز کو بھی اپنانے کی کوشش کی ہے۔ غرۃ الکمال خسرو کا تیسرا دیوان ہے جو انھوں نے ۶۹۳ ہجری میں تمام کیا۔ اس میں چونتیس برس سے بینتالیس سال کی عمر تک کا کلام ملتا ہے۔ اس کے مقدمہ میں خسرو نے ہندوستان کی فارسی شاعری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور عربی شاعری پر اس کی فوقیت کو واضح کیا ہے۔ یہ دیوان سب سے بڑا ہے۔ اس میں زیادہ تر قدیم اُستادوں کی پیروی کی گئی ہے۔ خسرو کے مشہور قصیدے جنات النجات، مرأت الصفا اور دریائے ابرار اسی دیوان میں موجود ہیں قصیدوں کے علاوہ اس میں ترجیع بند اور قطعے ہیں۔

خسرو کا چوتھا دیوان "بقیہ نقیہ" ہے اسکو ۷۱۶ ہجری میں تالیف کیا۔ اس میں زیادہ تر بڑھاپے کا کلام ہے اور اس کے قصائد بھی پرانے اُستادوں کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ایک مرثیہ سلطان علاؤالدین خلجی کا بھی ہے۔

نہایت الکمال خسرو کا پانچواں دیوان ہے جو انھوں نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور سلطان محمدؒ تغلق کی تخت نشینی کے بعد اور ان کے انتقال سے کچھ پہلے تالیف کیا ہے۔ یہ دیوان نادر ہے۔ اس میں غزلوں کے علاوہ۔ قطب الدین مبارک خلجی کا مرثیہ اور اس کے ولی عہد کی

درج ہے۔ چند قصائد میں تصوف اور حقائق و معارف کے مسائل بیان کئے ہیں۔ یہ خسرو کی زندگی کے آخر دنوں کا کلام ہے۔

خسرو نے قران السعدین کے نام سے ایک تاریخی مثنوی چھ مہینے کی کاوش اور دماغ سوز کے بعد ۶۸۸ ہجری میں مکمل کی ؎

ساختہ گشت از روش خامہ　　از پس شش ماہ چنین نامہ

در رمضان شد بہ سعادت تمام　　یافت قران السعدین نام

آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت　　بود سن ششصد و ہشتاد و ہشت

اس ضمن میں یہ لکھنا خالی از بحث نہ ہوگا کہ خسرو نے اس مثنوی سے قبل باپ بیٹے کے اتحاد و مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

زہی ملک خوش چوں دو سلطان یکی شد　　زہی عہد خوش چو دو پیمان یکی شد

پسر بادشاہی پدر نیز سلطان　　کنوں ملک بین چوں دو سلطان یکی شد

اس میں شہزادہ کیقباد اور سلطان بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا حال تفصیل سے درج ہے۔ یہ ان کی پہلی مستقل تصنیف ہے جو خسرو نے اپنی عمر کے ۳۳ویں سال میں تصنیف کی خسرو کی جدت پسند طبیعت نے اس میں نہ صرف سرخیات کا عنوان شعر میں دیا ہے بلکہ مثنوی کی یکسانیت دور کرنے کی غرض سے غزلوں کا اضافہ کیا ہے جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے یہ مثنوی اتنی اہم نہیں ہے تاہم اس میں بہت سی دلچسپ اور اہم باتیں ملتی ہیں۔ اگرچہ اس میں تکلف اور آورد بہت ہے تاہم یہ برجستہ اور رواں ہے۔ اس میں نظم اور لطائف کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں سب ملحوظ رکھی گئی ہیں۔ سچ ہے کہ اگر کوئی اس واقعہ کو نثر میں لکھتا تو اس سے بڑھکر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خسرو نے سلطان جلال الدین فیروز خلجی کی فتوحات کے ذکر پر مبنی ایک تاریخی مثنوی بنام مفتاح الفتوح ۶۹۰ ہجری میں تالیف کی۔ اس مختصر مثنوی کی زبان بہت ہی سادہ ہے اور واقعات کو بلا مبالغہ اور بغیر حشو و زوائد کے پیش کیا ہے۔ قران السعدین کی طرح اس میں بھی ابیات سلسلہ موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ لکھنا نامناسب نہ ہوگا کہ سلطان جلال الدین خلجی خسرو کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور معقول مشاہرہ مقرر کر کے انھیں خلعت خاص عنایت کیا تھا۔ تخت نشینی کے بعد ندیم خاص اور مصحف داری و امارت کا عہدہ عطا کیا۔ اس وقت سے خسرو امیر خسرو کے نام سے پکارے جانے لگے۔

عشقیہ کے نام سے ایک تاریخی مثنوی خسرو نے ۷۱۵ھ ہجری میں تکمیل کی یہ مثنوی گجرات کے راجہ کی صاحبزادی دیول رانی اور سلطان علاؤالدین کے بیٹے خضر خاں کے معاشقہ سے متعلق ہے۔ یہ مثنوی منشور شاہی کے نام سے بھی یاد کی جاتی ہے۔

خسرو نے نہ سپہر کو ۷۱۸ھ ہجری میں مکمل کیا۔ یہ مثنوی نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ معاشرتی اعتبار سے بھی ایک خاص اہمیت کی حامل ہے اس میں نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے۔ اسی مناسبت سے اس کا نام نہ سپہر رکھا ہے۔ مختلف بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال خسرو کی جدت ہے۔ ایک باب ہندوستان سے متعلق ہے۔ جس میں خسرو نے ہندوستان کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کیا ہے اور ہندوستان کی برتری اور فوقیت کو اس طرح ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں علم و فن نے تمام ملکوں سے زیادہ وسعت حاصل کرلی ہے۔ ہندوستان میں دنیا کے مختلف حصوں سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے ہیں، ہندوستان کے لوگ دنیا کی ہر زبان پر عبور حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ہندوستان نے اور ملکوں کے مقابلے میں فن موسیقی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے۔ ہندوستان کی ایجادوں میں شطرنج اور صفر بھی ہیں، ہندوستان میں وید جیسی قابل قدر تصنیف ملتی ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور سنگیت کا مرقع ہے، ہندوستان کی تالیف پنچ تنترہ ہے۔ جس کا ترجمہ عربی، فارسی اور ترکی زبان کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ہوا ہے اور ہندوستان ہی میں خسرو جیسے سحر البیان اور جادو قلم پیدا ہوئے ہیں۔ سلطان قطب الدین مبارک نے اس مثنوی کی تکمیل پر ہاتھی کے ہم وزن روپئے انعام دیئے جس کے بارے میں خسرو کہتے ہیں ؎

چو میراث شد پیل زر دادنم | نہ زیبا ست زین سہل تر دادنم
شہا گنج بخشا کرم گسترا | معانی شناسا سخن داورا
چنیں بخششی کز تو جسم یافتم | در ایام پیشینہ کم یافتم

تاریخی مثنویوں کے سلسلہ کی آخری مثنوی تغلق نامہ ہے۔ جس کو خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے ترتیب دیا۔ اس میں سلطان غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات کا ذکر درج ہے۔ یہ مثنوی تاریخی لحاظ سے بہت اہم ہے کیونکہ اس میں بعض ایسی باتیں ملتی ہیں جو کسی بھی تاریخ میں درج نہیں ہیں۔ دراصل تغلق نامہ۔ تغلق دور کی مفصل تاریخ ہے۔

خسرو کی ہمہ گیر طبیعت نے خدائے سخن نظامی گنجوی کے خمسہ کا جواب لکھا جو خمسۂ خسرو کے نام سے موسوم ہے اور جو انھوں نے ۶۹۸ھ میں تالیف کیا اور بقول خسرو ان پانچوں مثنویوں یعنی خمسہ کی تالیف کا زمانہ کل سوا دو برس ہے جو دراصل خسرو کی قادر الکامی اور پرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اور خمسۂ خسرو کے متعلق جامی کے الفاظ میں خمسۂ نظامی را بہ از وی کسی درجواب نگفتہ۔

خمسۂ خسرو کے سلسلہ کی پہلی مثنوی مطلع الانوار ہے۔ یہ نظامی کے مخزن الاسرار کا جواب ہے۔ اس مثنوی کو صرف دو ہفتے میں لکھا ہے۔ اُن کی دوسری مثنوی شیریں و خسرو ہے۔ جو نظامی کے خسرو شیریں کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۶۹۸ھ ہجری ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انھوں نے اپنے صاحب زادے سعود سے خطاب کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی۔ میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے ؎

شب تا سحر و ز صبح تا شام   در گوشۂ غم نگیرم آرام

اگرچہ خسرو نے اس مثنوی میں ہر قسم کی شاعری کے مواقع پیدا کئے اور کمال دکھلایا ہے تاہم نظامی کے سامنے خاکساری سے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے ؎

می داد چو نظم نامہ را ہیچ   یا تی نگذاشت بہر ما ہیچ

مجنون و لیلیٰ تیسری مثنوی ہے جو نظامی کی لیلیٰ مجنون کے نمونہ پر لکھی گئی ہے اور اسے ۶۹۹ھ ہجری میں لکھا۔ اس مثنوی کا سب سے پُر اثر حصہ وہ اشعار ہیں جس میں خسرو نے اپنی ماں اور بھائی کی وفات کا ماتم کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو ؎

امسال دو نور ز محترم رفت   ہم مادرم و ہم برادرم رفت

اس سلسلہ کی چوتھی مثنوی آئینہ سکندری ہے جو نظامی کے سکندر نامہ کا جواب ہے اور اسے بھی ۶۹۹ھ ہجری میں لکھا اس میں خسرو نظامی کے دوش بدوش ہیں۔ آخری مثنوی اس سلسلہ کی ہشت بہشت ہے۔ جو نظامی کی ہفت پیکر کے طرز پر تالیف کی گئی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۷۰۱ھ ہجری ہے ہشت بہشت میں بہرام کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ خسرو کی شاعری اس مثنوی میں پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے۔ یہ تمام مثنویاں علاء الدین محمد شاہ کے نام سے معنون کی گئی ہیں۔

خسرو کی طبیعت کی جولانی کسی بھی صنف سخن میں کم نہیں، مثنوی، قصیدہ، غزل، رباعی سب میں منفرد و یگانہ ہیں۔ ان کی فکر رسا نے اقسام شاعری میں وہ جوہر دکھائے ہیں کہ جن کا مقابلہ آج تک کوئی نہ کرسکا۔ نثر نگاری میں بھی ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ اعجاز خسروی وہ نثری کارنامہ ہے جس میں خسرو نے زبان و بیان کے اصول منضبط کئے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے بھی نثر نگاری کے اصول و قواعد مرتب نہیں کئے تھے۔ یہ تین جلدوں میں ہے اور اس کا سن تالیف

۷۱۹ھ ہجری ہے۔ خزائن الفتوح جو تاریخ علائی کے نام سے بھی موسوم ہے خسرو نے ۷۱۱ھ ہجری میں تالیف کی اس میں سلطان علاء الدین کی فتوحات کا ذکر مندرج ہے۔ یہ تاریخی اعتبار سے بھی بڑی اہم ہے۔ سلطان علاء الدین نے خسرو کے لیئے ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ افضل الفوائد میں خسرو نے اپنے پیر و مرشد خواجہ نظام الدین اولیاء کے ملفوظات درج کئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ کو خسرو نے اپنے مرشد کی خدمت میں ۷۱۹ھ ہجری میں پیش کیا تھا جو انھوں نے بہت پسند کیا۔ اس ضمن میں اس امر کا انکشاف نا مناسب ہوگا کہ خسرو کی عقیدت و ارادت خواجہ نظام الدین اولیاء سے عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی اور خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا تو خسرو کو پیش کرونگا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب لبِ دریا ایک کوٹھے پر بیٹھکر ہندوؤں کی پوجا و اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے کہ فرمایا ؎

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی

خواجہ صاحب کی ٹوپی ٹیڑھی تھی۔ خسرو نے اس کی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا ع

من قبلہ راست کردم بر طرف کج کلاہی

خواجہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں خسرو کو دفن کراتا۔ بہر کیف، انھوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں میری قبر کے پہلو میں دفن کیا جائے خواجہ صاحب کی رحلت کے چھ مہینے بعد ہی ذی القعدہ ۷۲۵ھ ہجری میں خسرو نے انتقال کیا اور خواجہ صاحب کے پائنتی دفن کیا گیا۔ خواجہ صاحب کو بھی خسرو سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ جس کا اظہار ذیل کے شعروں سے ہوتا ہے ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست   ملکیست کہ ملک سخن آن خسرو راست

آن خسرو ماست نام خسرو نیست   زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

مہدی خواجہ جو شہنشاہ بابر کے امرا میں تھے۔ انھوں نے انکا مقبرہ تعمیر کرایا اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ لکھکر لوحِ قبر پر کندہ کرائی ؎

شد "عدیم المثال" یک تاریخ او   واں دگر شد "طوطی شکر مقال"

۷۲۵ھ   ۷۲۵ھ

تقی اوحدی اپنی عرفات العارفین میں لکھتے ہیں کہ خسرو نے جس قدر فارسی میں لکھا ہے۔ اسی قدر بھاشا میں بھی ہے لیکن اسکا کہیں نام و نشان نہیں ...... اگرچہ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ

جزوی از نظم ہندی نیز نذر دوستان کردہ ام

خسرو ترکی اور فارسی میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور عربی میں ادبائے عرب کے ہم پلہ ہیں۔ یہ ایک

حقیقت یہ ہے کہ انہیں عربی علم و ادب میں عبور حاصل تھا تاہم انھوں نے دعویٰ نہیں کیا سنسکرت میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ نہ سپہر میں سنسکرت دانی کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

من قدر بر سر ایں کار شدم

موسیقی میں بھی کمال پیدا کیا تھا اور نایک کے خطاب سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے کئی ایک راگ ایجاد کئے تھے۔ شعر و موسیقی میں ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں ؎

یا سخن گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم

سیرالاولیاء کے مؤلف امیر خورد لکھتے ہیں کہ خسرو نے ننانوے کتابیں تالیف کی ہیں اور جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ خسرو نے بیانوے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

الحاصل خسرو کی تالیفات کا مطالعہ ہندوستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی وہ تصویر پیش کرتا ہے۔ جس میں ملک کی ملی جلی تہذیب و تمدن کے نقوش نظر آتے ہیں بالفاظ دیگر خسرو کی تصانیف ان کے اپنے عہد کی نہ صرف آئینہ دار ہیں بلکہ ان کے عہد کے ہندوستان کے مزاج و ذہنیت کی عکاسی کرتی ہیں۔ خسرو کی ذات ہندوستان کے لئے قران السعدین تھی۔ جس میں دو ثقافتوں، دو تہذیبوں اور دو معاشرتوں کا سنگم نظر آتا ہے۔ خسرو ہندوستان کو دنیا کے تمام ملکوں پر ترجیح دیتے ہیں، و حب الوطن من الایمان کے پیش نظر ہندوستان سے اپنی گہری محبت کا اظہار کبھی یوں کرتے ہیں ؎

کشور ہند است بہشتی بہ زمیں | حجتش اینک بہ رخ صفو ببیں
حجت ثابت چو دراں نیست شکی | ہفت بگویم بہ درستی نہ یکی

کبھی ہندوستان جنت نشان کو اپنا وطن مالوف اس طرح کہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں ؎

ہست مرا مولد و ماویٰ و وطن

الغرض خسرو کی تالیفات ایک طرف اخلاقی اقدار کا کامل نقشہ نظر آتی ہیں تو دوسری طرف سیاسیات کا روشن مرقع۔ ایک طرف آرزوؤں کی سنہری دنیا کی سیر کا نظارہ پیش کرتی ہیں تو دوسری طرف ناکامیوں کا المیہ۔ بہر کیف خسرو کی تصنیفات میں پند و نصیحت، حکمت و تدبیر اور تصوف نیت سب کچھ ہے۔ چھ سو سال کے بعد بھی خسرو کا پیغام ہمارے لئے وہ مشعل ہدایت ہے جو منزل مقصود کی ہماری صحیح رہنمائی کر سکتا ہے۔

عبدالرؤف

تجزیہ مثنوی گلزار نسیم

ہماری شاعری کا بیشتر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے غزلوں کے بعد جو صنف سب سے اہم ہو سکتی ہے۔ وہ مثنوی ہے۔ اس ضمن میں قصیدے کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس صنف کی آبیاری صرف شہنشاہی اور جاگیردارانہ دور تک ممکن تھی۔ اس خاص دور کے ختم ہونیکے بعد قصیدہ کی صنف کو زمانے کی آب و ہوا راس نہیں آئی اور وہ اس طرح مرجھائی کہ پھر پنپ نہ سکی۔ بات یہ ہے کہ قصیدوں کیلئے ممدوح کی ضرورت پڑتی ہے اور پھر جب ممدوح ہی نہ رہیں۔۔۔۔۔تو قصیدے کس کے لئے لکھے جائیں۔ البتہ غزل کی طرح مثنوی بڑی سخت جان ثابت ہوئی۔ اسے مختلف ادوار سے گذرنا پڑا اور ہر دور میں وہ اپنے احول کے تقاضوں کو پورا کرتی رہی اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو زبان کی ادبی تاریخ۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دور سے لیکر حالی اور اقبال کے دور تک جتنی مثنویاں لکھی گئیں انکا شمار مشکل ہے۔

جنوبی ہند میں مثنوی نگاری کی ابتدار آج سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے ہو چکی تھی لیکن شمالی ہند میں اس کی باقاعدہ ابتدار میر کے دور سے ہوتی ہے اور میر ہی کی مثنویوں کو کم از کم شمالی ہند میں سب سے قدیم نمونہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ جنوبی ہند میں جو مثنویاں لکھی گئیں تھیں شمالی ہند کا ادبی حلقہ بعض سیاسی اور ثقافتی اسباب کی بنا پر ان سے صدیوں تک بے نیاز رہا سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مثنوی کے موضوع بھی بدلتے رہے میر نے اپنے قلبی تاثرات کو جو حرماں نصیبی کا نتیجہ تھے۔ اپنی مثنویوں کا موضوع بنایا۔ ان کی مثنویاں "شعلہ عشق" دریائے عشق" "خواب وخیال" ان کی یاس اور حرماں نصیبی کا ......گویا مرقع ہیں۔ میر حسن نے حسن وعشق کی داستان لکھی جس کے کردار آدمیوں کے علاوہ جن پری اور دیو وغیرہ بھی ہیں۔ حالی اور آزاد نے قومی مثنویاں لکھیں اور اقبال نے اس صنف کو اپنے فلسفیانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔

ان لاتعداد مثنویوں میں جو مقام اور مقبولیت دو مثنویوں "سحر البیان" اور "گلزار نسیم کو نصیب ہوئی وہ کسی اور مثنوی کے حصے میں نہیں آئی۔ بعض نقادوں نے آپس کی چشمک یا عدم التفات کے باعث گلزار نسیم کی ادبی قدر متعین کرنے میں قدرے بے انصافی برتی ہے اور مثنوی سحر البیان کے مقابلے میں اسے یہ کہہ کر پس پشت ڈالنا چاہا کہ یہ محض رنگین بیانی اور رعایت لفظی کا گورکھ دھندا ہے اس باب میں پروفیسر وقار عظیم کی رائے بڑی

سنجیدہ اور قابل قدر ہے۔ دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں "دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا رنگ ہر زمانے میں ایک دوسرے سے جداگانہ رہا ہے دہلی کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی بیان ہے اور لکھنؤ کی شاعری کا امتیاز اس کی رنگین بیانی اور تکلف پسندی ہے۔ یہ فرق نسیم اور میر حسن کی مثنویوں میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ میر حسن کی سادگی ایسی ہے کہ اس سے بہتر کا تصور مشکل ہے اور نسیم کی رنگینی ایسی کہ کوئی دوسرا مثنوی نگار اس کا جواب نہ پیدا کر سکا۔"

حقیقت یہ ہے کہ موضوع پلاٹ۔ کردار نگاری، مناظر کی عکاسی۔ اختصار، جامعیت اور انداز بیان کے لحاظ سے گلزار نسیم کا شمار ان ادبی شہ پاروں میں ہونا چاہیے جو ہمیں صف اول کے شعرا سے میراث میں ملے۔ مثنوی سراپا حسن اور رنگینی میں ڈوبی ہوئی ہے۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

حسن کا تجزیہ مشکل ہے۔ بہر حال ذیل میں مثنوی کے بعض محاسن پہ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہر چند نسیم کے بیاں رنگین بیانی اور مجلس آرائی ہے لیکن اس سے ان کے آرٹ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ فن کی معراج یہ ہے کہ فنکار اپنے احساسات اور تجربات و مشاہدات کا اظہار اس طرح کردے کہ قاری یا سامع یہ سمجھنے لگے کہ محسوسات یا مشاہدات شاعر کے نہیں بلکہ خود اس کے اپنے ہیں۔ اسی فنی نقطۂ نظر کا اظہار غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

نسیم فن کے اس نکتے سے بے خبر نہیں تھے۔ انھوں نے اس کا صحیح مصرف کیا ہے اور اس سے اپنے فن کو رونق بخشی ہے۔ انکا انداز بیاں پر تکلف مزور ہے لیکن غیر فطری یا مصنوعی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ منظر لیجیے جب بکاولی اور تاج الملوک ایک دوسرے کی جدائی میں اپنی زندگی سے تنگ آجاتے ہیں اور روح افزا کی مدد سے دونوں کی شادی طے پا جاتی ہے۔ موقع محل کے اعتبار سے نسیم نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ حد درجہ شگفتہ، نشاط انگیز اور ساتھ ساتھ فطری بھی ہے ؎

اقرار میں تھی جو بے حیائی شرمائی لجائی، مسکرائی
حسن آرا نے کہا مبارک ایجاب اسنے کیا مبارک
سج دھج پہ بنی ادھر بنائے بن ٹھن کے بنا ادھر سے آئے
سیارہ شناس کو بلایا ساعت ٹھہرائی دن دکھایا
شادی کی خبر سے خوش خوش آئی مشتاق کو خوش خبر سنائی

راتوں کو جو گنتی تھی ستارے		دن گننے لگی خوشی کے مارے

واں مہندی نے چوے پائے خورشید		یاں سبز ہوا نہال اُمید
واں غازہ سے رنگ شفق میں خورشید		یاں جم گیا منہ پہ رنگ اُمید
افشاں ہوئی واں ستارہ افشاں		یاں جیغے سے روشنی درخشاں
واں مانگ سے رنگ کہکشاں ماند		یاں شملۂ سر سے ہالے میں چاند
واں زلف نے کھائے پیچ پر پیچ		وہ کلغی پہ یاں تھا سر پیچ
آنچل ہوئے واں نقاب عارض		سہرا ہوا یاں حجاب عارض

اس کے بعد کس خوبی سے بعض مراسم کا ذکر کرتے ہیں جو شادی کے موقع پر ادا کئے جاتے ہیں ؎

گل سے خوانوں میں زردہ لایا		ان غنچہ دہانوں کو کھلایا
خورشید سا آفتابہ لائے		منہ ہاتھ ہر ایک کے دھلائے
تلیاں پئے شکیو دھواں دھار		بیڑے چکھے پان کے مزیدار

محاسن لفظی ترتیب ہر شعر میں ہیں لیکن ساتھ ساتھ معنی آفرینی بھی ہے۔ سامع یا قاری ہرگز یہ محسوس نہیں کرتا کہ لفظی رعایتوں کا اہتمام باستقصد کیا گیا ہے یہ کمال شاعر کو صرف اسی وقت نصیب ہوسکتا ہے جبکہ اسے زبان پر پوری طرح قدرت حاصل ہو۔ رعایت لفظی کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ الفاظ معنی پر حاوی نہ ہوں۔

ایک مورخ اور قصہ نویس میں فرق یہ ہے کہ مورخ واقعات کے قبضے میں ہوتا ہے لیکن برخلاف اس کے قصہ نویس کے قبضے میں واقعات ہوتے ہیں۔ نسیم نہ صرف زبان پر قادر نظر آتے ہیں بلکہ واقعات کی باگ ڈور بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بڑے التزام کیا تھا ایک سین کے بعد دوسرا سین پیش کیا جاتا ربط و تسلسل اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔ جیسا سین ہوتا ہے۔ اس کے لحاظ سے انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ الفاظ اور ترکیبیں برمحل ہوتی ہیں۔ نشاط و شادمانی کا ذکر وہ کس شان و تجلی سے کرتے ہیں اس کی مثال آپ نے دیکھ لی۔ اب وہ منظر بھی ملاحظہ ہو جس میں وہ درد و غم کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ موقعہ ہے جب تاج الملوک ہجر کے صدمے سہتے سہتے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور اپنے ایک مکتوب میں بکاولی سے یوں مخاطب ہوتا ہے ؎

مرجاؤں اگر طلب میں تیری		میں کیا کہ خبر نہ پہنچے میری
قابل وہاں آنے کے کہاں ہوں		یاں جو بھی رہا تو نیم جاں ہوں

تجھ سے مری خطا اب کہاں شمع — تو نشتر شعلہ میں رگ شمع
تو برق دماں میں خرمن خار — تو سیل رواں میں خستہ دیوار
تو جز شش یم میں مور بے پر — میں نقش قدم تو باد صرصر
دھڑکا ہے یہی تو جان دونگا — مر جاؤنگا اب نہ میں جیوں گا

جذبات میں کتنا جوش اور خلوص ہے۔ سادگی حسن کلام کا ایک اہم جز ہے۔ نسیم نے بعض مناظر اور واقعات کے بیان کرنے میں انتہائی حد تک سادگی برتی ہے۔ لیکن اس انداز سے کہ شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ بادشاہ زین الملوک نے اپنے بیٹے تاج الملوک کو دیکھنے کے بعد جیسا کہ جوتشی نے بتایا تھا اندھا ہو جاتا ہے۔ اس کے بھائی اس کی جان کے درپئے ہو جاتے ہیں اور اسے شہر سے نکال دیتے ہیں۔ تاج الملوک چار و ناچار صحرا میں پناہ لیتا ہے۔ اس کے بعد چاروں شہزادے (یعنی تاج الملوک کے بھائی) گل بکاولی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ ناگاہ اُن کی ملاقات تاج الملوک سے ہوتی ہے۔ جسے وہ پہچان نہیں سکتے۔

شہزادے ہوئے چاروں تیار — رخصت کئے شہ نے چار ناچار
شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ — لشکر اسباب، خیمے۔ خرگاہ
وہ بادیہ گرد خانہ برباد — یعنی تاج الملوک ناشاد
میدان میں خاک اڑا رہا تھا — دیکھا تو وہ لشکر آرہا تھا
پوچھا تم لوگ خیل کے خیل — جاتے ہو کدھر کو صورت سیل
بولا لشکر کا اک سپاہی — جاتی ہے ارم کو فوج شاہی
سلطان زین الملوک شہ زور — دیدار پسر سے ہو گیا کور
منظور علاج روشنی ہے — مطلوب گل بکاولی ہے

مبالغہ کا استعمال اگر قرینے سے کیا جائے تو تخیل یا کسی منظر کا نقش زیادہ گہرا نظر آنے لگتا ہے۔ اور در اصل مبالغہ کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ بعض شعراء نے جنکے کلام کو مستند ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس معاملے میں بڑی بے راہ روی برتی ہے۔ خاص کر قصیدے کے شعراء نے تو اس کی مٹی پلید کر دی ہے۔ سودا آصف الدولہ کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا ممدوح بے کسوں اور کمزوروں کی اس طرح اعانت کرتا ہے کہ ایک حقیر سا پشہ اس کی شہ پا کر ہاتھی کو پرے ڈھکیل سکتا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے تواں بخش ناتواں کا وہ　　شاہد اسکا ہے متفق جمہور

نے گیا پیل پیل کو پیٹ　　اسکے آگے کیا جو باہم زور

زدری نے بھی اس مضمون کو اس طرح باندھا ہے ؎

وہ ترازو در حمایت ہے کہ جس کے باعث　　ناتوانوں کو بھی ہے دہر میں یہ تاب و تواں

ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں　　آپ کی تار نگہ زور سے سنتو پیل دماں

نسیم نے اپنے پیش روؤں اور نیز یہ کہ اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں مبالغہ کے استعمال میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ ان کے یہاں مبالغہ کا مقصد محض مضمون آفرینی یا لوگوں کو بھونچکا کر دینا نہیں بلکہ مناظر کو اس انداز سے پیش کرنا ہے کہ سننے یا پڑھنے والے اس سے اثر قبول کر سکیں مثلاً ایک جگہ صحرا کی ویرانی اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

وہ دامن دشت شوق کا خار　　یعنی تاج الملوک دل زار

اک جنگل میں جا پڑا جہانگرد　　صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد

سایہ کو پتہ نہ تھا شجر کا　　عنقا تھا نام جانور کا

وہ دشت کہ جس میں ریگ و دد　　یا ریگ رواں تھی یا وہ رہ رو

دیو کا سراپا یوں بیان کرتے ہیں ؎

دانت اس کے تھے گورکن قضا کے　　دو نتھنے وہ عدم کے ناکے

شعر میں فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ کلام روزمرہ کے مطابق ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں اور نیز یہ کہ لفظوں کی نشست یا ترتیب ہو۔ اس کسوٹی پر اگر ہم گلزار نسیم کو پرکھیں تو شاید پوری مثنوی میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ملیگا جو فصاحت کے معیار سے گرا ہوا ہو۔ مثالیں اتنی وافر ہیں کہ کوئی کہاں تک گنائے بہر حال دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں۔ تاج الملوک کے غم میں بکاولی جب کھانا پینا ترک کر دیتی ہے اور روز بروز اسکی جسمانی حالت خراب ہوتی جاتی ہے تو اس کی سہیلیاں سمجھاتی ہیں ؎

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر　　منہ دیکھ تو آئینہ منگا کر

ہے ہے تری عقل کس نے کھوئی　　ناجنس کو چاہتا ہے کوئی

اوشن ہے جو کچھ کیا ہے اندھیر　　پھر اپنی سمجھ سمجھ کا ہے پھیر

سمجھانے سے تھا ہمیں سروکار　　اب مان نہ مان تو ہے مختار

بکاولی جواب دیتی ہے ؎

جھنجھلائی بکاؤلی کہ بس بس — اب ایک کہو گی تم تو میں دس
رنجور جو ہوں تو میں تمہیں کیا — مجبور جو ہوں تو میں، تمہیں کیا
مانا مری حالت اب ردی ہے — بہتر ہے وہی جو مجھ بدی ہے

زبان کتنی صاف شستہ اور رواں ہے۔ محاوروں کا استعمال کتنا برمحل ہے۔ مولانا شبلی نے نظم کی ہیئت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ نظم کا درحقیقت سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اگر اسکو نثر کرنا چاہیں تو نہ ہوسکے اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب شعر میں الفاظ کی وہی ترکیب باقی رہے جو نثر معمولاً رہا کرتی ہے۔ اوپر جو مثال دی گئی ہے اس میں سے کوئی سا شعر بھی لے لیجئے اور مذکورہ کلیہ کے مطابق اسے پرکھئے۔

تشبیہیں:— صنائع بدائع عروس شاعری کیلئے زیور کا حکم رکھتے ہیں۔ اگر وہ کلام میں بے تکلفی سے آجائیں تو کلام کے حسن میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ نسیم نے مختلف صنعتوں کو برتا ہے۔ لیکن جس حسن و خوبی سے تشبیہوں کا استعمال کیا ہے اس کی مثال ہمیں کم از کم اردو زبان کی کسی مثنوی[1] میں نہیں مل سکتی تشبیہوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مشبہ کا خد و خال قاری یا سامع کے ذہن میں اُجاگر ہوجائے۔ چنانچہ تشبیہوں کو دور از کار یا بعید الفہم نہیں ہونا چاہیئے۔ نسیم نے تشبیہیں اس طرح استعمال کی ہیں کہ وہ ہمارے ذہن کے پردے پر مرتسم ہوجاتی ہیں اور جو منظر یا کیفیت وہ بیان کرنا چاہتے ہیں اسے دیکھنے یا محسوس کرنے کیلئے ہمیں اپنی قوتِ متخیلہ پر دباؤ ڈالنا نہیں پڑتا ہے

جاگی مرغ سحر کے غل سے — اٹھی نکہت سی فرش گل سے
ماں نے دیکھا جو وہ دلاور — اشکوں کے گہر کئے نچھاور
وہ طفل بھی گر پڑا قدم پر — مانند سرِ اشک چشم مادر

(مانند سرِ اشک چشم مادر کتنی بلیغ اور پرسوز تشبیہ ہے)

قاصد سے کلام لطف بولا — خط صورتِ چشم شوق کھولا

(یہ وہ موقع ہے جبکہ تاج الملوک غم ہجر میں اپنی جاں سے تنگ آجاتا ہے اور یکایک ایک پری کی توسط سے اسے بکاؤلی کا خط ملتا ہے)

یوں سیج پہ آکے سوئی بیتاب — جس شکل سے کٹے آنکھ میں خواب
نظروں سے گرا وہ طفل ابتر — مانند سرِ اشک دیدۂ تر

(تاج الملوک کو دیکھنے کے بعد بادشاہ اندھا ہوجاتا ہے۔ اس شعر میں اسی بدشگونی کی طرف اشارہ ہے)

---

[1] اس سلسلہ میں دکنی کی مثنوی قطب مشتری کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے جو تشبیہات کے اعتبار سے ایک بلند پایہ عظیم مثنوی ہے۔

جب دیوِ سیاہ شب سے مہتاب　　　رخصت ہوا جیسے چشم سے خواب

اور گل لئے آفتابِ تاباں　　　ہنگام سحر ہوا شتاباں

گل سے ہوئی چشمِ کور تاباں　　　ہو جیسے چراغ سے چراغاں

گھر چھوڑ کے چل بسے سب انساں　　　پھر تن میں نہ آئے صورتِ جاں

تو برقِ دمان میں خرمنِ خار　　　تو سیلِ رواں میں خستہ دیوار

تو جوششِ یم میں مور بے پر　　　میں نقشِ قدم تو بادِ صرصر

راجہ اندر کو بکاولی کی انسان دوستی پسند نہیں آئی اور اس نے بکاولی کو معتوب ٹھہرایا جس کے نتیجے میں اس کا آدھا دھڑ پتھر کا ہو گیا۔ بایں صورت تاج الملوک بکاولی کی تلاش میں نکلتا ہے۔ اور پریوں کی مدد سے اس بت خانے تک پہونچتا ہے۔ جہاں اس کا آدھا جسم زمین میں گڑا ہوا ہوتا ہے بکاولی اسے سمجھاتی ہے کہ راتوں رات واپس چلے جاؤ کیونکہ بت خانے کا دروازہ صبح ہوتے ہوتے بند ہو جاتا ہے۔ اس مکالمہ کو نسیم اس طرح پیش کرتے ہیں سے

یہ در مانندِ چشمِ بے خواب　　　ہوتا ہے سحر کو بند بے تاب"

اس کے بعد اخراجات کے لئے بکاولی اپنے گہنے زیور اتار کر تاج الملوک کو دے دیتی ہے۔ اس منظر کو بیان کرنے میں نسیم نے جو تشبیہ استعمال کی ہے اس سے شعر میں ایک ڈرامائیت پیدا ہو گئی ہے

مصرف کو جو ہو ضرورتِ زر　　　زیور میرا مجھ سے لو یہ کہہ کر

کانوں میں سے موتی کچھ نکالے　　　دامن پہ مثالِ اشک ڈالے

اختصار اور جامعیت سے شعر کا لطف اور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اصولاً اور کلیتاً غزل کے شعروں میں اختصار کا ہونا ضروری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مثنوی کے مقابلے میں غزل کی صنف میں اختصار برتنا قدرے آسان بھی ہے کیونکہ معنی اور مضموں کے اعتبار سے غزل کے تمام اشعار ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن مثنوی کے تمام اشعار معنی اور مضمون کے اعتبار سے آپس میں منسلک اور ایک دوسرے سے اس طرح مربوط ہوتے ہیں جیسے ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں۔ زنجیر کی اگر ایک کڑی بھی بیکار ہوئی تو پوری زنجیر بیکار ہو جاتی ہے۔ نسیم نے بھی اختصار برتا ہے۔ لیکن اس صفائی اور فنکارانہ چابکدستی سے کہ نفسِ مضمون میں کہیں سے بے ربطی نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ اس سے کرداروں کے مکالمے زیادہ دلچسپ اور مناظر یک گونہ جاذبِ توجہ

---

۱ اس ضمن میں وجہی کی مثنوی "قطب مشتری" کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے۔ جو تشبیہات کے اعتبار سے ایک بلند پایہ عظیم مثنوی ہے

بن جاتے ہیں۔ مکالموں میں اختصار کی مثال پیش ہے۔

پوچھا کہ "سبب" کہا کہ "قسمت" پوچھا کہ "طلب" کہا "قناعت"
ہم پر تو پڑے وہاں پہ پتھر تم کیونکر بچے کہا "مقدر"
بولی "کہو" کہا "کیا" کہا "خوب" بے کچھ کئے پھر بھی آئی کیا خوب

اختصار کی یہ خوبی واقعہ اور منظر نگاری میں بھی نمایاں ہے راجہ کی بیٹی چتراوت تاج الملوک پر عاشق ہو جاتی ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ راجہ کی طرف سے تاج الملوک کے پاس ایک مشاطہ بھیجی جاتی ہے جو واقعہ کو یوں بیان کرتی ہے ؎

اس شہر کا چترسین راجا دختر رکھتا ہے ماہ سیما
ہر ملک کے شہریار آئے ہر شہر کے تاجدار آئے
راضی تجھ سے ہوئی وہ بے پیر طالع قسمت نصیب تقدیر

ان چند شعروں میں ایک داستان بیان کر دی گئی ہے۔ تاج الملوک جب طلسمات کے صحرا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس سے کچھ بن نہیں پڑتی تو دو طائر آپس میں بات چیت کر کے اسے طلسم کے بہت سارے راز بتا دیتے ہیں جنکی مدد سے نہ صرف وہ طلسم کو توڑ سکتا ہے بلکہ ایسی چیزیں بھی حاصل کر سکتا ہے جو آئندہ اسے تمام آفات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں اس پورے واقع کو نسیم نے جس اختصار سے بیاں کیا ہے وہ قابل تعریف ہے ؎

تو تا بن کر شجر پہ آکر پھل کھا کے بشر کا روپ پاکر
پتے پھل گرند چھال لکڑی اس پیڑ سے لیکے راہ پکڑی

نسیم کو زبان و بیان پر پوری طرح قدرت حاصل تھی جہاں انھوں نے رنگینی اور تکلف برتنا چاہا ہے وہ حد درجہ کامیاب نظر آتے ہیں اور جہاں سادگی اور متانت سے کام لینا چاہا ہے وہاں بھی انکی کامیابی نمایاں ہے اور یہ چیز صرف اس شاعر کو نصیب ہو سکتی ہے جو قادر الکلام ہو۔ پر تکلف اور رنگین اشعار کی مثنویوں میں کوئی کمی نہیں لیکن جو اشعار سادہ ہیں ان میں اتنی شگفتگی روانی اور سلاست ہے کہ وہ بے تکلف ضرب المثل بن سکتے ہیں ؎

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجئے جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
سن کوئی ہزار گر سنائے کیجئے وہی جو سمجھ میں آئے
ارباب غرض کی بات سنکر کر لیجئے یک بیک نہ باور

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

سید اعظم الحسینی

علامہ سید محمد موسوی المشہور مولوی سیدن صاحبؒ

علامہ سید محمد موسویؒ اواخر بارہویں صدی ہجری و اوائل تیرہویں صدی ہجری میں ہندوستان کے اکابر علمار اسلام سے گذرے ہیں۔ بقول صاحب گلزار آصفیہ آپ جمیع علوم عقلی و نقلی ---- و استکمال فارسی و فنون خوشنویسی وغیرہ میں مقتدائے عہد و یکتائے روزگار اور علم سلوک میں پیشوائے طریقت و معرفت تھے آپ نے عظیم علمی و دینی خدمات انجام دیں جن سے ہزارہا افراد فیضیاب ہوئے۔

آپ کی ولادت ۱۷ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ میں بلدہ حیدرآباد میں ہوئی۔ اسم گرامی سید شاہ محمد الحسینی الموسوی تھا اور مولوی سیدن صاحبؒ کے لقب سے مشہور تھے۔ بعض کتب میں آپ کا نام میر محمد قاسم اور عرف سید محمد مرقوم ہے۔ آپ دکن کے مشہور بزرگ عارف باللہ سید شاہ اعظم الحسینی چشتی المعروف شاہ اعظم صاحبؒ کے فرزند اکبر و جانشین تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اکتیسویں پشت میں حضرت امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔

اجداد آپ کے اجداد میں بکثرت علمار گذرے ہیں چنانچہ آپ نے ریاض اعظم میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے اجداد میں سوائے پدر بزرگوار اور دادا (سید محمد موسوی المعروف مرزا بزرگؒ) کے کوئی بے علم نہیں تھا۔ آپ کے اجداد میں تاریخی شہرت کے حامل اکابر علمار کے علاوہ مشاہیر نسابہ و شعرار و ادبا۔ نقیب الاشراف۔ قاضیان مملکت اسلام۔ امیر حاج۔ سلاطین و وزرا۔ اولیا و اتقیا گذرے ہیں۔

آپ کے جد اعلیٰ سید قوام الدین مشہور بہ میر بزرگؒ مازندران پر خاندان سادات مرعشیہ کی حکومت کے بانی تھے۔ مازندران ملک ایران کی شمالی ریاست بحیرۂ کیسپین کے جنوبی ساحل پر واقع ہے۔ برٹش کونسلیٹ ایچ۔ یل۔ رابی نو نے اپنی کتاب "MAZANDERAN AND ASTRABAD" صفحہ ۱۴۲ پر تفصیل دی ہے جس کے بموجب اس خاندان نے مازندران پر ۷۶۰ھ م ۱۳۵۹ء تا ۹۸۹ھ م ۱۵۸۱ء تک بادشاہت کی اور انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد سوم صفحہ ۲۷۱ پر مرقوم ہے کہ اس خاندان کی حکومت ۷۶۰ھ تا ۹۹۰ھ کے زمانہ میں رہی۔

سلطان مذکور علامہ شریف مرتضیٰ علم الہدیٰ بن شریف طاہر ابی احمد الحسینؒ المتوفی ۴۳۶ھ نقیب الاشراف و قاضی اسلام و امیر حاج (بعہد عباسی) کے نبیرہ تھے۔ شریف مرتضیٰؒ و شریف رضیؒ ہر دو برادران

اپنے زمانہ میں اعلم الناس وصاحب ورع و تقویٰ تھے۔ ان کی تصانیف مثلاً شریف مرتضیٰ کی "الامالی" "درر القلائد و غرر الفوائد" "الشہاب فی الشیب والشباب" اور شریف رضی کا "دیوان" اور کتاب "نہج البلاغہ" (جس میں سیدنا علیؑ کے خطبے جمع ہیں) وغیرہ تا حال موجود و مشہور ہیں۔ شریفین مذکور کے حالات "تاریخ ابن خلکان" "عمدۃ الطالب فی نسب آل ابی طالب" "یتیمۃ الدہر" وغیرہ میں مرقوم ہیں۔

آپ کے اجداد میں سلطان مذکور کی اولاد میں ایک شاخ ماژندران سے بعہد قطب شاہی ملک دکن میں وارد ہوئی اور عہدۂ وزارت وسپہ سالاری و اتالیقی پر فائز اور عمدہ خطابات سے ممتاز کئے گئے۔ چنانچہ اولاً سید قطب الدین نعمت اللہ المتوفی ۱۰۴۲ھ براہ بنگال دکن آئے سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اپنی خواہران سے منسوب کی۔ یہ اور ان کے داماد میر محمد شریف شہرستانی المتوفی ۱۰۲۹ھ عبد اللہ قطب شاہ کے اتالیق مقرر کئے گئے تھے۔ موجودہ محلہ مغل پورہ سید موصوف کی احاطہ حویلی و عمارات تھا۔ جہاں آج صرف ان کا مزار جس پر عمارت پختہ اور ان کے داماد کے مزار پر گنبد موجود اور زیر نگرانی محکمۂ آثار قدیمہ ہیں۔ ان کی نواسی سیدہ کلثوم کی بنا کردہ عالیشان مسجد و سرائے وغیرہ محلہ کاروان کے قریب واقع ہیں۔ بعد ازاں سید مذکور کے برادر سید کمال الدین تشریف لائے جو بعہدۂ وزارت فائز اور بخطاب شجاع الملک ممتاز کئے گئے۔ ان کے دو فرزند سید زین العابدین شجاع الملک المتوفی ۱۰۵۶ھ اور سید مظفر بعہد سلطان عبد اللہ قطب شاہ و ابو الحسن تانا شاہ عہدۂ وزارت پر مامور کئے گئے تھے۔ سید کمال الدین مسطور کی دو دختر تھیں۔ ایک دختر مشہور بزرگ حضرت سید نور الہدیٰؒ اور دوسری دختر سید عبد اللہ خاں سر خیل شاہی سے منسوب کی گئی تھیں۔

تزک محبوبیہ میں مرقوم ہے کہ سید نعمت اللہ مذکور کے والد سید شمس الدین ماژندرانی شاہ عباس صفوی (شہنشاہ ایران) کے خالو تھے۔ آخر میں سید نعمت اللہ مذکور کے برادر خورد علامہ سید حسین ماژندرانیؒ ہمراہ فرزند خود علامہ روزگار مجدد بے نظیر و جفرداں بے مثل سید محمد باقر نسابہؒ دکن تشریف لائے علامہ سید محمد باقر نسابہؒ کے فرزند حضرت سید محمد موسوی المعروف مرزا بزرگؒ تھے۔

مولوی سید ان صاحبؒ نے زاد اعظم مومنین جلد دوم (سنہ تصنیف ۱۳۲۱ھ) میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے پاس فہرست تین سو ساٹھ قطعہ املاک وغیرہ مع اسناد سلاطین قطب شاہیہ موسومہ سید قطب الدین نعمت اللہ نسبت عطاء انعامات تا لابہا و باغہا وغیرہ موجود ہیں۔ لیکن ان اسناد کا اب پتہ نہیں چلتا۔ الغرض ان حضرات کے تفصیلی حالات ریاض اعظم و کتب تواریخ قطب شاہیہ میں مرقوم ہیں۔

اس خاندان کی ایک شاخ بعہد سلطنت مغلیہ ہندوستان پہنچی اور انہیں منجانب شاہان مغلیہ

مختلف کلیدی عہدوں پر فائز اور عمدہ خطابات سے ممتاز کیا گیا۔ چنانچہ میر قوام الدین خاں اصفہانی (صدر ایران برادر خلیفہ سلطان) لاہور کے صوبہ دار مقرر ہوئے (ملاحظہ ہو مآثر الامرا جلد سوم ص۱۰۹) صف شکن خاں داروغہ توپ خانہ عالمگیری جنھیں اورنگ زیب نے دارا شکوہ کے تعاقب کیلئے مامور کیا تھا (مآثر الامرا جلد سوم ص۹۵) مخلص خاں پسر صف شکن خاں نے ایام محاصرۂ قلعہ گولکنڈہ داروغگی توپخانہ پادشاہی کی خدمت انجام دی (مآثر الامرا جلد سوم ص۶۳۱)

تحصیل علم مولوی سید ن صاحب نے اکابر علماء و اجلۂ شیوخ عہد سے تمام علوم معقول و منقول و علم سلوک کی تعلیم حاصل فرمائی پدر بزرگوار نے چار سال کی عمر ہی سے تعلیم کا انتظام فرمایا۔ آپ ابتداءً حضرت مولانا حافظ محمد صاحبؒ (جو پہلے مدرس دوم بلدہ حیدرآباد و مفتی بلدہ پھر قاضی بلدہ مقرر اور بخطاب شریعت اللہ خاں ممتاز کئے گئے تھے) سے دینی علوم حاصل فرمائے۔ مولوی محمد ولیؒ (جو ملک سب استاد در فنون خط سمجھے جاتے تھے) سے تعلیم خطوط نستعلیق و نسخ و ثلث و ریحان و توقیع و رقاع اور مولوی شاہ ظاہر الدینؒ فرزند حضرت میراں حبیب اللہ کاردانیؒ (مرشد والا جاہ) سے شکستہ اور بے نظیر رقعات کمال خوشنویس شاہ معین الدین چشتیؒ سے شفیعہ وغیرہ کی تعلیم حاصل فرمائی۔

صغر سنی میں چودہ سال کی عمر تک حضرت فقیر علی چشتی ارکاٹیؒ اور شیخ عتیق اللہ شطاریؒ کی صحبت، با برکات سے استفادہ فرمایا۔ پدر بزرگوار سے بھی علم سلوک حاصل فرمایا اور سلسلۂ چشتیہ و دیگر سولہ سلاسل تصوف میں اجازت و خلافت حاصل فرمائی چنانچہ بعض اسنادِ سلاسل مع طبیعہ در [illegible] موجودہ محفوظ ہیں۔ آپ نے حضرت سید یوسف بن علی قادریؒ سے تمام سلاسل قادریہ و رفاعیہ و نقشبندیہ و سہروردیہ و شاذلیہ و بدریہ و اولیسیہ و مجددیہ و شطاریہ و قلندریہ و بخاریہ وغیرہ کی اجازت و خلافت اور پیران کبار سے حاصل شدہ اوراد وغیرہ حاصل فرمائے۔ چنانچہ ۱۱۹۱ھ و ۱۱۹۲ھ کے بعض اسناد تا حال محفوظ ہیں۔

۱۱۹۱ھ میں حضرت مولانا سید شاہ حفیظ اللہ گجراتیؒ خلیفۂ شیخ المحدثین مولانا خیر الدین نقشبندی مجددی سورتی وارد بلدہ حیدرآباد ہوئے۔ آپ نے ۱۱۹۵ھ تک مولانا کے انتقال تک مستفیدانہ رو تبرک نقشبندیہ و قادریہ و سند فصوص و مثنوی و سند بخاری و مسلم و مشکوٰۃ شریف و حصن حصین و دیگر رسائل تصوف وغیرہ حاصل فرمائے۔ بعد ازاں آپ نے علوم معقول حواشی و شرح مطالع و شرح ہدایہ وغیرہ حضرت مولانا سید زین العلیؒ اورنگ آبادیؒ سے اکتساب کیا۔ پھر تکمیل کتب منقولات و معقولات حواشی قدیمہ و جدیدہ و شرح تجرید و شرح چغمینی و اقلیدس و شرح اسطرلاب و ہیئت و ہندسہ و فرہنگ و کتب طب

نفیسی و شرح اسباب و علامات و قانون وغیرہ و تحصیل کتب تصوف شرح نصوص مولانا جامی و مثنوی کرر و ہدایہ و فقہ و کتب احادیث و قاموس لغت و علم انساب وغیرہ شروع سال سنہ ۱۲۰۱ھ مسلسل چار سال تک علامہ سید حسین اصفہانیؒ سے استفادہ کیا۔ علامہ اصفہانیؒ کے متعلق آپ نے ریاض اعظم میں تحریر فرمایا ہے "از علمائی ہند و دکن و یورپ و ولایت و لندن ہر کہ بوی ملاقی شد میگفت کہ بعد بو علی سینا برین زبا کسے متولد نشدہ"۔ آپ نے علامہ اصفہانیؒ کی بعض رباعیات کو نقل فرمایا ہے۔ سنہ ۱۲۱۹ء میں سورت میں شیخ المحدثین مولانا خیرالدین نقشبندی مجددیؒ سے سلسلہ مجددیہ میں اجازت حاصل فرمائی۔ حضرت شیخ موصوفؒ خلیفہ تھے۔ مولانا شاہ نصر اللہؒ کے اور وہ خلیفہ خواجہ محمد النقشبند ثانیؒ کے تھے اور وہ خلیفہ مولانا شیخ محمد معصومؒ کے اور وہ خلیفہ اپنے والد حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے تھے۔ حضرت مولانا شاہ نصر اللہؒ کا دوسرا سلسلہ اس طرح ہے آپ خلیفہ حضرت سید اشرف کیؒ کے اور وہ خلیفہ شیخ محمد طاہرؒ کے اور وہ خلیفہ شیخ حاجی سلطان پوریؒ کے اور وہ خلیفہ مولانا آدم بنوری کے اور وہ خلیفہ اپنے والد شیخ احمد سرہندیؒ کے تھے۔

حضرت شیخ خیرالدین سورتی بڑے جلیل القدر محدث و عالم و اتقی و اورع بزرگ اور سلسلہ مجددیہ کے باکمال شیخ وقت تھے۔ چنانچہ مکہ اور مدینہ کے لوگ آپ کو حرزاً خیرالدنیا والدین سے پکارا کرتے (ملاحظہ ہو مشکوٰۃ النبوۃ وغیرہ کتب تواریخ) حضرت شیخؒ کی مہری سنہ ۱۱۹۹ھ میں عطا کردہ سند تاحال موجود ہے۔ اس سند میں جلیل القدر شیخ نے اپنے جوان سال مرید کے لیے القاب ذیل تحریر فرمائے ہیں۔ "خلاصۃ اولاد سید المرسلین و زبدۃ احفاد آل طٰہٰ و یٰسین قطعۃ کبد سیدۃ النساء بتول والمرتضیٰ علیہم السلام جامع المعقول والمنقول حاوی الفروع والاصول صاحب الاخلاق محمدیہ ذو المفاخر الاحمدیہ مولانا المجد السید محمد الحسینی اوصلہ اللہ"۔

مدرسہ سیدن صاحب تذکرہ ریاض اعظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے تحصیل علوم کے زمانے ہی سے پندرہ سولہ سال کی عمر ہی میں سنہ ۱۱۸۹ھ میں درس و تدریس کا سلسلہ آغاز فرما دیا تھا۔ آپ کی درس گاہ جنوبی ہند کا مشہور علمی مرکز بن گئی تھی چنانچہ مجلہ طلسانین حصہ تاریخ جلد ۹ شمارہ سنہ ۱۹۲۵ء میں مولوی سید علی محسن ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ نے اپنے مضمون بعنوان "دکن میں تعلیم بہ عہد آصف جاہ اول و آصف جاہ ثانی" لکھا ہے کہ آپ کی درس گاہ میں تمام علوم متداولہ کی تعلیم دی جاتی تھی اور آپ کی غیر معمولی قابلیت و بے لوث خدمات کے سبب ان کی درس گاہ نہایت مشہور تھی۔ تلامذہ کی کثرت کے سبب آپ کو شب و روز فرصت ملنا دشوار ہو گیا تھا۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں مرقوم ہے "۔ در حین حیات الدماجد خود یا جمیع علوم عقلی و نقلی و استکمال فارسی و فنون خوشنویسی وغیرہ مقتدائے عہد و یکتائے روزگار

خویشیں گشتہ کہ فیض عام جاری ساختند کہ از کثرت تلامذہ شب و روز فرصت یکسانیت نمیگر دید و پدر عالیقدر از ملاحظہ اینحال دعاہای فراوان بجناب اقدس الٰہی درباره صحت و سلامتی ایشان میکردند"

خود آپ نے بھی اپنی معروفیات کا حال ریاض اعظم میں اس طرح لکھا ہے"۔ خدمت مدرسہ خانقاہ زیادہ از سابق لاحق گردید بنا بر فوت علمائے ہند و دکن طلبہ جوق جوق از ہر بلدہ و قریہ رو بمدرسہ این لا یعلم آوردند و می آرند فرصت تحریر بالکل نمی شد و بعد سال چار و ناچار آن اوراق را جمع کردہ دیباچہ باوضم کردہ کتاب مرتب ساختم و نامش ریاض اعظم نہادم"۔

آپ کی درس گاہ ابتداءً چوڑی بازار میں تھی بعد میں آپ نے اپنا مدرسہ ۱۲۰۳ھ میں مسجد بنا کردہ حیات ماں صاحبہ والدہ عبداللہ قطب شاہ واقع شیر گل کے قریب بصرفہ ذاتی تعمیر فرمایا اور مسجد جو ویران و شکستہ ہو گئی تھی۔ بزرِ خالص خود باحسن الوجوہ تعمیر و ترمیم اور توسیع فرمائی اور مسجد کو آباد کیا۔ مسجد مذکور تا حال "مسجد سیدن صاحبؒ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مدرسہ و مسجد کی متعلقہ شاہی اسناد مجریہ ۱۲۱۱ھ تا حال موجود و محفوظ ہیں۔

۱۲۱۲ھ میں حکومت کی جانب سے آپ کو مدرس اول بلدۂ حیدرآباد مقرر کیا گیا۔ آپ کے ممتاز شاگردوں میں مولوی نور الاصفیاؒ و مولوی محمد فاضل وغیرہم تھے۔ مولوی نور الاصفیا صاحبؒ نے علم ریاضی آپ ہی سے حاصل کیا۔ ان کی مصنفہ ضخیم قلمی کتابیں نور الحساب و نور المساحین اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہیں۔

تعمیرات

نواب آصف جاہ ثانی نے مسجد حیات ماں صاحبہؒ و چار ہزار مربع گز افتادہ اراضی آپ کے حوالہ فرمائی جس پر آپ نے اپنے خرچ سے حویلی برائے سکونتِ خود و اماکن و دکاکین و حوض برائے مسجد و مدرسہ و خانقاہ اور مکان برائے تحفظ تبرکات خاندانی (یعنی آثار شریف حضور نبی کریمؐ و حضرات شیخینؓ و حضرت سیدہ فاطمہؓ و حضرات یازدہ آئمہ اہلبیت کرامؓ و اولیائے عظامؒ) تعمیر فرمائے اور وقف کیا۔ ان تبرکاتِ خاندانی کا ذکر تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ششم بر صفحہ ۵۱۴ اور صولت عثمانی صفحہ ۱۰۱ پر موجود ہے۔ علاوہ ازیں شاہی اسناد مجریہ ۱۲۰۳ھ و ۱۲۱۱ھ میں بھی ان تعمیرات و آثار شریف کا ذکر موجود ہے۔

سفر کرنول

نواب محمد الف خاں رئیس کرنول آپ سے نہایت عقیدت رکھتے تھے۔ ان کی کمال تمنا پر آپ ۱۲۱۹ھ میں کرنول تشریف لے گئے۔ رئیس مذکور کے پاس آپ کا قیام ۱۲۳۰ھ تک رہا۔ محرم ۱۲۳۱ھ میں آپ بلدہ حیدرآباد واپس ہوئے۔ آپ نے ریاض اعظم میں نواب موصوف کے مختصر حالات تحریر فرمائے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ نواب نہایت سخی و ایثار پسند ہمدرد و سادہ مزاج و عاشق رسول و محبت اہلبیت و قدردان سادات و علماء و شرفا اور نہایت مودب تھے۔ ہمیشہ باوضو

رہتے اور ایک ہی وقت کھانا کھاتے۔ جس وقت آپ مکان آثار شریف میں حدیث بیان فرماتے تو نواب دست بستہ بحالت درود خوانی ختم درس تک ایستادہ رہتے۔ نواب نے بعارضۂ استسقا ۱۲ ربیع الاول ۱۲۳۰ھ شب پنجشنبہ سرای فانی سے دارالبقا کو کوچ کیا۔ آپ تجہیز و تکفین و نماز جنازہ و تدفین کے موقع پر شریک تھے۔

سیرت آپ نہایت متواضع و صاحب اخلاق حمیدہ و اوصاف پسندیدہ و حلیم الطبع و عابد و زاہد و متقی و مخلص عالم باعمل، حافظ قرآن عارف کامل، بسیار ذکی و فطین، مرد جواد و متوکل، صاحب شوکت و صلابت تھے۔

ہمیشہ درس و تدریس و تبلیغ و امور علمیہ میں مشغول رہتے اور کبھی امر لایعنی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ گلزار آصفیہ میں مرقوم ہے۔ "عجب وقت بود و عجب بزرگان عہد غیر از تحصیل علم و تذکرہ علوم عقلی و نقلی و شوق خوشنویسی و انشاپردازی و شعرخوانی و اشعار گوئی ذکر لہو و لعب بیجا ہرگز ہرگز بنظر عاصی نہ آمد۔"

آپ قرآن نویسی نہایت التفات سے فرماتے اور نماز نہایت خشوع و خضوع سے ادا فرماتے۔ گلزار آصفیہ میں مرقوم ہے کہ نماز پنجوقتہ بجماعت کبھی قضا ہوتی نہیں دیکھی گئی۔ آپ کو توریثاً سلاطین قطب شاہیہ کی عطاکردہ معاشیں پہنچی تھیں علاوہ ازیں سلاطین آصفیہ و نواب کرنول کی جانب سے مختلف معاشیں یومیہ، مناصب و جاگیر و مقطوعات و انعام وغیرہ جاری تھیں لیکن آپ نے ریاض اعظم میں تحریر فرمایا ہے کہ جو کچھ آپ کو آمدنی ہوتی اور نقد و رحاصل ہوتے آپ صرف فرما دیتے اور ہمیشہ مقروض رہتے۔

دوران قیام کرنول ریذیڈنٹ اکثر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ آپ بدرجہ صاحب شوکت و صلابت تھے۔ چنانچہ مورخ گلزار آصفیہ آپ کی کرنول سے بلدہ کو واپسی کا حال اس طرح لکھتا ہے۔ "باز بحیدرآباد تشریف آوردند کہ شوکت و صلابت بدرجہ بود کہ ہیچ کس از علما و فقرا و امرا غیر از دست بوسی چارہ نمیدید" نواب میرا لملک اور مہاراجہ چندولال آپ کی نہایت توقیر کرتے اور جب کبھی بموقع عیدین آپ تشریف لیجاتے تو بارزدی تمام بالائی نصف مسند پر بٹھاتے اور فخر کرتے اور معذرت خواہ ہوتے۔ آپ کے علم و فضل و تقوی کے شیوخ وقت بھی معترف تھے۔ شاہی اسناد میں آپ کے نام کے ساتھ "سیادت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ جامع علم و عمل و تقوی" کے القاب تحریر کئے گئے ہیں۔ صاحب مشکوٰۃ النبوۃ نے بھی آپ کو جامع العلوم والفنون لکھا ہے۔

تصانیف آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ بعض کتب کے قلمی نسخے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری و سالار جنگ لائبریری میں موجود ہیں۔

(۱) ریاض اعظم :- اس کتاب کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔ اس میں آپ نے والد بزرگوار حضرت شاہ اعظم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور ان کے اجداد در شمیرین اور خلفاء و مریدین صادقین کے

حالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس کتاب میں مختصراً ان لڑائیوں کا بھی تذکرہ ہے جو مدراس وغیرہ میں نواب مظفر جنگ نے لڑی تھیں۔ چونکہ شاہ اعظم صاحبؒ اپنے سفر میں نواب مظفر جنگ کے ساتھ ایک قلیل عرصہ تک رہے۔

(۲) **کلیات حقائق** و (۳) **فیض اعظم** :۔ یہ مختصر رسائل تصوف کے بنیادی مسائل پر مرقوم ہیں۔ ان کے قلمی نسخے اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہیں۔

(۴) **الہامات اعظم** :۔ اس کتاب میں آپ نے حضرت شاہ اعظم چشتیؒ کے اقوال جو معارف و سالک پر مشتمل ہیں، جمع کئے ہیں۔ اس کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔

(۵) **طب اعظم** :۔ یہ "تذکرۃ اللذات" کا فارسی ترجمہ ہے۔ اس کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ ہے۔

(۶) **زاد اعظم مومنین جلد اول** :۔ یہ ضخیم کتاب ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ نواب الف خاں رئیس کرنول کی خواہش پر ۱۲۱۹ء میں حضور نبی کریمؐ و خلفاء راشدینؓ کے حالات پر تحریر فرمائی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہے۔

(۷) **زاد اعظم مومنین جلد دوم** :۔ یہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔ جو حسب فرمائش رئیس کرنول حضرت سیدہ فاطمہؓ و حضرت علیؓ و حضرات حسنینؓ و باقی ہمہ یازدہ آئمہ اہلبیتؓ کے حالات پر لکھی ہے۔ اس کے قلمی نسخے اسٹیٹ لائبریری و سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہیں۔

(۸) **فوائد اعظم (شرح کافیہ)** :۔ یہ کتاب عربی نحو سے متعلق تحریر کی گئی ہے۔ اس کے نسخے مذکورہ صدر کتب خانوں میں موجود ہیں۔

(۹) **اعظم المناقب** :۔ یہ ضخیم کتاب نواب الف خاں کی خواہش پر ۱۲۲۱ھ میں تصنیف فرمائی۔ اس میں قرآن کریم اور اہلبیت کے فضائل مرقوم ہیں۔ اس کے دو قلمی نسخے اسٹیٹ لائبریری میں موجود ہیں۔

دیگر تصانیف جو دستیاب نہیں ہوئیں بلکہ اُن کے نام وغیرہ کا علم ہوا ہے۔ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) **الہامات قدسی سمات** :۔ پدر بزرگوار کا ضخیم ملفوظ ہے جس میں اُن کے حالات وغیرہ معہ احوال اجداد و مرشدان کرام تا سیدنا علیؓ اور خلفاء کاملین وغیرہ کے حالات تحریر فرمائے۔

(۲) **نسب اعظم** :۔ یہ علم انساب پر تصنیف ہے۔ اس میں حضور نبی کریمؐ کا نسب و احوال اجداد بحوالہ علمائے انساب و تواریخ سیدنا آدمؑ تک اور پھر آئمہ اہلبیت کے نسب کی تفصیل تحریر فرمائی۔

(۳) **اعظم الاخبار** :۔ اس میں غزوات النبیؐ کی تفصیل درج فرمائی۔

(۴) رسالہ شجرۂ طیبہ :۔ جس میں تمام سلاسل طریقت کی تفصیل یعنی تاریخ ابتدا و تعلیمات عالیہ وغیرہ تحریر فرمائے۔

(۵) شجرہ اعظم اور (۶) مصطلحات اعظم :۔ نامی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔

اولاد آپ نے ریاض اعظم میں ذکر کیا ہے کہ آپ کی زوجہ اول (جو وزیر زادہ بخارا کی پوتی تھیں) سے اکیس اولادیں ہوئیں لیکن وہ سب کی سب کسی نہ کسی طرح فوت ہوگئیں جس کے سبب بہ تقاضائے بشریت آپ نہایت مغموم ہوئے اور سفر حرمین شریفین کا ارادہ فرمایا۔ اثناء میں نواب الف خاں کے پاس قیام ہوا۔ چنانچہ نواب کی خواہش پر کرنول کے مشہور بزرگ سید شاہ صادق الحسینیؒ کی پوتی سیدہ صادق بیگم بنت سید ثابت الحسینی صاحبؒ سے نکاح فرمایا۔ جن کی اولاد تاحال موجود ہے۔ بہرحال آپ کے جانشین فرزند اکبر سید شاہ اعظم الحسینی ثانیؒ (۲۳ ۱۲ء تولد ۱۲۸۷ء وفات) ہوئے۔ ان کے لاولد انتقال کرجانے سے فرزند خورد سید شاہ ابوتراب الحسینی المتوفی ۱۲۹۵ھ جانشین ہوئے اور مسجد و خانقاہ و آثار شریف و مدرسہ وغیرہ کے متولی ہوئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند سید شاہ قاسم الحسینی عرف مولوی سیدن صاحب ثانی جانشین و متولی ہوئے۔ بعد ازاں مولوی سید احمد بادشاہ قادری (جو حضرت موسیٰ قادریؒ کے پڑپوتے اور مولوی سیدن صاحبؒ کے پڑنواسے تھے اور مفتی اشرف علی صاحب مرحوم (فرزند شائق صاحب مرحوم) اور مولوی سید لطیف الدین صاحب مالک اخبار رہنمائے دکن کے حقیقی نانا تھے) بہ استرضاء مولوی سیدن صاحب ثانی متولی ہوئے۔ مولوی احمد بادشاہ مرحوم کے بعد مولوی سید عزیز پیران حسینی المتوفی سنہ ۱۳۹۰ھ فرزند مولوی سیدن صاحب ثانی متولی ہوئے۔

وفات آپ نے ۵ جمادی الثانی ۱۲۶۴ھ کو بیابان فنا سے شہرستان بقا کی طرف کوچ فرمایا اور مسجد مشہور بنام خود "مسجد سیدن صاحبؒ" کے صحن میں بہ پہلوئے پدر بزرگوار حضرت شاہ اعظم چشتیؒ مدفون ہوئے نور اللہ مرقدہما۔

تاریخ ابن خلکان، عمدۃ الطالب فی نسب ال ابیطالب، مآثر الامراء جلد سوم، مشکوٰۃ النبوۃ، تاریخ گلزار آصفیہ، درہ احزاب دکن، حدیقۃ السلاطین۔ تزک محبوبیہ مآثر دکن۔ صولت عثمانی۔ اولیائے دکن دیدبۂ نظام حصہ حکارم ۳۲ ریاض اعظم، زاد اعظم، مومنین جلد دوم، JNCYCLOZEDIA OF ISLAM —— MEZANDERAN AND ASTRABAD کے اسناد محفوظ ہیں۔

رئیسہ بیگم

ظہیر دہلوی اور حیدرآباد

ظہیر دہلوی دبستان دہلی کے ایسے شاعر ہیں جو غدر کے بعد جے پور اور بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد آگئے والد کا نام جلال الدین حیدر تھا دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پلے بڑھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں ماہی مراتب کی منتقلی پر تقرر ہوا۔ بادشاہ نے انھیں خطاب راقم الدولہ داروغہ فوز بیگی سے سرفراز کیا تھا وہ ہمیشہ بادشاہ کی سواری کے ساتھ ساتھ رہا کرتے۔ بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ ابتداً میں چند دنوں کیلئے بادشاہ کی شاگردی اختیار کی پھر ذوق کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا لیکن کلام میں اکثر مومن کا اثر پایا جاتا ہے۔

ذوق کے شاگردوں میں انھیں خاص مقام حاصل ہے۔ انھوں نے صرف شاعری کے میدان ہی میں اپنی جولانیاں نہیں دکھائیں بلکہ نثر میں بھی دو گراں بہا کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ایک داستان غدر اور دوسرا قصۂ ممتاز۔ ظہیر نے جس ادبی ماحول میں آنکھ کھولی وہ اردو شاعری کیلئے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں غالب، مومن، ذوق سب پہلوان سخن اکھاڑے میں موجود تھے۔ ظہیر ان سب سے متاثر ہوئے اس کے باوجود ان کے کلام میں انفرادیت ہے۔ چند ہی دن میں یہ بساط الٹ گئی۔ غدر کے ہنگاموں میں دہلی تباہ و تاراج ہوگئی ظہیر نے دہلی کو خیرباد کہا اور رام پور، جے پور، ٹونک، بھوپال ہوتے ہوئے حیدرآباد آگئے اپنی عمر کا آخری حصہ یہیں گذارا اور یہیں زمین کا پیوند ہوگئے۔

چونکہ اس زمانے میں والی ریاست حیدرآباد بھی شعروادب کے شائق تھے اکثر امراء و شرفاء کے ہاں طرحی و غیر طرحی مشاعرے ہوا کرتے تھے اور اکثر شعراء داد و تحسین حاصل کرتے تھے، اس بات کا اندازہ ہمیں اس زمانے کے گلدستوں اور رسالوں کے مطالعے سے بھی ہوسکتا ہے جیسے رسالہ محبوب الکلام وغیرہ ظہیر کے کلام نے انھیں بہت جلد مقبول بنا دیا جس کا ذکر انھوں نے داستان غدر میں کیا ہے لکھتے ہیں۔

" اکثر دوستوں کے خطوط پہ بہ پہنچے حیدرآباد آجاؤ یہاں کے امرا قدردان ہیں۔ شعر و سخن کا چرچا ازحد ہے۔ تمہارے کلام کے بہت لوگ مشتاق ہیں شعروسخن کی بڑی قدردانی ہے غرض کہ میرا قصد بھی حیدرآباد کا ہوا۔ جب وہ [illegible] آباد پہنچے تو پہلے ان کا قیام کرچہ فتح اللہ بیگ میں راجہ بھگوان داس سہائے کے ہاں رہا۔ انھوں نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ چونکہ مہاراجہ علم دوست تھے۔ اس لئے شعراء سے بڑا اچھا سلوک

کرتے تھے۔ ظہیر سے انھیں بڑا انس تھا۔

راجہ بھگوان داس بہادر حیدرآباد کے بڑے سیٹھ ہری داس متوفی کے خلف ارشد اور پرشوتم داس کے پوتے تھے اور راجہ بھگوان داس نے اپنے حسن اخلاق و مروت اور خوش معاملگی کی بدولت بڑی ناموری حاصل کی اور سرکار عالی میں نہایت عزت و وقعت پیدا کی تھی۔ فیاضی اور سیر چشمی میں شہرت پائی تھی یہاں راجہ بھگوان داس صاحب کا ذکر اس لئے بھی ضروری ہے کہ انھوں نے ظہیر دہلوی کو مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں پیش کیا مہاراجہ نے ان کی دستگیری کی اور ظہیر ان کی سرکار سے متوسل ہو گئے۔ چنانچہ ظہیر نے داستان غدر میں مہاراجہ کے مشاغل اور فیاضی کے حالات قلم بند کئے ہیں اس کے ساتھ ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظہیر حیدرآباد میں جن امیدوں کے ساتھ آئے تھے وہ پوری نہیں ہوئیں۔ ظہیر ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں داغ کا بھی طوطی بول رہا تھا۔ ظہیر کو داغ کے مقابلے میں وہ شہرت و منزلت نہیں مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران میں ان کی ملاقات عبداللہ خاں ضیغم سے ہوئی۔ عبداللہ خاں نے اپنے تذکرہ یادگار ضیغم میں ظہیر کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ نیز ان کے کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے بھی داستان ادب حیدرآباد میں مہاراجہ کشن پرشاد کی شعری محفلوں میں ظہیر کی وابستگی کا ذکر کیا ہے اور ظہیر کا مہاراجہ کی محفل کے صاحبان کمال میں شمار کیا ہے لکھتے ہیں :۔

"یہاں پر انھوں نے نظام دکن کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں۔ ان کا انتقال رام بابو سکسینہ کے قول کے مطابق ۱۹۱۱ء میں ہوا"

حیدرآباد میں چونکہ ظہیر دہلوی کا زیادہ دن قیام نہ رہا پھر بھی اس قلیل مدت میں انھوں نے ئی مشاعروں میں شرکت کی اور داد سخن حاصل کی ظہیر دہلوی صرف ۹ ماہ حیدرآباد میں رہے بقول عبدالشکور شیدا۔

"آخر عمر میں حیدرآباد آئے عبداللہ خاں ضیغم کے شاعرے میں زیارت بھی ہوئی اور بعد میں پھر ہوبیب کی زیارت بھی ہوئی بس تبرک ہی تبرک رہ گئے تھے۔[1]"

ظہیر صاحب حیدرآباد آئے تو اس وقت ان کی عمر بقول غلام صمدانی خاں گوہر حیدرآبادی اسّی سال کی ہوگی۔ تزک محبوبیہ میں لکھا ہے کہ وہ اس سے قبل ۱۲۱۲ھ میں بھی تشریف لائے تھے غرض حیدرآباد میں

---

[1] بیاض سخن مولفہ عبدالشکور شیدا۔ ص ۱۶۱

مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی ان کو بڑی قدر و منزلت کی اور اپنی جیب خاص سے ظہیر کے اخراجات کے لئے چالیس روپیے ماہوار مقرر کئے۔ بقول ڈاکٹر محی الدین قادری زور ظہیر دہلوی ... مہاراجہ کشن پرشاد کی اپنی خاص محفل کے صاحبان کمال میں سے تھے۔ مہاراجہ کے ہاں ماہانہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ محبوب الکلام گلدستہ اسی بزم کی طرف سے شائع ہوتا تھا کہ اس گلدستہ کے ایڈیٹر ہیرا لال نشاط تھے۔ ظہیر کی اکثر غزلیں اس میں شائع ہوگئی ہیں اس گلدستے میں غزلوں کا انتخاب اس بناء پر ہوتا تھا کہ مصرع طرح پہلے ہی دے دیا جاتا اور اس پر فارسی اور اردو میں مختلف صاحب فن طبع آزمائی کرتے اور اپنا نتیجۂ فکر بھجواتے۔ ظہیر کی چند مشہور غزلوں کے اشعار یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

رونا نیا نہیں ہے دل داد خواہ کا ۔۔۔ کمبخت کو مزہ ہے ہمیشہ سے چاہ کا

مقبول خاک عذر ہو دشمن کی چاہ کا ۔۔۔ کیا کہہ رہا ہے منہ سے چراتا نگاہ کا

جو آپ کا وکیل ہے میرا گواہ ہے ۔۔۔ کیوں رنگ اڑ گیا ہے لب عذر خواہ کا

لاریب اے ظہیر ہے اس میں کلام کیا ۔۔۔ ملک سخن ہے آصف عالم پناہ کا

آتے آتے جام مجھ تک چشم ساغر پھر گئی ۔۔۔ دور ساغر میرے حق میں گردش افلاک تھا

کیا بتاؤں کون تھا جو دل کو مجھ سے لے گیا ۔۔۔ شوخ تھا عیار تھا طرار تھا چالاک تھا

کل ظہیر خستہ کو دیکھا تھا با حال عجب ۔۔۔ چشم گریاں سینہ بریاں جیب و داماں چاک تھا

رسالۂ محبوب الکلام کے علاوہ گلدستہ فیض میں بھی ظہیر کی غزلیں شائع ہوئی ہیں ایک غزل کے چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نگاہ راہزن ہر گام پر آوازے کستی ہے ۔۔۔ مسافر گانٹھ سے ہشیار یہ چوروں کی بستی ہے

مری وحشت ہی کافی ہے مرے گھر کی تباہی کو ۔۔۔ در و دیوار سے از خود ہی ویرانی برستی ہے

شباب و ناز و نخوت اس پہ طرہ جوش مستی ہے ۔۔۔ نشیلی آنکھ ہے ساقی کی یہ مستوں کی مستی ہے

متاع جاں کی کیا پرسش ہے بازار محبت میں ۔۔۔ بہت مہنگی سی مہنگی ہے بہت سستی سی سستی ہے

زمانے کی دو رنگی کا مرقع ہے غم و شادی ۔۔۔ کہ شبنم شب کو روتی ہے نسیم صبح ہنستی ہے

حیدرآباد کے ان رئیسوں اور نوابوں کے علاوہ نواب محمد خاں وفا نے بھی ان کی خدمت کی ہے۔ اس دوران میں وہ کافی ضعیف ہو چکے تھے بقول عبدالشکور شیدا تبرک ہی تبرک رہ گئے تھے۔ پڑھنا تو گیا لطف داد سخن سے بھی محروم تھے کہ سماعت بھی جواب دے چکی تھی اس کے باوجود بھی اکثر شاعروں میں شرکت کے کتنے شائق تھے۔ مشاعروں میں محض اپنے ذوق کی تسکین کیلئے حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت

عمر تقریباً ۸۰ سے تجاوز کر گئی تھی۔ اسی حالت میں تقریباً آٹھ مہینے حیدرآباد میں رہے اور پھر ۹ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ اور سہ شنبہ دبستان دلی کا یہ آخری چراغ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گل ہو گیا۔ حیدرآباد میں وہ جتنے بھی دن رہے ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی لیکن جیسی کہ ایک نوواردِ شاعر اور عالم کی ہونی چاہیے تھی اور جس کے وہ مستحق تھے نہیں ہوئی۔ حیدرآباد کے استادانِ سخن نواب اور راجاؤں کے ذوق پر انھوں نے سخت تنقید کی ہے۔ اپنی تصنیف داستان غدر میں انھوں نے لکھا ہے۔

باوجود اس نشست خاطر کے خون جگر پی کر اور جان کو ہلاک کر کے کچھ کچھ کیا گیا تو انجام اس کا سوائے رشک و حسد حرف گیری کے کچھ نہ دیکھا گیا ناقدری زمانہ کا یہ حال ہے کہ ناقص کامل ایک نظر دیکھے جاتے ہیں کوئی قدرداں کمال نہیں۔

ان حالات کے مدنظر انھوں نے شعر و شاعری ختم کر کے گوشہ نشینی اختیار کی۔

اکثر تذکروں میں ان کا مدفن دائرہ میر مومن بتلایا جاتا ہے۔ داستان غدر میں آغا محمد طاہر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں کہ ظہیر نے حیدرآباد میں ۱۹۱۱ء میں انتقال کیا اور مرقد نعمت خاں عالی میں مدفون ہیں مولوی ترک علی شاہ ترکی اپنے سخنوران چشم دیدہ میں رقم طراز ہیں۔

"ظہیر در عمر ہشتاد سالگی در حیدرآباد رحلت کرد و مزارش دائرہ میر زیارت گاہ ہر کہ ومہ است"۔

نعمت خاں عالی کا مزار بھی دائرہ میر مومن ہی میں ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۰ سے آگے)

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے ۔۔۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

دیوانے کی مطلق العنانی ۔۔۔ ہے باعثِ مرگ ناگہانی

کس سوچ میں ہو نسیم بولو ۔۔۔ آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

کلام میں رنگینی اسی حد تک مناسب ہے جتنا کہ پھول میں رنگ اتنا ضرور ہے کہ نسیم نے بھی کبھی رنگوں کے امتزاج میں بے اعتدالی برتی ہے۔ اور آب و رنگ شعر کو اس درجہ شوخ کر دیا ہے کہ اس پر تصنع یا غیر فطریت کا گمان ہونے لگتا ہے۔

میر نقی علی خاں ثاقب

غزل

قرارِ رشتۂ جاں جب بھی ٹوٹ جاتا ہے
ترا خیال کھنڈر میں دیئے جلاتا ہے

وہ پچھلی رات ترے عنبریں بدن کا گداز
دبے سروں میں کوئی بانسری بجاتا ہے

ابھی حیات پہ تہمت ہے بے چراغی کی
ابھی شعور کہاں راستہ دکھاتا ہے

کسی سے طے نہ ہوا اپنے جسم کا صحرا
یہ قرب وہ ہے کہ جو فاصلہ بڑھاتا ہے

مرے قریب کچھ اس طرح آ رہی ہے حیات
کہ جیسے تھک کے مسافر قدم بڑھاتا ہے

بہت سی وسعتِ زنداں سمیٹ لائی ہیں
[illegible]

نصیر پرواز

غزل

بئی سوزِ نفس سے جب بھی مرجھاتا ہوں میں
اشک بنکر اپنی پلکوں پہ ٹھہر جاتا ہوں میں

نت کے ماتھے پہ میرا نام کس نے لکھ دیا
اس قدر تنہا ہوں اور رسوا ہوا جاتا ہوں میں

ظ گر جائیں گے ہونٹوں کو ابھی جنبش نہ دے
احتیاطِ فکر کا مفہوم بتلاتا ہوں میں

ں قدر نزدیک آتی جا رہی ہے روشنی
اپنے ہی سائے سے اتنا خوف سا کھاتا ہوں میں

ـاہی مرکز پہ ٹھہرا ہے غرورِ آگہی!
دیکھ کر دیمک زدہ دیوار گھبراتا ہوں میں

ری خوشبو غنچہ غنچہ میری رنگت پھول پھول
بن سنور کر جب بھی اٹھتا ہوں بکھر جاتا ہوں میں

بنات خودشناسی آئینہ در آئینہ
ایک پتھر بن کے ہر شیشے سے ٹکراتا ہوں میں

ندگی کو اس طرح اندھی روایت کھا گئی
جس طرح اکثر فریبِ دوستی کھاتا ہوں میں

چھپاتا پھرتا ہوں ہر اک آشنا سے اپنا نام
کس طرف سے آرہا ہوں اور کدھر جاتا ہوں میں

پہ طعنہ زن ہے میری خودستائی کا ملال
زندگی کو کتنی بیدردی سے ٹھکراتا ہوں میں

مجھ کو اپنی کم نصیبی پر بھی کتنا ناز ہے
کچھ کہے دنیا مگر پرواز اتراتا ہوں میں

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمن خاں
منشا

تضمین بر کلامِ اقبالؒ

جہانِ مہر و ماہ و کہکشاں تیرا ہے یا میرا
فلک پہ ہر طرف سکہ رواں تیرا ہے یا میرا
نظامِ گردشِ سیارگاں تیرا ہے یا میرا
اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا — مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

زہے یہ عزمِ بے پایاں خوشا یہ ہمت عالی
سما سے تا سمک میرا نہیں ہے کوئی تمثالی
یہاں تو دھوم میں نے جذب و مستی میں مچا ڈالی
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی — خطا کس کی ہے یا رب لامکاں تیرا ہے یا میرا

یہ عقدہ کھول دے تو ہی ذرا اے داورِ محشر
عبادت میں جسے تھی فوقیت جن و ملائک پر
تری درگاہ میں دائم جھکا رہتا تھا جس کا سر
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر — مجھے معلوم کیا وہ راز داں تیرا ہے یا میرا

میں بندہ ہوں ترا اور تابع فرمان بھی تیرا
مرا ہر بال ہے شرمندۂ احسان بھی تیرا
اجازت ہو تو پوچھوں تجھ سے دکھ کرمان بھی تیرا
محمد بھی ترا جبریل بھی قرآن بھی تیرا — مگر یہ حرفِ شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

فرازِ چرخ سے بھی تھا پرے جس کا کبھی مسکن
نظر سے گر کے تیری وہ زمیں پر آ رہا فوراً
ستاروں پر دمک جس کی مگر ہے آج خندہ زن
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن — زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

بشیر احمد طاہر

جگا رہا ہے جھنجھوڑ کر اب ہر ایک غافل کو یوں زمانہ
کہ اس کی ذلت لگا رہی ہے اسی کی غفلت پہ تازیانہ

اگر ہے ایمان تیرا محکم، تو کیوں تذبذب کا ہے یہ عالم
چلا کر یہ تیر وہ ہے جس کا نہیں ہے ہوتا خطا نشانہ

یہ تیری تقدیر کیا ہے بس اک بہانہ ہے پست ہمتی کا
بڑھا قدم آگے سر بکف ہو، نہ کر تو تقدیر کا بہانہ

اگر تو دل میں اُتر کے دیکھے، سفر ہے یہ تیری زندگی کا
سمجھ رہا ہے وگرنہ اے دل تو روز و شب کو رمِ زمانہ

فروغ پائے حیات جس سے وہ روشنی بخش زندگی کو
تو در حقیقت ہے مہرِ تاباں، نہ بن کے رہ جا چراغِ خانہ

یہ سرفروشانہ جراتوں کی، یہ جوش و ہمت کی باتیں اے دل
ہے تیری تقریر ایسی جیسے سنا رہا ہے کوئی ترانہ

حشم الرمضان

غزل

عرضِ تمنا پر میری اُن ہونٹوں پر مسکان تو ہے
چاہے لاکھ نہ برسے بادل، بارش کا امکان تو ہے

جرم اگر ثابت نہ ہوا تو کیا پروا، بہتان تو ہے
پاگل کہہ کر یا بہ سلاسل کر دینا آسان تو ہے

سیرت میں ہو چاہے درندہ، صورت سے انسان تو ہے
باطن چاہے پست ہو جتنا، ظاہر عالیشان تو ہے

مکر و ریا کی اس بستی میں تیری کون سنے اے دل
چاہے وہ انصاف نہ بانٹیں، ہاتھوں میں میزان تو ہے

اتنی دور سے چل کر آئے، آپ بھی کتنے بھولے ہیں
مہر و وفا کی اس بستی میں رہئے گا؟ ویران تو ہے

آپ تو کہتے تھے اپنے ہیں، مڑ کے انھوں نے دیکھا بھی!
شرمندہ ہوں، کیا بولوں، میری اُن سے پہچان تو ہے

باطل کی یہ بالادستی اب بھی ہمیں تسلیم نہیں
لاکھ ہوئی پسپائی اپنی جان میں اب تک جان تو ہے

فرق بس اتنا ہے، میں اس کی سرکوبی کر دیتا ہوں
سرکش میری آنکھوں میں بھی اشکوں کا طوفان تو ہے

چھیڑے جو ہر بات ہی منہ کی ایسا بھی کوئی شاعر ہے
ایسا شاعر، ایسا شاعر، ہاں حشم الرمضان تو ہے

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

شعاعوں کی صلیب :— پروفیسر کرامت علی کرامت ، ناشر "شاخسانہ" پبلی کیشنز بخشی بازار کٹک اڑیسہ صفحہ ۱۰۴ ڈیمی سائز خوبصورت گٹ اپ قیمت چھ روپے۔

پروفیسر کرامت علی کرامت نے علم و فضل کے گھرانے میں آنکھ کھولی شعر و ادب کے ماحول میں پرورش پائی۔ فن شعر میں امجد نجمی سے مشورہ کرتے رہے۔ اردو مادری زبان ہے۔ عربی فارسی انگریزی بنگالی سنسکرت اور اڑیا زبانوں سے واقفیت نے ذہن کو روشن فکر و تصور کو بلند اور قلب کو وسیع کر دیا اور سارے جہاں کا درد جگر میں بھر دیا۔ کتاب میں ان کے اثرات جگہ جگہ کار فرما نظر آتے ہیں۔ کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔ باغبانیٔ صحرا کے تحت نظمیں ہیں بادۂ شیشہ گداز کے تحت غزلیں اور رانی تا افق کے زیر عنوان اڑیا اور بنگالی نظموں کو اردو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ ابتدا میں اپنی سوانح حیات اور شاعری کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جس سے ان کی شاعری کے تدریجی ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ان نظموں میں ایمائیت و اشاریت ہے۔ علائم جو استعمال کئے گئے ہیں وہ بعید از فہم نہیں ہیں نظموں میں تین مرثیہ نما نظمیں ہیں ایک والد مرحوم کی اور دو دوستوں کی یاد میں ہیں۔ ان میں ندرت خیال بھی ہے اور اثر انگیزی بھی۔ دو نظمیں بچوں سے متعلق ہیں۔ بچے بڑے ہو کر شمس و قمر کا نظام بدل سکتے ہیں۔ بھوک اور کلا ایک مناظرہ ہے اور سعدی کے خیال کی یاد دلاتا ہے کہ ؎ "یاران فراموش کردند عشق" لیکن کلا کی زبان سے کہلوایا ہے ؎

گلشن دہر میں تو آگ لگا سکتی ہے　　　میں مگر آگ میں بھی پھول کھلا سکتی ہوں
جس چمن زار کو ویران کیا ہے تو نے　　　خاک سے اس کی دوبارہ اگا سکتی ہوں

نظمیں پاکیزہ اور بلند خیال کی حامل ہیں اور دعوت فکر و نظر دیتی ہیں۔ بادۂ شیشہ گداز کے تحت غزلیں ہیں ان میں تخیل کی جولانیاں بھی ہیں اور عصر حاضر کی سماجی رفتار کا جائزہ بھی تغزل کی شان بھی ہے اور جدت ادا بھی۔ ایک دو شعر پیش ہیں۔

کوئی ضروری نہیں ہے غم کو میں پیکر شعر ہی میں ڈھالوں　　　چبھو کے سینے میں اپنے نشتر ترانہ گاتا ہوں خوشی کا
اک سہارا ملا ہے غم کا ہمیں　　　ورنہ دنیا میں کون کس کا ہے
خزاں گزیدہ بہار رویا تبار اکھڑی　　　مری شکستہ تمنا کی تازگی کیلئے

دو تین شعر اور دیکھئے اور تشبیہوں کی داد دیجئے۔

یوں دیکھتے ہیں مجھ کو وہ بیتابہ نظر سے　　　جس طرح سخن سنج کوئی داد کو ترسے
برسات کی ... [illegible]　　　جس طرح غزل گو نئے مضمون کو ترسے

نکھرا ہوا یہ حسن یہ نکھرا ہوا شباب — ہر سکوت جاری ہو جیسے رباب سے

تیسرے حصہ انتخاب میں اڑیا اور بنگالی نظموں کے ترجمے ہیں اور ان سے ہمیں اڑیا اور بنگالی کے شعرا سے متعارف ہونے کا موقع ملا ہے۔ شاعروں کی صلیب شعری ادب میں گراں قدر اضافہ ہے اور یقیناً نہایت دلچسپی اور ذوق و شوق کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا جائیگا۔

آواز کا جسم :- مخمور سعیدی۔ ناشر پی کے۔ پبلی کیشنز گول مارکٹ دریا گنج دہلی ۶ ڈیمی سائز مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ کتابت اور طباعت معیاری صفحہ ۱۲۰ قیمت دس روپے۔

مخمور سعیدی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مخمور موجودہ دور کے شعراء میں اپنے خیال کی ندرت اور طرز اظہار کی جدت کیلئے اونچے مقام کے حامل ہیں۔ ان کا تخیل مستقبل کا شاہین بن کر اڑتا ہے لیکن ماضی سے اپنا دامن چھڑانے کیلئے تیار نہیں ایک امتزاجی کیفیت کا اکثر مقامات پر اظہار ہوتا ہے۔ وہ آزاد نظموں میں جن جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں غزلوں میں بھی انہیں کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ عام قاری کو کلام کے مطالعہ کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ یاسیت کی فضا میں گھوم رہا ہے۔ ہمارے شعراء کے تخیل پر سماجی حالات نے یاسیت کی ایک ردا اوڑھادی ہے۔ آزادی کے بعد وہ جس روشنی کے متمنی تھے وہ نہ مل سکی بلکہ فضا دھندلا گئی اور کملا گئی۔ عمال کی بد اعمالیوں نے سارے سماج کو گدلا دیا۔ رہنماؤں نے رہزنی کی تو مستقبل کی تابناکی دھندلکوں میں ڈوب گئی۔ ہمارے شعراء کا تصور اسی سماج کے اثرات قبول کرکے شعر کا تانا بانا بنتا ہے۔ نظم ہو یا غزل ایک سے ملتی ہے۔ وہ وقت کی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں اور زندگی کے کھوکھلے پن کو آشکارا کرتے ہیں اور جب صورت حال یہ ہو تو فراریت ایک لازمہ بن جاتی ہے۔ لیکن یہ فرار زندگی سے نہیں بلکہ اس کے کھوکھلے پن سے ہے۔ دو شعر ہیں ؎

ہوا میں نور نہ نکہت نہ رنگ صرف دھواں — فضا ہے کتنی مکدر یہاں سے بھاگ چلو

کوئی دیا کبھی جلتا تھا دل کی چوکھٹ پر — وہ بجھ گیا کہ تری راہ دیکھتے کتنی

نظموں میں بھی اشاریت اور ابہام سے زیادہ صاف گوئی اور دو ٹوک اظہار ملتا ہے۔ کلام میں تشبیہیں اور استعارے بھی استعمال ہوئے ہیں اور وقت کی اہمیت کا احساس پیدا کرنے کی سعی بلیغ کی گئی ہے ——

ایس۔ جے۔ صادق

قہقہہ زار :- صفحات ۲۰۸ قیمت چار روپیہ۔ خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس (مہاراشٹرا)

شگوفہ زار :- صفحات ۳۱۶ قیمت دس روپیہ خواجہ عبدالغفور آئی اے ایس (مہاراشٹرا)

ناشر حلقہ ارباب ذوق بمبئی۔

وقت واحد میں ہر دو کتابوں پر تبصرہ اسلئے ضروری ہے کہ دونوں کتابوں کے مواد میں ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ ہے۔

قہقہہ زار کے بہت سارے لطیفوں کی تشریح اور ان کے ادبی جواز کو شگوفہ زار میں پیش کیا گیا ہے۔ قہقہہ زار لطیفوں کی کتاب ہے اور شگوفہ زار ایک تحقیقی مقالہ۔ شگوفہ زار اُردو طنز و مزاح کے تحقیقی سفر میں ایک اہم سنگِ میل اور مجموعی طور پر اُردو ادب کے ذخیرہ میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ شگوفہ زار قابل مصنف کی عرق ریزی، سنجیدہ کاوش اور موضوع سے تحقیقی دلچسپی کا نتیجہ ہے کتاب کا ایک بڑا حصہ ریسرچ اسکالر کیلئے گائیڈ بک کا کام دیتا ہے۔ اور یہ اُردو ادب میں بالکل نئی چیز ہے اور نئے انداز سے پیش کی گئی ہے۔ مزاح سے تعلق رکھنے والی کم سے کم ڈیڑھ سو اصطلاحات پر نظر ڈالی گئی ہے ہر اصطلاح کی تشریح کرتے ہوئے اس بات کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ موزوں مثال بھی پیش کی جائے۔ بہت ساری انگریزی اصطلاحات کا مناسب اُردو ترجمہ بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ اُردو میں مزاحیہ صحافت کے تحت مزاحیہ اخباروں کے نام اور بعض اخباروں کے مزاحیہ کالموں کے عنوان کالم نگار کے نام کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔ مزاح گو شعرا اور مزاح نگاروں کا تشفی بخش جائزہ نہیں لیا گیا اور نہ ہی تقدیم و تاخیر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ جدید دور کے شعرا بیشتر بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اصطلاحات کی تشریح جو ڈکشنری اور انسائیکلو پیڈیا کا انداز لئے ہوئے ہے۔ بڑی حد تک مکمل کہی جا سکتی ہے گو یہ حصہ مبسوط مقالے کی صورت میں ہوتا تو بہت بہتر تھا۔ ہماری ہمہ گیر تحقیقی نقطۂ نظر رکھنے والوں کیلئے شاید شگوفہ زار کا یہ حصہ خاص طور پر اور کتاب کا ایک بڑا حصہ عام طور پر تشنہ محسوس ہو اور انہیں مایوسی کا سامنا ہو مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عام قاری کیلئے یہ کتاب گراں مایہ تحفہ ہے۔ بادی النظر میں قہقہہ زار کے مقابل شگوفہ زار ایک بہت پھیکی کتاب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سارے لطیفے پہلی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ باوجود اس کے کہ قہقہہ زار کے اکثر لطیفے ہماری نظر سے گذر چکے ہیں پھر بھی بعض لطیفے بالکل نئے ہیں اور عام دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ قہقہہ زار ایک عام قاری کیلئے دلچسپ کتاب ہے تو شگوفہ زار تحقیقی ذوق رکھنے والوں کیلئے دلکش۔ شگوفہ زار میں مرد پرستی اور جنس کا موضوع بالکل عریاں ہو کر سامنے آیا ہے اور ذوقِ سلیم پر اکثر باتیں بار گزرتی ہیں۔ جس کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھنا چاہیئے مگر اس موضوع پر قلم اٹھانے سے پیشتر کافی سوچ بچار کی شدید ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ایک رڈرن پر نظر پڑتے ہی خیال اچانک اور لازمی طور پر جنسی فعل کی جانب چلا جاتا ہے۔ جنسی مزاح کو ایمائی و اشاری ہونا چاہیئے ورنہ سماج میں بھونڈے ذوقِ مزاح کے راہ پانے کا اندیشہ ہوگا۔ مصنف نے حتی المقدور اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان تمام ذرائع کا پتہ چلایا جائے جو ہماری دلچسپی اور شگفتہ مزاجی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اس خصوص میں مصنف نے ہوا محل پروگرام من خراب ڈ کے مہمان اور جوہر کے جواب کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔ یہ ریڈیو پروگرام ہمالیہ سے راس کماری تک سنے جاتے ہیں ہر اُردو ہندی جاننے والا ان کا شائق ہے لطیفوں کے کالم کے سلسلے میں مصنف نے ریسں ڈائجسٹ السٹریٹڈ ویکلی اور شمع کی بزم شمع کو نظر انداز کیا ہے جبکہ لاکھوں لوگ ان لطیفوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں بعض لوگ تو لطیفوں کی خاطر ان رسائل پر ایک نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ دونوں کتابوں کی طباعت ایک حد تک گوارہ۔ گٹ اپ خوبصورت ہے۔ زار کی قیمت واجبی اور شگوفہ زار کی قیمت سرِ بگر بیاں کرنے والا ہے۔

دیوان حسینی

ادائے دلفریب دلربا ہے
کہ جس کی ہر ادا میں غلغلا ہے
صنم کے چشم میں ہے مردمک یوں
بھنور جیوں نیلوفر پر مبتلا ہے
دھڑی مستی پو یوں ہے سرخی پاں
کہ جیوں نیلم پو یاقوتی جلا ہے
مصور نے کہا ہو حیرت افزا
میانِ ماہرو کیا کم نما ہے
حسینی دل مصفا کیوں نہ ہووے
خم ابرو کا جس کو مصقلا ہے

سیر گلشن کوں یار آیا ہے
از سر نو بہار آیا ہے
کیوں رہے ہوش اہل گلشن کا
دیکھ دلبر سنوار آیا ہے
دیکھ گلشن منیں عنادل سب
کہا اٹھے گلعذار آیا ہے
ہو گئے گلہار گل ہیں رہنے کوں
وہ در شاہوار آیا ہے
کیوں رہے دل نہ شادماں ہو کر
یار ہو یار بار آیا ہے
وحشیٔ دل کوں صید کرلینے
کس اداسوں نگار آیا ہے
بے حجابانہ ہو حسینی کے
دلربا در کنار آیا ہے

دینا درس لاچک سوں چک دلدار کا دستور ہے
نظروں میں کرنا مبتلا جو نار کا دستور ہے
باطن میں یک تن ایک[۱] ظاہر ہو دو دسیں
یاری نبھانا اس وضع[۲] اس یار کا دستور ہے
بن جیو کچھ[۳] رشوت نہ لیں درکار سازی پریت
اے بادشاہ حسن تجہ دربار کا دستور ہے
آوصل وے کہتا رہوں ہیں کر دفع درد ہجر کوں
صحت بجز مانگے نہ کچھ بیمار کا دستور ہے
دلبر حسینی کوں دکھو راکھے اپس گلہار کر
دن رات رہنا گل منیں گلہار کا دستور ہے

صنم ہر دم پر آشوب و ادا ہے
وفاداری میں جیوں رنگ حنا ہے
تبسم دیکھ گل کیتا قبا چاک
موہن کا مسکرانا کیا بلا ہے

---

(۱) اننگ من ظاہر ہیں ہو کر (۲) روش (۳) رشوت کچھ۔ (مخزن امین)

دو رشکِ خوبیٔ آں قد نازک صنوبر حیرت افزا ہو کھڑا ہے
ستم کرنے کوں سر کا تیغ ابرو * وو ہے جس گل میں گلناری قبا ہے
حسینیؔ دیکھ کر مجکوں سراپا
صنم ہر دم پر آشوب و ادا ہے

عجایب نازنیں کی دلبری ہے سپرلا دلبری میں زرگری ہے
مذاقِ عشق بازی نیں ہے جس کوں قدم میں اوس کے ہر دم کج روی ہے
وفا اس کوں اچھے کیوں گل رخاں میں جسے عاشق سوں الفت سرسری ہے
وفاداری میں یکسو وو اچھے کیوں کہ جس کے دل میں کینہ کافری ہے
حسینیؔ دل نہ لا تا لبِ وفا سین
اگرچہ شکل وہ شکل پری ہے

اگر خورشید رو گلشن میں آ مج ساتھ مل جاوے زسر تا پا ندامت سوں رقیب از رشک جل جاوے
تبسم گر کرے گل رو چمن میں بے حجابی سوں ز حیرت غنچہ وا ہو کر بعزت پل میں کھل جاوے
اگر اس شوخ کی باکلی اداخوں ریز کوی دیکھے ز تاب حسن ادھر دم نگہ کے یک پھسل جاوے
نگاہ عشوہ گر صحرا طرف جاوے تو کیا ہووے غزال آشفتہ ہو تجہ پگ سوں آنکھیاں کر مل جاوے
صنم آشوق سوں بر میں مزہ عیب وصل کا دیکھے
مئے وحدت کوں پی موہن حسینیؔ سوں مل جاوے

دلبری کا شوخ دلبری کر گئے دلبری سات دلبری کر گئے
مجہ میں عاشق کے ساتھ بے خود ہو عشق بازی میں ہمسری کر گئے
ملک دل کوں صنم کر تسخیر کس نزاکت سوں داوری کر گئے
دھرا دھر پہ ادھر سینے کو لگا گھات مجہ سات وہ پری کر گئے
مدنین سوں نین حسینیؔ کے
ماہ (رو) سحر سامری کر گئے

شوخیٔ شوخ سب سوں نیاری ہے سب میں آدھی ہے اس میں ساری ہے
کچھ اوپر گلبدن کے دینے بار جو نداں تن پو گل اناری ہے
جن کے دل پر لگیا ہے نشترِ عشق وہ سدم اس کوں بے قراری ہے

لذت دید کا جسے ہے مذاق
چشم سوں اس کے اشک جاری ہے

زیب دینے کتاب حسن اوپر
خط جدول ہے یا کناری ہے

جب سوں دیکھا صنم کی میگوں چشم
تب سوں آنکھوں میں مجھ خماری ہے

کیوں حسینیؔ کے دل کوں ہووے قرار
وصل پانے کی اضطراری ہے

عاشق دید کیوں دو ٹل جاوے
غیرت عشق سوں پگل جاوے

عین ہو عین کا کوئی جب سیر
صورت غیریت نکل جاوے

عین مطلق آپ ہو کر شاہد
دمبدم ذوق پا کو بل جاوے

ہستی عین عین مطلق جان
اس میں ہو کر محیط مل جاوے

ہے حسینیؔ جسے مذاق شہود
اس کو مشہور ذات کھل جاوے

دل مرا تجھ نال ہیگا مدعا کے واسطے
بیوفائی اوس سوں مت کیجو خدا کے واسطے

حق بدست خویش کھینچا ہے اے اُنے قبلہ رو
تجھ خم ابرو کوں محراب دعا کے واسطے

مونس و ہمدم ہوا ہے دمبدم در سینہ آہ
ناتواں کو راہ غربت میں عصا کے واسطے

میں نہ جانوں کس رقیب رو سیہ کے فن ستی
غمزۂ ناشاد ظالم ہے خفا کے واسطے

اے حسینیؔ کس سوں نئیں رہنے چشم امید
راز گوئی ناروا ہے مرحبا کے واسطے

جس ذہن میں یار کی تصویر ہے
اس کے گل میں عشق کی زنجیر ہے

عجز سوں جو نقش پائے یار ہے
اور رہ تسلیم میں ہموار ہے

فکر ظاہر کوں کیا منفک جو کوئی
اہل معنی میں وہی ہوشیار ہے

دیدۂ ماہی کی جو دھرتا صفت
وہ صنم کے روبرو چک چار ہے

نفس کی خواہش کیا جو کوئی عدم
او خفی میں صاحب اسرار ہے

قربیت[1] کہتے اوسے جو یار سوں
ایک کا یک جسم یک گفتار ہے

---

[1] قربیت کہتے اوسے جو یار سوں ؛ ایک دل یک جسم یک گفتار ہے۔

یک جھلک سے کل کے تئیں روشن کیا — یو حجاب مظہر انوار ہے
مو بمو ہے جلوہ گر جس میں صنم — قم باذنی گفتنش کیا بار ہے
جو پیا ہے بادۂ توحید کوں — جنم میں یک رنگ ہو سرشار ہے

یوں حسینی شرع پر قایم رہنا
حکم جیوں از صاحب اسرار ہے

دل مرا مجہ پاس نہیں ہے دل ربا کے نال ہے — نام جس کا چنچل چھبیلی کا جو صاحب لال ہے
کیوں نہ دل بیتاب ہو دیکھ تجہ ابرو کا کھب — کھب نہیں اے دل ربا جل جس بلنے بال ہے
ماہ نو خورشید ابروئے سیما پر تری — لب یو تجہ کان یمن لعل تر یاں لال ہے
مردمک میں اے صنم دایم دسے تو جلوہ گر — نور کے انکھیاں منیں یو آئینہ بے تمثال ہے
مکھ اوپر تیرے سجن کیوں کر نہ پاوے زیب حسن — نور اسود کا نقطہ دستا سو ہر یک خال ہے
دیکھ کر ہر سرو تیرے معتدل قامت کے تئیں — منفعل ہو در چمن کیا رشک سیں پامال ہے

اے صنم بزم میں حسینی کے بصد ناز و ادا
تجہ سے ہم آغوش ہونے شوق مالا مال ہے

جس کے گل میں پیو کا زنار ہے — کفر میں او صاحب اسرار ہے
بت پرستی کام ادنا ہے او سے — اس مسلمانی سوں وہ بیزار ہے
بہتر از اسلام ہے کفر صنم — ظاہری لوگاں سوں کیا تکرار ہے
زاہد از زہد ریا ہو خشک خوب[1] — در جہنم شعلۂ یک تار ہے
راز کاف کفر کا پایا ہے جو — بت پرستاں کا وہی سردار ہے
عین او اسلام بوجھے کفر کوں — شرع میں جو فعل سوں مختار ہے
بت پرستی عین ہے حج کبیر — اہل معنی کا یہی اقرار ہے
سجدۂ بت بہتر از طاعت شدہ — کیا سبب جو حاصل دیدار ہے

اب حسینی کون سمجھا کفر کوں
جس نے وہ بوجھا سو لا گفتار ہے

---

[1] غالباً چوب ہے (خشک مغز و خشک تار و خشک چوب) "مثنوی مولانا روم"

سُرودی[1] کا عجب نازک گلا ہے — کہ جس پر جملہ عالم مبتلا ہے
سمجھتے کیوں نہیں آواز کے تئیں — کہ یہ بھیروں سری ہور ینکلا ہے
کریں تشخیص سب سکرائے کرکر — کہیں پھر میگھ کا چھایا ملا ہے
نمی سوں ذات بن کر آب سو نور — خواجل روح اور ناجیوں ملا ہے
اسی خواہش ستی ہر اک بشر میں — شیوق ماہیت یک دیولا ہے
اسی وضع سوں تبدیل آواز — کہ فیض ذات سوں جیوں سلسلہ ہے

حسینی جس کے تئیں آواز کہتے
سو بھی اچھر ستی وہ تر ملا ہے

بے خود ہو سجن سینی دل لانے کو کیا کہیئے — تجہ دید کے سودے کے مستانے کو کیا کہیئے
مشہور ہیو شاہد ہو دکھلانے کو کیا کہیئے — بینش میں محیط ہو کر رل جانے کو کیا کہیئے
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

تجہ عشق کے سودے سوں آرام نہیں مجہ کوں — بے کل ہو تڑپنے بن کچھ کام نہیں مجہ کوں
انکھیاں کے بجز مسکن ولبرام نہیں مجہ کوں — جز شاہدی شاہد انجام نہیں مجہ کوں
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

درپن میں جب انکھیاں کے بے خود ہو نہاتا ہوں — تب شاہد ہیچوں کوں مشہود میں پاتا ہوں
اس ہستی مطلق میں ہستی کوں گنواتا ہوں — اس عالم ہیچوں میں بیچوں کو دکھاتا ہوں
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

لازم ہے عبادت میں شاہد ہو الیس جزنا — مشہود میں فانی ہو باقی پو خدا ہونا
یو داغ بندے پن کا کس وضع ستی دھونا — اس شاہد مطلق میں مطلق ہو الیس کھونا
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

جب نور کے دریا میں یک رنگ ہو جاوے گا — امواج نمن سر کو ہستی سوں اوچاوے گا
منصور ہو سولی جس اپ اپسکوں سراوے گا — تب راز حسینی گنج مخفی کا بتاوے گا
کیا کام کیا دل نے دیوانے کو کیا کہیئے

1۔ صرف مخزن ابجد میں۔

فارسی کلام

صنم بطعن مرا یاد می کند چہ کنم | دل شکستۂ ما شاد می کند چہ کنم
بغیر یاد تو یاد دگر مباد مرا | دلم ز عشق تو فریاد می کند چہ کنم
بتار زلف گرفتار کردہ دل را | ز تار فتنہ چہ ایجاد می کند چہ کنم
بر عارضت کہ نہادہ است خال مسکین را | کہ داد ہا ہمہ برباد می کند چہ کنم

نوید شوق فرستادہ است حسینی را
بغمزہ ہا ہمہ ارشاد می کند چہ کنم

در بزم دلدار دارم انتظار کیستم | جاں بدست یار دارم جاں نثار کیستم
خوردہ ام مے از نسبت یارم چہا دل مست گشت | عاشق و معشوق خویشم بے قرار کیستم
زلف دام آسا کمند صید ما تم کشتہ است | مرغ جاں چوں شد اسیر او شکار کیستم
سرخی در چشم من عکس رخ یار من است | لالہ ام در باغ وصلت داغدار کیستم

اے حسینی جز خیال یار در دل جا مدہ
صحبت دلدار دارم آہ یار کیستم

نیست بر ابروے تو خال سیہ اے نازنین | قصد صورت داشتہ زنگی رسید از راہ چین
زلف یا زنجیر قدرت دام یا مار سیاہ | موج بحر ہستی عشاق یا موے عنبریں
از نگاہ دیدہ پر آشوب شاہنشاہ حسن | فتنہ ہا برخاستہ بر دید خوش رائے ہمیں
سرو بستان عدن یا قامت نخل مراد | یا قدرت را حق ز قدرت آفریدہ ایں چنیں

اے حسینی از نگہ صد پیچ و تابی میخورد
بس نزاکت دارد آں موے میان یار ہیں

ہر آنچہ می نماید ایں خیال است | تو بینا شو ببین خود را چہ حال است
توی ناظر توی منظور الحق | نظر در مطلقیت بے مثال است
نظر در ہستی خود چوں شود ہضم | در آنجا خود بخود عین وصال است
نمی بینم کسے جا خود نمائی | ہمہ جا می نماید قیل و قال است

بغیر از شاہد خود نیست کاری
حسینی را از و ذوق کمال است

[illegible] ... خاتم ... ہست ... آں ... میاں ... ہیں

نگاہ[1] یار دلم بردمن چہ چارہ کنم — درون جسم ببینم دراں نظارہ کنم
شراب خوار الستم حسینی از لب یار — شراب وصل بنوش و بہ ہیراشارہ کنم

فرد

صفا ہوکر صفا کروں دیکھ یکبار — دِسے مرات ممکن ہو نمودار

اے نظر تو کیستی خود را بنگر — تو منزہ گنج مخفی نہ دگر
ہستی تو گنج مطلق سربسر — ائے حسینی تو مباش از خود گذر

فرد

مردمک بتخانہ شد من بت پرستی می کنم — در تصوّر ہائے بُت گم کردہ ام بتخانہ را

نور عین مصطفیٰ و مرتضیٰ — واضح گنج خفی کبریا
نیست جز تو قبلۂ حاجات ما — ما گنہ گاریم و عاصی پر خطا

یا امین الدین علی شیر خدا
مشکلم بکشا شہ مشکل کشا

وائی جز تو ندارم ہیچ کس — یاد تو کافیست ما را پیش و پس
فضل کن برمن تو اے فریاد رس — نام تو گوید دلم مثل جرس

یا امین الدین علی ......

در خیالات دلم موجود تو — در نظر و ز جاں ہمہ مقصود تو
در تصور ہائے ما مورود تو — در شہودم شاہد و مشہود تو

یا امین الدین علی ......

از گرفتارئی نفس آزاد کن — خانۂ قلبم ز نور آباد کن
روح را عرفان خاص امداد کن — نور را از نور مطلق شاد کن

یا امین الدین علی ......

ائے شفیع المذنبیں بندہ نواز — حل مشکل ہا بکن ائے کارساز
کن حسینی را ز لطفت سرفراز — سرّ پنہاں را بکن برمن تو باز

یا امین الدین علی ......

---

[1] معارف مخزن الاسرار

ندارم یا الٰہی جز تو پناہے ۔ ز فضل خویش بر من کن نگاہے
مرا ہنما شہنشہ شاہ را ہے مقامے دہ مرا در بارگاہے

تجرد دہ مرا در حال تجرید
تفرد کن مرا در حال تفرید

مرا از بحر عصیاں تو بروں آر ز شوقت کن دل ما را خبردار
کہ تا واقف شوم از سر اسرار ز عشق تو مرا کن مست و سرشار

تجرد دہ مرا در حال تجرید
تفرد کن مرا در حال تفرید

دل پر درد را ہر دم دوا تو تمامی گم رہاں را رہنما تو
شفیع المذنبیں روز جزا تو مرا کشاف راز کبریا تو

تجرد دہ مرا در حال تجرید
تفرد کن مرا در حال تفرید

رہائی دہ مرا از نفس بدکار دل ما را زیادت کن تو ہشیار
خیال روح ما از غیر بردار شود عرفاں ز نورت نور یکبار

تجرد دہ مرا در حال تجرید
تفرد کن مرا در حال تفرید

حسینی از خودی خود جدا باش ز ہستی نظر بگذر فدا باش
ورا در مطلقیت با خدا باش دریں رہ رہرو راہ ہدا باش

تجرد دہ مرا در حال تجرید
تفرد کن مرا در حال تفرید

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۵ شمارہ (۵)

مئی ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

سید علی اکبر ایم اے کینٹب

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں۔ محمد منظور احمد۔

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم
محمد جمال الدین

منتظم
وقار خلیل

زر سالانہ آٹھ روپے زر ششماہی چار روپے
غیر ممالک سے پندرہ روپے فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدر آباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

حصۂ نظم

دیوان حسینی

اپنی بات

۶ مارچ کو میں نے ایک تقریر سنی جس نے مجھے متاثر کیا' نشر کی۔ اس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا :-

"سٹی کالج کے پرنسپل جناب سید محمد اعظم (نواب اعظم جنگ) تھے۔ طلبا تو طلبا، بعض اساتذہ کو بھی انھیں دیکھنے یا ان تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ ان کا رعب طلبا اور اساتذہ سب پر چھایا ہوا تھا۔ سب ہی ان سے ڈرتے تھے اور ان کے سامنے جانے کی جرات بہت کم لوگوں کو ہوتی تھی۔ امتحان کی فیس داخل کرنے کا زمانہ آیا۔ ہمارے بعض ساتھی اپنی ناداری کی وجہ سے فیس دینے کے قابل نہ تھے۔ انھوں نے معافی فیس کی درخواست دی۔ پرنسپل صاحب نے انھیں بلایا حالات دریافت کئے اور ان کی فیس معاف کر دی۔ ہم حیران کہ امتحان کی فیس کیسے معاف ہو سکتی ہے۔ پتہ چلا کہ پرنسپل صاحب نے ان طلبا کی فیس اپنی جیب سے ادا کر دی ہے۔ سٹی کالج میں ان کی داد و دہش کے قصے مشہور ہیں۔ ایک دن طلبا نے نظام ساگر دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ تقریباً سو طلبا تھے۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ طلبا صبح کا ناشتہ میرے گھر پر کریں گے اور وہیں سے لاریوں میں نظام ساگر جائیں گے۔ طلبا وقت پر پہنچے' ناشتہ کیا۔ اب پرنسپل صاحب طلبا میں گشت کرتے ہوئے نکلے اور میز پر کا بچا ہوا سامان کیک' پیسٹری' بسکٹ' موز' موسمی' سنترا' طلبا کی جیبوں اور دستیوں میں یہ کہہ کر بھروانے لگے کہ راستے میں تم لوگوں کے کام آئیں گے پہلے تو سو طلبا کے ناشتے کے اہتمام کا اندازہ کیجئے اور پھر ساتھ توشہ دینے کا انداز۔ یہ تھے ہمارے ہر دلعزیز پرنسپل جن کے نام کے ساتھ دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے" ـــــ افسوس کہ یہ باغ و بہار شخصیت تقریر کے صرف سات دن بعد ۱۳ مارچ ۱۹۷۲ء کو ہم سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئی اور مسجد خیریت آباد کے عقبی شہر خموشاں میں ابدی نیند سو رہی ہے ـــــ نواب اعظم جنگ نے ریاست حیدرآباد کی تعلیمی زندگی کو ابھارنے' معیار کو بلند کرنے' ثقافت کو اونچا اٹھانے اور اپنے ہزاروں طلبا کو تہذیب و تمدن سے آراستہ کرنے میں بڑا حصہ لیا۔ ڈاکٹر زور مرحوم بھی انھیں کے شاگرد تھے۔ جب انھوں نے ادارہ قایم کیا تو نواب اعظم جنگ کی سرپرستی بھی حاصل کی۔ ادارہ کے کاروبار کے سلسلے میں ہمیشہ مفید مشوروں سے نوازتے اور اپنی امکانی مدد پہنچانے سے دریغ نہ فرماتے۔ ایک دن میں اور ڈاکٹر زور مرحوم نے نواب اعظم جنگ کے دولت کدہ پر حاضری دی بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ فرمانے لگے کہ میرے پاس راس مسعود کے بہت سارے خطوط ہیں یہ ادارہ میں محفوظ ہو جائیں تو اچھا ہے لیکن میرے لیے انکی تلاش مشکل ہے (گھٹنوں میں خمیدگی کی صلاحیت نہ تھی اور چلنا پھرنا مشکل تھا) ان کی موت سے ادارہ کے ایک سرپرست اور مربی کو ہم سے جدا کر لیا۔ ہم ان کے پس ماندگاں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں لے ـــــ جناب نثار احمد فاروقی نے برصغیر ہند و پاک کے ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر شوکت سبزواری کے انتقال کی اطلاع دی اور اس کے بعد مشہور افسانہ نگار "نیا دور" بنگلور کی مدیرہ ممتاز شیریں نے انتقال کیا۔ ان دونوں کی موت ادب کا بہت بڑا نقصان ہے۔ خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

(بہ سلسلہ گذشتہ ماہ فروری)

باغ و بہار کا تنقیدی مطالعہ

بعض اُردو ناقدوں کی اس رائے سے میں اتفاق نہیں کرسکتا کہ میرامن کے یہاں قافیہ پیمائی نہیں ہے۔ میرامن عمداً کہیں سجع اور قافیہ کا اہتمام کرتے ہیں مگر یہ صحیح ہے کہ ان کے قافیوں میں تکلف کی بو نہیں آتی وہ بڑے سیدھے، فطری اور دلکش انداز سے عبارت میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں مقفّٰی جملوں کی بہتات نہیں ہے اور نہ وہ سجع تلاش کرتے ہیں۔ مگر جہاں آسانی سے وہ فطری طور پر کرسکتے ہیں وہ موقع ہاتھ سے جانے بھی نہیں دیتے۔ میں اپنی اس بات کو مدلل بنانے کیلئے یہاں اس طرح کے چند جملے نقل کرتا ہوں۔

(۱) اب میں امیدوار ہوں کہ اس کا پھل مجھے بھی ملے تو میرا غنچۂ دل مانند گل کے کھلے۔

(۲) ایسا حاکم تشریف لایا جس کے نبض سے ایک عالم نے آرام پایا۔

(۳) امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمارداری میں حاضر رہتے۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی۔ تب انھوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصے کو سنے گا خدا کے فضل سے تندرست رہے گا۔

بہرحال اس طرز کی سادہ قافیہ پیمائی عبارت کے رنگ و آہنگ اور سادگی سے ہم آہنگی رکھتی ہے اور طبیعت پر بار نہیں گذرتی ہے۔ مگر اس کا انکار صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ انھوں نے رعایت لفظی سے پرہیز کیا ہے مگر سجع اور قافیہ سے عبارت میں دلکشی پیدا کی ہے لیکن ان کی قافیہ پیمائی آورد سے پاک اور غالب کی قافیہ پیمائی سے مشابہ ہے۔

زبان میں ایک روانی ہے ایسی روانی جو صبح سویرے دریا کی پرسکون فضا میں ہوتی ہے نہ کہ سیلاب کی روانی۔ ان کے اسلوب کی صفات اور انداز میں قاری ایک نشہ کی کیفیت اور گم گشتگی محسوس کرتا ہے۔ وہ ایک خاص آہنگ ایک استعجاب اور محویت سی تسکین ذوق کی لذت پاتا ہے۔ میرامن کے ہر ہر لفظ پر ان کے مخصوص مذاقِ فصاحت کی مہر ثبت نظر آتی ہے۔ یہ تمام صفات مل کر قاری کو اکتاہٹ سے بچاتی ہیں۔ ان کے یہاں عبارت کا لطف نغمہ کی لطیف کیفیت سے مشابہ ہے۔

ان کو تمہید لکھنے اور تعارف کرانے کا خاص سلیقہ ہے۔ یہ کیفیت ان کے اس خط میں جو بطور عرضی کے میں پیش کیا تھا۔ کتاب کے اس دیباچہ میں جو انھوں نے لکھا ہے اور ہر قصے کی ابتدا میں واضح ہے۔

انھوں نے ایک مخصوص دلکش انداز سے تمہیدیں لکھی ہیں اور قصوں کے شروع کو غیر معمولی دلچسپ اور حیرت انگیز بنا کر پیش کیا ہے۔ ابتدا ملاحظہ فرمائیے:-

"اب آغاز قصے کا کرتا ہوں۔ ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو، بہر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔"

میرامن ذرا الفاظ کی ترتیب بھی بے تکلفی کے خیال سے الٹ دیتے ہیں کہنا اس طرح چاہئے تھا کہ اب قصہ کا آغاز کرتا ہوں۔ اسی طرح منصفی کرو۔ اور کہنے والے نے کہا زائد جملے ہیں مگر عبارت کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اگر ان کو نکال دیا جائے تو مفہوم میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ یہاں پرانے زمانے کیلئے آگے کا لفظ بھی قابل لحاظ ہے۔

اب یہاں ایک نکتہ اور سامنے آتا ہے کہ میرامن تابع مہمل عوام کے عام انداز گفتگو کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ وہ ایسے مرادف الفاظ بھی لاتے ہیں جو دلکشی کا باعث بن سکیں۔ توابع مہمل اور مرادف دونوں طرح کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں مل سکتا ہے۔ تابع مہمل سے وہ بے تکلفی پیدا کرتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے گفتگو اور بول چال کی زبان لکھی ہے تو ان کا مقصد یہی ہے کہ انھوں نے زبان کے اس انداز کو ادبیت کے ساتھ نبھایا ہے جو عام استعمال میں ہوتا ہے۔ محاورے، روزمرہ اور توابع مہمل خاصہ ہیں عوامی زبان کا۔ اب میں یہاں ان کے چند توابع مہمل کو نمونتہً پیش کرتا ہوں تاکہ اہل نظر سمجھ سکیں گے کہ وہ کس طرح زبان کو جان دار اور عوامی گفتگو سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

(۱) فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے، چلونیں تکلف کی لگا دیں۔
(۲) غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو دھا کر صاف کیا۔
(۳) جس نے اسے (مال کو) اونے پونے بیچ ڈالا اور وارد درمن میں خرچ کرنے لگا۔
(۴) تاکید ہر کھانے کی کر رکھی ہے کہ خبردار با مزہ ہو اور آب و نمک بو باس درست رہے۔

تابع وہ اس لئے استعمال نہیں کرتے کہ ان کے پاس الفاظ کی کمی ہے حق یہ ہے کہ الفاظ پر ان کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ ان کے ہر جملے اور ہر طرز عبارت سے ہو سکتا ہے۔ الفاظ بھی جاندار اور بے جان ہوتے ہیں ان کے اندر بھی خشکی اور رسیلا پن ہوتا ہے میرامن کا فن یہ ہے کہ وہ جاندار، دلکش، رسیلے اور سُریلے الفاظ چن لیتے ہیں وہ بھڑک اور چمک کے قائل نہیں وہ نگاہوں کو سرور کی طرح چکاچوند

نہیں کرتے بلکہ روح کو گرماتے اور دل کو روشن کرتے ہیں۔ ان کی زبان دماغ کو نہیں دل کو اپیل کرتی ہے۔
ان کا مذاقِ سخن ستھرا اور نکھرا ہے۔ وہ دل کے نباض ہیں۔ وہ زبان اور الفاظ کے باہمی ربط سے کما حقہ واقف ہیں۔ میرامن اگرچہ رعایتِ لفظی کے قائل نہیں مگر صفت و موصوف میں اعلیٰ درجہ کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔
مثال کے طور پر وہ عبارت ملاحظہ ہو۔ جس میں فرماتے ہیں "اس بادشاہ کے وقت رعیت آباد، خزانہ معمور، لشکر مرفہ، غریب غربا، آسودہ۔"

اس میں غریب غربا بڑا دلکش انداز ہے پھر ہر صفت، کو موصوف سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔
میرامن کے یہاں ایک حرفِ عطف "کہ" کے ذریعہ بڑے بڑے کام لئے گئے ہیں ان کو دو جملوں میں "کہ" کے ذریعہ عبارت کو متصل اور مختصر کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ اس "کہ" کا استعمال انھوں نے شروع سے آخر تک کتاب میں کیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر چند جملے نقل کئے جاتے ہیں۔
سیر میں چار درویش کی یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی"۔
جب تک تو اس جوان کو ساتھ لے کر آوے کہ سیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کی "کہ" والدہ مجھ ناپاک کی ہیں اعتراض کیا۔
ان مواقع پر ہم جو اور جس کا استعمال کرتے ہیں مگر میرامن اکثر جگہ "کہ" کے ذریعہ اپنی عبارتوں کو لطیف و نفیس بناتے ہیں۔

اصل میں میرامن کا حسن زبان ان کے اندازِ تعبیر سے عبارت ہے وہ معمولی اُمور کو بھی اپنے اندازِ تعبیر سے حسن و تخیل کا مجسمہ بنا دیتے ہیں، دیکھئے ان کو کہنا صرف اتنا ہے کہ سفر جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اسکو اس طرح کہتے ہیں کہ "اگر زندگی ہے تو سفر کی عمر کوتاہ ہوتی ہے جلد پھر آتا ہوں"۔ انھوں نے اکثر اپنے ذہن کی تخلیقی صلاحیت سے نئے نئے اندازِ تعبیر پیش کئے ہیں اور اس زبان میں حسن و رعنائی پیدا کی ہے۔
اس سلسلہ میں ذیل کی عبارت ملاحظہ فرمائیے:۔
دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا لاچار بے حیائی کا برقع منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے"۔
اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے تیرے آنے سے کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔ تو نے مجھے نہال کیا۔ وہ درمیان درمیان یا فقراء اللہ یا فقراء کے ذریعہ بھی ایک کیفیت پیدا کرتے ہیں کبھی یا مرشد اللہ کہتے ہیں۔

میرامن کے یہاں زبان کا وہ لہجہ محفوظ کر دیا گیا ہے جو بے تکلف زبان کی روح ہے۔ اسی بنا پر وہ ”یہیں“ کے بجائے ”وہیں“ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کی وہ شکل لکھنے کی کوشش کرتے ہیں جو عوام کی زبان سے ظاہر ہوتی ہے وہ ہمیشہ جھوٹ کو جھوٹھ لکھتے ہیں۔ میرامن وہ کو وُو لکھتے ہیں۔ اور ماں باپ کو ما باپ اسی بنا پر لکھتے ہیں کہ زبان میں وہ کیفیت پیدا ہو سکے جو بے تکلفی کی زبان کا خاصہ ہے۔ اس کی مزید تشریح میں کٹنی کے ذکر میں کروں گا۔ اسی طرح وہ کمبل کو کمل لکھتے ہیں۔ اسی انداز سے زبان کو وہ جیبھ لکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

”سارے ڈیل میں زبان حلال ہے حرف کو چاہے جو کہے کرے نہیں تو جیبھ حیوان کو بھی خدا نے دی ہے۔“

”نمک دان سے لون نکال، چقمک سے آگ جھاڑ بھون بھان کر کھا لیتے“

”وُہیں اٹھ کر ہاتھ پکڑ لیا اور چلا جاتے جاتے ایک باغ میں لے گیا۔“

یہاں ”وُہیں“ اسی وقت کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ایک مدت اسی لاد دنیا میں کٹی جو اس نے فرمائش کی میں نے وہیں لا کر حاضر کی۔

”فقیر وونہیں سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا۔“

اصل میں میرامن کا آرٹ عوامی بے تکلفی کا آرٹ ہے جس میں حسنِ ذوق کی مرصع کاری شامل ہے وہ ایسے الفاظ کو منتخب کر لیتے ہیں جو باوجود عوامی ہونے کے تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ایک لفظ ”کلبلانا“ ہے۔ اس کو اس طرح استعمال کرتے ہیں:۔

”ایک معشوق خوبصورت، کانی سی مورت جو کہ دیکھنے سے ہوش جاتا رہے۔ گھائل لہو میں تر بتر آنکھیں بند کئے پڑی کلبلاتی ہے۔“

میرامن نے شیریں الفاظ، حسن تعبیر اور عوامی لہجہ سے اپنے فن کے تانے بانے تیار کئے ہیں۔ انھوں نے ہندی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور بعض الفاظ مخصوص انداز سے بار بار استعمال کر کے لطف پیدا کیا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میرامن کے بارے میں ہمارے ناقدوں نے تعریف کے پل باندھ دئے ہیں۔ مگر ان کی بعض باتیں جو طبیعت و ذوق کو کھٹکتی ہیں، ان کا کسی نے نام تک نہیں لیا ہے۔ میں صاف لکھتا ہوں میرامن سے بھی بعض غلطیاں سرزد ہوئی ہیں اور اردو کی بعض معروف اصطلاحوں کو انھوں نے غلط استعمال کیا ہے۔ بعض جگہ ایسی حرکت کی ہے۔ جو ذوق و زبان کیلئے برداشت کرنا مشکل ہے۔ میں ان تمام

امور کا اس مقالہ میں احاطہ کرنا ضروری تصور کرتا ہوں۔

میرامن "کرکے" کو ہر جگہ کرکر لکھتے ہیں جس سے طبیعت کو ثقل کا احساس ہوتا ہے اور بار بار اس کو دہراتے ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

"جتنے چور چکار، جیب کترے، صبح خیزے، اٹھائی گیرے، دغاباز تھے سب کو نیست ونابود کر کر نام ونشان ان کا اپنے ملک بھر میں نہ رکھا۔"

اسی طرح میرامن عورتوں کو رنڈیاں لکھتے ہیں مالک کو خاوند اور میاں لکھتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا۔ خدا جانے۔ رنڈی کا لفظ تو اردو میں ہمیشہ سے معروف ہے۔ میرامن کے دور میں یہ اصطلاح یقیناً طوائف کے معنی میں موجود تھی مگر انھوں نے معلوم نہیں کس مصلحت سے عورت کو رنڈی لکھا ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

"اتفاقاً وزیرزادی کو پیٹ رہا جب ستوانسا ہوا اور ان گنا مہینہ گذر کر پورے دن ہوئے پیریں لگیں۔ دائی جنائی آئی تو مرا لڑکا پیٹ میں سے نکلا اس کا لہو جم کر چڑھا۔ وہ مرگئی میں مارے غم کے دیوانہ ہوگیا کہ یہ کیا آفت ٹوٹی۔ اس کے سرہانے بیٹھا روتا تھا۔ ایک بارگی رونے کی آواز سارے محل میں بلند ہوئی جو آتی تھی ایک دوہتھڑ میرے سر پہ مارتی اور اپنی کس اور کون کو ننگا کرکے میرے مقابل کھڑی رہتی اور رونا شروع کرتی۔ اتنی رنڈیاں اکٹھی ہوئیں کہ میں ان کے چوتڑوں میں دب گیا۔ نزدیک تھا کہ جان نکل جائے۔"

اس میں جس طرح سے انھوں نے غیر مہذب انداز اختیار کیا ہے اس میں دلی کی ڈھلی منجی اور صاف ستھری تہذیب کا کہیں دور دور پتہ نہیں۔ یہی نہیں انھوں نے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ بچہ پیدا ہوا یا کہیں حمل کا ذکر آگیا تب بھی اسی طرح کھل کھیلنے کی کوشش کی ہے کتاب میں سارے توازن واحتیاط کے باوجود ان عبارتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(۱) سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے۔ اس پاجی کے نطفہ میں کچھ خلل ہوگا۔

(۲) شہوت کے غلبہ میں میرے روبرو اس بے حیا نے اس بندر سے صحبت کی۔

(۳) لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بستر ہونے کی تھی ویسی ہی جی میں بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی۔

(۴) باوصف اس اشتیاق کے قصہ مباشرت کا نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا۔ دن کو یوں ہی اٹھ جاتا۔

(۵) اگر وہ چاہے کہ دریا سے نکل بھاگے تو آفت اور خصئے اس کے لمبے ہوجاتے ہیں۔ ایسے کہ زمین گھسٹتے ہیں۔

بیشک یہ ان کے بلندی معیار کے منافی عبارتیں ہیں مگر یہاں میں صرف ایک بات کہوں گا کہ
یہ موضوع ان کی کمزوری ہے اور نفسیاتی کمزوری۔ اس موضوع پر وہ لطف ہرگز نہیں لیتے اس کو
اہمیت بھی نہیں دیتے بلکہ اس کی تحقیر کرتے ہیں اور اس سے رغبت نہیں بلکہ نفرت دلاتے ہیں۔ یہی
فرق ہے۔ منٹو کے اظہار جنسیت اور میرامن کے انداز فکر میں۔ منٹو جنس کا ذکر کر کے لذت پیدا کرتے ہیں
مگر میرامن اگرچہ کھل کر ذکر کرتے ہیں مگر لذت کے بجائے وہ نفرت پیدا کرتے ہیں جس سے ان کا گناہ ہلکا
ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرامن کے یہاں اس قسم کے مواقع بس دو تین جگہ ملیں گے ورنہ پوری
کتاب میں جنسی محرکات، بیہودگی اور شہوانی خیالات کا نام نہیں۔ موضوع عشق ضرور ہے مگر عبارتیں کوثر و
تسنیم سے دھلی مصفیٰ اور منقح ہیں جس پر فصاحت و بلاغت نے سادگی کے لباس میں تابندگی پیدا کی ہے
یہاں نا مہذب عبارتوں کو سامنے لانا ضرور تھا اس لئے کہ برائی تھوڑی بھی گوارا نہیں ہوتی۔ یہ عیب ان کے
یہاں بلاشبہ ہے اور اس سے انکار ناممکن ہے۔ لیکن جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ اس سے ان کی فنی عظمت
پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔

میرامن سجدہ کرنے کو "ناک گھسنا" لکھتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ میرامن جنس کے بیان میں اکثر محتاط و متوازن ہیں ان چند جگہوں کو چھوڑ کر
انھوں نے کہیں بھی حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ خیال فرمائیے کہ داستانوں میں کتنی جنسی یاوہ
گوئیاں ہوتی تھیں اور کس قدر فحش نگاری سے کام لیا جاتا تھا۔ میرامن نے بڑے احتیاط اور اختصار
سے ان منزلوں کو طے کیا ہے۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ جنس کے بارے میں تفصیلات سے رکاکت
اور پستی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے انھوں نے صرف چند جگہوں پر اور چند جملوں کے علاوہ کہیں اس موضوع سے
تعرض نہیں ہے۔ یہ امور ان کے دور کو ملحوظ رکھتے ہوئے چنداں قابل اعتراض نہیں ہو سکتے۔

اب میں میرامن کی کردار نگاری کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ میرامن کردار نگاری میں سب سے
زیادہ بڑے فنکار نظر آتے ہیں وہ نفسیاتی انداز سے کردار نگاری کا فرض انجام دیتے ہیں وہ اس امر کا
لحاظ رکھتے ہیں کہ گفتگو میں کس قسم کے الفاظ موضوع اور محل سے مناسبت رکھتے ہیں۔ وہ کردار کیلئے
ایک فضا تیار کرتے ہیں۔ جس سے وہ کھپ جاتا ہے۔ وہ کرداروں کے تعارف کیلئے شروع ہی میں چند جملے
ایسے لکھ دیتے ہیں۔ جن پر وہ آئندہ اس کردار کی بنیاد رکھتے ہیں وہ۔ تعارف کرانے کا جیسا کہ میں پہلے
عرض کر چکا ہوں ایک خاص سلیقہ رکھتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کا اشتیاق برابر بڑھتا ہی جاتا
، ہیرو کے انجام کی جستجو میں قاری کا ذہن سرشار ہو جاتا ہے اور وہ لذت و اشتیاق کے عالم میں

قصہ کا مطالعہ کرتا ہے باوجود کرداروں کی یکسانیت اور شاہانہ فضا کے وہ کہیں اکتاہٹ یا تھکاوٹ
کا نام نہیں۔ میرامن محض زبان ہی کے جادوگر نہیں وہ کردار نگاری کے بھی رازداں ہیں۔ باغ و بہار کا
قاری مجسم اشتیاق و انتظار بن جاتا ہے آئندہ آنے والے واقعات کو وہ بڑی بے چینی سے معلوم کرنا
چاہتا ہے کہ آئندہ کیا ہوگا۔ میرامن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ قاری کی نفسیات کو بھی مطمئن کریں وہ
اس کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ مصنف زندہ ہے۔ بول رہا ہے اور واقعات اور
کردار کے ارتقا میں وہی متوازن اور فطری انداز اختیار کرتے ہیں جو زندگی میں موجود ہے۔ ان کے یہاں عموماً
اختصار ہے لیکن اگر کہیں طوالت ہے تو موقع و محل کے اعتبار سے اور کردار کو واضح کرنے کیلئے۔

وہ جو کردار پیش کرتے ہیں وہ ان کے ماحول و معاشرت کے ترجمان ہوتے ہیں وہ اپنے کردار کو ایک
مخصوص تہذیب اور معاشرتی خصائص کے آئینہ میں پیش کرتے ہیں جس میں ایک طرف ان کے دور کی اور دلّی کی
اجتماعی تہذیب ہے تو دوسری طرف خود میرامن کے ذاتی رجحانات کا ان پر ٹھپہ بھی لگا ہے۔ وہ اپنی انفرادیت کو کبھی
نہیں چھوڑ سکتے مگر وہ اجتماعی رجحان کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔ ان کے کردار ان کے دور کے معاشرتی ماحول کے
مصور ہیں اور خود ان کے مزاج کے بھی۔ اس میں کردار کی تعمیر میں مصنف کے سامنے ایک وسیع تخلیقی فضا ہے۔
چونکہ میرامن مترجم ہیں پھر بھی وہ ترجمہ آزادی سے کرتے ہیں اور اس میں اپنے ذاتی اظہار خیال ترمیم و اضافے اور
اسکو ایک نئی صورت گری کے ذریعہ ایک نئی شکل عطا کرتے ہیں۔ وہ ہر کردار سے متعلق جو گفتگو اور عمل ظاہر
کرتے ہیں اس میں اس کی عمر، پیشہ، مذہب، ذہن، ماحول اور نفسیات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں
کرداروں کے بارے میں پڑھتے وقت یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ جلدی میں ہیں اور بات کو جیسے تیسے ختم
کرنا چاہتے ہیں وہ دل لگا کر اطمینان سے لکھتے ہیں اور کرداروں کے بارے میں بہت سی جزئیات میں سے
معمولی جزئیات بھی پیش کرتے ہیں اگر ان کو یقین ہوتا ہے کہ ان سے کردار کی تصویر زیادہ واضح ہوسکے گی۔
غیر ضروری تفصیلات وہ ہمیشہ نظر انداز کردیتے ہیں۔ وہ جس طرح قصے کی ابتدا میں دلکشی کا اہتمام کرتے ہیں
اسی طرح ان کے اختتام کو بھی دلچسپ بناتے ہیں اور آخر میں حیرت اور اشتیاق کا عالم کم نہیں ہوتا بلکہ کچھ
اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ کردار نگاری میں لفظوں کے استعمال میں فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے بات چیت کی
رفتار دھیمی ہوتی ہے اور فطری بھی۔ قاری کو کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ جلدی میں ہیں۔

میرامن کے یہاں ہر کردار کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ باتیں اسی کے مطابق کی گئی ہیں مثال کے طور پر
پہلا درویش وفادار ہے۔ محبت میں مخلص ہے اس کا یہ کردار اس کی پوری کہانی میں قائم رہتا ہے۔ اس کے
ساتھ ان کے یہاں ایک مخصوص معاشرت کی ترجمانی بھی ہے جس کے بارے میں پہلے تفصیل سے عرض کیا جاچکا ہے

کرداروں کی زبان میں ان کے مخصوص طبقہ اور حالات کے لحاظ سے ان کے جذبات اور نفسیات کا لحاظ رکھا گیا ہے
مثال کے طور پر کٹنی جو ایک ضمنی کردار ہے۔ اس کا بیان ملاحظہ ہو۔

"ایک بڑھیا شیطان کی خالہ۔ اس کا خدا کرے منہ کالا ہاتھ میں تسبیح لٹکائے۔ برقع اوڑھے دروازہ کھلا پاکر
ندھڑک چلی آئی اور سامنے ملکہ کے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا دینے لگی کہ الٰہی! تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت
رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ درد سے پورے دنوں
درد زہ میں مرتی ہے اور مجھکو اتنی وسعت نہیں کہ ادھی کا تیل چراغ میں جلاؤں کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں
اگر مرگئی تو گور کفن کیوں کر کروں گی؟ اگر جنی تو دائی جنائی کو کیا دوں گی اور جچا کو تھوڑا اچھوانی کہاں سے
پلاؤں گی؟ آج دو دن ہوئے کہ بھوکی پیاسی پڑی ہے اے صاحب زادی! اپنی خیر کچھ ٹکڑا پارچہ دلاؤ تو اس کو
پانی کا ادھار ہو۔"[۱]

اس عبارت میں محض کٹنی کے کردار کی حقیقی تصویر ہی نہیں ملتی بلکہ میرامن کی زبان بھی نکھر کر سامنے
آجاتی ہے اس میں مقفی زبان بھی ہے اور خاص طور سے وہ لہجہ ہے جو بول چال کا ہے مثلاً وہ بھوکی کو عوام کی
زبان کے مطابق بھوکی لکھتے ہیں برہمن بامن لکھتے ہیں۔ سامنے کو سامھنے وغیرہ۔ اسی بنا پر اکثر وہ یہ کریلے
اور ہندی کے لحاظ سے ان کو "دن" لکھتے ہیں۔ میرامن لہجہ کے پابند ہیں نہ کہ عام ادبی زبان کے۔

میرامن کے کرداروں میں ایک مذہبی رجحان ملتا ہے وقار عظیم اس کو ان کا نقص شمار کرتے ہیں
مگر میں سمجھتا ہوں کہ نظریاتی نقطۂ نظر سے ان کا یہ فعل محمود ہے۔ ہمارے افسانہ اور ناول لکھنے والوں کو
دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنے نظریہ کو پیش کرتے ہوئے کس طرح فن کے تقاضہ کو پورا کر سکتے ہیں۔ میرامن کا یہ فنی کمال
ہے کہ وہ بڑی چابک دستی سے اسلام کی عظمت کا نقش دلوں پر بٹھاتے ہیں۔ البتہ صرف نماز پڑھتے دیکھ کر
مسلمان ہوجانا ناممکن تو ہے مگر عملی زندگی میں اس کی مثالیں کم ہیں ان کو معاملات میں سچائی اور پاکیزہ زندگی
کے ذریعہ یہ کوشش کرنی چاہیئے تھی کہ اس سے متاثر ہو کر ہیروئن مسلمان ہوجاتی۔ انھوں نے اسلام لانے کے
رستے میں جہاں بھی واقعات پیش کئے ہیں ان میں نماز کو بنیاد بنایا ہے۔ اس طرح تین عورتوں کے
مسلمان ہونے کا ذکر آزاد بخت کی سرگذشت میں ہے۔ مگر باقی قصوں میں اس طرح کی کوشش نہیں کی گئی ہے
وقار عظیم کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ انھوں نے۔ ہیروئن کو کلمہ اس بنا پر پڑھا دیا ہے کہ اس طرح عوام کو اور مسلمانوں کو
خوش کرنا چاہتے تھے۔ کیا آج مخصوص نظریات رکھنے والے فنکار اپنے نظریہ کی تبلیغ سے باز رہتے ہیں۔

باغ و بہار ص ۲۰۲

میں سمجھتا ہوں کہ زندگی اور کائنات کے بارے میں بنیادی قدروں کی ترجمانی زندگی اور ادب کا ایک اہم عنصر ہے۔ میرامن کی عظمت میرے نزدیک اس حیثیت سے بڑھ جاتی ہے کہ انھوں نے زندگی کے بارے میں ایک نظریاتی رنگ پیدا کیا ہے ان کے اکثر ہیرو نمازی ہیں۔ مصیبت میں خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ گڑگڑاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں اور بقول ان کے نمک گھسن کرتے ہیں۔

میرامن کے یہاں اسلامی قدروں اور مسلم تہذیب کی ترجمانی کا ایک پہلو وہ ہے جو ہمارے اکثر ناقدوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے۔ وہ دراصل اس کتاب میں اس مسلم معاشرہ کی ترجمانی کرتے ہیں جو اسلامی قدروں کا علمبردار ہے روزہ نماز کا پابند ہے مگر شراب و عیاشی میں مبتلا ہے۔ ان کے کسی کردار نے بلا نکاح یا متع کسی عورت سے تعلق پیدا نہیں کیا ہے۔ خواجہ سگ پرست کلمہ پڑھتا ہے نماز کا پابند ہے روزہ رکھتا ہے مگر شراب خود بھی پیتا ہے مست ہوتا ہے اور سوداگر بچہ کو بھی پلاتا ہے۔ میرامن کے سارے کردار شرابی ہیں عاشق ہیں وفادار ہیں۔ مگر دیندار ہیں یہ وہ تضاد ہے جو مسلم معاشرہ میں اعلیٰ طبقہ میں موجود تھا مشہور ہے کہ رمضان میں نوابی دور میں لکھنو کے امرار اور نواب طبیبوں سے روزہ نہ رکھنے کا سرٹیفکٹ حاصل کر لیتے تھے یہ اس تضاد کی نشان دہی ہے جو اسلام کے اصل اصولوں اور مسلمانوں کے عمل کے درمیان میرامن کے دور کی سوسائٹی میں پیدا ہو گیا ہے۔ شراب کی یہ کثرت نظر آتی ہے کہ مہمان بھی آتا ہے تو اس کو پہلے شراب پیش کی جاتی ہے۔ باغ و بہار نے اپنے دور کے مسلم معاشرہ کی اس حیثیت سے پوری ترجمانی کی ہے۔ ایک ہاتھ میں سندان عشق ہے اور دوسرے ہاتھ میں جام شریعت بھی۔

وقار عظیم نے باغ و بہار کے نسوانی کرداروں کو خاص اہمیت دی ہے اور آجکل یہ وبا عام ہو گئی ہے کہ نسوانی کرداروں کو غیر ضروری اہمیت دی جانے لگی ہے اور ہمارے ناقدوں کے اعصاب پر بھی عورت سوار نظر آتی ہے۔ وقار صاحب کا خیال ہے کہ میرامن کے نسوانی کردار بہادری اور بڑے کارناموں کے ذمہ دار ہیں مصنف نے ان کی جانب خاص توجہ کی ہے۔ اس نے جس طرح فنکارانہ انداز سے ہیروئن کے کرداروں کو پیش کیا ہے۔ اس سے مردوں کے کردار محروم ہیں۔ (۱) میں اس رائے سے اختلاف رکھتا ہوں۔ عورتوں کا ذکر دراصل صرف ایک کہانی آزاد کی سرگذشت میں آیا ہے اور وہ صرف تین ہیں۔

(۱) دمشق کی شاہزادی　(۲) وزیر زادی یا سوداگر بچہ　(۳) زیر باد کی شہزادی، سراندیپ کی شہزادی

ان کرداروں کے سہارے یہ نظریہ قائم کرنا کہ میرامن نے ان پر خاص توجہ صرف کی ہے صحیح نہیں یہ کردار داستان کے آٹھویں حصے سے بھی کم ہیں مرد کرداروں نے جتنے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں ان کی مثال عورت کرداروں میں نہیں ملتی۔ دمشق کی شہزادی سے کہیں زیادہ عمدہ کردار پہلے درویش کا ہے جو وفاداری اور

محبت کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ اس کے پہلے عاشق کے بارے میں کہتا ہے کہ آدمی آدمی برابر نہیں پھر وہ مسلسل خدمت کرتا ہے اور اُف نہیں کرتا حتیٰ کہ شہزادی خود اعتراف کرتی ہے کہ تم نے خدمت ہی ایسی کی ہے کہ جو کچھ کہو ٹھیک ہے۔

زیرباد کی شہزادی نے نہایت دلیری کا کام کیا۔ اس نے زندان سلیمان سے خواجہ سگ پرست کو نکالا بیشک یہ بہادری کا کارنامہ ہے مگر کون ہے جو خواجہ سگ پرست کے حسن سلوک اور انسانیت کو نظر انداز کرسکتا ہے اس نے بھائیوں کیلئے جو کچھ کیا ہے جو خطرات مول لئے جو قربانیاں دیں اس کی مثال کسی نسوانی کردار میں نہیں ملتی۔

سراندیپ کی شہزادی جس کا ذکر زیرباد کی شہزادی کے بعد آتا ہے جس نے خواجہ سگ پرست کو لیجاکر اس کی مرہم پٹی کی تھی وہ بھی بہادر ہے وہ اپنی دانشمندی سے اس کو بچاتی ہے اور ایسی ترکیبیں بتاتی ہے۔ جن سے خواجہ شاہ بندر سے شہزادی کو نجات دلاکر خود شاہ بندر بن جاتا ہے مگر عمل تو خواجہ کا ہے۔ صرف دماغ شہزادی کا ہے۔

پھر سب سے بڑھکر وزیرزادی کا کردار ہے جو ایسا کارنامہ کر دکھاتی ہے جو مردوں سے بھی ممکن نہیں۔ وہ اپنے باپ کو دوبارہ وزیراعظم بناتی ہے قید سے چھڑاتی ہے مردانہ بھیس میں ملکوں کا سفر کرتی ہے اور ثابت کر دیتی ہے کہ وہ ایک عظیم دل و دماغ کی عورت ہے اور صاحبِ عقل و عمل ہے۔ کسی کا ایک کردار ایسا ہے جو مرد کرداروں پر تفوق رکھتا ہے مگر دوسرے کردار اس لائق نہیں کہ ان کو مرد کرداروں پر ترجیح دی جائے۔

مرد کرداروں میں شجاعت ہے چنانچہ ملک صادق کی محبوبہ کو تلاش کرنے میں تیسرا درویش غیرمعمولی نقص برداشت کرتا ہے۔ چوتھے اور تیسرے درویش کی کہانی میں چیلے کے مظالم کی داستان ہے جس کو ر کردار۔ بہادری سے سہتے ہیں۔ نوفل اور حاتم کے قصے میں بھی ایثار نفس کی عمدہ مثال ہے دوسرے درویش کہانی میں سخاوت کے موضوع پر نہایت عمدہ نصیحت اور عملی مثال ملتی ہے۔ نسوانی کرداروں میں جو شجاعت سخاوت اور ذہانت ہے وہ قابل تعریف ہے۔ مثلاً دوسرا درویش سخی ہے مگر بصرہ کی شہزادی اس سے زیادہ سخی ہے۔ البتہ حاتم اس سے زیادہ سخاوت کا ثبوت دیتا ہے اور اکثر درویش، مصائب کو برداشت کرنے میں ں مردی، شجاعت اور وفاداری کا عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔

وقار عظیم نے لکھا ہے کہ میرامن نے اکثر مرد کرداروں کو نسوانی کرداروں کے حسن کی نمائش کا آئینہ ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے میں کہوں کہ میرامن نے نسوانی کرداروں کو مرد کرداروں کے عشق کا آئینہ پیش کیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں مصنف نے دونوں کو یکساں درجہ دیا ہے اور دونوں کی تصویرکشی میں

وقت فن سے کام لیا ہے۔ ہاں ان کی یہ بات ضرور صحیح ہے کہ مردوں کے کردار ایک سانچے میں ڈھلے معلوم ہوتے ہیں مگر نسوانی کرداروں میں تنوع ہے۔ البتہ فن کے نقوش اور زندگی کی عظمت سے مرد کردار بھی محروم نہیں ہاں بعض نسوانی کرداروں مثلاً وزیرزادی، شہزادی کے یہاں یہ کیفیت زیادہ واضح ہے۔

باغ و بہار میں منظر نگاری بڑے غضب کی ہے کہیں سنسان جنگل ہے کہیں لق و دق میدان کا ذکر ہے کہیں پرشور سمندر ہے اور کہیں دریا۔ بادشاہوں کے محلوں کے مناظر نہایت دلکشی سے معمور کئے گئے ہیں ان میں فطری مناظر اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ ان کا حسن دل پر عجیب اثر پیدا کرتا ہے میں یہاں صرف ایک مثال پہلے درویش کے قصہ سے نقل کرتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اس خوب جوان نے نہایت تسلی دے کر ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا رفتہ رفتہ ایک باغیچہ میں مجھے بٹھا کر کہا یہاں رہو میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلبدن کا خیال آتا جب چاند پر نظر پڑتی تب اس مہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی"

میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فطری منظر کشی کے ساتھ دراصل کتاب سماجی منظر کشی کا عمدہ نمونہ ہے اس میں محلوں کے نقشے باغوں کے نقشے درباروں اور دسترخوانوں اور شاہی لوازمات کے مناظر بکثرت موجود ہیں۔ دمشق کی شاہزادی نے جو باغ اپنے محبوب یوسف سوداگر کیلئے خریدا تھا اس کی تعریف جس موثر انداز سے میرامن نے کی ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر صاحب ذوق کا دل پھڑک اٹھتا ہے۔ اسی طرح آزاد بخت کی سرگذشت میں خواجہ سگ پرست نے سمندروں، شہروں اور میدانوں کے جو مختلف مناظر پیش کئے ہیں۔ ان میں بڑی فن کاری اور مصوری ہے۔ اس میں انسانی جذبات کی تصویریں بھی ہیں اور فطرت کی حسن کاری کے مرقع بھی۔

دمشق کی شہزادی یوسف سوداگر کے اس مکان کی تعریف کرتی ہے جو اس کے لئے خریدا گیا تھا وہ کہتی ہے کہ "دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینھ کے درختوں کے سبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرد کی پیڑیوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی اس ابر میں ایسی بھلی لگتی ہے۔ جیسے شام کو شفق پھولی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں"

میرامن کے قارئین کو خوب معلوم ہے کہ وہ ایک زبردست نباض حیات ہیں وہ انسانی محبت کے زبردست ترجمان ہیں وہ جذبات نگاری میں غیر معمولی عظمت و مہارت رکھتے ہیں وہ قلم کے ذریعے دلوں کی دنیا کو نگاہوں کے سامنے کر دیتے ہیں ان کو جذبات کی حقیقی کیفیات کو بیان کرنے میں غیر معمولی دستگاہ

حاصل ہے۔ وہ محبت کے ترجمان ہیں اس موضوع پران کا قلم پھول برساتا ہے ان کے دل سے نغمۂ سوز کی ندیاں رواں ہوتی ہیں اور ان کی عبارت میں سوز و گداز اور لذت و الم کی شبنم اسی طرح سایہ کئے رہتی ہے کہ فکر و فن میں عجیب لطف محسوس ہوتا ہے جیسے یہ خود ان کی اپنی واردات ہو اگرچہ وہ باتیں عامی کی کرتے ہیں مگر پڑھنے والا اس میں حال کی لذت و کسک محسوس کرتا ہے۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود ان منازل و مناظر سے گذر رہا ہے اس کو انسانی جذبات کے اتار چڑھاؤ نشیب و فراز اور لذت و اذیت کے جھکولے محسوس ہوتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرامن محبت کے جذبات کے دلدادہ ہیں۔ دل کی گھلاوٹ کا بیان اور سوز کی کیفیت ہجر کی مایوسیوں، ناکامیوں، اذیتوں اور موہوم امیدوں کو معمور کرتے، عاشق کے دل کی سوزش و جلن کو سامنے لانے اور وصل میں دل کی سرخوشی، روح کا نشاط طبیعت کا انبساط اور مسرت کا عالم معمور کرتے ہیں ان کے قلم کو مہارت حاصل ہے اسی بنا پر وصل و ہجر سے متعلق عبارتیں نہایت جاندار بلکہ زعفران زار بن گئی ہیں۔

میرامن شیعہ معلوم ہوتے ہیں اور اپنی شیعت کو چھپاتے نہیں اردو ادبا و شعراء نے اپنی شیعیت کو اپنے ادب میں کھل کر نمایاں کیا ہے چنانچہ میرامن کئی جگہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ قصوں میں برقع پوش دراصل مشکل کشا حضرت علی کرم اللہ وجہہ ہیں۔ موت کے قلعہ میں درویش کو جب بیڑیاں بند کر دیتے ہیں تو وہ ایک عورت کو مارنے کے بجائے اس سے متمتع کر لیتا ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر لکھتے ہیں۔

"الٰہی جس طرح یہ چاروں درویش پانچواں آزاد بخت اپنی مراد کو پہنچے اسی طرح ہر نامراد کا مقصود دلی اپنے کرم اور فضل سے بر لا، بطفیل پنجتن پاک، دوازدہ امام، چہاردہ معصوم علیہم الصلوٰۃ والسلام کے آمین یا الہ العالمین"۔

خواجہ سگ پرست اللہ و رسول کے ساتھ بارہ اماموں کا ذکر بھی کرتا ہے"۔

میرامن کے یہاں زبان و بیان کی جن خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے انکے بارے میں کہیں کہیں مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں مگر اصل یہ ہے کہ ان کی ایک مجموعی خوبی کا ذکر ابھی باقی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زبان لطف پُر ہے۔ یہ لطافت ان کے یہاں اس طرح موجزن ہے جیسے فوارے سے پانی۔ اس میں ایسا طبیعت کو اہتزاز محسوس ہوتا ہے جیسے بہار میں چمن کی خوشبو دار ہواؤں سے دل کو حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس کیفیت میں کہیں تشبیہ کی ندرت و لطافت ہے کہیں الفاظ کی کشش اور کہیں تخیل کی رعنائی۔ میرامن دراصل اردو کے ابن مقفع ہیں جو ترجموں میں تخلیق کی شان پیدا کرتے ہیں جن کے یہاں اسلوب کی لطافت آب زلال اور طراوت غسل مصفیٰ کے مانند ہے۔

محمد عبداللطیف خاں

ڈاکٹر سیّد عبداللطیف

ڈاکٹر صاحب ضلع کرنول کے ایک بزرگ خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد شاہ حسین الحسنی کرنول کے ایک مشہور عالم و صوفی تھے۔ آپ کی تاریخ پیدائش ۱۱ ستمبر ۱۸۹۱ء ہے۔ آپ کا خاندان اپنی بزرگانہ عظمت اور قلندرانہ طرز زندگی کی وجہ سے سارے ملک میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ اس خاندان میں قدامت پرستی اس درجہ پر تھی کہ فرنگی تعلیم مشکوک نظروں سے دیکھی جاتی تھی اور یہ خیال عام تھا کہ جو کوئی فرنگی تعلیم حاصل کریگا اپنے مذہب سے منحرف ہو جائیگا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب اپنے زمانۂ طفلی میں حسب قاعدہ قرآن شریف کی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا خیال تک نہ آیا۔ لیکن آپ کی والدہ محترمہ بڑی روشن خیال تھیں۔ ڈاکٹر صاحب خود فرماتے تھے کہ میری ماں کی تربیت اور روشن خیالی نے میرے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھولے۔ وہ خاندانی روایات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بچے کو انگریزی زبان سکھلانے کی طرف مائل ہوئیں۔ لیکن کھلے طور پر وہ ایسا اقدام نہ کر سکتی تھیں۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے والد خود فرنگی تعلیم کے مخالف تھے اس لئے انھوں نے پڑوس ہی میں ایک کلرک کو جو مدراس یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو انگریزی پڑھانے کے لئے مقرر کیا۔ اُس زمانہ میں مدراس کے تعلیم یافتہ کلرک بھی معیاری انگریزی بولتے اور لکھتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے نہایت خاموشی سے یہ تعلیم حاصل کرنی شروع کی وہ خود کہتے تھے کہ میرے والد ایک زمانہ تک اِس سے ناواقف تھے کہ ان کا لڑکا انگریزی زبان سیکھ رہا ہے۔ لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا انگریزی سیکھ رہا ہے تو بہت خفا ہوئے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُن سے کہا کہ انگریزی زبان سیکھ کر قرآنی تعلیم کو یورپ میں عام کر دینگے تو وہ خاموش ہو گئے۔ بالآخر ڈاکٹر صاحب نے اپنا وعدہ پورا کیا۔

ڈاکٹر صاحب بچپن ہی سے ذہین اور ہوشیار تھے اس لئے انھوں نے بہت جلد اس زبان پر عبور حاصل کر لیا ابتدائی تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد جب وہ مدراس یونیورسٹی پہونچے تو یہاں اُنہیں اِس کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے کس قدر آگے ہیں۔ اِن کی اعلیٰ ذہانت اور امتیازی کامیابی کی وجہ سے وہ صرف ماہانہ فیس کی ادائیگی سے بے نیاز ہوئے بلکہ کالج کی طرف سے انھیں ایک معقول وظیفہ بھی مقرر کیا گیا۔ ۱۹۱۵ء میں آپ نے بی اے کامیاب کیا اور ۱۹۲۰ء میں آپ حیدرآباد تشریف لائے اور یہاں آپ کا تقرر جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت اُستاد

انگریزی کے ہوا۔ کچھ عرصہ ملازمت کرنے کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان روانہ ہوئے جہاں سے آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مقالہ جو آپ نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لئے پیش کیا وہ انگریزی ادب کے اثرات اردو ادب پر تھا۔ لندن سے بعد تکمیل تعلیم واپس آنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت پروفیسر انگریزی آپکا تقرر کیا گیا اور یہ خدمت آپ نے کئی سال تک انجام دی۔

" ڈاکٹر صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے پروفیسر محمد عبدالرحمٰن خانصاحب مرحوم صدر جامعہ عثمانیہ کے مکان میں ایک دعوت میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی چالیس سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ اس دعوت میں اور بہت سے پروفیسر صاحبان شریک تھے۔ ایک صاحب سفید سوٹ زیب تن کئے سر پر کرسٹی ٹوپی (رومی ٹوپی) پہنے ہوئے بڑی بے تکلفی اور مسکراہٹ کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے گفتگو میں معروف تھے اُن کا انداز تکلم کچھ ایسا دلچسپ تھا کہ میں اُن کی طرف زیادہ متوجہ ہو گیا اور اپنے بازو بیٹھے ہوئے ساتھی سے اس خاص شخصیت کی تعریف پوچھی اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ یہ ڈاکٹر سید عبداللطیف ہیں جو جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے پروفیسر ہیں"۔

ڈاکٹر صاحب کا نام میرے لئے نیا نہیں تھا مرزا غالب کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کافی مشہور ہو چکے تھے۔ اس محفل میں وہی علمی تذکرے ہو رہے تھے۔ مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب پرنسپل جامعہ عثمانیہ کی یہ خواہش تھی کہ ہر سال ایک ریسرچ جنرل (تحقیقاتی مقالہ) نکالا جائے جس میں تحقیقاتی مضامین شائع کئے جائیں۔ اور اس کی ایڈیٹری کے فرائض ڈاکٹر صاحب انجام دیں۔ بہرحال ڈیڑھ دو گھنٹوں کی بحث کے بعد اس محفل میں یہ طے پایا کہ ایک معیاری تحقیقاتی جرنل نکالا جائے۔ چنانچہ بعد میں ایک اعلیٰ پیمانہ پر تحقیقاتی جرنل نکالا گیا۔ جس کی شہرت نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ کے ممالک میں پھیلی تھوڑے ہی دن بعد جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تو ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔

ترجمہ میں ڈاکٹر صاحب ید طولیٰ رکھتے تھے۔ بعض دفعہ آپ کا ترجمہ اصل سے بھی شاندار ہو جاتا تھا۔ یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ ڈاکٹر صاحب جیسا لائق شخص ہمارا استاد بنا۔ جماعت میں ترجمہ کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مضمون جو اُردو میں ہوتا نصف صفحہ لکھوا دیا جاتا اور حکم دیا جاتا تاکہ اس کا ترجمہ کیا جائے۔ کچھ وقفہ کے بعد اب ہر ایک طالب علم سے وہ ترجمہ سنتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم پر مہربان تھے اور پہلی نظر ہم پر پڑتی ہم بڑے فخر سے اُٹھ کر ترجمہ سُناتے تھے۔ جہاں پسند آیا تعریف کرتے اور جہاں کچھ غلطی ہوئی تو مسکرا دیتے اور کہتے کہ اس طرح لکھو۔ چنانچہ وہ ترجمہ لکھواتے لیکن خوبی یہ تھی کہ ہمارے الفاظ کو ڈاکٹر صاحب اس طرح زیب دے کر جملے بناتے تھے کہ اس ترجمہ کا رنگ ہی اور ہو جاتا

قدرت نے ڈاکٹر صاحب کو اس فن میں بڑی مہارت عطا کی تھی۔ ہم نے دوسرے اساتذہ کو بھی دیکھا

لیکن ڈاکٹر صاحب کے مقابل میں وہ کوئی مقام نہیں رکھتے تھے۔ بات یہ تھی کہ دوسرے اساتذہ صاحبان طلبا کے جملوں کو درست کرنے کے بجائے خود اپنا ترجمہ لکھوا دیتے تھے۔ غرض دو سال مجھے ڈاکٹر صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔ ایک ٹوانٹر میڈیٹ کے پہلے سال میں یہ ہمیں ترجمہ کرواتے تھے۔ اس کے بعد جب بی ایس سی، سال اول میں آئے تو یہ سرسری مطالعہ (نان ڈیٹیل) پڑھاتے تھے۔ یہ گھنٹہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ معیاری قسم کے انگریزی ادب کے تعلق سے بحث ہوتی تھی اور اعلیٰ معلومات فراہم کئے جاتے تھے۔ یہاں بھی میرے ذمہ نصاب کی کتاب کو جماعت میں باآواز بلند پڑھنے کا کام سپرد تھا۔ کچھ صفحے پڑھانے کے بعد اس پر سیر حاصل بحث کی جاتی تھی۔ غرض لائق اور خلیق اساتذہ کی تعلیم کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ عمر بھر سائنس پڑھ کر بھی لٹریچر کا دلدادہ رہا۔ اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر صاحب جیسے لائق اساتذہ کی تعلیم و تدریس ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی غیر معمولی قابلیت اور ملنسار طبیعت کی وجہ سے ان کا دائرہ احباب کافی بڑا تھا۔ حیدرآباد کی ممتاز شخصیتوں سے ان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ چنانچہ نواب سر نظامت جنگ مرحوم جو حیدرآباد کونسل کے صدر تھے ڈاکٹر صاحب کے گہرے دوست تھے۔ جس طرح آج ملک میں ملکی اور غیر ملکی اختلافات پھیلے ہوئے ہیں، اسی طرح اس زمانہ میں بھی ملکیوں اور غیر ملکیوں میں ٹکراؤ تھا۔ کئی حضرات شمالی ہند سے سرسالار جنگ بہادر کے زمانہ میں یہاں آکر بس گئے تھے۔ ان افراد کے خاندان یہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور جنوبی ہند اور خود حیدرآباد کے باشندے اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھے جاتے تھے۔ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے ٹکراؤ میں شمالی ہند والے ہی اکثر کامیاب رہتے تھے۔ چنانچہ اسی ٹکراؤ کے نتیجے میں ڈاکٹر صاحب اپنے مستحق عہدہ کو پا نہ سکے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ کے شعبہ انگریزی کی صدارت کے مستحق تھے لیکن انہیں یہ موقع نہیں ملا کیونکہ جامعہ عثمانیہ کی انتظامی کمیٹی کے اکثر ارکین شمالی ہند کے حضرات تھے اور ان ہی کے خاندان کا ایک فرد اس عہدہ پر فائز تھا۔ غرض اسی کشمکش میں احتجاجاً ڈاکٹر صاحب نے وقت سے پہلے وظیفہ حاصل کر لیا۔ وظیفہ حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ اسی دوران میں حضور نظام نے انہیں طلب کیا اور ان کی غیر معمولی فراست اور قابلیت سے متاثر ہو کر پوری تنخواہ بطور وظیفہ ان کے نام جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

ڈاکٹر صاحب بڑے وضعدار آدمی تھے۔ انگلستان میں وہ جب تک رہے اپنی وضع قطع نہیں بدلی۔ خود کہتے ہیں کہ میں لندن میں ہیٹ کے بجائے شملہ باندھتا تھا۔ سوٹ یعنی کوٹ پتلون پر شملہ کا وجود ہر ایک کو ان کی طرف متوجہ کرتا تھا۔ اپنی ذہانت اور محنت کی وجہ انھوں نے بہت جلد اپنے استادوں کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ ۱۹۲۳ء میں لندن سے لٹریری سوسائٹی (ادبی مجلس) کا ایک وفد انگلستان اور امریکہ

کے انگریزی پروفیسروں کی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے انگلستان سے امریکہ گیا تو ڈاکٹر صاحب خاص طور پر اس کے ممبر منتخب کئے گئے۔ حالانکہ اُس وقت اُن کی حیثیت ایک طالب علم کی تھی۔ جامعہ عثمانیہ سے وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کرنول کے ایک امدادی کالج کے پرنسپل بنائے گئے لیکن بہت جلد وہ سیاسی سرگرمیوں میں منہمک ہوگئے اور اپنی ملازمت سے استعفار دیدیا۔ ان کے تعلقات مولانا ابوالکلام آزاد اور سر محمد اقبال سے کافی گہرے اور دوستانہ تھے۔ اس کے بعد محمد علی جناح سے بھی ان کے مراسم بڑھے لیکن سیاسی اختلافات کی وجہ یہ دوستی مستحکم نہ ہوسکی یوں تو ڈاکٹر صاحب اپنی مخصوص طبیعت کی وجہ سیاسی میدان میں ابھر نہ سکے اور نہ کوئی مادی فائدہ حاصل کیا۔ ان کے علمی تبحر سے مولانا آزاد بڑے متاثر تھے اُنھوں نے اپنی تصنیف ترجمان القرآن انگریزی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے ڈاکٹر صاحب کو دی لیکن یہ مولانا کا آخری زمانہ تھا۔ جس وقت مولانا آزاد کا انتقال ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اُس وقت مولانا آزاد کے مکان میں بحیثیت مہمان مقیم تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ترجمان القرآن کا بڑی خوبی سے انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے جس کے دو حصّے طبع ہوچکے ہیں اور تیسرا حصّہ زیر طبع ہے۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کی تحریروں کا مطالعہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان کی زبان کتنی ادق اور طرز بیان کس قدر نرالا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے باوجود ان مشکلات کے نہایت ہی نفیس ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور میری رائے میں یہ ترجمہ انگریزی ادب میں خود ایک شاہکار اور گراں قدر نثر کا نمونہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ہر دلعزیزی اور علمی قابلیت کی وجہ سے انھیں ادبی اور مذہبی مجالس میں صدارت کے لئے انتخاب کیا جاتا۔ کمیٹیوں کے صدور آپ سے اصرار کرتے کہ صدارت قبول کریں۔ چنانچہ آپ صدارت قبول فرماتے تھے۔ صدارت کی ذمہ داری وہ قبول کرنے سے اس لئے پیچھے ہٹتے تھے کہ آخری زمانہ میں ان کی صحت خراب ہوچکی تھی اس کے باوجود وہ انکار کرکے کسی کی دلشکنی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ یوم انیس کے موقع پر آپ نے باوجود اپنی خرابی صحت کے بڑی دل افروز تقریر کی ——————— آپ نے فرمایا کہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا غم تو ہر ایک کرتا ہے لیکن جو غم حضرت امام حسینؑ کو اپنی قوم کی بے راہ روی سے تھا کوئی نہیں سمجھتا یعنی حضرت امام حسینؑ کو غم اس بات کا تھا کہ جماعت ٹوٹ رہی ہے آپس کے جھگڑوں سے اسلامی طاقت متزلزل ہو رہی ہے۔ اگر یہ غم لوگ سمجھ جاتے تو بہت سی پریشانیاں خود بخود رفع ہوجاتیں۔ غم حسینؑ کو دور کرو اور یہی حضرت امام حسینؑ کے سوگ منانے کا بہترین طریقہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنی غالب دشمنی کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ انھوں نے مرزا غالب پر جو تنقیدی کتاب شائع کی وہ ٹکنک اور فن تنقید کے لحاظ سے ایک معیاری کتاب ہے لیکن ایک من چلے شاعر کو میدان میں لاکر مغربی انداز میں تنقید کرنے سے انہیں بڑی مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور اردو ادب کے پرستار ڈاکٹر صاحب کے

مخالف ہو گئے تھے۔ یہ بات بہت پرانی ہے لیکن دو سال قبل جب غالب کا صد سالہ جشن منایا گیا تو انجمن ترقی اردو کے اراکین نے ڈاکٹر صاحب کو ان کی علم دوستی اور ہر دلعزیزی کی وجہ سے اس جلسہ کی صدارت کے لئے منتخب کیا۔ اس وقت تک مرزا غالب کے تعلق سے ڈاکٹر صاحب کے خیالات میں تبدیلی آ گئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی بینائی کمزور ہو گئی تھی۔ اس لئے وہ اپنا مضمون لکھوا دیتے اور جلسے کے موقع پر انہیں کے شاگردوں میں سے کوئی ایک متعلقہ خطبہ ڈاکٹر صاحب کی جانب سے پڑھ دیتا۔ اس موقع پر یہ کام پروفیسر سید محمد صاحب کے تفویض ہوا۔

دوسرے دن جلسہ اردو ہال میں نہایت شاندار طریقے پر منایا گیا۔ اس جلسے کے کچھ دن بعد حکومت کی جانب سے رویندر بھارتی میں گورنر آندھرا پردیش کی زیر صدارت شری برہمانند ریڈی چیف منسٹر آندھرا پردیش کی زیر نگرانی غالب صدی کے جلسہ کا انتظام کیا گیا تھا جس کے مہمان خصوصی نواب معظم جاہ بہادر تھے۔ غالب کے تعلق سے اس موقع پر دو کتابوں کے علاوہ میری کتاب پیکر غالب کی رسم اجراء بھی ہوئی۔ جب پیکر غالب کے مصنف کا تعارف عوام سے کیا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے جو اس اجلاس میں شریک تھے اپنے ایک شاگرد بلال سے پوچھا کہ کیا یہ وہی اپنا لطیف ہے؟ تو اس پر بلال نے مسکرا کر جواب دیا کہ ہاں وہی اپنا لطیف ہے، تب ڈاکٹر صاحب نے بلال سے کہا کہ جلسہ ختم ہونے پر اس کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ جلسہ ختم پر بلال میرے پاس آئے اور پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ آپ کی طلبی ہو رہی ہے میں فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور سلام کیا تو۔ مزاحیہ انداز میں کہنے لگے کہ کل آپ میرے گھر تشریف لائیے آپ کا شاندار سواگت کیا جائیگا پھر اپنے خاص انداز میں کہنے لگے کہ اس تصنیف کا ذکر مجھ سے کیوں نہیں کیا اور اس کو راز میں رکھنے کی کیا وجہ تھی! میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جس دن آپ کا خطبہ گھر پر سنایا جا رہا تھا میں جان بوجھ کر وہاں سے اٹھا کہ کہیں غالب کے تعلق سے میں کچھ کہہ دوں۔ اور آپ اس سے متاثر ہو جائیں تو مسکرا کر کہنے لگے کہ اچھا کل گھر آؤ تو تفصیلی گفتگو کرینگے" دوسرے دن جب میں ڈاکٹر صاحب کے مکان پر گیا تو بڑی دلچسپ بحث رہی اس کے بعد مسکراتے ہوئے ایک بڑا دلچسپ لطیفہ سنایا۔ ڈاکٹر صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ جب اردو ہال کے جلسے میں کرسی صدارت پر بیٹھا تو میرے ایک دوست نے کسی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حسینؓ کی مجلس میں یزید کی صدارت کیسی یعنی ڈاکٹر صاحب نے غالب پر کڑی تنقید کی تھی۔ اب اس کی یاد اور اعزاز میں منعقد کئے گئے جلسے میں صدر کیسے بنائے گئے۔ اس واقعہ کو ان کے دوست نے دوسرے دن ان کے گھر پر آ کر سنایا۔

ڈاکٹر صاحبؒ کا انتقال ماہ رمضان کے مقدس مہینے میں یعنی ۱۴ رمضان ۱۳۹۱ھ م ۴ نومبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔

کام نسبتاً زیادہ ہوتا تھا۔ پیوستہ رمضان کا ایک واقعہ سن لیجئے۔ عشاء کی نماز کے بعد چند شاگرد ڈاکٹر صاحب کے ہاں جمع ہو جاتے ۔ اور ترجمہ کا کام شروع کیا جاتا۔ کبھی تو رات کے تین بلکہ چار ہی بج جاتے تھے اور پھر خوشی خوشی ہم اپنے گھروں کو لوٹتے تھے۔ ابتداء میں عجیب واقعہ پیش آیا۔ حسب معمول رات کے آٹھ بجے ہم ڈاکٹر صاحب کے پاس پہونچے اور خیال تھا کہ دس گیارہ بجے تک واپس لوٹ جائینگے۔ لیکن قرآنی ترجمہ میں ایسے محو ہو گئے کہ اچانک سحری کو اٹھانے والے حضرات کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ رات کے چار بجے ہیں۔ غرض محویت کا یہ عالم ہوتا کہ وقت کا احساس ہی نہ ہوتا۔

ملا ساقی جو دریا دل بلا زشون کی بن آئی
اٹھایا شام سے ساغر تو ہنگام سحر رکھا

ایک نئے آدمی کے لئے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کچھ جاذب نظر نہیں تھی۔ لیکن جب وہ گفتگو کرتے تو سننے والوں پر ایک محویت طاری ہو جاتی تھی۔ قدرت نے انھیں ایک غیر معمولی دل و دماغ عطا کیا تھا۔ لیکن آخری زمانہ میں جب وہ قرآن شریف کا ترجمہ اور مذہبی تحقیقاتی مقالے لکھنے میں معروف ہوئے تو اس وقت ان کی بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی۔ خصوصاً ایک آنکھ کی روشنی بالکل غائب ہو چکی تھی لیکن اس باہمت شخص نے ان موانعات کے باوجود جس کام کو تکمیل کرنے کا بیڑا اٹھایا اس کو خدا کے فضل سے مکمل کر کے چھوڑا۔ خصوصاً جب قرآن شریف کا ترجمہ آخری مرحلوں سے گزر رہا تھا وہ اچانک سخت علیل ہو گئے اور تقریباً ایک مہینہ سکندرآباد کے دواخانہ میں انھیں زیر علاج رہنا پڑا۔ اس وقت ہم تمام دست بدعا تھے کہ ڈاکٹر صاحب جلد اچھے ہو جائیں اور قرآن شریف کا ترجمہ مکمل ہو جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کی طلب صادق اور شاگردوں کی دعا اور پھر مقدس کام کی تکمیل کے ارادہ نے انھیں بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ وہ باقی کام آسانی کے ساتھ انجام دے سکے۔

قرآن شریف کا ترجمہ جب چھپ کر منظر عام پر آیا تو بعض منچلے حضرات جن کا پیشہ تنقید نگاری اور تنقیص نگاری تھا۔ اس ترجمہ پر اعتراضات کئے اور بعض انگریزی اخباروں میں اس ترجمہ کے خلاف مضمون لکھے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان تنقید نگاروں کا منہ توڑ جواب دیا۔ ان حضرات کا اعتراض تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب عربی زبان سے ناواقف ہیں تو وہ ترجمہ کیسے کر سکتے۔ ڈاکٹر صاحب عربی زبان سے کما حقہ' واقف تھے۔ میرے خیال میں ان کی عربی زبان کی قابلیت ان تعلیم یافتہ پوسٹ گریجویٹس سے بھی کئی گنا زیادہ تھی جنھوں نے عربی زبان میں ڈگریاں حاصل کیں۔ مسٹر پکتھال جو پیدائشی انگریز تھے اور جنھوں نے تعلیمات اسلامی سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا ان کی مادری زبان عربی نہ تھی۔ لیکن ان کا قرآن شریف کا ترجمہ انگریزی زبان میں ایک مستند ترجمہ مانا جاتا ہے۔ انھیں عربی زبان پر کافی عبور نہ تھا اس مقصد کے لئے وہ مصر گئے اور انگریزی داں عربی علماء سے

استفادہ کیا کیونکہ وہ قرآن شریف کے اردو ترجموں سے اردو زبان نہ جاننے کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اس معاملہ میں مسٹر پکتھال سے زیادہ خوش نصیب تھے وہ انگریزی زبان کے جید عالم، اردو زبان کے مستند استاد اور عربی زبان پر انہیں کافی عبور تھا۔ ایسی خوبیوں سے مزین شخص کے لیے ترجمہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ پھر یوں بھی ان کے حلقہ احباب میں عربی اور انگریزی جاننے والوں کی کمی نہ تھی ان حضرات نے ڈاکٹر صاحب کے ترجمہ جیسے مقدس کام میں انتہائی عقیدت مندی اور پورے انہماک سے ہاتھ بٹایا۔ ترجمہ کے طریقہ کار سے متعلق کچھ مختصر روداد قارئین کی معلومات کے لیے پیش ہے تاکہ وہ لوگ جو ڈاکٹر صاحب کے ترجمہ سے مطمئن نہیں ہیں حقیقت سے آگاہ ہو کر مطمئن ہو جائیں۔

عموماً رات میں عشاء کی نماز کے بعد یا تعطیل کے دن صبح دس گیارہ بجے پانچ چھ حضرات ان کے مکان پر جمع ہو جاتے تھے یہ حضرات انگریزی، عربی اور اردو زبان کی کافی مہارت رکھتے تھے۔ کوئی عربی کا عالم ہوتا تو کوئی انگریزی اور اردو ادب کا ماہر ہوتا۔ مختلف مستند انگریزی اور اردو ترجموں کو سامنے رکھ لیا جاتا اور احتیاطاً شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجمہ پیش نظر ہوتا۔ قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی جاتی اس کے بعد اس آیت کے مختلف ترجمے انگریزی میں پڑھے جاتے۔ پھر اردو ترجموں کی باری آتی اگر ضرورت محسوس ہوتی تو شاہ ولی اللہ صاحب کا فارسی ترجمہ بھی پڑھا جاتا۔ ترجموں کے تعلق سے بحث ہوتی بعد میں ڈاکٹر صاحب کافی غور و فکر کے بعد اپنا انگریزی ترجمہ تحریر کرواتے تھے۔ بینائی کمزور ہونے کی وجہ وہ خود نہیں لکھ سکتے تھے۔ مجھے اکثر ان ترجموں کو تحریر کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

غرض اتنی کاوش اور غور و فکر کے بعد جب ترجمہ کیا جاتا تو اس کا مستند ہونا یقینی ہے۔ گستاخی معاف اگر میں یہ کہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے مزاج میں قدرے ضد تھی بعض وقت ایسا ہوتا تھا کہ جو وہ کہتے دوسروں کو ماننے کے لئے اصرار کرتے تھے اس طرح تھوڑی دیر کی بحث اور متفقہ رائے کے بعد ترجمہ لکھا جاتا تھا۔ ایک واقعہ بیان کرتا ہوں ایک ترجمہ کے ضمن میں کافی بحث ہوئی میں مصر تھا کہ ترجمہ بدلا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے نہیں مانا آخر میں بھی ان کا شاگرد تھا میں نے عرض کیا کہ اس ترجمہ کے آپ ذمہ دار ہیں۔ آپ کے کہنے پر لکھ دیتے ہیں۔ لیکن بعد میں غور فرمائیے۔ ہمارے جانے کے بعد آپ نے اس ترجمہ کو دوبارہ اطمینان سے دیکھا جب دوسرے دن ہم گئے تو مسکرا کر کہنے لگے کہ آئیے آپ کو الہام ہوا ہے اور دوبارہ اس ترجمے کو لکھوایا۔ بعد میں کہا کہ میں بحث و مباحث کا قائل ہوں اس سے بہت سی اچھی باتیں منظر عام آتی ہیں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ میرے شاگرد بغیر سوچے سمجھے خصوصاً قرآنی آیتوں کا ترجمہ نہ کریں۔ غلط ترجموں سے بعد میں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب نے قرآن شریف جیسی

مفتوں کوٹوی

منیر شکوہ آبادی مرحوم کی قصیدہ نگاری

منیر شکوہ آبادی مرحوم کی شخصیت اردو ادب میں کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو شاعری اپنے ایسے پرگو اور زود گو شاعر پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ انھوں نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور حق یہ ہے کہ استادانہ کمالات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمارے یہاں ہر صنف خصوصی نزاکتیں اور لطافتیں رکھتی ہے۔ اس کے تقاضوں کو پورا کرنا مہارت تامہ کا بھی طلبگار ہے اور فن دانی و ادب پرستی کا بھی۔ مرثیہ گوئی کے لوازمات کچھ اور ہیں قصیدہ نگاری کے کچھ اور۔ غزل کی زبان اور اس کا لہجہ کچھ اور ہی ہے۔ پھر اس ظرف کو جس شراب طہور سے بھرا جاتا ہے اس کا رنگ دور ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یہاں جناب منیر کی قصیدہ نگاری اور غزل گوئی کا کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ اگرچہ ادب و سخن کے یہ دونوں میدان ایک دوسرے سے امتیاز و اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن جناب منیر کے پاؤں کسی لغزش سے آشنا نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ اپنے رہوار قلم کو بے تکان دوڑاتے چلے گئے ہیں۔ طبیعت کا جوش و خروش اور وجدان و میلان ہر ہر قدم پر تحسین و آفریں کی صدائیں بلند کروا لیتا ہے اور یہی ان کا کمال فن ہے۔

منیر شکوہ آبادی کی قصیدہ گوئی

آداب قصیدہ گوئی برتنے میں منیر مرحوم اپنے پیش روؤں سے کچھ کم نہیں۔ تشبیب، گریز، مدح، اور دعا جو قصیدہ کے چار عناصر ہیں ان میں منیر کمال فن کا بڑا مظاہرہ کرتے ہیں۔ منقبتی قصیدہ امام مہدی کی ابتدا میں اگرچہ کچھ تکلف معلوم نہیں ہوتا لیکن گریز کے بعد پھر جو مدح میں قلم اٹھایا ہے تو کمال کر دکھایا ہے ؎

کرے جو کسب ضیا جلوہ گاہ حضرت سے
شعاع مہر ہو جاروب خانۂ زنبور

ترے نمک کی قسم ایکبار اگر کھائیں
تو گرسنہ نہ ہوں پھر عمر بھر اناث و ذکور

جو شب کو راہ بھٹک جائے کوئی دیوانہ
دکھائے عقل اندھیرے میں اس کو شمع شعور

ترے زمانہ میں اغر فر پڑھے خط تقدیر
جو چشم کور میں ہو سرمۂ شب دیجور

ترے اشارے سے ظلمت ہو نور سے بہتر
نظر میں کنجۂ افعی ہو صاف شعلۂ طور

خلاف اس میں نہیں ہے اگر بغرض محال
بجائے خامہ میسر ہو موج چشمۂ نور

دوات میں عوض صوف ہو لباس حرم / ورق کے بدلے بہم پہنچے صفحۂ دل حور
تمام جن و ملک جمع ہوں پئے امداد / لکھا نہ جائے ترا وصف تا بہ روز نشور

ب فریاد پیش کرتے ہیں ؎

جفائے دہر کی فریاد تجھ سے لایا ہوں / کہ مجھ کو صورت تصویر کر دیا مجبور
مجھے صلہ یہی دلواؤ اس قصیدہ کا / کہ رنج دور ہو حاصل ہو جاہ و عیش و سرور

مولانا سید محمد کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کی تمہید اس طرح قائم کی ہے کہ صبح کا ماحول بڑا پُر فضا ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ملائکہ طبق نور لئے لکھنؤ کی طرف رواں ہیں ؎

سوال میں نے کیا ان سے بعد تسلیمات / کہ اے ملائکہ فضل ایزد وہاب
وہ کون بندۂ مقبول حق ہے جس کے لئے / رواں ہو تحفۂ قدسی لئے شتاب شتاب
دیا جواب کہ اے نقش بوریائے الم / کیا خطاب کہ اے مبتلائے رنج و عذاب
ہم اس ولی کی زیارت کو جاتے ہیں ہر صبح / کہ جو ہے قبلۂ دیں مرشد اولی الالباب
ستون کعبۂ اسلام عرش اعظم علم / گل بہشت کمالات خضر راہ صواب
امام و سید ناصر ظلہ العالی / کہ مہر برج شریعت ہے جس کی مہر خطاب
یہ سن کے مدحت اقدس کی ہو گئی مجھے فکر / کہا یہ مطلع نو رشک مہر عالمتاب

اور پھر مدح کی طرف رجوع ہوئے ہیں۔ دعا میں اساتذۂ قدیم کا سا انداز ہے۔

واجد علی شاہ بادشاہ غازی کے مدحیہ قصیدے ہیں۔ یہ بہت گہرے ڈوبے ہیں۔ دریائے معانی کی غواصی کر کے کئی گوہر نکالے ہیں۔ یہ مطلع لکھ کر ؎

آئینہ سخن کے لئے ہو گھر آب میں / ہاتھ آئے سیر کشتی اسکندر آب میں

تین چار شعر کے بعد غزل کی طرف رجوع ہو گئے ہیں۔ غزل کا مطلع ہے ؎

آئی ہے موج خندۂ گل اکثر آب میں / بیضہ ہے عندلیب کا ہر گوہر آب میں

اس مقطع سے پھر قصیدہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں ؎

اس بحر میں ہے فکر قصیدہ کی اے منیرؔ / غواص دل کو ہاتھ لگیں گوہر آب میں

کچھ مدحیہ اشعار سے حظ حاصل کیجئے ؎

تنویر دست جود سے پیدا ہوا طلسم / مچھلی کے فلس بن گئے قرص زر آب میں
رکھتے ہیں فیض شاہ سے سنگین دل آب و تاب / پارس کی قدر پانے لگے پتھر آب میں

وہ عدل ہے کہ ربط نقیضین ہو عیاں ۔۔۔ ہر قطرہ آگ میں رہے ہر اخگر آب میں
دیکھیں یہ عدل تو صفا سے قوی ڈریں ۔۔۔ بجلی کے پر گر کو بنیں خنجر آب میں
غالب ہوئے ہیں سخت دلوں پر خدا پرست ۔۔۔ آہن بجھاتے رہتے ہیں آہنگر آب میں

گھوڑے کی تعریف بھی ہے اور فیل خاصہ کی بھی۔ دو شعر فیل خاصہ کی تعریف کے سنئے ؎

زنجیر اس کے پاؤں کی طوفانِ نوح میں ۔۔۔ کشتی کائنات کو ہو لنگر آب میں
دریا کو اس کا سایہ معطر اگر کرے ۔۔۔ پیدا ہو مشک تر، عوض عنبر آب میں

نواب ذوالفقار علی خاں بہادر کی مدح میں جو قصیدہ ہے۔ اس میں سواری کا حال دیکھئے ؎

یہ بڑھا تیری سواری سے عروج اور وقار ۔۔۔ پست ہے مثل زمیں گنبد چرخ دوار
بہر تسلیم خمیدہ ہے سر فیل فلک ۔۔۔ کیا کروں فیل سواری کی بلندی اظہار
ایسی دیکھی نہیں رفتار سیہ مستی کی ۔۔۔ اکثر اٹھتا ہے تماشے کے لئے ابر بہار

تلوار کی تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

فتح ہے جیسی ہر اک شیر یں کے ہمیشہ ہمراہ ۔۔۔ جوئے شیر سحر عید ہے تیری تلوار
دام گیسوئے پری سے بھی زیادہ ہے ذرہ ۔۔۔ چادر آئینہ ہیں پیشانیٔ خوبان بہار
کیا ترے عدل کی تعریف ہوائے چشمۂ فیض ۔۔۔ آب و آتش میں تخالف نہیں باہم زنہار
شب گیسو میں کرے دزد نگر کیا چوری ۔۔۔ ہندوِ خال بتاں آپ بنا چوکیدار
رات کے قبضہ میں ہے تیغ مہ نو یعنی ۔۔۔ حبشی گشت کو پھرتا ہے لگائے تلوار
تھک گئے حشر خرامی سے حسینانِ جہاں ۔۔۔ ٹھوکروں سے بھی تو ہوتا نہیں فتنہ بیدار
گوسپندوں کی چراگاہ ہوا کارِ گرگ ۔۔۔ دہن شیر ہے گہوارۂ آہوئے تتار
دو دقلیاں سے معطر ہوئی بزم عشرت ۔۔۔ باغ قالیں میں کھلا سنبل فردوس بہار
سبق آموز فلاطون ہیں غلامانِ حضور ۔۔۔ عقل کامل تری شاگرد ہے اے عرش وقار

نواب تجمل حسین خاں کے قصیدہ میں جو گہرباری کی ہے۔ اس کی آب و تاب دیکھنے کے قابل ہے تمہید ہی پر شکوہ ہے ؎

قلزمِ فیض سے کس کے ہوئے پیدا گوہر ۔۔۔ اپنے کوزوں میں لئے پھرتے ہیں دریا گوہر
دست گیری ہوئی پا ماؤں کی کس کو منظور ۔۔۔ آبلوں سے ہوئے کس واسطے ماناگوہر
کس خدا دوست کے ہاتھوں میں پہنچنے کے لئے ۔۔۔ کرتے ہیں دانہ تسبیح سے رشتا گوہر

مدحیہ اشعار کی چمک دمک ملاحظہ فرمائیے ؎

فیض والا سے نہیں اہل عدم بھی محروم　　فرط بخشش سے ہوئے بیضۂ عنقا گوہر
آپ کے فیض نے جب ابر کرم برسایا　　رعد کے بدلے گرجنے لگے کیا کیا گوہر
تیرے دریائے کرم کی نہ ملے گی کبھی تھاہ　　آب میں اپنے عبث کھاتے ہیں غوطا گوہر
اہل تقویٰ پہ اگر آپ گہرافشاں ہوں　　دانہ کے بدلے چگے مرغ مصلاً گوہر
زال دنیا نے بھی بالوں میں پروئے موتی　　روز لوٹے تری سرکار سے صدہا گوہر

کمال تو یہ ملاحظہ ہو کہ اس ردیف میں بھی گھوڑے ہاتھی اور تلوار کی مدح کر ڈالی ہے ؎

لب دریا جو کرے گرم روی توسن خاص　　اڑ چلیں بطن صدف سے شررآسا گوہر
ہاتھی ایسا ہے سبک رو کہ قدم سے جس کے　　ٹوٹنا کیا کہ نہ ہو نام کو میلا گوہر
دیکھ کر موتیوں کی جھول پہ سب کہتے ہیں　　پہنے پھرتی ہے عروس شب یلدا گوہر
تیری شمشیر شررِ دم کی جو تیزی سن پائیں　　قطع کر دیں صدف بحر سے رشتہ گوہر
کوئی اس سیف سے تشبیہ اگر موج کو دے　　اپنے روزن میں چھپائے پھریں دریا گوہر

اور سنئے ؎

آپ کا نام جو اطفال کریں ورد زبان　　دودھ کے دانت بنیں منہ میں مصفا گوہر

دعا کے بعد مدعا ملاحظہ ہو ؎

منہ مرا گوہر انعام سے ہو مالا مال　　دہن فکر کے ہوں دانت سراپا گوہر
اپنے مداح پہ اب کیجئے بخشش کی نگاہ　　بخشئے آج یم فیض سے آقا گوہر

منیر مرحوم کے ایک قصیدہ میں حیات و موت کا مناظرہ سنئے جو قصیدہ کی شان بھی ہے اور ان کی بلندیٔ تخیل کی آن بھی ؎

زمانے بھر کی بلاؤں میں مبتلا تھا میں　　خفا میں جان سے تھا۔ جان مجھ سے تھی بیزار
ادھر تو کھینچتی تھیں سخت جانیاں دامن　　ادھر قضا میرے لے جانے کے لئے تیار
میں طرفہ ردّ و بدل، تازہ کشمکش میں تھا　　مرے لئے ہوئی ہستی و مرگ میں تکرار
ہر اک کو دونوں میں دعویٔ افضلیت تھا　　ہر ایک کرتی تھی اپنی فضیلتیں اظہار
بیان دعویٔ ہستی یہ تھا کہ سن اے مرگ　　میں مجھ سے بڑھ کے ہوں آگاہ ہیں صغار و کبار
مرے طفیل سے قائم ہیں آسمان و زمیں　　مجھی سے ہیں مہ و خورشید مطلع انوار

مرے پیالے میں آبِ حیات ہے لبریز — تری شراب میں مخلوط زہرِ عقرب و مار
خراب لوٹتے ہوئے مقبرے تری جاگیر — مرے نصیب میں سونے کے قصر مینا کار
ترے دماغ کو حاصل عفونتِ اموات — مرے مشام میں عطرِ نفیس مشکِ تتار
مرے نصیب میں ہانگِ نشاط نغمۂ عیش — تری بساط میں ہے نوحہ اور نالۂ زار
کہا یہ مرگ نے لس لس خموش اے ہستی — کچھ اس میں راست ہے کچھ خلاف ہے تری گفتار
میں وہ ہوں جس سے لرزتے ہیں سرکشانِ جہاں — میں وہ ہوں جس سے ہیں عاجز ستم گر و اشرار
مرے سبب سے شہیدوں کو ہے حیاتِ ابد — مرے سبب سے ہیں پیوندِ خاک بدکردار
مرے وسیلے سے ابرار زینتِ فردوس — مرے طفیل سے اشرار ہیں وقودِ النار
پسند آتی ہے تو کس کو ضعفِ پیری میں — کہ اپنی جان سے ہو جاتے ہیں بشر بیزار
غرور کرکے ہوئے مدعی خدائی کے — ترے سبب سے سلاطین ظالم و جبار
خدا نے حکم دیا قبل آن تموتوا کا — جہاں میں مرنے کے مشتاق رہتے ہیں ابرار

گریز کی شان ملاحظہ ہو ــــ

گزشتہ را صلوات اب بغور حال کو دیکھ — کہ تیرے پاس بہت بد ہیں کم ہیں نیکوکار
پیمبرانِ خدا میرے شہر میں سب ہیں — کہ جن کے نقشِ کفِ پا سے خلد ہے گلزار
خصوصاً ان میں شہ انبیاء حبیبِ خدا — شفیعِ امت و محبوبِ ایزدِ غفار
صفائے آئینۂ لا الٰہ الا اللہ — جلائے سرمۂ مازاغ واقفِ اسرار

یہ قصیدہ نعت میں ہے۔ جناب منیرؔ ہر صنفِ سخن میں کامیاب ہیں۔ عبور کامل رکھتے ہیں۔ ان کے قصیدوں میں بڑی شان و شوکت اور برتری و عظمت ہے۔ قصیدہ کا کوئی جزو ایسا نہیں جس میں کہیں جھول نظر آئے۔ تشبیب ہے تو لاجواب، گریز ہے تو بے مثال، مدح ہے تو عرش پیما، دعا ہے تو مقبول و رسا۔ الفاظ میں دبدبہ ہے۔ خیالات میں شان و شکوہ ہے۔ بیان میں تازگی و شگفتگی ہے۔ اظہار میں شائستگی و برجستگی، حسبِ موقع و محل گہرباری اور مدح نگاری کرتے چلے جاتے ہیں۔ نہ قافیہ و ردیف کی دشواریاں انھیں مزاحم ہوتی ہیں۔ نہ تاثرات و جذبات کے اظہار میں یہ خامی نظر آتے ہیں اور یہی ان کے فن کا جلال اور ان کی شخصیت کا جمال ہے۔

منیر شکوہ آبادی کا معیارِ غزل

دیگر کئی خوبیوں کے ساتھ ہماری قدیم غزل فنی مہارت اور پختگیِ مشق کے اظہار کا ذریعہ بھی رہی ہے۔ صنائع و بدائع کی

بہتات استعارہ و تشبیہ کی کثرت، لفظی و معنوی آرائش، رعایات و مناسبات کا التزام۔ غزل کے ضروری عناصر رہے ہیں۔ اس سے قدرتِ بیان کا اظہار، زورِ کلام کی نمائش اور افکار و خیالات کی رفعت و ندرت دکھانی مقصود ہوتی تھی۔ استادانہ کمالات انھیں میں مخفی تھے۔ سخت زمین اور مشکل قوافی کا انتخاب اور پھر اس میں سخن آرائی کرنا ہنروری اور زنکاری کا ثبوت بہم پہنچانا تھا۔ شاہ نصیر اس میدان کے مرد تھے۔ لکھنوی اساتذہ نے اس انداز کو زیادہ گلے لگایا۔ آتش مرحوم فرماتے ہیں ؎

آتش زمینِ شعر ہو ہر چند سنگلاخ لغزش سے آشنا نہیں مردِ سخن کے پاؤں

قصائد میں ایسے ہی ردیف و قافیہ منتخب کئے گئے اور زورِ سخن اور استادانہ کمال دکھایا گیا۔ غزل میں بھی اسی جدت و ندرت کے مظاہرے کئے گئے۔ طرحی مشاعرے اوّل تو خود ہی آزمائش و امتحان کے معرکے تھے۔ پھر اگر کسی سخت زمین اور مشکل قافیہ و ردیف والے مصرع کا انتخاب ہو گیا بلکہ انتخاب کیا جاتا تھا زورِ قلم دکھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاتی تھی۔ سخن سنجوں اور سخن فہموں کی دلچسپیاں بڑھ جاتی تھیں۔ منیر شکوہ آبادی مرحوم کی کئی غزلیں مشکل قوافی و ردیف کی حامل ہیں اور یہ غواصِ سخن۔ جولانیِ طبع دکھاتا چلا گیا ہے۔ حروفِ تہجی سے دیوان کی ترتیب، خود ہی مشکل قوافی و ردیف پیدا کر دیتی تھی اور صاحبِ دیوان کو ہر حرف میں کم از کم دو چار غزلیں ضرور کہنی پڑتی تھیں۔ منیر مرحوم کو بھی اپنے دواوین کی ترتیب میں اس کا پاس رکھنا پڑا ہے۔ لیکن اس مردِ سخن کے پاؤں لغزش سے کہیں آشنا نہ ہو سکے اور جہاں قدرتِ بیان حائل ہو وہاں طبعزاد مشکل زمینیں پیدا کر کے بھی کامیاب غزلیں کہہ دینا کونسی بڑی بات ہے۔ منیر مرحوم کی غزلیں طویل بھی ہیں اور بالعموم سخت زمینوں کو باطنی و ظاہری آرائشوں سے نکھارنا کارے دارد والا مضمون ہے منیر مرحوم کا کلام موجود ہے آپ آزمائش کر لیجئے۔ انھیں کامیاب پایئے گا۔ کوئی سی غزل لے لیجئے۔ اس میں کئی ثانی مصرعے آپ کو ایسے مل جائیں گے جن کے لئے مصرعِ اولیٰ بہم پہنچانا منیر جیسے مشاقِ سخن ہی کا کام تھا۔ مثال کے طور پر اگر ذیل کے اشعار کے ثانی مصرعوں پر اولیٰ مصرعے خود لگانے کی کوشش کی جائے اور بعد میں منیر مرحوم کے اولیٰ مصرعے دیکھے جائیں تو سطورِ بالا کی حقیقت آشکارا ہو جائے گی میں کبھی کد و کاوش سے نہیں، مجموعۂ کلام کے اوراق الٹ پلٹ کر چند ایسے اشعار لکھ دیتا ہوں ؎

چھپ چھپ کے دیکھتے ہیں عبث آپ گھر میں بال پڑ جائیں گے حضور کی تیغِ نظر میں بال

پہنے نہا کے ہار جو تو نے پلنگ پر اے بحرِ حسن بہہ گئے موجِ رسن میں پھول

کس قدر ہے شعلہ افشاں آتشِ رنگِ حنا بن گئے ہیں بھبھوکے، نگ، گلنار ہاتھ میں

سیلِ سرشک سے تہ و بالا ہوا مکان پانی پر اب پلنگ ہے پانی پلنگ پر

دل پکا یا گرمیٔ روزِ فراقِ یار نے　　آتشِ خورشید سے پیکاں مرا پھوڑا ہوا

اب کی فصلِ گل میں وحشت کی جو یہ لزت رہی　　شاخ آہو پہ بنے گا آشیانِ عندلیب

تیرے سخن سخت میں ہے حسن نزاکت　　کانوں کو ہوئی پنبۂ مہتاب کڑی بات

اُردو شاعری کے ساتھ ہی ساتھ شاگردی و استادی کی رسم بھی پنپتی چلی آرہی ہے۔ یہ ایک دوسرے سے بڑی قریبی وابستگی رکھتی ہیں۔ اُستاد اپنے تلامذہ کے خیال و بیان میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ آدابِ شعر گوئی کی تربیت دیتا ہے۔ شعر گوئی کے طور طریق سکھاتا ہے۔ صنائع و بدائع، خامیوں اور خوبیوں، بلندیوں اور پستیوں سے آگاہی بخشتا ہے۔ ان کی فطری استعداد، ذاتی صلاحیت اور ذہنی رجحانات کی نئی تراش خراش کر کے انھیں اُجالتا ہے۔ سنوارتا ہے اور جلا دیتا ہے۔ جذبات و خیالات کو پستی، سوقیت، عریانیت کے گرد و غبار سے مصفا و مجلا کر کے ان میں بلندی متانت و وقار کی تابناکیاں پیدا کرتا ہے۔ اظہار و ابلاغ زبان و بیان خیال و افکار سب کچھ ارتقائی و ارتفاعی منازل طے کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک دن شاگرد خود اُستادی کے منصب پر فائز ہو جاتا ہے۔ اُستاد کی اس جگر کاوی۔ دماغ سوزی اور محنت و خدمت کا صلہ سعادت مند شاگرد اس کے ادب و احترام اس کی قدردانی اور عظمت شناسی سے دیتے ہیں۔ تن من دھن اسی کیلئے وقف رکھتے ہیں۔ منیرؔ شکوہ آبادی مرحوم اس سلسلہ میں بلند شخصیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اساتذہ کے فن اور کمال کو اجاگر کیا۔ بلکہ ہمیشہ ان کی ہدایات اور روایات کی پابندی کی چنانچہ نواب کلب علی خاں والئی رامپور نے جن کی دربار داری میں منیرؔ مرحوم تھے۔ جب اس زمین میں ناسخؔ مرحوم کا مشہور مطلع ہے ؎

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

گریباں کا قافیہ بہتر سے بہتر لانے کی پابندی کے ساتھ اپنے درباری شعراء سے غزلیں لکھنے کیلئے کہا تو اپنے اُستاد رشکؔ مرحوم کا حوالہ دیتے ہوئے منیرؔ مرحوم نے یہی عذر کیا کہ میں ان کی ہدایت کے مطابق اس زمین میں بغیر عطف و اضافت کے اس قافیہ کو نہیں لا سکتا۔ نواب صاحب کے اصرار پر منیرؔ مرحوم نے غزل کہی اور اس غزل میں ۳، گریباں کے قافیے کہے۔ لیکن سب عطف و اضافت کے ساتھ۔ جتنی بار اس واقعہ کو دھرایا جائے شاگرد و اُستاد کا ربطِ باطنی اجاگر ہوتا چلا جاتا ہے۔ شاگرد کی عقیدت اور اُستاد کی عظمت دل پر اثر کرتی جاتی ہے۔ منیرؔ کے اُستادِ اوّل ناسخؔ مرحوم تھے۔ انھیں کے ایما سے انھوں نے جناب میر علی اوسط رشکؔ کی شاگردی قبول کی تھی۔ ان کے یہاں نئی پابندی سخت تھی۔ منیرؔ مرحوم نے اپنا ایک مطلع رشکؔ مرحوم کو سنایا ؎

گنبدِ قبرِ عاشقاں ٹوٹے　　اے زمیں تجھ پہ آسماں ٹوٹے

اُستاد رشک نے مطلع کی داد دی۔ لیکن فرمایا لوگ برتتے یوں ہیں۔ آسمان (با علان نون) ٹوٹے۔ آسمان (با خفائے نون یعنی نون غنہ کے ساتھ) کوئی نہیں بولتا۔ دوسرا مصرع بدلو۔ منیر مرحوم نے تعمیل حکم کی ؎

لرزے دل ہائے مے کشاں ٹوٹے　　اے خدا جام آسماں ٹوٹے
دشمنی اس زمیں کی دیکھو　　گنبد قبر دوستاں ٹوٹے

جناب منیرؔ جہاں تک غزل کا سوال ہے اور اپنے اُستاد کی پابندی کا تعلق غزل میں اُستاد کے ارشادات کی پابندی کو وضعداری، رواداری اور سعادت مندی سمجھتے ہیں لیکن دیگر اصناف سخن میں وہ اپنے اُستاد مرزا دبیرؔ کے معتقد و پیرو ہیں۔ مرثیوں اور قصیدوں میں قطعوں اور رباعیوں میں وہ اس رکھ رکھاؤ کو ضروری نہیں سمجھتے۔ اس واقعہ کا بار بار دوہرانا بھی موجودہ ماحول کی ساز گاری کا سبب ہوگا اور اسی لئے التفات خصوصی برتا گیا ہے۔ اپنے اساتذہ کے احترام میں ان کی غزلوں کے کئی مقاطع موجود ہیں جن میں بڑی شیفتگی اور خوش عقیدگی سے ان کی شفقت و عظمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اُن میں سے چند مقطعوں کا اندراج یہاں بے جا نہ ہوگا۔ ابتدا اس مقطع سے کیجئے ؎

ہو پائے بوس رشکؔ بس طوف کربلا　　چل اے منیرؔ خدمت اُستاد کے لئے
رشکؔ سے اُستاد کے فیض تلمذ سے منیرؔ　　فکر صائب مدح کے لائق ہماری ہوگئی
رشکؔ کے فیض تلمذ سے منیرؔ　　شاعروں میں تو بھی یکتا ہوگیا
محروم ہوں میں خدمت اُستاد سے منیرؔ　　کلکتہ مجھ کو گور سے بھی تنگ ہوگیا
ہوگیا کامل منیرؔ اُستاد کے اعجاز سے　　آج فرصت مل گئی۔ دیوان پورا ہوگیا
بعد فنا بھی فیض سخن ہے جہان میں　　صدقے منیرؔ حضرت ناسخؔ کے گور پر
ہوں جدا رشکؔ سے اُستاد کی خدمت سے منیرؔ　　فرخ آباد میں کیوں کر ملے آرام مجھے
کیا جانیں منیرؔ شاعری ہم　　اُستاد شفیق کا کرم ہے

یہی نہیں۔ جس طرح جناب دبیرؔ کے لئے ایک مدحیہ غزل ہے۔ اسی طرح جناب رشکؔ کے لئے بھی دیوان میں ایک مدحیہ غزل موجود ہے۔

شاگرد و اُستاد کی عقیدت و عظمت کی مکمل تصویر یہاں موجود تھی۔ اسی لئے اس تصویر کے تمام خدو خال مکمل بہ تفصیل پیش کئے گئے ہیں۔

منیر مرحوم غزلیں بڑی طول طویل کہتے ہیں پھر بھی سیری نہیں ہوتی تو قافیہ بدل کر اسی زمین میں دوسری غزل شروع کر دیتے ہیں۔ مقطع میں اس امر کا اشارہ ضرور کر دیتے ہیں۔

ان کے پہلے دیوان منتخب العالم سے کچھ مطلعے پیش کر رہا ہوں جن سے ان کی دشوار پسندی کا پتہ چل سکے گا۔ مطلعوں سے ہی ان کے زورِ طبیعت اور قدرتِ بیان کا بھی اندازہ کر لیجئے ؎

رفتہ رفتہ پست اتنا مسیک دوں ہو گیا
عقدۂ امساک قفلِ گنجِ قاروں ہو گیا

گذر ہر بحر میں ہوتا ہے خضرِ طبعِ موزوں کا
ہمارا کالبد بجرا بنا دریائے مضموں کا

راہ کر کے اس بت گمراہ نے دھوکا دیا
گر پڑے اندھے کنوئیں میں چاہ نے دھوکا دیا

بڑھ چلا عشق تو دل چھوڑ کے دنیا اٹھا
خود بخود جوشِ مئے ناب سے شیشا اٹھا

غم سہتے ہیں پر غمزۂ بیجا نہیں اٹھتا
مرتے ہیں مگر نازِ مسیحا نہیں اٹھتا

ردیف الف کے مطلعے ہی پیش کئے ہیں۔ پھر ان میں سے سہل قافیہ و ردیف کی غزلیں چھوڑ دی ہیں۔ ایک غزل میں کئی کئی مطلعے ہیں۔ میں نے صرف پہلا مطلع لکھا ہے۔ میں پھر کہوں گا کہ منیرؔ صاحب کی مشاقی، پختگی، مہارت و قدرت کا اندازہ لگانا ہو تو انھیں مطلعوں کے ثانی مصرعوں پر اولی مصرع لگانے کی کوشش کی جائے اور پھر منیرؔ مرحوم کا زورِ سخن آزما لیا جائے۔ یہ ضیغمِ ادب ہی کامیاب نظر آئے گا۔

اخیر میں ایک غزل پیش کر رہا ہوں۔ تشبیہ و استعارہ کی بہاریں دیکھئے اور منیرؔ مرحوم کی سوجھ بوجھ کا اندازہ لگائیے ؎

تمہاری زلف و مکھ کا لطف ہم اے مہ لقا سمجھے
اسے بالِ آئینے کا اور اس کو آئینا سمجھے

اگر اس صاف پھبتی پر ہوئے برہم تو جانے دو
کسوٹی زلف کو عارض کو ہم لوحِ طلا سمجھے

خزانہ زر درو ہے سانپ ان پر زہر کھاتے ہیں
گہن زلفوں کو عارض کو مہِ برجِ ضیا سمجھے

معاذ اللہ ہم کیوں کر جلی چیزوں سے نسبت دیں
بنفشہ اس کو اور اس کو گلِ باغِ وفا سمجھے

جو اس تشبیہ سے بھی ہو پریشانی طبیعت کو
اسے کافور سمجھے اس کو مشکِ جاں فزا سمجھے

اگر نازک مزاجی سے نہ ہو منظور یہ نسبت
شبِ قدر اس کو سمجھے اور اسے بدر الدجیٰ سمجھے

اگر گھٹتی ہو قدرِ حسن اس تشبیہِ نازک سے
اُسے شامِ مراد اس کو چراغِ مدعا سمجھے

نہیں کچھ آبرو اس میں بھی زلف روئے زیبا کی
اُسے آئینۂ دولت اسے بالِ ہما سمجھے

جو یہ تشبیہ بھی گیسو و عارض پر نہ ہو صادق
شبِ معراج اس کو اور اسے نورِ خدا سمجھے

غزل یہ نظم کی فرمائش نواب سے میں نے
قصور اس کا ہے میری فکر کو جو نارسا سمجھے

منیرؔ ان ساری تشبیہوں کے بعد اب اور کیا کہئے
اسے قرآں اسے سطریں اگر سمجھے بجا سمجھے

ایم۔اے۔نصر

اُردو شاعری میں زاہد و رند کا تصور

اُردو ادب نے اپنی زندگی کی کئی منزلیں طے کی ہیں اور اس کے دامن میں گردشِ زمانہ کے ساتھ خوشگوار اور ناخوشگوار دونوں ہی اثرات کا اضافہ ہوا ہے۔ وقت کی لہریں، ان اثرات کو چھپائے ہوئے تیزی کے ساتھ، اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب، اب رجعت پسند ترقی پسند اور جدیدیت کے خانوں میں منقسم ہے۔ ادب کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے نئی راہیں وارد ہوئی ہیں۔ اسی طرح تنقید کا ہیولہ بھی، دواوین اور تذکروں سے نکل آیا ہے اور اب تقریظ، قصیدہ، تنقیص، اور ہجو۔ خاص معنی اور مفہوم رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں، ادب کی طرح، تنقید بھی کئی خاص حصّوں میں منقسم ہو گئی ہے۔ جن میں قدیم اور ترقی پسند دو خاص شکلیں ہیں۔ اس باب میں سید صفی مرتضیٰ کے یہ الفاظ غور طلب ہیں:۔

"مختلف زمانوں میں تنقید کا معیار بدلتا رہا ہے۔ کبھی زبان کا حسن دیکھا گیا تو کبھی سماج کی خوبی اور طرز ادا کی جدت پر نگاہ رہی۔ کبھی جماعتی مفاد کو پیش نظر رکھا گیا تو کبھی سماج کو معاشرت اور معیشت کی کھوج لگائی گئی، کبھی شاعری صرف ذریعہ تفریح سمجھی گئی، تو کبھی ذریعہ تبلیغ۔ ہر دور کے نقاد نے اپنے اپنے احول اور زمانہ کے لحاظ سے تنقید کی ہے"[1]

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ کی نظر میں، ایک تنقید نگار کا یہ فرض ہے کہ:۔

"وہ ہمیشہ غیر جانبدار رہے۔ کسی تصنیف پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے دامن و دماغ کو شخصی تعلقات اور ذاتی خیالات کی گرد سے بالکل پاک کر لے۔ اور اپنی اور جس کتاب پر تنقید کی جا رہی ہو وہ مع اپنے تاریک پہلوؤں کے بھی اس پر نمودار ہو سکے"[2]

دراصل تنقید اور تخلیق کے درمیان گہرا ربط ہے، یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس حقیقت سے بھی انحراف ممکن نہیں جس کی طرف کلیم الدین احمد نے اشارہ کیا ہے:۔

"اگر کسی زبان میں معیاری شاعری بلند نہ ہو تو اس کے نقاد کا دائرہ بھی لازمی طور پر محدود ہو جائیگا"[3]

---

[1] اصناف ادب کا ارتقاء ص ۔ [2] روح تنقید ص۵۸، ص۹۰ [3] اردو شاعری پر ایک نظر ص۹

اور وہ اپنی ایک دوسری کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں یہ لکھتے ہیں۔ —

"اردو شاعری میں لفظوں کو خیالات اور جذبات سے زیادہ اہم سمجھا گیا ہے"[1]

ڈاکٹر محمد حسن کے یہ الفاظ بھی توجہ کے مستحق ہیں!۔ —

"تصوف کی فلسفیانہ بنیادوں کو سمجھے بغیر اردو شاعری کی اصطلاحوں کو نہیں سمجھا جا سکتا اور خانقاہوں کے سماجی رابطے اور عوام پر ان کے اثر کو سمجھے بغیر ہماری شاعری کے سماجی مفہوم تک رسائی ممکن نہیں"[2]

دور جدید میں حالات بدل گئے ہیں، ادب کئی مختلف حصوں میں منقسم ہوگیا ہے۔ تنقیدی زاویے بھی بدلے ہیں۔ ہمارے ادیب اور ناقد حضرات، اپنے مطمح نظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے، زبان و ادب کے گرد محاسبہ کر رہے ہیں اور ان کی بار آور کوششیں، نئی چونکا دینے والی، مفید اور منفعت بخش رازہائے گرانمایہ کو ہمارے روبرو لا رہی ہیں اور نقد و فن کی روشنی میں، جو مثل آئینہ ہمارے سامنے ہے، زبان و ادب کے صحیح معیار سے ہمیں واقفیت ہو رہی ہے۔ اس طرح ہماری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی، کھسکنے لگی ہے۔ اس کی گرہیں کھلنے لگی ہیں جس نے ہمیں اندھیرے اور اجالے کے فرق سے، ابھی تک ناآشنا رکھا تھا۔ ہمیں یہ جان کر از حد حیرت ہوتی ہے کہ اردو شاعری، مدت دراز تک تقلیدی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ فارسی کے عادات و اطوار کو اپنائے ہوئے تھی اور اسی تقلید نے اردو شاعری کے خد و خال کو ابھرنے سے قاصر رکھا اور ہمارے ادبا بالخصوص شعرا کو وہ سوچ اور ذہن میسر نہیں ہونے دیا۔ جس کے سہارے وہ اپنے ماحول، اپنی معاشرت، سماجی حالت یعنی خارجی و داخلی احساسات و جذبات اور مشاہدات کو اشعار کے سانچے میں ڈھال سکیں، میرا مدعا ہرگز یہ نہیں کہ ماضی میں ایسی کوششیں نہیں ہوئیں، وہ بھی فارسی کے دائرہ سے خارج نہیں، لیکن چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ پیش نظر اردو شاعری نے ترقی کی جو منزلیں طے کی ہیں، وہ بلاشبہ ماضی کی مرہون منت ہیں کیونکہ اردو شاعری کے قصر عالیشان کی جڑیں ماضی کی اسی روایت پسند شاعری سے جڑی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ہمیں اس شاعری کی بھی قدر کرنی ہے۔ کیونکہ اس سے ابھرتی ہوئی روشن شعاعوں نے ہمیں بہت سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت دی ہے اور ہمیں اپنی شاعری کی کامیابی میں، ان کا حصہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس حقیقت سے منکر ہونا دیانت داری کے خلاف ہوگا۔

اردو شاعری کی یہ روایت رہی ہے کہ کعبہ پر دیر کو اور پارسا پر رند کو ترجیح دی جائے اور یہ روایت

---

[1] اردو تنقید پر ایک نظر ص۳، [2] ادبی تنقید ص۲۱۴

فارسی سے اُردو میں آئی ہے۔ اور اس کی رو سے بقول ڈاکٹر محمد حسن" ظاہر پرستی کی قدر نہ تھی، قانون، جرم و سزا، جبر اور مذہبی تعصب کی بجائے باطن کی تطہیر اور تربیت پر زور دیا جاتا تھا محبت (مجازی سے حقیقی تک) یہاں کا دستور تھی اور سوز و گداز پیدا کرنا یہاں کی عبادت، اس سوز و گدازِ عشق کو صحیح راستے پر گہری قلبی وابستگی کے ذریعہ لیجایا جا سکتا تھا...... مرشد کی رہبری میں انسان باطن کی یہ منزلیں طے کرتا تھا شریعت سے طریقت کی طرف قدم بڑھاتا تھا اور اسی طرح معرفت اور حقیقت تک پہنچتا تھا، جہاں مذہب کے ظاہری رسوم بیکار ہو جاتے تھے اور اس کو جلوۂ حقیقی کی قربت نصیب ہوتی تھی...... حکومت وقت کی صوفی مشائخ کے خلاف سخت کارروائیاں عوام الناس کے اس عقیدے کو اور بھی پختہ کرتی تھیں کہ صوفی مذہب کے مسکہ بند تصور سے برسرپیکار ہیں"۔

اس طویل اقتباس سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں، مثلاً ظاہر پر باطن کو ترجیح دی جاتی تھی اور ان کا اولین مقصد جلوہ حقیقی کی قربت حاصل کرنا تھا۔ چونکہ ان کا یہ اقدام از روئے شرع غلط تھا۔ لہٰذا حکومت وقت ان کے خلاف تھی اور وہ حکومت کے خلاف برسرپیکار اور حکومت کی مخاصمت کی وجہ سے انہیں عوام کی تائید حاصل تھی۔ الغرض جس طرح لیلیٰ مجنوں، سنبل، نرگس اور عنقا وغیرہ، فارسی شاعری کی دین ہیں، اسی طرح زاہد، رند، شیخ، محتسب، یہ سب بھی فارسی سے اردو ادب میں آئے ہیں۔ بقول عندلیب شادانی اس رسم پرستی کا سب سے زیادہ افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے شعرا نے ہندوستان کی ہر چیز کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ انھیں اپنے اشعار کے لیے ہر شئے ایران و عرب سے مستعار لینی پڑتی ہے" اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ہم چند ایسے شعراء کے اشعار ذیل کی سطروں میں پیش کر رہے ہیں، جن کے زمانہ شاعری کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔

ہمارے شعرائے اردو محتسب کو کس قدر تیکھے انداز میں طعنہ دیتے ہیں ؎

اس قدر تاکید کیوں ترکِ مے و ساغر میں ہے ۔۔۔ محتسب خود بھی تو فکرِ جنت و کوثر میں ہے (حسرت موہانی)

اے محتسب نہ پھینک ارے محتسب نہ پھینک ۔۔۔ ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے (جگر مرادآبادی)

پھر بھلا واعظ ان کی گرفت سے کیسے آزاد رہ سکتا ہے ؎

حشر میں بھی نہ ہوگا اے واعظ ۔۔۔ گنہ آرزوئے حور معاف (حسرت موہانی)

ابھی اک موج مے اٹھی تھی حجاز میں اے واعظ
ابھی اک برق چمکی تھی مری وادیٔ ایمن میں (اصغر گونڈوی)

اور پھر بیچارہ زاہد ؎

نورِ عرفاں کی عبث ہے دلِ زاہد میں تلاش ۔۔۔ اس دیارِ خاک میں نہیں خواہشِ جنت کے سوا (حسرت موہانی)

نگہ زاہد کو حور و کوثر و تسنیم کی　　اور ہم جنت سمجھتے ہیں ترے دیدار کو (جگر مراد آبادی)

اب جناب شیخ کی باری آئی ہے ؎

طالب کوثر و تسنیم جو ہوں حضرت شیخ　　خواہش بادہ کی توہین گوارا نہ کریں (حسرت موہانی)

تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں (نامعلوم)

زاہد، شیخ اور رند وغیرہ اردو شاعری میں ایک خاص علامت ہیں اور ان کے ذریعہ شاعر اپنے خیالات عوام تک پہنچاتا ہے، کیونکہ حالات، اس کے موافق نہیں، زمانہ کی دورنگی نے اسے پریشان کر رکھا ہے اور اپنے خیالات اور احساسات کو واضح الفاظ میں بیان کرنے سے خوف زدہ ہے، جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

کدھر سے برق چمکتی ہے دیکھیں اے واعظ　　میں اپنا ساغر اٹھاتا ہوں تو کتاب اٹھا (جگر)

اس شعر میں شاعر نے اہل علم حضرات پر طنز کیا ہے۔ جنھوں نے تمام عیوب دنیا کو اپنا لیا ہے، لہذا یہی وجہ ہے کہ ؎

نہ پوچھی بات بھی اس شوق کی کافر نگاہوں نے　　لئے بیٹھا رہا زاہد متاعِ دین و ایماں کو (جگر)

ایسے مکار زاہدوں سے رند بلانوش ہی اچھے ہیں، جنکا ظاہر و باطن، ایک ہوتا ہے ؎

ذکر خورشید قیامت سن کے واعظ کیا کہوں　　خبر اس تردامنی کی روز محشر دیکھنا (فانی)

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا　　رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا (اصغر)

جانتے تھے ہم بڑا زاہد جنھیں وہ اے ظفر　　مے کدہ کی کیچ تک عمامہ دھر کر پی گئے (ظفر)

اور بھلا رند کا کیا کہنا، بقول راسخ ؎

راسخ کی فاقہ مستی سے اللہ کی پناہ　　کھاتا ہے سوکھے ٹکڑے بھگو کر شراب میں

ایسی حالت میں بھلا حسرت کے کون منہ آسکتا ہے ؎

جم محتسب ہم پہ حال و قال کا رنگ　　شیخ بیکار ہائے و ہو نہ کرے

دراصل اردو شاعری میں رند کو کبھی ایسے انسان کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے، جس کا ظاہر و باطن، دونوں ایک ہو۔ خرقہ پوشوں، جبہ والوں کی طرح ظاہر اور باطن میں تضاد نہ ہو۔ گویا واعظ، زاہد یا اس قبیل سے تعلق رکھنے والے، دورنگی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر اور باطن کے درمیان، ایک خلیج حائل ہوتی ہے جبکہ رند، ایک صاف گو اور سچا ہے اس کے ظاہر اور باطن میں فرق نہیں، بقول میر تقی میر ؎

صورت پرست ہوتے نہیں معنی آشنا　　ہے عشق سے بتوں کے مرا مدعا کچھ اور

خواجہ الطاف حسین حالیؔ "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھتے ہیں :-

"اصول شاعری کے موافق شراب و کباب کے مضمون باندھنا صرف اُن لوگوں کا حق ہو سکتا ہے جو یا تو خود اس میدان کے مرد ہوں اور یا اپنے اصلی خیالات "خمریات" کے پیرایہ میں بطرز مجاز و استعارہ کے ادا کر سکتے ہوں۔ ورنہ وہ قدما کے ہی مقلد سمجھے جائیں گے ...... واعظ و زاہد وغیرہ کو ننانا اور ان پر نکتہ چینی کرنی انھیں لوگوں کو زیبا ہے جن کو فی الواقع ان کے ساتھ کوئی وجہ مخالفت ہو"

اور پھر ایک دوسری جگہ، وہ لکھتے ہیں :-

"جس طرح عشقیہ مضامین غزل کے خمیر میں داخل ہیں۔ اسی طرح خمریات یعنی شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر نیز فقہا و زہاد اور تمام اہل ظاہر پر طعن و تعریض کرنی۔ اپنی مے خواری و تر دامنی پر فخر کرنا اور اہل شرع اور اہل تقویٰ کے اعمال و اقوال میں عیب نکالنے اور اسی قسم کی باتیں جو عقل و شرع کے خلاف ہوں یہ مضامین بھی غزل کے اجزائے غیر منفک قرار پا سکتے ہیں"۔

حالیؔ کے ان خیالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا زیادہ دشوار نہیں کہ تصوف اردو شاعری کا ماضی میں ایک خاص جزو تھا اور صوفیہ کرام کے علاوہ بھی لوگوں نے فلسفہ تصوف میں دلچسپی لی۔ چونکہ زمانہ کا مزاج اس کے موافق تھا۔ لہذا بہت سے شعراء نے بطور فیشن کے اس روایت کو اپنایا۔ جس نے تجربہ کی وادی سے گذر کر اپنی علامتوں کو ایک خاص معنی اور مفہوم دینے میں کامیابی حاصل کی اور اب بھی اس روایت کو زندہ رکھنے کی کوشش جاری ہے۔ اس روایت سے اردو شاعری کو فائدہ پہنچا یا نقصان اس بحث سے قطع نظر یہ بات صداقت پر مبنی ہے جس کی طرف شاداںؔ نے اشارہ کیا ہے "ہمارے شاعروں نے رندی کا سوانگ بھر کر اپنے اشعار میں زاہد و واعظ اور شیخ و محتسب پر جو لے دے کی ہے وہ محض ایک رسم ہے۔ اور ہمارے لئے کسی متروک اور فرسودہ روایت سے زیادہ اہمیت کی حامل نہیں۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۱ سے آگے) مقدس کتاب کا ترجمہ کیا یہ ان کا ایک بڑا علمی کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک قائم رہیگا اور ان کا یہ مقدس اور نیک عمل حق تعالیٰ کے دربار میں ان کی نجات کا وسیلہ بن جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتقال ۷ ار رمضان ۱۳۹۱ھ مطابق ۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو ساڑھے پانچ بجے صبح ہوا۔ مرنے سے قبل وہ معروف حمد الٰہی رہے۔ بالآخر سرزمین دکن کا یہ درخشاں ستارہ ہمیشہ کے لئے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی و سیاسی کارناموں اور ہمہ گیر صلاحیتوں کا تذکرہ اس مختصر سے مضمون میں مشکل ہے۔

افتخار احمد فخر

خصوصیاتِ کلامِ غالب

غزل کے لفظی معنی عورتوں سے گفتگو کرنے کے ہیں یعنی غزل بنیادی طور پر "بازی کردن از جوانی وحدیث محبت اور عشق زنان ہے" اس میں شدتِ جذبات لازمی عنصر ہے جوانی کی دیوانگی میں پاسبانِ عقل بھی کبھی کبھی دل کو تنہا چھوڑ دیتا ہے، یہی کیفیت جب شاعری کا جامہ زیب تن کر لیتی ہے تو غزل بن جاتی ہے غنائیت، شدتِ جذبات، نزاکتِ ادا اور سوز و گداز غزل کے چار عناصر ہیں اور انہی سے اس پیکر میں شعر و نغمہ کی روح بیدار ہوتی ہے"۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے غزل جو "گفتگو کردن بہ زنان" کا بنیادی درجہ رکھتی ہے اور اسی محور کے گرد گھومتی رہی ہے اسکے جو مندرجہ بالا چار عناصر گنائے ہیں وہ غزل کیلئے اس میں شک نہیں کہ لازمی تصور کئے جاتے رہے ہیں۔ غزل چونکہ فارسی سے اردو میں آئی لہذا وہی تعریف غزل کی اردو میں آئی جبکہ فارسی میں تھی ہندی رجحان سے اردو غزل میں بے ثباتی کا تصور اور سیاسی و اقتصادی حالات بھی اثر انداز ہوئے ہیں اگر ہم ایک نظر جائزہ لیں تو میر و سودا تک یہی انداز جلوہ فرما نظر آتا ہے۔ میر نے جگ بیتی میں آپ بیتی بیان کی ہے اس میں شک نہیں کہ وہ یاسیت کے امام ہیں اور انہیں غم سے محبت ہے۔ سودا کے ہاں جو جوش ہے۔ آہنگ ہے وہ میر کے ہاں نہیں ہے۔ غم غلط کرنے کا انداز بھی ہے مصحفی اپنا کوئی رنگ نہیں رکھتے تاہم زندگی کی پوری عکاسی ان کے ہاں ملتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مصحفی میر بھی ہیں انشا بھی ناسخ بھی اور درد بھی۔ انشا نے اگرچہ نام ضرور پیدا کیا مگر ان کے ہاں جاذبیت مفقود ہے، ناسخ سچ مچ ناسخ متروکات تھے مگر ان کے ہاں بھی متروکات کبھی کبھی ملتے ہیں تو یہ اور بات ہے۔ نازک خیالی ان کے ہاں عرفِ عام میں ملتی ہے جسمانی اعتبار سے وہ پہلوان تھے ہی اپنی اس جرات رندانہ پر شاعرانہ زبان میں وہ "پہلوانِ سخن" کے نام سے بھی یاد کئے جاتے ہیں۔ ان ہی کے ہمعصر آتش ہیں مگر وہ خوددار بھی رہے اور انھوں نے زندگی کو سمجھا بھی ہے۔ کھری کھری باتیں کہی ہیں بقول شیفتہ "اگر آتش لکھنو کی بجائے دہلی میں پیدا ہوتے تو غالباً غالب سے بھی آگے نکل جاتے ـــ ان کے بعد تخریبی اور تعمیری پہلو غزل میں راہ پاتے نظر آتے ہیں۔ داغ اور اودھ کی رنگ رلیاں انکے محلوں سے چھن کر گلی کوچوں میں پھیل جاتی ہیں یہ بذاتہ بُری بات نہیں ہے

مگر کثرت نے قیمت کردی۔ کنگھی چوٹی اور چوما چاٹی کی شاعری سے تخریبی پہلو نمایاں ہے، رندؔ وزیرؔ صبا وغیرہ نے عورت کے پندار کو پندار نہ سمجھا کہ مرد کی طرح عورت میں بھی پندار ہے انداز تخاطب عورت کے لئے پرانی غزل میں مردانہ ہی رہتا ہے۔

ایک مدت کے بعد (دور متاخرین کے بعد) ہمیں اخترؔ شیرانی کے ہاں یہ بیان کھل کر ملتا ہے کہ شاعر کا معشوق مرد نہیں عورت ہے الغرض دور متقدمین، متوسطین اور متاخرین تک ہمیں غزل کی رنگا رنگی وسعت و ہمہ گیری کے احساس ساتھ ساتھ غزل کی تدریجی ترقی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

غالبؔ کے ہاں غزل کا انداز بدل جاتا ہے اور غزل کی جامعیت و انفرادیت کھل کر سامنے آجاتی ہے اگر غالبؔ نہ ہوتے تو اقبالؔ پیدا نہ ہوئے ہوتے اور اقبالؔ نے جنم نہ لیا ہوتا تو ہمارا یہ موجودہ ادب اور شاعری نہ ہوتی۔ موجودہ دور کی جدید غزل تک حالات کے تقاضوں اور وقت کے مطالبات کا ساتھ غزل نے ہر دور میں دیا ہے۔ غزل پر تنگ دامانی کا الزام غلط ہے اس سے قطع نظر کہ غالبؔ نے "تنگنائے غزل" کی بات کس موقعہ پر کہی تھی اور اس کا مقصود کیا تھا آیئے ہم غالبؔ کی خصوصیات کا سرسری جائزہ لیں۔

چونکہ غالبؔ بنیادی طور پر فارسی زبان کے شاعر تھے وقت کے تقاضے سے مجبوراً ریختہ کی طرف مائل ہوئے تھے کلام میں فارسیت کا اثر لازمی شئے ہے مگر رفتہ رفتہ جب ان کی زبان میں صفائی پیدا ہوئی تو ان کی اردو غزل میں سوز و گداز، خستگی، دلگرفتگی سے نرالی شان ندرت بیان سے آئی اور شیفتگی، ربودگی، سپردگی و فتادگی، بھی جو غزل کی جان ہیں زبان و بیان کے لحاظ سے تغزل کی جتنی بھی صورتیں پائی جاتی ہیں وہ سب ان کے ہاں موجود ہیں۔ غالب کی غزلوں میں کوئی تخیل ایسا نہ ملیگا جس کا پس منظر حسن و عشق نہ ہو مگر ان کی نکتہ آفرینیاں زیادہ تر جدت ادا جوش و سرمستی، حسن تعبیر اور ندرت بیان کے رنگ میں سامنے آتی ہیں تو وجدان حظ اٹھاتا ہے۔ مرزاؔ نے فارسی کے متاخرین شعراء سے زیادہ اثر لیا ہے مثلاً بیدلؔ کے بعد عرفیؔ، نظیریؔ، حزیںؔ، ظہوریؔ وغیرہ اردو میں وہ ناسخؔ کے بعد میرؔ کے رنگ سخن سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیدلؔ کی دقت پسندی اور تخیل پر وہ اول اول ریجھے رہے اور اسے اپنے لئے طرۂ امتیاز جانا چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اسدؔ ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے	مجھے رنگ بہار ایجادیٔ بیدلؔ پسند آیا
مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالبؔ	عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامہ بیدلؔ کا

غالبؔ کے یہ اشعار رنگ بیدلؔ کے غماز ہیں ؎

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا	تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

حریف مطلب مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش — خیالِ شوخیٔ خوباں کو راحت آفریں پایا

حسنِ تعبیر کا تعلق زیادہ تر تخیل سے ہے۔ مرزا غالب نے تخیل میں بھی بیدل سے استفادہ کیا ہے ۔

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

میں نے کہا کہ "بزم ناز چاہیے غیر سے تہی" — سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

انھوں نے ظہوری، عرفی، حزیں وغیرہ کے اتباع کا اعتراف بھی کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

ما را مدد ز فیضِ ظہوری است در سخن — رو شیوۂ نظیری و طرزِ حزیں شناس

یا

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب — جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

اور در اصل عرفی اور نظیری کی تقلید ہی نے مرزا کو بیدل کے اتباع سے نکالا۔ معاملہ بندی عرفی و نظیری کی مقبول ترین صفت ہے

حافظ کے رنگ میں ان کی "جام شراب" والی غزل کے علاوہ "تماشا رہے آگے" اور "نالہ و نوش" کی غزلیں عمدہ مثالیں ہیں۔

ناسخ نے زبان کی تہذیب اور صفائی کی طرف دھیان دیا اور اسے دلکش تراش خراش سے جو پاکیزگی عطا کی جا بجا غالب کے ہاں اس کے اثرات ملتے ہیں۔ بلکہ غالب نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ محبت کے جذبات کا سادہ اظہار غزل کی بہترین اور دلپذیر خوبی ہے اور اگر اندازِ بیان میں ہلکی سی ندرت ہو تو دلکشی و رعنائی دو چند ہو جاتی ہے میر کے درد بھرے اشعار کا عکس غالب کے بیشتر اشعار میں نمایاں ہے۔

غالب کے ہاں بقول مولانا عبدالسلام ندوی" ناسخ کے کئی دور ملتے ہیں اس کے بعد غالب کی انفرادیت انہیں اپنے ہمعصروں سے متمائز کرتی ہے۔ جدت طرازی، معنی آفرینی، رندی و مستی، معشوق کی طرفداری حسن و عشق کی چاشنی اور واردات قلبی کے ساتھ ساتھ تفنن طبع و شوخی، ظرافت کی پاکیزگی، ژرف نگاہی، مذہبی آزاد خیالی کو وہ اپنی چابکدستی سے ایک جہان معنی اور طلسم رنگ و بو کی دنیا عطا کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر قسم کے خیالات ہمیں ملتے ہیں اعلیٰ اور فلسفیانہ بھی رکیک و متبذل بھی ـــــ عیاشی کا میلان پستی کی طرف ہوتا ہے۔ غالب کا عہد بھی عیاشانہ اور پست تھا سلطنت زوال پذیر تھی عوام میں اخلاقی گراوٹ آگئی تھی۔ شاعر اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ چنانچہ باوجود شاعرانہ نفاست اور علوئے تخیل کے ان کے ہاں بھی متبذل اشعار کا پایا جانا بدیہی اور لازمی شے ہے۔ غالب قافیہ پیمائی پر تخیل کو فوقیت دیتے تھے اور اسلوب بیان کی

جدت پر زیادہ تر ان کی نگاہیں مرکوز رہتیں۔ طرز ادا کا انہیں بہت خیال رہتا۔ ساتھ ہی بلند خیالی کا بھی۔

طرز ادا:۔ قلب انسان کی فطری غمگینی اور انسان کی بے بسی کے سفا میں بیان کرتے وقت طرز ادا کا خاص طور پر انہیں لحاظ رہتا تھا۔

ترتیب الفاظ اور انتخاب الفاظ میں وہ ان کی ہم آہنگی اور ترنم کا پاس رکھتے تھے ان کے ہاں الفاظ نگ ہیں انگارے ہیں ان کی نشست حسین و دلکش اور بندش چست ہوتی ہے۔

جہانِ معنی:۔ وسیع خیال کو جو متعدد شعروں میں ادا ہو سکتا تھا مرزا نے ایک شعر میں ادا کیا ہے۔ اس ایجاز و اختصار کی مثالیں دوسروں کے پاس شاذ ہی ہیں۔ بعض جگہ ان کے اشعار کی بنیاد محض "رعایت لفظی" پر ہوتی ہے۔ مرزا کی اور ایک خصوصیت ذو معنین ہے۔

مرزا غالب کے ہاں سادہ استعارات و تشبیہات بہت کم ہیں تاہم تمثیلی رنگ بہت لطیف و دلکش ہے اشعار کی جدت تشبیہات کی ندرت میں کوئی ان کا حریف شکل ہی سے ملے گا۔ ہجر، وصال، نا امیدی، تصور، غم، رندی و مستی، عشق و حسن کی چاشنی، رشک و حسد، تعلّی و انانیت، شوخی و ظرافت، مذہبی آزاد خیالی اور فلسفیانہ و متصوفانہ خیالات کے علاوہ تفنن طبع سے بھی کام لیا ہے۔ واردات قلبی کے اظہار میں مرزا کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ متصوفانہ خیالات ان کے ہاں بہ افراط ہیں بقول حالیؔ[1] "متصوفانہ خیالات نے مرزا کو نہ صرف اپنے ہمعصروں میں بلکہ بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام شعرا میں ممتاز بنا دیا ہے"۔

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　　ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حسد اور رشک کا عنصر کلام غالب کی اہم ترین خصوصیات میں سے ہے۔

ڈاکٹر بجنوری نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ:۔

" مرزا کی شاعری میں زیادہ تر عشق و محبت کا بیان ہے مقبولیت کی وجہ حیرت انگیز تنوع ہے۔ پیچیدہ خیالات کے طالب، مرزا کے ہاں معنی آفرینی اور نازک خیالی کے نمونے، شگفتہ طبع لوگ ترقی و ظرافت اور انسانی فطرت کی داستان الغرض دیوان غالب میں ہر شخص اپنی تصویر دیکھتا ہے اور لطف اٹھاتا ہے وجہ مرزا تمام زمانے کی خاک چھان چکے تھے۔

شرع و تصوف کی منزلوں سے بھی ناواقف نہ تھے وہ اپنے دل کے مشاہدات بیان کرتے ہیں۔ اسلئے

---

[1] "یادگار غالب" از حالیؔ ص ۵۶

فرزدہ فلسفی میخواد اور عاشق مزاج سب ہی محظوظ ہوتے ہیں۔
مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں مرزا غالب کے کلام کی درج ذیل جو چھے[7] خوبیاں گنائی ہیں۔
اسے بھی ملاحظہ فرمالیں۔

(۱) جدت مضامین و طرفگی خیالات۔
(۲) نادر تشبیہات، عام اور مبتذل تشبیہوں سے گریز۔
(۳) استعارات، کنائے اور تمثیل کا خوبصورت استعمال۔
(۴) شوخی و ظرافت
(۵) پہلو دار اشعار۔
(۶) سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسالیب میں لفظی و معنوی تصرفات کرکے ان میں ندرت اور طرفگی پیدا کرنا۔

تصحیح

اپریل کے شمارہ میں سید اعظم الحسینی صاحب کا مضمون، علامہ سید محمد موسوی شائع ہوا ہے۔ اس میں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں براہ کرم صحت فرمالیں۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱۶	مجور	مجدد
۲۴	۵	۱۹۱۹ء	۱۹۹۱ھ
۲۵	۱	یکسا بنبت	یکسا عیبت
"	۲۳	محبت	محب
۲۶	۲	دستہ لبتہ	دست لبتہ
"	۴	بتواضع	متواضع
۲۸	۲	شجرہ اعظم	شجرا عظم
"	۳	تاریخ ابن خلکان	ماخذ مضمون تاریخ ابن خلکان
"	۲۳	انگریزی الفاظ کے بعد "اور اسناد محفوظ ہیں۔	

عزیز احمد جلیلی عزیزؔ

کس قدر میں ہوں بے آرام تمہیں کیا معلوم
کیسے کٹتی ہے مری شام تمہیں کیا معلوم

تم نہیں ہو تو نہیں کوئی مزہ جینے کا
لب تک آتے نہیں اب جام تمہیں کیا معلوم

جب پکارا میں تمہیں دل سے جواب آیا ہے
کام آیا دل ناکام تمہیں کیا معلوم

زخم ہی زخم نظر آتے ہیں اب تو دل میں
یہ وفاؤں کا ہے انعام تمہیں کیا معلوم

بال الجھے ہوئے ویران نظر حال تباہ
لوگ دینے لگے الزام تمہیں کیا معلوم

آنکھیں بھر آتی ہیں جب ذکر تمہارا آیا
میری الفت کا یہ انجام تمہیں کیا معلوم

سکرایا جو میں فریاد زباں سے نکلی
کس پہ آتا ہے یہ الزام تمہیں کیا معلوم

دیکھو بھولے سے بھی لینا نہ کہیں نام عزیزؔ
وہ ہے اک شاعر بدنام تمہیں کیا معلوم

صاحب حیدرآبادی

(۱)

آدمی کی ہے زندگی کتنی
دوستی کتنی دشمنی کتنی

دلِ ناداں نہ کر ملال اتنا
زندگی اور رہ گئی کتنی

جگمگا دے گا کیا زمانے کو
ایک جگنو کی روشنی کتنی

لوگ اس میں بھی بخل کرتے ہیں
اک تبسم کی بات ہی کتنی

شمع نے بخش دی بقا صاحبؔ
تھی پتنگے کی زندگی کتنی

(۲)

کرکے بیداد جفا بھول گئے
یعنی احسان کیا بھول گئے

یاد بس اتنا رہا بھول گئے
ہائے کیا یاد تھا کیا بھول گئے

ہر جفا اہلِ وفا بھول گئے
جو بھی ہونا تھا ہوا بھول گئے

رنج جتنے شب فرقت نے دیئے
آپ نے یاد کیا بھول گئے

ہم وہ درویش صفت ہیں [illegible]
جو [illegible] بھول گئے

محمد شمس الدین تاباںؔ

تمہارے حسن کے افسانہ خواں ہیں کتنے لوگ
زہے نصیب! مرے مہرباں ہیں کتنے لوگ

حجاب ترب ادائے وفا وطیرۂ شب
ابھی تمہارے مرے درمیاں ہیں کتنے لوگ

وصال و ہجر تو دو رخ ہیں عشق کے لیکن
فریب خوردۂ سود و زیاں ہیں کتنے لوگ

کوئی گواہ محبت نہ پاسدارِ وفا
مزاج حسن ترے ترجماں ہیں کتنے لوگ

زوال حسن کے دو چار نوحہ گر بھی نہیں
شباب یار ترے مدح خواں ہیں کتنے لوگ

کوئی خبر بھی ہے اے حسنِ بے پناہ تجھے
ملول کتنے ہیں دل شادماں ہیں کتنے لوگ

شمیم خندۂ پیہم ذرا خیال تو کر
مجسم آہ، سراپا فغاں ہیں کتنے لوگ

لغزش ملے نہ ملے گفتگو بھی ہو کہ نہ ہو
اس انجمن میں یہیں بدگماں ہیں کتنے لوگ

جراحتِ دل تاباںؔ تو ایک محرم ہے
نگاہِ ناز ترے رازداں ہیں کتنے لوگ

ہنین ریحانیؔ

شہید ہوتے ہیں راہِ وفا میں دیوانے
ثواب جن کو پہنچتا ہے وہ ہیں فرزانے

اگر نہیں ہے تصور لقائے باہم کا
بسائے جا نہ سکیں گے دلوں کے ویرانے

ہم اپنی آگ میں جل کر بنے منارۂ زیست
پرائی آگ میں کیوں جل رہے ہیں پروانے

سوادِ فرش سے پہنچے فرازِ عرش میں ہم
اب اور آگے کہاں جائیں گے خدا جانے

یگانگت کی ترازو ہمارے ہاتھ میں ہے
زمیں سمجھ کے اِدھر کا ارادہ بیگانے

گناہگار ہوں لایا گیا ہوں مقتل میں
جو بے گناہ ہے وہ آئے سنگ برسانے

کبھی جراحتِ جسم اور کبھی جراحتِ روح
علاوہ اِس کے ہمیں کیا دیا ہے دنیا نے

سرشکِ صبح بنا میکدے کا ہنگامہ
چراغ کشتہ ہیں زخمی پڑے ہیں پیمانے

وہ کاوش کرتے زمیں پر دوں کو بھی تسخیر
گئے ہیں چاند پہ جو پرچم اپنا لہرانے

ہے آزمائشِ جرأت کا وقت ریحانیؔ
بہار آئی ہے اور لٹ رہے ہیں میخانے

نصیر پرواز

اک خواب ایک روحِ تمنا کو چھوڑ کر
آیا ہوں تیرے شہر میں دنیا کو چھوڑ کر

ایمان کی بات یہ ہے کہ کوئی نہیں عزیز
اس تیرگی میں اُس رُخِ زیبا کو چھوڑ کر

جی چاہتا ہے اپنی زباں میں غزل کہیں
احساسِ میر، جذبۂ مرزا کو چھوڑ کر

منزل قریب تر ہے قدم فکرمند ہیں
کیسے بڑھیں گے نقشِ کفِ پا کو چھوڑ کر

اب کون میرے ساتھ چلے گا فلک کی سمت
تنہا جمالِ وادیٔ صحرا کو چھوڑ کر

عریاں قدم قدم پہ ہمیں تشنگی ملی
آئے ہیں جب بھی ہم کسی دریا کو چھوڑ کر

جینے کی آرزو تو ہمارے بھی دل میں ہے
کیسے جئیں گے پر غمِ فردا کو چھوڑ کر

منزل نہ ہمسفر نہ کوئی گھر نہ رہگذر
سب بچھڑ گئے دلِ تنہا کو چھوڑ کر

کیا حادثہ ہوا تھا کہ بھیگی نہ آنکھ بھی
آیا ہوں جب خلوصِ سراپا کو چھوڑ کر

آنکھیں ترس گئیں حسیں خوابوں کی چاہ میں
آخر ملا ہی کیا شبِ یلدا کو چھوڑ کر

پرواز اب کسی پہ یقیں بھی نہیں ہوا
لیکن سفیرِ عرشِ معلّی کو چھوڑ کر

تابش صدیقی پرتاب گڈھی

ہم نے یہ بھی دیکھ لیا اس دنیا کے انسانوں میں
اب کوئی بھی فرق نہیں ہے اپنے اور بیگانوں میں

مجھکو پڑھو لیا میری تحریریں دونوں میں ایک ہی بات
مجھ پہ جو کچھ گذری وہ روداد ہے ان افسانوں میں

کون اٹھا ہے کس کا ماتم کرتے ہیں رندانِ جہاں
کیوں پگھلی چیخیں ڈھلتی ہیں آج سبھی پیمانوں میں

بامِ ترقی پہ کہلایا انسانوں کا ہر احساس
اب بھی لیکن پیار کی خو بو ملتی ہے حیوانوں میں

ساقی میرے ہی ساغر سے ہوتا ہے خورشید طلوع
میرے بعد اندھیرے لہرائیں گے ان میخانوں میں

ذوقِ جنوں کی خیر نہیں ہے کارِ سیاست کیا کہیے
آج تو اہلِ ہوش بھی پائے جاتے ہیں دیوانوں میں

دورِ جدید کا عاقل انساں تابش اس کو کیا جانے
رسمِ محبت ڈھونڈھو دیوانوں میں یا میخانوں میں

حباب ہاشمی

دل میں ہے ولولۂ شوق ہر اک گام کے ساتھ
ہم بھی کچھ دور چلیں گردشِ ایام کے ساتھ

پیش آتے تھے جو کل عزت و اکرام کے ساتھ
نام لیتے ہیں مرا آج وہ دشنام کے ساتھ

کیا کہیں تیری طرف کون سی شے کھینچے ہے؟
جب بھی ملتے ہیں تو اک جذبۂ بے نام کے ساتھ

مرتے دم لب پہ ترا نام جو آ جائے گا
جاں نکل جائے گی تن سے بہت آرام کے ساتھ

عزم بالجزم ضروری ہے مسافر کے لئے
کون پہنچا سرِ منزل ہوسِ خام کے ساتھ

مدتیں گذریں تجھے بھول چکا ہوں لیکن
آج بھی دل دھڑک اٹھتا ہے ترے نام کے ساتھ

جن کو پینے کا سلیقہ ہے نہ چھلکانے کا
بزمِ رنداں سے نکل جائیں اس الزام کے ساتھ

غلام مرتضیٰ راہی

بس ایک دھند سی چاروں طرف نظر میں ہے
سفر کا سودا ابھی تک ہمارے سر میں ہے

اب اپنی نیند کا بھی اعتبار ختم ہوا
جو میں نے خواب میں دیکھا وہی خبر میں ہے

اڑا رہی ہے ہوا جانے کس کی خاکِ طلب
نشان میرے قدم کا بھی رہگذر میں ہے

قدم بڑھائے چلے جا رہے ہیں سب کے سب
غبار سلسلہ در سلسلہ نظر میں ہے

نظر اٹھائے تو کس کی طرف اٹھائے کوئی
ہوا کا چہرہ ابھی خاک کے اثر میں ہے

دیوان حسینی

مثنوی

گنجینۃ الاسرار

گنجینۃ الاسرار

اے صبا یار کن لجا پیغام
با ادب ہو کے) کہہ دعا و سلام

تجہ صبا کردگار کی سوگند
صاحب ذوالفقار کی سوگند

میرے احوال یار سوں جا بول
راز مخفی تمام اوس کن کھول

جب سوں دیکھا ہوں سرو قد تیرا
تب ستی مبتلا (رہے) دل میرا

زلف نے دل کوں پیچ و تاب دیا
رُخ نے یک پل میں فتحیاب کیا

حسن کے بحر کوں نہایت نہیں
ذو رقِ فہم کوں ہدایت نہیں

جب سوں تجہ لب ستی پیا ہوں شراب
مست ہوں عقل کا اٹھا کے نقاب

تیری تصویر مجہ نین کے حضور
یاد تیرا (رہے) دل میں مجہ معمور

ہے تصور ترا مثال انجن
مجہ نین میں کیا ہے نت مسکن

دمبدم ہے زباں پو تیرا نام
تجہ تصور بغیر نیند حرام

صورتِ یار سوں مجھے ہے کام
صورتِ یار دل کوں کیتا دام

عشق کے درس کا ہو کر استاد
طرح نو دلربا کیا ایجاد

مئے محبت پلا کو رام کیا
دلربائی سوں لا کلام کیا

نشۂ مئے نے جب سے کیتا جوش
تب ستی مجہ میں کچھ رہا نیں ہوش

کام دلبر کا دلربائی ہے
عشق بازوں کی خیر خواہی ہے

جب سوں بھڑکا ہوں عشق کا افسوں
دل مرا تب ستی ہوا مجنوں

تجہ تغافل سوں دل بت بیکل
نیں سمجھتا ہوں کب پڑے گی کلی

جل کو دل عشق سوں ہوا ہے کباب
اے صنم لے خبر شتاب شتاب

تیرے دیدار کا مجھے ہے شوق
نظر التفات کا ہے ذوق

آتش شوق دل میں جلتا ہے
خار غم نے جگر میں سلتا ہے

نیں ہے بازی تو عشق بازی ہے
عشق بازی میں سرفرازی ہے

عشق بازی میں عشق سوں آیا
عشق کا بھید عشق سوں پایا

عشق کے دام میں جو آیا ہے
عشق کا راز وجہ پایا ہے

عشق کے تاب ہو دلِ بیتاب
تاب نالیا ہوا ہے مثلِ کباب

خبر دل سوں بے خبر مت ہو حال عاشق سوں بے خبر مت ہو

عشق بازی میں بے قراری ہے روز و شب غم سوں عشق جاری ہے

عشق کا جس کے دل میں لاگا خار اوس کوں دائم ہے لذت دیدار

یار جانی سوں یار جاں ہو کر حال دل پوچھ مہرباں ہو کر

مت صنم کر تو مجھ پو جور و ستم میں ہوں عاشق ترا خدا کی قسم

اے دل آرام دل کوں دے آرام جب تلک ہے زباں پو تیرا نام

وصل کا شوق دل میں رکھتا ہوں تجھ کوں یک پل نہیں بسرتا ہوں

کب تلک اس وضع رہوں بے حال اے سجن مہرباں ہو مجھ کوں سنبھال

کب مرے بر میں آویگا وہ یار ناکروں میں ایس کوں اس پو نثار

ورطۂ عشق میں پڑا ہے من یا الہی وو کب ملے گا سجن

وصل کے شوق سوں ہے دل بیتاب یا الہی ملا سجن کو شتاب

یا الہی مجھے سجن سوں ملا لب سنی یار کے شراب پلا

وصل بن مجکوں بے قراری ہے نشتر دل پو آہ کاری ہے

وصل تیرا برا ہے مج پو فرض اپنے احوال کا کیا ہوں عرض

نیں ہے یک پل جدا مرے سوں موہن چشم میں ہے سجن نظر کے تمن

زلف تیری کا گل میں سٹ زنار تجھ پو قرباں ہوں دمبدم صد بار

عشق کا گھاٹ ہے کٹھل سے کٹھل ہوش میرے کے پگ گئے ہیں پھسل

چین مجھ دل کے تئیں نہیں یک پل گر گھٹا آہ کی اٹھے بادل

دن گذرتا ہے بے قراری سوں دین کٹتا ہے دل فگاری سوں

دلربا آئے کر ہو کیتا گھات گھات کی بات کھول کہوں کس سات

جیو بیکل ہے یار جانی بن جوں تڑپتی ہے مینا پانی بن

راحت مین نت ہے پانی سوں مجکوں آرام یار جانی سوں

کس کنے جا کروں تری فریاد اے صنم داد کر ہو دیجو داد

اب تغافل کوں راہ مت دیجو رحم کیجو عذاب مت

مہربانی سوں دلبر جانی نظر فضل کا پلا پانی

چھوڑ صورت نظر کوں پکڑا ہوں — دیکھ میں دیکھ اپس کوں بسرا ہوں
دیکھنے دیکھنے ہوا ہوں دیکھ — دیکھ میں دیکھتا ہوں مطلق دیکھ
دیکھ مطلق کی مے کرے جب نوش — ہستی دیکھ کا اوسے ہوئے ہوش
ہستی دیکھ دیکھ میں پاتی — مئے وحدت کا اوچہ ہے ساقی
ہستی دیکھ پر تھے شاہد ہے — اوچہ شاہد ہے جو کہ واحد ہے
مطلقیت ستی جو مطلق ہے — احدیت موج التحق ہے
بحر بینش کا جب سوں ہوں غواص — تب سوں پایا ہوں در مطلق خاص
چھوڑ صورت نظر کوں وہ پکڑے — دیکھ میں دیکھ اپس کوں جو لرے
دیکھ مطلق کا عشق دھرتا ہوں — اوس کوں دایم نظر میں رکھتا ہوں
خوب شاہد نظر ہو بولیا ہوں — دیکھ میں دیکھ اپس کوں بولیا ہوں
بس اشارات کوں عیاں مت کر — اس سے زاید اتا بیاں مت کر
علم نقطہ کہے کے اہل کمال — ٹک نقطہ سوں سہ نقطہ کوں نکال
سہ نقطہ کوں الف کو کر کے عیاں — ہیبت و ہشت کا کیے ہیں بیاں
دیکھ نقطہ میں کیوں الف ہے نہاں — وونچہ نقطہ الف میں تھیں نہاں
ہیبت و ہشت یک سوں یک ظاہر — وونچہ اپس میں آپ ہیں ظاہر

بینش حرزاں کیے ہیں یونچہ نہاں
ہیبت و ہشت حرف کیے ہیں عیاں

رسالہ گنجینۃ الاسرار ارشادات وارث شاہ و گدا حضرت خواجہ حسینی بادشاہ قدس اللہ اسرارہم و علی ابرائیم۔

تمام شد

یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۶ شمارہ (۶)

جون ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ

غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

منتظم

اقبال الدین، وقار خلیل

سالانہ آٹھ روپے، غیر ممالک سے پندرہ روپے

ششماہی چار روپے، فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونہ پرچہ کیلئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر ... اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ... دفتر ... ادارہ ادبیات اردو ... سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اردو کے تحفظ و بقا کیلئے "ترقی اردو بورڈ" کے نام سے ایک بورڈ قائم کیا ہے جو آئی کے گجرال وزیر حکومت ہند کے زیر نگرانی کام کر رہا ہے۔ بورڈ نے سارے ملک کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ مرتب کرلی ہے اور جلد ہی حکومت کے آگے پیش کر دی جائے گی۔ بورڈ نے لغات کی ترتیب کا کام "انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ" کو سونپا ہے اور اردو انسائیکلو پیڈیا کا ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد کو۔ بورڈ کے تجویز ہے کہ دو ریسرچ سنٹر قائم کئے جائیں جس میں ایک شمال میں ہو اور ایک جنوب میں۔ اس سلسلے میں بورڈ کی سب کمیٹی نے حیدرآباد کا دورہ کیا اور یہاں تمام کتب خانوں یعنی آصفیہ، سالار جنگ، سعیدیہ، جامعہ اور ادارہ کا معائنہ کیا اور ادارہ کے کتب خانہ اور عمارت کی سہولتوں کا لحاظ کرتے اس کو ریسرچ سنٹر بنانے کی رائے ظاہر کی۔

بورڈ نے کاتبوں کی فراہمی کے سلسلے میں بھی ایک اقدام کیا ہے اور شمال اور جنوب میں خوشنویسی کھانے کے دو مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ایک مرکز شمال میں لکھنؤ میں قائم کیا جاچکا ہے۔ دوسرا مرکز حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات اردو میں قائم کرنے کی تجویز ہے۔ اگر یہ تجویز منظور ہوجائے تو اس کو فروغ دینے کی ادارہ ممکنہ کوشش کرے گا اس لئے کہ ادارہ کے اغراض و مقاصد میں خوشنویسی کے فن کو فروغ دینے کا پروگرام نہ صرف شامل رہا ہے۔ بلکہ ادارہ اپنے دوسرے امتحانات کے ساتھ سنہ [illegible]ء تک خوشنویسی کے امتحانات بھی لیتا رہا ہے اور آٹھ سال (سنہ [illegible] تا سنہ [illegible]) میں بہترین خوشنویسوں کو اسناد عطا کی ہیں

یہ تجاویز اگر عملی جامہ پہن لیں تو ادارہ کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوجائے گا اور ادارہ کے خدمت گذاروں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا۔

ادارہ کے امتحانات اردو دانی، زبان دانی، عالم اور فاضل ہر سال جون میں مراکز بلدہ، سنٹرل جیل، آرمور، اورنگ آباد، بنگلور، بودھن، بھینسہ، شمس آباد، عادل آباد، کریم نگر، محبوب نگر، مغل گدہ، میدچل اور ناگر کرنول پر منعقد ہوئے۔ ان سب امتحانوں میں تقریباً پانسو امیدوار شریک ہیں۔

زیر نظر شمارے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری اور سید محمد اعظم مرحوم پر دو مضامین شریک ہیں ایک ادیب تھے اور دوسرے ماہر تعلیم جنہوں نے ریاست حیدرآباد میں مدارس کا ایک جال بچھا دیا تھا۔ امید کہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے

محمد اکبرالدین صدیقی

محمد حبیب الحق

زندگی کے ہوتے ہوتے ......

علمی نظریات پر مبنی ایک امکانی مقالہ

یوں تو اسحاق نیوٹن مستقل غیر تبدیل شدہ جسیمات کے وجود کا قائل تھا جیسا کہ وہ اپنی کتاب "نور" میں لکھتا ہے :—

"ان ساری چیزوں پر غور کرنے کے بعد مجھے یہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے شروع میں مادہ کو ٹھوس، وزنی، سخت، غیر قابل الخرق، قابل حرکت جسیمات کو ایسے قد اور تشکلات اور دیگر ایسے خواص کے ساتھ اور مکان کے ایسے تناسب میں بنایا کہ جو اس مقصد کے لیئے کہ جس کے لیئے اُس نے ان کو پیدا کیا مناسب ترین تھے اور یہ کہ یہ قدیم (یا ابتدائی) جسیمات ٹھوس ہونے کی وجہ سے کسی بھی ایسے اجسام کے مقابلے میں جو اُن کے ترکیب دے کر بنائے گئے ہوں، بے انتہا زیادہ سخت ہوں گے، اتنے سخت کہ کبھی بھی ضائع یا ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو سکتے ہوں۔ اس لئے کوئی عمومی قوت اس کو توڑنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ جس کو خدا نے خود اپنی ذات سے اولین تخلیق میں بنایا ہو۔ جب تک جسیمات سالم و ثابت باقی رہتے ہیں تو وہ ہر زمانے میں اسی ایک فطرت اور ساخت کے اجسام ترکیب دے سکتے ہیں لیکن اگر وہ زمانے کے ساتھ بدل جائیں یا ٹوٹ جائیں تو اُن اشیاء کی فطرتیں بھی کہ جو اُن پر منحصر ہیں بدل جا سکتی ہیں۔ چنانچہ اگر آخر الذکر صحیح ہو تو پانی اور زمین پرانے گھسے ہوئے جسیمات اور جسیمات کے ٹکڑوں سے ترکیب پا کر اب اس فطرت اور ساخت کے نہ ہو سکتے۔ مقابلۃً اس پانی اور زمین کے کہ جو سالم جسیمات سے شروع میں ترکیب پائے ہوں اور اس لئے کہ فطرت قائم رہ سکے جسمانی چیزوں کے تغیرات فقط مختلف بدائیگیوں اور نئے ملاپ اور ان مستقل جسیمات کی حرکات میں رکھے گئے ہیں"۔

لیکن ساتھ ہی نیوٹن اپنی کتاب "فطری فلسفہ کے ریاضیاتی اصول" جلد (۲) کتاب (۳) کے دوسری طباعت کے خاتمہ میں لکھتا ہے "اب تک ہم نے کائنات کے اور اپنے سمندر کے مظاہر کو ثقل کی قوت سے سمجھایا ہے۔ لیکن اس قوت کا سبب نہیں بتایا ہے" اور پھر ثقل کے بعض خواص پیش کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے :—

"لیکن اب تک میں ثقل کی اُن خصوصیات کا سبب مظاہر سے نہیں اخذ کر پایا ہوں۔ اور میں کوئی مفروضات نہیں قائم کرتا کیونکہ جو بھی مظاہر سے نہیں اخذ کیا جاسکتا اُس کو ایک مفروضہ کہا جاتا ہے اور مفروضات چاہے وہ مافوق الطبعی ہوں کہ طبعی چاہے مستتر خصوصیات کے ہوں یا میکانیکی، تجرباتی فلسفہ میں کوئی جگہ نہیں رکھتے۔ اس فلسفہ میں خاص افتراضات کو مظاہر سے اخذ کیا جاتا ہے اور بعد ازاں استقرار کے ذریعے عام بتایا جاتا ہے۔"

کچھ یہی موقف آج بھی ہے ہم "ابتدائی جسیمات" کی باتیں کرتے ہیں اور "قوانین طبیعیات" کی باتیں کرتے ہیں۔ ہمارا علم تجرباتی علم ہوتا ہے جس کو ہم قابل مشاہدہ اور قابل ناپ مقداروں ہی پر تعمیر کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قوانین طبیعیات میں پائے جانے والے چند کائناتی ثوابت کو وقت کیساتھ تغیر بتایا گیا ہے لیکن ہم آج بھی یہی کہتے ہیں کہ وہ قوانین جو آج طبعی نظاموں کے تعاملات کو تابع کیئے ہوئے ہیں۔ ہر وقت وہی تھے اور رہے ہیں اور ہم آج بھی ابتدائی جسیمات اور قوانین طبیعیات کو کسی اور کائیناتی تنظیم کے تحت منسلک نہیں کر پائے ہیں۔ البتہ وقت کے ساتھ ہم اس بات کو زیادہ وضاحت سے سن رہے ہیں کہ وہی قوانین طبیعیات جو غیر عضوی مادہ کے تغیرات تعاملات کی تحدید کرتے ہیں، عضوی اور حیاتی اشیاء کی نہ صرف یہ کہ تحدید کرتے ہیں۔ بلکہ غیر عضوی مادہ سے عضوی اجسام کے ارتقا کے مدارج بھی انہیں قوانین کے تحت ہونے کے امکان کو امکان سے بڑھا کر حقیقت کا درجہ دیا جا رہا ہے۔

تو اوپر لکھا جا چکا ہے اس کی بنا پر اگر ہم زندگی کے اس بیان کا آغاز یہ کہہ کر کریں کہ شروع میں قوانین تھے اور جسیمات تو غلط نہ ہوگا۔ قوانین جسیمات کے ایک محدود تعداد کی اقسام اور خصوصیات کے ذرّے بنانے میں، جمع ہونے کے اور ذرّوں کے آپس میں نوعی جزی تشکیلات میں اکٹھے ہونے کے مسبب ہوئے۔

بدائی ارض کی جَو میں طاقت کے بنیادی مصادر — ناعلیہ الاشعاعیہ، اشعاع مابعد النفسجی، کہربائی تفریغ اور گرمی — نے گیسی اجزا کو ایسے ٹکڑوں میں توڑ دیا کہ جنہوں نے دوبارہ جڑنے پر ایک تعداد وزنی اور نسبتاً پیچیدہ مرکبات کی بنائی جو سمندر میں نیچے جا پہنچی۔ نئے جواہر میں طاقت سے بھرپور اجزا تھے جنہوں نے عارضی طور پر دیگر اجزائی ٹکڑوں سے منعطف ہو کر اُن کے اور بھی زیادہ پیچیدہ مرکبات کی تشکیل میں حصہ لینے میں مدد دی۔ وہاں ایسے ترشے بھی تھے جو بعض اوقات آسان پروٹین کی طرح کی اشیاء بنانے میں آپس میں جڑ گیے۔ مائیں شکریں، نوسفات اور قلیاں تھیں جو درجۂ حرارت اور مقاربت کی مناسب حالتوں میں بسا اوقات نووی ترشوں کے بدائی مادات اولی بنانے کے قابل ہوئیں۔ زلزالی واقعات کے سبب سے بڑے سمندروں سے کٹے ہوئے علیحدہ تالابوں میں پانی کے بڑے حصّے کی تبخیر سے کیمیائی ناعلیہ کی

شرح کثرت سے بڑھ گئی۔ ان تالابوں میں جزئی ٹکڑوں کے اتفاقی اتحاد کی انحصار بعض اوقات ایسی پیچیدہ جزئی ترکیبوں میں منتج ہوئی کہ جو موجود جواہر میں نوعی تفاعل کی زنجیروں میں موثر مادات حفازہ ثابت ہوئے۔ عرصۂ دراز میں کبھی ایک بار حفز الذاتی کا مظہر از خود تضخیمی کیمیائی فاعلیہ کے بند دائروں میں وتورع پذیر ہوا۔ اُن قوانین کی تشغیل کے سبب کہ جو پانی میں مذاب بڑے جزئی وزن والے مادہ کی خصوصیات کی تحدید کرتے ہیں۔ نئے مرکبات میں قطیرات یا (COACERVATES) میں جمع ہونے کا میلان تھا۔ فاعلیہ کے یہ حقیقیات بالآخر زندگی کی طرح کی خصوصیات کا کہ جن میں نمو کی قابلیت اور مناسب حالات میں اپنا خود کا استعادہ شامل ہیں، اظہار کرنے لگے۔

اِس دوران میں کیمیائی ارتقار کی ایک اور لکیر ابھر رہی تھی۔ سیہل نووی ترشوں نے کہ جو مسلسل اور آپ ہی آپ بدائی ابحار کے گرم مخفف شوربے میں بن چکے تھے اپنے خود کے ممتع استعادی افعال کا مظاہرہ شروع کردیا۔ یہ پہلی مرتبہ قطیرات کی ایسی متنقع اقسام میں ہوا جو بعض طرح کے حفزی جواہر اور ساتھ ہی ساتھ زمنی طور سے تغیر پاتے کیمیائی فاعلیہ کے ادوار کے حامل تھے کہ بالآخر ارتقائی محاولہ اور خطا کے اتفاقی مگر تام اعمال نے ایک ہی قطیرہ میں خاصیتوں کے ایک خوش قسمت طقم کے جمع کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ ان خصوصیات میں وہ حالات جو" وراثتی" نووی ترشے کے اجزار کے دقیق ذاتی استعادہ کے لیے اور اس طرح نووی ترشے کے ملبئ مبلغ اجزار کو صلبی تعضنات پر پھیلنے اور اُسی مادہ کے چھوٹے" انتقالی اجزار" سے رابطات قائم کرنے کیلئے ضروری ہیں شامل تھے۔ دیگر اجزار کی مختلف قسموں کے واسطے" انتقالی اجزار" کے غیر ملحق کناروں میں موجود فطری تجاذب نے ان تفاعلات کے ایک رائع طور سے اہم جانبی نتیجہ۔ نووی ترشے کے علاوہ اور پیچیدہ عضوی مرکبات کی صناعت کا انطلاع کیا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ ارتقائی تکریر نے مبلغ اور انتقالی اجزار کو اس حد تک متخصص کردیا کہ نووی ترشے کے آلیات، پروتینی انزیم کی تجمیع میں غیر معمولی حد تک موثر ہوگئے۔ ان مقتدر مادات صنا ذھنی بالدور، بالآخر ایک دوسرے سے مربوط تفاعلات کے نمط کا محکم قبضہ میں لے لیا جس نے آخرکار" کیمیائیات کے حقیقیات" کو انتہا استقرار اور الیغی تفتح دیا کہ جو ان کے" کائن حی" کہلانے کے مستحق ہونے کیلئے کافی ہوتا۔

رفتہ رفتہ نووی ترشے مع انزیم آلیات کی مزید معماری تاثیر کے ساتھ مفرد خلیہ والے کائن حی کے انتشار اور الیف میں دوسری ارتقائی تحسینات آئیں عضوی خصوصیات میں اصلاح ہوئی۔ خلیہ کی حیات کی قابلیت کے اکتساب کو رایبوسوم اور اور گینل جیسے کہ مینوکوندریا ظاہر ہوئے۔ نواۃ کے تنمیہ نے پیچیدہ کیمیائی تفاعلات کو بڑے الیغی فرعی نظاموں کے درمیان عزل کے ایک درجہ کو مہیا کرکے آسان کردیا۔

نووی ترشوں کے وظائف کو دو مختلف اقسام کے اجزاء میں تقسیم کرنے سے اور کرو موسومی آلیات کے ذریعے سے اُن اجزاء کو محفوظ رکھنے سے کہ جو خلیہ کے انتشار اور ایض کے تحکم کی بنیادی "تعلیمات کی کتاب" کے حامل تھے مزید متانت مہیا ہوئی۔ یہ غیر معمولی تجزیہ تصرفات خلیہ کی تقسیم کے دوران نووی ترشے کی توزیع کے دقیق ذرائع میں منتج ہوئے کہ جو اس اعلیٰ درجہ کے وراثتی استقرار کی کہ جو موجودہ زندگی کے نسبتاً متقدم درجے سے قرب کرتا ہو ضمانت ہوں۔

ارتقاء کی اقتضاءیات نے اس بات کی تک اجازت دی کہ بعض نووی اور خلیائی جبلت کے تفاعلات کی احاطاتی کیمیائی عوامل سے متعلق حساسیت کو تک — کہ جو حساسیت خلیتی آلیات میں ایک اہم کمزوری معلوم ہو سکتی تھی۔ معمول کیا جا سکے۔ کیونکہ منتج ہونے والی نووی موروثی تحویل اور امتزاجی تاثیر کی خلیائی جبلت کے ذریعہ تفہیم نے خلیوں کے مختلف گروہوں کو ایک مشترک موروثی عطیہ کے باوجود مختلف طریقوں میں ظاہر ہونے کی اجازت دے کر متعدد خلیوں والے کوائن جی کو ممکن بنا دیا اور کائن جی کے اعضاء کے مفاصلہ پر موضعی احاطاتی اثرات کے اسمام کے سبب موزونات میں "تعلیمات کی کتاب" کی اعلامی معتویات اب اُن سے بہت ہی کم ہو سکتی تھیں جو باحالات دیگر نووی ترشوں کے اجزاء میں ہر خلیہ کے ایض اور تفصیلی انتشار کے تراسر کے لئے ضروری ہوتیں۔ اس طرح پیچیدہ کوائن جی کا عمل ممکن ہوا۔ اعلیٰ نباتات و حیوانات بشمول انسان کے تنمیہ کے قابل ہوئے۔

اس طرح ثقل، نووی قوت، مقناطیس اور کہربا کے قوانین تو تھے ہی لیکن اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ موجودہ دلیل اصحاب علم کی اس اُمید کے متوافق ہے کہ باشعور تجربہ کی خاصیتیں بھی بالآخر اس طرح منتظم اور تنبؤ کے قابل پائی جائیں گی کہ جیسے ثقل اور کہربا کی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ بھی محتم ہے کہ چاروناچار بالآخر ہم وحدات حسی کے مادہ کی طبعی حالتوں اور سادراکی معرفت کی کیفیتوں کے مابین قرابتوں کا ان قوانین میں اضافہ کر لیں گے کہ جو بنیادی جسیات کی تفاصیل کے ساتھ مل کر طبیعیات جدیدہ کی فہرست بنتے ہیں۔

باور کیا جاتا ہے کہ بیسویں صدی کے اس آخری تہائی حصہ میں علم کی وحدت اور کفائت کا کیس طاقتور ہو چکا ہے مستقبل کے اکتشافات اس نتیجہ کو کہ جس کی طرف علم اتنے عرصے سے ہو رہا ہے غیر قابل ضرب بنا سکتے ہیں کہ کسی طرح کے فوق العلمی یا حقیقتی اصول کے اضافے کے بغیر انسانی تجزیہ کے تمام مظاہر کے بیان کے لئے طبیعاتی قانون کے ایک واحد مجموعہ کا منتظم اور تنبؤ کے قابل عمل کافی ہے۔

کیا اس تجزیہ سے آئن سٹائن اور نیوٹن کے الہیاتی عقاید اور مارکس، اینجلس، لینن اور نہرو کے مادی فلسفوں کے درمیان حقائق پر مبنی کوئی فیصلہ کن بات اُبھر سکتی ہے۔ اس کا فیصلہ ہر دو طرح سے ممکن اور ایک طرح سے لامعنی بھی ہے کیونکہ بنیادی اعتبار سے خود بنیادی جسیات کی طبیعیات، علم کے قریب قریب

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

شارق میرٹھی

ڈاکٹر شوکت سبزواری

"شخصیت اور ادبی خدمات"

شخصیت

اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ پچھلی نصف صدی میں اردو کے کون کون سے ادیب گذرے ہیں جو عظیم کہلائے جانے کے مستحق ہیں، تو میں بلا تامل جواب دوں گا کہ وہ ہیں مولوی عبدالحق، نیاز اور ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری ۱۹ مارچ ۱۹۷۳ء کو ہم سے رخصت ہو گئے اور آسمان ادب کا ایک درخشاں ستارہ ڈوب گیا۔ وہ فرد واحد نہیں تھے۔ بلکہ اپنی جگہ انجمن تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے ادب آج سونی سونی سی نظر آتی ہے۔ سطحی علم کے حامل تو بہت سے مل سکتے ہیں مگر ایسے ادیب جن کے بحر علم کی تھاہ نہ ہو، بہت کم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے ہی صاحب فن تھے۔ ان کے علم کی تہ بہت گہری اور ان کے دریائے فکر کی حدود بے پایاں تھیں۔ ان کی وسعت معلومات کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ وہ نہ صرف بلند پایہ ادیب تھے بلکہ اچھے نقاد بھی تھے۔ ایک ماہر لسانیات کی حیثیت سے ان کا مقام اور بھی بلند ہے وہ گنے چنے ایک دو ماہرین لسانیات میں سے تھے۔ ان کی مذہبی معلومات بھی بہت وسیع تھیں۔ انھیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا فارسی، انگریزی اور عربی کے وہ جید عالم تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ہندی اور سنسکرت کے ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے حقیقت میں وہ تمام مشرقی زبانوں کے رموز آشنا تھے۔

ڈاکٹر صاحب میرٹھ کے باشندے تھے ان کی تعلیم کا آغاز عربی اور فارسی سے ہوا۔ جلد ہی وہ مرتبۂ کمال کو پہنچ گئے۔ بحیثیت مذہبی عالم کے، کم عمری ہی میں انھیں شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ مناظر بھی بڑے اچھے تھے۔ باہر سے جب بھی کوئی مناظر میرٹھ کے قرب و جوار میں آتا تو ڈاکٹر صاحب ہی کو آگے بڑھایا جاتا۔

شوکت صاحب کی ملازمت کا آغاز چونے والوں کی مسجد میں واقع عربی مدرسے سے ہوا۔ مولوی فاضل کا امتحان پاس کرکے وہ یہاں مولوی فاضل اور منشی کامل کے درجات کو پڑھانے لگے۔ وہ جتنے دن بھی یہاں رہے انھوں نے اپنے فرائض کو خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ اس عرصے میں وہ نہ صرف معلم ہی تھے بلکہ متعلم بھی رہے۔ انھوں نے پرائیویٹ طور پر عربی، فارسی اور اردو میں ایم۔ اے کے امتحانات پاس کیے اور سب میں امتیاز حاصل کیا۔ بعد میں انھوں نے قانون کا امتحان دیا اور اس میں بھی درجۂ اول میں کامیاب ہوئے۔ ان امتحانات میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے پر انھیں بہت سے تمغے عطا کیے گئے۔ اس کے وہ مستحق بھی تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد

اُن کی گراں قدر ریسرچ پر انھیں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا۔

مقامی مدرسے کی ملازمت کو ترک کر کے، کچھ دنوں انھوں نے اسلامیہ کالج بریلی میں ملازمت کی اس کے بعد وہ میرٹھ کالج میں آ گئے۔ فلسفۂ کلامِ غالب کے نام سے کتاب انھوں نے اسی زمانے میں لکھی اور اُسے سیٹھ گوپی ناتھ رئیس میرٹھ کے نام معنون کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ جمعیۃ العلماء سے منسلک رہے۔ وہ کانگریسی نظریۂ خیال کے حامی تھے۔ کانگریس کی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ وطنیت کے موضوع پر جب علامہ اقبالؔ کی وہ مشہور نظم شائع ہوئی جس کا ایک مصرع یہ ہے ؂

"ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست"

تو اس کے جواب میں بہت سی نظمیں شائع ہوئیں۔ اِن میں شوکت صاحب کی نظم بہت مشہور ہوئی۔

۱۹۴۷ء کے بعد کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب بددل ہو گئے۔ ڈاکٹر شادانی اُن کی قابلیت کے معترف تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بلا لیا۔ وہ خود لکھتے ہیں: "قیامِ پاکستان کے بعد مغربی یو۔ پی میں ایک بھونچال آیا جس نے زندگی کی طنابیں تک اکھاڑ پھینکیں۔ بہت سے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد سنہ ۱۹۵۰ء میں ڈھاکے آ گیا۔"[1] مگر ڈاکٹر صاحب وہاں زیادہ مطمئن نہ رہے۔ اِسی لئے چند سال بعد وہ کراچی چلے گئے۔ یہاں انھیں ڈاکٹر عبدالحق کی سرپرستی نصیب ہو گئی اور وہ ترقی اُردو بورڈ کے مدیرِ اوّل بنا دیئے گئے۔ اُردو کی مشہور لغت انھیں کے زیرِ نگرانی ترتیب پا رہی تھی۔ ابتدا میں جوش ملیح آبادی بھی اس بورڈ سے منسلک تھے۔ نیازؔ فتحپوری نے ترقی اردو بورڈ کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ جوش اِس ایوانِ ادب کے نقش و نگار ہیں اور شوکت سبزواری اس کے بنیادی ستون۔ اِس کی تمام عمارت اصل میں شوکت صاحب ہی کے بل پر قائم تھی۔ اب اُردو لغت کا جو حصّہ ادھورا رہ گیا ہے۔ اُس کا پورا ہونا محال نہیں تو امرِ دشوار ضرور ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر وفات کے وقت ستّر کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو اردو زبان کی گراں قدر خدمات انجام دیتے۔ اب ڈاکٹر صاحب جیسے صاحبِ علم مشکل سے پیدا ہوں گے۔ اُن جیسی شخصیت اُردو کو شاید ہی نصیب ہو سکے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری بڑی متوازن شخصیت کے مالک تھے۔ اوسط قد، نکھرا ہوا سفید رنگ، خوب صورت نقش و نگار، آنکھیں ذرا اندر کو دھنسی ہوئی۔ اُن کی نظر شروع ہی سے کمزور تھی۔ اِسی لئے وہ موٹے شیشے کی عینک استعمال کرتے تھے۔ اُن کی سیاہ ترشی ہوئی داڑھی اُن کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھی۔ کراچی جا کر شاید انھوں نے داڑھی کو صاف کرا دیا تھا۔ معلوم نہیں اس حال میں وہ کیسے لگتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے۔ جاذبِ نظر وہ پھر بھی ہوں گے۔

---

[1] مضمون عندلیب شادانی مطبوعہ نقوش شخصیات نمبر صفحہ ۳۶۲

عربی مدرسے کی معلمی کے زمانے میں وہ صرف قمیص، پائجامہ استعمال کرتے تھے۔ اگرچہ اس زمانے میں اُن کی تنخواہ قلیل تھی مگر میں نے انھیں ہمیشہ خوش لباس پایا۔ وہ بہت صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ اس سے اُن کی نفاست طبع کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نماز روزے کے پابند تھے مگر دینی معاملات میں انھیں غلو نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب بہت گمبھیر طبیعت کے انسان تھے۔ وہ بہت لئے دیے رہتے تھے۔ زائد الفاظ اُن کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوتے تھے۔ بحیثیت معلم وہ بہت شفیق اور مربّی تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے اُن کے مدرسے میں داخلہ لیا تھا۔ اگرچہ شوکت صاحب عربی اور فارسی کے اچھے معلم تھے مگر چونکہ میرے ساتھ کے اکثر طلبا کمزور تھے، اس لیے اُن کا لیکچر اکثر طلبا کی سمجھ سے باہر ہوتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اُن کی سطح تک اُتر بھی نہیں سکتے تھے پڑھاتے ہوئے وہ بڑے ضبط سے کام لیتے تھے۔ ہاں منشی کے امتحان سے قبل جب انھوں نے ایک دن اپنے شاگردوں کی قابلیت کا امتحان لیا تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ میرے ہم سبق ایک صاحب کامل نام کے تھے۔ اُن سے ایک سوال کا جواب بھی نہیں دیا گیا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کا غصہ دیکھنے کے قابل تھا۔ انھوں نے کامل کی پٹائی کی اور اچھی طرح کی۔

ایک بار ہم سبق پڑھ رہے تھے کہ سمٹ گنج، میرٹھ کی مسجد کے پیش امام تشریف لائے، لمبی داڑھی، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا، ماتھے پر شکنیں پڑی ہوئیں۔ آتے ہی پوچھنے لگے "آپ معراج جسمانی کے قائل نہیں ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے انھیں دیکھا اور واقعہ سے متعلق کوئی آیت پڑھ کر مولانا سے اس کے معنی پوچھے۔ مولانا نے فرمایا "کیا میں جاہل ہوں"؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں جاہل تو میں ہی ہوں اسی لئے تو آپ سے معنی پوچھے تاکہ میری معلومات میں اضافہ ہو جائے" مولانا خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے اور ڈاکٹر صاحب پھر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔

بعد میں وہ بریلی چلے گئے اور میں کھاتولی میں ملازم ہو گیا۔ چھٹیوں میں وہ اکثر میرٹھ آتے رہتے تھے۔ ہم دونوں کی ملاقات اکثر لائل لائبریری میں ہوتی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں میری ایک نظم ماہنامہ زمانہ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ اُن کی نظر سے گذر چکی تھی۔ ملے تو اس کی بہت تعریف کی۔ پھر وہ میرٹھ کالج میں آ گئے۔ اب اُن سے ملاقات کے مواقع زیادہ ملنے لگے۔ شوراب دروازہ کے باہر وہ ایک دو منزلہ مکان میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں بھی، میں نے اُن کے رہن سہن میں کوئی فرق نہیں دیکھا۔ وہی علی گڈھ کٹ کا پائجامہ، وہی سادہ خوش نما کپڑے کی قمیص اور شیروانی یہ لباس اُن کے جسم پر ہر طرح موزوں بھی تھا۔ گھر میں وہ تہمد استعمال کرتے تھے۔ ان دنوں کچھ باتیں اُن کی نجی زندگی سے متعلق مشہور ہوئیں، مگر میں نے انہیں ہمیشہ بلند اخلاق سے متصف و مزین پایا۔

جہاں تک ڈاکٹر صاحب کے ذوق مطالعہ کا سوال ہے، وہ راہ علم میں ہمیشہ سرگرم طلب رہے۔ انھیں اپنے

متعلم ہونے پر فخر تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ادب پر کوئی نئی کتاب شائع ہو اور اُن کی نظر سے نہ گذرے۔ انھیں کتابوں کا بڑا شوق تھا۔ ہر رسالے کی سال بھر کی ایک جلد بند ہوا کر بڑے سلیقے سے الماری میں رکھتے تھے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کئی زبانوں کے ماہر تھے اس لئے تقابلی بحث بڑی خوبی سے کرتے تھے۔ سبق کے درمیان عربی اور فارسی کے اشعار کی اس خوبی سے تشریح کرتے کہ معلوم ہوتا کہ یہ اشعار اسی موقع کے لئے کہے گئے تھے۔

یہ سب باتیں میں نے اس وقت تک کی لکھی ہیں جب تک ڈاکٹر صاحب میرٹھ میں مقیم رہے۔ ڈھاکے پہنچ کر انھوں نے کس طرح زندگی بسر کی، اس پر نقوش کے شخصیات نمبر میں جناب شکور عظیم نے روشنی ڈالی ہے۔ شوکت صاحب صاحب کی سیرت کا اندازہ اِس اقتباس سے کیجئے :—

" تنقید سے لے کر لباس و رہائش تک ہر چیز مشرقی ہے۔ وہ بڑے ٹھیٹ مشرقی ہیں، روایت کے پرستار سفید علی گڈھ کٹ پائجامہ، پاؤں میں شو اور سردی ہو یا گرمی اُسی کی مناسبت سے ہمیشہ شیروانی۔ بغیر شیروانی پہنے وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ جس زمانے میں زبان کا جھگڑا چل رہا تھا اور لڑکے یونیورسٹی میں کسی کو داخل نہ ہونے دیتے تھے، میں نے بہت سے اساتذہ کو دیکھا جو ہمیشہ شیروانی پہن کر آتے تھے مگر اس ڈر کی وجہ سے لباس بدل کر آئے کیونکہ شیروانی اردو داں ہونے کا بڑا ثبوت تھی مگر یہ جاننے کے باوجود بھی شوکت صاحب ہمیشہ شیروانی ہی پہن کر جاتے "

اب میں اختصار کے ساتھ ڈاکٹر شوکت سبزواری کی چند تصانیف کا تعارف کرانا چاہوں گا۔ افسوس ہے اُن کی تمام کتابیں میری دسترس سے باہر ہیں۔ پھر بھی جتنی کتابیں میرے پاس ہیں، اُن کا تعارف، ڈاکٹر صاحب کی خدمت زبان اور ادبی مرتبے کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے ملاحظہ فرمائیں۔

تصانیف کا تعارف : (۱) لسانیات

(الف) اردو زبان کا ارتقا :— ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ پی، ایچ، ڈی کے لئے لکھا گیا تھا۔ چنانچہ مقدمے میں لکھتے ہیں، میں مدت سے اس فکر میں تھا کہ ہر قسم کے تعصبات سے الگ ہو کر اردو کے لسانی ارتقا کا ایک ہلکا سا لیکن روشن خاکہ اردو میں پیش کر دوں تاکہ اس کی روشنی میں اردو داں طبقے کو اردو کے حسب نسب اور مولد و منشاء کے متعلق صحیح فیصلہ کرنے کا موقع مل سکے" اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان کا لسانی تجزیہ کر کے اُس کے تاریخی ارتقا کو دکھایا ہے اور زمانۂ قدیم سے عہد حاضر تک کی عہد بعہد تبدیلیاں پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اوّل تمہیدی، دوم تحقیقی،

تمہیدی حصے کو جن ابواب میں تقسیم کیا ہے، وہ یہ ہیں : —

باب اوّل : زبانوں کے خاندان اور اُن کے شجرے ــــ باب دوم . ہند پاک کی قدیم زبانیں ۔

باب سوم : — ہند پاک کی زبانوں کے رشتے اور اردو زبان کا ماخذ ۔

تحقیقی حصے کو ان ابواب میں ترتیب دیا گیا ہے:۔

صوتی تبدیلیاں، اخذ و اشتقاق، اسمائے نوع، اسمائے مطلقہ، اور افعال و مشتقات، مقالے میں تمام لسانی اور صوتی خصوصیات سے بحث کرکے ڈاکٹر صاحب نے جس ارتقائی کھوج کا پتہ چلایا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے۔ "اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہئے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی"

اس گراں قدر تصنیف کے بارے میں ڈاکٹر زور مرحوم کی رائے وقیع قرار دی جاسکتی ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"اتنا ضرور ہے کہ اردو زبان کا ارتقاء کے مطالعے سے آئندہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے اردو کے آغاز و ارتقاء پر غور کرنے کے امکان سجھائی دیں گے اور یہ بات پالی زبان سے ہندی اور اردو کے تعلق اور مناسبت سے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پالی بھی ہندی اور اردو کی طرح ایک زمانے میں تمام ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور اس کی طرف غور کرنا اردو ہندی کے ارتقائی منازل طے کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔ چونکہ اب تک کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی اس لئے یہ مسئلہ قابل توجہ نظر آتا ہے"[1]

داستان زبان اردو:۔ اردو زبان کا ارتقاء اگر اجمال کی حامل کتاب ہے تو داستان زبان اردو تفصیل کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس میں مزاج و منہاج اور اس کی فطرت پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو کے آغاز و ارتقاء کے بہت سے ان گوشوں کو روشن کیا ہے جو ہنوز تاریکی میں ہیں اردو کے آغاز و ارتقاء سے قطع نظر ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اردو کا لسانی سرمایہ تین اجزاء پر مشتمل ہے اور وہ یہ ہیں:۔

(i) منفرد الفاظ بشمول اسماء و صفات (ii) افعال و حروف (iii) اصول صرف و نحو

ج: **لسانی مسائل**:۔ یہ کتاب مجموعہ ہے ڈاکٹر صاحب کے لسانیات سے متعلق چند مضامین کا اس کے پیش لفظ میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں۔ "کسی زبان کی ترقی کے لئے یہ بھی کچھ کم اہم نہیں کہ ہم اس کی معرفت حاصل کریں اور یہ معرفت اس وقت حاصل ہوتی ہے۔ جب زبان کا حسب نسب معلوم ہو۔ اس کے تاریخی ارتقاء کے مختلف دور ہم جانتے ہوں ...... میں نے ۱۹۵۸ء اردو زبان کا ارتقاء لکھا جس میں اردو کی تاریخ کے

---

[1] ادبی تحریریں مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، صفحات ۱۴۰-۱۵۹

ارتقائی دوروں کی نشان دہی کر کے اُس کے حسب نسب کا کھوج لگایا تھا۔ اِس کے بعد داستان زبان اُردو میں اس امر کی کوشش کی کہ اُردو کے مزاج و منہاج اور اُس کی فطرت بتاؤں اور اُس کے آغاز و ارتقا کے اُن گوشوں کو جو ہنوز تاریکی میں ہیں روشن کردوں ان کتابوں کی تالیف و تسوید کے دوران میں اردو کی سرگذشت ساخت اور تاریخ سے متعلق کچھ مسائل میرے سامنے آئے جو اِن کتابوں میں جگہ نہیں پا سکے تھے" یہ مضامین جو وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں اس کتاب میں شامل ہیں۔ اِسی کتاب میں تین باب قائم کئے گئے ہیں۔

باب اول میں قواعد لسانیات سے متعلق مضامین ہیں جیسے لسانی مسائل اردو قواعد کی ترتیب نو اور الفاظ عامہ کی آپ بیتی اُردو کی مرفی نحوی استواری" نے "کی سرگذشت" جیسا "کی سرگذشت" "کی" کی جگہ "کے" کیوں؟ اردو کی مفعولی ضمیریں احوال اسم اور زبان کا ایک صوتی رجحان۔

باب دوم کا عنوان ہے "زبان اور رسم الخط" اس میں پہلا مضمون ہے "اصلاح زبان اردو" یہ بڑا مفید مضمون ہے۔ اِس میں اصلاح زبان سے متعلق کس صاحب فن نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اس پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ تین مضامین لکھنؤ کی زبان پر ہیں۔ یہ اصل میں اثر لکھنوی مرحوم کے مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین میں لکھنؤ کی زبان سے متعلق ہر گوشے پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اِن کے مطالعے کے بعد لکھنؤ کی زبان کی تمام خصوصیات واضح ہوجاتی ہیں۔ "اُردو کا رسم الخط" بھی قیمتی مضمون ہے۔ اِس میں اردو رسم الخط کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور بڑے سائنٹیفک انداز میں بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ اردو کے لئے فارسی رسم الخط ہی موزوں ہے۔

باب سوم میں چند متفرق مضامین ہیں جن میں کچھ لفظوں کی سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ یہ ہیں "بادرچی یعنی چہ" "خودی میں خدائی" اور "روداد میز و میزبانی"۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے لسانیات جیسے خشک موضوع کو بھی انتہائی شگفتہ اور دل چسپ انداز میں پیش کیا ہے۔

(۲) تنقیدی مضامین

(الف) نئی پرانی قدریں:۔ یہ کتاب مجموعہ ہے اردو ادب کی نئی پرانی قدروں پر چند جامع مضامین کا ان میں مختلف ادبی مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

(ب) معیار ادب:۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اِس میں نظریاتی اور عملی تنقید سے متعلق چودہ گراں قدر مضامین شامل ہیں۔

(۳) غالبیات: (الف) فلسفۂ کلام غالب:۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اوّلین تصنیف ہے۔ اس میں اُردو کے

منفرد شاعر غالب کے نظام فکر و فلسفہ کے متعلق مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اقبالیات سے متعلق لٹریچر میں جو مرتبہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی گراں قدر تصنیف روح اقبال کا ہے وہی مرتبہ غالبیات کے سرمایۂ نقد میں فلسفۂ کلام غالب کو حاصل ہے۔ یہ کتاب سلسلۂ غالبیات کی اتنی اہم کڑی ہے کہ اسے نہ کوئی اہل نظر نظر انداز کر سکتا ہے اور نہ تماشائی اس سلسلے میں نیا نقطہ نظری کی رائے توجہ کی مستحق ہے۔ "کہتے ہیں غالب کو فلسفی ظاہر کرنا اب ہر نقاد و شارح کا دستور ہے اور ایسا کہہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن قیامت یہ ہے کہ اسکو فلسفی ظاہر کیا جاتا ہے ایسے عجیب و غریب زاویوں سے کہ غالب فلسفی تو کیا شاعر بھی باقی نہیں رہتا۔

پروفیسر سبزواری نے اس کتاب میں زیادہ تر اس گتھی کو سلجھایا ہے اور غالب کی شاعرانہ و فلسفیانہ حیثیت کو جو دراصل ایک ہی چیز ہے اس قدر تحقیق و کاوش کے بعد پیش کیا ہے کہ ان کی کتاب خود شعر و فلسفہ کی ایک نہایت اچھی تصنیف ہو گئی ہے۔"

فاضل مصنف نے غالب کے نظریۂ حیات، فلسفیانہ تصورات، اخلاقی موضوعات اور جمالیاتی تاثرات کے متعلق بحث کی ہے اور اس گفتگو میں اس بالغ نظری سے کام لیا ہے جو شیدائیان غالب میں سے شاید ہی کسی طرف سے اس وقت تک ظاہر ہوئی ہو"۔

اس کا اندازہ شوکت صاحب کو بھی تھا۔ چنانچہ احوال واقعی کے تحت کہتے ہیں" ان اوراق میں شاعر کی سخنورانہ رفعتوں تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان کے کلام و پیام کو شعر و نغمہ کی زبان میں قارئین تک پہنچایا گیا ہے"۔

کتاب کی جامعیت کا اندازہ اس کے مشمولات سے لگایا جا سکتا ہے جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) غالب کے حکمیاتی تصورات

(الف) وجود و ہستی (ب) فنا اور بقا

(۲) غالب کا نظریۂ حیات (۳) غالب کی اخلاقی قدریں (۴) آرٹ اور جمال۔

(الف) نظریۂ حسن و عشق (ب) مسلک شعری (ج) فنی تجزیہ (د) غالب کی غزل سرائی۔

یہ کتاب برسوں تک مختلف یونیورسٹیوں کے ایم۔ اے کے نصاب میں داخل رہی ہے۔ افسوس ہے۔ اب ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتی۔

(ب) **غالب فکر و فن** :۔ یہ کتاب غالب سے متعلق چند تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ غالب کی شخصیت پر ڈاکٹر صاحب کا مضمون علی گڈھ میگزین کے غالب نمبر میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔ غالب نمبر ہی میں ایک تحقیقی مقالہ ملک کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب کا شائع ہوا تھا۔ شوکت صاحب نے اس پر

سیر حاصل تنقید کرکے بعض غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔ ان مضامین میں شوکت صاحب کی بھرپور گرفت سے اُن کی قابلیت اور وسعت مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں قاضی عبدالودود صاحب کو اپنے مضمون سے اظہار برأت کرنا پڑا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تنقید کی روشنی میں اصلاح کرکے ازسرنو اس موضوع پر مضمون لکھا جو بعد میں 'نقد غالب' مرتبہ ڈاکٹر مختارالدین آرزو میں شامل ہوا۔ اسی مجموعے کا ایک اور مضمون بڑا قیمتی ہے۔ وہ ہے 'غالب اور میرٹھ'

سلسلۂ غالبیات میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

شوکت سبزواری کا انداز نگارش

حالی کی ادبی روایت کو جن ادیبوں نے آگے بڑھایا اُن میں مولوی عبدالحق کے بعد ڈاکٹر شوکت سبزواری کا نام سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی رواں دواں اور سادہ نثر لکھتے ہیں۔ وہ اظہار قابلیت کے لئے بے جا لفاظی اور صنعت گری سے کام نہیں لیتے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات کو نہایت سادگی سے ادا کرتے ہیں۔ ابہام ان کی تحریر میں نام کو نہیں ملتا۔ اُن کی ابتدائی تصانیف میں 'فلسفۂ کلام غالب' ہی ایک ایسی تصنیف ہے جس کا اسلوب نگارش شعریت کا انداز لئے ہوئے ہے۔ یہ کتاب فلسفہ و شعر کا بہترین امتزاج ہے مگر یہاں بھی اُن کی نثر 'ہزار شیوہ' بیانیوں سے قطع نظر انتہائی سلیس ہے اس میں انھوں نے ہندوستانی فلسفے کی تعبیرات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن بہت سلجھے ہوئے انداز میں۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا قلم نہایت خشک موضوعات پر اٹھایا۔ لسانیات ان کا خاص مضمون تھا مگر اس سے متعلق نثر بھی سنجیدگی کے باوجود انتہائی شگفتہ ہے۔

ان کی نثر نگاری کا کمال یہ ہے کہ اس میں فرسودگی نام کو نہیں ملتی۔ ڈاکٹر صاحب کا خاص اسلوب تحریر اُن کے تحقیقاتی مضامین میں نظر آتا ہے۔ وہ اپنے موضوع کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انتہائی گہرائیوں میں جاکر صدف مقصود کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ پھر اپنی تلاش کے جواہر زر نگار کو نہایت خوب صورتی سے قارئین کے پیش نظر کر دیتے ہیں۔ ہاں کہیں کہیں اس میں مناظرانہ انداز پیدا ہوجاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ یہ مضامین انھوں نے بعض مضامین کے جواب میں لکھے ہیں۔ مثال کے طور پر 'لکھنؤ کی زبان' یہ جناب اثر لکھنوی مرحوم کے مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بالاقساط کئی مضامین میں اثر صاحب کے مضامین پر تبصرہ کیا ہے مگر انتہائی متانت کے ساتھ ایسے مضامین میں عام طور لہجے کی جھنجھلاہٹ نمایاں ہوجاتی ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب یہاں بھی سنجیدگی کے دامن کو نہیں چھوڑتے۔ وہ صرف اپنے موضوع سے کام رکھتے ہیں۔ اس قسم کے مضامین میں ان کا ایک مضمون بہت مشہور ہے۔ یہ مضمون قاضی عبدالودود کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا ہے جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جاچکا ہے۔ قاضی صاحب کو اپنے مضمون سے اظہار برأت کرنا پڑا اور انھوں نے ڈاکٹر صاحب

مضمون کی روشنی میں از سر نو اپنا مضمون لکھ کر چھپوایا۔ یہ اور بات ہے کہ قاضی صاحب نے اس کے اظہار کو مناسب خیال نہیں فرمایا۔ بہرکیف ان دونوں مضامین سے ڈاکٹر صاحب کی وسعت علم کا اندازہ بآسانی ہوجاتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز عربی افسانوں کے تراجم سے کیا۔ یہ افسانے اپنے عہد کے معتمد رسائل جیسے ادبی دنیا، شاہکار وغیرہ میں شائع ہوکر مقبول ہوئے۔ بعد میں انھوں نے افسانہ نگاری کو ترک کرکے سنجیدہ موضوعات کو اپنایا۔ اُن کی طبع دشوار پسند کے لئے افسانہ نگاری موزوں بھی نہ تھی۔ اُن کی وسعت مطالعہ کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے لئے کسی بلند ترین موضوع کا انتخاب کرتے اور یہ موضوع غالب کے علاوہ اور کون ہوسکتا تھا۔ چنانچہ غالب پر اُن کی کتاب اپنے عہد کی گراں قدر تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر بجنوری کے بعد شوکت سبزواری ہی کو یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ غالب پر قلم اُٹھانے کی جراءت کرتے۔ انھوں نے کلام غالب کے نئے گوشے تلاش کرکے اُن پر روشنی ڈالی اور ماہرین غالبیات کے درمیان اپنے لئے ایک اہم جگہ بنالی۔

ڈاکٹر صاحب کو خاکہ نگاری میں بھی دخل تھا۔ عندلیب شادانی اور کیفی پر اُن کے خاکے بہت قیمتی ہیں۔ انھوں نے جن ہستیوں کو اپنے موضوع کے لئے منتخب کیا وہ سب اپنی اپنی جگہ عہد آفریں تھیں۔

اب آپ اُن کے اسلوب نگارش کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:۔

'غزل کی آپ بیتی' اُن کا ایک گراں قدر تنقیدی مضمون ہے۔ غزل کیا ہے؟ اسے ڈاکٹر صاحب کی زبانی سنئے:۔

"دل جذبات کا سرچشمہ ہے۔ عالم رستاخیز ہے۔ جس طرح پانی کی سطح پر بلبلے اُٹھتے ہیں، جذبات بھی اُسی طرح دل میں اُبھرتے رہتے ہیں۔ جذبات بہت ہیں بقول شاعر ؎

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا کوئی نام نہیں اور جن کے ہماری زبان میں نام ہیں، ان کی بھی بے شمار نہیں ہیں۔ لاتعداد تنوعات ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں، روشن اور ہمہ گیر جذبہ محبّت ہے۔ ہمارے غزل گو شعراء نے غزل کو دل کے رنگا رنگ جذبات میں سے بھی صرف جذبۂ عشق و محبت کے لئے خاص کرلیا ہے۔ غزل دل کی باتوں کا نام ہے۔ عشق و الفت کی رنگین داستان ہے اور بقول ڈاکٹر شادانی 'ایک مینا ہے جو صہبائے محبت کے لئے زیادہ موزوں ہے'۔"

رسمی اور حقیقی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے خیالات کیا ہیں اسے دیکھئے اور اندازہ لگائیے کہ انھوں نے اپنے خیالات کو کس خوبی سے پیش کیا ہے۔

"رسمی اور حقیقی شاعری میں یہ فرق صحیح نہیں کہ رسمی شاعری جگ بیتی ہے اور حقیقی شاعری آپ بیتی۔ شاعری کا یہ تصور محدود ہی نہیں بلکہ غلط بھی ہے۔ حقیقی شاعری وہ ہے جس میں خلوص ہو، جادو ہو، تاثر ہو، جذبات کی

حرارت اور تیزی ہو، تجربے کی پختگی اور احساس کی شدت ہو اور اُس کا سچا اور اچھا معیار خود شعر ہے۔ آفتاب کی دلیل آفتاب کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے۔ شعر میں تیزی اور شوخی، گہرائی اور گیرائی "خونِ جگر" سے آتی ہے۔ جو اشعار خونِ جگر کھا کر کہے جاتے ہیں اور جنھیں "دل گداختہ" کی آنچ دی جاتی ہے، ان کے لہجے کی قطعیت، طرزِ ادا کے جوش اور روئے کی تیزی سے اُن کے اندر کی نشتری کیفیت خود پھوٹ پڑتی ہے ؎

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسدؔ　　　پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

یہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب سنسکرت کے بھی فاضل تھے۔ اِسی کے ساتھ فلسفہ و منطق پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ مگر اُن کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ مشکل سے مشکل مقام کو بڑی خوبی سے ادا کر دیتے تھے۔ اُن کی نثر سہل ممتنع ہے۔ جسے جذبہ و فکر کی آمیزش نہایت دل آویز اور پُر تاثیر بنا دیتی ہے۔

گیتا میں کرم یوگ کو سنیاس سے افضل اور برتر بتایا گیا ہے۔ چنانچہ گیتا کے ادھیائے پانچ (۵) اشلوک (۲) میں کہا گیا ہے "یوں تو سنیاس اور کرم یوگ دونوں بہتر ہیں لیکن کرم یوگ سنیاس سے زیادہ اچھا ہے۔ اِس کی تعبیر و تشریح "فلسفۂ کلام غالب" کے صفحہ ۱۴۷ اول ایڈیشن میں ملاحظہ فرمائیں:۔

در اصل سنیاس یوگ بھی ایک اعتبار سے کرم یوگ ہی ہے۔ بس اس قدر فرق ہے کہ سنیاس کے لئے ضروری ہے کہ یوگی (مجاہد) جملہ خواہشوں اور تمناؤں سے پاک ہو اور یہ بات کرم یوگ سے بھی حاصل ہوسکتی ہے نشکام کرم (عمل بے آرزو) ویدانت کی رو سے سب سے بڑی ریاضت اور سب سے اعلیٰ عمل خیر ہے۔ ویدانتیوں کا خیال ہے کہ کرم پھل آسنگ (یعنی کرم کے پھل کی خواہش ترک کر دینے سے جیوآتما (روح) کرم کے بندھن سے آزاد ہو جاتی ہے۔ کرم ہندو فلسفے میں جملہ مصائب و آلام کی علت ہے۔ اِس لئے وہ اس بلا سے بچنے کے لئے کچھ ضروری سا خیال کرتے ہیں کہ کرم سے مجتنب رہیں۔ اِس کی صورت اُن کے نزدیک یہ ہے کہ نفس انسانی کرم بھی کرے اور اُس سے پاک بھی رہے۔ اِس طور پر کہ کرم کے پھل کی خواہش قلب سے دور کر دی جائے۔

کرشن جی فرماتے ہیں:۔

برہمنی آدھائے کرمانے سنگم　　　جو پھل کی خواہش ترک کر کے خدا پر
تیکتوا۔ کروتی، یہ لپتے۔ نہ سہہ　　　اعتماد کرتا ہے وہ کبھی گناہ آلود
پاپن۔ پدم۔ پتر مو۔ امبھسا　　　نہیں ہوتا جس طرح کنول کی پتیاں پانی
　　　میں رہتے ہوئے بھی پاک و صاف رہتی ہیں۔

گیتا ادھیائے ۵ شلوک ۱۰

مذکورہ عبارت سے آپ ڈاکٹر صاحب کے اسلوب بیان کی سلاست کا اندازہ لگائیں۔ انھوں نے فلسفیانہ خیالات کو کتنی سادگی اور خوبی سے ادا کر دیا ہے۔ کہیں ابہام کا پتہ نہیں۔ اندازِ تحریر میں کہیں کوئی الجھن نہیں۔ فلسفیانہ خیالات کے اظہار کی ایک اور مثال دیکھئے:—

"میرا خیال ہے کہ جمالیات کے شدید ترین احساس سے آرٹ یا شعر وجود میں آتا ہے اور اس کے دقیق ترین یا لطیف ترین شعور سے حکمت پیدا ہوتی ہے۔ دونوں ایک ہیں صرف شدت اور لطافت کا فرق ہے۔

جمالیاتی احساس کے درجات کا تفاوت اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک چھوٹے بچے یا طفلِ ناداں کا احساس جمال کسی قدر کثیف ہوتا ہے۔ وہ نہایت ہی ابتدائی اور سادہ بھدی ترکیب پر اس طرح اظہار مسرت کرتا ہے جس طرح ایک ماہر فنکار کسی نادر اور انوکھے شاہکار کو دیکھ کر مسرور ہوتا ہے۔ اسی جذبے اور احساس کے زیر اثر بچے پھولوں کا ہار بنا کر خوش ہوا کرتے ہیں اور کسی بھدی نقل کو دیکھ کر آپے میں نہیں سماتے۔"[1]

لسانیات کا موضوع بڑا خشک ہے مگر ڈاکٹر صاحب اِس سے بھی بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ اُن کے انداز بیان نے اُس میں بھی دل کشی پیدا کر دی ہے "لسانی مسائل" میں اُن کا ایک نہایت گراں قدر مضمون ہے "اُردو رسم الخط" اس میں وہ دیوناگری کی خصوصیات دکھاتے ہوئے ہندی رسم الخط سے اُردو رسم الخط کا موازنہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اُردو رسم الخط کی دشواری بھی عین فطرت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:—

"دیوناگری کی تین خصوصیات ہیں:—

(۱) اس میں ماتراؤں کا استعمال ہوتا ہے (۲) اس کا ہر حرف دوسرے سے جدا لکھا جاتا ہے۔ (۳) ہر حرف پورا لکھا جاتا ہے۔

یہ تینوں خصوصیتیں کاروباری لحاظ سے ایسی ہیں جو دیوناگری کو اُردو کے مقابلے میں ناکارہ بنا دیتی ہیں۔ اِس لئے کہ موجودہ کاروبار کی ترقی کا دارومدار زود نویسی پر ہے۔ جس طرز میں زود نویسی نہیں وہ موجودہ کاروباری ہنگامہ زائیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اِس کے علاوہ کائنات و آفاق کا مطالعہ کیجئے۔ آپ کو کون و فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ نظر آئے گا۔ کائنات میں کچھ بسائط ہیں۔

---

[1] فلسفۂ کلام غالب صفحہ ۱۷۸ پہلا ایڈیشن

جو ترکیب پاکر رنگا رنگ شکلوں میں جلوہ افروزی کرتے ہیں۔ ترکیب کی حالت میں بسیط کی شکل بہت کچھ بدل جاتی ہے۔ کائنات کی جملہ رنگینیاں اور رعنائیاں ایسی ترکیب و تالیف کی شرمندۂ احسان ہیں یہی حال مفرد حرف کا ہے۔ بسیط آوازوں کی مفرد علامات ہیں۔ جس طرح آوازوں کی معجزانہ ترکیب سے الفاظ وجود میں آتے ہیں اسی طرح ان علامات کی تالیف سے عبارت کا وجود ہوتا ہے اور یقیناً وہی طرز تحریر حکیمانہ اور سائنٹی فک ہے جس میں وصل و فصل کے قاعدے فطرت اور کائنات میں عامل ترکیب و تالیف کے قوانین پر مبنی اور ان کے مطابق ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ اردو رسم الخط میں چونکہ حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے اور جوڑنے کے وقت اس کی پوری شکل باقی نہیں رہتی اس لئے اس کا پڑھنا دشوار ہوتا ہے۔ یہ دشواری کائنات کے مظاہر و مناظر کی دشواری ہے ؎

سہل را جستن دریں دیر کہن ایں دلیل آں کہ جاں رفت از بدن[1]

اِن اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا انداز نگارش کتنا سادہ، کتنا پُرزور اور کتنا جان دار ہے۔ خلوص اور راست گوئی دو اور عناصر ہیں جنھوں نے اُن کے اسلوب تحریر کو دل آویزی اور تاثیر عطا کردی ہے۔

شوکت سبزواری کی مکتوب نگاری

ڈاکٹر صاحب کا مکتوب نگاری میں کیا مقام ہے اِس کے اندازے کے لئے ایک خط درج ذیل ہے۔ یہ انھوں نے میرے خط کے جواب میں ڈھاکے سے لکھا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں: —

۸۔ ایف، عظیم پور اسٹیٹ، ڈھاکا

۲۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء

برادر عزیز!

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ کے مقالات کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے۔ اِس کی ایک کاپی ضرور بھیجئے شوق سے اس کا مطالعہ کروں گا۔ مجموعۂ کلام کے بارے میں کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ چھپوا کر ایک کاپی مجھے بھیج دیں۔ میں اِس پر مقدمہ لکھ دوں گا۔ اِس میں کچھ زیادہ وقت نہ لگے گا۔ اس کو بعد میں شامل کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں آپ کا مسودہ محفوظ رہے گا۔ عام طور پر یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے ڈھاکا یونیورسٹی کے اصول و ضوابط کے مطابق یہ ضروری ہے کہ آپ یہاں رجسٹر کرائیں اور

۱؎ لسانی مسائل اشاعت اول صفحہ ۲۷۶

باقاعدہ یہاں حاضر رہیں۔ وہاں رہ کر آپ مقالہ پیش نہیں کر سکتے۔

میری تازہ کتاب "اردو زبان کا ارتقا" چھپ کر بازار میں آگئی ہے۔ آپ اس کی ایک کاپی اپنے کالج کی لائبریری کیلئے خریدیں۔ اس پر تبصرہ اس ماہ کے نگار میں شائع ہوا ہے۔ ہندوستان کا پتہ اس میں درج ہے۔

شوکت سبزواری

شوکت صاحب کا خط بھی بڑا پاکیزہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خط پر موتی ٹانک دیئے گئے ہوں۔ سب الفاظ صاف، واضح اور بڑے۔ اس سے اُن کے دل کی کشادگی اور صفائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

شوکت صاحب کی ادبی حیثیت کا اعتراف | ڈاکٹر صاحب کی ادبی حیثیت کا اعتراف ڈاکٹر سید عبداللہ نے "اردو ادب کی ایک صدی" میں اور ڈاکٹر گیان چند نے لسانی مطالعے میں کیا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند کی رائے ملاحظہ فرمائیں

"اُردو ادب کے آغاز کے بارے میں ادیبوں نے نہ معلوم کیا کیا طوطا مینا اُڑائے۔ جب ماہرین لسانیات ڈاکٹر مسعود حسن خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس موضوع کو لیا تب کوئی مدلل بات سامنے آئی[1]"

اگرچہ ڈاکٹر شوکت سبزواری اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن وہ سرمایۂ علمی جو انھوں نے اپنے بعد چھوڑا ہے۔ اعتماد قیع ہے کہ تاریخ ادب میں اُن کا نام ہمیشہ سنہری حرفوں سے مرتسم رہے گا

---

[1] لسانی مطالعے صفحہ ۱۵ مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۷ سے آگے) ہر تحقیق طلب شعبہ کی طرح، توجہ کی طالب اور منطقیت سے محروم اور تکمیل سے عاری ہے۔ علم کی روشنی سچائی سے روشناس کرا کر انسان کی عظمت میں اضافہ کرتی اور کامیاب نظام عمل بنی نوع انسان کیلئے مرتب دینے میں مدد دیتی ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے فقط اسی قدر ملتجی ہیں کہ وہ ہر ہر طرح سے علم کی اس تحسین طلب ترقی میں مددگار رہیں اور اس کے حریت پسندوں کو حق کے علمبردار تسلیم کرتے ہوئے ان کی ہر قدم پر اعانت و حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔ شاید یہی ہماری خرد کی عظمت و دنیوی رہبری کا تقاضہ ہو۔

سیّارہ وسیم دُرّ دانہ باسط

ابوالفتح ضیاء الدین محمد عرف سیّد امجد حسین

خطیب و قاضی شش محال

(خان بہادر)

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

غالب کا یہ خیال سرزمین ایلچپور کے لئے بھی حرف بہ حرف صادق آتا ہے۔

سرزمین ایلچپور میں کتنے ہی اہل علم و ادب ہیں جو ناسازگاریٔ زمانہ کے ہاتھوں اپنے کلام کے ساتھ دفن ہیں۔ حالانکہ ان کا کلام اُنہیں زندۂ جاوید رکھنے کے لئے بہت کافی ہے سنہ ۱۸۲۵ سے سنہ ۱۸۵۳ کا زمانہ شہر ایلچپور میں علم و فن کا سنہری زمانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ برار کے قدیم تاریخی شہروں میں ایلچپور نہایت ہی قدیم شہر ہے۔ نہ صرف تاریخی حیثیت سے یہ اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ یہ برار کا مرکز علم و فن رہا ہے تاریخی حیثیت سے یہ شہر راجہ ایل سے لیکر مغلیہ دور سلطنت تک بہت عروج پر رہا انگریزوں کے دور کے آغاز میں بھی اسے کافی اہمیت حاصل تھی لیکن انگریزوں ہی کے ہاتھوں یہ قدیم شہر برباد ہوا۔

کھنڈرات بتاتے ہیں عمارت عظیم تھی، شہر کی وسعت، عظیم الشان عمارتوں کے کھنڈر ضعیف العمر حضرات (مرد و زن) کی زبان ان کی برجستہ گوئی الفاظ، تلمیحات۔ تشبیہات۔ و استعارات کا استعمال اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ شہر بارونق و باعظمت ادبی و علمی مجلسوں سے آراستہ تھا اور یہ غالباً صوفیائے کرام کے فیضان صحبت کا اثر ہے کہ نسلاً بعد نسل چلا آرہا ہے کہ آج بھی یہاں کے لوگ مذہب پرست اور قناعت پسند نظر آتے ہیں ہر مذہب و ملّت کے لوگ مثلاً ہندو، مسلم، شیعہ، سنّی۔ مہدوی وغیرہ سب یکجہتی کے ساتھ رہتے ہیں ؎

مہ و انجم پہ اس مٹی کے ذرے مسکراتے ہیں — زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

دکن اور دہلی کے درمیان رشتہ استوار کرنے میں ایلچپور کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور اسی دوران یہاں فارسی ترکی اور عربی زبان آئی اور مُروّج بھی ہوئی۔ یہاں کی قدیم اردو زبان پر دکنی اور اطراف دلّی کی زبان کا اثر اب بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً اب بھی یہاں کے عوام اور اکثر ضعیف العمر

(مردود نہ ن) تک کو "تک"، "آگی جو"، "آجا گو" کب تک کو "کد گو" جب کو "جد"، "تین" سے "کو سوں"، سید کو "میست"، "ہجت" وغیرہ الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

شاہ دولہ رحمٰن غازی راجہ ایل کے ظلم و تشدد کا خاتمہ کرنے کے لیے غزنی سے اپنی شادی کی تقریب کو چھوڑ کر یہاں تشریف لائے طرفین میں گھمسان کی جنگ ہوئی لیکن فتح شاہ غازی کے ہاتھ رہی ان کے ہمراہ اکثر صوفیائے کرام بھی تھے۔ مثلاً قدوۃ الشہدا سید عبدالملک مثنیٰ جو ۳۹۲ھ میں شاہ موصوف ہی کے ہمراہ یہاں تشریف لائے تھے یہی ابوالفتح ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب کے جدِ امجد تھے۔ علاؤالدین خلجی کے بعد محمد تغلق کا داماد سرتیز ترکمان جب یہاں آیا اور ایلچپور میں جامع مسجد تعمیر کی اور اس کی خطابت حافظ عبدالجلیل خطیب کے سپرد کی جو چھٹی پشت میں عبدالملک مثنیٰ کی اولاد تھے اسی مسجد کی خطابت آج تک انہیں کی اولاد کو ملی ہے۔

آج بھی سید اکرم حسین خطیب سید امجد حسین صاحب کے پوتے خطابت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

عبدالملک مثنیٰ کا سلسلہ نسب دسویں پشت میں حضرت سید زین العابدین، حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے پوتے سے ملتا ہے۔ ابوالفتح ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب کے متعلق اگر کہا جائے کہ ہمہ خاندان آفتاب است تو بیجا نہ ہوگا۔ اوپر کی دس پشتوں کی خوبیوں کے بیان سے تو زبان قاصر ہے لیکن عبدالملک مثنیٰ سے ابوالفتح ضیاء الدین محمد تک بھی جتنے حضرات گذرے ہیں ان میں اکثر زاہد، محدث، حافظ، عابد اور صوفی منش تھے۔ مثلاً سید محمد خلیل خطیب جو سید جلیل خطیب کے لڑکے تھے ان کی بیوی شاہ سید غلام حسین کی ہمشیرہ تھیں، حضرت شاہ سید غلام حسین اس زمانے کے بہترین صوفیائے کرام سے تھے۔ انہیں قطب وقت، فرید دہر، ولی کامل، رونقِ بلدہ ایلچپور کہا جاتا ہے۔ یہ صاحب دیوان تھے ان کا دیوان دیوانِ حسین کے نام سے موسوم ہے

نظام ثانی حیدرآباد جب ایلچپور تشریف لائے تو اس محل میں ٹھیرے جس کا نام دل بادل ہے اور آج میونسپلٹی کے لئے استعمال ہوتا ہے اس وقت سید محمد خلیل خطیب کی گود میں اپنے فرزند عبدالخالق کو تبرکاً ڈالا اور مسجد پر جو چار سیڑھی ہے اس کو روپیوں سے مفروش کر کے انہیں بطور نذرانہ پیش کیا اور بوقت عیدالفطر جب خطیب سید محمد خلیل صاحب نے خطبہ دیا اور اس میں شاہانِ آصفیہ کی مدح میں اشعار کہے تو خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا۔

اِس خلعتِ شاہانہ کے چند پارچہ جات آج بھی خطیب صاحب کے پاس موجود ہیں۔ ابوالفتح ضیاء الدین محمد عرف سید امجد حسین خطیب نہ صرف صوفی منش تھے بلکہ بلند پایہ شاعر اور مورخ بھی تھے۔ ان کا دیوان "دیوانِ امجد فی مدح احمدؐ" اپنے زمانہ میں مقبول خاص و عام رہا ہے۔ یہ دیوان اہل علم حضرات کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ ان کے قصائد ضعیف العمر حضرات کی زبانی محفل میلاد میں اکثر سنائی دیتے ہیں۔ ان کا کلام جو نعت میں ہے اس زمانہ کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک قصیدہ میں اس قصہ کا ذکر ہے جب حضور صلعم رات کے وقت ہر چار صحابہ کرام کے ہمراہ مقداد کے گھر پہنچے اور آواز دی اور آپ کے جواب میں مقداد نے جو کہا اُسے یوں منظوم کیا ہے سہ

یہ در پہ مرے کون کھڑا چاند سَری کا	یہ چاند تو ہے مہر درخشاں سَری کا
اِس رات اندھاری میں غریبوں کے سرانے	ہے کون کھڑا شمع شبستان سَری کا
آنے سے تمہارے مری دہلیز کا رتبہ	اے فخر رُسل ہوگیا کیوان سَری کا
اطراف میں ہیں چرخِ ہدایت کے ستارے	اور بیچ میں ہے خود مہ تاباں سَری کا

یہ دیوان نعت میں ہے اور اکثر تلمیحات و تشبیہات احادیث و آیاتِ قرآنی سے لی ہیں۔ بعض قصائد میں تو شاید ہی کوئی شعر ایسا ہوگا جس میں تلمیح نہ ہو مثلاً ایک قصیدے کے چند اشعار پیش ہیں سہ

صورتِ حق لاریب فیہا ہست فرمانِ رسولؐ	شاہد است انّا فتحنا بر عزتِ شانِ رسولؐ
	(سورہ فتح) (مازاغ البصر)

دیوان کا پہلا قصیدہ ہے سہ

مبارک باد دنیا میں اب ایسا مہ جبیں آیا	کہ جس کے حُسن کے خرمن میں یوسف خوشہ چیں آیا
چراغ خانۂ ایزد مکینِ خانقاہِ کُن	مکانِ لامکاں جس بادشاہ کا شہ نشیں آیا
رکھا اور رنگ پر کنت نبیاؐ کے قدم اس نے	مقام حضرتِ آدم ابھی تک ماء طیں آیا
اس قبائے تنگ کا سُن حال یہ کہتا ہوں میں	مس جسم پاک سے اسعد قبا تھی میں نہ تھا

اِس حدیث کی طرف اشارہ ہے (اس شعر میں) جَبْهَةٌ رُوْمِيَةٌ ضَيْقَةٌ الْمكين۔

آپ کی تشبیہات۔ تلمیحات کو دیکھ کر محسن کاکوروی کی مثنوی چراغِ کعبہ اور صبح تجلی یاد آتی ہے ان مثنویوں میں محسن نے بھی احادیث و آیاتِ قرآنی ہی سے تلمیحات و تشبیہات اخذ کی ہیں اور یہی چیزیں سید امجد حسین خطیب کے بے پناہ مذہبی معلومات اور عربی پر دستگاہ کا ثبوت

ن ہیں۔ خطیب صاحب نے اکثر قصائد عربی اور فارسی میں بھی کہے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل
ہے کہ انہیں اردو کی طرح عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ عربی زبان میں
قصیدہ کہا ہے۔ جس کے تین اشعار پیش ہیں ؎

الہٰی الہٰی بفضل العیمم | اَرِنی دیارُ الرسول الکریم
وان نلت یومًا الیٰ طیبۃ | تبلغ سلامی الیہ النسیم
نقولی لہٗ انا عبدک | فی الارض البرار بحال یحیم

فارسی قصیدہ

صبا ز جانب ما گو حبیب رحمٰن را | کہ تا بکے نہ نمائی جمال مستان را
برآنہ روضۂ اقدس کہ عاشقاں ہرسو | نمودہ فرش رہت پردہ ہائے چشماں را
نسیما جانب بطحا گزر کن | زاحوالم محمد را خبر کن
بگو اے بادشاہ ہر دو عالم | مرا از روضہ ات شام گزر کن

وہ پوربی زبان پر بھی قادر تھے اور اس میں شعر کہتے تھے۔ دو شعر ہیں ؎

جگ موہن ام کرا کو یا سی گیو بیت مکدّس آنن میں
سبحان الذی اسریٰ سے موہے وا کی کھتبر کر آنن میں
آدم ستی یا عیسیٰ نبی سگرو ہی پکار ہیں گے نفسی
پر موہے نبی سلطان رسول کہیں امتی اس میدانن میں

خطیب صاحب کی زبان صرف نعتِ رسول ہی کے لئے تھی انہوں نے مسدّس، مخمس، تظمین،
مثلث جس صنف میں بھی قلم اٹھایا وہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے اوصاف
حمیدہ تھے ایک بار نواب یونس خاں صاحب نے محل میں حوض کے سامنے آپ کو تخت پر بیٹھا کر
ولم صاحب کو جو اس عہد میں ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر فائز تھے اور خطیب صاحب کے کسی کام
پر خوش ہو کر انہیں سلامی دی تھی اس وقت خطیب صاحب نے اپنی لکھی ہوئی نعت جو انہیں بہت
پسند تھی۔ عبدالرحمٰن صاحب شکاری خوش الحان کی زبانی سنائی تھی۔ آپ نے شیخ عبدالقادر جیلانی،
امیر خسرو، مولانا قدسی علیہ الرحمۃ حضرت سعدی شیرازی، مولانا کافی علیہ الرحمۃ بھائی رحمۃ اللہ علیہ کے
قصائد پر تظمین کہی ہے۔

مثلاً: —

تضمین مخمس بر کلام حضرت غوث الاعظم دستگیر قدس سرہ

میں ہوں ڈوبا ہوا بچارہ بدی　　طاعتِ حق ہوئی نہ مجھ سے کدی
اور سر پر اجل کھڑی ہے جدی　　یا حبیب اللہ خذ بیدی
مابعجزی سواک مستندی

اے مرے بادشاہ اے مفترح　　ہے تری ذات ارفع الارفع
کون ہے تجھ سوا مرا مجزع　　کن رحیما لذلتی والشفیع
یا شفیع الوریٰ الیٰ الصمدیٰ

"تضمین دوہرہ"

کہو اس بد رعالم سے کہ جب سے تو سدھارا ہے　　پڑا چاروں طرف عالم میں اس دن سے اندھارا ہے
تمہاری یارسول اللہ مجھے فرقت نے مارا ہے　　نیہہ لگو سندر سین اور نا جانے کوئے
یا جیو جانے اپنا یا جن لاگے سوئے

ہمارے دیکھتے صدہا مدینہ دیکھ آتے ہیں　　یہیں بیٹھے ہوئے کمبخت ہم افسوس کھاتے ہیں
نہ یاں رہنے کی طاقت ہے نہ واں جانے کا یارا ہے　　جن ڈھونڈیاں تن پائیاں گہری پانی بیٹھ
میں بودی ڈوبن ڈری رہی کنارے بیٹھ

مسدس ترجیع بند بر شعر سعدی شیرازی

عزیزو حشر میں جیدم خدا ہو ویگا خود سلطاں　　جنابِ مصطفائی کو ملیگا منصبِ دیواں
یہیں اللہ پر حضرت نشستہ ہوں گے با صد شاں　　کہوں گا دستہ بستہ ہو کے میں تم پر سے ہوں قرباں
چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیباں
چہ باک از موج بحر آنرا کہ باشد نوح کشتیباں

ایک پورا قصیدہ جس میں ۲۵ اشعار ہیں سب بے نقطہ ہے۔ صرف مقطع میں نقطے ہیں ۔

محمدؐ سرور و سردار عالم　　محمدؐ مالک و سالارِ اکرم
محمدؐ مالک اسرار مولا　　محمدؐ سرگروہ ولد آدم
محمدؐ حامد و محمود و مسعود　　محمدؐ کو ہمہ عالم مسلم

محمد اور و وار کل کا — محمد اکمل و اولاد آدم

محمد دادگر دار الحکم کا — لوائے الحمد کا سردار محکم

وہ مالک کل کا اور کل اسکا مملوک — کلاہ کلک کل اس کو مسلم

ہوا مولود وہ سردار کل کا — ہوا کسریٰ کا گھر اسدم مہدم

لگا روح عدو کو رمح اس کا — ہوا مہدوم ہر سطر و داس دم

سوار راہوار راہ ہموار — عمامہ مہر اللہ کا معمم

علوم اللہ کل معلوم اس کا — دوام اللہ اعلیٰ کا معلم

ہمام حومۂ اسرار احمد — سوار ادھم براک و ارحم

محمد گوہر لولوء لالا — کلوم دل کو اس کا رحم مرہم

کلام لا الہ کا مکلم — وہ مورد سورۂ طاہا کا ادرعم

درود لاعد واللہ کا اس کو — الی سر الدہر رسول ہر دم

محمد عروس در مطہر — محمد علم اللہ کا محکم

محمد صدر رسل ماہ کامل — علم وہ اور ہمہ عالم ہوا کم

حسام و کلک کا مالک محمد — ہوا ملک صمد اس کو مسلم

مراحل سر طے وحلیں ورد اکو — دکھا مسلک رسول اللہ مکرم

علمدار لوا الحمد واللہ — امام کل عوالم اور آدم

مدار دور عالم مورد کل — رسول اللہ وہ مار گل آدم

محمد حومہ رسل کا سردار — امام کل ملک صدر مکرم

گل احمد درود ار احمد — دوار در صل اللہ وسلم

درود اللہ کا اس ماہ سما کو — رواج دہر ہوا اصل دکادم

لکھا واللہ رسول اللہ کا احوال — رسول اللہ کا مملوک اسدم

رکھا کل مہلہ ہر گھر کا معرع — محمد کا سدا مملوک محکم

لکھا بے نقط امجد نے قصیدہ
وصلی اللہ علی احمد وسلم

ان کے اکثر اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ انہیں حضور صلعم سے بہت لگاؤ تھا ان کے اشعار عشق احمدیں

ڈوبے ہوئے ہیں) سے

صبا نہیں ہے مجھے لطف یاں کے جینے میں — خدا کے واسطے لے چل کہیں مدینے میں

نصیب ایسا بھی روز ہوگا زیارت حضرت کی کرکے حاصل — جبیں کو چوکھٹ پہ ان کے گھس کر نقوش عصیاں مٹائیں گے ہم

سید امجد حسین خطیب صوفی منش تھے کلام تو تصوف میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ان کی زندگی بھی صوفیانہ تھی۔ باوجود دنیوی مال و دولت کے وہ نہایت سادہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی زندگی لفظ فقیر کی اصلی معنوں کی آئینہ دار تھی۔ ف سے فاقہ، ق سے قناعت، ی سے یاد الہٰی، ر سے ریاضت۔ غذا سادہ کھاتے اکثر روزہ رکھتے۔ کپڑا بھی زیادہ قیمتی نہ پہنتے لباس میں پاجامہ انگرکھا ململ کا ہوتا۔ ململ کی پگڑی نماز پنجگانہ کے علاوہ سنا ہے کہ تہجد اور تلاوت قرآن کے بھی پابند تھے۔ جامع مسجد ایلچپور میں ایک دینی مدرسہ بنام "مدرستہ الجامع" قائم کیا تھا۔ جس سے کئی حفاظ اور عالم نکلے مسجد سے باہر لنگر خانہ تھا۔ جہاں ہر روز کھانا پکتا تھا اور غریبوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ آپ کی میلاد کی جماعت تھی جس میں خوش گلو حضرات شامل تھے۔ آج بھی ان کی جماعت سے عبدالرحمن شکاری بقید حیات ہیں اور اکثر حالات مجھے ان سے حاصل ہوئے ہیں۔ آپ جید عالم تھے۔ آپ کی محفل ہمیشہ صاحب علم و ادب حضرات سے گرم رہتی تھی۔ دور دراز سے تشنگان مذہبی مسائل آپ کے پاس آتے اور اپنی پیاس بجھاتے۔ آپ آفتاب برار کے لقب سے مشہور تھے۔ ۱۸۳۰ء میں تولد ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں ۲۰ر ڈسمبر کو انتقال کیا۔ قبل از وفات سرکار انگریزی سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا۔ جو بعد میں ان کے فرزند اکبر سید عظمت حسین صاحب خطیب کو عطا کیا گیا۔ ان کے والد سید اشرف حسین خطیب بھی حافظ قرآن تھے۔

مندرجہ ذیل اقتباس سید امجد حسین کے شجرۂ نسب سے لیا گیا ہے:۔

"در عمر بیست پنج سال از مولوی سید محی الدین صاحب مغربی در عمل نواب غلام حسین صاحب خان بہادر که در ایلچپور از طرف سرکار آصفیہ میر عدم ضلع برار رشدہ آمدہ بودند تحصیل علم کردند در ہمہ علوم علم فرائض کامل حال گرفتند و سنہ ۱۲۷۰ھ در سرکار انگریزی بواجب یکصد و بست پنج روپیہ بہ منصب منصفی قصبہ آکوٹ منصوب شدند بعد رحلت والد ماجد (سید اشرف حسین) سنہ ۱۲۷۶ھ ترک روزگار نمود از ماموں صاحب خود یعنی حضرت شاہ محمد منیر اللہ قادری ساکن قصبہ ملا نا عمامہ خلافت بر سر بستہ بجائے والد بزرگوار خود مسند نشین شدند و در سنہ ۱۲۸۵ھ کتاب لاجواب "تاریخ امجدی یعنی تواریخ برار تصنیف کردہ تمام برار را گویا آئینہ نمودند اگر چوں جام جم تصور نمایند سزا و بجا است در صلۂ تصنیف

ڈاکٹر احمد سجاد

عظمتِ اقبال کی بنیادیں

"یہ ہماری پوری ثقافت کی کیفیت ہے کہ اس کے مختلف اجزا اپنے اپنے دوائر کے اندر مقید ہیں۔ اس کی دینیات، فلسفے، سائنس اور ادب سے تغافل کر رہی ہے۔ اس کا نتیجہ فلسفہ سائنس سے بے خبر ہے اس کی سائنس فلسفے سے جاہل اور ادب سے نفرت کرتی ہے۔ اس کے تعلیمی نصاب یونانی کے علم نحو اور "قدما کی دانش" کے سوا ہر چیز سے بے خبر ہیں۔ اس کا عام ادب دلالی اور ترقم ساقی کے فنون کے سوا اور ہر شئے سے جاہل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قدرتی حالت و کیفیت نہیں بلکہ غیر معمولی شکل ہے اور ہمارے موجودہ ذہنی نشو و ارتقا کی ایک مکروہ بدصورتی ہے[1]۔"

اقبال کی شخصیت اور شاعری اس ... کاری، تنگدلی، تعصب، دلالی اور عصری فیشن پرستی سے پاک ہے۔ اس لئے مذکورہ مکروہ بدصورتی اور فرسودگی کے بجائے اس میں جدت و تازگی، ہمہ گیر تخلیقی توانائی، تہذیبی قدروں کو نئے اور جدید پیرائے میں جمالیاتی انداز سے پیش کرنے کا شدید احساس ہے اور یہی اس کی عظمت کی بنیاد ہے۔

اردو شعر و ادب میں اقبال کی عظمت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ اس کا مطالعہ کرنے والے اپنے اپنے ذوق نظر کے مطابق اسے ایک فلسفی، حکیم، صوفی، صاحب عشق یا قومی شاعر، ملی شاعر، سیاسی شاعر اور لیڈر کی الگ الگ حیثیت سے ان کی بزرگی تسلیم کرتے ہیں جب کہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اقبال کی شخصیت بیک وقت ان تمام حیثیتوں کی جامع تھی۔ یہ ہمہ گیر اور جامع شخصیت ان کی شاعری میں ظاہر و باہر ہے۔

اقبال کی دینداری و مذہب پسندی مریضانہ و منفی نوعیت کی نہ تھی۔ اپنی فکر صحیح کی وجہ سے وہ ضمیر مغرب کی تاجرانہ روش اور ضمیر مشرق کے راہبانہ طرز سے بھی نالاں تھے۔ وہ ایک طرف ملاؤں اور بے بصر صوفیوں پر طنز کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف مغرب زدہ مرطوں اور اشترا کی کوچ

---

[1] تشکیل انسانیت" از رابرٹ بریفالٹ ص ۳۹۲

گردوں کو بھی نہیں بخشتے۔ عقل و فلسفہ کو خداداد نعمت سمجھنے کے باوجود چونکہ اس کی تقدیر میں
حضور نہیں لہٰذا وہ اسے چراغ راہ سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں۔ اس کے مقابلے میں عشق و
یقین اور خودی سے آگ گلزار بن سکتی ہے اور تقدیریں پلٹی جا سکتی ہیں۔ اگر سائنسی ترقیوں کو
سراہتے ہیں تو اس کے یکسر خاتمے سے بیزار بھی ہیں اور اظہار تشویش کرتے ہیں کہ بجلیوں پر قابو پانے
والے کسی دن اپنے آشیانے ہی کو نہ پھونک دیں۔ اسی طرح موجودہ نظام تعلیم، ادب اور فنون لطیفہ
کے بارے میں بھی انہوں نے اپنی واضح رائے پیش کی ہے اور صاف کہا ہے کہ آج یہ امتوں کی
ذلت و رسوائی کا ذریعہ ہیں ؂

گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر　　وائے صورت گری و شاعری و نائے و سرود

موجودہ ادبی ماحول میں جب کہ نئی علامتوں، الفاظ کے نئے تلازموں، نئے امیج، نئے منظر نامے
اور نئی فضا کا عام چرچا ہے، ادب میں نظریہ کو جرم عظیم سمجھا جا رہا ہے کلام اقبال کے ان ہمہ گیر افکار
شاعرانہ پر کسی کو انگشت نمائی کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں اس کی
وجہ ظاہر ہے یعنی اقبال کی شاعرانہ فطرت اور حکیمانہ طبیعت میں کچھ اس طرح کا امتزاج پیدا
ہو گیا ہے کہ ان کے افکار جذبات اور ان کے جذبات افکار معلوم ہوتے ہیں۔ ادبی تخلیق کی دنیا
میں یہ مسلمہ امر ہے کہ اگر کوئی موضوع شاعر کی داخلی شخصیت اور اس کے نجی تجربے سے ہم آہنگ
ہو کر تخلیقی مراحل طے کرے اور مواد و ہیئت کا حسین اور فطری امتزاج بروئے کار آجائے تو ایسا فن پارہ
نہ کبھی پرانا ہو سکتا ہے نہ مستقبل اسے نظر انداز کر سکتا ہے ؂

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو　　عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

کلام اقبال کی عظمت کا راز اسی ادبی نکتہ میں مضمر ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا اقبال کی شخصیت اور ان کا فن اس قدر پہلو دار اور حیرت انگیز ہے
کہ کسی چھوٹے سے مقالے میں ان کی عظمت کی تمام بنیادوں کی واضح نشاندہی ممکن نہیں۔ پھر بھی
اجمالی جائزے کے لیے اس نابغۂ عصر شخصیت کی دو اہم ترین بنیادوں کا سرسری مطالعہ ضروری ہے
ان میں سے ایک فنی و ادبی بنیاد ہے

اور دوسری فکری و اخلاقی۔

اقبال کی فنی و ادبی حیثیت کو فوقیت و اولیت دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہی ان کی عظمت کی
اصل بنیاد ہے۔ فکر و فلسفہ اور مذہب و اخلاق کے ضمن میں انھوں نے جو کچھ پیش کیا ہے چند

مستشرقات سے قطع نظر سب کچھ شعروادب ہی کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اسی پیرایہ گلنار اور حسن بیان نے آج بھی ایک جہان کو اپنا دالہ وشیدا بنا رکھا ہے۔

یوں تو اقبال نے خود کو شاعر کہلانا کبھی پسند نہیں کیا اور ایک زمانے میں شعر کہنا بھی ترک کر دیا تھا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شاید کسی وقتی تاثر کا رد عمل تھا۔ ان کے دوست سر عبدالقادر انہیں دوبارہ شعروسخن کی طرف مائل نہ بھی کرتے جب بھی انہیں جلد ہی خود بخود اس کوچے میں دوبارہ آنا ہی پڑتا کیوں کہ ان کا مزاج اور ان کا پورا وجود شاعرانہ اور خالص شاعرانہ تھا۔ چنانچہ خود کو شاعر نوا، محو ترنم بلبل اور شاعر آتش نوا کہنے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کی۔ حد تو یہ ہے کہ ایک جگہ شاعری کو ملی زندگی کا جزو لازم قرار دیا ہے ؎ ملتی ہی شاعری ابناؤ گل

ان کے نزدیک شاعر دلنواز کی کھری بات مزاج زندگی کو ہرا بھرا رکھتی ہے اور خون جگر سے سینچی ہوئی شاعری زندگی کو دوام بخشتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے اردو فارسی کلام میں شعروسخن کی دیوی اپنے حسن کی تمام حشر سامانیوں اور نیرنگیوں کے ساتھ جلوہ فرما ہے۔ ان کی شاعری میں ایلیٹ کی پیش کردہ تینوں آوازیں موجود ہیں۔ بانگ درا کی ابتدائی نظموں اور غزلوں میں خودکلامی کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ مگر ایک عظیم شاعر کے لئے یہ پہلی آواز دراصل اس کے فنی ارتقا کا پہلا زینہ ہوتی ہے چنانچہ دوسرے مرحلے میں جہاں سے قومی و وطنی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمیں کلام اقبال میں شاعری کی دوسری آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ اس مرحلے سے ان کا فکری اور مقصدی رنگ با انداز جمال سامنے آنے لگا۔ شاعر نے آس پاس کے حلقے اور قوم و ملک اور ملت سے خطاب کرنے میں اپنی تہذیب و معاشرت، تاریخ اور ظرف و ذوق کے مطابق فکری و عقلی اور فلسفیانہ لب ولہجہ اختیار کیا۔ یہاں سے آل احمد سرور کے الفاظ میں ان کے یہاں زندگی کے تجربات بہت جلد پیمبرانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ پیمبرانہ رنگ اپنے فلسفیانہ ذوق، سماجی شعور، اخلاقی ذہن اور مقصدی آہنگ کی وجہ سے بڑا رفیع و جلیل ہے۔ اس کی وجہ سے انجمن میں خلوت کا احساس رہتا ہے۔ اس کی وجہ سے شمع محفل کی طرح سب سے جدا ہو کر سب کا رفیق رہنے کا جذبہ نمایاں ہو جاتا ہے ؎

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو　　آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

تیسری آواز جہاں سے شاعر ڈرامائی کردار ڈھالتا ہے۔ ان کے مرد مومن، مرد کامل اور صاحب خودی کی روح کی ان کہی آوازیں گونجتی ہیں، عجب ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ خضر راہ

ساقی نامہ، شمع و شاعر، جاوید نامہ، مسجد قرطبہ، میلادِ آدم اور ابلیس کی مجلس شوریٰ میں جو مصوری اور مکالمات پیش کیے گئے ہیں انہیں دنیائے شاعری میں بے نظیر اور لافانی شاہکار قرار دینا ادبی دیانتداری کا عین تقاضا ہے۔ ان نظموں میں فن کار نے فکر و خیال کے حجم کو شاعرانہ لطافت اور معجز بیانی میں اس طرح حل کر دیا ہے کہ سوائے فن کے دوسری چیزیں گویا معدوم ہو جاتی ہیں مگر معدومیت کے باوجود ان کے وزن و وقار سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

ان نظموں کی تخلیقی توانائی نے اردو دنیا کو ایک نئے شعری ذائقے اور جدید طرز احساس سے ہمکنار کیا۔ اپنے زمانے کے اعتبار سے انھوں نے فرسودہ ادبی اقدار میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کی نئی اقدار کی جستجو اور ان کی پیشکش کے لحاظ سے ہیئت میں بعض چونکا دینے والے تجربے کیے۔ اس سلسلے میں بعض حضرات انگریزی فارسی اور اردو شعرا سے اکتساب فن پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ اس میں کسی قدر سچائی بھی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے کسی کی تقلید جامد نہیں کی۔ پیرزادگی کی بھی نہیں کیوں کہ رسم عاشقی میں سب سے الگ بیٹھنا ہی صاحب عشق کا کمال ہے اور ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

شاعر نے ملی و اجتماعی انقلاب کی خواہش، فکری صلابت اور عظمت آدم کے تصور کو انفرادی طرز احساس بنا کر پیش کیا۔ فکر و نظر کی حرارت کو نئے استعارے، نئی ترکیبوں اور رمز و ایما کو اس طرح پیش کیا ہے کہ نصف صدی سے بار بار کے مطالعہ کے باوجود اس کی جدت و تازگی میں ہنوز کوئی کمی نہیں آئی۔ مثلاً: ــ

"عہد گل، سازچمن، دماغ فتنہ تراش، نوائے سوختہ در گلو، حکایت غم آرزو، اندیشۂ تاریک، حدیث ماتم دلبری، نے نوازی، آتش رفتہ، صورت گل، دست صبا، گردش سیارہ کی آواز، تجلۂ جام، ادا رحیل کارواں، درماندہ رہرو کی صدائے دردناک طبیعت دیدہ کار۔ بال جبرئیل۔ تاثیر کا سائل۔ اسی طرح چاند کی کھیتی سے گہر پانا، بدن کو بیدار کرنا، مانند سحر رونا دشت جگر تاب کی خاموشی فضا۔ جیسے بے شمار الفاظ کے تلازمے، اشارے کنائے اور علامتیں ملتی ہیں جن میں اقبال کا نیا آہنگ اس کے مزاج اور لب و لہجے کی ندرت کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

غالب نے اپنے بارے میں ایک جگہ کہا تھا کہ ؎ میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

مگر راقم الحروف کے خیال میں یہ مصرع اقبال کی فکری بنیادوں پر زیادہ صادق آتا ہے۔

کیوں کہ انھوں نے آدمیت، انسانی اخلاق و شرافت، مساوات، خودی، عقل و عشق کے امتزاج، مردکامل اور روحانی مادیت کا جو بلند ترین آئیڈیل پیش کیا ہے وہ موجودہ مادہ پرستانہ اور خدا بےزار معاشرہ میں فی الحال بے جوڑ محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے سو پچاس برسوں کے بعد جب دنیا مادّی اور عقلی کاوشوں سے تھک کر دینی و روحانی اقدار کی طرف پیش قدمی کرے تب فکر اقبال کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔ یہ کوئی انہونی سی بات نہیں تاریخ عالم میں بہت سے مفکر اور فنکار ایسے بھی گزرے ہیں جن کے فکر و فن کی قدر افزائی صدیوں بعد ہوئی ہے۔

اقبال کی فکر کی بنیادوں میں بڑی گہرائی و گیرائی ہے وہ غوری اور سطحی پہلوؤں کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

اس حقیقت میں بینی نے انہیں وہ بصیرت اور نکتہ سنجی عطا کی جس سے اردو کے دوسرے شعرا کا دامن تقریباً خالی ہے۔ چنانچہ اسلام جو ان کے فکر کا بنیادی محور ہے اسے خشک واعظانہ انداز میں محض حصول جنت اور بخشش گناہ کے لیے کبھی پیش نہیں کیا بلکہ خالصتاً انسانی و اجتماعی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ:-

"یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ انفرادی اور نہ پرائیوٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام نسلی امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔"

انہوں نے مغرب کی مادہ پرستی، مشرق کی رہبانیت اور مریضانہ دینداری دونوں کو ہدف ملامت اس لیے نہیں بنایا کہ خواہ مخواہ اپنی بات منوانی ہے بلکہ دونوں دنیاؤں کے حکماء و فلاسفہ کا براہ راست مطالعہ کرنے اور ان کی خوبیوں و خامیوں کو بچشم خود دیکھنے اور پرکھنے کے بعد یہ کہا کہ ؎

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت یہ سیاست یہ تجارت — جو کچھ ہے وہ ہے فکر ملوکانہ کی ایجاد

کسی شخص کو اقبال کے ان تصورات سے انکار ہو سکتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے ذاتی طور پر جو حق سمجھا اسے پوری ایمانداری اور نیک خلوص و دیانتداری کے ساتھ پیش کر دیا۔ فکر اقبال کی عظمت کا اس لیے بھی قائل ہونا پڑتا ہے کہ رفتہ رفتہ عالمی رجحانات میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں وہ بہت حد تک ان کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہیں۔ ورنہ عظیم

مورخ ٹوائن بی کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ: —

"دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیا ہے"

اور نہ ڈاربسی (D'ARCY) کو اس احتجاج کی ضرورت تھی کہ: —

"ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عالمی، اخلاقی، مذہبی، ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔"

اقبالؔ نے اسی اعتراف حقیقت کو تو ان الفاظ میں پیش کیا ہے —

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی		جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

چنانچہ آج تو اقبالؔ کے اس خیال کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ جس طرح آنکھ کے لیے سورج کی روشنی ضروری ہے اسی طرح عقل کے لیے وحی کی روشنی لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تصور توحید و رسالت محض پوجا پاٹ یا گیان دھیان قسم کی کوئی چیز نہیں، وہ تو توحید کے نرے نظری تصور کو بھی برا سمجھتے ہیں۔ —

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی		آج کیا ہے؛ فقط اک مسئلہ علم کلام

آگے چل کر اپنے تصور دین کو ۱۹۳۲ء کی آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں اس طرح پیش کیا ہے۔ —

"جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور بندوں میں صرف کر دے۔ اس دین قیم کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ دین اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں جس میں انسانی سوسائٹی مادوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روح کی مساوات پر قائم ہو۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ؕ"

اقبالؔ کی اخلاقی و مقصدی شاعری کی اپنی ایک مخصوص جہت ہے جو مذہبی اوامر و نواہی یا محض آداب و شائستگی تک محدود نہیں بلکہ اسے وسیع تر معنوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے دراصل اخلاق کو نوع انسانی کے اعلیٰ مفادات، مادی و روحانی ترقی، راحت و مسرت، تناسب و توازن، حسن و جمال، عدل و انصاف، جماعت و افراد کے درمیان ہم آہنگی اور اسی طرح کی دوسری اعلیٰ انسانی اقدار کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ غور کیا جائے تو ان وسیع معنوں میں اخلاق کا یہ تصور نہ صرف اردو شاعری بلکہ دنیا کی شاعری میں مشکل سے کہیں اور نظر آئے گا۔ انسانی مساوات، روحانی مادیت، جہد مسلسل،

حصولِ آرزو کی جگہ تخلیقِ آرزو پر زور، دردمندی، اشتیاق اور تڑپ ہر جگہ یہی اخلاقی و مقصدی روح جاری و ساری نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم اقبال کی شاعری کو محض اخلاقی شاعری نہیں بلکہ تخیلی، جذباتی اور عاشقانہ شاعری بھی کہہ سکتے ہیں اور اس حقیقت کو تو اب بلا لحاظ مذہب و ملت سبھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اقبال کی مسلمانی ان کی شخصیت کو محدود نہیں کر دیتی بلکہ انہیں عالمگیر شخصیت بخش دیتی ہے۔ کیوں کہ ان کا اسلام ساری نوعِ انسانی کا مذہب ہے اور ملتِ اسلامیہ انسانیت کا خلاصہ اور اس کا آئیڈیل ہے۔ یہاں یہ واضح ہو کہ "انسانِ کامل" کا تصور نِٹشے سے ماخوذ نہیں بلکہ بقول محمد ہادی حسین "انسانِ اخلاقی" کی ایک مثالی شبیہ ہے جو خدا کے تخیل کا وہ شاہکار مطلوب ہے جس کے وجود میں لانے کے لیے اس کی ساری تخلیقی قوتیں ازل سے معروفِ کار ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ تخیل اور اخلاق، فکر اور فن کار کا اتنا گہرا جذباتی تعلق اور اس بلند سطح پر سوائے ڈانٹے کی "طربیہ قدسیہ" کے دنیا کی شاعری میں اور کہیں دکھائی نہیں دیتا ؎

تہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ٹینی سن نے غلط نہیں کہا ہے کہ جس شاعری سے ملت کا دل قوی ہو اور اس کی ہمتیں بلند ہوں اس کو اعلیٰ درجے کے اعمالِ حسنہ میں شمار کرنا چاہیئے اور مزید یہ کہ اگر انہیں خونِ جگر اور جذبِ دروں کے ساتھ پیش کیا جائے تو اسے اعلیٰ درجے کی شاعری میں بھی شمار کرنا چاہیئے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۲۶ سے آگے)

کتاب از سرکار انگریزی دو صد پنجاہ روپیہ انعام عطا شدند و نہایت تحسین و آفریں گشت۔

۱۸۶۲ء میں آپ کے خسر صاحب یعنی سید غلام حسین احمد عرف مدار بخش قاضی شش محال کا انتقال ہوا۔ انہیں کوئی اولادِ نرینہ نہ تھی۔ بجز خطیب سید احمد حسین صاحب چونکہ خطیب صاحب موصوف جید عالم اور مصنف بھی رہ چکے تھے۔ باشندگانِ اڈگاؤں نے خواہش کی کہ خطیب صاحب کو قاضی مقرر کیا جائے لہٰذا یہ درخواست سلسلہ بسلسلہ گورنمنٹ آف انڈیا دہلی تک پہنچی ۱۸۶۵ء میں آپ کو قاضی شش محال مقرر فرمایا۔ تب ہی سے آپ خطیب کے ساتھ قاضی بھی کہلائے۔

محمد عبداللطیف خاں

سید محمد اعظم

(نواب اعظم جنگ بہادر)

نواب اعظم جنگ کا انتقال ۱۲ مارچ ۱۹۷۳ء کو ہوا۔ جیسے ہی یہ خبر ملی ایک غیر معمولی صدمہ دل کو پہونچا اور ایسا محسوس ہوا کہ ایک عزیز ترین بزرگ ہم سے جدا ہوگیا۔ حالانکہ وہ عمر طبعی کو پہونچ چکے تھے۔ عرصے سے بیمار تھے لیکن جن سے قلبی لگاؤ ہوتا ہے اور جن سے غیر معمولی عقیدتمندی ہوتی ہے ان کی جدائی بڑی شاق گذرتی ہے۔ اعظم صاحب سے میرا تقریباً اڑتالیس سال سے قریبی تعلق رہا۔ طالب علمی کے زمانہ سے جب کہ میں سٹی ہائی اسکول کی چوتھی جماعت میں شریک ہوا وہ اُس وقت پرنسپل تھے اور اُس وقت سے آخر وقت تک اُن کی پُرخلوص بزرگانہ شفقتیں مجھ پر تھیں۔

اعظم صاحب حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں بتاریخ ۲ فروری ۱۸۹۰ء کو بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ڈاکٹر سید [illegible] صاحب مہتمم صدر مخزن ادویہ سرکار عالی تھے جو اپنی ہمدردی اور خوش خلقی کی وجہ کافی ہردلعزیز تھے۔ ایک عرصے تک وہ ہمارے پڑوس میں مقیم تھے یہ محلہ گوشہ محل بارہ دری کے روبرو واقع ہے۔ جہاں اعظم صاحب نے اپنے بچپن کے دن گذارے ۱۹۰۱ء میں سٹی ہائی اسکول میں شریک ہوئے زان بعد چادرگھاٹ ہائی اسکول میں شریک ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور جمیع اُمیدواران امتحان میں مضمون انگریزی میں اول رہے یہ امتحان بڑے اہتمام سے سرکاری طور پر مقرر کیا جاتا تھا اور اس کے ممتحن بھی اعلیٰ قابلیت کے پروفیسر ہوتے تھے۔ مڈل اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ علی گڑھ بھیجے گئے جہاں سے اُنہوں نے ۱۹۰۷ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا اور امتیازی وظیفہ پایا علی گڑھ سے آپ نے ۱۹۰۹ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا اور بی ایس سی کی تکمیل کر رہے تھے کہ ۱۹۱۲ء میں حکومت نظام نے آپ کے نام ایک وظیفہ یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے منظور کیا۔ اس وظیفہ کا اعلان ۱۹۱۲ء میں ہوا اور آپ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے اسی سنہ میں انگلستان روانہ ہوئے اور جیسس کالج کیمبرج میں شریک ہوئے۔ ۱۹۱۵ء میں نیچرل سائنس ٹرائی پاس کا امتحان مکمل کیا اور کیمبرج سے ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈبلن یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے

فن تعلیم کی عملی تعلیم و تربیت کے لئے آپ نے لندن بورڈ آف ایجوکیشن کی زیر نگرانی کچھ عرصہ تک تربیت حاصل کی اور اس کے بعد انگلستان کے ایک مخصوص مدرسہ میں تین ماہ تدریس کا کام انجام دیا۔ آپ ۱۹۱۸ء میں حیدرآباد واپس ہوئے۔

اسی زمانہ میں آپ کی شادی حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ لیکن شادی کے چند سال بعد ۱۹۳۱ء میں آپ کی اہلیہ انتقال فرماگئیں۔ اعظم صاحب کے لیے یہ ایک غیر معمولی سانحہ تھا۔ آپ کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ میاں بیوی کے تعلقات رسمی نہیں تھے بلکہ آپس میں ان میں محبت اور وارفتگی کا جذبہ بے انتہا تھا۔ جس وقت بیگم اعظم کے انتقال کی خبر اسکول پہونچی تو ایک سناٹا سا چھا گیا۔ اسکول بند کردیا گیا اور تمام اسٹاف میت میں شرکت کے لیے روانہ ہوگیا دوسرے دن مدرسہ کی جانب سے تعزیتی قرارداد پیش کی گئی جس کو مولوی غلام قادر صاحب وائس پرنسپل نے پڑھ کر سنایا۔ پندرہ سو طلباء کا اجتماع نہایت رنج اور ملال سے اس کو سنا بعد میں یہ قرارداد اعظم صاحب کو پیش کی گئی تو اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آپ کو اپنی شریک حیات کا اتنا غیر معمولی صدمہ ہوا کہ آپ نے بعد میں دوسری شادی نہیں کی حالانکہ بیگم اعظم کی وفات کے وقت آپ کی عمر چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ آپ نے اپنی عمر کا بقیہ حصہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت اور بیوی کی یاد میں گذار دیا۔ آپ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں جو اپنے والد بزرگوار کی طرح زیور علم سے آراستہ ہیں۔

لندن سے واپسی کے بعد ہی آپ کا تقرر ضلع بیدر میں مہتمم تعلیمات کی خدمت پر ہوا۔ ایک سال بعد ۱۹۱۹ء میں مددگار ناظم تعلیمات مقرر کیے گئے اور پھر اسی سال یعنی ۱۹۱۹ء میں سٹی ہائی اسکول کے پرنسپل مقرر ہوئے اور فضل محمد خاں صاحب سے سٹی ہائی اسکول کا جائزہ لیا۔ جو نائب نظامت کے عہدہ پر مقرر کئے گئے اس وقت تک سٹی ہائی اسکول اپنی قدیم چھوٹی سی عمارت میں جو نیا پل کے قریب مغل کی ہوٹل پر تھی۔ جو دیوان دیوڑھی کا ایک حصہ تھا مدرسہ کا تحتانی حصہ پتھر گٹی کے ایک چھوٹے سے مکان میں تھا۔ وسطانی اور فوقانی جماعتوں کے درس سالار جنگ بلڈنگ کے اس بالائی حصے میں ہوتے تھے جس کے نیچے مغل کی ہوٹل اور دوسری دکانیں تھیں۔ لیکن بہت جلد اعظم صاحب کی کوشش کی وجہ سے ۱۳۳۰ف میں مدرسہ موجودہ عمارت میں منتقل ہوا۔ اس میں شک نہیں اعظم صاحب کے آنے سے پہلے فضل محمد خاں صاحب اور دوسرے عہدہ داران تعلیمات نئی عمارت کی تعمیر کے لئے کوشاں تھے اور عمارت کی تعمیر بھی شروع ہوچکی تھی لیکن یہ اعظم صاحب کی جد و جہد تھی کہ انہیں بہت جلد اس نئی

عمارت میں نئی علم کی دنیا بسانے اور نورِ علم سے آراستہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ اعظم صاحب کی شخصیت تھی جس نے دیکھتے دیکھتے اس سٹی ہائی اسکول کو سنہ ۳۲ف میں کالج کا مرتبہ دلایا۔

اعظم صاحب تقریباً چوبیس۲۴ سال سٹی کالج کے پرنسپل رہے۔ اِس زمانے میں مدرسہ کا نظم و ضبط ایک مثالی اور نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ سٹی کالج کی شاندار عمارت اس کا محل وقوع اور اس کے لائق اساتذہ کی وجہ یہ مدرسہ عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرچکا تھا۔ سٹی کالج کے ڈسپلن کا یہ عالم تھا کہ ادھر مدرسہ کی پہلی گھنٹی بلکہ میں یہ کہوں گا کہ پہلا گھنٹہ بجا (گھنٹہ اس لئے کہ ایک بڑا گھنٹہ مدرسہ کی برجیوں کے اوپر بلند مقام پر آویزاں کیا گیا تھا جس کی گونج دار آواز دور تک سنائی دیتی تھی) اور پوری عمارت میں سناٹا چھا گیا اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ کالج میں کوئی نہیں ہے۔ وقتاً فوقتاً اعظم صاحب معائنہ کے لئے نکل جاتے تھے۔ اگر کسی جماعت میں داخل ہوگئے اور اس کا معائنہ کیا تو پورے اسکول میں یہ خبر پھیل جاتی تھی کہ فلاں جماعت میں اعظم صاحب نے معائنہ کیا۔ اِس کے نتیجہ میں دوسری جماعت کے طلباء اور اساتذہ چوکنے ہوجاتے تھے۔

اعظم صاحب نے سٹی کالج میں اونچے معیار اور بلند کردار کے اساتذہ کا انتظام فرمایا سب سے پہلے میں مولوی غلام قادر صاحب کا ذکر کروں گا صاحب موصوف سٹی کالج ہی کے قدیم طالب علم تھے اور ترقی کرتے کرتے اسی کالج کے وائس پرنسپل مقرر ہوئے۔ آپ اعظم صاحب کے حقیقی معنوں میں رفیق کار اور مددگار ثابت ہوئے مدرسہ کے تعلق سے آپ نے بڑی پُرخلوص خدمات انجام دیں خصوصاً مدرسہ میں ڈسپلن قائم رکھنے اور عام انتظامات کو مستحکم کرنے میں آپ کا بڑا ہاتھ تھا۔ اعظم صاحب کے ناظم تعلیمات ہونے کے بعد آپ صدر مہتمم تعلیمات صوبہ ورنگل بنائے گئے۔

شاید قارئین کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ جن اساتذہ نے ہمیں ہائی اسکول کی جماعتوں میں تعلیم دی ان میں سے اکثر بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے صف اوّل کے اساتذہ میں شمار کئے جانے لگے۔ ان حضرات کی فہرست طویل ہے لیکن اختصار کی خاطر چند اساتذہ کا ذکر کرتا ہوں۔ مولوی فضل الرحمن صاحب عثمانیہ میٹرک اور ایف اے کی جماعتوں کو انگریزی ادب کی تعلیم دیتے تھے موصوف نے اپنی ذاتی قابلیت اور اعلیٰ صلاحیتوں کی وجہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کی و معلم انگریزی ادب سے ناظم تعلیمات بنے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ شہرۂ آفاق مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ آپ نہ صرف طالب علموں میں مقبول اور ہردلعزیز تھے بلکہ اعظم صاحب کو بھی آپ پر بڑا اعتماد تھا۔ ایک اور مقبول اور ہردلعزیز استاد جنھوں نے ہمیں آٹھویں اور نویں جماعت میں انگریزی ادب کی تعلیم دی

وہ سٹرڈرراسوامی تھے جن کا حال ہی میں دو سال پہلے انتقال ہوا۔ موصوف کو انگریزی ادب بالخصوص شکسپیر سے لٹریچر پر بڑا عبور تھا چنانچہ شکسپیر کے ڈراموں کی مشہور و معروف نظمیں ہم طلبا کو زبانی یاد کروائی گئیں تھیں اور انہوں نے ہمیں ان کو خاص انداز اور لب لہجہ میں ادا کرنے کا طریقہ سکھایا تھا۔ آپ ترقی کرتے کرتے نہ صرف جامعہ عثمانیہ کے انگریزی ادب کے پروفیسر بنے بلکہ بعد میں عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر منتخب کئے گئے۔ وائس چانسلری کے عہدہ پر ترقی اعظم صاحب کی تربیت اور سرپرستی کی رہین منت ہے۔ جب جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلروں کا ذکر چھڑ گیا تو دو اور حضرات کا ذکر کرتا ہوں یہ حضرات جامعہ عثمانیہ کے سابق وائس چانسلر مسٹر جگونتم پروفیسر طبیعات اور سابق وائس چانسلر مسٹر ستنارائن روڈا - پروفیسر طبیعات ہیں۔ یہ دونوں سٹی کالج کے اُن ہونہار سپوتوں میں سے ہیں جن کی تربیت اور سرپرستی میں اعظم صاحب نے دل کھول کر حصہ لیا۔ ایک دوسرے اُستاد مولوی سید محمد صاحب ہیں جنہوں نے ہم کو آٹھویں جماعت میں اُردو ادب کی تعلیم دی تھی کیونکہ اُس وقت مدارس میٹرک کے نصاب کے مطابق صرف آٹھویں جماعت تک اُردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ موصوف اپنی علمی قابلیت اور اعظم صاحب کی رہبری اور سرپرستی میں نہ صرف ایک نامور ادیب بنے بلکہ وہ جامعہ عثمانیہ میں ریڈر شعبہ اردو کی حیثیت سے منتخب کئے گئے۔ اسی درسگاہ کے ایک معزز اُستاد مولوی سید فضل حق صاحب تھے جو اپنی قابلیت اور خلوص کی وجہ طلباء میں بے حد ہر دلعزیز تھے۔ آپ عثمانیہ میٹرک کی جماعتوں میں انگریزی ادب کی تعلیم دیا کرتے تھے بعد میں ترقی کرتے کرتے جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل ہو گئے اور تادم آخر اپنی پرنسپلی کے عہدہ کو بڑی شان اور خودداری سے انجام دیا۔ اعظم صاحب کے تربیت یافتہ اساتذہ کی فہرست بڑی طویل ہے اور اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا ذکر مشکل ہے اس لئے اس تذکرہ کو یہیں پر ختم کرتا ہوں ۔

اعظم صاحب کی پرنسپلی کے زمانہ میں لائق اساتذہ کی زیر نگرانی علوم ادب کے ساتھ ساتھ علوم سائنس کی طرف کافی توجہ دی گئی۔ شعبۂ سائنس میں آپ کے زمانہ میں غیر معمولی ترقی ہوئی۔ عام طور پر طلباء جب میٹرک کا امتحان کامیاب کرکے انٹرمیڈیٹ سائنس میں شریک ہوتے تو اُس وقت انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں میں انہیں عملی کام کرنے کا موقع دیا جاتا تھا لیکن سٹی کالج کے طلباء کو یہ اعزاز حاصل رہا کہ اُنہوں نے میٹرک کی جماعتوں میں خود اپنے تجربات کئے تین تین طلباء کا گروپ بنایا جاتا اور پروگرام کے مطابق جماعت کے طلباء اپنے معلم سائنس کی زیر نگرانی مختلف تجربات کیا کرتے تھے۔ مثلاً گیسوں کی تیاری ترشوں کی تیاری اور اسی طرح طبیعیات میں مقناطیس، نور اور حرارت کے تعلق سے تجربے کئے جاتے تھے۔ اس قسم کی تعلیم کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ طلباء اچھے

نمبرات سے کامیاب ہوتے تھے۔ اساتذہ صاحبان کی تدریس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ہر سال مدراس میٹرک کے امتحان میں سٹی کالج کا ایک طالب علم گو کھلے اسکالر کا درجہ حاصل کرتا تھا۔ میری طالبعلمی کے زمانے میں جب کہ میں خود ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھا ہر سال ایک طالب علم گو کھلے اسکالر کا درجہ حاصل کرتا تھا۔ گو کھلے اسکالر اس طالب علم کو قرار دیا جاتا تھا جو مدراس میٹرک کے آخری سرکاری امتحان میں جملہ شریک طلبا میں سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرے۔

کھیل کے میدانوں میں بھی یہ مدرسہ کسی سے پیچھے نہ تھا یہاں بھی وہی جوش و خروش اور ہنگامے برپا تھے اس زمانہ میں سٹی کالج کا اپنا کوئی کھیل کا میدان نہ تھا لیکن اعظم صاحب کی کوشش اور اثرات سے سٹی پولیس پریڈ گراونڈ جس پر مستقل فٹ بال گراونڈ بھی تھا استعمال کرنے کی اجازت حاصل کرلی گئی تھی اعظم صاحب خود فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی فٹ بال ٹیم کے کپتان تھے۔ اس لحاظ سے انہیں فٹ بال اور اس کے کھلاڑیوں سے کافی دلچسپی تھی آپ کے دور صدارت میں فٹ بال، ہاکی اور کرکٹ کی ٹیمیں بڑی معیاری تھیں خصوصاً فٹ بال اور کرکٹ کی ٹیموں کے اکثر طلبا بعد میں "حیدرآباد الیون" جیسی مشہور ٹیموں کے ممبر بنائے گئے تھے۔ میں بھی فٹ بال کا شوقین کھلاڑی تھا ۱۹۳۳ء میں مجھے ہائی اسکول فٹ بال ٹیم کا کپتان مقرر کیا گیا۔

اسپورٹس سے اعظم صاحب کو بڑی دلچسپی تھی میری طالب علمی کے زمانہ میں جب کہ میں فوقانی جماعتوں میں زیر تعلیم تھا سٹی کالج اسپورٹس کے میدان بہت آگے تھا۔ اس کی بڑی وجہ اعظم صاحب کی شخصی دلچسپی تھی۔ ایک روز کا دلچسپ واقعہ سناتا ہوں ایک دن اعظم صاحب مسٹر ٹرنر کے ہمراہ کھیل کے میدان میں جہاں ہم اسپورٹس کی مشق کر رہے تھے اچانک چلے آئے مسٹر ٹرنر نظام کالج کے پرنسپل تھے اور انگریزی ادب کے مستند پروفیسر مانے جاتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کھیل کے میدان میں بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے آپ ورلڈ اولمپک اسپورٹس میں دوڑ دوڑ کے مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کر چکے تھے مسٹر ٹرنر نے آتے ہی اپنا کوٹ موٹر میں ڈالدیا اور طلبا کے ساتھ کھیل کے میدان میں شریک ہوگئے۔ میں ذرا جسیم تھا وہ مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ اس وقت میں ہرڈل کی مشق میں مصروف تھا وہ میرے قریب آئے اور مجھے ہرڈل کے پاس لیجا کر کھڑا کر دیا اور ایک ڈنڈا لیکر میرے قد کی بلندی تک ڈنڈے کو آڑا پکڑا۔ ہرڈل کی مقررہ بلندی اور ڈنڈے کی بلندی میں تقریباً تین فٹ کا فاصلہ تھا مجھ سے کہا گیا کہ میں دوڑتے ہوئے ہرڈل پر سے اس طرح گذروں کہ میرا سر نہ تو ڈنڈے سے مس کرے اور نہ میرے پیر ہرڈل کی پٹی کو چھوئیں۔ یہ ایک کڑا امتحان تھا۔ لیکن میں حسب ہدایت

ہرڈل پر سے گذر گیا۔ انھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور سمجھایا کہ چھلانگ لگاتے وقت کم سے کم بلندی ہونی چاہئیے کیونکہ اس سے کم وقت میں ہرڈلوں کے درمیان، فاصلہ طے ہوتا ہے۔ خیر یہ باتیں فنی اور ٹکنیکل ہیں۔ لیکن ان کو یہاں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کس طرح قابل اور ماہر فن و تعلیم یافتہ حضرات کو کھیل کے میدان میں لاکر اعظم صاحب اپنے طلبار کو مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتے تھے ان حضرات کو لانے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ طلبار کو یہ بتلائیں کہ جو طلبار کھیل کے میدان کے ہیرو ہوتے ہیں وہ تعلیم کے میدان میں بھی سرخرو ہوتے ہیں۔ تقریباً دو ڈھائی گھنٹے مسٹر ٹرنر ہمارے ساتھ رہے اور طلبار کے سامنے لانگ جمپ، ہائی جمپ اور دوڑوں کی ٹکنک کے مظاہرے کئے جس سے طلبا کافی مستفید ہوئے۔

اعظم صاحب زائد از نصاب مصروفیات کو تعلیم کی طرح بڑی اہمیت دیتے تھے۔ میں اوپر کھیل کے میدانوں کا ذکر کرچکا ہوں اب طلبار میں شعور اور ذہنی بیداری پیدا کرنے کے لئے آپ نے جو تدابیر اختیار کیں۔ اس کا مختصراً ذکر کرتا ہوں۔ اگر شہر میں کوئی بڑا مقرر یا مشہور و معروف شخصیت آجاتی تو ضرور اس کو وہ اپنے کالج میں بلواتے تھے اور طلبار کو ان کی تقاریر اور خیالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرتے تھے تاکہ طلبار ان عالموں کی صحبت سے علمی فیض حاصل کرسکیں یوں تو کئی باوقار شخصیتوں کو سننے کا موقع ملا لیکن یہاں میں صرف دو کا ذکر کرتا ہوں۔ جب میں آٹھویں یا نویں جماعت میں زیر تعلیم تھا تو اس وقت پنڈت ہردیا ناتھ کنزرو (جو ہندوستان کی آزادی کے بعد اترپردیش کے گورنر ہوئے تھے) کالج تشریف لائے وہ اُسوقت ایک قومی لیڈر تھے اعظم صاحب نے لیکچر ہال میں ان کی تقریر کا انتظام فرمایا۔ اعظم صاحب کے تعارف کے بعد پنڈت جی نے جو تقریر کی وہ آج تک یاد ہے۔ غالباً یہ واقعہ چالیس بیالیس سال پہلے کا ہے پنڈت جی نے اپنی تقریر کی ابتدا اس طرح کی:-

پیارے بچو! میں اپنی تقریر کو میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر محمد اقبال کے دو شعروں سے شروع کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر انھوں نے باآواز بلند یہ شعر پڑھے (اس زمانہ میں لاوڈ اسپیکر کا رواج نہ تھا) ؎

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے — تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا — جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

اس طرح انھوں نے قومی اتحاد اور رواداری پر ایک دلچسپ اور موثر تقریر کی۔ اسی طرح ایک اور موقع پر مسز سروجنی نائیڈو طوطی ہند کو پہلی دفعہ سننے کا موقع ملا۔ غرض اس طرح کے جلسے سٹی کالج میں ہوتے تھے جن سے طلبار غیر معمولی طور پر مستفید ہوتے تھے۔

سال میں ایک مرتبہ کالج ڈے کے موقع پر ڈرامے پیش کئے جاتے تھے جن میں طلبار اور بعض اوقات

اساتذہ بھی شریک ہو جایا کرتے تھے۔ شکسپیر اور دیگر بین الاقوامی ڈرامہ نگاروں کے ڈراموں کو منتخب کیا جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۲ء میں ایک مشہور ڈرامہ پارٹی حیدرآباد آئی ہوئی تھی جس کی قیادت ایک انگریز اداکار مسٹر اینڈرسن کر رہے تھے۔ اسی پارٹی میں ہندوستان کے مشہور اداکار پرتھوی راج کپور بھی شریک تھے۔ مسٹر پرتھوی راج نے ڈرامہ ہیملٹ میں ہیملٹ کا کردار بڑی خوبی سے کیا تھا اور مسٹر اینڈرسن نے مرچنٹ آف وینس میں شائلاک کا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ غرض ایک ہفتہ تک شکسپیر کے مختلف ڈرامے پیش کئے گئے جس کی وجہ سے طلباء میں انگریزی زبان سے لگاؤ اور آرٹ سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

اعظم صاحب کی غیر معمولی رواداری شاید میں کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے صوفیانہ تصورات کی وجہ سے بعض حلقوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں خصوصاً علماء کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں چھٹی جماعت میں زیر تعلیم تھا اس وقت علماء کی ایک جماعت مدرسے میں دینیات کی تعلیم سے متعلق معائنہ کرنے کے لئے اچانک مدرسہ پہونچ گئی۔ طلباء کو ڈرائنگ کے کمرے میں جو زیادہ کشادہ تھا بٹھا دیا گیا اور ایک مقدس جماعت سامنے ایک میز کے اطراف کرسیوں پر بیٹھ گئی دینیات کی کتابیں ہر ایک معائنہ کنندہ کے ہاتھ میں تھیں طلباء سے کچھ سوالات کئے جاتے تھے اور وہ معصومانہ مگر دلیرانہ انداز میں صحیح جوابات دیتے تھے۔ معائنہ کنندگان کو مایوس لوٹنا پڑا کیونکہ وہ ایک غلط تصور لے کر آئے تھے سٹی کالج میں مذہبی تعلیم کا معقول انتظام تھا دینیات کی تعلیم کے لئے ایک علیحدہ کمرہ تھا۔ یہاں ہر سال ایک زمانہ تک میلاد النبی کے جلسے منائے جاتے تھے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب کی تعلیم کا یہاں معقول انتظام تھا۔ جب دینی تعلیم کا گھنٹہ بجتا تو جماعت تین حصوں میں بٹ جاتی تھی دینیات پڑھنے والے طلباء دینیات کے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ ہندو طلبا جو سناتن دھرم پڑھتے تھے وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے اور باقی طلباء جو دینیات اور سناتن دھرم نہیں پڑھتے تھے وہ اخلاقیات پڑھنے کے لئے جماعت ہی میں رہ جاتے تھے۔

غرض اعظم صاحب کے دورِ صدارت میں سٹی کالج نے ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کئے اور شہر حیدرآباد کی چوٹی کی درس گاہوں میں شمار کیا جانے لگا۔ آپ کی غیر معمولی صلاحیتیں اور بے لاگ کارکردگی اور تقدم کے لحاظ سے آپ کو ۱۹۴۲ء میں ناظم تعلیمات کے عہدہ پر ترقی دی گئی۔ جیسے ہی آپ نے نظامت تعلیمات کی عنان ہاتھ میں لی آپ نے سب سے پہلے دیہاتوں میں تعلیم کی اشاعت کی طرف توجہ کی اور لازمی تعلیم کی اسکیم کو منظور کرانے میں کامیاب ہوئے۔ شہر حیدرآباد میں بہت سے تحتانی مدارس کو وسطانی مدارس میں

تبدیل کیا گیا اور بہت سے وسطانیہ مدارس کو فوقانیہ کا درجہ دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا گیا۔ دیہاتوں میں کسان جو اپنے بچوں کو کھیتی باڑی کے کاموں میں معروف رکھنا چاہتے تھے پہلے ان مدارس کی طرف توجہ دی بعض معترضین یہ اعتراض کرنے لگے کہ جن مدارس میں طلباء کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ نہیں اُن کو بند کر دینا چاہیئے کیونکہ ان مدارس سے حکومت پر غیر معمولی بار پڑ رہا ہے اعظم صاحب جواب میں یہ کہتے تھے آج ان مدارس میں پندرہ بیس طلباء ہیں۔ لیکن عنقریب انہیں مدارس میں تعداد سینکڑوں تک پہونچ جائیگی اور ہوا ایسا ہی آج ان ہی مدارس میں جہاں پندرہ بیس طالب علم تعلیم پاتے تھے وہاں طلباء کی تعداد پانچسو سے زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ اعظم صاحب کی دور اندیشی اور قومی جذبہ تھا۔ جو نہ صرف شہر حیدرآباد میں بلکہ دیہاتوں میں تعلیم عام کرنے کا ذریعہ بنا جس وقت آپ ناظم تعلیمات ہوئے اُس وقت . . . . غلام محمد صاحب وزیر فینانس تھے۔ اعظم صاحب کی شخصیت نے انہیں ایسا متاثر کیا کہ اِن کی ہر اسکیم منظور کی گئی اور کافی رقم علمی ترقیاتی کاموں کے لئے منظور کی گئی۔ اعظم صاحب صرف تین سال ناظم تعلیمات رہے لیکن اس مختصر دور نظامت میں ایک ہزار جدید تحتانی مدارس قائم کئے گئے اور طلباء کی تعداد میں پچاس ہزار کا اضافہ ہوا۔

اعلیٰ حضرت حضور نظام کے فرمان سے ۱۹۴۶ء میں وہ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی مقرر کئے گئے اور یہاں وہ نو مہینے تک کام کرنے نہ پائے تھے کہ انہیں نظام نے بذریعہ فرمان وزیر تعلیمات کے عہدہ پر ترقی دی۔ یہاں وہ دو سال تک فائز رہے اور اسی زمانہ میں اعظم صاحب کو ان کی غیر معمولی نمایاں خدمت کے صلہ میں جنگ کا خطاب عطا ہوا اور وہ اب نواب اعظم جنگ بن گئے۔

اعظم صاحب نے اپنے دو سالہ دور صدر المہامی میں سررشتہ تعلیمات میں غیر معمولی انقلابی تبدیلیاں لائیں، صدر المہام بنتے ہی پہلا کام جو آپ نے کیا وہ یہ تھا کہ آپ نے اپنے عزیز دوست اور قدیم رفیق کار سید علی اکبر صاحب کو جو اُس وقت نظام کالج کے پرنسپل تھے ترقی دے کر قلمدان نظامت تعلیمات آپ کے حوالے کیا اس کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ سید علی اکبر صاحب ایک زمانہ تک دفتر تعلیمات میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ آپ نائب ناظم تعلیمات ہی رہے۔ اعظم صاحب کی طرح آپ کو تعلیم کی اشاعت سے بڑی دلچسپی تھی اور آپ بھی تعلیمی دنیا میں ایک تعمیری انقلاب لانا چاہتے تھے۔ دونوں نے ملک حیدرآباد کے تمام اضلاع کا دورہ کیا اور جہاں جہاں ضروری سمجھا اُسی وقت انتظامات کے احکام جاری کئے اس طرح ملک کا تعلیمی نظام ایک جدید مضبوط سانچے میں ڈھالا گیا۔ میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ سررشتہ تعلیمات کا یہ دور ملک کی تاریخ میں سنہرے دور سے یاد کیا جائیگا۔

اعظم صاحب ۱۹۴۷ء میں وظیفہ پر علیحدہ ہوئے۔ آپ وظیفہ کے بعد کچھ دن پبلک سروس کمیشن کے رکن بھی مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپ کی علمی خدمات اور قابلیت کی بناء پر جامعہ عثمانیہ کی گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ اعظم صاحب کو اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا ابتدائی زمانہ میں آپ نے مولوی کا امتحان پاس کیا کیمبرج یونیورسٹی میں بھی جہاں ایک کلاسیکی زبان نصاب میں لازمی تھی آپ نے عربی پڑھی انگریزی کے علاوہ آپ کی اردو تحریریں بڑی شاندار ہوتی تھیں لیکن آپ نے کوئی تصنیف ان زبانوں میں نہیں چھوڑی۔

تین چار مہینے قبل میں آپ کے مکان پر ملنے کے لئے گیا بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے میں نے اپنی ایک تصنیف پیکر غالب' بطور نذر عقیدت گذرانی کتاب لے کر بہت خوش ہوئے اور میری ڈو تصانیف غذا اور اس کی اہمیت اور بچوں کی نشو و نما میں غذا کی اہمیت کا ذکر کیا اور کہنے لگے اردو زبان میں یہ تصانیف قیمتی اضافہ ہیں میں نے جواباً عرض کیا کہ یہ سب آپ کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کا نتیجہ ہیں یہ بات یہ تھی کہ میں ڈاکٹر اکرانڈ (ناظم ماسٹوا انسٹیوٹ کرنور نیلگری) جو اس وقت اقوام متحدہ کے رکن بھی تھے کی دعوت پر کرنور جا رہا تھا۔ تاکہ میری یہ تصانیف ڈاکٹر صاحب کی رہبری میں مرتب کی جائیں میں نے رخصت کی درخواست دی اور وجہ بھی ظاہر کی اس پر اعظم صاحب نے اس دعوت کو سرکاری حیثیت دی اور میرے نیلگری آنے جانے اور ٹھہرنے کے اخراجات کا حکومت کی جانب سے انتظام فرمایا۔ یہ ان کی ہمت افزائی اور علم دوستی کی معمولی مثال تھی۔

انتقال کے چند دن پہلے مجھے اطلاع ملی کہ آپ سخت علیل ہیں اور دواخانہ عثمانیہ میں زیر علاج ہیں اور تھوڑے ہی دن بعد یہ غمناک خبر ملی کہ آپ کا انتقال ہو گیا۔

میں اپنے محترم استاد سے متعلق جیسا لکھنا چاہئے تھا نہ لکھ سکا اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لکھتے وقت اعظم صاحب کا پر رونق چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور قلم کی روانی رک جاتی ہے اس لئے آئندہ جب کبھی موقع ملے تو ایک مضمون "ہم جب پڑھتے تھے" کے عنوان سے پیش کرونگا جس میں سٹی کالج میں ہماری طالب علمانہ زندگی کے واقعات جو خاص طور پر اعظم صاحب کے دور پرنسپلی میں پیش آئے تھے۔ بیان کرونگا فی الوقت دل یہ چاہتا ہے کہ روح اعظم پر دست فاتحہ اٹھا کر خاموش ہو جاؤں۔

نمر بسوانی

یہ کون میکدہ بردوش بادہ خوار اُٹھا
صراحی جھوم اٹھی ابر کوہسار اُٹھا

ہمارے جہد مسلسل کا نام ہے منزل
قدم رکا ہی نہیں پھر جو ایک بار اُٹھا

رخِ حیات بھی مہتاب بن کے چمکے گا
زمانہ اپنے جو گیسو کہیں سنوار اُٹھا

خرامِ یار بھی اے دوست اک قیامت ہے
چلا وہ جو بھی قدم حشر بار بار اُٹھا

تمام عمر نہ احساس کی پلک جھپکی
ہر ایک گام پہ دردِ جہاں پکار اُٹھا

چمن کے پھول بھی کیا پست حوصلہ نکلے
کہ چار دن بھی نہیں زندگی کا بار اُٹھا

نمر کی آہ کا سوزِ درونِ بھٹکتا تھا
بگولا بن کے جو صحرا میں بار بار اُٹھا

واحد پریمی

جو شخص کہ دنیا میں ہے بے خواہش و مقصد
وہ لاش کی مانند ہے گھر اس کا ہے مرقد

گو پیٹ کی دوزخ سے بچا لیتے ہیں لیکن
کس کس کو بیا پوچھوں کہ مرے سیوں سعد

خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کے دیکھو
کیا تم کو زمانے سے کوئی نیک ہو یا بد

تم گنبدِ افلاک بھی چھو سکتے ہو لیکن
پیمانۂ ادراک سے ناپو تو کبھی قد

دیکھو کہ کوئی تار گریباں میں نہ رہ جائے
ہشیار کہ دیوانو بہاروں کی ہے آمد

وہ سامنے باطل کے کبھی جھک نہیں سکتے
جو حق کے پرستار رہیں یا پیرِ دِ سرمد

کانٹوں کا بچھونا ہمیں مرغوب ہے واحد
انکو ہی مبارک رہے وہ پھولوں کی مسند

مظفر حنفی

رباعیات

(۱)

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے
خاکے میں سیہ رنگ نہیں بھر سکتے
ہر لوح پہ تحریر ہے جینا ہے حرام
آواز لگا دو کہ نہیں مر سکتے

(۲)

دریاؤں کو جانا تھا سمندر کی راہ
بادل تو جمائے تھے پہاڑوں پہ نگاہ
یوں قدرتِ صحرا کو پسینے آئے
گرتے ہوئے شبنم نے کہا بسم اللہ

(۳)

موسم کے تقاضے پہ ذرا سوچو نا
انجام ہے مطلع کا مکدر ہونا
کھانے کی کوئی چیز اگا لو پہلے
پھر شوق سے کھیتوں میں ستارے بونا

(۴)

کمرے میں سبک رنگ بکھر جائیں گے
بے ساز کے نغمات سنائی دیں گے
بستر پہ مرے آ کے تماشا دیکھو
چادر پہ کڑھے پھول مہک اٹھیں گے

(۵)

یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
گر خود کو سنبھالوں نہ بہیں آنسو کی طرح
دن رات گھمائے مجھے صحرا صحرا
خوشبوئے سخن نافۂ آہو کی طرح

(۶)

بھڑکی ہوئی اک شعلۂ غم رکھتا ہوں
شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں
دکھتی ہوئی رگ اپنی چھپا لے دنیا
مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

(۷)

شعلہ ہے اسے چوم رہا ہوں پھر بھی
خالی ہے سبو جھوم رہا ہوں پھر بھی
وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند
پنکھے کی طرح گھوم رہا ہوں پھر بھی

(۸)

آفت ہے یہ الحاد مظفر صاحب
خود ساختہ بیداد مظفر صاحب
مشکل میں خدا کو یاد کرتے ہیں لوگ
ہم کس کو کریں یاد مظفر صاحب

طیب انصاری

نقد و نظر

شیرازہ محمور سعیدی - پریم گوپال متل - ناشر: پی کے پبلکیشنز ۲۰۷۲ - پرتاب اسٹریٹ گولا مارکیٹ، دریا گنج - دہلی - قیمت: بارہ روپے۔

آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد اردو صحافت قومی، سیاسی، سماجی اور ادبی زندگی میں تعمیری اور تخریبی ہر دو رول ادا کرتی رہی ہے۔ زندگی کے اس طویل سفر میں بہت سے نئے ذہن پیدا ہوئے۔ مٹ گئے اور بہت سے رجحان بن کھلے مرجھا بھی گئے اور بعض تحریک کی شکل میں آج بھی موجود ہیں ان تمام تحریکوں کی پرچھائیاں ہمارے ادب پر بھی نمایاں رہیں۔ خصوصاً آزادی کی تحریک تو ۱۹۴۷ء سے قبل اردو صحافت کا مقدر بن چکی تھی۔ آزادی کے بعد آج ہم اردو صحافت کو پا ہیں چلا پا لیکن جو گراں قدر رول اس کا حصول آزادی کے سلسلہ میں رہا ہے وہ تاریخ کا ایک قابل قدر جز رہے۔ آزادی کی اسی قومی تحریک کے پہلو بہ پہلو بہت سی ایسی تحریکیں بھی دبے پاؤں اور بہ بانگ دہل داخل ہوئیں جو بہ نام آزادی و مساوات بے راہ روی اور ذہنی و اخلاقی پستی کو عام کیا مذہب بیزاری بھی اسی کے نتیجہ میں پھیلی ہے۔ میری مراد کمیونزم سے ہے جو ہمارے ادب میں نام نہاد "ترقی پسند تحریک" کی صورت میں داخل ہوئی اور خوب خوب اودھم مچایا! لیکن اس کے خلاف آواز بھی اٹھائی گئی گو ابتداء میں ان مثبت قدروں کو دشواریوں کا سامنا رہا اور ادھر "ترقی پسند" آمرانہ انداز اختیار کر چکے تھے لیکن بہت جلد ان قدروں کو استحکام ملا اور آج "ترقی پسند" چاروں خانے چیت ہیں! "ترقی پسندوں" کی کر توڑنے والوں میں "تحریک" کا بھی اہم رول رہا ہے اور اس سلسلہ میں گوپال متل اور محمور سعیدی صاحب کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان حضرات کی انتھک محنت، خلوص اور لگن کی وجہ سے "تحریک" واقعی ایک ادبی تحریک کی صورت اختیار کر گیا اور اس کو امجد حیدر آبادی، بے خود دہلوی، یگانہ چنگیزی، جگر، حفیظ، خروم، اثر، فراق، روش، میکش، عدم، وجد، علی جواد، ماہر، اعجاز صدیقی اور شمیم کرہانی سے لیکر آج کے جدید شاعر شہریار، علوی، باقی، ندا، عادل، احمد ہمیش، اکرام باگ اور حمید سہروردی جیسے شعراء کا قلمی تعاون حاصل رہا۔ زیر نظر شعری مجموعہ "شیرازہ" پچھلے بیس سالوں کا انتخاب ہے جس میں ۲۲۹ شاعروں کا منتخب کلام ہے۔

اور آخر میں سوانحی اشارے بھی شامل ہیں۔ اس طرح اس مجموعہ کی اہمیت اُردو ادب میں ایک مستند دستاویز کی ہے۔

"شیرازہ" آزادی کے بعد ہمارے ذہنی سفر کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ اس میں قدیم انداز کی شاعری شامل ہے اور جدیدیت کے زیر اثر کہی گئی شاعری بھی موجود ہے۔ فکر و فن میں جو نئی نئی تبدیلیاں آئیں ان سب کا پتہ شیرازہ کے قاری کو ہو جاتا ہے۔ اس مجموعہ میں جہاں دیو پیکر اور بھاری بھرکم شعراء موجود ہیں وہاں بہت سے ہلکے پھلکے شاعر بھی موجود ہیں۔ اس طرح بڑی حد تک معیاری کلام کے ساتھ ساتھ غیر معیاری کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ انتخاب کے سلسلہ میں کم از کم اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تو زیادہ مناسب رہتا بعض اوقات مصلحتاً اور اکثر دفعہ نئے شعراء کی ہمت افزائی کی خاطر ماہ نامہ میں ہر طرح کا کلام شامل ہو جا سکتا ہے لیکن انتخاب میں نہیں۔

بحیثیت مجموعی مخمور سعیدی صاحب اور پریم صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ایک معیاری انتخاب شائع کر کے تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔ خصوصاً نئے نام کی اشاعت کے بعد اس طرح کے ایک اور ...... انتخاب کا شائع ہونا ضروری تھا۔ شیرازہ اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔

امریکہ کے کالے مسلمان

ڈاکٹر مشیر الحق۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
قیمت دو روپیہ۔

پچھلے چند برسوں سے امریکہ میں اسلام کی "مقبولیت" کی خوش کن خبریں سننے میں آرہی ہیں اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ مغرب خصوصاً امریکہ میں اسلام "تیزی" سے پھیل رہا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ گورے امریکیوں کا کالوں پر جبر و ستم ہے۔ کالے گوروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جوق جوق مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں اور اس سلسلے میں الیجا محمد کا نام نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ جو تبلیغ اسلام میں مصروف ہیں۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ سے بہت سی تلخ حقیقتیں سامنے آجاتی ہیں اور ساری خوشیوں پر پانی سا پھر جاتا ہے۔ ڈاکٹر مشیر الحق صاحب کے الفاظ میں یہ کہنا مشکل ہے کہ "امریکہ کے کالے مسلمان درحقیقت مسلمان ہیں یا نہیں! اور پھر انہوں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کالے مسلمانوں کی یہ تحریک "احیائے اسلام" کی غرض سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ تحریک کے لیڈروں نے اسلام کو امریکی حبشیوں میں علیحدگی پسندی کا جذبہ ابھارنے اور "عزت نفس" پیدا کرنے کی خاطر اپنایا تھا۔ اور اس تحریک کا بنیادی مقصد اپنے لئے الگ خطۂ زمین مانگنا تھا۔

امریکہ کے کالے مسلمان' اس حیثیت سے ایک دلچسپ کتاب ہے اور اس کے مطالعہ سے اندازہ

ہو سکتا ہے کہ کالے امریکیوں کے سوچنے کا ڈھنگ کیا ہے اور امریکہ پر نسلی عصبیت کیا صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ کس طرح "اسلام" کا سہارا لیکر کالے امریکی "علیحدگی" اختیار کرتے جارہے ہیں۔ ڈاکٹر مشیر الحق نے واقعی ایک اہم اور دلچسپ موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے امریکہ کے کالے مسلمان شائع کر کے ہندوستانی مسلمانوں کو اس تحریک کے پس منظر سے واقف کرایا ہے جو امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ذہنی پیچیدگی کے نتیجہ میں پیدا ہوئی اور اسی اندھیرے میں آگے بڑھ رہی ہے۔ خدا تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایک دن اسلام کے نور سے سچ مچ امریکہ کے کالے مسلمانوں کے قلوب منور ہوں اور وہ صحیح اور سیدھا راستہ پا جائیں۔

میرا وطن ہندوستان بدیع الزماں خاور۔ ناشر: بی کے۔ پبلیکیشنز ۲۰۷۲ پرتاب اسٹریٹ دریا گنج، دہلی ۶۔ قیمت: چار روپے۔

پچھلے چند سالوں میں خاور کے تین چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں "حروف" ان کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے "بیاض" میں صرف غزلیں ہیں اور زیر نظر مجموعہ "میرا وطن ہندوستان" قومی نظموں کا عکاس ہے اس مجموعہ کے کلام کو پڑھنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر کا دل وطن دوستی کے جذبات سے سرشار ہے اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ سب کے یہ جذبات عام ہوں۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ اپنے فن کا سہارا لیتا ہے۔ خاور نے اپنے اس مجموعہ کا انتساب شہیدان وطن کی عظیم روحوں کے نام کیا ہے۔ یہ انتساب خود اس بات کا ثبوت ہے کہ خاور کو صرف اس مقدس زمین ہی سے محبت نہیں ہے بلکہ وہ اس سرزمین سے اٹھنے والی عظیم ہستیوں کو بھی بہ نظر استحسان دیکھتا ہے۔ ان کی عظمت کا بھی اور قربانی کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔

پریم گوپال متل نے اپنے پیش لفظ میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اردو شاعری میں ہندوستان کی مٹی کی بو باس شروع ہی سے رچی بسی ہے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد حالیؔ سے اقبالؔ تک ایسے کتنے ہی شاعر پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے فن کو تلوار کی طرح استعمال کیا ہے۔ جذبۂ قومیت کو بیدار کرنے، آزادی کی امنگ پیدا کرنے اور جد و جہد پر اکسانے کے لئے بے تکان لکھا ہے۔ ان شاعروں میں یقیناً شبلیؔ، اکبر الہ آبادی، سرورؔ، چکبستؔ، محرومؔ، جوشؔ، فیضؔ، مخدومؔ، جگناتھ آزادؔ، احسانؔ، دانشؔ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن جیسے ہی ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا۔ دیگر زبانوں کے شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کی طرح اردو شعراء نے بھی جذبۂ قومیت کی اہمیت کو فراموش کر دیا۔ حالانکہ اس جذبہ کو عام کرنے کی ضرورت آزادی سے پہلے سے کہیں زیادہ آزادی کے بعد بھی اور ہے۔ ایسے زمانہ میں جب کہ اردو شاعری دلی کا جنتر منتر بن گئی ہے۔ خاور کی طرح کے شاعر غنیمت نظر آتے ہیں جو اپنے فن کے ذریعہ زمانہ کی اس ضرورت کی بڑی حد تک تکمیل کرتے ہیں

میرا وطن ہندوستان ہیں کوئی ۳۲ نظمیں مختلف عنوانات کے ساتھ ہیں لیکن سبھوں میں وطن سے محبت کا جذبہ ہی کارفرما ہے۔ البتہ قومی نظموں کے اس مجموعہ میں پتہ نہیں کیوں خاور نے خواہ مخواہ بھی دو ایک غزلیں شریک کر دی ہیں۔

امر بانی کے عنوان سے خاور نے مہاتما گاندھی کے چودہ صوفیانہ اقوال کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور اپنے لحاظ سے یہ خاصہ کی چیز ہے۔ چند شعر پیش خدمت ہیں ؎

اپنے گناہوں پر بیکار نہ کوئی پردہ ڈال — تیرے چہرے پر لکھا ہے تیرے دل کا حال
نام رٹنے سے نہ بنے گا کوئی رام کا داس — پیا نہ جائے پانی جب تک بجھ نہ سکے گی پیاس
اندھا ہے ہر چند نہ ہو وہ آنکھوں سے محروم — اپنے عیب نہیں ہوتے جس انساں کو معلوم
کوئی کہے رحمٰن زباں سے چاہے بولے رام — دل جس سے خالی ہوتا ہے جھوٹا ہے وہ نام

واقعہ تو یہ ہے کہ خاور نے اس طرح کے مقصدی اور افادی مجموعہ کو شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کی تکمیل کی طرف قدم اٹھایا ہے اور اس کا یہ نقشِ قدم دوسروں کے لئے تحریک کا باعث بن سکتا ہے۔

روشنی کی کرن

رضا الجبار۔ ناشر: بزم خلوص کاچی گوڑہ حیدرآباد۔

رضا الجبار حیدرآباد کے ان نوجوان افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنہوں نے پولیس ایکشن کے بعد لکھنا شروع کیا اور پچھلے ۲۶، ۲۷ سالوں سے مسلسل لکھتے آرہے ہیں۔ اردو ادب میں رسالہ "بیسویں صدی" (دہلی) کے افسانوں کے معیار سے رضا الجبار کے افسانوں کا معیار مختلف نہیں روایتی بقول ظ۔ انصاری۔ ان کے ہاں ڈرائنگ ہال ہیں، بار روم ہے، بیزل ہے، سو بیتا ہے، اونچی سوسائٹی کی تتلیاں اور ان کے ڈرائنگ روم میں اینگلو انڈین تہذیب اور کردار ہیں...... وہ اس ماحول اور اس کے کرداروں کے چال چلن سے واقف ہیں اور موٹی لکیروں سے جلتے پہچانے خاکے کھینچ لیتے ہیں۔ باریک الجھے ہوئے نازک اور تہہ در تہہ کرداروں سے ان کی دوری صاحب سلامت معلوم ہوتی ہے۔ اور تا وقتیکہ ان کی یہ کمزوری دور نہ ہوگی اس وقت تک ان کے افسانوں میں اثر انگیزی پیدا نہیں ہوگی وہ افسانہ نگاروں کی پہلی تو کیا دوسری صف میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ کرشن چندر نے بھی رضا الجبار کی اسی کوتاہی کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ ان ہی کے الفاظ میں "انھیں (رضا الجبار کو) ابھی فکر و فن کی بہت اونچی بلندیوں پر"

رضا الجبار سے ہم مستقبل میں ایسی توقع بھی رکھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ زبان و بیان پر انہیں جو قوت حاصل ہے بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت بھی پیدا ہو جائے گی اور قاری کے لئے ان کے افسانے "تفریح طبع" کے ساماں نہ ہوں گے۔ دعوت فکر و عمل بھی دیں گے۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۳۶ شمارہ (۷)

جولائی سنہ ۱۹۷۳ء

ماہنامہ سب رس

نگران
سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت
میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم: محمد جمال الدین
منتظم: وقار خلیل

زر سالانہ: آٹھ روپے — غیر ممالک سے: پندرہ روپے
زر ششماہی: چار روپے — فی پرچہ: ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

ہر تا ۷ جون ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات منعقد ہوئے مراکز کی تعداد ۱۵ تھی۔ بلدہ کے علاوہ سنٹرل جیل، آرمور، ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اورنگ آباد۔ بنگلور، بودھن، بھینسہ، شمس آباد، عادل آباد، کریم، محبوب نگر، مغل گدہ، میرچل اور ناگر کرنول پر منعقد تمام امتحانوں میں تقریباً ۶۰۰ امیدواروں نے شرکت کی۔ مرکز سنٹرل جیل میں اس دفعہ اردو عالم میں بھی امیدواروں نے شرکت کی۔ ان کے نتائج اگلے شمارے میں شریک رہیں گے۔

گذشتہ مہینے میں ملک کے اکثر شہروں میں اقبال صدی کے جلسے منعقد کیے گئے۔ اقبال کی یاد منانے کیلئے جس جذبۂ عمل کی ضرورت تھی اس کا اظہار نہ ہو سکا۔ ۱۹۶۹ء میں جب غالب صدی منائی گئی تو رسائل نے ضخیم نمبر نکالے، جلسے منعقد کیے اور نہ جاننے والوں نے بھی غالب سے واقفیت حاصل کی لیکن اقبال کے لئے جوش اور جذبہ دکھائی نہ دیا۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ نئی نسل اپنی زبان اردو سے کچھ دور ہوتی جارہی ہے اور ادب تک اس کو رسائی کا موقع نہیں مل رہا ہے۔ یہ دور مادیت کا ہے۔ آدمی کام کرتے وقت یہ سوچنے لگا ہے کہ اس سے مجھے کیا ملے گا۔ قلب و نظر کی کشادگی اور سکون کی شکل میں نہیں بلکہ روپیے کی شکل میں اور وہ کس قدر ہوگا۔ چیز شہرت ہے جس کے پس منظر میں دولت کا حصول ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو ہم نہ اپنی زبان کو سلامت رکھ سکتے نہ ادب کو۔ حسب نسب کا تو اب سوال ہی نہیں رہا ہے۔ بہتر ہے کہ ہمارے زعمائے ملت اس نقطۂ نظر پر غور کریں اور قومی زندگی کی راہیں متعین کریں۔

گجرال کمیٹی نے اپنے دورے ختم کر دیئے اور رپورٹ تیار ہو رہی ہے ممکن ہے کہ اس مہینے میں پیش ہو۔ اس کی روشنی میں دیکھنا ہے کہ اردو کو کیا ملتا ہے۔

ترقی اردو بورڈ نے متعدد اسکیمیں تیار کی ہیں جن کی کارروائیاں چل رہی ہیں فائلیں ایک میز سے دوسرے میز پر منتقل ہوتی ہیں۔ ایک عمارت سے دوسری عمارت اور پھر ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتی ہیں۔ ان کا یہ سفر کب ختم ہوگا اور کب اردو کے بھاگ کھلیں گے۔ دفتریت کا چکر حسب ضرورت ہو تو تاخیر سے بچا جا سکتا ہے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

پروفیسر عبدالرؤف

وحشت کا تنقیدی شعور

مولانا شبلی نے شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "شاعر کے لفظی معنی صاحبِ شعور
، ہیں" اس لحاظ سے شاعر سے مراد وہ شخص ہے جو سماج کے دیگر افراد کے مقابلے میں زیادہ باشعور ہو شاعر
ینائے قوم ہوتا ہے' وہ سوسائٹی کے صرف ظاہری خدوخال کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظریں روح کی پہنائیوں تک
پہنچتی ہیں، چشم دل سے وہ ان چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے' جو انسانی ذہن کے کسی نہ دیکھے جانے والے
رشے میں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔" اسے "روشنیٔ طبع تو بر من بلا شدی" کے مصداق اسے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ
ہونا پڑتا ہے جہاں دوسروں کا گذر نہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

سماج کے سب سے زیادہ باشعور فرد کی حیثیت سے شاعر ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔
سماج کی اصلاح کرنے والوں' سیاسی رہنماؤں' فلسفیوں' موسیقاروں' مصوروں اور عوامی ذہن کی تشکیل
رنے والوں پر عائد ہوتی ہیں۔ شاعر ضمیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب فکر گمراہ ہوتی ہے تو اسے ٹوکتا ہے' وہ
ندگی کی تنقید کرتا ہے۔ اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے کے بعد خاموش نہیں ہو بیٹھتا بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ
حقائق کی تلخیوں کو کس طرح شیریں بنایا جائے۔ وہ حال کی تفسیر لکھتا ہے' اور مستقبل کی بشارت
ی دیتا ہے۔

شعر کیا ہے' اس کی ماہیت کیا ہے؟ انسانی جذبات و شعور سے اس کا کیا تعلق ہے؟ طبیعاتی' مابعد
طبیعاتی اور روحانی عالم کے درمیان کس طرح شعر رشتے قائم کرتا ہے۔ شاعری کس طرح سماجی' سیاسی اور
معاشی حالات سے متاثر ہوتی ہے اور بذاتِ خود کس طرح مختلف نظامہائے فکر کو متاثر کرتی ہے۔ وہ کس حد تک
احول کی خالق اور اس کی رہنما ہوتی ہے۔ ماضی' حال اور مستقبل کے درمیان کیا رشتے ہیں۔ شاعری
طرح ماضی کی روایتوں اور قدروں سے استفادہ کرتے ہوئے حال کو سیراب کرتی ہے اور مستقبل کیلئے
میراث چھوڑتی ہے۔ ماضی حال کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن فکر نے ایک نئی کروٹ لی ہے
ب یہ سوچا جانے لگا ہے' آیا حال ماضی کو متاثر کر سکتا ہے؟ چنانچہ دورِ حاضر کے عظیم نقاد۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ

کا خیال ہے۔

"The Poet should be alter by the present as much as the present is directed by the past and the poet who is aware of this will be aware of great difficulties and responsibilities."

مذکورہ نکات نفس شاعری سے متعلق تھے۔ دورِ حاضر کے نقاد صرف فن شعر کی تنقید پر ہی اکتفا
کرتے بلکہ وہ ہمیں یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ شاعر یعنی خالق فن پر کن عنوانات سے فرائض عائد ہوتے ہیں
کی ذات سے سماج اور ماحول کیا طلب کرتا ہے' زبان اور ماہیت شاعری اس سے کن چیزوں کا تقاضا
اب تک جس خاص ہیئت کو وہ صنف شاعری سمجھتا رہا ہے کیا اس کے علاوہ دیگر ہیئتیں شاعری نہیں
بن سکتیں۔ کیا نثر میں شاعری ممکن ہے وغیرہ وغیرہ۔

فن تنقید کا آغاز اگرچہ ارسطو کے ہاتھوں ہوا (اس کا عہد ۳۸۴ ق-م تا ۳۲۲ ق-م ہے
لیکن صدیوں تک یورپ اس خاص صنف ادب کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ دیگر اسباب کے علاوہ اس
خاص سبب یہ ہے کہ اہل مغرب یونانی علوم و حکمت سے براہ راست متاثر نہیں ہوئے بلکہ بارھویں صدی
قرطبہ اور قسطنطنیہ کی راہ سے افلاطون اور ارسطو کی تصانیف کے عربی ترجمے اور تبصرے یورپ پہنچے۔ انہ
دوبارہ لاطینی میں ترجمہ کیا گیا اور پھر یورپ کی دیگر زبانوں میں ارسطو کی تصانیف کے ایک مترجم اور مبصر
حیثیت سے ابن الرش کو خاص اہمیت نصیب ہوئی۔ جس کے نام سے یورپ میں ایک مکتبۂ فکر قائم کر لیا
جو سولھویں صدی تک قائم رہا (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا) اس طرح یورپ ابن الرش کی معرفت ارسطو
متعارف ہوا۔ اس کے قائم کردہ اصولوں کی روشنی میں موجودہ فن تنقید کی بنیاد پڑتی ہے۔

انیسویں صدی نے عظیم سائنسدانوں کو جنم دیا۔ جن کے انکشافات اور ایجادات کی مثالیں پچھلی
میں نہیں ملتیں۔ اس صدی میں سائنس کے علاوہ دیگر علوم کی بھی از سرِ نو تنظیم کی گئی۔ جن میں ایک فن
بھی ہے۔ ہماری زبان میں فن تنقید کا آغاز انیسویں صدی کے وسط سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے فا
زبان میں تذکرے لکھے گئے جن میں صرف شاعروں کے نام تخلص اور حالات سے متعلق چند فقرے لکھ
جاتے تھے۔ شاعری کے بارے میں اولاً تو کوئی رائے نہیں ملتی اور ملتی بھی ہے تو رسمی اور غیر واضح طور پر۔ ا
باوجود یہ تذکرے ہمارے ادب کی تاریخ کی بنیاد ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انتقادیات کا جو سرمایہ ہمیں نصیب ہے وہ متقدمین شعراء اردو یا فارسی کی دسترس سے باہر تھا لیکن اس کے باوجود اگر ہم قدیم دواوین کا مطالعہ کرتے وقت اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھیں کہ قدما کے نزدیک معیار سخن کیا تھا۔ اچھا شعر وہ کسے سمجھتے تھے۔ شاعری کے اصول اور لوازمات کے بارے میں ان کا کیا نظریہ تھا۔ ہمیں خاصی تعداد میں ایسے اشعار مل جائیں گے جن کی روشنی میں ہم ان کے نام کردہ معیار سخن کا پتہ چلا سکیں۔

قدیم دکنی دور یعنی پندرھویں صدی کے آغاز سے لیکر شعراء کے جتنے دیوان اور کلام کے مجموعے مرتب ہوئے ہیں۔ سب میں کچھ نہ کچھ اشعار ضرور ایسے ملتے ہیں جو فن شعر اور اس کے محاسن اور معائب کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں۔ عصر حاضر کے شعراء میں اقبال، حسرت اور وحشت کے یہاں یہ رجحان سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ فارسی اور اردو شعراء نے اپنے کلام میں فکر و فن کے متعلق شاعرانہ انداز میں جن اصولوں اور کلیوں کا ذکر کیا ہے۔ اگر انھیں عصر حاضر کے انتقادی ادب کے بالمقابل رکھا جائے تو شاید آج کا انتقادی ادب سوائے چند اجنبی اور بھاری بھرکم اصطلاحوں کے کوئی نئی چیز پیش نہیں کر سکے گا لیکن یہ امر صرف اصول اور کلیے سے متعلق ہے۔ شاعری کی تفصیلات سے نہیں۔ نفس مضمون کی وضاحت کے لئے اساتذہ متقدمین کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں جو فن شعر اور معیار سخن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں مولانا روم فرماتے ہیں ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں　　　گفتہ آید در حدیث دیگراں

حسنِ بیان یہ ہے کہ محبوب کی باتیں دوسروں کی داستان میں بیان کی جائیں۔ مولانا کے اس شعر نے جو شہرت اور آفاقیت حاصل کی وہ محتاج بیان نہیں اور کیوں نہ ہو اس میں وہ نقطہ مضمر ہے جو شعر و ادب کی روح کا پتہ دیتا ہے۔

حافظ نے بتایا ہے کہ شعروں کی بندش میں چستی اور سلاست پیدا کرنے کے بعد ہی قبول عام کی توقع کی جا سکتی ہے ؎

حسد چہ می بری اے سست نظم بر حافظ　　　قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

ایک دوسرے شعر میں انہوں نے بتایا ہے کہ ایک کامیاب فنکار اور شاعر بننے کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادبی شہ پاروں کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ اپنے ایک کامیاب شاعر بننے کی توضیح اس طرح کرتے ہیں ؎

گر بہ ایوان غزل صدر نشینم چہ عجب　　　سالہا پیروی صاحب دیوان کردم

ایرانی غزل میں اگر مجھے صدر کی جگہ مل جائے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیونکہ میں نے سالہا صاحب دیوان شعرا کی پیروی کی ہے۔

ایرانی شعراء کی تقلید میں اُردو کے اساتذہ نے بھی اس ضمن میں بہت کچھ کہا ہے۔ شعر کہاہے اا شاعر کے فرائض کیا ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ملا وجہی اپنی مثنوی قطب مشتری میں فرماتے ہیں سے

کتا[1] ہوں تجھے پند کی ایک بات　　کہ ہے فائدہ اس منے دھات دھات[2]

جو بے ربط بولے توں بیتاں پچیس[3]　　بھلا ہے جو یک بیت بولے سلیس

سلاست نہیں جس[4] کیرے بات میں　　پڑیا جاسے کیوں جز نے کرات میں

جسے بات کے ربط کا فام[5] نیں[6]　　اسے شعر کہنے سوں کچ کام نہیں

اسی لفظ کوں شعر میں لیائے تو[7]　　کہ لیا یا ہے استاد جس لفظ کو[8]

اگر خام ہے شعر کا تجکوں چھند　　چنے لفظ لیا ہور معنی بلند

اگر خوب محبوب جیوں سور[9] ہے　　سنوارے تو نور[2] علیٰ نور ہے

اپنی حلاوت بیان اور شیرینیٔ سخن کا ذکر کرتے ہوئے وؔلی فرماتے ہیں سے

ولیؔ شیریں زبانی کی نہیں ہے جاشنی سب کو　　حلاوت فہم کو میرا سخن شہد و شکر دستا[10]

دوسرے مقام پر ایک مستزاد میں فرماتے ہیں سے

فرہاد کی آتی ہے صدا روح صبا ہو　　مذکور ہے از بسکہ ولیؔ میرے سخن میں شیریں بچناں[11] کا

چونکہ میرے کلام میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے بول میٹھے تھے۔ لہذا فرہاد کی روح صبا بن کر میرا کلام سننے

شاعر کا کلام اس کی بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ سوداؔ فرماتے ہیں سے

اثر نشاں بنے ہیں عالم میں نام خاطر　　تو نے سخن کو سوداؔ اپنا نشاں بنایا

اور میرؔ کیا کہتے ہیں سے

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ　　مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

شعر و سخن کے متعلق غالبؔ کے اشعار انقلاب انگیز اور حکیمانہ ہیں سے

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل　　کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

۱۔ کہتا ہوں　۲۔ طرح طرح　۳۔ جس کی　۴۔ کتاب　۵۔ فہم، سمجھ　۶۔ نہیں۔

۷۔ تو　۸۔ کو　۹۔ سورج　۱۰۔ دکھائی دینا　۱۱۔ میٹھے بول بولنے والا۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ذکرِ عشق خوں ریزو دلگداز ہوتا ہے ؎

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

شعروں میں معنوی خوبیوں کے علاوہ لفظی خوبیوں کا ہونا بھی ضروری ہے ؎

نہیں گر سر و برگ ادراک معنی تماشائے نیرنگ صورت سلامت

سی عنوان کے تحت حالیؔ کہتے ہیں ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

(۲)

آئیے اب ہم معلوم کریں کہ وحشتؔ نے اردو اور فارسی کی اس عظیم روایت کو کس طرح برتا اور فن شعر سے متعلق کیا کیا نکات واضح کئے۔ اختصار اور جامعیت کا شمار محاسن شاعری میں ہوتا ہے۔ دیگر اصناف سخن کے مقابلے میں غزلوں میں اختصار اور جامعیت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ غزل کا ہر شعر انسان کے مختلف جذبات کا ایک مکمل نقش ایک مکمل نظام فکر ایک مکمل فلسفۂ حیات ہوتا ہے۔ حضرت وحشتؔ نے اپنے کلام میں شعوری طور پر اختصار برتا ہے اور مختلف اشعار میں اس کی افادیت پر روشنی بھی ڈالی ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

وحشتؔ خصوصیت جو تری ہے برتا اسے ہاں ہاں غزل میں شان رہے اختصار کی

اختصار سے معنی میں تشنگی نہیں بلکہ لطف پیدا ہوتا ہے ؎

زنہار بار خاطر اہل سخن نہ ہو وحشتؔ غزل میں لطف رہے اختصار کا

طوالت سے شعر کے اثر پر حرف آتا ہے ؎

گراں ہوتا ہے طبع شعر کو طول سخن وحشتؔ اگر یہ لطف رکھنا ہے غزل کو مختصر کر دے

اہل نظر کو طول سخن کی نہیں بلکہ حسن مضمون کی طلب ہوتی ہے ؎

ہمیں طول سخن سے کام کیا وحشتؔ تغزل میں کہ ہیں اہل نظر تو حسن مضمون دیکھنے والے

اشعار کے معنی مبہم نہ ہوں، پیچیدگی اور تعقید لفظی سے معنی خبط ہو جاتے ہیں اور شعر کا لطف جاتا رہتا ہے ؎

پیچیدگی سے پاک رکھ اپنے کلام کو وحشتؔ سخن میں جا ہے لطف زباں رہے

کلید عقدۂ خاطر نہیں مضمون پیچیدہ سخن میں جب بناوٹ آگئی وحشتؔ سخن بگڑا

کلام میں لطف معنی کے علاوہ لطف بیان کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر شاعر کی تمام کاوش بے ضابطہ ..کا

بندش تنگ محدود ہوں اور وہ فصاحت، بلاغت اور شاعری کے دیگر لوازمات کی طرف متوجہ نہ ہو تو، اسے شعر کا عیب سمجھا جائیگا۔ اچھے شعر کی تعریف یہ ہے کہ وہ معنی و بیان سے آراستہ ہو۔ چنانچہ حضرت وحشتؔ نے اس کی طرف بھی اشارے کئے ہیں ؎

وحشتؔ کمال شعر فصاحت کا تمام ہے ... مضمون کے خیال میں لطف بیان رہے نہ ہو

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

وحشتؔ مری نظر میں مکمل نہیں وہ شعر ... جس میں کہ حسنِ معنی و لطف بیان نہ ہو

حق تو یہ ہے کہ وحشتؔ نے معنی و بیان کی تکمیل میں عمر صرف کر دی۔ جس کا ایک گہرا اور پائدار نقش، ان کے کلام میں نظر آتا ہے ؎

فروغ طبع خداداد اگرچہ تھا وحشتؔ ... ریاض کم نہ کیا ہم نے کسب فن کے لئے

کلام اور انداز بیان کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وحشتؔ مری زباں کو تو اہل زباں سے پوچھ ... ماہر زباں کے ہوں فقط اہل زبان غلط

کیا تھا روح غالبؔ سے جو میں نے کسب فن وحشتؔ ... سخنور سیکھتے ہیں آج انداز بیاں مجھ سے

کسب فن کی وحشتؔ نے جو ریاضت کی اس کی روشنی میں ان کا دعویٰ سخن محض تعلی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جس کی شہادت ان کی غزلوں میں موجود ہے اور جس کا اعتراف عصر حاضر کے فنکاروں اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔ وحشتؔ کی شاعری کے اسی خاص پہلو (یعنی فصاحت اور بلاغت) کو مد نظر رکھتے ہوئے، پرویزؔ شاہدی نے نہایت ہی پر درد لہجے میں کہا ہے ؎

ماتمِ قوتِ نظمست عجزِ کلکِ فکر ... ہم بلاغت محو خواب و ہم فصاحت محو خواب

(خامۂ فکر اس بات پر ماتم کر رہا ہے کہ اس میں قوت نظم یعنی شعر و شاعری کی طاقت باقی نہیں رہی کیونکہ وحشتؔ کی موت کے بعد فصاحت و بلاغت کو گویا نیند آگئی ہے[1])

(۴)

اساتذہ کے کلام سے وحشتؔ نے جس طرح استفادہ کیا، اس کی مثال اس دور میں حسرتؔ کے سوا کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتی۔ اس لحاظ سے ان کا کلام نئی پود کے لئے روشنی کا ایک مینار ہے جو اسے گمراہی سے بچا سکتا ہے۔ وحشتؔ نے اساتذہ کو جو داد سخن دی ہے خود ان ہی کی زبان سے سنئے ؎

---

[1] پرویزؔ شاہدی نے علامہ وحشتؔ کے انتقال پر فارسی میں ایک نظم لکھی تھی۔ جس کا ایک شعر اوپر درج کیا ہے پوری نظم
[illegible]

سخن سے تیرے وحشتؔ طرزِ غالبؔ آشکارا ہے کہیں رنگیں بیانی ہے کہیں نازک خیالی ہے

میں تو ہوں معتقدِ داغؔ، غزل میں وحشتؔ جس کی ہر بات ہم آہنگ اثر ہوتی ہے

میرؔ اور غالبؔ کی مدح میں جو انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ وہ ان کے تنقیدی شعور کا نہایت شگفتہ اور دلاویز نمونہ ہیں۔ میرؔ کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

وفا و مہر کا ایسا نہ ہوگا راز داں ہرگز لکھے گا یوں نہ کوئی دردِ غم کی داستاں ہرگز
نہ آتی ہے نہ آئے گی کسی کو یہ زباں ہرگز میسر ہو نہیں سکتا یہ اندازِ بیاں ہرگز

جو اس کا رنگ ہے وہ کسب کا حاصل نہیں ہوگا
الم پروردہ اس کا سا کسی کا دل نہیں ہوگا

نہ گزرا وادیٔ الفت کا ایسا رہنما کوئی دلوں کے راز سے نکلا نہ اتنا آشنا کوئی
حریف اس کا بیانِ عشق میں وحشتؔ نہ تھا کوئی زمینِ ہند کیا ایران میں بھی کب ہوا کوئی

ہوا تغیرِ رنگ ایک ایک کی شیوا بیانی کا
ہلالیؔ کا ضمیریؔ کا شفائیؔ کا فغانیؔ کا

حضرت غالبؔ کو وہ اس طرح دادِ سخن دیتے ہیں ؎

عبارت تیری کیا ہے سرمۂ تسخیر ہے گویا کلامِ جاں فزا اعجاز کی تقریر ہے گویا
سخن تیرا ہے کیا اک درد کی تصویر ہے گویا جو تیرا نالہ ہے وہ نالے کی تاثیر ہے گویا

حکایت ہے ترے لب پر غمِ جاں سوزِ ہجراں کی
اڑائی تیرے خامے نے ادا دلہائے نالاں کی

نسیمِ صبح گاہی ہے کلامِ جاں فزا تیرا دلوں کو جوش میں لاتا ہے رنگ آشنا تیرا
بہارستانِ معنوں ہے خیالِ نکتہ زا تیرا فروغِ طبع کی معراج ہے فکرِ رسا تیرا

ترا دیوان غالبؔ دفترِ نازک خیالی ہے
ترا پایہ سخنداں ہندوستاں میں عالی ہے

(۴)

ہماری طبع جب ہوتی ہے جدت آفریں وحشتؔ نیا اندازِ فنِ شعر میں ایجاد ہوتا ہے

وحشتؔ فن میں نئے انداز، ایجاد، جدت آفرینی کے موید تھے۔ لیکن محض ہیئت پرستی کہ جس کا شعریت اور معنویت سے کوئی تعلق نہ ہو، غارتگرِ سخن سمجھتے تھے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

کئے کیا کیا تصرف شعر میں جدت پرستوں نے ہے وحشتؔ مدعا ان کا یہ فن برباد ہو جائے

ہے مجھے وحشتؔ تصرف ہائے بیجا کا گلہ کس قدر ہے ان دنوں اردو زباں بدلی ہوئی

غزل کا ایک مخصوص مزاج، ایک مخصوص لہجہ، ایک مخصوص انداز بیان ہوتا ہے۔ جسے محض جدت پرستی زعم میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں وہ قدما کی تقلید کو زیادہ مناسب سمجھتے تھے، چنانچہ حکیمانہ اندا سے جس سے ان کے عزم و استقلال کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

غزل کا لطف ہے وابستہ طرز کہن وحشتؔ خیال خاطر اصحاب جدت آشنا کب تک؟

کلام وحشتؔ کی جاذبیت، رنگین لفظوں کی حسین ترتیب، فکر و معنی کی شگفتگی اور تنقیدی شعور کا پختگی کے دو اہم اسباب ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے فارسی اور انگریزی ادبیات کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا تھا اور دوسرے یہ کہ متقدمین کے کلام کے مطالعہ اور اس سے اکتساب فیض کرنے میں عمر بسر کر دی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اپنی کاوشیں اردو اور فارسی کی کلاسیکی شاعری تک محدود رکھیں بلکہ اپنے ہمعصر شعرا کے کلام کا بھی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے اور انہیں داد سخن دیتے رہے ؎

طبع وحشتؔ نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض

یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کا مطالعہ کلاسیکی شاعری کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ میرؔ نے اپنے بارے میں کہا

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

حضرت وحشتؔ سے وابستہ رہنے والی ہستیوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ درد و غم کا کتنا حصہ انہیں نصیب ہوا تھا۔ اور انہوں نے اس حصے سے کیا کام لیا۔

ہمارا دور نئی قدروں کو متعین کئے بغیر پرانی قدروں کو مسمار کرنے پر تلا ہوا ہے۔ لہذا ہم کو یہ سوچنا ہے کہ کلام وحشتؔ اور ان ہی کی صف کے دیگر اساتذہ کے کلام کی روشنی میں کس طرح ہم نئی سمتیں متعین کر سکتے ہیں

ابوعلی

شہر احمد نگر
مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

مولانا کی قوتِ حافظہ بے مثال تھی، کم سے کم ان کے دور میں، تمام ہندوستان میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا، ان کو اپنے اس فطری وصف کا خود بھی احساس تھا، غبارِ خاطر میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کو لکھتے ہیں: —

"معلوم نہیں ایک خاص طرح کے ذہنی واردہ کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی، گویا کسی کونے میں سو رہی ہے، پھر کبھی وقت اچانک اس طرح جاگ اٹھے گی، جیسے ابھی وقت دماغ نے کروٹ بدل کر اندر سے نیا ہو۔ اشعار دمہا البنی کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں، تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا کہ ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں، مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے، کتاب کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا، یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحہ کا رخ کہ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا، ابھی تھوڑی دیر ہوئی حسب معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر جاری تھا۔

گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم　　　کم لذتم و قیمتم افزوں ز شمارست

ساتھ ہی یاد آگیا کہ شعر حکیم صدرائے شیرازی کا ہے جو اواخر عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور شاہجہاں کے عہد تک زندہ رہا اور آفتاب عالمتاب میں نظر سے گذرا تھا، غالباً بائیں طرف کے صفحہ میں اور صفحہ کی ابتدائی سطروں میں تذکرۂ آفتاب عالمتاب دیکھے ہوئے کم سے کم تیس برس ہو گئے ہوں گے پھر اتفاق نہیں ہوا کہ اسے کھولا ہو۔"

غبارِ خاطر کا پہلا ایڈیشن لاہور سے چھپا تھا اور تصحیح کی خدمت مولانا کے معتقد اور غالب اور سید احمد شہید کے مشہور مصنف مولانا غلام رسول مہر سے متعلق تھی۔ مولانا کی تحریک حزب اللہ کے ایک اہم رکن بھی تھے اور مولانا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، ان کو ایک واقعہ کے حوالہ میں شک و تردد ہو گیا، مولانا کو خط لکھ کر دریافت کیا، مولانا اپنے مرکز کلکتہ سے دور سفر میں تھے وہیں سے ان کو جواب دیا کہ مآثر الامراء

کی فلاں جلد کے فلاں صفحہ کی فلاں سطر میں دیکھئے' مولانا مہر نے اصل سے ملایا تو بالکل ٹھیک نکلا حالانکہ مولانا نے اس کتاب کو ۲۵ برس پہلے دیکھا تھا' اور اب تک اس کا ایک ایک شوشہ دماغ میں محفوظ تھا۔

۱۹۴۲ء میں مولانا کو بمبئی میں گرفتاری کے وقت معلوم نہیں تھا کہ ان کو کہاں لیجایا جائے گا۔ "پونہ کی سمت گاڑی روانہ ہوئی تو ان کو خیال ہوا کہ منزل مقصود شاید یرودا جیل ہو' یا آغا خاں کا پیلس' لیکن جب گاڑی پونہ سے گذر گئی اور کچھ دور پہنچ کر احمد نگر کا سواد نظر آیا' اور پھر گاڑی اسی کے اسٹیشن پر رکی' تو اس کی پوری تاریخ نظروں کے سامنے آ گئی' قلعہ احمد نگر جیل میں کتب و رسائل و اخبارات تو الگ رہے' زندگی کی معمولی ضروریات پر بھی پورا اعتماد نہیں تھا کہ وہ ہم تک پہنچ سکینگی یا نہیں" انھوں نے وہاں کے قیام کے کچھ ہی دنوں کے بعد بطور مشغلۂ تنہائی کے پورے کیف و نشاط کے ساتھ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو عالم خیال میں مخاطب کر کے خطوط لکھنے شروع کر دیئے جن میں انھوں نے اپنے حافظہ کا خوب خوب کمال دکھایا ہے' پہلے خط کا ابتدائی حصہ اسی شہر احمد نگر اور اس کے تاریخی قلعہ کے متعلق ہے' جو ان کا اور ان کے قابل صد ہزار عزت ساتھیوں پنڈت جواہر لال نہرو' ولبھ بھائی پٹیل' بابو راجندر پرشاد' اچاریہ کرپلانی' ڈاکٹر سید محمود اور آصف علی بیرسٹر وغیرہ کا عارضی مسکن تھا۔ یہاں پہنچتے ہی اس شہر اور قلعہ کی تاریخ کے مطالعہ کے تمام نقوش دماغ میں ابھر آئے' اور ہر چیز کی یاد اس طرح تازہ ہو گئی کہ گویا اس کے متعلق تاریخ کی ساری کتابیں ابھی ابھی نظر سے گذری ہیں' اس کے بعد کے خطوط میں اس کے متعلق تاریخی معلومات جا بجا بکھرے ہوئے ہیں' انھیں سب کو ہم نے تسلسل کے ساتھ اس مضمون میں جمع کر دیا ہے' جس سے اس شہر کی ایک اجمالی تاریخ نظر کے سامنے آ جاتی ہے' مقصود تاریخ لکھنا نہیں تھا کہ اس کے لیئے تاریخ کی کتابوں کی مراجعت کی ضرورت پیش آتی' جو وہاں میسر نہیں آ سکتی تھی' وہ تو آپ سے آپ اس سلسلہ کے مطالعہ کے نقوش دماغ میں ابھرے اور نوک قلم کے حوالے ہو گئے' اس کے لیے مولانا نے کوئی کد و کاوش نہیں کی' یہ نقوش ہم کو یقین ہے کہ بالکل اصل کے مطابق ہوں گے اور زیر و زبر تک کا انشاءاللہ فرق نہ ہوگا

مولانا کا موضوع تو ادب' فلسفہ اور تفسیر تھا' لیکن اگر انھوں نے تاریخ کی طرف بھی توجہ کی ہوتی تو وہ ادیب و فلسفی و مفسر ہونے کے ساتھ مولانا شبلی کی طرح جن کی چند ماہ صحبت نے آپ کی تحریروں میں بڑی جلا پیدا کر دی تھی' بہت اچھے مورخ بھی ہوتے' کہ تاریخ دانی کے لئے حافظہ بہت ضروری ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے بدرجہ اتم ان کو ودیعت فرما دیا تھا' طالب علمی میں ان کے حافظہ کا تو یہ عالم تھا کہ نفقہ اکبر' تہذیب' خلاصہ کیدانی وغیرہ سب ان کو ازبر تھیں اور ان کے استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف اپنے ساتھ کے طالب علموں کو بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیتے تھے' لیکن انھوں نے اس کی طرف ساری عمر کوئی

توجہ نہیں کی، اس لئے نفس تاریخ میں ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے غبار خاطر یا تذکرہ میں جہاں جہاں اپنی تاریخ دانی اور تاریخ کے مطالعہ کا اظہار کیا ہے، وہ محض ضمنی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک چیز احمد نگر کی تاریخ بھی ہے جو غبار خاطر کے مختلف خطوں میں جستہ جستہ آگئی ہے، اسی کو مزید افادہ کے خیال سے تسلسل کے ساتھ انہی کے الفاظ وعبارت میں ذیل میں پیش کیا جارہا ہے، فرماتے ہیں۔

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ ملک کے تقریباً تمام تاریخی مقامات دیکھنے میں آئے، مگر شہر احمد نگر اور قلعہ احمد نگر دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، ایک مرتبہ جب بمبئی میں تھا تو اس کا قصد بھی کیا تھا۔ مگر پھر حالات نے مہلت نہ دی اور ارادہ فسخ ہوگیا۔ یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ہے، جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کے انقلابات وحوادث کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں، پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے اسی نام کا ایک گانوں آباد تھا، پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑگئی تو ملک احمد نظام الملک بحری (۱۴۹۰ء تا ۱۵۰۹ء) نے علم استقلال بلند کیا اور اسی دریائے بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈالی، اور جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنایا اس وقت سے یہی نظام شاہی مملکت کا دارالحکومت بن گیا۔ فرشتہ جس کا خاندان استرآباد سے یہاں آکر آباد ہوگیا تھا۔ اپنی شہرۂ آفاق تاریخ میں لکھتا ہے کہ چند برسوں کے اندر اس شہر نے وہ رونق ووسعت پیدا کرلی کہ بغداد اور قاہرہ کا مقابلہ کرنے لگا تھا۔

کس پائمال آفت فرسودگی مباد دی روز رنگ بادیہ آئینہ خانہ بود

ملک احمد نے جو قلعہ تعمیر کیا تھا، اس کا حصار مٹی کا تھا اس کے لڑکے برہان نظام شاہ اول نے اسے منہدم کرکے از سر نو پتھر کا حصار تعمیر کیا اور اسے اس درجہ بلند اور مضبوط بنایا کہ مصر وایران تک اس کی مضبوطی کا غلغلہ پہنچا، ۱۸۰۳ء کی دوسری جنگ مرہٹہ میں جب جنرل ویلیلی (جو آگے چل کر ڈیوک آف ویلنگٹن ہوا) نے اس کا معاینہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلابات سہہ چکا تھا، پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا، اس نے اپنے مراسلہ میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔

کارواں رفتہ وانداز ہ جاہش پیداست زاں نشانہا کہ بہ ہر راہ گذار افتاد است

یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم وشجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں، اور جن میں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے۔

بیفشاں جرعۂ برخاک و حال اہل شوکت بیں ... کہ از جمشید و کیخسرو ہزاراں داستاں دارد

یہی احمد نگر کے کھنڈروں میں عبدالرحیم خانخاناں کی جواں مردی کا وہ واقعہ نمایاں ہوا تھا جس کی سرگذشت عبدالباقی نہاوندی اور صمصام الدولہ نے ہمیں سنائی ہے جب احمد نگر کی مدد پر بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجیں بھی آگئیں، اور خانخاناں کی قلیل التعداد فوج کو سہیل حبشی کی طاقتور فوج سے ٹکرانا پڑا تو دولت خاں لودی نے پوچھا تھا -

چنیں انبوہے در پیش و فتح آسمانی اگر حادثہ رو دہد
جائے نشاں دہید کہ شمارا دریابم

ایسی بھیڑ سامنے ہے اور فتح تمام تر غیر یقینی ہے اگر خدا نخواستہ کوئی حادثہ پیش آجائے تو مجھے ایسی جگہ کا نشان بتاؤ کہ تم کو پا جاؤں۔

خانخاناں نے جواب دیا تھا "زیر لاشہا"

ونحن اناس لا توسط بیننا ... لنا الصدر دون العالمین او القبر
ہم وہ لوگ ہیں کہ بیچ میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ ... یا تو ہم سب سے آگے رہیں گے یا ہمارا ٹھکانا قبر ہوگا۔

احمد نگر کے نام نے حافظہ کے کتنے ہی بھولے ہوئے نقوش یکایک تازہ کر دیے، ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی، میدان کے میدان گذر رہے تھے، ایک منظر پر پورے طور پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا، احمد نگر اپنے چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق پر ورق الٹتا جاتا! ایک صفحہ پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا ؎

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را ... تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

دیکھنے والے تھے کہ ٹرین احمد نگر پہنچ گئی، اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے، راہ میں کوئی موڑ نہیں، اسٹیشن سے قلعہ تک کی مسافت زیادہ سے زیادہ دس بارہ منٹ کی ہوگی، قلعہ کا حصار پہلے کسی قدر فاصلہ پر دکھائی دیا، چند لمحوں میں یہ فاصلہ گھٹ ہو گیا اور ہم قلعہ کی باہر کی دنیا چھوڑ کر قلعہ کی دنیا میں داخل ہو گئے ؎

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ ... دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

قلعہ کی خندق جس کی نسبت ابوالفضل نے لکھا ہے کہ چالیس گز چوڑی اور چودہ گز گہری تھی اور جسے سنہ ۱۸۰۳ء میں جنرل ویلزلی نے ایک سو آٹھ فیٹ تک چوڑا پایا تھا، مجھے دکھائی نہیں دی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس رخ سے ہم قلعہ میں داخل ہوئے اس طرف خندق پاٹ دی گئی ہے۔ اس کا بیرونی کنارہ جو کھدائی کی خاک ریز سے اس قدر اونچا کر دیا گیا تھا کہ دیوار چھپ گئی تھی، وہ بھی اس رخ پر نمایاں نہ تھا۔ دروازہ کے اندر داخل ہوئے تو ایک

مستطیل احاطہ سامنے تھا۔ غالباً دو سو فیٹ لمبا اور ڈیڑھ سو فیٹ چوڑا ہوگا اس کے تینوں طرف بارک کی طرح کمروں کا سلسلہ چلا گیا ہے، کمروں کے سامنے برامدہ ہے اور بیچ میں کھلی جگہ ہے، یہ اگرچہ اتنی وسیع نہیں ہے کہ اسے میدان کہا جاسکے، لیکن اس میں اتنی میدانیت ضرور ہے کہ آدمی کمرے سے نکل کر باہر آئے تو اسے یہ محسوس ہوگا کہ کھلی جگہ میں آ گیا ہے، شاعرانہ زبان میں کم از کم اتنی جگہ ضرور ہے کہ جی بھر کے خاک اڑائی جا سکتی ہے۔

سر پہ ہجوم درد غریبی سے ڈالیے — وہ ایک مشت خاک کہ صحرا کہیں جسے

صحن کے وسط میں ایک پختہ چبوترہ ہے، جس میں جھنڈے کا مستول نصب ہے۔

احاطہ کے شمالی کنارہ پر ایک پرانی ٹوٹی ہوئی قبر ہے، نیم کے ایک درخت کی شاخیں اس پر سایہ کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مگر کامیاب نہیں ہوئیں، قبر کے سرہانے ایک چھوٹا سا طاق ہے طاق اب چراغ سے خالی ہے، مگر محراب کی رنگت بول رہی ہے کہ یہاں کبھی دیا جلا کرتا تھا۔

اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

معلوم نہیں یہ کس کی قبر ہے، چاند بی بی کی ہو نہیں سکتی، کیونکہ اس کا مقبرہ قلعہ سے باہر ایک پہاڑی پر واقع ہے، بہر حال جس کی بھی ہو وہ اپنے دور کی کوئی مجہول الحال شخصیت نہ ہوگی، ورنہ جہاں قلعہ کی تمام عمارتیں گرا دی گئی تھیں، اس کو بھی گرا دیا گیا ہوتا۔ اللہ اللہ اس پرانی قبر کو ویران ہونا بھی تھا تو اس لیے کہ شاید ہم زندانیان خراباتی کے شور و ہنگامہ سے آباد ہو،

مغربی رخ کے تمام کمرے کھلے اور چشم براہ تھے۔ قطار کا پہلا کمرہ میرے حصہ میں آیا۔

قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے جس کے لیے یہ زندان خانہ انتخاب کیا گیا ہے، پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس رانچی صوبہ بہار میں پہلے تو بمقام مورابادی نظر بند رہا اور کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا، جس کا سلسلہ ۱۹۲۰ء تک رہا پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے قید و بند کی یہ منزل پیش آتی رہی، پھر ۱۹۴۲ء میں اسی منزل سے قافلہ بادپیمائے عمر گذر رہا ہے۔

قلعہ کی جس عمارت میں ہم رکھے گئے ہیں، یہاں غالباً چھاؤنی کے افسر رہا کرتے تھے گاہ گاہ جنگی قیدیوں کے لیے بھی اسے کام میں لایا گیا ہے، جنگ بوئر کے زمانے میں جو قیدی ہندوستان لائے گئے تھے، ان کے افسروں کا ایک گروہ یہیں رکھا گیا تھا، گذشتہ بڑی جنگ میں بھی ہندوستان کے جرمن قیدی یہیں نظر بند کیے گئے اور موجودہ جنگ میں بھی اطالوی افسروں کا ایک گروہ جو مصر سے لایا گیا تھا یہیں نظر بند تھا۔

چھتہ خاں کہتا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں فوجی افسروں کی ٹریننگ کی ایک کلاس بھی کھولی گئی تھی۔

جس کے کچھ نشانات اب تک باقی تھے، کل میرے کمرے میں الماری ہٹا کر اوس نے دکھایا کہ دیکھیئے ایک بڑا سیاہ بورڈ دیوار پر بنا ہے، یہ اصل میں انگریز ہے، میجر ہے، جب جاپانیوں نے انڈمن پر قبضہ کیا تھا، تو یہ وہیں متعین تھا۔ اس کا تمام سامان وہیں غارت ہو گیا تھا جس کا اس کو بے حد غم تھا اور اپنی بربادیوں کی داستان اکثر ہم لوگوں کو سنایا کرتا تھا، نام میجر ایم سینڈک ہے، اور اس عارضی جیل کا سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوا ہے ~~سینڈک~~ یہ نام ایسا ٹیڑھا تھا کہ ہم مشرقیوں کے لیئے کچھ نامانوس معلوم ہوا۔ سوچا کہ کوئی ایسا نام ہونا چاہیئے جو خود مانوس اور رواں ہو۔ یہاں پھر حافظے نے مدد کی، کتابوں میں کہیں نظر سے گذرا تھا کہ چاند بی بی کے زمانہ میں اس قلعہ کا قلعہ دار چیتا خاں نامی ایک حبشی تھا۔ میں نے اس مناسبت سے ان حضرت کا نام بدل کر چیتا خاں رکھدیا۔ ابھی دو چار دن بھی نہیں گذرے تھے کہ ہر شخص کی زبان پر چیتا خاں تھا، سارے قیدی اور جیل کا پورا عملہ اسی نام سے اوس کو پکارنے لگا۔

ماہیچ نہ گفتیم و حکایت بدر افتاد

ہمیں جو کمرے رہنے کے لئے دیئے گئے ہیں، ان کی کھڑکیاں قلعہ کے احاطہ میں کھلتی ہیں کھڑکیوں کے اوپر روشندان بھی ہیں، لیکن وہ سب اس خیال سے بند کر دیئے گئے کہ ہماری نگاہیں بھی باہر نہ جا سکیں، ہمارے ان کمروں میں جانے سے کچھ ہی دن پہلے یہ تبدیلی کی گئی ہے، لیکن عقل سے نہیں بے عقلی سے کام لیا گیا ہے کہ یہ کھڑکیاں اور روشندان قلعہ کے اندر ہی کھلتے تھے، اگر یہ کھلے ہوتے تو زیادہ سے زیادہ ہماری نگاہیں قلعہ کی سنگی دیوار تک جاتیں اور ٹکرا کر پھر واپس آجاتیں، لیکن ہماری نگاہوں کی اتنی رسائی بھی خطرناک سمجھی گئی۔

قلعہ کے دروازہ کی شب و روز پاسبانی کیجاتی ہے اور قلعہ اور قلعہ کے اندر بھی ہماری نگرانی کے لیئے مسلح سنتری چاروں طرف پھرتے رہتے ہیں، احاطہ کے اندر بھی ہمارے آنے سے پہلے کچھ تبدیلی کی گئی ہے، پہلے احاطہ کا شمالی رُخ کھلا تھا۔ اب دس دس فیٹ اونچی دیواریں کھینچ دی گئی ہیں اور ان میں دروازہ بنا یا گیا ہے، جس پر رات دن مسلح پہرہ رہتا ہے، فوج تمام تر انگریز سپاہیوں کی ہے۔ اور وہی ڈیوٹی پر لگائے جاتے ہیں، جیلر اور ایک وارڈر کے کوئی شخص بھی باہر نہیں جاسکتا اور ان دونوں کو بھی جامہ تلاشی دینی پڑتی ہے، مگر چیتا خاں ہمارے لئے اپنی طبعی خوش خلقی اور سلاست روی سے فرشتۂ رحمت بن گیا تھا، وہ ہماری ہر ضرورت کے پوری کرنے میں برابر لگا رہتا تھا، اور اس کی کوشش رہتی تھی کہ ہمیں کوئی تکلیف نہ ہو، اور یہ واقعہ ہے کہ جب تک وہ ہمارا نگران رہا، ہماری ہر ضرورت اوس کے ذریعہ پوری ہوتی رہی، گویا اللہ تعالیٰ نے اس جیل میں اس کو ہماری خدمت ہی کے لیئے بھیج دیا تھا۔

اس علاقہ میں عام طور پر سردی بہت ہلکی ہوتی ہے، پونہ یہاں سے صرف ۸۰ میل کی مسافت پر واقع ہے اور دکن کا یہ تمام حصّہ ایک ہی سطحِ مرتفع ہے۔ اس لئے یہاں کی موسمی حالت کو پونہ پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے موسم کا آپ کو بھی تجربہ ہوگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہوا تھا تو اس موقع پر آپ سے وہاں ملاقات ہوئی تھی۔ یہ جنوری کا مہینہ ہے اور سردی اپنے پورے عروج پر ہے، کمرہ کا دروازہ اور کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ اور ہوا کے برفانی جھونکے دمبدم آرہے ہیں، طبعاً اس طرح کا موسم مجھے بے حد پسند ہے، بے اختیار خواجۂ شیراز کا یہ ترانۂ صبح گاہی دل و دماغ میں گونج گیا اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ گنگناؤں، مگر اپنے بلند پایہ ہمسایہ کی نیند میں خلل پڑنے کا اندیشہ لبوں کو کھلنے کی اجازت نہیں۔ ناچار نوکِ قلم کے حوالے کرتا ہوں۔

صبح است و ژالہ می چکد از ابر بہمنی　　برگِ صبوح ساز و بدہ جام یک منی

گر مبحدم خمار ترا با درد سر دہد　　پیشانی خمار ہمان بہ کہ بشکنی

ساقی بہ ہوش باش کہ غم در کمین ماست　　مطرب نگاہدار ہمیں رہ کہ می زنی

ساقی بہ بے نیازی یزداں کہ مے بیار　　تا بشنوی ز صوت مغنی "ہوالغنی"

ملک الشعراء فیضی کو جب اکبر نے یہاں سفارت پر بھیجا تھا تو معاملات کی پیچیدگیوں نے اسے دو سال ملنے نہیں دیا اور اسے یہاں کے ہر موسم کے تجربہ کا موقع ملا اس نے اپنے مکاتیب میں احمد نگر کی آب و ہوا کے اعتدال کی بہت تعریف کی تھی۔

فیضی سے بھی بہت پہلے کا واقعہ ہے کہ ملک التجار شیرازی نے مولانا جامی کو دکن آنے کی دعوت دی تھی اور لکھا تھا کہ اس ملک میں بارہ مہینے ہوائے معتدل کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے، خیر بارہ مہینے موسم کا اعتدال کہنا تو صریح مبالغہ ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ یہاں گرمی کے دن بہت کم ہوتے ہیں اور یہاں کی برسات مالوہ کی برسات کی طرح بہت ہی پُر لطف ہوتی ہے، غالباً ۱۹۰۵ء کی بات ہے کہ بمبئی میں مرزا فرصت شیرازی صاحب آثار العجم سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا (یہ ایران کے فاضل نئے علوم والسنہ سے آشنا نئے انداز تحقیق اور جدید طریق تلاش و جستجو کا بڑا اچھا ذوق رکھتے تھے اور بارہ برس تک ایران کے آثار قدیمہ کے ایک جرمن محقق کے سکریٹری رہ چکے تھے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں اس کو جو معلومات بہم پہنچائی تھیں، بعد میں ان کو اپنی اس کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا تھا۔ مولانا اون کے علم و قابلیت کے بڑے معترف تھے کہ فارسی ادبیات اور بعض علوم میں ان سے مجھے بہت بیش فائدے حاصل ہوئے۔ وہ برسات کا موسم پونہ میں بسر کر کے آئے تھے اور کہتے تھے کہ پونہ کی ہوا کے اعتدال نے ہوائے شیراز کی یاد تازہ کر دی۔ میرا ذاتی تجربہ تو معاملہ کو یہاں تک نہیں لیجاتا، لیکن شیراز میرے لئے بہرحال مسافر تھا اور مرزا اسے موصوف صاحب البیت اور صاحب البیت ادری بما فیہا۔

اورنگ زیب جب دکن آیا تھا، تو یہاں کے موسم برشگال کا اعتدال اوس کی طبع خشک کو بھی ترکیے بغ
نہیں رہا۔ آپ نے تاریخ خوافی خاں اور مآثر الامراء وغیرہ میں جا بجا پڑھا ہوگا کہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا
میں بسر کرتا تھا۔ پونہ کا نام اوس نے اپنے لقب کی نسبت سے "محی نگر" رکھا تھا، مگر زبانوں پر نہیں چڑھا۔ اس
انتقال[1] احمد نگر ہی میں ہوا تھا۔

میں طبعی طور پر سردی کی شدت پسند کرتا ہوں، نومبر شروع ہوا تو طبیعت اس خیال سے افسردہ ر
کہ یہاں کی سردی کا موسم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ عام طور پر دسمبر اور جنوری کا موسم یہاں ایسا رہتا ہے جیسا دہلی ا
پنجاب میں جاڑے کے ابتدائی دنوں کا ہوتا ہے۔ میں بہت مایوس تھا کہ موسم کا لطف نہ اٹھا سکوں گا۔ لیکن
جونہی دسمبر شروع ہوا، موسم نے اچانک کروٹ لی۔ دو دن تک بادل چھایا رہا، اور پھر جو مطلع کھلا، تو کچھ نہ پوچھ
موسم کی فیاضیوں کا کیا عالم ہوا، دہلی اور لاہور کے چلّہ کا مزہ آگیا۔ جسے دیکھو سردی کی بیجا ستانیوں کا شاکی ہے
اور دھوپ میں بیٹھ کر تیل کی مالش کر رہا ہے، دہلی اور یوپی کے رہنے والے تک جو نینی تال کے موسم کے عاد
بھی رہ چکے ہیں، یہاں کے جاڑے کے قائل ہوگئے، یہاں کے لوگ تو سردی کی سختیوں کی شکایت کر رہے ہیں
اور میرے دل آرزومند سے اب بھی صدائے ہل من مزید اٹھ رہی ہے۔

گذشتہ سال جب یہاں آنا ہوا تھا۔ تو قلعہ کا صحن بالکل چٹیل میدان تھا۔ بارش نے سبزہ پیدا کر
بار بار کوشش کی۔ لیکن مٹی نے ساتھ نہیں دیا۔ احاطہ کی پوری زمین دراصل قلعہ کی پرانی عمارتوں کا ملبہ ہے، ذرہ
تو پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے اور چونے اور ریت کا برادہ ہر جگہ سے نکلنا شروع ہو جاتا ہے، درمیانی ح
گویا گنبدوں اور مقبروں کا مدفن ہے، معلوم نہیں کن کن فرمانرواؤں اور کیسے کیسے پری چہروں کی ہڈ
سے اس خرابے کی مٹی گوندھی گئی ہے اور زبان حال سے کہہ رہی ہے۔

قدح بشرط ادب گیر زانکہ ترکیبش ز کاسۂ سر جمشید و بہمن است و قباد

---

[1] مگر اس کی قبر اس کی بیگم دلرس بانو بیگم (رابعہ دورانی) کے مقبرہ اورنگ آباد دکن میں ہے، جس کا انتقال اوسی کی
میں ہوا تھا، اس کا مزار اپنی والدہ ممتاز محل کے مزار کے نمونہ پر بڑے اہتمام سے اورنگ آباد میں جو اس کا فوجی ہیڈ کوا
تھا، یہ حیدرآباد کی بہترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے اور سیاح خاص طور سے اوسکو بھی دیکھنے جاتے ہیں، مولانا نے احمد نگر
اورنگ آباد اوس کی لاش لیجانے کی تفصیل نہیں لکھی ہے، ممکن ہے اوس کی وصیت رہی ہو کہ اس علاقہ میں جہاں
اس کی موت ہو، اس کو اورنگ آباد لیجا کر اوس کی محبوب بیگم کے پہلو ہی میں اس کے باپ شاہجہاں کی ط
دفن کیا جائے اور فوجیوں نے اسی وصیت کی تعمیل میں اس کو وہاں دفن کیا ہو۔ (عالمگیر حضرت برہان الدین غریب کے پائ

ناچار تختوں کی داغ بیل ڈال کر دو دو تین تین فٹ زمین کھود دی گئی اور باہر سے مٹی اور کھاد منگوا کر انہیں بھر دیا گیا۔ جب زمین قابل کاشت ہو گئی تو ستمبر، اکتوبر میں مختلف قسم کے پھولوں کے بیج ڈالے گئے اور دسمبر شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی اور جنوری آئی تو یہ عالم ہوا کہ ہر گوشہ ان کی جھولی اور ہر تختہ گل فروش کا ہاتھ تھا اور ــــ

کنوں کہ در چمن آمد گل از عدم بوجود	بنفشہ در قدم او نہاد سر بسجود
بہ باغ تازہ کن آئین دین زردشتی	کنوں کہ لالہ برافروخت آتش نمرود
ز دست شاہد سیمیں عذار عیسیٰ دم	شراب نوش و رہا کن حدیث عاد و ثمود

عالم طاری ہو گیا۔ اس رنگ و بو کے پیدا کرنے میں سب سے زیادہ دخل پنڈت جواہر لال نہرو کا تھا، وہ صبح و شام ہاتھوں میں پھاوڑا اور کدال لیے زمین ہموار کرنے میں لگے رہتے تھے، چند ہی ہفتوں میں پورا صحن لاتعداد قسم کے پھولوں سے لالہ زار بن گیا۔ جن کی جلوہ فروشیاں ہر دم دیدۂ و دل کو دعوت نظارہ دیتی رہتی تھیں۔

یہ علاقہ اگرچہ سرد سیر نہیں ہے لیکن چونکہ بلند سطح پر واقع ہے، اس لیے پہاڑی بلبلوں سے خالی نہیں ہے، ایک روز ایک بلبل کی آواز بھی کان میں آئی اور میں تھوڑی دیر کے لیے بے خود ہو گیا۔ اگرچہ اور لوگوں نے اس کو چنداں اہمیت نہیں دی، بہر حال یہ تو اپنا اپنا ذوق ہے، اپنا ذوق دوسروں میں کہاں پیدا کر سکتا ہوں۔ ہندوستان کا عام ذوق بلبل کی نواؤں سے آشنا نہیں ہو سکتا، یہاں بلبل کی جگہ کوئل کی صدائیں شاعری کے کام آئیں اور وہی شاعری کا آب و رنگ بن گئیں، بلبل کی نواؤں کا ذوق تو ایران کے حصہ میں آیا ہے، موسم بہار آتے ہی باغ و صحرا ہی نہیں بلکہ ہر گھر کا پائیں باغ ان کی نواؤں اور نغموں سے گونج اٹھتا ہے ــــ

مرغان باغ قافیہ سنجند و بذلہ گو تا خواجہ مے خورد بہ غزلہائے پہلوی

یہاں جو کمرے ہمیں رہنے کو ملے ہیں، پچھلی صدی کی تعمیرات کا نمونہ ہیں، چھت لکڑی کے شہتیروں کی ہے اور شہتیروں کے سہارے کے لیے محرابیں ڈال دی گئی ہیں اور ان میں چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں اور موسم بہار میں ان کی نغمہ سنجیوں اور ترانہ ریزیوں سے تمام قلعہ گونجتا رہتا ہے۔

یہاں احاطہ کے اندر ایک پرانی قبر ہے۔ نہیں معلوم کس کی ہے۔ جب سے آیا ہوں سیکڑوں مرتبہ اس پر نظر پڑ چکی ہے۔ لیکن بیوی کے انتقال کے بعد اب اسے دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک نئے طرح کا انس اس سے طبیعت کو ہو گیا ہے، کل شام کو دیر تک اسے دیکھتا رہا اور متمم بن نویرہ کا مرثیہ جو اس نے اپنے بھائی مالک کی موت پر لکھا تھا بے اختیار یاد آ گیا ــــ

لقد لامنی عند القبور علی البکا رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال ابتکی کل قبر رائیتہ — لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک

فقلت لہ ان الشجا یبعث الشجا — فدعنی فہذا کلہ قبر مالک

اس مرثیہ کو عربی شاعری کی صنف مراثی میں بہت اونچا مقام حاصل ہے، یہ ایسا درد انگیز ہے کہ او لوگوں نے اپنے اعزہ کی موت پر مرثیہ لکھنے کی اس سے زیادہ کوشش کی تو وہ درد و سوز پیدا نہ ہوسکا مولانا نے اپنی بیوی زلیخا مرحومہ کا کوئی مرثیہ تو متمم بن نویرہ کی طرح نہیں لکھا لیکن جس درد و سوز کے ساتھ اون کی طو علالت اور موت کا ذکر غبار خاطر کے آخری خطوں میں کیا ہے۔ اوس سے ان کے غم، درد اور تڑپ کا اندازہ ہے جب بھی کوئی غبار خاطر کا مطالعہ کرے گا تو مولانا کے ساتھ بی بی زلیخا کی یاد بھی ضرور تازہ ہو جائیگی۔

مولانا مختلف قومی و ملی و سیاسی تحریکوں کے سلسلہ میں سنہ ۱۶ء سے سنہ ۴۲ء تک سولہ برس یدفعہ جیل میں رہے، ہجر و فراق کی اس طویل مدت کو بی بی زلیخا نے جس ہمت و استقلال کے ساتھ گذارا وہ ہندوستا ملی زندگی کا بڑا قابل فخر واقعہ ہے، ان کی زندگی نے اگر وفا کی ہوتی تو آزادی ملنے کے بعد اور ایثار پیشہ خواتین کی وہ بھی اپنی ان قربانیوں کے صلہ میں بڑے سے بڑے اعزاز کی مستحق قرار پاتیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے محبوب شوہر کی زندگی ہی میں جب کہ وہ قلعہ احمد نگر جیل میں قید و بند کی زندگی گذار رہے تھے اٹھا لیا مولانا کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ اون کی زندگی کا سارا نشاط ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اور وہ پھر کوئی ٹھوس علمی و اد کام جس کے لئے ان کو بڑی فرصت بھی حاصل تھی انجام نہ دے سکے، یہاں تک کہ اون کی تفسیر ترجمان القرآن تک جس کا اون کے قدردانوں اور عقیدت مندوں کو شدید انتظار تھا۔ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکی اور ناتمام رہ گئی، غبار خاطر کے یہ خطوط بھی جو وہ اپنے حبیب لبیب مولانا حبیب الرحمن شروانی کو عالم خیال میں مخاطب کر کے لکھ رہے تھے وہ ۱۹ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ورنہ اگر بی بی زلیخا کے انتقال کا حادثہ نہ پیش آجاتا تو سلسلہ یقیناً اور آگے بڑھتا اور شیدائیان ادب ابوالکلام کے ہاتھوں میں غبار خاطر کی ایک اور جلد آجاتی مگر مشیت خداوندی یہی تھی، جو ہوا۔ بندہ کی بے بسی بالکل مسلم ہے، تاہم تفسیر ترجمان القرآن کی نامکمل جلدوں، تذ خطبہ خلافت کانفرنس، الہلال والبلاغ کے سیکڑوں علمی و ادبی مضامین اور غبار خاطر وغیرہ کی شکل میں او کا جو سرمایۂ قلم موجود ہے، وہ ان کو بقائے دوام کی مجلس میں جگہ دینے کے لیے بالکل کافی ہے، تذکرہ اور غبار خاطر دونوں ہندوستان و پاکستان کی یونیورسٹیوں کے اردو نصاب میں شامل ہیں، جن کا دیدہ زیب اڈیشن غالبیات کے مشہور ما جناب مالک رام ایم اے نے از سر نو ایڈٹ کر کے اپنے عالمانہ و فاضلانہ و محققانہ حواشی و تعلیقات کے ساہتیہ اکاڈ دہلی کی طرف سے شائع کیا ہے، جس سے ان کی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ گئی ہے، اور ان کا مطالعہ ان حواشی کی روشنی میں بہت آسا ہو گیا ہے، مولانا زندہ ہوتے اور اپنی ان کتابوں کے ان شاندار اڈیشنوں کو دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور مالک ا

[illegible]

عبدالمنان

ولی غزل کے آئینے میں

فطرت کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنی نظر کرم اور انعامات کے لئے انسانوں میں سے صرف چند کو چن لیتی ہے اور اپنے رحم و کرم کی بارش کر کے انھیں ممتاز حیثیت عطا کرتی ہے اور بہت ساری سحرانگیز خوبیاں دے کر لوگوں سے داد و تحسین کے حصول کا موقعہ پیش کرتی ہے۔ گویا ایسی ہستیاں جو قدرت کی نگاہ کرم سے منتخب کر لی جاتی ہیں افق ہستی پر مہر کی طرح منور ہو کر ایک ایسی روشنی عطا کرتی ہیں جو لوگوں کے لئے مشعل راہ بن جاتی ہے۔ تاریخ ان بزرگ ہستیوں کے نام کو صفحات کی زینت سمجھتی ہے اور پھر آنے والی نسل صفحۂ قرطاس پر بکھرے ہوئے برگزیدہ ہستیوں کے کارنامے کو اپنے لئے ایک نئی راہ ایک نیا چمن زیست اور ایک نیا آسمانی تحفہ سمجھتی ہے اور اس کے سہارے انھیں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔

قطب شاہی دور سے ولی تک سینکڑوں شعراء پیدا ہوئے اور سبھوں نے اپنی افتاد طبع کا جلوہ دکھایا مگر جو ہستی افق ادب پر مہر درخشاں ہوئی وہ ولی دکنی ہے۔ انھوں نے ایک الہڑ بازاری کل کی چھوکری یعنی (اردو) کو اس لائق بنا دیا کہ وہ اپنی بوڑھیوں کے شانہ بشانہ چل سکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے اس کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں۔ اپنی افتاد طبع سے مرصع سازی کر کے اس قابل بنا دیا کہ کیا دکن کیا شمالی تمام علاقوں کے لوگ اپنا معشوق گرداننے لگے اور پھر میر جیسے شاعر کو بھی یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا کہ "معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا" اگر ولی نہ پیدا ہوئے ہوتے تو نہ جانے کتنی مدت تک ہمارے شعراء دکنی زبان کی ناہمواری اور فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے پیدا شدہ ناہموار زبان کی الجھن میں گرفتار رہتے۔ یہ ولی کا کارنامہ ہے کہ جس نے ایک ایسے ادب کی بنیاد رکھی جس میں ہر قسم کے مضامین مثلاً فلسفہ، تصوف، اخلاق، جمالیات، واردات حسن و عشق اور فطرت کی نیرنگیاں وغیرہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ولی نے آنے والی نسل کے لئے ایک سیدھی سادی اور کشادہ راہ متعین کی اور انھیں زبان کی اگلا گھائیوں سے نجات دلائی۔

یہ حقیقت ہے کہ ولی کی صحیح حیات زندگی سے متعلق واقعات کے سلسلے میں ناقدوں کی مختلف رائے ہے۔ خود ان کی پیدائش سے متعلق جو رائیں ہمیں ملتی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ولی کا نام شاہ ولی اللہ۔ محمد ولی اللہ۔ ولی محمد۔ محمد ولی یا شمس ولی اللہ اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ لیکن نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں

دکنی مخطوطات کے حوالے سے لکھا ہے کہ " ولی اورنگ آبادی کا صحیح نام ولی محمد تھا اور محمد اکبرالدین صدیقی نے بیجاپور کے کتب خانہ کی بیاضوں میں " غزل ولی محمد سلمہٗ " لکھا دیکھا ہے اور ولی کا نام اس طرح معاصرین کی تحریر سے ولی محمد ہونا ثابت کیا ہے ۔ شارب ردولوی بھی اسی نام سے اتفاق رکھتے ہیں۔ ولی کی زندگی سے متعلق ہم ایک مدت تک تشنگی کا احساس ہوتا رہا۔ کبھی ہم ان کے نام کبھی ان کی وفات، کبھی ان کے اورنگ آبادی اور کبھی گجراتی ہونے کے جھگڑے میں کھوئے رہے اور ان کے کلام کا صحیح طور پر جائزہ لینے سے قاصر رہے لیکن شارب ردولوی نے کتاب " مطالعہ ولی " لکھکر طلبار کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق رکھنے والے حضرات کے لئے ولی کی زندگی اور ان کے کلام سے متعلق ایک راستہ ہموار کر دیا اور اس سے قبل جو دقت اور پریشانی محسوس ہوتی تھی وہ اب بہت حد تک جاتی رہی۔ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔

" ولی پر بعض ناقدوں کے چند مقالات رسائل اور مضامین کے مجموعوں میں شائع ہوئے ہیں لیکن اب ان کو تلاش کرنا بھی مشکل ہے ۔ ان مضامین میں سے اگر کوئی مل بھی جاتا ہے تو ولی کی شخصیت اور شاعری کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا۔ ایسے مضامین سے ولی کے کلام کے کسی ایک پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح ولی کی شخصیت و شاعری تک ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی رسائی نہیں ہو پاتی .... یہی وجہ " مطالعہ ولی " کی تصنیف کی محرک بنی "۔

انھوں نے جس تشنگی کا احساس کیا تھا وہ ذاتی حیثیت رکھتا تھا۔ یعنی ان کا یہ احساس صرف انہی تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ ایسی دشواری دوسرے ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں کے سامنے بھی ہوگی اور خاص طور پر طلبار کو محسوس ہوتی ہوگی اور اسی جذبے یا تشنگی نے چشمۂ آب لانے کے لئے انھیں کوشش پر آمادہ کر دیا اور یہی کوشش طلبار کے لئے فال نیک ثابت ہوئی۔ حالانکہ جس کمی کا احساس ڈاکٹر شارب ردولوی کر رہے تھے اس کمی کی وضاحت محمد عبدالحکیم علی گڈھ نے بھی کی ہے۔ انھوں نے فرمایا

" افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ولی جیسے بلند پایہ شاعر کے حالات زندگی تفصیل سے تو کیا اجمال کے ساتھ بھی نہیں معلوم ہو سکے ہیں۔ یہ شخص اگر یورپ میں پیدا ہوتا تو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر اس کثرت سے کتابیں لکھی جاتیں کہ ایک پوری لائبریری ہو جاتی اور واقعات وسوانح کا ہر باب ولی کی تصویر کے خال تک کو روشن اور اجاگر کر دیتا لیکن ہماری غفلتوں اور بے نیازیوں کا یہ حال ہے کہ آج ہم ولی کا نام بھی متحقق نہ کر سکے "۔

غزل کے لغوی اور اصطلاحی معنی سے کون آشنا نہیں۔ ہر وہ شاعر جس نے صنف غزل کو شاعری کا میدان بنایا ہے، وہ غزل میں تغزل کی شان اپنے اپنے طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے یہ

ہی کے سر پہ کامیابی اور شہرت کا تاج رہا اور کسی کے سر پہ نہیں لیکن اگر ہر دور کے دیوان کو کھنگالا جائے
بے شمار شاعر ایسے ملیں گے جنکے کلام میں غزل کا محبوب پوری آن بان اور پورے خط و خال کے ساتھ
نمایاں ہے۔

ولی نے بھی غزل کی اصلی خصوصیات کو اپنے سامنے رکھا اور رسم عشق و عاشقی پر اپنے قلم کا زور اور
اپنی انتاد طبع کا شور اس طرح سنایا کہ شمالی ہندوستان کے وہ تمام شعراء جو دکنی زبان کو "ایک بات لچر سی
بزبان دکنی بھی" کہا کرتے تھے اور فارسی کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے ولی کی آواز پر چونک پڑے اور جس
زبان کو جنس کاسد سمجھکر حقارت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اس کی طرف پروانہ وار آنے لگے۔ ولی نے اردو
شعراء کی طرح دیوان کے دیوان چھوڑے اور نہ دفتر سیاہ کئے کہ "پست اور بلند" کے انتخاب اور مباحثے
کی راہیں کھل جائیں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ انھوں نے مثنوی قصیدے اور قصے وغیرہ لکھے ہیں اور آزاد کے
خیال کے مطابق جس چیز نے انھیں بقائے دوام بخشی وہ غزل ہے۔ ان کے یہاں غزل کا دفتر سجا ہوا نہیں
لیکن ایک چھوٹے دیوان میں معنی کی دنیا آباد ہے۔ وہ تمام باتیں کسی نہ کسی طور پر غزلوں میں پائی جاتی ہیں جو غزل کی
اصطلاح سے متعلق ہیں اور جنکو ہمارے بعد کے شعراء نے اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ اس کی طرف انھوں نے
بڑے ہی اچھے انداز سے اشارہ کیا ہے ؎

ولی دیوان میں میرے تو وہ دفتر کی حاجت نئیں — کہ مجھ دیواں میں ہر اک شعر سو دفتر برابر ہے

ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں۔ ان کا ہر ایک شعر معنی کی ایک دنیا رکھتا ہے اور اس دنیا میں حسین جلوے بھی
ملتے ہیں، محبوب کی بُو بھی۔ اس کے خط و خال بھی نظر آتے ہیں اور اس کی شان محبوبیت بھی۔ معرفت اور حقیقت
کی باتیں بھی ملتی ہیں اور دلبر سے "سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ" کا سلسلہ بھی۔

ولی کی شاعری کی اصل جولانگاہ ان کا اپنا مشاہدۂ حسن و عشق ہے۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی
بڑی اہمیت ہے جو حسن و عشق کی جو دنیا ان کے یہاں آباد ہے اس میں میر بھی نظر آتے ہیں اور غالب بھی۔
آتش بھی دکھائی پڑتے ہیں اور ناسخ بھی۔ حسرت بھی جلوہ گر ہیں اور اصغر اور فانی بھی۔ مختصر یہ کہ ان سے
اردو کے بعد کے قریب قریب تمام شعراء متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حسن و عشق کی جس انداز سے
ترجمانی ہوئی ہے وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ ولی کا عشق حقیقی بھی ہے اور مجازی بھی۔ اس میں کوئی شک
نہیں ولی نے عشق مجازی کا بھی نقشہ کھینچا ہے اور جب تک عشق مجازی کا صحیح تصور نہیں پیدا ہو سکتا عشق
حقیقی کی طرف متوجہ ہونا ممکن نہیں۔ اگرچہ ولی کی حیات زندگی کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ
ولی کا کوئی محبوب تھا جو گو شست و پوست کا تھا اور جسکو انھوں نے دل دیا تھا۔ محبت کے چرچے سب تھے۔

چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو تھی۔ لیکن ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے کسی دل رُبا سے عشق کیا تھا جس کے لمس کی گرمی اور جس کی قربت کی تمنا تھی۔ اس کی ہر تیکھی اور تیز ادا انھیں عزیز تھی۔ وہ اپنے محبوب سے خفا کسی حال میں بھی نہ ہوتے تھے۔ ہزار رنج و غم کا اظہار کرے طنز و دشنام کے تیر برسائے ان کی پیشانی پر شکن نہیں پڑتی تھی ؎

ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں پیارے تری بات پیاری لگے

ولی کا محبوب خوش ہو، رنجیدہ ہو، ناراض ہو، تیور بدلے ہوئے ہو یا لبوں پر مسکراہٹ ہو غرضکہ ہر وقت میں اس کی باتیں بھلی معلوم ہوتی ہیں ان کے ذیل کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی کہ ان کا محبوب اسی دنیا کا بسنے والا ہے ؎

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نئیں دل ہے مرا واقف اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے یہ کام دھرم کا ہے ٹک اسکو چھڑاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت یکبار اوسے موہن چھاتی سوں لگاتی جا

ان اشعار میں جو تڑپ۔ التماس۔ آرزو چھپی ہوئی ہے وہ صاف طور پر ولی کی دل باختگی کا اعلان ہے ولی اپنے محبوب کی بارگاہ میں دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ تو اپنا رخ جمال نقاب الٹ کر دکھا تا کہ دیدار یار کا شرف حاصل ہو اور پھر یہ ہدایت ہے کہ نقاب کشائی میں اس وقت لطف آتا ہے۔ جب نقاب اچانک نہ اٹھ جائے بلکہ آہستہ آہستہ اٹھے۔ جس طرح گلاب آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ پھول اپنے بند قبا رفتہ رفتہ کھول کر اپنا حسن و جمال دکھاتا ہے اسی طرح اے محبوب تو اپنا نقاب اٹھا تا کہ تیرا جمال حسن مجھے بہت زیادہ متاثر کرے اور میں تجھے بے ساختہ سونگھنے کے لئے اسی طرح قریب ہو جاؤں جس طرح پھول کے کھل جانے پر اس کی طرف متوجہ ہو کر اسے سونگھتا ہوں ؎

سجن تجھ مکھ ستی کھول نقاب آہستہ آہستہ کہ جیوں گل سوں نکلتا ہے گلاب آہستہ آہستہ

جس طرح تمام ستاروں کے بیچ چاند اپنی عظمت رکھتا ہے اسی طرح ہزاروں لاکھوں حسینوں کے حسن سے بڑھکر اس کا حسن و جمال ہے گویا ولی اپنے محبوب کو ہزاروں اور لاکھوں حسینوں پر ترجیح دیتے ہیں ؎

ہزاروں لاکھوں خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر ستاروں میں چلے مہتاب جیوں آہستہ آہستہ

ظاہر ہے کہ جب ولی کا محبوب اس حد تک حسین ہوگا کہ اس حسن و جمال کو دیکھ کر اسکا دل دے بیٹھنا کوئی تعجب کی بات نہیں تو پھر اس کی قربت اور اس کے وصال کی لذت حاصل کرنے کی تمنا فطری ہے

وہ فرماتے ہیں ؎

عجب کچھ لطف دیتا ہے شب خلوت میں دلبر سے	سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ان کے کلام سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ گجرات میں کسی پری تمثال نے ان کا دل موہ لیا تھا اسی لئے وہ وطن جانے کی تمنا بھی نہیں کرتے تھے کیوں کرتے گجرات کا حسن اور دلربا صورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان کی گہرائیوں میں ولی کے ترکِ وطن کا راز پوشیدہ ہے۔ بھلا ولی جیسے آزاد منش، اور حسن پرست انسان کیلئے اورنگ آباد اور دورِ عالمگیری کے اورنگ آباد میں کیا رکھا ہوا تھا۔ ان کا دل تو حسن کی طرف مائل تھا۔ وہ تو عبادت کے ساتھ ساتھ کچھ نظارہ بازی بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ عہد عالمگیر کا یہ کنھیا اپنے محبوب کی تلاش میں بتکدوں اور مندروں میں جاتا ہے اور جب اس کی رادھا اسے مل جاتی ہے تو وہ اپنے دل کی صدا الگا الگا کر اپنی محبت کے نغمے الاپ الاپ کر محبوب کے ساز دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور کہتا ہے ؎

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری	اے بت کی پجن ہاری اس بت کوں بجاتی جا

وہ گجرات کو اپنا وطن بنانے کی وجہ بتاتے ہیں ؎

لاگی ہے لگن تم سے چھڑا کون سکے گا	اب مجھ کو وطن اپنے بلا کون سکے گا

ولی کا محبوب بازاری نہیں۔ وہ حیا کا پتلا ہے۔ وہ بے حجاب ہونا اپنے حسن کی توہین سمجھتا ہے۔ اسی لئے عاشق کو کہنا پڑتا ہے کہ تو نقاب اٹھا دے تاکہ چاند سا مکھڑا جو چاندنی کے لئے ہے اپنا نور میرے دل کی گہرائیوں میں اتار دینے میں کامیاب ہو جائے مگر شرط ہے کہ نقاب آہستہ آہستہ اٹھنا چاہیئے جس طرح گلاب کھلتا ہے۔

یہ آہستہ آہستہ نقاب کشائی کی تمنا کچھ عاشق کو اپنے محبوب کے حسن سے محظوظ ہونے کی بھی ہے اور اسکے حیا کا احترام بھی۔ اپنے محبوب کی اداؤں کا ذکر کس انداز سے کرتے ہیں ؎

ہوش کھوتی ہے نازنین کی ادا	سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا

ہوش میرا نہیں رہا مجھ میں	جب سوں دیکھی ہے نازنیں کی ادا

لیکن ولی کا دیوان صرف عشق مجازی کی تصویر نہیں اور نہ ہی مجازی حسن و عشق کا دفتر ہے بلکہ عشق حقیقی کی ایسی دنیا آباد ہے جہاں ہم معرفت الٰہی کے جلوے دیکھتے ہیں۔ ولی کی شاعری میں تصوف کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ انھوں نے جگہ جگہ تصوف کی باریکیوں اور حیات و کائنات کے رموز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس عہد میں ولی کی شاعری پروان چڑھی وہ خالص صوفیانہ تھا وہ اس عہد کے بڑے جینیس تھے وہ کیونکر تصوف سے پہلو تہی کر سکتے تھے۔ پھر یہ کہ انھوں نے شاہ نور الدین سے درس سلوک لیا تھا۔

دہلی میں سعد اللہ گلشن سے فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ علی رضا جس کی طرف ولی نے اپنے ایک شعر میں ذکر کیا ہے۔ ان سے فیض یاب ہوتے تھے شعر ملاحظہ ہوں ؎

بادشاہ نجف ولی اللہ پیر کامل علی رضا پایا

غرضکہ ان تمام بزرگوں کی صحبت کا فیض تھا کہ ولی کو تصوف کی طرف مبذول ہونا پڑا۔ عشق کا درس انھیں ان کے مرشدوں اور پیروں نے دیا تھا۔ عشق ہی انسان کو کمال تک پہنچاتا ہے۔ عشق حقیقی عشق مجازی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ولی نے خود کہا ہے کہ مجاز کے بغیر حقیقت تک رسائی ممکن نہیں ؎

دروادی حقیقت جن نے قدم رکھا ہے اوّل قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

میر تقی میرؔ کو بھی ان کے والد عشق کا سبق دیا کرتے تھے کہ بیٹا عشق اختیار کرو۔ یہی دنیا کو چلانے والا ہے۔ اگر عشق نہ ہو تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔ اس سبق کا لازمی اثر یہ ہوا کہ میرؔ نے بآواز بلند کہا ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

اور زندگی بھر اپنے محبوب کی یاد سینے میں لئے خون جگر پیتے رہے اور آہ و نالہ اس طرح کرتے رہے کہ ان کے ہمسایہ بھی ان سے عاجز ہو چکے تھے۔ کبھی وہ محبوب کے کوچے میں اور کبھی دیدار محبوب کی خاطر دیوار کے سایہ تلے پڑے رہتے۔

ولی کو عشق کی تعلیم ان کے مرشدوں اور پیروں سے ملی تھی۔ ولی کی نگاہ میں عشق محبوب حقیقی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ عاشق کے گھر میں چراغ کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ گھر شمع عشق سے منور رہے ؎

حاجت نہیں چراغ کی تجھ گھر میں اے ولی روشن ہے بزم عشق تری شمع آہ سوں

جب عاشق محبوب حقیقی کی تلاش میں اپنے دل کے اندر اس قدر روشنی پیدا کر لیتا ہے کہ اس کا گھر اسی روشنی سے روشن ہو جاتا ہے اور اس کے دل کی گرمی ہمیشہ اسے جلاتی رہتی ہے۔ تب پھر اسے موت کا ذرا بھی ڈر نہیں رہتا ؎

عاشقوں کو نہیں ہے موت سوں کام مرقد پاک اولیا کی قسم

محبوب حقیقی تک پہنچنا اس وقت ممکن ہے جب عاشق اپنی ذات کو محبوب حقیقی میں فنا کردے اور دنیا کی لذت سے ناآشنا ہو جائے ؏

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کو فانی کرے

معشوق حقیقی کے بارے میں کہتے ہیں ؎

دیکھ تجھ میں جمال حق کا ظہور ہیں دعاگو فلک پہ سارے ملک

جہاں تک کہ ولی کی شاعری کی زبان اور بیان کا تعلق ہے ان کا کلام متقدمین اور ہمعصروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بڑے فصیح اور مترنم انداز میں کیا ہے۔ ان کی زبان کی سادگی، صفائی، برجستگی اور روانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے زبان کی بڑی خدمت کی ہے اور شاعری کو پرانی ناہموار زبان کے کوچے سے نکال کر فصاحت و بلاغت کی کرسی پر بٹھایا ہے۔ ولی فارسی الفاظ و تراکیب اور ہندی الفاظ و محاورے برمحل استعمال کرتے ہیں ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ ذرا بھی پتا نہیں چلتا کہ ولی کسی انداز میں شاعری کر رہا ہے یا اسی زبان کو اپنی شاعری کا آلۂ کار بنایا ہے جس میں وجہی کی قطب مشتری نظر آتی ہے کہ اس مثنوی کی زبان کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب شاعری کی زبان وغیرہ ذہن سے بالاتر ہوگی یا پھر ذہن کو زور دیکر معانی نکالنے کی ضرورت پڑے گی تو اس شاعری کی روح پرواز کر جائے گی اور اس کی کوئی عظمت نہیں ہوگی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس کی تاریخی اہمیت رہ سکتی ہے لیکن ادبی اہمیت وہ نہیں ہو سکتی جس کی توقع کی جاتی ہے۔ ولی کے کلام کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا کلام بہت ہی سادہ سلیس رواں اور شگفتہ ہے۔ کچھ ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جنھیں پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ ولی کی زبان اور آج کے شاعروں کی زبان میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ ولی کی زبان دکنی زبان اور شمالی ہند کی زبان کے امتزاج سے بنی تھی۔ اسلئے ہمیں ان کے کلام میں دکنی الفاظ بھی ملتے ہیں اور شمالی ہند کی زبان کے الفاظ بھی اور انداز بیان بھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ولی دکن کے شاعر تھے تو انھوں نے شمالی ہند کی زبان کیوں استعمال کی؟ ولی کی حیات زندگی کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ولی دو مرتبہ دلی آئے۔ ایک بار اپنے دیوان کے ساتھ اور ایکبار اس سے قبل ظاہر ہے کہ وہ یہاں کی زبان سے ضرور متاثر ہوئے ہونگے اور پھر انھیں سعد اللہ گلشن نے مشورے کے طور پر کہا تھا کہ تم دلی کی زبان اپنی شاعری میں استعمال کرو۔ چنانچہ ان کے کلام میں دلی کی زبان کا بھی رنگ موجود ہے۔ تحقیق کے سہارے یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ شمالی ہند میں اس وقت اردو بول چال کی زبان تھی اور اسے ادبی اظہار کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ولی کے سفر دہلی اور ان کے دیوان کی مقبولیت کے بعد شعر و شاعری کا چرچا عام ہوا۔ اگرچہ ولی کے آنے سے قبل بھی دکنی ادب کی بہت سی کتابیں دہلی آئیں اور یہاں ان کی نقلیں ہوئیں۔ لوگوں نے ان کتابوں کا مطالعہ کیا جس سے دکنی زبان کی مقبولیت کا اندازہ ہوا اور اردو زبان میں شاعری کی فضا تیار ہونے لگی۔ لیکن ولی کے آنے سے اس شوق نے تازیانہ ہوا۔ مجالس دہلی ان کے نغموں سے گونجنے لگیں۔ ہر جگہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ قدر و منزلت کا مقام دیا گیا یہاں تک کہ ولی کے جانے کے بعد ان کی غزل کا مصرع طرح مشاعرہ کے لئے دیا جاتا اور اس پر

غزل کہنا باعثِ فخر تصور کیا جاتا رہا۔

ولی سے پہلے بھی اردو شاعری دکن میں ہو رہی تھی۔ کیونکہ تحقیق کی روشنی نے ہمیں ان تمام شاعروں کو بتا دیا ہے جو تاریکی کے دھندلکے میں بھٹک رہے تھے۔ انھیں ایسے چراغ کی ضرورت تھی جو منظرِ عام پر لانے کے لئے مدد معاون ثابت ہو۔ دکن میں قطب شاہی سلطنت کا مشہور فرمانروا محمدؐ قلی قطب شاہ ایک صاحب دیوان شاعر گذرا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ ہے۔ حالانکہ آبِ حیات کے مصنف آزاد نے ولی کو پہلا شاعر مانا ہے لیکن تحقیق سے اب یہ بات عیاں ہو چکی ہے کہ اردو کا پہلا شاعر ولی دکنی نہیں ہے بلکہ اس سے قبل قطب شاہی دور کا فرمانروا محمدؐ قلی قطب شاہ پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ محمدؐ قلی کو تاریخی اور ادبی حیثیت ضرور حاصل ہے اور تذکرہ نگاروں کا انھیں فراموش کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن محمدؐ قلی کی شاعری میں بعض باتیں ایسی ہیں جن کے سبب اردو شعر و شاعری کے نقطہ نظر سے ان کے کلام کو صاف اور شیریں نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا زمانہ ایسا تھا جب دکنی زبان پر بھاشا سنسکرت اور فارسی کا اثر پڑ رہا تھا۔ اس لئے کبھی ان کے کلام میں ہندی الفاظ اور ان کی ترکیبوں اور بندشوں کی ایسی بھرمار ہو جاتی ہے کہ اشعار اردو زبان کے بجائے بھاشا کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں سہ

چھبیلی سوں لگیا ہے من ہمارا کہ اس میں نئیں ہمیں ٹک دل قرارا

بیجاپور اور گولکنڈہ کے بادشاہوں کے ادبی ذوق کی وجہ سے بھی دکنی ادب نے کافی ترقی کی اور دن بدن ارتقا کے بلند زینے طے کرتا گیا۔ اس دور میں غواصی۔ ابن نشاطی۔ نوری۔ فائز۔ طبعی۔ طالب۔ مرزا۔ مومن وغیرہ قابل ذکر شعرا ہیں۔ لیکن ان تمام شاعروں کی شاعری کی زبان اتنی صاف سلیس اور پرکشش نہیں جو ولی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان تمام شعرا کے یہاں بھاشا۔ ہندی۔ سنسکرت۔ فارسی اور دکنی زبانوں کے امتزاج سے جو زبان ابتدائی شکل میں تھی وہی آلۂ شاعری تھی لیکن ولی کے ظہور کے بعد عالم شعر و شاعری میں ایک زبردست انقلاب آگیا۔ ولی کا ابتدائی کلام زبان کے لحاظ سے کوئی امتیازی شان نہیں رکھتا لیکن وسطی دور سے انھوں نے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا اور اس رنگ کے بدلنے کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ان کے ذہن پر دلی کی زبان کا بہت بڑا اثر اس وقت ہوا جب وہ دلی آئے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے جو شاعری کی وہ زبان و بیان۔ اثر دروانی اور پرواز تخیل اور حقیقت و معرفت کی ترجمانی کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔ ان کی اسی طرزِ شاعری کا فیض ہے کہ ولی کو آج بھی انفرادی حیثیت حاصل ہے۔ ولی کے کلام کی مقبولیت اور ان کی

اُستادی کا اعتراف قدماء میں سے بہت سے اساتذہ نے کیا ہے۔ آبرو کہتے ہیں ؎

آبرو شعر ہے ترا اعجاز   پر ولی کا سخن کرامت ہے

ولی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی   دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
یہ ریختہ ولی کا جا کر اسے سنا دو   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کی مانند
شکر دہ جان گئی پھر آئی   عیش کی آن گئی پھر آئی

غرضکہ ولی کے کلیات میں سیکڑوں اشعار ایسے ملیں گے جو فصاحت کی جان اور قارئین کیلئے ایک وافر ذخیرۂ مسرت اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔ شعر کی سادگی و صفائی جدت و ندرت، سلاست و روانی، ترنم و موسیقیت سحر آمیزی و دلکشی جو ادب کو ادب کہلانے کے مستحق بناتے ہیں ولی کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

ولی کو تشبیہات و استعارات کا بادشاہ کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ایسی نادر تشبیہیں استعمال کی ہیں کہ قارئین ان کی ندرت اور لطافت سے بے حد متاثر ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت کی داد اس وجہ سے دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے ایک چیز کے لئے ہر موقع پر نئی تشبیہیں استعمال کی ہیں یہی حال اشعار کا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

زلف تیری ہے موج دریا کی   پاس تل اس کے جوں سناسی ہے
کفار فرنگ کوں دیا ہے   تجھ زلف نے درس کافری کا

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے ولی اردو شاعری کے آسمان پر مانند مہر درخشاں ہیں جس کی روشنی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ !!!

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۴۳ سے آگے) آپ کے چھوٹے بھائی حضرت سید محمد پادشاہ صاحب قادری اظہر بزم حیدر کے صدر منتخب ہوئے۔ ہر سال اس بزم کا مشاعرہ آپ کی سالانہ فاتحہ پر ہوتا رہا ہے لیکن دو سال سے ناسازگاری حالات کے باعث یہ مشاعرہ نہ ہو سکا۔ آپ کے تلامذہ میں قابل ذکر عبدالقیوم باقی مرحوم، خواجہ حمید الدین شاہد، ابوالفضل سید محمود قادری محمود۔ ابن احمد تاب، صفا کوکب۔ امجد نظمی۔ اظہر قادری، منصب عباسی۔ اختر قادری۔ نور حیدری کے علاوہ بیسیوں حضرات حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد ہیں۔ آپ کی ۲۰۰ غزلوں کا ایک دیوان مرتب کیا ہوا ہے۔ لیکن حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ اُسے شائع کروایا جاسکے۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی ادبی بزم یا ادارہ قدم بڑھائے تو ایک ادبی خدمت انجام پا سکتی ہے۔

سید احمد پادشاہ قادری اختر

سید حیدر پادشاہ صاحب قادری حیدر

نام سید حیدر پادشاہ قادری اور تخلص حیدر تھا۔ علمی تبحر اور شاعری میں ایک بلند مقام رکھنے کی وجہ سے لوگ آپ کو وحید العصر اور سراج الشعراء جیسے القاب سے یاد کرتے تھے۔

آپ کے والد سید احمد پادشاہ صاحب قادری ایک مجذوب صفت بزرگ تھے اور حیدرآباد کے ایک معزز مشائخ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

والد صاحب قبلہ حضرت حیدر ۱۹ رجب المرجب ۱۲۹۵ھ م ۱۷ رجون ۱۸۷۸ء بروز جمعہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ نظامیہ و مدرسہ منصبداران میں ہوئی اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے عربی و فارسی کے اعلیٰ امتحانات کامیاب کئے آپکو یوں تو بچپن ہی سے شعر و سخن سے دلچسپی تھی لیکن سترہ سال کی عمر سے باقاعدہ شعر کہنے اور محفلوں میں شرکت کرنے لگے آپ نے حضرت داغ اور حضرت شاد کی محفلوں میں بھی شریک ہوکر اپنے کلام پر داد و تحسین حاصل کی۔

ابتداء میں آپ نے حضرت عاشق حسین خان ہاتف کو اپنا کلام دکھایا جلال الدین توفیق سے کچھ دن مشورہ کیا۔ بعد میں علامہ ضامن کنتوری کے حلقہ تلامذہ میں شریک ہوئے۔ ۸۶ سال کی عمر میں بتاریخ ۳ر شوال المکرم ۱۳۸۴ھ م ۱۷ر فروری ۱۹۶۴ء بروز دوشنبہ ۱۲ ساعت دن اس جہان فانی سے رخصت ہوئے اور حیدرآباد کے محلہ کاما ئی پورہ میں درگاہ حضرت سید میراں محی الدین شاہ قادریؒ میں دفن کئے گئے۔

نادان، سائل، قیس، مائل اور ظہیر دہلوی جیسے اساتذہ سخن کی محفلوں میں اپنا کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی، باغ کے ان معیاری اور بلند پایہ مشاعروں میں بھی آپ نے اپنا کلام سنایا جس میں علم و ادب کی عظیم ہستیاں مثلاً وحید الدین سلیم، ضیا، گورگانی مرزا ہادی رسوا۔ علامہ نظم طباطبائی شرکت کرتی تھیں۔ آپ نہایت منکسر المزاج تھے۔ ہر ایک سے نہایت خوش خلقی سے پیش آتے جو کوئی آپ سے ایک مرتبہ ملتا دوسری مرتبہ ملنے کا خواہاں رہتا۔ آپ کی گفتگو کا انداز اس قدر دلنشین اور اسلوب بیان اتنا شیریں ہوتا کہ مخاطب کو وقت کا احساس نہ ہوتا۔

آپ کو اپنے والد سید احمد پادشاہ قادریؒ کے علاوہ سید عبدالقادر قادریؒ سے بھی بیعت وخلافت

حاصل تھی۔ پیر و مرشد کی خصوصی توجہات سے ایک عرصہ تک آپ پر جذب کی کیفیت طاری رہی اور ایک عرصہ تک آصف نگر کے گرد و نواح کے جنگلوں میں گھومتے رہے۔ لیکن آپ کے منجھلے بھائی سید صفدر پادشاہ قادری نے آپ کے پیر و مرشد سے استدعا کی کہ یہی گھر کے بڑے اور ذمہ دار ہیں اس لئے ان کا حالت سکون میں رہنا ضروری تھا تو پیر و مرشد اپنی توجہ سے آپ کو حالت سکون میں لے آئے۔

آپ کا سلسلہ نسب سیدنا غوث الاعظمؓ سے ہوتے ہوئے حضرت سیدنا علیؓ تک پہنچتا ہے۔
آپ نے اپنے تخلص حیدر کو اکثر شعروں میں ذو معنی انداز میں استعمال کیا اور حضرت علیؓ سے نسبت کو ظاہر کیا ہے بلکہ ہر غزل کا مقطع آپ کی اس نسبت کی عکاسی کرتا ہے۔ مثلاً ؎

غلامی کا شرف پہلے سے یوں بھی مجھکو حاصل ہے — کہ میرا سلسلہ ملتا ہے حیدرؓ شیر یزداں سے
کیا نام ہے حیدر حیدرؓ کا کیا شان ہے حیدر حیدرؓ کی — مشکل جو پڑی آ پہنچا دیں ایسی بھی کوئی سرکار تو ہو
کاش حیدر جنگ خیبر میں جو ہوتے ہم شریک — کچھ نہیں تو قوت بازوے حیدر دیکھتے
حیدر کوئی بنے نہ بنے ان کا اختیار — ہم تو غلام حیدرؓ کرار بن گئے

۱۹۶۲ء میں اُردو ہال میں جن معمر و بزرگ شعراء کی امداد کے لئے مشاعرہ کیا گیا تھا ان میں والد محترم سید حیدر پادشاہ صاحب قادری حیدر کا نام بھی شامل تھا۔
آپ کے کلام میں بلا کا سوز ہے لیکن کوئی شعر بے مقصد نہیں ملتا جہاں تک الفاظ کے برتنے کا تعلق ہے۔ دلکش حسن بیان برجستہ محاورات فصاحت و بلاغت کا امتزاج رنگینی اور محاکات آپ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔
آپ نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کر کے اپنی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن غزل آپ کی پسندیدہ صنف ہے۔ نمونے کے طور پر چند اشعار پیش ہیں ؎

لے بہار آئی ہے اب کیا سوچتا ہے سر اٹھا — پی بھی لے چل توڑ توبہ جام لے ساغر اٹھا
میں اُٹھا کیا دل اُٹھا ارماں اُٹھے حسرت اُٹھی — قتل کرنے کو مرے جب وہ ستم پرور اٹھا
بڑا دعویٰ تھا سب کو ان سے عرض حال کرنے کا — انھیں دیکھا تو کانٹے پڑ گئے سب کی زبانوں میں

وہ ترے شاعر ہی نہیں تھے۔ مسائل حاضرہ پر بھی ان کی نظر تھی۔ اس کا ثبوت مختلف اشعار سے ملتا ہے ؎

یہ محفل لوٹنے والی ہے ظلمت چھانے والی ہے — کہیں دھوکا نہ کھا جانا چراغ بزم امکاں پر

آہ قریب آستاں لٹ گیا دل کا کارواں
کس سے کہوں غم نہاں کس کو کہوں بچائے جا

تمہارے کارواں میں بھی تو آخر تیرا ساتھی ہوں
یہ تیری بے رُخی کیسی رفیقِ راہ منزل سے

چونکہ آپ کا سلسلہ خمخانہ تصوف سے وابستہ ہے اس لئے آپ کے کلام میں بھی تصوف کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کبھی تو ہوش میں لا سرفرازِ دید کر مجھ کو
فقط جلوؤں کے دامن میں رہے گی بے خودی کب تک

یہ نہیں ہے مقصد زندگی کہ صلوٰۃ و صوم ہے بندگی
یہ عبادتیں نہیں کام کی غم دوست دل میں اگر نہیں

جب سامنے اُن کا جلوہ نہیں کیا فائدہ ایسے جینے سے
یوں جینے کو جی جینے والے ہونے کو گذر ہو جاتی ہے

بکھری ہوئی ہیں مصحف ایماں کی بندشیں
ان صورتوں کو جوڑ کے قرآن بنائیے

کچھ رباعیات بھی پیش خدمت ہیں ؎

(۱)
کس سے کہوں کیا کہوں کہانی اپنی
غفلت میں بسر کی زندگانی اپنی
بے وجہ کمر میں خم نہیں ہے حیدرؔ
میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں جوانی اپنی

(۲)
ہیبت سے عدو کا سینہ پھٹ جاتا ہے
کیا نام ہے جس سے رنج کٹ جاتا ہے
کیا پوچھنا ان کی برتری کا حیدرؔ
جن کیلئے خورشید پلٹ جاتا ہے

(۳)
ہستی کو رہ عدم سے ہوتے آیا
افسوس ازل کا عیش کھوتے آیا
دنیا میں زبردستی خدا نے بھیجا
یہ اس کی دلیل ہے کہ روتے آیا

(۴)
کم بخت یہ گھر بیٹھے کدھر آئی ہے
کھانے کو مرے جان دجگر آئی ہے
میں تاب و تواں سے ہو گیا ہوں محتاج
جس روز سے پیری مرے گھر آئی ہے

آپ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ یمین السلطنت کے مشاعروں میں بھی ہر سال شریک ہوتے رہے۔ اپنے اُستاد حضرت علامہ ضامن کنتوری کے انتقال کے بعد بزم ضامن کے صدر منتخب ہوئے اور تاحیات صدر رہے۔ اِس بزم کے معتمد ٹھاکر بجرنگ سنگھ فقیرؔ ہیں جو اب بھی اس بزم کو چلا رہے ہیں۔ آپ کے انتقال سے ۰ سال پہلے آپ کے تلامذہ نے آپکے نام سے بزم حیدر قائم کی جسکا افتتاحی مشاعرہ ۲۹ جون ۱۹۵۷ء کو نواب محمد حمید خاں صاحب کی ڈیوڑھی واقع شاہ گنج میں بطرح ذیل ہوا ؎

دیکھیے اب افتتاحِ بزمِ حیدرؔ دیکھیے

اِس بزم کے پہلے معتمد محمد مصطفیٰ بشیرؔ اور معتمد مشاعرہ غلام دستگیر اثمؔ تھے۔ حضرت قبلہ کے انتقال کے

محمد اکبر الدین صدیقی

خاور نامہ

خاور نامہ اُردو ادب کی سب سے طویل رزمیہ مثنوی ہے جو ملکہ خدیجہ سلطان کے حکم کی تعمیل میں فارسی سے ترجمہ کی گئی۔ اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ان کارناموں کی داستان بیان کی گئی ہے جو بالکل فرضی اور خیالی ہیں۔ بلحاظ قصہ اس کی حیثیت افسانے سے زیادہ نہیں۔

ملکہ خدیجہ سلطان گولکنڈہ کی شہزادی تھی حیات بخشی بیگم جیسی مدبر دانا اور نفیس خاتون اس کی ماں تھی۔ حیات بخشی بیگم کی یادگاریں حیدرآباد میں آج بھی باقی ہیں۔ حیات نگر، ماں صاحب کا تالاب، حسینی علم، بی کا علم، محرم کا لنگر حیات بخشی بیگم کی مسجد اور گنبد آج بھی اس کی یاد دلاتے ہیں۔ خدیجہ سلطان اسی کے سایہ عاطفت میں رہی اور محمد عادل شاہ والی بیجاپور سے بیاہی گئی اور آج اپنے شوہر کے پہلو میں مشہور عالم عمارت گول گنبد یا بولتی گنبد میں ابدی نیند سو رہی ہے۔

شعر و ادب کی دلدادہ اس شہزادی نے بیجاپور پہنچکر اپنے رفاہی کاموں کی بنا پر بڑا نام پیدا کیا۔ کیا عجب ہے کہ بولتی گنبد کی تعمیر میں بھی اس کے مشوروں کو دخل رہا ہو۔ اس نے شعر و ادب کی فضا کو چمکانے کیلئے وہاں کے شعرا کو مثنویاں لکھنے یا فارسی سے ترجمہ کرنے کیلئے اجالہ اور انعامات مقرر کئے چنانچہ اس کے غلام ملک خوشنود نے جو بعد کو سفارت کے عہدہ پر فائز ہوا دو مثنویاں یوسف زلیخا اور ہشت بہشت فارسی سے ترجمہ کیں اور محمد عادل شاہ کے دبیر یعنے فرمان نویس اسمٰعیل مخاطب بہ خطاط خاں کے لڑکے کمال خاں رستمی نے ابن حسام کی فارسی مثنوی کا ترجمہ کیا۔ چوبیس ہزار اشعار کی یہ مثنوی اس نے ڈیڑھ سال کی مدت میں تکمیل کی اس کا ابتک صرف ایک ہی نسخہ دریافت ہوا ہے جو انڈیا آفس کے کتب خانہ میں ہے اس میں جابجا تصویریں دی گئی ہیں ممکن ہے کہ یہ ملکہ کیلئے تیار کیا گیا ہو۔

ابن حسام کے فارسی خاور نامے کے تین نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک نسخہ برٹش میوزیم میں ہے اور دو کتب خانہ انڈیا آفس میں اس طرح فارسی کے تین اور اُردو کا ایک نسخہ سب لندن کے کتب خانوں کی زینت اور گنج گرانمایہ بنے ہوئے ہیں۔

کمال خاں رستمی کے آبا و اجداد چھ پشت سے عادل شاہی دربار میں دبیری کے منصب پر فائز رہے۔

کمال خاں بھی دبیر تھا اور اپنے آبائی خطاب خطاط خاں سے مشرف تھا۔ وہ نہایت عالم و فاضل اور اردو اور زود گو شاعر تھا اس نے اس مثنوی کے علاوہ قصیدے، غزلیں اور مرثیے لکھے ہیں لیکن اس مثنوی کے سوا ابھی تک اس کا کوئی دوسرا کلام دستیاب نہیں ہوا۔

اس کی زبان اور اس کے معاصرین کی زبان میں قدرے فرق نظر آتا ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ابراہیم عادل شاہ اور محمد عادل شاہ کا دربار فارسی شعراء کا ملجا و ماویٰ تھا۔ ملک ظہوری، حکیم آتشی اور مقیمی جیسے بلند پایہ شعرا اور نثر نگار اس دور میں موجود تھے جنھوں نے فارسی دنیا میں اپنے لئے اعلیٰ مقام پیدا کیا ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کمال خاں رستمی بھی جو حکیم آتشی اور مقیمی کا معاصر فارسی کا بلند پایہ شاعر رہا ہو۔ چونکہ دکنی اس کی مادری زبان تھی اس لئے ملک کے حکم کی تعمیل میں اس ابن حسام کے خاور نامے کا ترجمہ دکنی زبان میں کیا۔ حقیقت میں اس کی زبان دکنی ہے اور ریختہ بھی یہاں ریختہ سے میری مراد فارسی آمیز دکنی سے ہے کہ وہ کہیں کہیں آدھا مصرع دکنی میں کہتا ہے اور آدھا فارسی میں۔ ان چوبیس ہزار اشعار میں متعدد شعر ایسے ملیں جنھیں ریختہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کی زبان دکنی اور بیجاپوری لب و لہجہ کی ہے جو آج بھی بیجاپور کی گلیوں میں سنائی دیتی ہے۔ اس نے ترجمہ کرتے وقت اس کا خیال رکھا ہے کہ الفاظ مشکل نہ ہوں اور زبان حتی الامکان عام فہم ہو۔ اس نے اپنی مثنوی کی بحر متقارب یعنی شاہنامے کی رکھی ہے۔ جس میں رزمیہ نظم بہ آسانی کہی جا سکتی ہے۔ اس قدر طویل مثنوی کا جو تقریباً ۸۰۰ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے خلاصہ دینا بھی ممکن نہیں۔ مختصر لفظوں میں قصہ یہ ہے کہ ایک دن پیغمبر خدا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفل میں مالک، سعد وقاص، ابو المعجن اور حضرت عمر وغیرہ بھی بیٹھے تھے۔ کسی نے مالک کی بہادری کی تعریف کی۔ سعد وقاص اپنی بہادری پر نازاں تھے ابو المعجن کو ان کا یہ عجب و ناز پسند نہ آیا اور دونوں میں تکرار ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے انھیں بلند آواز سے جھگڑتے دیکھ کر حضرت عمرؓ غضبناک ہوئے اور دونوں کے ایک ایک درہ مار دیا۔ دونوں محفل سے نکلے گھر گئے اور گھر سے جنگل کی راہ لی دونوں حضرات ... کے دل میں حضرت عمرؓ سے انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ مختلف شہروں اور بادشاہوں کے درباروں میں گئے اور جنگوں میں حصہ لے کر نام پاتے رہے۔ تکلیفیں اٹھائیں۔ قید کی صعوبتیں برداشت کیں اور حضرت علیؓ نے جو آنحضرت کے حکم کی بناء پر ان کی تلاش میں نکلے انھیں ان تکلیفوں سے نجات دلائی مثنوی میں ایک بات اہم نظر آتی ہے یہ حضرات پہلے اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں اگر کوئی قبول کرتا ہے تو اس کی سلطنت اسی کو بخشتے ہیں ورنہ جنگ آزما ہوتے ہیں۔

خاور نامے کے چند بادشاہ جن سے لڑائیاں ہوتی ہیں ان کے نام ملاحظہ ہوں۔ بلال شاہ، زاور شاہ، تنطار شاہ، بادشاہ زنگیاں۔ قباد شاہ خاوراں، سلیمان۔ جمشید۔ نہروز ناہید، بادشاہ نیل گوشاں وغیرہ ان میں بعض نے اسلام قبول کیا اور بعض مارے گئے۔

عورتوں کے بغیر افسانے میں رنگینی نہیں پیدا کی جاسکتی۔ چند نام یہ ہیں۔ دل افروز۔ گل چہرہ۔ پری رخ۔ گلنار۔ پری کوہ بلور وغیرہ۔

حضرت علیؓ کے رفقائے کرام میں ابوالمحجن۔ سعد۔ مالک، عمرامیہ۔ قنبر۔ خالد۔ نتاح وغیرہ۔ چند شہروں اور قلعوں کے نام سنیئے۔ کرٹھ نور۔ ریاض کوٹھ۔ صباح کرٹھ۔ پولاد کوٹھ۔ شہر تم۔ شہر خاور۔ کوہ بلور۔ قلعہ آدمی خوار وغیرہ۔

رستمی نے اپنی مثنوی میں تمام لوازمات حرب کو قائم رکھا ہے۔ مبارز طلبی، رجز، لڑائی کی کیفیت اور منظر کشی سبھی مثالیں ملتی ہیں۔ باغ کا منظر دیکھئے کہ دلدل باغ یا چراگاہ کی تلاش میں نکلتا ہے کہتا ہے۔

کہ جوں دلدل حیدر نامدار	گیا جاد داستاں میں سے ذوالفقار
ڈھونڈیا باغ ہور چشمہ ہور مرغزار	دیکھیا سب بیابان ہور جوئبار
عجب دیکھیا یک ٹھار یک مرغزار	دسے دیس کوں جھاڑاں میانے اندھار
کھلیا جوں کہ فردوس اس ٹھار کوں	آوے باس خوش باس ہر یار کوں
ملائے سر ہیں سر جو شمشاد سرو	خوش آواز تھے ہر درے میں تدرو
اتھے سنبل و سوسن یکیبا سلے	کریں قمریاں تس اوپر غلغلے
پیا لالے لائے کا سنبل کھلیا	کیا مست ساقی ہور اس سے پلا

اسی طرح سے ۳۳ اشعار تک منظر کشی کی ہے۔

مبارز طلبی کی ایک مثال دیکھئے سے

کیا نعرہ ان آکے مرد دلیر	او مرداں میں بھی دھرتا تھا تنک شیر
کھیا آکر ایلاق جنگی ہوں میں	سپہ دار ہور شہ بار سنگی ہوں میں
اگر قہر کروں بازو میں حسام سوں	فلک تھے تلیں لیاؤں بہرام کوں
مری تیغ دھرتی ہے او آب و تاب	جو اس عکس تھے چاند ہوے آفتاب
آتال کون مردانہ ہے زیں سپاہ	آ جہاں جیگا تھے بس لدم گاہ

حضرت علی کا مخالف، اپنے ساتھی سے ذوالفقار کی تعریف کرتا اور اس کے دل میں تلوار کا خوف

اس طرح پیدا کرتا ہے ؎

نکو جا تو حیدر سوں لڑنے کو بھار جو دیکھیں ہیں اس کا ہیں کار زار
اسے تیغ ہے اژدہائے دو سر اُنے کاٹتی ترک و تاج و سپر
او پولاد کی تیغ ہے آب دار دو کرتی ہے گھوڑے سوں مل کر سوار
زمیں سانٹھ کرنے منگے گر او جنگ زمیں کوں نہیں ہے مجال درنگ
نہیں ڈرتا دریا و ڈونگر تے او دُنیا میں کے سگلے بی لشکر تے او
سوار ایسا و گھوڑا ایسا و تیغ تجھے جیو تھے اپنے نئیں ہے دریغ

خاور نامہ ایک سمندر ہے اس کے دو قطرے یہاں پیش کئے گئے ہیں۔ رستمی کی تشبیہیں دکنی محاورے، فن حرب میں اس کا تجربہ، دکنی اور فارسی زبان پر اس کی قدرت اور ملکہ اس کی تفاصیل کی پیش کشی غرض ہر طرح وہ اپنے فن میں طاق نظر آتا ہے۔

خاور نامہ لکھنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ایک یادگار چھوڑ جانا چاہتا ہے، اس کے الفاظ

ہوا تھا اندیشہ منجے رہنمائے رکھوں یادگار ایک میں بی بجائے
سنوارا یا ہوں اس نامہ سوں خامہ کوں نہایت کو انپڑایا ہوں نامہ کوں
نہایت ہوا نامۂ نامدار ہوا نامداراں اُپر یادگار
اگر مائی ہووے گا تن زیر خاک مرا نانو جیتا ہے مج کیا ہے باک

اس کے بعد تاریخ لکھی ہے ؎

نبیؐ کی جو ہجرت تھے کیتا خیال ہزار پر پچاس اور نو کے تھے سال
کیا رستمی اس وقت یو کتاب بندیا بات کے گوہراں بے حساب

اور نام کہتا ہے ؎

خاور نامۂ دکنی کیتا ہوں نام ہوا خاوراں پر قصہ سب تمام
اس اوپر بہت گذرے گا روزگار اچھے گا یو دنیا میں ہو یادگار

اور اس خاور نامہ کی کہانی ختم ہوئی۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

وفاؔ سکندرپوری

کہاں تھا خواب میں تعبیر میں حباب ملا
کہ ساتھ آئی تباہی بھی جب شباب ملا

سب اُن کی بزم سے لوٹے مئے نشاط لئے
جو میں گیا تو مجھے دیدۂ پُرآب ملا

نظر کی خامی کہوں یا کمالِ جلوہ گری
حجاب اور بڑھا جب وہ بے حجاب ملا

بلا سے اُس نے مرے دل کو پائمال کیا
تصورات کا عالم تو لاجواب ملا

کسی کی راہ میں ہلکی سی روشنی بھی نہیں
کسی کی راہ کا ہر ذرّہ آفتاب ملا

مرے گناہ کا مانا کوئی حساب نہیں
حضور آپ کی رحمت کا کب حساب ملا

کہا اُداس ہوں، بولے یہی تو دنیا ہے
مرا سوال تھا کچھ، اور کچھ جواب ملا

جو گھر میں رہ کے بھی رہتا تھا سات پردے میں
وہ آج مجھ کو سرِ راہ بے نقاب ملا

لگا جو دور سے اک بحرِ بےکراں اے وفاؔ
گیا قریب تو ہنستا ہوا سراب ملا

مومن خاں شوقؔ

درد احساس جگائے تو غزل کہتا ہوں
زخم دل پر اُبھر آئے تو غزل کہتا ہوں

حادثہ عشق کا یا حسن کا دلکش منظر
کوئی نظروں میں سمائے تو غزل کہتا ہوں

سرزمین پر مری اظہارِ عقیدت کے لئے
روشنی مہر لٹائے تو غزل کہتا ہوں

میری آنکھوں میں رہے کوئی نظر کی صورت
کوئی دل دل سے ملائے تو غزل کہتا ہوں

ظلمتِ شب کو مٹانے کے لئے خود کو فلک
چاند تاروں سے سجائے تو غزل کہتا ہوں

شعر کہنے کے لئے چاہیئے تحریک کوئی
شوقؔ دل چوٹ جو کھائے تو غزل کہتا ہوں

قطب سرشار

چاندی کی آرزو نہیں تھیں سونے کے خواب تھے
لمحات عہد رفتہ کے عزت مآب تھے

وہ آج بے ضمیر ہیں، ننگِ وجود ہیں
ٹھہرا نا ہیں کل جو خود اپنا جواب تھے

فرصت کہاں کہ تم ہمیں پڑھتے کبھی کبھی
ہم جو کتاب درد کے دلچسپ باب تھے

سو بار اس سے مل کے بھی ہم اجنبی رہے
آخر ہمارے درمیاں کتنے حجاب تھے

دل سے جو شعلے اٹھتے تو جلتا رہا دماغ
ہم اپنے ہی وجود کے حق میں عذاب تھے

سائے بھی آج ان کے اندھیرے میں مٹ گئے
کل تک جو عہد ساز تھے اہل کتاب تھے

ڈاکٹر شیدا دہلوی

ہوتی نہ اگر کھوٹ کوئی دل میں تمہارے
مشکوک نظر آتے نہ انداز ہمارے

کہتے ہیں ابلتے تھے جہاں عشق کے دھارے
بہتے نظر آتے ہیں وہاں خون کے دھارے

تم نے بھی کبھی پوچھا ہے کچھ حال ہمارا
ہم نے تو مصیبت میں بھی گن گائے تمہارے

اب تیرے سوا کون ہے کشتی کا نگہبان
موجوں کا تلاطم ہے سمندر کے کنارے

آئے ہیں بہت دور سے غمخوار سمجھ کر
اب تم ہی کہو جائیں کہاں درد کے مارے

قسمت کو تری روتا ہوں اے وقت کی دیوی
الجھی ہوئی زلفوں کو تری کون سنوارے

اس دورِ مخالف میں یہی فکر ہے شیدا
بن جائیں نہ دشمن کہیں احباب ہمارے

مہدی پرتاب گڈھی

خوشبو کا اک نشاں بھی وہاں اب نہیں رہا
خالی مکاں میں کس لئے دیتے ہو تم صدا
میری تباہیوں کا سبب پوچھتے ہو کیا
میں خود ہی اپنی راہ کا پتھر بنا رہا
یہ ہے ہمارے عہد کے انساں کا مسئلہ
ہر گام پہ بکھرتا رہا، ٹوٹتا رہا
سچ کو سہارنے کو نہیں اس میں حوصلہ
اب بار بار دیکھ رہا ہے وہ آئینا
تلوؤں کو مل گیا ہے مرے ذوق زندگی
کانٹوں نے کر دیا ہے رفاقت کا حق ادا
صورت کوئی بھی میری شناسا نہیں رہی
یہ کون میری یادوں کا چہرہ کھرچ گیا
اک مٹھی دھوپ عاریتاً بھی نہ مل سکی
ہم آج آگئے ہیں کہاں سوچنا پڑا
کس نے کرید دی ہے مرے ذہن و دل کی راکھ
یاد آرہا ہے پھر کوئی چہرہ کتاب سا
مہدی بھی باوجود مخالف ہواؤں کے
پرچم نئی حیات کا لے کر نکل پڑا

کریم اسدی

محفل میں ان کی بات ہماری جو چل گئی
بل پڑ گیا جبیں پہ یہ بات ان کو کھل گئی
دیکھیے تو کوئی رشک نسیم بہار کا
زخم جگر کے پھولوں کو آ کے مسل گئی
دانشور چمن سے یہ پرچھے تو پوچھے کون
آتے ہی کیوں بہار خزاں میں بدل گئی
مستی میں دیکھا گردش دوراں نے جب ہمیں
کترا کے سامنے سے ہمارے نکل گئی
عنوان بن گئی وہ کتاب حیات کی
جو بات میرے منہ سے جنوں میں نکل گئی
نبض چمن پہ ہاتھ جو رکھنے کی آئی بات
ارباب گلستاں کو یہ دیکھا کہ کھل گئی
رند خراب میں ترا نام آتے ہی کریم
تلخئ زندگی مرے ساغر میں ڈھل گئی

غلام مرتضیٰ راہی

شاخ تا شاخ مرا خون تمنا تھا کبھی
ان درختوں کے تلے اک گھنا سایہ تھا کبھی

کیسی ٹھنڈک سی پہنچتی ہے مرے تلووں میں
ایسا لگتا ہے یہاں پر کوئی دریا تھا کبھی

اب یہاں میں کسی گنتی میں نہیں ہوں شاید
ورنہ اس عالمِ ہُو میں تن تنہا تھا کبھی

جانے اب پانو کہاں پڑنے لگا ہے میرا
ایسا نزدیک سمندر تھا نہ صحرا تھا کبھی

ڈال دے خاک کہ ماضی مرا روشن ہے بہت
رائج الوقت مرے نام کا سکہ تھا کبھی

پوچھ اس گنبدِ بےدر کو جگا کر کہ تجھے
ایک آواز سے ہم نے ہی پکارا تھا کبھی

ہاتھ پر ہاتھ دھرے سوچ رہا ہوں راہی
کیسا آسان مرا طور طریقہ تھا کبھی

رونق دکنی سیمابی

ہیں عزم جواں سختیٔ حالات کے پیچھے
روشن ہیں دیئے پردۂ ظلمات کے پیچھے

شعلوں کی زباں بھی ہے گلابوں کی نمی بھی
اک محشر احساس ہے جذبات کے پیچھے

کس موڑ سے ٹکرائے گی یہ دوڑ نہ جانے
شب دن کے تعاقب میں ہے دن رات کے پیچھے

کیوں شاکی بے مہری دنیا ہوں خرد مند
ہے شہر مساوات' خرابات کے پیچھے

سمجھو تو بہت کچھ ہے نہ سمجھو تو نہ کچھ بھی
ہے عظمتِ پارینہ' روایات کے پیچھے

تقویم کی جو روز و مہ و سال کو ہے فکر
گردش میں شب و روز ہیں لمحات کے پیچھے

دیوار صداقت نہ کہیں روک دے رستہ
یوں طیش میں دوڑو نہ خرافات کے پیچھے

تعمیر میں انساں کی بڑا ہاتھ ہے اس کا
وہ شخصیت پوشیدہ جو ہے ذات کے پیچھے

جینا ہی خود اک بحث طلب بات ہے رونق
کیا فائدہ اک بات بڑھے بات کے پیچھے

تاج پیامی

ہم سخن ہے نہ ہے کوئی دمساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز
اک قیامت ہے ان دنوں جینا
کون مانگے دعائے عمر دراز
آدمی آدمی سے ڈرتا ہے
کیا انوکھا ہے وقت کا اعجاز
لب کو دانتوں تلے دبا لینا
ضبط غم کا ہے خوب یہ انداز
اب کہاں وہ قصیدۂ پندار
دل نے توڑا مری انا کا ساز
ان کی چشم کرم کا کیا کہنا
مرتبہ اپنا ہو گیا ممتاز
پھول جیسے چمن میں کھلتے ہیں
ان کے ہنسنے کا ہے وہی انداز
مے سے بڑھ کر لطیف ہے ساقی
تیری پرکیف، مدھ بھری آواز
عرش سے بھی پرے بنا تا گھر
کاش ہوتی یہ طاقت پرواز
حال دل میں کسی سے کیا کہتا
خود ہی اشعار دل کے ہیں غمّاز
کوئی تازہ غزل سنائے تاج
اہل محفل ہیں گوش بر آواز

قمر صدّیقی

حسن ہے نزاکت ہے ناز ہے ادا بھی ہے
سب درست وہ لیکن تھوڑا بے وفا بھی ہے
کیسے پہنچیں منزل تک منزلوں کے دیوانے
رہزنوں میں شامل جب انکار ہنما بھی ہے
دردو غم کی دنیا میں کیا کرے کوئی جی کر
اس جہاں میں کیا کوئی اپنا آشنا بھی ہے
آج خاک کا پتلا ہے قمر پہ خیمہ زن
بے پری میں رفعت کی کوئی انتہا بھی ہے
کیوں کرے محبت وہ کیوں کسی کا ہو جائے
درد کے سوا دل کو اور کچھ ملا بھی ہے
میں نے جس جگہ دیکھا تجھکو اس جگہ پایا
منزلوں کی صورت میں تیرا نقش پا بھی ہے
کیا کہوں قمر اس کو جس کے روپ لاکھوں ہیں
برق ہے شرارہ ہے پھول ہے صبا بھی ہے

بشیر احمد طاہر

علم اور آرٹ[1]

(۱)

ہے جہانگیری اشیا خوئے علم
آرٹ کیا ہے؟ حسن کی ہر جا تلاش
فاش وہ کرتا ہے رازِ کائنات
اور یہ اسرارِ دروں کرتا ہے فاش

(۲)

علم ہے اشیا کی اک صورت گری
حسن، رعنائی و طوقِ دلبری
علم قابو سے ہوا باہر تو دیو
حسن شیشہ میں اگر اترا، پری

(۳)

علم کی قوت ہے بس آفاق گیر
اور دل ذروں کے دیتا ہے وہ چیر
حسن گہرائی میں دل کے ہے مکیں
ہر ادا جس کی دلِ عالم پہ تیر

(۴)

آرٹ دردِ دل کی ہے گویا کسک
آرٹ دردِ غیر کی دل میں کھٹک
آرٹ سے کھلتی ہے یوں دل کی کلی
جیسے پھولوں کی مہک، گل کی چٹک

(۵)

زندگی انساں کی ہے تشنہ و خام
یہ بدلتی ہی رہے گی یاں مدام
خوب تر کی اس کو رہتی ہے تلاش
آرٹ کو کیسے نہ ہوگا پھر دوام؟

[1] آرٹ میں مصوری، نقاشی، مجسمہ سازی کے علاوہ موسیقی، رقص و سرود، شعر و ادب، ناٹک اور جمالیاتی صنعتیں شامل ہیں (طاہر)

نقد و نظر

جنّت کا سجدہ سیّد علی شاکر۔ ایم اے۔ بی ایڈ ۲۹۷-۴-۱۶ چنچلگوڑہ حیدرآباد ۲۴-۵۰۰۰
صفحے ۱۲۵ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔ (۲/۵۰)

شاکر صاحب بہت پرانے لکھنے والوں میں ہیں۔ ریسرچ ختم کرکے دکھنی کالج میں فارسی کے لکچرار ہوئے ان کے آنے سے کچھ ہی دن پہلے میر حسن، مخدوم محی الدین اور بھارت چند کھنہ نے سٹی کالج چھوڑا تھا۔ مخدوم نے تو اُردو دُنیا میں نام پایا لیکن کھنہ اور شاکر نے بھی اپنے طنزیہ مضامین اور "شکر پارون" سے کچھ کم شہرت نہ پائی۔ دونوں "ساقی" کے مضمون نگار رہے ہیں لیکن دونوں نے جب سٹی کالج چھوڑا تو ان کا قلم خاموش ہوگیا کھنہ عہدہ دار بن گئے۔ اس زمانے میں عہدہ دار کو اپنی پوزیشن کا خیال رکھنا ضروری ہوتا تھا۔ شاکر کا تبادلہ ایک اسکول میں ضلع پر ہوگیا اور طبیعت جو پہلے ہی بند تھی اب بجھ گئی۔ مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ادبی دُنیا ادب لطف، ریاست اور ساقی کے اوراق میں شاکر نے بہت کچھ لکھا اور ایک طویل افسانہ "میری کہانی" سنیے گا۔ شائع کیا۔ شاکر کے مضامین دلکش اور طنز بھرے ہوتے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے ۱۹۳۸ء میں قائم "سب رس" میں ایک مضمون شائع ہوا۔ قاسم شاکر صاحب سے تقاضہ کرکر کے مضمون لکھواتے اور چھپواتے رہے۔ پیش نظر افسانہ انھوں نے ۱۹۶۶ء میں لکھا اور اب ۱۹۷۳ء میں چھپا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جب سب رس کا غالب نمبر نکل رہا تھا شاکر صاحب نے میری درخواست پر غالب پر ایک طویل مضمون عنایت فرمایا۔

پیش نظر کتاب "جنت کا سجدہ" ایک طویل افسانہ ہے گتھیوں کو لئے ہوئے قصہ در قصہ چلتا ہے پلاٹ بظاہر گنجلک ہے لیکن قدرے غور و خوض سے واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ بعض باتیں ناقابل یقین ہیں لیکن بڑی صفائی کے ساتھ باور کرادیا جاتا ہے۔

فسانۂ آزاد میں رتن ناتھ سرشار نے اپنے ایک کردار کو موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اودھ اخبار کے قاری برہم ہوگئے اور تقاضہ ہونے لگا کہ اسے زندہ کیا جائے۔ دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اودھ اخبار کی بکری کم ہوگئی۔ انھیں مجبوراً کردار کو زندہ کرنا اور افسانہ کو آگے بڑھانا پڑا۔
یہاں شاکر صاحب نے بھی افسانہ کے ہیرو کے والد انور نواب کے ذکر کو ختم کردیا تو شاکر صاحب کی

لڑکیوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور انھیں انور نواب کو بھر سے چگانا پڑا۔ افسانہ طویل ہے لیکن آخر تک اس کی دلچسپی باقی رہتی ہے۔ شاکر صاحب کی زبان پر دکنیت غالب ہے اس لئے چٹخارے دار ہوگئی ہے۔ بعض بعض جگہ شاعر اعظم ٹیگور کی تحریر کا انداز لئے ہوئے ہیں لیکن یہ قلم سے بے باکانہ ٹپک پڑے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ افسانہ اگر مختصر ناول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ کو قابل تعریف تو نہیں کہا جاسکتا لیکن جس کو آم کھانے سے مطلب ہو اس کو پیڑ گننے کی کیوں ضرورت پیش آئے۔

صبح کا سورج

فیض الحسن خیال ۱۳/۲۲-۴-۲۰ مرتی گلی حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲
صفحے ۱۲۸ مجلد قیمت ۲/۵۰

فیض الحسن خیال ملک کے ان نوجوان شعرا میں ہیں جنھوں نے ابتدائے شعر گوئی ہی سے ادبی دنیا میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کر لیا۔ ان کے پہلے مجموعہ کلام "موج صبا" نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ خیال کے کلام کا تاثر، شیرینی اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی اس کے قبول عام کا سبب ہے اور بقول ڈاکٹر مسعود حسین خاں' ان کی نوا میں بانکپن اور تخیل میں تاب پرواز ہے'۔

"صبح کا سورج" پیش کرتے ہوئے خیال لکھتے ہیں کہ اس کو میں نے احساسات کا شہر، تجربات کا تسلسل، سماج کا پرچم، مسرتوں کا محل، آگہی کا چراغ اور دیوانگی کا زخم بنانے کی کوشش کی ہے"۔ کتاب کا مطالعہ ان خیالات کی تصدیق کرتا ہے۔

آزادی کے بعد سیاست‌داں نے ملک کو جن خم و پیچ رکھنے والی راہوں پر چلایا اور خود استفادگی کا جو مظاہرہ کیا اس کی طرف متعدد اشعار میں اشارے ملتے ہیں۔ ایسے مشورے بھی ملتے ہیں جو خزاں زدہ گلستاں کو بہار میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح خیال کے بارے میں خواجہ احمد عباس کا یہ کہنا کہ جو لوگ ادب میں جمود کے قایل ہیں ان کے لئے یہ جواب ہے۔ صحیح ہے۔

خیال کے کلام میں جدت آفرینی وقت کی نبض پر انگلیوں کی گرفت، سماج کے بگڑتے یا بنتے حالات کی متعدد مثالیں ملیں گی۔

صبح کا سورج' غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ نظمیں موزوں بھی ہیں اور بے قافیہ بھی حدودِ فہم سے باہر جانے والی نہیں اس لئے ان میں تاثر کا فقدان نہیں۔ ان کی گھلاوٹ اور حلاوت زندگی بخش اور دلفریب ہے۔ چند نظموں کے عنوان ہیں۔ پھولوں کی برسات، عذابوں کا شہر، شعلوں کا بازار، آگ کا شہر، اعتبار کرم، اگلوں کے قافلے، نئی بہار اور ہمراز۔ ان میں جینے سے کہیں بیزارگی کا احساس ہوتا ہے

اور کہیں پاس پڑوس اور دوست آشناؤں کی بے اعتنائی کا لیکن اس کے باوجود جیتے جانے کا عزم مستقل غالب نظر آتا ہے۔ یہاں چند اشعار پیش ہیں جن سے مندرجہ بالا خیالات کی تصدیق ہو سکتی ہے

جو شہر جاتے تھے آواز یہ میری یارو
وہ بھی اب وقت کی زنجیر ہوئے ہیں شاید

شراب خانے لٹاتا تھا کل جو محفل میں
وہ آج زہر کے دو گھونٹ کو ترستا ہے

قدم قدم پہ اندھیرا نظر نظر تنہا
یہ شہر شہر نہیں کوئی قید خانہ ہے

بہار آئی تھی کچھ لوگ مسکرائے تھے
جلے ہیں کیسے مرے بال و پر نہیں معلوم

پاک ذہنوں میں نہ بارود بھرو نفرت کی
آگ لگ جائیگی پھولوں کی حسیں وادی میں

سمجھ گئے کہاں تم مرے انداز غزل کو
یہ درد کا افسانہ بے حرف و صدا ہے

ان کے ہاتھوں میں چراغ سحری ہے یارو
جن کو معلوم نہیں صبح بھی کب ہوتی ہے

کچھ اندھیرے بھی خطاوار تباہی ہیں مگر
روشنی پر بھی ہے الزام تمہیں کیا معلوم

خیال زلف شکن در شکن کی بات کرو
نفس نفس میں غنیمت ہے ذکر یار چلے

ہم تو کانٹوں پہ بھی ہنستے ہیں مگر اہل خرد
بستر گل پہ بھی بادیدۂ تر جلتے ہیں

گلستاں کی فصیلوں کی طرح جو کام آئے ہیں
بہار آئی تو ان پر وقت نے پتھر چلائے ہیں

قدیم اردو جلد چہارم ۱۹۷۲ء عاشور نامہ از روشن علی مرتبہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں و سفارش حسین رضوی شعبہ لسانیات۔ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ ڈیمی سایز صفحے ۲۴۵

قیمت مجلد: دس روپے۔

قدیم اردو کے نام سے ایک رسالہ مسعود حسین خاں صاحب نے اپنی صدارت شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے دور میں جاری کیا تین شمارے نکلے کہ وہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کی صدارت پر تشریف لے گئے اور سمجھا گیا کہ اب قدیم اردو بھی بند ہو جائیگا لیکن ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی دلچسپی کی وجہ سے اس کا چوتھا شمارہ جو ان کے دور کا پہلا شمارہ تھا۔ حضرت برہان الدین جانم بیجاپوری کے "ارشاد نامہ" کی شکل میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے علی گڈھ جانے کے بعد بھی قدیم اردو سے اپنی دلچسپی قایم رکھی اور اپنی ادارت میں اس کا چوتھا شمارہ شائع کیا جس میں روشن علی کا عاشور نامہ پیش کیا گیا ہے۔ روشن علی کے متعلق جو معلومات ملتی ہیں ان کا ماخذ اس کی مثنوی عاشور نامہ ہی ہے۔ روشن علی کا وطن سہارن پور تھا اور اس نے دوستوں کے کہنے پر ملا حسین واعظ کاشفی کی روضۃ الشہدا کو پیش نظر رکھ کر عاشور نامہ اپنی قصباتی زبان میں لکھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے پرانے خطی نسخے اکثر و بیشتر کم سواد کاتبوں کے ہاتھ سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ شاذ و نادر ہی اچھے خطی نسخے دستیاب ہوتے ہیں۔ یہ خصوصیت صرف شمالی ہند ہی کی نہیں بلکہ ہندو پاک میں ہر جگہ عام ہے۔ عاشور نامہ میں فاضل مرتبین نے جو لسانی خصوصیات گنائی ہیں وہ صرف سہارن پور یا دوآبہ گنگ و جمن ہی کی نہیں بلکہ دکنی میں بھی یہ ساری خصوصیات ملیں گی۔ البتہ لغات کے لحاظ سے قدرے مختلف ہیں۔ روشن علی نے بعض الفاظ اپنے ماحول سے لیے ہیں جو دکنی ادب میں نہیں ملتے۔ مثلاً ریاں۔ راج۔ رتش۔ روپنا۔ کوٹھلا۔ بنگالی تم بجائے تم۔ قتام (ختم) کو بخ در کو بخ (کوچ بر کوچ) عیاں دار، بیاں دارانی وغیرہ۔

فاضل مرتبین نے ایک تفصیلی مقدمہ میں عاشور نامے کے مصنف اس کی زبان اور لسانی خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ میں نے اس سے پہلے "کربل کتھا" مرتبہ مالک رام و مختار الدین آرزو پر تبصرہ کرتے ہوئے ذکر کیا تھا کہ روضۃ الشہدا (ملا حسین واعظ کاشفی) اور اشرف بیا بانی کی نوسرہار کی تصنیف میں زمانی فرق صرف تین چار مہینوں کا ہے اس طرح عزاداری اور روضہ خوانی کے لیے دونوں قریب قریب معاصر ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ روضہ خوانی کے مقصد سے لکھی گئی ابتدائی مثنویاں زیادہ تر سنی حضرات کی لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ دکن میں روضۃ الشہدا ولی ویلوری کو جو قبولیت نصیب ہوئی وہ عاشور نامے کو شاید نہ مل سکی اسی طرح دکن میں نوسرہار کو بھی نہ ملی۔ یہ قیاس اس لیے ہے کہ اس کے خطی نسخے بھی بہت کم دستیاب ہوئے ہیں۔

روضۃ الشہدا کے بعد تو اس موضوع پر متعدد مثنویاں لکھی گئیں جن کے کئی نسخے دستیاب ہیں۔

بہرحال عاشور نامے کی اشاعت سے شمالی ہند خصوصاً سلطان پور اور اس کے اطراف کی زبان کا گیارہویں صدی ہجری کا نمونہ ہمارے سامنے آگیا اس کیلئے ہمیں فاضل مرتبین کا شکر گذار ہونا چاہیے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

مزاج شریف رشید قرلیشی۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادبی بک ٹرسٹ حیدرآباد چھاپنے والے۔ زندہ دلان حیدرآباد۔ قیمت ساڑھے تین روپیہ صفحات ۱۴۴

مزاج شریف کو اکثر لوگوں نے مزاج شریف پڑھا۔ کیونکہ مزاج شریف کے مقابلے میں مزاج شریف والی ترکیب سوسائیٹی میں زیادہ مقبول عام ہے۔ اجمیر شریف کی طرح مزاج شریف کی بھی

اپنی ایک الگ تعریف اور توجیہہ ہے۔ مزاج شریف چونکہ طنزاً کسی کا مزاج پوچھنے کا طریقہ اور شگفتہ و بے تکلفانہ انداز تخاطب ہے اس لئے رشید قریشی کے نام کی مناسبت سے مزاج شریف کو مزاج شریف سمجھنے والوں نے کوئی بڑی غلطی نہیں کی اور وہ حقیقت کی تہہ تک پہونچتے پہونچتے رہ گئے۔ بعض جلد باز تو اس لفظ خوری کا سہرا کاتب صاحب کے سر باندھنے لگے۔ لیکن اس موقع پر وہ ان کی مزاج پرسی کو تیار ملے گھوڑا جوڑا۔ کیا کیا نہ کیا شادی کیلئے۔ گلگت۔ بیوی کی سہیلیاں۔ ساس۔ واہیات ایسے مضامین ہیں جنکو پڑھکر ہنسی کا روکنا بالکل ناممکن ہوجاتا ہے۔

ہارون رشید کے زمانے میں سوداگرانہ صحبت پر ایک کرارا طنز ہے اور مضمون کو پڑھتے پڑھتے حسن ورد ان کی بغدادی فضا میں جھومنے والا انجام سے ٹکرا کر دیدے پھاڑ دیتا ہے۔ دوسری بیوی کا پہلا شوہر۔ ہے کوئی انصاف کرنیوالا۔ اچھے افسانے ہیں مجموعی طور پہ اندازِ تحریر اور دلکش بہت ہی دلکش اور سحر انگیز ہے۔ عبارت جادو کرنے کا کام کرتی ہے اور زبان و بیان کا جادو سر چڑھ کر بولتا نظر آتا ہے۔

رشید قریشی ایک کہنہ مشق نثار ہیں۔ ان کے سنجیدہ مضامین ریڈیائی ڈرامے اور افسانے اپنی جگہ اہم ہیں۔ من کی دنیا' افسانوں کا مجموعہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد سے شایع ہوا تھا جبکہ وہ طالب علم تھے۔ انہیں حقیقی اور سچی شہرت دینے والا ان کا مزاح نگار قلم ہے۔

موضوعات کی توجیہہ کی جانب توجہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شادی اور بیوی سے تعلقات ان کے محبوب موضوع ہیں اور انہوں نے اپنے موضوعات سے انصاف کیا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عورت ان کے قلم پر حاوی ہے۔ کبھی یہ بیوی بن جاتی ہے تو کبھی نادیدہ محبوبہ اور کبھی ادھیڑ عمر کی بیوہ۔ ان کے مضامین میں کہانی کہنے کا افسانوی انداز بہت ہی پسندیدہ ہے اور قاری کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے رشید قریشی نے اپنی کتاب چھاپنے میں بڑی دیر کی اور ادبی دنیا ان کے مزاح کے سحر سے اب تک محروم رہی۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ مضامین ہے مگر مواد اور ہئیت کے اعتبار سے اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔ سارے مضامین اعلیٰ مزاح کا نمونہ ہیں۔

مجتبیٰ کی زبان جمنا کے پانی سے دُھل کر اور نکھر گئی ہے۔ ان کے تعارف رشیدان قریش کو میں نے رشیدانِ قریش پڑھا اور سمجھا کہ یہ محمود دان گرا قسم کی کوئی چیز ہوگی اور انھوں نے رشید کی قریش سے کچھ مطابقت پیدا کی ہوگی۔ مضمون خاتمہ کے قریب آیا تو دیکھا کہ مجتبیٰ رشید صاحب کو کھنگالنے اور ٹٹولنے میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل کا جائزہ بلیغ اور فکر انگیز ہے۔ یہ انشائیہ خاصے کی چیز پڑھنے والوں کو [illegible] کر لاتا ہے۔

رشید صاحب کا انداز فطری ہے۔ جو چیز بظاہر آورد نہیں ہے۔ بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔ یہاں آمد ہی آمد ہے آورد کا پتہ نہیں۔ ہمارے بیشتر مزاح نگار اپنے دھان ایک کوٹھڑی سے دوسری کوٹھڑی میں منتقل کرتے نظر آتے ہیں۔ اس آرڈر پر مال سپلائی کے ماحول میں رشید قریشی کے مضامین کا اوریجنل موسیقی ریز اور آمد کا انداز تحریر اور شگفتہ لہجہ ایک خوش آئیند مزاح کی بنیاد ثابت ہوگا بشرطیکہ رشید اسی رفتار سے موضوعات کے تنوع کا لحاظ کرتے ہوئے خطیبانہ و ناصحانہ انداز کو یکسر فراموش کرکے اپنا مزاح نگاری کو جاری رکھیں۔ کتاب خرید کر پڑھی جاسکتی ہے۔

یس۔ جے۔ صادق

عربی شاعری کے جدید رجحانات

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی۔
ونکٹیشور یونیورسٹی۔ ترویتی۔

مصر پر نپولین کا حملہ جو سیاسی اعتبار سے عربوں کے زوال اور مشرق وسطی میں سامراجی طاقتوں کے تسلط کا سبب بنا عربی ادب کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عرب شعراء اور ادباء مغربی تہذیب اور ادب سے نا آشنا تھے ان کو پہلی مرتبہ مغربی ادب کے مطالعہ کا موقع ملا۔ عربی شاعری انحطاط اور تنزل کے دور سے گذر رہی تھی اور ادب کا معیار بالکل گرچکا تھا عربی شاعری میں خرافات، سحر وطلسم جیسی چیزیں عام ہوگئی تھیں، تکلف، تملق، ابہام، اسمام اور صنائع و بدائع اس دور کی شاعری کی اہم خصوصیتیں تھیں۔ مغربی ادب کے مطالعہ سے عرب شعراء اور ادباء نے عربی ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مغرب کی حریت فکر قومیت اور وطنیت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ انھوں نے مشرق کی عظمت اور مغرب کی مادیت دونوں سے استفادہ کیا۔ انھوں نے نئے رجحانات اور افکار کو اپنایا لیکن تہذیبی ورثہ کو ترک نہیں کیا۔ نپولین کے حملہ مصر کے بعد شعر و شاعری کا سب سے بڑا مرکز مصر بن گیا۔ جدید شاعری کے بانی امیر الشعراء شوقی، حافظ، خلیل مطران اسی افق سے رونما ہوئے۔ مصر کے علاوہ شام اور لبنان کے شعراء نے بھی جدید عربی شاعری کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔

افسوس ہے کہ اردو میں جدید عربی شاعری پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر احتشام احمد ندوی نے اپنی کتاب 'عربی شاعری کے جدید رجحانات' میں بڑی کاوش اور جانفشانی سے عربی شاعری کے ارتقاء اور اس کے جدید رجحانات پر روشنی ڈالی ہے اور عصر نو کی عربی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں کو مختلف موضوعات کے تحت اجاگر کیا ہے۔ کتاب میں آزاد نظم کا ارتقاء، قصہ نگاری، تمثیل نگاری، اسلامی شاعری تحریک رومانیت جیسے تمام اہم موضوعات زیر بحث آگئے ہیں۔ کتاب شروع سے آخر تک بے حد دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ طرز بیان کی شگفتگی اور مختلف موضوعات کا تسلسل اس کتاب کی خاص خوبی ہے۔ توقع ہے کہ شائقین ادب عربی اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کریں گے۔ محمد ابراہیم ندوی

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۴۸ء جلد ۳۶ شمارہ (۸)

اگست ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

زر سالانہ: آٹھ روپے   غیر ممالک سے: پندرہ روپے
زر ششماہی: چار روپے   فی پرچہ: ۷۵ پیسے
نمونے کے پرچہ کیلئے ۷۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔
پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۔۔۔ سے شائع ہوا

ترتیب

———(ﷺ)———

اپنی بات

حکومت ہند نے اُردو کو سہولتیں بہم پہنچانے کیلئے فروغ اردو کمیٹی قایم کی جس نے ہندوستا
مختلف شہروں میں اجلاس منعقد کئے اور تقریباً ایک سال کے عرصہ میں اپنی رپورٹ تیار کر کے حکو
آگے پیش کر دی۔ "سیاست جدید کے حوالے سے" ہماری زبان نے یہ اطلاع دی ہے کہ اس کمیٹی نے یہ مط
ٹھکرا دیا ہے کہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے۔ لیکن تعلیم اور د
کی پیش کشی اور ان کے جوابات اُردو میں دینے کی سفارش کی ہے۔

تعلیم کے سلسلے میں اتر پردیش کی حکومت نے چار ہزار اردو اساتذہ کے تقرر کا اعلان ک
جب مختلف اضلاع میں انتخابی کمیٹیاں منعقد ہوئیں تو ان کے فیصلے نہایت مایوس کن رہے اور اخ
کی روشنی میں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ صورتِ حال میں خاطر خواہ تبدیلی ممکن نہیں۔ اس کا سبب سے بڑ
لسانی عصبیت اور جلب منفعت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ حکومت کی پالیسی کے بالکل مغایر
حکومت کی پالیسی دوہری ہے یعنی ظاہر ایک اور باطن ایک تو اس کا کوئی علاج نہیں اور اگر ایسا نہ
حکومت اپنی پالیسی کو روبہ عمل لانے کیلئے سختی برت سکتی ہے اور پالیسی کو پامال کرنے والوں کے خلاف مج
نظر رکھنے کی علت میں مقدمات قایم کر سکتی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی نے ادارہ ادبیات اُردو کے امتحانات اردو عالم اور اردو فاضل کو اپنے ا
انٹرنس اور ڈپ' او' ایل کے مماثل قرار دیدیا ہے۔ اس کے بعد خواہشمند حضرات بی او ایل میں شرکت کر کے
حاصل کر سکتے ہیں اور بی اے کا انگریزی کا ایک پرچہ دے کر گریجویٹ ہو سکتے ہیں۔ مراکز کے
سے درخواست ہے کہ اس سہولت سے فایدہ اٹھانے کیلئے عمدہ تعلیم کا انتظام کریں اور امتحانات کو
طریقہ سے چلائیں۔ اس کے خلاف عمل نقصان کا موجب بن سکتا ہے۔

اُمیدوار اگر ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھیں تو اس کا امکان ہے کہ اردو والوں کو اب
مل رہی ہیں وہ آئندہ کیلئے باقی نہ رہیں۔ جیسا کہ بعض اور پردیشوں میں ہوا ہے۔

(محمد اکبر الدین صدیقی)

زین الساجدین صدیقی

کتب علوم اسلامیہ کی موجودہ فہرستیں

اور ان کی تدوین نو کی ضرورت

اسلام میں حصول علم کو نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو پہلی وحی اتری اس میں علم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا۔[1] قرآن کریم میں فضیلت علم متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ "کہدو کیا علم رکھنے والے اور (بے علم) جو نہیں جانتے برابر ہو سکتے ہیں؟"[2] ایک دوسری جگہ ارشاد ہے "اللہ ان لوگوں کے درجے بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہیں علم عطا کیا گیا۔"[3] خود پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے علم حاصل کرنے کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے چین کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اور آپ نے علم حاصل کرنے کو کار ثواب قرار دیا۔ ایک حدیث میں روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص علم کی تلاش میں نکلے وہ اس وقت تک خدا کی راہ میں ہے جب تک واپس نہ آجائے۔[4] جنگ بدر (۲ ہجری) میں جو خواندہ غیر مسلم مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور وہ زر فدیہ ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا فدیہ تجویز کیا کہ وہ دس دس ناخواندہ مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔[5]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم قرار دیا گیا۔ وہ علوم و فنون کے ایسے سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے دماغ اور دل دونوں سیراب ہوتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کا علمی ذوق قرآن کریم ہی کا رہین منت ہے۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری کے آخر میں جب مسلمانوں نے امن و سکون کا سانس لیا تو قرآن کریم کی تفسیر اس کے احکام کی تشریح اور اس کے الفاظ و معانی کی توضیح کے لئے علوم و فنون کی تدوین کی جانب توجہ کی گئی یہ تمام علوم علوم نقلیہ کہلائے۔ جن میں حدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، تاریخ، لغت و ادب، معانی و بیان، صرف و نحو، تجوید اور علم کلام وغیرہ شامل ہیں۔

اگرچہ مسلمانوں کا مرکز نظر و فکر قرآن ہی رہا اور اس ہی کو انھوں نے اپنی روحانی، اخلاقی، معاشرتی اور

---

[1] سورہ ۹۶ العلق [2] سورہ ۳۹ الزمر آیۃ ۹ [3] قرآن مجید سورہ ۵۸ المجادلہ آیۃ ۲
[4] ترمذی [5] رحمۃ للعالمین از قاضی محمد سلیمان منصورپوری ص ۱۲۰ مطبوعہ دہلی۔
یہ واقعہ تمام کتب سیرت میں ملتا ہے۔

تمدنی زندگانی کا سنگ بنیاد قرار دیا۔ مگر علوم عقلیہ کو بھی انھوں نے خوش آمدید کہا اور اموی حکومت کے آخر میں، اور عباسی عہد کے آغاز میں یونانی، سریانی، لاطینی، عبرانی، فارسی اور سنسکرت کتابوں کا بیشتر ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا اور یہاں بنیادوں پر انھوں نے اپنی علمی اور فنی کاوشوں کی عمار[ت] ... یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اموی عہد کے امراء نے ان علمائے یونان کو جو مصر میں مقیم تھے گراں قدر م[شاہرے] مقرر کر کے فلسفہ منطق طب کیمیا کی کتابیں یونانی اور قبطی زبانوں سے عربی میں ترجمہ کرائیں۔ جب دو[لت امویہ] کا آفتاب غروب ہوا اور عباسی سلطنت کا ستارہ چمکا تو عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (دور ۱۳۹ھ/۷۵۴ء تا ۱۵۸ھ/۷۷۵ء) نے ایرانی اور یونانی علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرانے کا اہتمام کیا[۲]۔ ح[نانچہ] حنین ابن اسحق (۱۹۴ھ/۸۰۹ء تا ۲۶۰ھ/۸۷۴ء)، کے حکم سے بقراط (۴۶۰ - ۳۷۷ ق م) اور جالینوس (۲۰[۰]) کی کتابیں عربی زبان میں منتقل کیں اور ابن المقفع ۱۴۳ھ اور حسن ابن سہل ۲۳۶ھ/۸۵۰ء وغیرہ نے فا[رسی کی] بہت سی اخلاقی ادبی اور طبی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ مامون (۷۸۶ء - ۸۳۳ء) نے شہنشاہ روم سے درخوا[ست کی کہ] وہ جتنے ہو سکیں علوم و فنون کے ذخائر بغداد روانہ کرے چنانچہ بڑی تعداد میں گراں قدر کتابیں اس کے ز[مانے میں] سریانی کلدانی زبانوں کی بغداد پہنچیں، عربی میں منتقل کی گئیں اور قسطا بن لوقا نے جو بعلبک کا [باشندہ تھا] خصوصیت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیا، بادشاہوں کی دیکھا دیکھی امرائے سلطنت میں بھی علوم و فنو[ن کے] ذخائر جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اسی کے زمانہ میں بعض امرائے سلطنت نے حنین ابن اسحق (۱۹۴ھ/۸۰۹ء) [کو] روم کی طرف روانہ کیا اور وہاں سے گراں قیمت ادا کر کے نادر کتابیں منگائیں، پھر ان رومی یونانی ذخائر کے ترجمے کرائے ان کی شرحیں لکھی گئیں ان پر حاشیے چڑھائے گئے اور ان کی غلطیوں کی تصحی[ح کی گئی۔ اس] سلسلہ میں یعقوب ابن اسحق کندی (م ۲۰۵ھ) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

ابن ندیم (م ۳۸۵ھ) نے لکھا ہے کہ صرف بنو شاکر کا گھرانہ نقل و ترجمہ کے سلسلہ میں مترجمین [کو ...] دینار ماہانہ ادا کرتا تھا۔ پھر علوم عقلیہ و نقلیہ کے بیش بہا ذخیرے ہر بڑے شہر میں کتب خانوں [میں] جمع کئے گئے۔ ان میں بغداد کا بیت الحکمت جس کی بنیاد ہارون رشید خلیفہ عباسی (۷۶۶ء — ۹[۰۹ء]) [نے] رکھی تھی سب سے بڑا کتابوں کا مخزن تھا، اسکی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ہ[لاکو نے] ۶۵۶ھ/۱۲۵۶ء میں بغداد کو تاراج کیا اور اس کتب خانے کی کتابیں دریا برد کیں تو کہا جاتا ہے کہ کئی روز تک دجلہ کا [پانی سیاہ] بہتا رہا۔ بنو عباس کی حریف حکومت جسے بنو امیہ نے اسپین میں قائم کیا تھا۔ تو وہاں علوم و فنون کی [قدر کی] کمی نہ رہی قرطبہ، غرناطہ اور طلیطلہ کے کتب خانے مشرق و مغرب میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ یور[پ کے] شائقین علم یہاں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے تھے اور پھر یہاں کی علمی شعلوں سے اپنے ملکوں

۲۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون (۱۳۳۲ء - ۱۴۰۶ء) (کتاب اول باب ۶ فصل ۱۳) نیز فجر الاسلام احمد ا[مین]

...ت کی تاریکی دور کرتے تھے۔

ہندوستان میں مغل عہد سے قبل اور اس کے بعد متعدد مسلمان بادشاہوں نے اسلام کی علمی روایات کو
...رکھا اور گرانقدر رقوم صرف کرکے نہ صرف سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کرایا بلکہ مختلف
...م و فنون پر علماء اور فضلاء سے قابل قدر کتابیں لکھوائیں عہد اکبر میں فیضی (۱۵۴۷ء - ۱۵۹۵ء) اور عبد القادر
...یونی (۱۵۴۰ء - ۱۶۰۵ء) کے نام تاریخ علوم میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے ارباب کمال نے خود
...پنے ذوق و شوق سے علوم عقلیہ و نقلیہ پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان علماء میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی (
۱۵۵۱ء - ۱۶۴۲ء) شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۰۳ء - ۱۷۶۲ء) شاہ عبد العزیز (۱۷۴۶ء - ۱۸۲۴ء) وغیرہ
... نام اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہی کی تصنیفات سو سے متجاوز ہیں۔[1]

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ میں مسلمانان اسپین کی علمی کوششوں اور
...اوشوں کا زبردست ہاتھ ہے مگر افسوس ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں اور اس کے بعد جب مشرق و مغرب
...اسلامی حکومتوں پر زوال آیا اور یوربین اقوام نے مشرقی ممالک پر سیاسی اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے دولت
...ت کے گراں قدر ذخیروں کے ساتھ علوم و فنون کے گراں قدر خزانے بھی اپنے ملکوں میں منتقل کر لیئے چنانچہ
...ت حال یہ ہوگئی کہ نہ صرف ادب، فلسفہ ہیئت اور تاریخ کی کتابیں بلکہ تفسیر و حدیث جیسے مذہبی علوم کی
...ر کتابیں آج قاہرہ قسطنطنیہ، طہران اور دہلی کے کتب خانوں کے بجائے یورپ اور امریکہ کے کتب خانوں
...دستیاب ہوتی ہیں، لندن کی انڈیا آفس لائبریری کی عظمت سے کون واقف نہیں ہے؛ بچے کھچے جو
...ی ذخیرے ترکی۔ مصر اور ہندوستان کے کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اکثر غیر مرتب حالت میں
...ب اور ان سے فائدہ حاصل کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کی جامع فہرستیں موجود نہیں ہیں، کتب خانوں کے علاوہ
...لائبریریوں میں بے شمار گراں قدر کتابیں موجود ہیں جنھیں اصحاب علم و فضل کی جاہل اولاد کیڑوں کی بھینٹ
...صرف کر رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان خاص طور پر اسلام کے اس گراں قدر عطیہ اور فضلائے اسلام کے اس
...ظیم الشان ترکہ کی حفاظت کی طرف توجہ کریں۔

دوسری اقوام کی قیادت میں جس کاروان علم و تحقیق کی مسلمانوں نے قیادت کی تھی آج وہ کاروان
...نزل بمنزل بڑھتا ہوا کافی آگے پہونچ چکا ہے اور تحقیق و تدوین کی نئی راہوں پر گامزن ہے مسلمانوں کا قدیم علمی
سرمایہ آج بھی مشعل راہ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس سرمایہ کو مفید اور کار آمد بنانے کے لیئے تمام اسلامی علوم و فنون کی

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مسلم ثقافت ہندوستان میں از مولانا عبد المجید سالک مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور از صفحہ ۱۸۵ تا صفحہ ۲۲۹
...و دود کوثر و موج کوثر از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام مطبوعہ پاکستان۔

ایک جامع فہرست تیار کی جائے جس میں ہر فن پر بصیرت افروز روشنی ڈالنے کے بعد بتایا جائے کہ اس فن پر کتنی ک
موجود ہیں ان تمام کتابوں کے نام اور ان کے متعلق تمام ضروری معلومات درج کی جائیں۔ مصنف کا نام ا
اس کے مختصر حالات بیان کرنے کے ساتھ اس کا علمی مقام متعین کیا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ اس نے ا
کتاب میں اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں جس فن میں کتاب لکھی گئی ہے اس فن میں کن جدید مباحث او
نکات کا اضافہ کیا ہے اور کن کن نئے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ پھر یہ بھی بتایا جائے کہ اس کتاب
نسخے دنیا کی کس کس لائبریری میں موجود ہیں اور اگر ممکن ہو تو کتاب کا کیٹلاگ نمبر بھی درج کیا جائے۔

تصنیفات اور مصنفین کی متعدد فہرستیں اور تذکرے مرتب اور مدون ہو چکے ہیں۔ جن کی افاد
انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ مذکورہ بالا مقصد کی تکمیل سے قاصر ہیں ہم اس موضوع سے متعلق چند ان کتا
ذکر کرتے ہیں جو معروف و مشہور ہیں۔

۱۔ الفہرست : (عربی) یہ کتاب محمد ابن اسحٰق بن محمد بن اسحٰق ابوالفرج بن ابو یعقوب الندیم (ا
۳۸۵ھ) کی تصنیف ہے۔ تاریخ اسلام میں فہرست تراجم اور تعارف کتب کے موضوع پر سب سے قدیم کتاب سم
جاتی ہے۔ درحقیقت یہ علوم قدیمہ اور یونانیوں اور ایرانیوں کی ان کتابوں کی فہرست ہے جو مصنف کے عہد
عربی زبان میں منتقل ہو چکی تھیں ترتیب چونکہ حروف تہجی کے بجائے اصناف علوم کے اعتبار سے ہے اور اسل
نگارش قدیم ہے اسی لئے اس سے استفادہ آسان نہیں ہے۔ گسٹاو فلوگل (GUSTARE FLUGEL)
۱۸۷۱ء میں عربی متن کے ساتھ جرمن زبان میں بھی تشریحات کے ساتھ اس کو مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

۲۔ مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ (عربی) : مولیٰ احمد بن مصطفیٰ طاش کبریٰ زادہ (المتو
۹۶۸ھ) کی تالیف ہے۔ مؤلف نے آٹھ سو علوم کی ممتاز کتابوں کا تعارف کرانے کے بعد ان کے مصنفین ک
حال بیان کیا ہے۔ مؤلف ترتیب کتاب کے سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"علم (متعلق بالاعیان) کی دو قسمیں ہیں (۱) عملی (۲) نظری۔ اول الذکر خود بذاتہ مقصود نہیں ہوتا۔ آ
حیثیت وسیلہ کی ہے اور آخر الذکر خود بذاتہ مقصود ہوتا ہے۔ ان علوم کی مباحث اگر شریعت سے ماخوذ ہوں ت
علم شریعت ہے اور اگر ان امور سے بحث کی گئی ہو جن کا تعلق مقتضائے عقل سے ہے تو وہ علم حکمی ہے"[۱] ا
مضامین کی اسی طرح ترتیب ہے۔ چنانچہ باب اول علوم خط سے متعلق ہے۔ جس میں خط کی ضرورت اور ایجا
کے مباحث پر روشنی ڈالنے کے بعد جن مضامین کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔ علم ادوات الخط

---

[۱] مفتاح السادۃ ص ۶۸ / ج ۱

اپنا مرتب کیا

المصنفات فی الخط - علم قوانین الکتابۃ - علم تحسین الحروف - علم کیفیۃ آلۃ الخط و عن اصولھا - وغیرہ -

باب دوئم میں الفاظ سے متعلق علوم کا بیان ہے جس میں لغت، صرف، نحو، عروض، معانی، بیان جیسے علوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوئم فلسفہ منطق مناظرہ جیسے علوم پر مشتمل ہے۔ باب چہارم علم الٰہی، علم تصوف علم نجوم، علم کیمیا، علم سیمیا، علم سحر وغیرہ پر مشتمل ہے کتاب کے کل سات باب ہیں۔ کتاب کی فہرست مضامین مطابق ترتیب مذکورہ بالا کے علاوہ حروف تہجی کے اعتبار سے بھی ہے۔ جس کو غالباً دائرۃ المعارف حیدرآباد نے مرتب کرایا ہے۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد نے سنہ ۱۳۲۹ھ میں اس کتاب کو دو جلدوں میں شائع کیا تھا جلد اول ۴۰۵ صفحات اور جلد ثانی ۴۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

بے شبہ یہ کتاب ایک عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے مگر بعض وجوہات کی بنا پر اس کتاب کی معلومات ہمارے زمانہ کے محققین کے لیے ناکافی ہیں کیونکہ اس کا زمانہ تالیف ساڑھے پانچ سو سال قبل کا ہے، ظاہر ہے مابعد کی تصنیفات اس میں شامل نہیں ہیں علاوہ ازیں عہد مصنف کے اعتبار سے بھی جامع نہیں ہے مثال کے طور پر طبقات احناف اور فقہاء احناف کی تصانیف کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرے فقہاء کے طبقات اور تصانیف کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یا اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون (بزبان عربی) ملا کاتب چلپی معروف بہ حاجی خلیفہ (۱۰۰۴ھ - ۱۰۶۷ھ) اس کتاب کے مصنف ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسی میں مصنف نے چودہ ہزار پانچ سو مخطوط کتب کا تعارف کرایا ہے۔

سنہ ۱۸۹۰ء ہی میں اس کتاب کا GUSTER FLUGEL کا جرمن ترجمہ عربی متن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔

حاجی خلیفہ مصنف کتاب مذکور مقدمہ میں کتاب کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"........ دقائق علوم کی تحقیق اور حقائق علوم کا بیان ایک کار عظیم ہے اس کو انجام دینے کی توفیق خداوند قدوس کی عنایت و کرم کے باعث ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں اس قابل قدر کام کو اہل علم و فضل کو انجام دینے کی توفیق سے نوازا ہے اور علماء نے بے شمار علوم میں حق تحقیق ادا کیا ہے ان مصنفین نے جن نادر علمی شہ پاروں کو زیب قرطاس کیا ہے۔ ان کی تفصیلات سے آگاہی [illegible] کے لیے کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں فصول و ابواب قائم کر کے کتابوں کے نام لکھے جاتے اور ان پر روشنی ڈالی جاتی تاکہ ہم ان ذخائر علمی کارناموں سے مستفید ہو سکتے کیونکہ اس طرح کی اہم کتاب کے بغیر ان علوم و فنون کے [illegible] ذخائر سے قید حیات کی مختصر مدت میں واقف ہونا ممکن نہ [illegible] نے اس ہی مقصد کو پیش نظر [illegible] زمانہ شباب میں ہی

اس کتاب کی تدوین کا کام شروع کر دیا تھا جو ایک طویل مدت میں انجام پذیر ہوا ......"

ترتیب کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے کتاب کا نام لکھنے کے بعد کتاب کے سلسلہ میں حسب ذیل تفاصیل دی گئی ہیں کتاب کا مصنف ۔ تاریخ تصنیف، مضامین کتاب ۔ کتاب پر معبرین اور ناقدین کی رائیں۔ کتاب کی شرحیں اور حاشیے ۔ کتاب پر اپنی رائے ۔ جو کتابیں فن یا مصنف کے نام سے موسوم ہیں تو ان کو فن یا مصنف کے اعتبار سے ہی بیان کیا ہے ۔ مثال کے طور پر تاریخ ابن اثیر تفسیر ابن جریر باب التا میں درج ہیں اور دیوان المتنبی باب الدال میں رسالہ ابن زیدون باب الالف میں اور کتاب سیبویہ باب السین میں مدرج ہیں ۔ علوم کی ترتیب میں مضاف الیہ کا اعتبار کیا ہے مثال کے طور پر علم الفقہ کو باب الفا میں درج کیا ہے۔

ہمارے سامنے جو مقصد ہے اس کتاب کو اس کے حصول کے لیئے دلیل راہ بنایا جا سکتا ہے اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں مصنف کی کاوش اور تحقیق یقیناً قابل ستائش و تحسین ہے ۔ لیکن عہد مصنف اور ہمارے زمانہ کے مابین تقریباً تین سو سال کا زمانہ ہے اور ہم کو گذشتہ تین صدیوں کے علمی کارناموں اور تصنیفات کی ترتیب و تدوین کے لیئے تحقیق وجد و جہد کا فریضہ انجام دینا ہے ۔

اسماء ذیل میں ان کتابوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جن میں کسی خاص موضوع یا ملک سے متعلق کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے یا جو کتابیں علماء و فضلاء کے حالات زندگی پر ہیں ۔ اور ان حضرات کے علمی کارناموں کو بیان کرتے ہوئے ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو ان حضرات کی تصنیف ہیں ۔ ایسی کتابوں میں حسب ذیل کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

۱ ۔ المعارف (عربی) مصنف ابن قتیبہ (المولود ۲۱۳ھ / ۸۲۸ء)

۲ ۔ معجم الادباء (عربی) تصنیف شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت الحموی (۶۲۶ھ / ۱۲۲۹ء)
قاہرہ سے بیس جلدوں میں شائع ہوئی ہے ۔

۳ ۔ نزہتہ الالبا فی طبقات الادباء (عربی) مصنف ابو البرکات عبدالرحمٰن بن محمد الانباری (المتوفی ۵۷۷ھ) یہ کتاب حضرت علیؓ سے لیکر ابو السعادات بن شجری ۵۴۲ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے ۔ چھوٹی تقطیع پر ۴۹۱ صفحات ہیں ۔

۴ ۔ وفیات الاعیان لابن خلکان (۱۲۱۱ء ۱۲۸۱ء)

؎ یہ مصنف کے مقدمہ کا خلاصہ ہے ۔ تفصیل کے لیئے ملاحظہ ہو کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون ملا کاتب چلپی معروف بہ حاجی خلیفہ المقدمہ فی احوال العلوم، البیان الاول فی بحث الموضوع ج ۱ / ص ۶

۵- کتاب بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ - تالیف : العلامہ الحافظ جلال الدین عبدالرحمن السیوطی الشافعی (المتوفی ۹۱۱ھ) بڑی تقطیع کے ۴۶۰ صفحات ہیں اور پہلی مرتبہ ۱۳۲۶ھ میں قاہرہ سے طبع ہوئی ہے۔

۶- کشف الحجب والاستار - مصنف سید اعجاز حسین کنتوری (۱۲۴۰ھ - ۱۲۸۶ھ) شیعہ مصنفین کی کتابوں کی فہرست ہے اور حال ہی میں اسی کتاب کی تاریخی اعتبار سے ترتیب نو ڈاکٹر ہاشم امیر علی سابق ڈائرکٹر ورلڈ انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی ہے جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔

۷- کتاب اعلام الاخیار لکھنوی (المتوفی سنہ ۹۹۰ھ / ۱۵۸۲ء)

۸- فرحۃ المدرسین بذکر المؤلفات والمؤلفین مولانا عبدالحی فرنگی محلی (المتوفی ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس کا مخطوط نسخہ موجود ہے۔

۹- الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ مؤلف مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی (المتوفی ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۶ء) یہ کتاب چھ سو علماء و مصنفین کے تراجم پر مشتمل ہے۔

الفوائد البہیہ دراصل کفوی کی طبقات کا خلاصہ ہے اور مصنف نے اس میں کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔

(اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۱۲۶)

۱۰- عجالہ نافعہ از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۷۴۶ - ۱۸۲۳ء) اس کتاب میں حضرت شاہ صاحب نے حدیث اور اصول حدیث کی تمام اہم کتابوں کا تعارف کرایا ہے اور ان پر تبصرہ کیا ہے۔ عبدالحلیم چشتی کے حواشی کے ساتھ حال ہی میں پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔

۱۱- فہرست کتب شیعہ ۱۸۵۳ء میں کلکتہ سے طبع ہوئی تھی۔

۱۲- محبوب الالباب فی تعریف الکتب والکتاب (بزبان فارسی) ایک ضخیم جلد۔ مصنف خدا بخش خاں عظیم آبادی (المتوفی ۱۹۰۸) اس کتاب میں ان تمام نادر کتابوں کا تذکرہ ہے جو مصنف کے کتب خانہ میں موجود تھیں۔

(۱۳) تالیف القلب الالیف - از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۹۵۸ھ / ۱۵۵۱ء - ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء) یہ کتابوں کی فہرست ہے۔

(۱۴) لواقح الانوار فی طبقات الاخیار - قدیم تصنیف ہے ۱۳۱۵ھ میں قاہرہ سے طبع ہوئی ہے۔

۱۵- ھدیۃ العارفین اسماء المؤلفین وآثار المصنفین تصنیف اسماعیل پاشا البغدادی۔ (المتوفی ۱۳۲۹ھ) ۱۹۶۷ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ طہران سے طبع ہوئی ہے۔

۱۶- مہر جہاں تاب (فارسی) مصنف مولانا سید فخر الدین خیالی المولود ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء المتوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء
یہ کتاب علوم وفنون مذہبی اور علمی تاریخ کا انسائیکلو پیڈیا کہی جاسکتی ہے بڑی تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں ہے۔

الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند (عربی) یہ کتاب حضرت مولانا حکیم عبدالحی رحمۃ (المتوفی ۱۹۲۳ء) کی تصنیف ہے۔ چار پانچ سال قبل شام کے مشہور علمی ادارے المجمع العلمی العربی کی جانب سے دمشق سے شائع ہو چکی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں دار المصنفین اعظم گڑھ نے اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم وفنون" ہندوستان میں کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ مولانا ابو العرفان صاحب ندوی استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ نے کیا ہے جو نامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوا ہے اور بڑی تقطیع کے ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا معین الدین احمد کے پیش لفظ اور مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ فرزند مصنف رحمۃ کے "تعارف وتذکرہ" اور مقدمہ کتاب از مصنف کے علاوہ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول میں نو فصلیں ہیں (۱) علم نحو (۲) علم صرف (۳) علم اشتقاق (۴) علم لغت (۵) علم بلاغت (۶) علم عروض (۷) علم ادب وانشاء وشعر (۸) علم تاریخ وسیرت وطبقات (۹) علم جغرافیہ اس باب میں جن کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کی تعداد کل ۱۲۷۶ ہے۔ باب علوم شرعیہ ودینیہ کے بیان میں اس میں سات فصلیں ہیں (۱) علم فقہ (۲) علم اصول فقہ (۳) علم فرائض (۴) فن حدیث (۵) فن تفسیر (۶) علم تصوف وسلوک (۷) علم کلام۔ تیسرا باب علوم عقلیہ میں ہے اور اس میں چھ فصلیں ہیں اور چوتھا باب ہندوستان کے شعراء اور شاعری کے تذکرہ میں ہے۔ اس کتاب میں اندازاً چھ ہزار کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب کو بھی ہندوستان کے علماء کی تصانیف کا انسائیکلو پیڈیا قرار دیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس میں بھی عہد مصنف کی کافی تعداد میں اہم کتابیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں اور سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ ترتیب مصنفین کے عہد کے مطابق نہیں ہے اور اکثر مصنفین یا کتاب کا زمانہ نہیں دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے معلومات ناکافی رہ جاتی ہیں اس لئے اس کتاب کی از سر نو ترتیب وتدوین کی ضرورت ہے۔

۱۷- نزہۃ الخواطر (عربی) مصنف مولانا حکیم سید عبدالحی لکھنوی (المتوفی ۱۹۲۲ء) آٹھ جلدوں میں ہے۔
اس کتاب میں ساڑھے چار ہزار سے زائد علماء ہند کا تذکرہ ہے۔ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک ہندوستان کے مصنفین کی تاریخ ہے۔

معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف (عربی) از مولانا حکیم سید عبدالحی لکھنوی (المتوفی ۱۹۲۲ء) ہندوستان کے مصنفین کی ایک ہزار سالہ تاریخ ہے اس کتاب میں پہلے ہر علم کی تعریف اور اس کی تاریخ بیان کی گئی ہے اور اس علم کی مشہور و معروف و معیاری کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور پھر اس موضوع پر علماء ہند کی تصانیف کا تذکرہ ہے۔

۱۹- معجم المولفین از عمر کحالہ - یہ کتاب ۱۵ جلدوں میں ۱۹۶۰ء میں طبع ہوئی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے مصنفین کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد ان کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲۰ - الاعلام - از خیرالدین الزرکلی - اس میں بھی بترتیب ابجد مصنفوں کے ناموں کو لکھ کر ان کی کتابوں کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں طبع ہوئی ہے۔

۲۱- معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ (مطبوعہ ۱۹۲۸) یوسف سرکیس نے اس کو مرتب کیا ہے اور شرقی و مغربی عربی مطبوعات کا مع ان کے مصنفین و مولفین کے ناموں کے تذکرہ ہے۔

یہ جملہ کتابیں اپنے اپنے حدود میں بیش قیمت اور قابل قدر علمی سرمایہ ہونے کے باوجود ہماری بیان کردہ ضرورت کی تکمیل نہیں کرتیں کیوں کہ یہ جامع اور مانع نہیں ہیں اور اکثر ایک خاص زمانہ تک محدود ہیں نیز ایک محقق کو اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں جو علمی ضرورتیں پیش آتی ہیں جن کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں ان کو پورا نہیں کر پاتیں لہذا سخت ضرورت ہے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے تمام اسلامی علمی اور فنی ذخائر کی ایک جامع اور معتبر فہرست عربی انگریزی اور اردو میں تیار کی جائے۔ اگرچہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ بڑی جدوجہد سخت محنت اور کثیر اخراجات چاہتا ہے۔ لیکن ارباب ہمت کی توجہ سے یہ انجام پا گیا تو اس سے مسلمانوں کی علمی جدوجہد کی مستند دستاویز تیار ہو جائے گی جو ساری دنیا کے شائقین علم و فن کے لیے ان کی علمی کوششوں میں بہترین مددگار بنے گی۔ وما علینا الا البلاغ ○

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۰ سے آگے) انسان کی شاعری ہے۔ جن کے پاس حیات انسانی کے اعلی مقاصد تھے اور جو اخلاق اور اعلی اقدار کو زندگی کے نہاں خانے میں سمونے کا بے پناہ جذبہ رکھتا تھا۔ روش کو میں نے بہت ہی قریب سے دیکھا تھا۔ اکثر جلسوں اور مشاعروں میں ان سے ملاقاتیں رہیں۔ تنہائی اور یکسوئی کے عالم میں گھنٹوں ان سے تبادلۂ خیال بھی کیا تھا وہ بڑی معصوم فطرت کے انسان تھے ان کی گفتگو میں ایک ٹھہراؤ رکھ رکھاؤ اور علمی انکساری ہوتی تھی۔ انھوں نے غیر منقسم ہندوستان کے بے شمار مشاعرے پڑھے اور آزادی کے بعد منقسم ہندوستان کے طول و عرض میں وہ اسی سلسلے میں ہمیشہ پابہ رکاب رہا کرتے تھے وہ تحت میں کبھی نہیں پڑھتے تھے ہمیشہ ترنم کے ساتھ پڑھتے اگرچہ ان کا ترنم سامعین کو پسند نہ آتا تھا لیکن ان کے کلام کی خوبصورتی ان کے ترنم کے بجائے ہمیشہ بھاری ہو جایا کرتی تھی۔ روش کی خدمات فراموش کرنے کے قابل نہیں، ہماری نئی نسل اگرچہ فکر و فن کے اعتبار سے الگ راستے پر گامزن ہے لیکن روش جیسے پرانے فنکاروں سے انھیں بہت کچھ مل سکتا ہے۔

محمد ایوب واقف

روشن صدیقی

روشن کی تاریخ ولادت ۱۰ر جولائی ۱۹۱۱ء ہے۔ جوالاپور ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ نام شاہد عزیز اور تخلص روشن تھا۔ عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ سات سال کی عمر سے شعر گوئی شروع کی۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہد فارسی زبان کے ماہر تھے۔ اس میں فکر سخن بھی کرتے تھے۔ شاعری کے ابتدائی ایام میں روشن اپنے والد ہی سے مشورہ لیتے تھے۔ لیکن باپ بیٹے کے درمیان تلمذ کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ روشن کی جدت پسندی تھی۔ روشن اس جادہ پر چلنا چاہتے تھے جسکا سراغ خود ان کے ذہن و فکر نے لگایا ہو۔ چنانچہ وہ شروع ہی سے اپنی نکالی ہوئی راہ پر گامزن ہوئے اور اپنے فطری ذوق کی رہنمائی میں اس منزل پر پہنچے جس تک پہنچنے کے لئے وہ کوشاں تھے۔ اردو شاعری میں انھوں نے اپنے خاص اسلوب سے اپنی انفرادیت قائم کی۔

روشن نے شروع میں غزلیں لکھیں۔ جسکا سلسلہ ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۴ء تک قائم رہا ۱۹۲۴ء کے بعد نظم گوئی کی طرف مائل ہوئے اور اس کے لئے اس قسم کے موضوع انتخاب کئے جس قسم کے موضوعات پر چکبست، جوش، حفیظ جالندھری، وغیرہ لکھ چکے تھے۔ ان شعراء نے اپنی شاعری کے ذریعہ ملک و قوم اور مذہب و ملت کی موثر خدمت انجام دی۔ روشن اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس نسل کے بہت سے شعراء اب ہم میں نہیں جو زندہ ہیں وہ شعر کہنا تقریباً بند کر چکے ہیں ایک حد تک ان کی خدمات بھی مکمل ہو چکی ہیں۔ اور اب ان سے مزید امیدیں وابستہ نہیں کی جاسکتیں اور اب نئی نسل کے نئے رجحانات و میلانات کا دور ہے۔ اقبال، سیماب، جوش، فراق، آنند نرائن ملا، احسان دانش، حفیظ جالندھری، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، عبدالحمید عدم، وغیرہ کے نام اس پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ روشن اس نسل کے ممتاز رکن تھے۔ انھوں نے خیال کی سطحیت اور فکر کی فرسودگی سے کبھی مفاہمت نہیں کی انھوں نے اپنی شاعری کو قدیم و جدید کا آمیزہ (MIXTURE) ضرور بنایا لیکن قدماء کے ایسے خیالات کو دائرہ فکر میں جگہ نہیں دی جو نئے ذہنوں پر گراں گزرتے تھے۔ ان کی شاعری روایت و بغاوت دونوں کا سنگم تھی۔ روشن نے نئے عہد کی نئی روشنی کا ہمیشہ خیر مقدم کیا مگر اسی سے استفادہ کرنے میں بڑی حد تک محتاط رہے۔ اس نسل کے بعض شعراء کے ذہنی نظام میں جو کجی پائی جاتی ہے۔ اس سے

روشن نے اپنی شاعری کو ہمیشہ بچائے رکھا۔ اس احتیاط اور سلامت روی نے ان کے فن کو مضحکہ خیز (DOGGEREL) نہیں ہونے دیا۔ انکی شاعری قدامت کی پختگی کے ساتھ ساتھ جدید رجحانات (TEW TENDENEIES) کی خوبیوں سے مالامال ہے یہی ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔

روشن نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی لیکن بدقسمتی سے ابھی تک انکو کتابی شکل میں یکجا نہیں کیا گیا ہے۔ غزلوں کا ایک مختصر سا مجموعہ "محراب غزل" کے نام سے مکتبہ جامعہ نے ۱۹۵۶ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں جتنی بھی غزلیں شامل ہیں انکی روشنی میں روشن کی غزل گوئی کے مقام کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری جس دور میں پروان چڑھی وہ ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین دور تھا۔ اس دور میں ہندوستان کی سیاست اسکی معاشرت اور ذہنی فضا میں بڑے انقلابات ہوئے۔

اس کے اثرات روشن کی نظموں اور غزلوں دونوں ہی میں ملتے ہیں۔ مولانا حالی کی اصلاحات نے اردو شاعری میں جس آہنگ کی بنیاد ڈالی تھی روشن کی شاعری اسکی روشن مثال ہے۔ اقبال نے بھی اسی بنیاد پر اپنی شاعری کی راہ متعین کی تھی۔ جوش ملیح آبادی ذہنی اعتبار سے انقلابی واقع ہوئے اس لئے انھوں نے اس آہنگ کو انقلاب کا نقیب بنایا شعراء میں محمد حسین آزاد سے لیکر اپنے عہد تک کے مشہور غزلگو اور نظم گو شعراء سے روشن نے استفادہ کیا۔ حسرت موہانی کی رنگینیٔ بیان، آرزو لکھنوی کی قدرت زبان، اختر شیرانی کی رعنائی فکر، اصغر گونڈوی کی پاکیزگی و طہارت اور شریفانہ سوز و گداز، فانی کی لذت الم اور مولانا محمد علی کے عزم و استقلال سے انھوں نے اپنی شاعری کو سنوارا۔ لیکن وہ اپنے خیالات و فکر میں اقبال سے زیادہ قریب رہے۔ اقبال کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے پرانی علامات کو نئی تعبیر (INTERPRETATION) کا جامہ پہنایا۔ روشن نے اقبال کی اس خوبی کو بڑے سلیقے سے اپنایا۔ اقبال کے آفاقی ذہن (UNIVERSAL INTELLIGANCE) ان کی بے خوفی و بیباکی، جرأت رندانہ اور احساس خودی سے روشن نے حتی المقدور استفادہ کیا۔ قلی قطب شاہ سے لیکر موجودہ عہد کے تقریباً تمام شاعروں کے یہاں عشق کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے مگر اقبال نے جس عشق سے ہمیں روشناس کرایا اسکی کیفیت بالکل جدا ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات کی تمام چہل پہل صرف عشق کی مرہون منت ہے عشق کے بغیر حیات و ممات نہ کوئی حقیقت رکھتے اور نہ اس کے بغیر زندگی میں کوئی سوز و گداز پیدا ہو سکتا ہے۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم — عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دم بدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق — شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

یا پھر یہ کہ ؎

کیونکر کیا بیاں کروں سر مقام مرگ عشق — عشق سے مرگ باشرف مرگ حیات بے شرف

عشق ہے مرگِ باشرف کہکر اقبالؔ اپنے عشق کی داستان ختم نہیں کر دیتے بلکہ اس داستان میں سوز، تب و تاب اور رنگ و نکہت کی آمیزش سے اسکے دامن میں وسعت و ہمہ گیری پیدا کرتے ہیں وہ عشق کو ازلی و دائمی بنانے کیلئے ان چیزوں کو نہایت ضروری بتلاتے ہیں اور جب ان تمام چیزوں کے ساتھ عشق نمودار ہوتا ہے تو صرف یہ کہ حیاتِ انسانی کامرانی سے دوچار ہوتی ہے بلکہ حیات و ممات کے رازہائے سربستہ ذہن انسانی پر فاش ہونے لگتے ہیں۔ اقبالؔ کہتے ہیں سہ

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　　اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

روشنؔ کے سرمایۂ کلام سے عشق کے متعلق لکھے گئے اشعار کو تلاش کیا جائے تو ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں روشنؔ نے عشق کے بارہ میں اپنا واضح نظریہ پیش کیا ہے۔ اقبالؔ کی طرح روشنؔ نے بھی عشق کو تمام تر مصائب کا حل قرار دیا ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ جب انسان غمِ عشق کے تیر سے زخمی ہو جائے تو یقینی طور پر وہ دوسرے تمام غموں سے آزاد ہو جاتا ہے سہ

ہم ازل سے ہیں گرفتارِ غمِ عشقِ روشنؔ　　　ہمکو ہر غم سے غمِ عشق نے آزاد کیا

اور جب عشق کے متعلق وہ یہ کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ سہ

عشق میں شانِ کبریائی ہے　　　بندگی عشق کی خدائی ہے

عشق نے شرک کی پستی سے بچایا مجھکو　　　عشق ہے شرحِ ہو اللہ احد اے محبوب

تو عشق کے متعلق اقبالؔ اور روشنؔ کے خیالات اور نظریات میں کوئی فاصلہ یا تضاد نہیں رہ جاتا۔ "یقینِ محکم" اور "سوزِ غم" جو اقبالؔ کے نزدیک عشقِ حقیقی کے لئے ضروری عنصر ہیں روشنؔ کو اس سے پورا پورا اتفاق ہے۔ وہ "یقینِ محکم" اور "سوزِ غم" کی اہمیت کا اقرار اپنے دو اشعار میں اس طرح کرتے ہیں سہ

ذوقِ یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا　　　جس در پہ سر جھکا در جاناں بنا دیا

نہ سوزِ غم کو سمجھا اور نہ دردِ دل کو پہچانا　　　کہاں دنیا نے حسن و عشق کی منزل کو پہچانا

ہم بے نیازِ چارہ گری ہیں کہ عشق نے　　　درماں کو درد، درد کو درماں بنا دیا

مندرجہ بالا اشعار میں روشنؔ کے جس نظریۂ عشق کو تلاش کیا گیا ہے وہ عشق کا حقیقی پہلو ہے۔ ظاہر ہے عشقِ حقیقی سے ان کا یہ گہرا ربط حقائق و معرفت تصوف و مذہب اور انسانی زندگی کے عمیق مطالعہ و مشاہدہ کے ذریعہ ہی پیدا ہوا ہوگا۔ روشنؔ کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے، تو جو چیز سب سے پہلے ذہن میں ابھرے گی وہ یہ ہوگی کہ روشنؔ نے زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھا ہے اور ان پر مسلسل غور و خوض کیا ہے۔ میرے خیال میں ان کے بیشتر اشعار تجربات و مشاہدات کی آماجگاہ ہیں۔

اقبالؔ ایک انتہا پسند مسلمان تھے۔ دینِ محمدی اور شانِ کبریائی کو وہ تمام بنی نوع انسان کی نجات

اور بخشش کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر اقبال جس دین کے عاشق تھے وہ مسجد کے نام نہاد ملّا و زاہد کے ایمان سے قطعاً مختلف تھا۔ وہ تنگ نظر اور عقل کے کورے ملا و زاہد کے طرزِ فکر سے ہمیشہ نالاں رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح کے شیدائی حق مذہب اسلام پر جان تو چھڑکتے ہیں لیکن اسلام کی ہمہ گیریت کو محدود کر دیتے ہیں جس سے اسلام کی برتری اور افضیلت پر بعض اوقات حرف آتا ہے۔ شاید اسی لیے اقبال نے اسلام کے اس نوع کے پرستاروں سے بیر رکھا اور اکثر و بیشتر ان کے طرزِ فکر پر حملے کئے۔ صرف یہی نہیں کہ انھوں نے اسلام کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کو ہمیشہ اپنے گہرے طنز (SATIRE) کا نشانہ بنایا بلکہ دوسرے لوگوں کو اس طرح کے مہلک اور بے سود اعتقاد سے آگاہ کیا۔ مذہب کے متعلق اقبال کے اس رویّے سے روشؔ نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اقبال کے طرزِ فکر کو اقبال کے بعد جاری و ساری رکھا۔ اسلام کے دائرہ (RANGE) کو قرآن کے زبان کے مطابق ہی قائم رکھنے کی انھوں نے تلقین کی۔ ملا و زاہد کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی کو منظرِ عام پر لانے کے لیے انھوں نے مجاہدانہ طور پر یہ اشعار کہے جنھیں ہم اقبال کے تفکر کی پیروی کہہ سکتے ہیں ؎

زاہد ترا تسلیم، ایمان سہی بلند　　　لیکن مرا تصورِ ایماں کچھ اور ہے

جلا کر اک چراغِ ترکِ دنیا تو نے اے زاہد　　　فروغِ زندگی کو آہ کتنا مختصر جانا

کون سمجھائے کہ اے واعظِ محدود نظر　　　زہدِ افسردہ نہیں آتشِ دوراں کا علاج

روشؔ کے کلام کے مطالعہ سے یہ امر بھی بخوبی واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اقبال کے فلسفۂ زندگی حقائق و معارف اور اسلامی طرزِ تفکر کی تقلید کی ہے بلکہ اکثر و بیشتر ان کے اسلوب بیان کا بھی تتبع کیا ہے طرزِ فکر کی تقلید بعض صورتوں میں اتنی مشکل نہیں ہوتی جتنی اسلوب بیان کی تقلید ہوتی ہے لیکن روشؔ اس مشکل کام میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ان کی شاعری میں اقبال کا رنگ کافی نمایاں ہو گیا ہے۔ مثلاً ان کی ایک غزل کے حسبِ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

کب سے پامال ہیں یہ ترکِ طلب کی راہیں　　　عشق کی ایک نئی راہگذر پیدا کر

منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے　　　تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

دلِ افسردہ محبت کو نہیں ہے درکار　　　اک گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر

درِ جاناں پہ اگر صرف سجدہ ہے تجھے　　　عرش جس کے لئے جھک جائے وہ سر پیدا کر

کیا ہوا گر تری راہیں رہیں بیگانۂ خواب　　　حسن بیدار ہو جس سے وہ سحر پیدا کر

زندگی کے لئے موت فریبِ آرام　　　حسنِ منزل سے تقاضائے سفر پیدا کر

اقبال کی ان تمام فنکارانہ خصوصیات کو اپنانے کے باوجود روشؔ اگرچہ اقبال کی طرح مثالی شخصیت

(ARCHETYPE) کے مالک نہ بن سکے لیکن روشن کی شاعری کے یہ گہرے نقوش ان کی شاعری اور ان کی شخصیت کی دائمی مقبولیت کے ضامن ضرور ہیں۔

حقائق و معارف اور عشقِ حقیقی کے بیان کے علاوہ روشن صدیقی نے دوسرے شاعروں کی طرح عشق کے مجازی پہلو کو بھی اپنے دامنِ فکر میں جگہ دی ہے" محرابِ غزل" کی غزلوں میں آپ کو اکثر مقامات پر گوشت پوست کے محبوب سے چھیڑ چھاڑ ملیگی۔ معشوق کے ساتھ گہری محبت اس سے والہانہ لگاؤ اور اس کی چاہت کے شدید جذبات سے لبریز اشعار بھی ملیں گے لیکن اپنی اس محبت اور چاہت میں روشن نے ہوشمندی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ دوسرے لفظوں میں اسطرح کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ابتذال و کروہات اور بے ضرر فحاشی (HEALTHY OBSENITY) کو اپنے کلام میں کوئی جگہ نہیں دی۔ ان کے عشق و محبت میں ایک سلیقہ اور رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کا ادبی شعور (LITERARY CONCIOUSNESS) بڑا پختہ اور پاکیزہ تھا ان بنیادوں پر ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ روشن غزل کی ہیئت (FORM OF GHAZAL) سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی لئے وہ ایک کامیاب غزلگو کی شکل میں جلوہ گر ہوئے۔

اس حقیقت کا انکشاف پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ روشن نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری بھی کی ہے۔ مگر چونکہ ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آسکا ہے کچھ اسی باعث اردو کے نظم نگار شعراء میں ان کا مقام ابھی تک متعین نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن انصاف اور غیر جانبداری سے اگر ان کی ان تمام نظموں کا جو ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع ہوئی ہیں مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلیگا کہ روشن اپنے ہمعصر نظم گو شعراء میں بھی ممتاز ہیں۔ جس عہد کے روشن فنکار تھے اس عہد کے بیشتر بیدار مغز شعراء نے غزل کے ساتھ ساتھ نظم نگاری بھی کی ہے۔ نظم لکھنے کا رجحان آزادیٔ وطن کی تحریک کے ساتھ ساتھ شروع ہوا تھا۔ نظم لکھنے کے شوق اور رجحان کی وجہ یہ رہی تھی کہ سنہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کا زمانہ سیاسی و سماجی اعتبار سے افراتفری کا زمانہ تھا مشرقی تہذیب کے ستم خوردہ شیدائیوں کے صبر کا جام اب لبریز ہو چکا تھا۔ بلا تفریق مذہب و ملت تمام ہندوستانی اپنی مشترکہ تہذیب کے تحفظ اور بقا کے لئے میدانِ جنگ میں کود پڑے تھے۔ اس ہولناک جنگ میں ہمارے شعراء و ادباء (بالخصوص اردو کے ادباء و شعراء) نے نمایاں حصہ لیا۔ غزل میں اگرچہ آزادی اور قومی مسائل کی ترجمانی ہو سکتی تھی اور کی بھی گئی لیکن نظم کی تنگنائے اس مہم کے لئے کافی کشادہ اور سازگار تھی چنانچہ ہمارے بیشتر شعراء نے نظم کا سہارا لیا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظموں کا گراں قدر سرمایہ تیار ہو گیا۔ اس عہد کی ادبی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ کہ نظم نگار شعراء کی ذہنی و فکری ترتیب علامہ اقبال مرحوم بہ نفسِ نفیس کر رہے تھے۔ اگرچہ اقبال نے اپنی فکر کا دھارا بہت جلد اسلامیات کی طرف موڑ دیا تھا

لیکن قومی بیداری کے لئے جس ہوشمندی کی ضرورت تھی اسے اقبال کی بعض نظموں نے اجاگر دیا تھا۔ اقبال کے پیچھے اردو کے نظم نگار شعراء کا جو کارواں گامزن تھا اس میں سیماب اکبرآبادی، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، جوش ملیح آبادی، آنند نرائن ملا، حفیظ جالندھری، احسان دانش، اختر شیرانی، فیض احمد فیض، سردار جعفری، [illegible] شفیق جونپوری، اقبال سہیل، مخدوم محی الدین اور ایسے بہت سے دوسرے شعراء تھے جن کی آوازیں تیغ و سناں کا کام کر رہی تھیں۔ روش صدیقی بھی شعراء کی اسی نسل میں شامل ہیں۔ اگرچہ وہ اقبال، جوش اور فیض وغیرہ کی طرح سیاسیات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکے تھے لیکن ملکی و قومی تعمیر و ترقی کے رازہائے سربستہ سے واقف تھے اور اپنے طرز کی بہترین قومی خدمات انجام دیں۔ مثلاً انکی نظم "سکوت شوق" جو ستمبر ۱۹۳۷ء کے زمانہ کانپور میں شائع ہوئی تھی۔ اسکا مطالعہ اسکا ثبوت ہے کہ ایک پست ہمت قوم کے ذہن کو بیدار کرنے میں روش نے کتنی کامیاب کوشش کی۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ــــ

پیش نظر خزاں سہی، حد نظر خزاں سہی
کیا ہے مگر خزاں کے بعد
آئیگی خود یہی خزاں بن کے بہار گلفشاں
غارت گلستاں کے بعد
سلسلۂ تغیرات اور یہ دور حادثات
خود ہے فروغ کائنات
بنتا ہے جنت نظر حسن صحیفہ سحر
رات کی داستاں کے بعد
حال وطن زبوں سہی سرنگوں تا خوں سہی
حب وطن جنوں سہی

ایک طرف روش حد درجہ دیندار اور صوم صلاۃ کے پابند مسلمان تھے اور دوسری طرف ہندو تہذیب اور اس کی رسومات کے دلدادہ تھے۔ ایک طرف وہ ہندوستان کے قرب و جوار میں اولیا و صوفیا کے مزاروں پر حاضری دیتے اور دوسری طرف رام اور کرشن کے تذکرے مزے لے لیکر کرتے ان کا عقیدہ تھا کہ محبت ایک ہمہ گیر وصف ہے اس کے دھارے کو کسی بھی طرف موڑا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں نہ تو بتکدہ سے بیزاری ملتی ہے اور نہ ہی حرم سے غفلت۔ ان بنیادوں پر کہا جا سکتا ہے کہ روش ہند مسلم تہذیب کے زبردست سنگم تھے وہ اس امر میں یقین کامل رکھتے تھے کہ تہذیبیں آپس میں اتحاد و اتفاق چاہتی ہیں نفرت و عداوت نہیں، وہ

آپس کے اختلافات کو ختم کرکے ایک دوسری میں ضم ہونے کے لئے ہمیشہ بے چین رہا کرتی ہیں لیکن تہذیبوں کے درمیان حیب و حشت، ڈر اور خوف جیسے خوں آشام عناصر داخل ہوتے ہیں تو منافرت، تعصب اور انسان دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے۔ روشن صدیقی کا عقیدہ تھا کہ تہذیبوں کا ٹکراؤ ہمیشہ مفاد پرست، تنگ ذہن اور متعصب انسانوں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے۔ روشن صدیقی نے اپنے قول و فعل اور فکر و تدبر سے ہمیشہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ کہیں بھی رہے کسی بھی حالت میں رہے۔ ہندوستان اور ہندوستانی عوام کی فلاح کا خواب دیکھتے رہے۔ حب الوطنی تو ان کے جسم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی تھی۔ یہاں ہم انکی ایسی ایک اور نظم کے چند بند پیش کرتے ہیں جس سے ان کا وطن دوستی کا چشمہ پھوٹ پڑتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

سازش رہزن بد بیں کو مٹائے یزداں
فتنہ پردازی گلچیں سے بچائے یزداں
اس خیاباں سے ہے مشرق کے چمن کی زینت
اسی معبد سے ہے اس دیر کہن کی زینت

ہے یہی ارض حسیں میرے وطن کی زینت
اسے اک جنت آزاد بنائے دنیا

مشرق کے چمن کی اس زینت یعنی ارض کشمیر جو قدرتی مناظر کا خطۂ دلنشیں ہے روشن اسکی رنگینیوں اور اسکے حسن کی رعنائیوں سے محظوظ ہوئے ہیں ہندوستان کے اس بے مثال مقام اور اس کی خوبصورتی کے ٹھہراؤ کے لئے وہ بارگاہِ خداوندی میں دست دعا تو دراز کرتے ہی ہیں خود وطن کے سرفروشوں اور جاں نثاروں کو بھی آواز دیتے ہیں کہ وہ وطن کی حفاظت اور اس کی عظمت کو برقرار رکھنے کے لئے سر سے کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ ذرا اس خوبصورت نظم کا ایک بند دیکھئے۔

نالۂ شام غریباں میں اثر پیدا ہو
دورِ آزادیٔ مغرب کی سحر پیدا ہو
روح خوابیدۂ احساس ہو بیدارِ عمل
ارضِ کشمیر کے فرزند ہوں سرشارِ عمل

نوجوانانِ وطن پھر ہوں جہاں دارِ عمل
اس افق سے کوئی خورشید دگر پیدا ہو

روشن صدیقی کی اس نوع کی دوسری نظموں سے بھی انکی گہری وطن دوستی ثابت ہوتی ہے مثال کے طور پر انکی مشہور و مقبول نظم "میرے حبیب" اس نظم کے ذریعہ روشن نے عام ہندوستانیوں کو خوشحالی اور سکون کا مژدہ سنایا ہے۔ انھوں نے بڑے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہا ہے کہ اگرچہ ہندوستانی قوم پر ایک مدت سے غریبی بے چینی اور خوف و ہراس کا بادل منڈلا رہا ہے لیکن اب خدائی رحمتوں کا نزول ہوگا اور قوم پستی اور پامالی کے غار سے نکل کر ترقی کے بام عروج تک پہنچیگی۔ نظم "میرے حبیب" کے دو بند ملاحظہ ہوں جن میں کچھ اسی طرح کی باتیں کی گئی ہیں:

ملیگی تیرے غریبوں کو دولتِ یزداں
کہ چھوٹنے کو ہیں انوارِ برکتِ یزداں
جھکی ہے تیری طرف چشمِ رحمتِ یزداں
بہیں گی تیرے لئے راحتوں کے گنگ و جمن
مرے حبیب وطن

تو شمعِ نور ہے مغرب کی روشنی کے لئے
تو ہی دلیل ہے مشرق کی برتری کے لئے
بنا ہے تاجِ وفا تیری برتری کے لئے
طواف زن ہے ترے آسماں کا چرخ کہن
مرے حبیب وطن

روشؔ کی نظموں کے سب سے اہم پہلو کا آپ نے مطالعہ کیا مگر ایسا نہیں کہ ان کی نظموں پر صرف حب الوطنی ہی کی سحر کاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی شاعری میں رومانوی انداز فکر ہی خاصے کی چیز ہے اور انکی شاعری کا یہ اہم اور قابل قدر (MERITORIOUS) پہلو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی نظموں میں روشؔ صدیقی نے بے جان طرز (CONVENTIONAL STYLE) سے احتراز کیا ہے۔ زبان سادہ اور دلکش ہے بحروں کی موزونیت سے نظموں میں اور حسن پیدا ہو گیا ہے۔ ان کی نظم "فردوسی شہزادی" جو انھوں نے ۱۹۲۸ء میں لکھی تھی ان بیانات کا بین ثبوت ہے اس خوبصورت نظم کے دو چار بند دیکھتے چلئے۔

سن اے فردوسی شہزادی		عہدِ وفا کو بھول نہ جانا
جب تو کرنوں کے جھولے میں
گانے گاتے اکتا جائے
دنیا کے افسانے سنکر
تیرا دل گھبرایا سا جائے
جب انسانوں کی محفل کا
منظر مجھکو یاد آ جائے
تیری ہنگامہ گر فطرت
تنہائی سے گھبرا جائے۔

میرے گلشن میں آ جانا　　عہدِ وفا کو بھول نہ جانا

یاد ہے تجھکو اس گلشن میں
گھوما کرتے تھے ہم دونوں
مست بادۂ الفت ہو کر
جھوما کرتے تھے ہم دونوں
پھر ان پاکیزہ کلیوں کو
چوما کرتے تھے ہم دونوں

وہ مل جلکر نغمے گانا　　عہدِ وفا کو بھول نہ جانا

اُردو کی رومانوی شاعری کے سرمائے کو کھنگال کر دیکھا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے کہ روشؔ صدیقی کی یہ نظم "فردوسی شہزادی" نہ صرف منفرد اور اچھوتے خیال کی حامل ہے بلکہ بعض وجوہ کی بنا دوسری بہت سی رومانوی نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اسی طرح "میرا محبوب" "سوگوار" اور "محبت کی شام" وغیرہ بھی روشؔ صدیقی کی کامیاب رومانوی تخلیقات ہیں ان نظموں میں نغمگی اور الفاظ کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ جذبات اور تاثرات کی بڑی حسین تصویر کشی کی گئی ہے۔ کیف آور اور خوبصورت تشبیہات کے استعمال سے ان نظموں کے حسن کو دوبالا کیا گیا ہے۔ ان کی نظم "محبت کی شام" کے دو بند ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ روشؔ نے محبت کی راہ میں حاصل شدہ درد و کسک اور سوز و گداز کی کیسی حسین و جمیل عکاسی کی ہے۔

منظرِ بربادیٔ دنیائے الفت یاد ہے۔
کس طرح سے ہو گیا تھا خونِ حسرت یاد ہے۔
یاد ہے وہ انکا انکارِ محبت یاد ہے
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے

روح افسردہ ہے ارمانِ محبت کی طرح
دل ہے ٹکڑے ٹکڑے پیمانِ محبت کی طرح
جا رہا ہوں اک پشیمانِ محبت کی طرح
ہائے کیا جانے! وہ اب کیوں یاد آتے ہیں مجھے

اس مقالے میں روشؔ کی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید اس سے ان کی شاعری کے خط و خال کا عکس دیر تو نظر آ جائے۔ روشؔ کی شاعری دراصل ایک ایسے بیدار مغز اور روشن ضمیر

(بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر)

سلیمان اطہر جاوید

امیجزم — ایک تحریک

دنیائے شعر و ادب میں اس صدی کے اوائل میں جن تحریکات کو پھلنے پھولنے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ امیجسٹ تحریک کا شمار انہی میں ہوتا ہے۔ امیجری کا تصور شعر و ادب میں نیا نہیں اس کی جڑیں خصوصاً شاعری میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کم و بیش ہر زبان میں اردو میں امیج کو ایک عرصہ تک تمثیل یا اسی قبیل کی کوئی چیز سمجھا گیا لیکن جوں جوں خود تمثیل کا تصور ہمارے ذہنوں میں واضح ہوتا گیا امیج کے باب میں بھی غلط فہمی زائل ہوتی گئی اور اب ہم امیج کو قطعی ایک جداگانہ اور اپنے طور پر منفرد حیثیت کی حامل چیز قرار دیتے ہیں۔ امیج کا استعارہ سے ایک حد تک تعلق ضرور ہے لیکن استعارہ کی طرح امیج مستعار لہٗ اور مستعار منہ دونوں سے بے نیاز ہے۔ اس کا آپ اپنا وجود ہوتا ہے۔ شاعر کچھ یوں ہمارے تصورات کو چھیڑتا ہے کہ ہمارے شیشۂ ذہن پر آپ ہی آپ کوئی تصویر ابھر آتی ہے یہ تصویر جتنی سرعت کے ساتھ، جتنی بھرپور اور جس قدر متحرک ہوگی امیج اتنا ہی کامیاب کہلائیگا امیج کو کسی نے حسیاتی تجربے کی بازیافت کا نام دیا ہے تو کسی کے نزدیک یہ کسی شئے کی مصورانہ پیش کش کا نام ہے۔ نیل فرانک ڈوبلڈے کی بموجب ہم امیج سے۔

"اُن ذہنی پیکروں سے مراد لیتے ہیں، جو الفاظ یا اظہارات کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوتے ہیں"[1]

ایزرا پاؤنڈ جس کو امیجسٹ تحریک کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اسی خیال کا حامل تھا کہ امیج ذہنی یا جذباتی (خصوصاً پیچیدہ) کیفیات کی مصورانہ پیش کش ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو بعض شاعروں نے اہمیت دی اور اس قدر کہ اگر کوئی نظم کسی ذہنی پیکر کی تخلیق نہیں کر سکتی تو وہ سب کچھ ہو سکتی ہے۔ شاعری نہیں۔ شاعر کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے کوئی امیج پیش کرے۔ کوئی پیکر تراش دے۔

امیج کی اس تشریح اور اہمیت کے بعد اس امر کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے کہ امیج کا بنیادی مقصد ترسیل ہے، ترسیل بھی ایسی، جو فوراً زیادہ سے زیادہ مکمل اور بھرپور ہو۔ اسی وجہ سے ادب میں امیجزم کی تحریک کا آغاز ایک طرح سے ابہام اور اشاریتی تحریک کے رَدِّ عمل کے طور پر ہوتا ہے۔ فرانس میں اشاریتی تحریک پارناسی دبستان کے خلاف بغاوت کا نتیجہ تھی۔ اشاریت پسندوں نے تحت الشعور، دروں محض،

---

[1] NEAL FRANK DOUBLEDAY "STUDIES IN POETRY" NEWYORK 1949 - P.52.

غنائیت، مابعد الطبیعیات اور محسوسات سے ماورا حُسن پر زور دیا۔ اسی کے ساتھ اُن کی اپنی جذباتی اور جنسی الجھنوں نے اُن کے فن کو مبہم بلکہ کہیں کہیں تو مہمل بنا دیا۔ ترسیل، جو شاعری کا مقصد تھا ہے اور چاہیئے اشاریت پسندوں نے اس مقصد کو شاعری سے چھین لیا۔ اُن کا فن معنی آفریں نہیں الفاظ کا گورکھ دھندا بن گیا۔ انھوں نے کچھ ایسا مجرد فن تخلیق کیا جس کے مقصد اور منہاج سے وہ خود ناواقف تھے۔ امیجزم کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے غیر یقینی، ابہام اور تجرید کو شاعری سے دور کیا۔ اشاریت پسندوں نے داخل اور کو اہمیت دی تھی، اپنی آنکھ سے اپنی ذات ہی کا نظارہ کیا تھا۔ امیجسٹوں نے خارج اور بیرون کو اہمیت دی اپنی ذات کا نہیں اپنے اطراف کا نظارہ کیا۔ اِن سب کے باوجود امیجسٹ، اشاریت پسندوں سے متاثر بھی رہے۔ غنائیت اور مرصع سازی میں امیجسٹوں پر اشاریت پسندوں کا غیر معمولی اثر رہا۔ ممتاز امیجسٹ شاعر پاونڈ نے امریکی شاعر پو اور فرانسیسی شعرا ملارمے اور لافورج جیسے اشاریت پسندوں کے غیر معمولی اثرات قبول کئے ہیں۔

اشاریت پسندی کے ساتھ ساتھ امیجزم ادب میں انسانیت پرستی کے رویہ کا استرداد بھی ہے۔ انسانیت پرست بات کو سیدھے سادے اور عام فہم انداز میں پیش کرنے پر زور دیتے تھے۔ اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس لئے ادب اور شاعری بھی اُسی کے لئے ہونے چاہئیں۔ برطانیہ کے مشہور امیجسٹ ہیوم نے انسانیت پرستوں کے اس نقطۂ نظر کو مسترد کیا۔ انسانیت پرستی کے خلاف اس کے موقف کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہیوم کے الفاظ میں شاعری ایک ایسا نازک اور دشوار فن ہے جو خیالات کو قوافی کا پابند کر کے امیج پیدا کرتا ہے گویا اُس کے ہاں فنی مرصع سازی ایک اہم بنیاد ہے۔

امیجزم کو روایت اور بغاوت کا خوشگوار امتزاج کہنا چاہیئے کیونکہ امیجسٹوں نے جہاں نت نئے تجربے کئے ماضی کی قدروں کو یکسر مسترد بھی نہیں کیا۔ اُن کے پاس اگر کلاسیکی روایت کا احترام ہے۔ خصوصاً یونانی روایات کی پاسداری تو اسی کے ساتھ نئے نئے قافیے اور اظہار کے نئے طریقے بھی ہیں۔ ایسا ضروری بھی تھا کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ اپنے احساسات و جذبات کو بھرپور اور موثر طریقہ پر پیش کرنے کے لئے صرف الفاظ ہی کافی نہیں۔ بندھی ٹکی تشبیہات تلمیحات اور استعارات وغیرہ سے ہی مافی الضمیر کا بخوبی اظہار ممکن نہیں۔ بایں وجوہ انھوں نے اظہار کا وہ ذریعہ اختیار کیا جسکو ہم امیجری کہتے ہیں۔ امیجری میں حقیقت پسندی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں ابہام سے دامن بچانا ضروری ہے۔ امیجری کی تخلیق ہی ممکن نہیں تا آنکہ خیال میں مرکزیت نہ پائی جاتی ہو اور مختلف تصورات ایک نقطہ پر مرکوز نہ ہو جاتے ہوں اس طرح امیج کو ایک اجتماعی اصطلاح کہنا چاہیئے۔ غالبؔ کے اس مشہور شعر سے

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل　　　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہیں بوسۂ گل، نالۂ دل اور دودِ چراغِ محفل کی دنیا جداگانہ ہے لیکن شاعر نے ان سب میں مرکزیت اور ہم آہنگی پیدا کر دی ہے ان تینوں کی ہم آہنگی سے جو امیجری پیدا ہوتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یا اختر الایمان کی نظم "بنتِ لمحات" کا یہ اقتباس مختلف النوع چیزوں میں ہم آہنگی کے باعث کتنی خوبصورت امیجری کا حامل ہے ؂

تمہارے لہجہ میں جو گرمی و حلاوت ہے — اُسے بھلا سا کوئی نام دو وفا کی جگہ

غنیم نور کا حملہ کہو اندھیروں پر — دیارِ درد میں آمد کہو مسیحا کی

رواں دواں ہوئے خوشبو کے قافلے ہر سو — خلائے صبح میں گونجی سحر کی شہنائی

امیجری اپنی وضاحت، یقینیت، حقیقت پسندی اور مرکزیت کے باوجود کئی اقسام کی حامل ہوتی ہے۔ رابن سکلیٹن نے امیجری کی جو کئی اقسام کی ہیں اُن میں حسب ذیل اہمیت رکھتی ہیں۔

سادہ امیج۔ وہ جو ہمارے حسی ادراک کو جگاتے ہیں۔ درخت، مکان، ہاتھ، سادہ امیج کی مثالیں ہیں۔ ان الفاظ کے استعمال سے ہمارے احساسات جاگ اٹھتے ہیں اور ایک خاص امیج ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ سخت، روشن اور زرد بھی سادہ امیج ہیں جو ایک بندھے ٹکے تصور کو جگاتے ہیں۔

وہ الفاظ جو کسی نوعیت کے حسی ادراک کو پیدا نہیں کرتے مجرد امیج کہلاتے ہیں۔ یہ امیجری کی دوسری قسم ہے۔ ایسے امیج سچائی، راستی، انصاف، عقلمندی، رحم اور محبت وغیرہ ہیں۔

بعض امیج جو بنیادی طور پر ہمارے حواسِ خمسہ کو بیدار کرتے ہیں فوری امیج کہے جاتے ہیں جیسے زرد، گونج، کھردرا اور ترشی وغیرہ۔

منتشر امیج وہ ہیں جو ہمارے کسی ایک حاسّہ سے تعلق نہیں رکھتے، بکھرا بکھرا ہونا جن کی عین ذات ہے مثلاً مجمع جدائی، خواہش، طاقت، تھکن وغیرہ۔

منتشر امیج کے متخالف مجتمع امیج ہوتے ہیں۔ یہ امیج کئی الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں اور یہ ایک سے زیادہ الفاظ اجتماعی طور پر کسی امیج کی تخلیق کرتے ہیں جیسے خیرات کی طرح سرد، تیز چاقو، سرخ انقلاب اور لافانی درخت وغیرہ۔

بعض امیج بڑے پیچیدہ ہوتے ہیں اول تو یہ کئی الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں اور جو مفہوم تخلیق کرتے ہیں اُن سے کسی امیج کا تعین آسان نہیں مثلاً گوبلار جنگل، سنہری گل نرگس، تیز چاول —— موجودہ دور میں ایسی امیجری عام ہے

اب ہم امیجری کی اُن اقسام کی طرف آتے ہیں جو مندرجہ بالا امیجوں کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے جیسے مجتمع تجریدی امیج —— اگرچہ یہ امیج کئی الفاظ سے تشکیل پاتا ہے لیکن پھر بھی مجرد ہوتا ہے جیسے شریف سچائی۔ منصفانہ رحم وغیرہ۔

اس طرح پیچیدہ تجریدی امیج ہوتے ہیں۔ یہ امیج ایسے الفاظ کا مجموعہ ہوتے ہیں جن کا ہر لفظ اپنے طور پر مجرد امیج کا حامل ہوتا ہے۔ ایسے امیج پھر بھی مجرد ہوتے ہیں اور کوئی قطعی تاثر پیدا نہیں کرتے جیسے وفادارانہ خیرات، مخلصانہ

محبت وغیرہ۔

امیجری کا مقصد نظم میں معنوی گہرائی پیدا کرنا ہے اور ترسیل کی اعلیٰ روایات کو شاعری میں محترم بنانا۔ امیجسٹ تحریک کا آغاز کرنے والوں نے جن میں ہیوم، فلنٹ، ازرا پاؤنڈ اور ایمی لوول لائق ذکر ہیں شاعری میں انہی اعلیٰ اور معتبر روایات کو رواج دینا چاہتے تھے۔ امیجزم کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ایک بین قومی تحریک ہے۔ اس کا آغاز برطانیہ میں ہوتا ہے لیکن اس کی ترویج و ارتقاء میں امریکہ اور برطانیہ دونوں ممالک کے فنکاروں نے برابر کا حصہ ادا کیا ہے۔

ہیوم اور فلنٹ کو یوں اہمیت حاصل ہے کہ ان دونوں نے ۱۹۰۹ء میں برطانیہ میں ایک چھوٹی سی سوسائٹی قائم کی جسکو "اسکول آف امیج" سے موسوم کیا گیا۔ بعد ازاں اس سوسائٹی میں ازرا پاؤنڈ نے بھی شرکت کی جو ایک سال قبل امریکہ چھوڑ چکا تھا۔ پاؤنڈ نے اس تحریک میں زبردست اور کلیدی حصہ ادا کیا۔ اس نے ۱۹۱۲ء میں شائع شدہ اپنی کتاب REPOSTES میں پہلی مرتبہ IMAGISME کا بطور تحریک تذکرہ کیا۔ یہ اس تحریک کا ابتدائی دور تھا۔ امیجسٹوں نے اس مرحلہ پر اپنی تحریک کے تین مقاصد قرار دیئے۔ زبان و بیان کی آرائش و زیبائش اور ابہام سے گریز، اشیاء کا واقعی اظہار اور غنائیت سے ہم آہنگ نئی بحروں اور اوزان کی تشکیل۔ امیجسٹ شاعروں کے کلام کا پہلا انتخاب DES IMAGISTES ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ جس میں امریکہ اور برطانیہ کے (۱۱) شاعروں کا کلام شامل تھا۔ ایمی لوول نے جو امیجسٹ تحریک کی پُرجوش کارکن تھی۔ ہر سال امیجسٹ شاعری کے انتخابی مجموعے شائع کرنے شروع کئے۔ ۱۹۱۵ء میں شائع شدہ امیجسٹ شاعری کا انتخاب بایں سبب اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں امیجزم کے اصول باضابطہ طور پر متعین کئے گئے۔ امیجزم کے یہ چھ اصول بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۔ عام گفتگو کی زبان استعمال کی جائے۔ ہمیشہ مناسب الفاظ استعمال کئے جائیں نہ بالکل سادہ اور مسجع۔

۲۔ جذبات کے اظہار کے لئے نئے اوزان تلاش کئے جائیں نہ کہ پرانے اوزان جن میں پرانے خیالات کی گونج الجھاتی ہو۔ اگرچہ ہم یقین رکھتے ہیں کہ شاعری انفرادیت کا بہترین اظہار روایتی ہیئت کی بجائے نظم آزاد میں ہوتا ہے لیکن ہم کو نظم آزاد پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے۔ موسیقی کے کئی نئے آہنگ کے معنی نئے خیال کے ہیں۔

۳۔ موضوع کے انتخاب میں قطعی آزادی ہونی چاہیئے۔

۴۔ امیج پیش کرنے کے لئے ہم مصوری کے کسی اسکول سے متفق نہیں ہیں لیکن ہمارا ایقان ہے کہ شاعری میں ہی بات کا من وعن اظہار ہونا چاہیئے۔ ابہام سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ خواہ وہ کتنا ہی عظیم اور شاندار کیوں نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ ہم نے COSMIC شعراء کی مخالفت کی ہے جو ہمارے خیال میں فن کی حقیقی دشواریوں سے دامن بچانے کی سعی کرتے ہیں۔

۵۔ شعر کی تخلیق میں غیر یقینی رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیئے۔

۶- آخر میں ہم سب کا ایقان ہے کہ مرکزیت شاعری کی روح ہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ ایمجزم کے بانیوں نے توازن اور اعتدال کو بڑی اہمیت دی قدیم و جدید کے درمیان توازن، روایتی و غیر روایتی ہیئت کے درمیان توازن اور الفاظ کے استعمال میں اعتدال اسی کے ساتھ فنکار کی آزادی، یقین محکم اور مرکزیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

ایمجزم کے آغاز کے چند ہی سال بعد ازرا پاؤنڈ نے ایمی لوول سے اختلافات کی بنا پر اس تحریک سے خود کو بے تعلق کر لیا۔ پاؤنڈ کو اعتراض تھا کہ لوول نے شاعرانہ صلاحیتوں سے زیادہ تجارتی مصلحتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ تحریک سے علیحدہ ہو جانے کے باوجود پاؤنڈ نے ایمجزم کی بے پناہ خدمات انجام دیں۔ اس کے کارنامے خود ایک تحریک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے اپنے پیشرو تحریکات اور ادب کا غیر معمولی مطالعہ کیا تحریک سے اس کے نظریاتی طور پر جو بھی اختلافات رہے ہوں لیکن۔ ایمجسٹ تحریک کو اس نے آگے بڑھایا اور سہارا دیا۔ پاؤنڈ نے اگر فنی مرصع سازی پارناسیوں سے سیکھی تو علامات بھی بے حد متاثر رہا۔ اس کے ہاں موسیقی، مصوری اور شاعری کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرنے کا رجحان اسی کا نتیجہ ہے۔ اسی طرح اس نے براؤننگ سے محاوروں کا استعمال سیکھا تو ایٹس سے تمثیل نگاری اور لافورج اور کاربیرے سے اشارات ـــــ یوں پاؤنڈ امریکہ کی ادبی قدروں سے بتدریج دور ہوتا جاتا ہے۔ پاؤنڈ نے جدید رجحانات کا خواہ کتنا ہی ساتھ دیا ہو لیکن اس نے ماضی کو نظر انداز نہیں کیا۔ خصوصاً انیسویں صدی کے شعری کارناموں کے تحفظ میں اس کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ وہ لوگ جو پاؤنڈ کی شاعری کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں اور پاؤنڈ پر یہ الزام عاید کرتے ہیں کہ پاؤنڈ "جدید" ہے۔ اس حقیقت سے انحراف نہیں کر سکتے کہ روایت کے احترام اور اس کی بازیافت کی کسی بھی جدید شاعر سے زیادہ پاؤنڈ نے کوشش کی ہے۔ پاؤنڈ کا مقصد تھا کہ یورپ کے عہد متوسط۔ روم کے کلاسکس اور چین کی قدیم روایات کو اپنے کلام میں سمو دے۔ اس نے چینی شاعری کے بیشتر تراجم کئے جس سے اپنے ایمجوں کے لئے رنگینی و رعنائی کا آرٹ سیکھا۔ پاؤنڈ کے ہاں جاپانی شاعری کے تراجم بھی ملتے ہیں۔ اس نے اپنے تراجم میں اس امر کو بہت زیادہ پیش نظر رکھا کہ متعلقہ زبانوں کی شاعرانہ روح کو انگریزی میں منتقل کیا جائے۔ پاؤنڈ کا شعری مجموعہ CATHAY ہے جو ۱۹۱۵ء میں شائع ہوا تھا ایمجزم کے شعری سرمایہ میں اس کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ پاؤنڈ کی عظمت کا اندازہ ایلیٹ کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے کہ "میں نہیں سمجھتا کہ ہماری یا آئندہ نسل کا کوئی ایسا نظم نگار ہوگا جس کی شاعری (اگر تھوڑی بہت بہتر ہو تو) پاؤنڈ کے مطالعہ کے بغیر مزید بہتر ہو سکتی ہے"۔ پاؤنڈ کے کلام سے نہ صرف اس کے ہمعصر متاثر ہوتے رہے ہیں بلکہ وہ آئندہ نسلوں کو بھی متاثر کرتا رہے گا۔ قطع نظر اس کے اپنی شخصیت اور کردار سے بھی پاؤنڈ نے کئی ایک کو متاثر کیا۔ جیسا کہ ایلیٹ ہی نے تحریر کیا ہے کہ اس کی پہلی کتاب پاؤنڈ ہی کی مساعی سے شائع ہوئی اور THE WASTE LAND کی اشاعت

میں بھی پاؤنڈ کی اعانت حاصل رہی۔ اسی طرح پاؤنڈ نے ایٹس، رچرڈ آلڈنگٹن، جیمس جوائز اور ایلیٹ کی رفتار کی رہنمائی کی۔ مختصر یہ کہ پاؤنڈ کے بغیر امیجسٹ تحریک کا تذکرہ مکمل نہ ہوگا۔ پاؤنڈ کی انفرادیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اس کی تقلید کی کئی ایک نے کوشش کی لیکن کامیاب کوئی نہ ہو سکا۔

امیجسٹ تحریک کا دوسرا اہم امریکی شاعر جان گولڈ فلیچر ہے۔ فلیچر اور پاؤنڈ کے قریبی مراسم رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی اشاریت پسندوں کی طرف پاؤنڈ کی توجہ فلیچر ہی نے منعطف کروائی۔ امیجسٹ تحریک سے وابستہ ہونے سے قبل فلیچر پر فرانس کے اشاریت پسندوں کا زیادہ اثر تھا اس لیے فلیچر کے ہاں امیجری اور اشاریت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ امیجسٹ تحریک سے فلیچر کو پاؤنڈ نے روشناس کرایا۔ یہ ایک زود گو شاعر تھا اس کے کئی مجموعہ کلام ہیں جن میں اہم IRRUDIATIONS (۱۹۱۵ء) GOBLIN AND RAGODES (۱۹۱۶ء) THE TREE OF LIFE (۱۹۱۸ء) اور BREAKERS AND GRANITE (۱۹۲۱ء) ہیں۔ اس کے بعد فلیچر نے امیجسٹ تحریک سے قطع تعلق کر لیا چنانچہ اس کے مجموعہ کلام BRANCHES OF ADAM (۱۹۲۵ء) میں امیجزم کے اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بن بعد فلیچر نے شاعری سے بھی کنارہ کشی کی اور نثر لکھنے لگا۔

ایمی لوول نہ صرف ایک ممتاز شاعر بلکہ امیجسٹ تحریک کی سرگرم کارکن اور پرجوش ترجمان بھی تھی۔ ازرا پاؤنڈ سے اس کے نظریاتی اختلافات اہمیت رکھتے ہیں لوول کے اسلوب میں طرفگی اور انوکھا پن ہے۔ اس کے دو شعری مجموعے اہم ہیں SWORD BLADE AND POPPY SEED جو ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا اور MAN, WOMAN AND GHOST ۱۹۱۶ء میں۔

امیجسٹ تحریک کی ایک اور خاتون امریکی شاعرہ ہلڈا ڈولٹلی ہے۔ ڈولٹلی ایک باکمال شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ جہاں امیجسٹ تحریک کے بیشتر شاعروں نے جلد یا بدیر اس تحریک سے بے تعلقی اختیار کی، ڈولٹلی نے زندگی بھر اس کا ساتھ دیا اور امیجزم کے اصولوں پر کاربند رہی۔ قدیم یونان کی ثقافت سے ڈولٹلی کی گہری وابستگی اہمیت رکھتی ہے۔ اگرچہ کئی امیجسٹ شاعروں نے قدیم یونان کی ثقافت سے دلچسپی لی ہے لیکن ڈولٹلی کے ہاں یہ عنصر زیادہ پایا جاتا ہے۔ ڈولٹلی کے کلام پر ازرا پاؤنڈ کا اثر بھی ہے۔ فنی مرصع سازی پر اس نے غیر معمولی توجہ دی۔ اس کے شعری مجموعوں SEA GAREN (۱۹۱۶ء) اور HYMEN (۱۹۲۱ء) سے ڈولٹلی کی نزاکتِ بیان اور اس کی فنی مرصع سازی کا اندازہ ہوتا ہے ۱۹۲۴ء میں اس نے اپنا ایک اور شعری مجموعہ HELIODORA شائع کیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ کلاسکی یونانی اسلوب و مواد سے متاثر ہو کر اس نے نئی نسل تک اپنے خیالات کی ترسیل کس عمدگی سے کی ہے اور پھر ۱۹۴۴ء میں شائع کردہ THE WALLS DO NOT FALL میں اس کا یہ طرزِ بیان ترقی کی کئی منازل طے کر چکا تھا۔

ڈولٹلی کی ایک ساتھی میرین مور نے بھی امیجسٹ شاعرہ کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ اگرچہ یہ دونوں دوست اور کالج میں ہم جماعت رہے لیکن ان دونوں کے مزاجوں میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ مور ایک دانشور شاعرہ تھی۔ کلاسیکی ادب پر اسکی نگاہ گہری تھی اور ادب کے مختلف موضوعات پر اسکی گرفت مضبوط۔ ازرا پاونڈ سے متاثر رہی۔ ایلیٹ سے اس کے مراسم تھے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ اس کی امیجری اشاریتی فضا کی حامل تھی مور کے ہاں مقامی الفاظ کا استعمال بہت زیادہ ملتا ہے اسی کے ساتھ معنوی گہرائی بھی۔ غالب کے الفاظ میں گنجینۂ معنی کا طلسم اسے کہیے۔ اگلی امیجسٹ شاعروں کی طرح مور نے فنی مرصع سازی سے بھی کام لیا۔ اس نے فنِ عروض میں تجربے بھی کئے۔ اس کا اہم کارنامہ اسکی وضع کردہ اشاریتی بحریں ہیں جو عام بحروں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں۔ اس طرح اس نے اوزان میں لچک اور قافیوں میں وسعت پیدا کی۔

ایک اور شاعر جو ازرا پاونڈ سے بہت زیادہ متاثر رہا ولیم کارلس ولیمس ہے۔ اس کے شعری مجموعوں THE TEMPERS (۱۹۱۳ء) اور ALL ONE QUIERE (۱۹۱۷ء) میں پاونڈ کے اثرات محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ مور کی طرح ولیمس کی بیشتر منظومات کا پس منظر مقامی ہے۔ اگرچہ اسکی فنی ترقی کی رفتار بے حد دھیمی ہے لیکن اسکے امیج قاری کی توجہ پوری طرح اپنی طرف منعطف کر لیتے ہیں۔ خصوصاً اس کی نظم THE BALL میں بنیادی طور پر دو مرکزی خیال ہیں جو ایک دوسرے سے با آسانی ممیز کئے جا سکتے ہیں لیکن ولیمس نے ان کے درمیان اسقدر انسلاک پیدا کر دیا ہے کہ نظم کی روانی، فصاحت اور اس کے ارتباط میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا ولیمس کے ہاں امیجری کی بہترین مثال اُسکی نظم PATEROON ہے۔ یہ بے حد طویل نظم ہے چار جلدوں پر مشتمل ولیمس نے اس نظم میں اپنے وطن پیٹرسن (نیو جرسی) اسکے معاشرتی حالات اور انسانی تعلقات کا بیان کیا ہے۔ اس میں امیجس کا اشاریتی دباؤ ہے جو نظم کو بتدریج آگے بڑھاتا ہے۔ اگرچہ اس نظم کا موضوع شہر پیٹرسن ہے لیکن یہ ہے ایک انسانی تاریخ۔ انسان جو ایک فنکار ہے اور انسان جو اپنے معاشرہ میں رہتا بستا ہے۔ ولیمس نے اس نظم میں اپنے آپ کے اظہار کی کوشش کی ہے۔ اس کو شاعر کی خود نوشت سوانح بھی کہا جا سکتا ہے۔ خوبیوں کے ساتھ اس نظم میں کئی خامیاں بھی ہیں۔ دیہی لب و لہجہ اور عامیانہ انداز جو نظم کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ یہی در اصل ہیئت کا بحران بھی ہے۔

برطانیہ میں امیجزم کے نمائندہ شاعروں میں رچرڈ آلڈنگٹن کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ آلڈنگٹن نہ صرف یہ کہ پاونڈ سے متاثر تھا بلکہ پاونڈ سے اس کے اچھے ادبی مراسم بھی تھے۔ پاونڈ سے اپنی وابستگی اور عقیدت کا ذکر وہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ COLLECTED POEMS کے دیباچہ میں اس طرح کرتا ہے کہ اس کے ابتدائی دور کا

منظومات پاؤنڈ ہی کی سفارش سے شکاگو کے جریدہ POETRY میں شائع ہوئیں۔ روم و یونان کے کلاسیکی ادب کی چھاپ بھی اس کی شاعری پر واضح ہے لیکن اس کے تصورات میں بے حد سطحیت پائی جاتی ہے۔ اس کے موضوعات عام ہیں۔ گہرائی کا فقدان لئے ہوئے۔ اسی کے ساتھ ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ اس کے امیج نگاہوں کے سامنے فوراً مجسم ہو جاتے ہیں۔ آلڈنگٹن کی بہترین نظم THE POPLAR ہے جو اس کے مجموعے IMAGE-OLD ANDREW میں موجود ہے۔

سنہ ۱۹۱۱ء تا سنہ ۱۹۱۴ء آلڈنگٹن نے فوج میں ملازمت کی۔ اس کی فوجی ملازمت نے اسکو زندگی سے آگاہی بخشی اس نے اپنی فوجی زندگی کے تجربات کو اپنے شعری مجموعہ IMAGES OF WAR (سنہ ۱۹۱۸ء) میں پیش کیا ہے۔ ان منظومات میں عروض کی پابندی نہ ہونے کے برابر ہے لیکن اس کے اور کلام کے مقابلہ میں اس مجموعہ کی منظومات میں احساسات شدید ہیں بایں وجہ یہ مجموعہ وزن و وقار کا حامل ہے۔ من بعد اس کا میلان جنس کی سمت ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنی نفرت کا نشانہ انسانیت کے عام دشمنوں زندگی کے مصائب، جدائی اور موت وغیرہ کو بنایا۔ اسکا شعری مجموعہ IMAGES OF DESIRE اپنی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ بتدریج اس کے کلام میں مابعد الطبیعاتی عنصر ختم ہوتا گیا اور اس کا موضوع مرد اور عورت کے جنسی تعلقات ہی رہ گیا۔

یہ تو امیجزم کے چند ایک نمائندہ شاعر تھے جبکہ امیجسٹ تحریک کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ اس کے اثرات دور رس، اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رابرٹ فاسٹ، کارل سانیڈبرگ اور واچل سنڈ سے کے کلام میں امریکہ کی مقامی شاعری کا رنگ تھا تو امیجسٹ تحریک نے شاعری میں بین قومیت کے تصور کو اجاگر کیا۔ روم، یونان، فرانس، چین اور جاپان کی کلاسیکی شاعرانہ روایات کو انگریزی شاعری سے روشناس کرایا اور شاعری میں مابعد الطبیعاتی عناصر کو سمونے کی کوشش کی۔ اس تحریک کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ کئی شاعر جو امیجسٹ تحریک سے وابستہ نہ تھے اس کے اثرات سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ خصوصاً ہربرٹ ایڈ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور ایلیٹ کے ہاں امیجزم کی فضا تھوڑی بہت ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن امیجزم کا سانحہ یہ ہے کہ اس تحریک کے بانیوں اور کارکنوں میں جلد ہی اختلافات پیدا ہوئے انہوں نے جہاں ایک طرف شعر و ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا وہیں عروض وغیرہ کی کئی پابندیاں عاید کیں شاعری کو لمحاتی کیفیات کے اظہار کا نام دیا اور فکری و ذہنی پیچیدگیوں کو پیش کرتے ہوئے خود بھی الجھ گئے۔ اس طرح اس کے پیروؤں کا میدان ایک طرف وسیع ہوا تو دوسری طرف محدود، اختلافات کے باعث تحریک انتشار کا شکار ہوئی اور سنہ ۱۹۳۰ء میں امیجسٹ شاعری کا شائع شدہ مجموعہ ہی آخری مجموعہ ثابت ہوا۔ اس کے بعد بطورِ تحریک کے امیجزم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ امیجزم کے آغاز سے قبل جس طرح شاعری میں امیجری موجود تھی اس تحریک کے اختتام کے بعد بھی شاعری کا دامن امیجری سے خالی نہیں اور نہ یہ ممکن ہے

ضیاءالدین احمد شکیب

غالب اور میسور

مرزا غالب کی تخلیقی شخصیت کی عظمت کا اعتراف آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں ہو رہا ہے۔ لیکن اپنی ۷۲ سالہ زندگی مرزا نے صرف تخلیقی مراقبہ میں نہیں گزاری۔ وہ ایک ذکی الحس اور ہوشمند انسان کی حیثیت سے ماضی حال اور مستقبل کے واقعات و رجحانات انکی سرگذشت اور امکانات سے اچھی طرح باخبر تھے مرزا نے ہندوستان کی مختلف تحریکوں اور واقعات سے اثرات قبول کئے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے اہل علم اور ارباب اقتدار سے غالب کے مراسم کا جائزہ ابھی پوری طرح نہیں لیا گیا ہے۔ غالب میسور سے دور تھے۔ لیکن اہل میسور کے احساسات سے ان کو حقیقی لگاؤ تھا۔

لیکن جس تاریخی عہد میں مرزا پیدا ہوئے وہ ہندوستانی قوم کی فکر اراده اور ضمیر کی شدید آزمائش کا دور تھا۔ اس دور میں ہندوستانی شہری کے جذبۂ وفا اور اظہار وفا میں کوئی حقیقی ربط باقی نہیں رہا تھا۔ سیاسی اور مادی حیثیت سے ملک سامراجی استیلا کا شکار ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی وفاداری کا اظہار ایک سیاسی اقتضاء تھا لیکن ملک کا ضمیر اس سامراجی غلامی سے استخلاص کی تمنا سے مضطرب تھا۔ یہ ایک تاریخی کشمکش تھی اور مرزا غالب اس کشمکش سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

ملک میں اقتدار و آزادی کی بقا، کے آخری مجاہد اور آزادی ہند کی تحریک کے رہنما ٹیپو سلطان نے مرزا غالب کی پیدائش (۱۷۹۷ء) کے ایک ہی سال بعد جام شہادت نوش کیا تھا۔ سلطان شہید کی جدوجہد آزادی اگرچہ جنوبی ہند کی ریاست میسور میں رہی۔ لیکن اس دلدادۂ حریت مجاہد کی شہادت نے آزادی اور اسکی قدر و قیمت کو سمجھنے کیلئے ملک کے طول و عرض میں ایک بے مثال پیام عمل پھیلا دیا۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جہاں سلطان شہید کی داستانیں زبان زد نہ ہوں اور شاید ہی کوئی دل ہو جو ٹیپو سلطان کی محبت سے لبریز نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ مرزا غالب ٹیپو سلطان شہید سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتے۔

مرزا کی عمر کے ابتدائی حصے میں ٹیپو کی آرزو میں مولانا سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی انقلابی تحریک کی صورت میں دہلی سے اٹھیں اس تحریک نے مرزا غالب کو بھی متاثر کیا لیکن مرزا کی زندگی جھمیلوں میں پڑی تھی اور شمالی ہند میں برطانوی تسلط جو شکل اختیار کر گیا تھا اس میں انگریزوں کے تعلق سے مرزا غالب کے

احساسات کچھ ایسے الجھے ہوئے محسوس ہوتے ہیں کہ بعض ناقدین انھیں انگریز پرست سمجھنے لگتے ہیں غالب کے تعلقات اور انکی بابت احساسات بجائے خود ایک عظیم الشان تحقیقی موضوع ہے جو محقق اور ناقد کی فکر و نظر کی آزمائش بھی کرتا ہے اور انصاف کا تقاضہ بھی۔ مرزا غالب نے دو حیثیتوں سے انگریزوں کی تعریف کی ہے اس میں ایک حیثیت حقیقی ہے اور دوسری غیر حقیقی ہے۔ جہاں تک برطانوی تہذیب علم اور ترقی کا تعلق ہے مرزا کی تاریخی بصیرت کہتی تھی کہ وہ اپنانے کے لائق ہے اور نئے ہندوستان کو اسکا استقبال کرنا چاہیئے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسکا اعتراف ہماری آزادی کے عظیم رہنماؤں اور نئے ہندوستان کے اکابر مورخین نے کیا ہے۔ اور اب جسکو سب تسلیم کر چکے ہیں۔ انگریزوں سے مرزا کا دوسرا تعلق جس میں مرزا انکی تعریف کرتے ہیں وہ ہے جو انکے روزگار سے متعلق ہے۔ اس تعلق کا اظہار مرزا کے ان متعدد قصیدوں اور قطعات دستنبو اور بعض دوسری تحریروں سے ہوتا ہے۔ جو انھوں نے انگریزوں کی مدح میں اور مصلحت کے پیش نظر سپرد قلم کئے تھے۔ مرزا کا یہ وہ تعلق ہے جو غیر حقیقی ہے۔ کیونکہ مرزا کے بارے میں اگر مرزا کی نیتوں کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یہ قصاید اپنی تخلیقی شخصیت کے اظہار کے لئے کہے تھے جو ان کے بہترین شعری کارنامے ہیں۔ ممدوح کی حیثیت اس میں محض فرضی ہوتی تھی۔ ایسی کئی شہادتیں موجود ہیں کہ مرزا غالب نے ممدوح کا نام بدل کر اپنے قصاید کو دوسرے ممدوحین کیلئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا اہل فرنگ سے مرزا کا یہ ربط سنجیدہ نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ چند ایک انگریزوں سے انکے شخصی مراسم بہت گہرے تھے یہ انفرادی دوستی کا معاملہ تھا قومی معیارات کے پیمانہ پر اس کی تنقید قرین انصاف نہیں ہے۔

اب ایک بات اور رہ جاتی ہے کہ تعلقات سے قطع نظر انگریزوں کے استیلا کے تعلق سے مرزا کے کیا احساسات تھے۔ یہاں ہمیں مرزا کے سیاسی ضمیر کا جائزہ لینا پڑیگا اور یہ جایزہ انکے نج کی ایسی خلوتوں میں لینا چاہیئے جہاں انھیں تیر کے کمان اور صیاد کے کمیں میں ہونے کا کوئی خوف نہ ہو۔ ایسی آزادانہ خلوتوں میں مرزا غالب کا ضمیر ملک کی حریت کی تمنا سے گرم دکھائی دیتا ہے۔

مئی ۱۷۹۹ء سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد سلطان شہید کے تمام اہل خاندان کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ لیکن اس کے فوری بعد ملک کے دوسرے علاقائی حکمرانوں سے کئے گئے معاہدوں سے استحصال کے طور پر انگریز حکمراں جنوبی ہندوستان میں مختلف ریاستوں کے حصے بخرے کرنے میں مصروف تھے انہیں حالات میں سنہ ۱۸۰۶ء میں میسور میں آزادی کی ایک دوسری لہر اٹھی جو ٹیپو سلطان کے بیٹے شکراللہ سلطان کے زیر سایہ تھی۔ لیکن یہ لہر بھی فرو کر دی گئی۔ اسکے بعد لارڈ ولیم بینٹنگ نے ٹیپو سلطان شہید کے تمام اہل خاندان کو کلکتہ منتقل کر دیا۔ جن میں خواتین کے علاوہ سلطان شہید کے بھائی کریم شاہ بہادر اور بارہ لڑکے شامل تھے۔ ان لڑکوں کے

نام بہ اعتبار عربیہ ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تاریخ وفات بھی نام کے آگے درج کی جاتی ہے۔

اسما	تاریخ وفات
۱۔ فتح حیدر سلطان	یکم شعبان ۱۲۳۳ھ م ۹ر جولائی ۱۸۱۸ء
۲۔ عبدالخالق سلطان	یکم شوال ۱۲۲۲ھ م یکم دسمبر ۱۸۰۷ء
۳۔ محی الدین سلطان	۴ر ربیع الثانیہ ۱۲۲۶ھ م ۲۸ر اپریل ۱۸۱۱ء
۴۔ معزالدین سلطان	۲۲ر جمادی الاول ۱۲۳۳ھ م ۳۰ر مارچ ۱۸۱۸ء
۵۔ محمد یاسین سلطان	
۶۔ محمد سبحان سلطان	۴ر رمضان ۱۲۶۱ھ م ۷ر ستمبر ۱۸۴۵ء
۷۔ شکراللہ سلطان	۲۴ر جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ م ۲۵ر ستمبر ۱۸۳۷ء
۸۔ سرورالدین سلطان	۶ر جمادی الثانی ۱۲۴۹ھ م ۲۰ر اکتوبر ۱۸۳۳ء
۹۔ جامع الدین سلطان	۱۷ر شوال ۱۲۵۸ھ م ۲۱ر نومبر ۱۸۴۲ء
۱۰۔ منیرالدین سلطان	۲ر رمضان ۱۲۵۳ھ م یکم دسمبر ۱۸۳۷ء
۱۱۔ محمد سلطان	۶ر جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ م ۱۱ر اگست ۱۸۷۲ء
۱۲۔ احمد سلطان	۱۰ر شعبان ۱۲۳۹ھ م ۱۱ر اپریل ۱۸۲۴ء

اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان شہید کے صرف دو بیٹے شہزادہ یسین سلطان (پانچویں فرزند) اور شہزادہ محمد سلطان (گیارھویں فرزند) ۱۸۴۵ء تک بقید حیات تھے۔ ان شہزادوں کو گولکنڈہ میں نہایت عزت و احترام اور آرام و آسایش کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ ان میں سے بعضوں نے ادبی اور مذہبی امور میں خاص دلچسپی لی غالباً غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا دیں یہی وہ زمانہ ہے کہ خانوادہ سلطان شہید سے مرزا کے مراسم پیدا ہوتے ہیں۔ اس خاندان کے دو افراد کے نام ہمیں مرزا غالب کے خطوط میں ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اشرف شاہزادگان میسور اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر کا نام ہے۔ دوسرا سلطان زادہ بشیرالدین میسوری کا "القاب" اشرف شاہزادگان اعلیٰحضرت سلطان محمد بہادر" سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ شہزادہ تھا نہ کہ سلطان زادہ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شہزادہ سلطان محمد کے نام اپنے خط کو مرزا نے عرضداشت کہا ہے۔ یہ شہزادہ سلطان محمد غالباً ٹیپو سلطان شہید کے وہی بیٹے ہیں جن کا نام مذکورہ بالا فہرست میں گیارہ نمبر پر محمد سلطان دیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ مغل شہزادے سلطان کا لفظ اپنے نام سے پہلے رکھا کرتے تھے اور شہزادگان میسور اپنے نام کے بعد۔

مرزا غالب کے دوسرے مکتوب الیہ سلطان زادہ بشیر الدین میسوری ہیں سلطان زادہ بشیر الدین میسوری سلطان شہید ٹیپو سلطان کے ساتویں بیٹے شکر اللہ سلطان کے فرزند تھے۔ شہزادہ شکر اللہ سلطان کا انتقال ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۷۶ھ مطابق ۵ ستمبر ۱۸۵۹ء بعارضہ ہیضہ کلکتہ میں ہوا۔

خانوادہ سلطان شہید سے غدر کے بعد کے حالات میں مرزا کا تعلق پیدا کرنا کئی لحاظ سے اہم ہے۔ ایک تو یہ کہ اس زمانہ میں مرزا انگریزوں کی نظر میں مشتبہ تھے اور دستنبو میں مختلف مصلحتوں کے ذریعہ انھوں نے اس کی کوشش کی تھی کہ حکومت برطانیہ کے عتاب سے اس ضعیف العمری میں محفوظ رہیں کیونکہ اس کے بغیر مرزا کی گذر بسر مشکل تھی۔ اس زمانے میں مرزا نے ہر طرح کی سیاسی احتیاط سے کام لیا تھا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب انھیں شہزادگان میسور کی علم دوستی کا علم ہوا تو انھوں نے ساری مصلحتیں بالائے طاق رکھ کے ان شہزادوں سے بے تکلف خط و کتابت شروع کر دی۔

افسوس ہے کہ مرزا اور شہزادگان میسور میں خط و کتابت کب اور کن حالات میں شروع ہوئی اس کا پتہ نہیں چلتا۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہ تعلق ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوا اور مرزا کے آخری دم تک باقی رہا۔ مرزا کی خط و کتابت سب سے پہلے سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ بشیر الدین ابن شہزادہ شکر اللہ سلطان (وفات ۱۸۳۳ء) سے شروع ہوئی۔ یہ تعلق خالص ادبی تھا۔ شہزادہ بشیر الدین توفیق تخلص کرتے تھے اور اردو و فارسی نظم و نثر میں خاصی دستگاہ حاصل تھی۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ توفیق اپنا فارسی کلام مرزا سے رجوع کرتے تھے۔

شہزادہ بشیر الدین توفیق میسوری کے نام مرزا کے خطوط اگرچہ بے تکلف ہیں لیکن ایسی عقیدت اور ایسے احترام میں ڈوبے ہوئے ہیں جیسے یہ خطوط کسی برسر اقتدار خاندان کے شہزادے کو لکھے گئے ہوں۔ ان خطوط میں مرزا شہزادہ بشیر الدین میسوری کو پیر و مرشد اور بندہ پرور سے مخاطب کرتے ہیں۔ شہزادہ بشیر الدین میسوری کے نام اگرچہ ہمیں کل چھ خط مل سکے ہیں جن میں سے پانچ اردو میں ہیں اور ایک فارسی میں لیکن غالباً مرزا نے ان کے علاوہ اور کئی خطوط شہزادہ بشیر الدین کو فارسی میں لکھے تھے جو نہیں مل سکے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۸۶۶ء مولوی نعمان احمد ساکن بھیوہ۔ ضلع سیتاپور کے نام غالب اپنے ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں۔

> " برسوں سے خطوط فارسی لکھنے چھوڑ دیئے۔ اب شہزادہ بشیر الدین نبیرہ ٹیپو سلطان کے سوا کسی کو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے اور وہ مطالع ہیں اور میں مطیع۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ توفیق میسوری کی یہ خواہش تھی کہ مرزا انھیں فارسی ہی میں خط لکھا کریں۔ توفیق میسوری کے نام مرزا کا ایک ہی فارسی خط ملتا ہے جو غالباً مراسم خط و کتابت کے ابتدائی زمانہ کا ہے۔ اس خط میں غالب نے بنیرہ سلطان شہید کو جم مرتبہ سلطان بلند آستان جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے اور اپنے آپ کو مور کف دست سلیمان جیسے انکسار آمیز الفاظ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سلطان زادہ توفیق میسوری کے خط آنے پر مرزا کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے وہ اُسکے وارد ہونے کو "شہپر ہما" کا سایہ پڑنے کے مرادف سمجھتے ہیں۔ اور اوسکی وصولی سے اپنے آپ کو مصر شادمانی" کا فرمانروا جانتے ہیں اور سلطان زادہ کے خط کو طغرائے دارائی" کہتے ہیں۔ یہ خط مرزا نے اسوقت لکھا جب بقول اونکے "عمر سبک سیر کے بہترین حصہ کے کچھ مرحلے گذر گئے" گویا یہ خط انھوں نے ۱۸۵۷ء کے اواخر یا ۱۸۵۸ء کے اوائل میں لکھا۔ اس خط میں مرزا نے اپنی مختصر سوانح بھی درج کی ہے۔ ممکن ہے کہ مرزا کے علمی مرتبہ اور انکی شہرت کے پیش نظر سلطان زادہ توفیق نے مرزا کو خط لکھنے میں خود پہل کی ہو اور اوسکے جواب میں مرزا کا یہ پہلا خط ہو۔ توفیق میسوری نے اپنے خط میں غالباً مرزا کی تصنیفات اور انکی قیمت بھی دریافت کی تھی۔ جس پر مرزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ مرزا کے مزاج کا وصف خاص ہے۔

"اس فقیر کی ہرزہ گوئی کی طلب میں مقدار قیمت کا پوچھنا زبان قلم پر کس لئے آیا نیازمندان بےنوا کے فوا‌ونے کا یہ طریقہ نہیں ہے بے سرمایہ ہوں نہ کہ فرومایہ۔ سخنور ہوں نہ کہ سوداگر مویینہ پوش ہوں نہ کہ کتاب فروش۔ عطا قبول کرنے والا ہوں نہ کہ بہا وصول کرنیوالا۔ مردان آزاد جو کچھ شہزادوں کو بھیجتے ہیں وہ نذر ہوتی ہے اور شہزادے جو کچھ آزادوں کو بخشتے ہیں وہ تبرک ہوتا ہے۔ بیع و شری نہیں ہے۔ چوں وچرا نہیں ہے۔ جو کچھ میں نے بھیجا ہے وہ ارمغان ہے اور جو کچھ بھیجوں گا وہ ارمغان ہوگا۔"

گویا مرزا نے قیمت لینا پسند نہیں کیا اور سلطان زادہ کے مقام کے اعتراف کے طور پر کتابیں تحفتاً بھیجیں۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان زادہ توفیق کے تعلقات مرزا شہاب الدین خاں ثاقب سے بھی تھے۔ توفیق میسوری نے ایک دفعہ بجائے غالب کو خط لکھنے کے ثاقب کو خط لکھا۔ جس میں مرزا کی بابت کچھ پیام تھا۔ مرزا پر اسکا بہت اثر ہوا۔ انھوں نے فوراً ایک معذرت نامہ لکھا۔ جس میں اسکا اظہار کیا ہے کہ توفیق کا خط نہ آنے سے جی گھبرا رہا ہے۔ اور جب تک انھیں اپنے خط کا جواب نہیں ملے گا انھیں آرام نہ آئے گا اور خدا اور رسولؐ کے واسطے سے مرزا نے معافی چاہی۔ توفیق میسوری کا خط وصول ہونے پر مرزا کو جو مسرت ہوئی اور خط نہ ملنے یا ڈاک میں کھو جانے پر جو اذیت ہوئی اوسکا اندازہ توفیق کے نام مرزا کے ایک خط کے ان جملوں سے لگایا جاسکتا ہے۔

"آج منگل ۱۲ر جون ۱۸۶۶ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا سرنامہ دیکھ کر سفیدہ صبح مراد سمجھا
ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر
ننگا نہ ہوتا تو گریبان پھاڑ ڈالتا۔"

کہنے کو یہ صرف چند ہی خطوط ہیں لیکن ان میں عقیدت و محبت لطف و عطا علمی مباحث۔ دلکش لطائف، مرزا کی علمی زندگی، اونکی تصنیف اور ان کے مزاج اور اونکی سوانح کے کتنے ہی گوشے ان چند سطروں میں سموئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان خطوط کا ایک ایک حرف غالبیات کا ایک گنجینہ ہے اور جداجدا طور پر تحقیق و تجزیہ کا مستحق ہے ان میں جو شخصی اور تاریخی گہرائی ہے وہ سلطان زادہ میسوری سے غالب کی گہری عقیدت کی غماز ہے۔

توفیق سلطان شہید ٹیپو سلطان کے پوتے تھے۔ مرزا سے ان کے مراسم پر تقریباً دس برس گزر جانے کے بعد مرزا نے ایک خط بعنوان عرضداشت شہزادہ محمد سلطان کو لکھا۔ اس مراسلہ نگاری میں پہل مرزا ہی نے کی ہے۔ محمد سلطان ٹیپو سلطان شہید کے گیارہویں فرزند تھے جو مارچ ۱۷۹۵ء کو میسور میں پیدا ہوئے۔ یہ شہزادہ محمد سلطان جنکو غالب اعلیٰ حضرت سلطان محمد بہادر کے نام سے علمی دنیا میں لکھتے ہیں۔ عام طور پر شہزادہ غلام محمد کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہیں۔ شہزادہ غلام محمد کا انتقال ۱۱ر اگست ۱۸۷۲ء کو کلکتہ میں ہوا۔ یہی شہزادہ محمد سلطان ہیں جنھوں نے ۱۸۴۸ء میں اپنے دادا حیدر علی اور اپنے والد سلطان ٹیپو کے عہد کے میسور اور خاندانی حالات پر مشتمل ایک ہزار صفحات کے لگ بھگ تاریخ مرتب کرکے مشن پریس کلکتہ سے چھپوا کر شائع کی۔ یہ کتاب کارنامہ حیدری یا سیر ودی، ماثر صفدری" یا" تواریخ گزیدہ" کے مختلف ناموں سے محول کیگئی ہے۔ لیکن ان سب میں یہ کتاب "کارنامہ حیدری" ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ اس کتاب میں شہزادہ محمد سلطان کی ایک بہت واضح اور خوبصورت شبیہ بھی شامل ہے جو اپریل ۱۸۴۸ء کو تیار کروائی گئی تھی۔ یہ کتاب شہزادہ محمد سلطان نے اپنے انگریز دوست سر تھامس میڈوک جو کونسل آف انڈیا کے صدر نشین اور بنگال کے ڈپٹی گورنر تھے۔ کو ہدیۃً پیش کرنے کے لیے لکھی تھی چنانچہ اسکا انتساب سر تھامس میڈوک کے نام ہے۔ ظاہر ہے کہ ۱۸۴۸ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد شہزادہ سلطان محمد بہادر کی شہرت ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوگی۔ مرزا غالب نے بھی اپنی ستر برس کی عمر میں یعنی ۱۸۶۶ء کے اواخر یا ۱۸۶۷ء کے اوائل میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو خط لکھا اور اپنی تصنیفات بطور پیش کش پارسل کے ذریعہ سے بھیجیں اور یہ چاہا کہ اس سلسلہ جنبانی سے خط و کتابت کا آغاز ہو۔ پتہ نہیں ہوا کہ نہیں، تاہم اس معاملہ میں مرزا کا حسنِ طلب ملاحظہ ہو۔

* عرضداشت اور پارسل کی روانگی کا دن ایک ہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خط پہلا پہنچے گا اور پارسل اس کے بعد اگر پارسل پہنچنے کے بعد خط اور پارسل دونوں کے پہنچنے کی مجھکو آگہی نہ ہو تو ان کے پہنچنے اور نہ پہنچنے کے بارے میں دو دل رہوں گا۔ مجھ پر اور میرے روزگار پر افسوس کہ جواب نہیں مانگتا۔ یہ آزادی ہے۔ نہیں نہیں یہ تو عریضہ کے جواب کے لئے حسن طلب کا عنوان ہے۔

مرزا غالب نے اس خط کے عنوان میں شہزادہ سلطان محمد بہادر کو اعلیٰ حضرت کے القاب سے مخاطب کیا ہے اور ابتدا میں جو رباعی لکھی ہے۔ اس میں انکو بادشاہ فلک آستاں کہا ہے اور یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ ان کی بندگی کے زمرہ میں شامل ہو جائیں اور ان کی چوکھٹ پر اپنا روئے نیاز مندی رکھنا چاہتے ہیں۔ خانوادہ سلطان شہید سے مرزا کے یہ تعلقات کسی صلہ یا ستائش کیلئے نہیں تھے بلکہ قطعاً بے غرضانہ تھے۔ یہ تعلقات سلطان شہید سے مرزا کی عقیدت و محبت کے آئینہ دار ہیں اور اہل میسور اس تعلق پر بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔

یہ تو ایک سرسری سا تبصرہ تھا۔ اب آپ شہزادگان میسور کے نام مرزا کے اصل خطوط ملاحظہ فرمائیں جو یہاں تاریخ وار درج کئے جاتے ہیں۔

عرضداشت بہ اسم سامی اشرف شاہزادگان میسور ربہ اعلیٰ حضرت سلطان محمد بہادر

رباعی

سبحان اللہ شان اعلیٰ حضرت — بادشاہ فلک نشان اعلیٰ حضرت

خواہم کہ بر آں عتبہ نہم روی نیاز — در زمرہ بندگان اعلیٰ حضرت

اس سبب سے کہ اس نگارش کا آغاز "تسبیح اسم مقدس باری" ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ عریضہ ذریعہ ہزار گونہ امیدواری ہے ان سب امیدوں کے منجملہ آنکھیں اس ایک پر لگی ہیں کہ اس فلک زدہ سخنور کو معاف فرمائیںگے اور اس پر عتاب نہیں فرمائیںگے کہ جب وہ مراد شناس نہیں تو اس نے اندازہ ادب پیش نظر کیوں نہیں رکھی اور جس جرأت کے تحت یہ خط لکھا، یقیناً چند ورق دردِ دل کی روشنائی سے سیاہ کئے اور ان کے نظارے کیلئے کسی والا نظر کی تلاش کی۔ عقل نے خدایگان ہمہ دان (یعنی شہزادہ سلطان محمد بہادر) کی نظر گاہ کی نشاندہی کی اور کہا کہ "اگر پیش کش لے جانے کی تاب نہیں ہے تو سر رشتہ ڈاک سے بھیج" شوق کی گرم خوئی نے خود نگہی مزید رہنمائی کی اور اس بار مقالہ کے بھیجنے والے نے دور سے زمین بوسی کی اور آستانہ پر اپنی پیشانی گھسی ہے

شادم کہ توی ما بتہ ہنگامہ کنم گرم ورنہ تو کجا یا فتی قیصر و جسم را

واضح رہے کہ دس سال کی عمر میں موزونی طبع کے آثار نے ظہور پکڑا یہاں تک کہ نثر و نظم کا تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا ہو گیا۔ زبان نے انداز گزارش اور قلم نے آئین نگارش پایا۔ اب جبکہ عمر گزران ستر کو پہنچ چکی خاطر ناشاد میں خیال گزرا پچاس سالہ مسودوں کو لکھوایا اور مصارف طبع کی عدم استطاعت کے باوجود ادا کر چھپوایا اور ان ہی مطبوعہ نسخوں میں سے ایک نسخہ بہ سبیل پارسل بھیجا۔

عرضداشت اور پارسل کی روانگی کا دن ایک ہی ہے میں سمجھتا ہوں کہ خط پہلے پہونچے گا اور پارسل پہنچنے کے بعد خط اور پارسل دونوں کے پہنچنے کی مجھ کو اطلاع نہ ہو تو ان کے پہنچنے اور نہ پہنچنے کے بارے میں دو دل رہونگا مجھ پر اور میرے روزگار پر افسوس یہ ہے کہ صاف جواب نہیں مانگتا۔ یہ آزادی ہے۔ نہیں نہیں یہ تو عریضہ کے جواب کیلئے حسن طلب کا عنوان ہے۔ وجود مسعود خدایگانی کی برکت سے تخت عز و جاہ کا پایہ اورنگ سلیمانی سے برتر ہے۔ (ترجمہ)

بنام سلطان زادہ بشیرالدین میسوری

رباعی

عشق است رخش مرغ گل و نسرین را ورتیرگی سہامہ و پروین را

وزمن کہ گدائے کوچۂ میکدہ ام جم مرتبہ شہزادہ بشیرالدین را

مور کفِ دست سلیمان یعنی بندہ کو سلطان بلند آستاں کا نظر کردہ ہے۔ نوید وصول و بشارت قبول کے پہونچنے پر اس فکر میں پڑا ہے کہ زمانے کو کس قدر آفریں کہا جائے اور قسمت پر کس قدر ناز کیا جائے۔ سلطان کی سپاس گزاری یہ ہے کہ نامہ شرف افزا کا راست وارد ہوتا گویا شہپر ہما کا سایہ پڑتا تھا کیونکہ اسنے اس غمزدہ کو معرِ شادمانی کا فرماں روا بنادیا بیشک جیسا کہ ہمائے ہمایوں نشان کا سایہ مرحلہ آب و گل کا اقتدار ہے یہ تحریر بھی قلمرو جان و دل کیلئے طغرا سرداری ہے۔ اشعار کا ورق ایک ابر تھا جو دریا دریا موتی برسا رہا تھا۔ اس قدر موتی برسائے کہ قلم میں گوہر معنی کا گنجینہ سما گیا اور زمانہ ہے کہ اگر حنا شود سخن کی داد دے تو میدانِ سخن کی شہسواری نامہ نگار خود ایک زمانہ سے سر سخن سنجی نہیں رکھتا۔ نہ ترازو میں گہر ہے نہ بازو میں زور۔ عمر سبک سیر کے بہترین حصہ کے چھ مرحلے گزر گئے۔ پچاس سال دہلی کے نیک محضروں کے ساتھ سرور زی اور عشق بازی کا ہنگامہ گرم رکھا اور اس میں کتنے دوستاں یکدل فراہم ہوئے۔ ناگاہ چرخ تیز گردان ان پیوند ہائے روحانی کو اس طرح قطع کیا کہ رگ جان سے خون بھی نکلا اور وہ بے شمار عزیز کہ جن کی گنتی نہیں کر سکتا حوادث کی اس تیز بارش اور اس ناسزا کار زار میں باقی نہیں رہے۔ مگر دیکھو چند خستہ تن اور مینا کو مرنے والوں کے

داغ سے افسردہ تباہ و پژمردہ ہوں۔ بس جیتا ہے اور خستہ جانوں پر خوں روتا ہے۔ زمانہ کا مارا ہوا ہوں، شہر اور اہلِ شہر کا ماتم دار ہوں۔ گزشتہ نقوش میں نثر کے تین مرقعے پنج آہنگ مہر نیمروز اور دستنبو ان میں سے دو جناب والا منظر کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ تیسرا ابھی تعجب نہیں ہے کہ وہاں پہنچ چکا ہو اور اگر نہ پہنچا ہو تو اسکی رسید سے آگاہ کر دائے۔ اردو شاعری ایک سفینہ سے زیادہ نہیں ہے اردو کا کلیات خود اس قابل نہیں ہے کہ میدان فارسی کے شہسواروں کے سامنے اسکا نام لیا جا سکے۔ رہا کلیات فارسی تو خاطر عالی میں یہ نہ گزرے کہ کلیات فارسی میرے پاس ہے۔ اگر ہوتا تو وہی دیوان مطبوعہ ہوتا کہ وہ کلیات کا آدھا ہے۔ سخن کوتاہ اگر کوئی دستنبو ہے تو یہی گلدستہ رنگ و بو یعنی مجموعہ نظم فارسی اور اگر یہی ہے تو دونوں نسخے یکجا فراہم کر کے بھیجے جائیں۔ چشم براہ ہوں کہ کیا فرمان ہوتا ہے۔ اس فقیر کی ہرزہ گوئی کی طلب میں مقدار قیمت کا پوچھنا زبان قلم پر کیسے آیا۔ نیازمندان بے نوا کو نوازنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ بے سرمایہ ہوں نہ کہ فرومایہ۔ سخنور ہوں نہ کہ سوداگر۔ موئینہ پوش ہوں نہ کہ کتاب فروش۔ عطار قبول کرنے والا ہوں نہ کہ بہا وصول کرنے والا۔ مردان آزاد جو کچھ شہزادوں کو بھیجتے ہیں وہ نذر ہوتی ہے اور شہزادے جو کچھ آزادوں کو بخشتے ہیں وہ تبرک ہوتا ہے۔ بیع و شری نہیں ہے چوں و چرا نہیں ہے۔ جو کچھ کہ میں نے بھیجا ہے وہ ارمغان ہے اور جو کچھ بھیجوں گا ارمغان ہوگا۔ شبہا شب عید و روزہا روز نوروز باخیر (ترجمہ)

شہزادہ بشیرالدین

(۱)

پیر و مرشد سلامت!

اعضا فرسودہ اور بودے ہو گئے۔ روح ان میں دوڑتی نہیں پھرتی۔ مگر ابھی مفارقت نہیں کر گئی۔ خدا جانے کس کمین میں ہے۔ قویٰ نکمے ہو گئے۔ اب وہ کام جو ان سے متعلق تھے۔ بند ہو گئے۔ آپ کا حکم ماننا اور آپ کی خدمت بجالانی دل سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ لطیفہ غیبی یعنی روح کے کام ہیں۔ جب تک وہ باقی ہے۔ سرانجام پائے جائینگے۔

"خاکم بدہن" واسطے اقوال کے ہے۔ جب کوئی کلمہ مکروہ طبع کہتے ہیں تو "خاکم بدہن" کہہ دیتے ہیں۔ برخاک بچور سختی مئے ناب مرا۔ "خاکم بدہن" مگر تو مستی ربی اور "خاکم بسر" اور "خاکم بفرق" عام ہے۔

جیسا کہ میں ایک شہزادہ کے مرثیہ میں کہتا ہوں ؎

اے اہلِ شہر دفن ایں دودماں کجاست "خاکم بہ فرق" خواب گہ خسروان کجاست

"خاکم بسر" کہ عاشق کار آزمودہ دم دائم کہ یار قیب بہ خلوت چہا کرد

آپ کے ہاں اور مولوی روم کے ہاں "خاکم بدہن" کا متوقع نہیں۔ جیسا کہ مولوی معنوی نے نہیں لکھا۔

حضرت بھی اپنے ہاں نہ لکھیں۔

فرق است درمیانہ کہ بسیار نازک است

(۲)

پیر و مرشد برحق سلامت

تقصیر معاف۔ میں مدعی اور آپ مدعا علیہ بھی اور حاکم بھی وجہ استغاثہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے اپنے حلقۂ ارادت سے خارج کر دیا۔ عرایض جواب طلب کا جواب نہیں۔ ایک عنایت نامہ سابق میں۔

آب زلال مرود بر پرچنگ

یہ جملہ رکیہ لکھا ہوا تھا۔ میں اس کو پڑھ بھی نہ سکا۔ معنی تو علاوہ رہے میں نے عریضہ لکھا اور جملے کی حقیقت حال کا انکشاف چاہا۔ اب تک جواب نہیں پہنچا۔ جی گھبرا رہا ہے۔ جب تک اس کا جواب نہ پاؤنگا۔ آرام نہ آئیگا برخوردار اقبال نشان مرزا شہاب الدین خان بہادر کی زبانی آپ کے مزاج مبارک کی خیر و عافیت سنی مگر وہ جو تحریر دستخطی سے تسلی ہوتی ہے۔ وہ کہاں۔ حضرت اب تو خالصاً لِلّٰہ والرسول میرا گناہ معاف اور دستخط خاص سے مجھ کو اس جملے کے معانی لکھ بھیجئے۔ زیادہ حد آداب۔

عفو جرم کا طالب۔ غالب

(۳)

بندہ پرور !

مہربانی نامہ آیا۔ سر پہ رکھا اور آنکھوں پر لگایا۔ فارسی کی تکمیل کے واسطے اصل الاصول مناسبت ازلی ہے۔ پھر تتبع کلام اہل زبان۔ لیکن نہ اشعار قتیل و واقف و شعرائے ہندوستان کہ یہ اشعار سوائے اس کے کہ ان کو موزونی طبع کا نتیجہ کہئے اور کسی تعریف کے شایاں نہیں ہیں۔ نہ ترکیب فارسی۔ نہ معانی نازک۔ ہاں الفاظ فرسودہ عامیانہ جو المقال دبستان جانتے ہیں اور جو متعدی نثر میں درج کرتے ہیں۔ وہ الفاظ فارسی یہ لوگ نظم میں صرف کرتے ہیں۔ جب رودکی و عنصری و خاقانی و رشید و طواط اور انکے امثال و نظایر کا کلام بہ استیعاد دیکھا جائے اور ان کی ترکیبوں سے آشنائی بہم پہنچے اور ذہن اعوجاج کی طرف نہ جائے۔ تب آدمی جانتا ہے کہ یہ فارسی ہے۔

منکہ باشم الخ !

اسکی یہ شرح جو چھاپے میں لکھی ہے اسکو ملاحظہ کیجئے اور معانی میں خاطر نشان کیجئے تو سلام کروں پہلے منظر یہاں زرانی چاہیئے کہ "از اوج بیان اندا ختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون؟ اگر عقل کل

"کو" انداختہ" کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کہ امیہ ٹھیراؤ گے تو بے شبہ "انداختہ" کے فاعل دو ٹھیریں گے۔ ایک "ناوک انداز ادب" اور ایک "مرغ اوصاف تو" ایک فعل اور دو فاعل یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے۔

اب فقیر سے اسکے معنی سنئے "من انداختہ" کا مفعول "را" "مقدر" "منکہ" کا "کاف" توضیحی "ناوک انداز ادب" ادب آموز یعنی استاد "مرغ توصیف تو" فاعل۔ مجھکو کہ عقل کل کا استاد ہوں۔ میرے مرغ توصیف نے اوج بیان سے گرا دیا "عقل کل" تک کہ وہ علویوں میں اعلیٰ ہے۔ اسکا ناوک پہنچ سکتا تھا۔ مگر مرغ اوصاف اس مقام پر ہے جہاں اس "ناوک انداز" کو ناوک کے پہنچانے کی گنجائش نہیں۔ اوج بیان سے گرنا۔ عاجز آجانا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ اوج بیان سے گر گیا۔ کیا اچھا مبالغہ ہے مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے اظہار عجز باوجود دعوائے قدرت ۱۲

ایثار تو بردوختہ چشم و دہن آز

اسکے معنی تو وہی ہیں جو چھاپے میں لکھے ہیں۔ مصرع ثانی کی شرح میں گمراہ ہو گیا۔

احسان تو ہر قطرۂ دریا بشگافت "تا ہم لقب حیات نیابد" یہ ہیچمدان اس معنی کے معنی نہیں سمجھا۔ سیدھی بات ہے۔ مگر خیال میں جب آئے گی کہ اساتذہ کے مسلمات معلوم ہوں۔ کمال ایثار و عطا میں مروارید و یاقوت و بحر و معدن کی کمبختی آتی ہے۔ لعل و دُر کا معدوم ہو جانا اور بحر و کان کا خالی رہ جانا۔ نئی نئی طرح سے باندھا ہے۔ چنانچہ میں نے کسی زمانے میں اس زمین میں ایک قصیدہ لکھکر وزیر الدولہ والی ٹونک کو بھیجا تھا۔ اس میں کے دو شعر یہ آپ کو لکھتا ہوں سو

ناموس نگہ داشتی از جود بہ گیتی — جد پردگیان حرم معدن و یم را
وقت است کہ ایں قوم بہ ہر کوچہ و بازار — پرسند ز ہم منشا رسوائی ہم را

"پردگیان حرم معدن و یم" لعل و گوہر جو کثرت ایثار سے کوچہ و بازار میں خاک آلودہ پڑے پھرتے ہیں۔ وہ باہم گر دردمندانہ یہ گفتگو کرتے ہیں کہ اس شخص نے سب کی حرمتیں رکھ لیں اور سب کی آبروئیں بچائیں۔ ہم کو اس قدر بے حرمت و ذلیل کیوں کر رکھا ہے۔ قطرۂ دریا کا حساب کے واسطے پیرا۔ بہت اچھا ہے۔ مقصود عرفی کا یہ ہے کہ جتنے موتی دریا میں ہاتھ آئے وہ بخش دیئے اور بخشش کا ذوق باقی رہا چونکہ قطرہ میں بالقوۃ استعداد موتی ہو جانے کی ہے تو اس احتمال سے ہر قطرۂ دریا کو چیر ڈالا کہ اگر موتی ہاتھ آئیں تو وہ سائلوں کو دیئے جائیں۔ پہلے مصرع میں حرم کا سیر کر دینا موافق مسلمات شعراء کے ممتنع اور اسکا وقوع میں آنا۔ اغراق دوسرے مصرع میں باحتمال استعداد بالقوۃ قطرے کو چیر ڈالنا اور پھر اسطرح کہ ہر قطرے کو یہ اغراق سے گذر کر تبلیغ و غلو ہے ۱۲

(واد کا طالب غالب۔)

(۴)

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

آج منگل ۱۶ جون ۱۸۶۷ء بارہ بجے عنایت نامہ آیا۔ سرنامہ دیکھ کر سفیدہ صبح مراد سمجھا۔ ننگا ایک چھوٹی سی خس کی ٹٹی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ خط پڑھ کر وہ حال طاری ہوا کہ اگر ننگا نہ ہوتا تو گریباں پھاڑ ڈالتا۔ اگر جان عزیز نہ ہوتی تو سر پھوڑتا اور کیوں کر اس غم کی تاب لاتا کہ میں نے اپنے کو چھپا کر یہ صورت تصویر آپ کی خدمت میں بھیجا۔

لفافہ انگریزی اقبال نشان شہاب الدین خاں سے لکھوا کر بیرنگ ارسال کیا۔ اس فرمان میں اس لفافے کی رسید نہ پائی۔ ظاہرا ڈاک پر ڈاکو گرے اور میرے پیکر بے روح کے ٹکڑے اڑا دیئے۔ بے تاب ہو کر یہ عبارت حضرت کو بھیجی ہوئی لفافہ میں لپیٹ کر روانہ کی۔ اب جب آپ اور لفافہ بھیجنگے تو مطالب باقی کا جواب میں اوراق اشعار بھیجونگا۔ زیادہ حد آداب۔

(۵)

در پرستش ستم و در کا مجوئی استوار بادشہ رانبدۂ کم خدمت و پر خوار ہست

حضرت پیر و مرشد برحق۔ روز افزوں کاہش اب اس حد کو پہنچی ہے کہ ؎

تقسیم جزو لا یتجزیٰ محال ہے

آگے باد زمہریر نے ہر خشک کر دیا تھا۔ اب آتش دوزخ نے رہا سہا جلا دیا۔ کل عنایت نامہ آیا۔ آپ جو رقم فرماتے ہیں کہ تونے میرے خط کا جواب نہیں بھیجا مجھ کو باوصف استیلائے نسیان خیال میں آتا ہے کہ میں حضرت کا جواب لکھ چکا ہوں ڈاک تلف ہو گیا تو کچھ بعید نہیں۔ متوقع ہوں کہ اس کا نہ پہنچنا میری نارسائی بخت کی تاثیر سمجھنا چاہیئے۔ میں مجرم نہ ٹھیروں۔ زیادہ حد ادب۔

روز دوشنبہ ۱۱ اپریل ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب۔ غالب

(ماخذ)

۱۔ مالک رام: ذکر غالب مطبوعہ
۲۔ مالک رام: تلامذۂ غالب مطبوعہ
۳۔ غالب: کلیات نثر مطبوعہ ۱۸۷۱ء
۴۔ مولانا مہر: خطوط غالب مطبوعہ ۱۹۶۲ء
۵۔ میر حسین علی کرمانی: نشان حیدری مطبوعہ ۱۸۹۰ء
۶۔ شہزادہ غلام محمد: کارنامۂ حیدری مطبوعہ ۱۸۴۸ء
۷۔ محمود بنگلوری: تاریخ سلطنت خداداد مطبوعہ ۱۹۳۹ء
۸۔ محمود خاں محمود: تاریخ جنوبی ہند مطبوعہ ۱۹۳۹ء
۹۔ نور الحسن: نگارستان سخن۔
۱۰۔ نظامی: قاموس المشاہیر۔

محمد اکبرالدین صدیقی

میٹھے بچن

(۱) غزل حضرت برہان الدین جانم

حضرت جانم کی مثنوی ارشاد نامہ اور نثری رسالہ کلمۃ الحقایق راقم نے مرتب کرکے شائع کر دیئے ہیں اور مقدمہ میں ان کے تفصیلی حالات بھی پیش کر دیئے ہیں۔ بعد کی تحقیق میں چند تاریخی مادے دستیاب ہوئے ہیں۔ حضرت جانم کے والد حضرت میراں جی شمس العشاق کی تاریخ ولادت کا مادہ "میر میراں قبلۂ دیں پناہ" ہے جس سے سنہ [illegible]ھ مستخرج ہوتے ہیں اور وفات کی تاریخ کے دو مادے "شمس منور بود" اور "مرقدِ ولی شاہ بود" ہیں جن سے سنہ ۹۰۲ھ کا استخراج ہوتا ہے۔ حضرت جانم کی والدہ کی تاریخ وفات "خواب گاہ حرم پاک" سے سنہ ۹۰۶ھ برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح حضرت جانم کی ولادت کا مادہ تاریخ "شمع جماعت" سنہ [illegible]ھ ہے اور وفات کا "برہان خلد منے" سنہ ۹۹۲ھ۔ اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔

جناب احمد خاں صاحب درویش کے ذخیرہ میں ایک مختصر سی بیاض دستیاب ہوئی ہے جو قدیم شعرا کے کلام سے مزین ہے۔ اس میں فارسی کلام بھی ہے اور اردو بھی۔ ہندی دوہرے بھی اس میں موجود ہیں۔ اس بیاض کا تعارف ڈاکٹر جمال شریف مرحوم نے مارچ سنہ ۱۹۶۵ء کے سب رس میں کرایا تھا اور اس بیاض سے فیروزی کی ایک غزل پیش کی تھی جس کا مطلع ہے ؎

لکلتی شہ پری سو ہتی سو عاواسر و ساڈولتا　　　　توں ایسی سرک پر ہوتی خرشتہ دیکھ تج بھولتا

اس غزل کے بعد ہی دیگر لکھ کر دوسری غزل بھی دی ہے۔ لیکن چونکہ اس میں مقطع نہیں ہے اس لئے غالباً ڈاکٹر جمال شریف مرحوم نے یہ سمجھا کہ یہ فیروزی کی نہ ہوگی حالانکہ اس بیاض میں بعض اور شعراء کی غزلوں کے ساتھ یہ عمل ہوا ہے۔ اس لئے میں اس غزل کو بھی فیروزی ہی کی قرار دیتا ہوں۔ پہلے حضرت جانم کی غزل پیش ہے۔ اور دوسری غزل فیروزی کی۔ غزل کا عنوان "شاہ برہان" ہے اور تخلص جانم اس لئے یہ قطعی ہے کہ یہ غزل حضرت شاہ برہان الدین جانم کی ہے۔

غزل شاہ برہان

سپنا[۱] دیکھیا[۲] نس[۳] آج کی[۴] بیٹھیا ہوں شہ کے پاس میں　　　　اے کاش دن نا اوگتا[۵] اچھتا[۶] سولک[۷] ماس[۸] میں

---

[۱] خواب [۲] نظر آیا [۳] رات [۴] کہ [۵] طلوع ہونا، نکلنا [۶] رہتا [۷] سو لاکھ [۸] مہینے۔

دکھیو یو دو تن[8] پاپنی[9] ناحق جگائی آن مجے　　　دشکوں اٹھائی بیس کر دیک ناسکا یک تاس[10] میں

ہشیار ہوں تب تل سؤوں[11] تو دکھیوں خواب[12] بیچ　　　خوش ہوں میں اپنے حال پر صاحب مرا تو واس[13] میں

شب روز تماری یاد میں تل تل بل بل دم بہ دم　　　سچ بولتا گر جھوٹ اپجے کھاؤں ابد کی ماس[14] میں

حاتم کہے اے شہ پری یک زہرا دھرا مشتری
توں سیام[17] ہوں تیری جڑی[16] کہتا ہوں واسک[18] داس[19] ہیں

حضرت حاتم کی فارسی غزلیں اور دوہرے تو دستیاب ہوئے ہیں لیکن دکنی میں یہ پہلی غزل ہے جو ہدیۂ ناظرین ہے۔ ان کا ایک مرثیہ اس سے پہلے منظر عام پر آچکا ہے۔

(۲) غزل فیروز

قطب الدین قادری فیروز و فیروزی مرید شیخ محمد ابراہیم معروف بہ مخدوم جی ابن شیخ محمد ملتانی متوفی ۹۰۳ھ دبستان بیدر اور بعد کو دبستان گولکنڈہ کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی استادی کو وجہی اور ابن نشاطی نے بھی تسلیم کیا ہے۔ فیروز کی مثنوی "پرت نامہ" کو جناب ڈاکٹر مسعود حسین نے قدیم اردو کی پہلی جلد میں شایع کر دیا ہے۔ اسکی ایک غزل ڈاکٹر جمال شریف مرحوم نے مارچ ۱۹۶۵ء کے سب رس میں شائع کی تھی۔ یہ اس کی دوسری غزل ہے جو دیگر کے عنوان سے اس کے بعد تحریر ہوئی ہے۔

غزل فیروز

سورجن[1] یوں جو تھا دل میں پیرت[2] پیاری نہ کرناتھا　　　کہ توں یار ہو جگ ساتھ اغیاری نہ کرناتھا

اول کس چھند[3] سوں آکر نہ تھا سونیہ[4] جگ لاکر　　　بِرَہ[6] کے بس[5] مِنے بھاکر تو بیزاری نہ کرناتھا

لگا سوکٹ[7] ساڑ کے بن[8] میں لگائی آگ جگ تن میں　　　کپٹ[9] یوں تھا ترے دل میں تو دلداری نہ کرناتھا

پیرت[11] یوں توڑ کر ہرنی پیا[12] دو تن[13] اوپر دیتی[14]　　　ہماری پیجری[15] سوتی[16] دیتی[17] ساری نہ کرناتھا

گرکن[18] پاپنی[19] رمکر[20] لگائی جھوٹ سب سچ کر　　　تو اپی تکرار بیرا ابھگر[21] روا داری نہ کرناتھا

لہوجا لال[22] کوں کرئی تیتا[23] کیا زیر پر زوری　　　کوی میں کات کر دوری نیہ آدھاری[24] نہ کرناتھا

---

[8] دو ۔ [9] کشنی ۔ محبوبہ [10] گنہگار عورت [11] گھنٹہ [12] سو جاؤں [13] تب [14] خادم [15] قسم [16] سری کرشن جی کا نام [17] کنیز خادمہ [18] سچ بات، حقیقت ۔

[1] محبوب [2] محبت، عشق [3] دھوکا، مکر و فریب [4] عشق [5] لگاکر [6] فراق [7] حوالے کر کے ۔ قبضہ میں دے کر [8] عیش و عشرت [9] جنگل [10] دشمنی [11] محبت منقطع کر کے [12] محبت [13] رقیب، کٹنی [14] دکھی [15] سیج کا اسم تصغیر [16] سنسان بے رونق [17] کرنا [18] گنہگار عورت [19] بناوٹ کی بات کر کے [20] جھوٹ کہنا [21] آمادہ کرنا [22] محبوب [23] آتنا [24] مجبور [25] کمزور، بے سہارا عشق میں مبتلا...

دلؔ عرفانی

جنسِ الفت کو یہ ناداں کتنا ارزاں کر گئے
بر سرِ بازار سودائے دل و جاں کر گئے

دے گئے اذنِ سکوں بیدار ارماں کر گئے
چند ساعت کیلئے آئے پریشاں کر گئے

درد کی سوغات میرے وقفِ داماں کر گئے
بندۂ ناچیز کو ممنونِ احساں کر گئے

الاماں اے جوشِ گریہ الحذر اے جذبِ دل
وہ پشیماں آئے اور مجھ کو پشیماں کر گئے

اتفاقاً کل تمھارا نام لے بیٹھے تھے ہم
آج پھر ذکرِ رخ و گیسوئے پیچاں کر گئے

کچھ نہ کچھ دیوانے سے انکا تعلق ہے ضرور
ورنہ کیوں گلشن میں وہ ذکرِ بیاباں کر گئے

ہم کو زعمِ خود پرستی تو نہیں، پھر کیا کہیں
"زندگی میں کونسا کارِ نمایاں کر گئے"

اِن کا غم، انکی تمنا، انکا ذکر، اور انکی یاد
کس قدر ہم دل کے بہلانے کا ساماں کر گئے

آپ کے وعدے کا ہو دل کو بھلا کیونکر یقیں
یوں بھی اکثر بے ارادہ آپ ہاں ہاں کر گئے

واحدؔ پریمی

وہ راہِ شعر و ادب میں بنے ہیں سنگِ میل
چلے ہیں لیکے جو عصری شعور کی قندیل

رہِ نشاط پہ سرشار دوڑنے والو
بہت قریب غم و یاس کی ہے گہری جھیل

مسافرانِ طلب اور تیز گام ذرا
کہ وقت کم ہے مگر راستہ بہت ہے طویل

کہیں تو کیسے کہیں شامِ غم کو صبحِ طرب
کریں تو کیسے کریں اُن کے حکم کی تعمیل

اب آؤ ڈھا دیں اسے تیشۂ محبت سے
ہمارے بیچ جو حائل ہے نفرتوں کی فصیل

غمِ حیات ترے فیضِ خاص سے ہم لوگ
وہ شاہکار ہیں جنکی نہیں کوئی تمثیل

تم آسروں پہ جیوگے تو کب تلک آخر
کرو تو خود ہی کرو زندگی کی کوئی سبیل

زبان نرم تو لہجہ ہو پُر اثر واحدؔ
تم اسطرح کرو فکر و خیال کی ترسیل

محی الدین غنی

وہ جوشِ عشق اور وہ سوزِ دروں گیا
اُبھرا خرد کا ذوق مذاقِ جنوں گیا

حیراں ہے پھول پھول پریشاں کلی کلی
یہ فصلِ اضطراب ہے دورِ سکوں گیا

اے موسمِ بہار، چمن بے بہار کیوں؟
کیا رائیگاں شہیدِ محبت کا خوں گیا؟

کیا پھر کبھی بہار نہیں آئے گی یہاں؟
دیوانہ کیا چمن سے کوئی سرنگوں گیا

طوفانِ حادثات کسے ڈھونڈھتا ہے اب
اس خیمۂ بہار کا ایک اک ستوں گیا

شہرِ ستم میں اُٹھا ہے طوفان بے کراں
کیا سوئے عرش نالۂ صید زبوں گیا

سرگرمیاں جہادِ محبت کی اب کہاں
وہ لمحۂ حیاتِ غنیؔ کیا کہوں گیا

عبدالمتین نیازؔ

ہر سمت دیکھتا ہوں میں ایک انقلاب سا
ہر منظرِ حیات لگے ہے سراب سا
خود غرضیاں، یہ لوٹ، یہ نفرت یہ انتشار
اپنے لیے یہ عہد ہے روزِ حساب سا
زردی خزاں کی خون میں تحلیل ہو گئی
اس شہر میں نہ ڈھونڈیے چہرہ گلاب سا
اک دیو جیسے شیر کی مٹھی میں قید ہوں
محسوس ہو رہا ہے ہر اک پل عذاب سا
غم کو نگلنے لگا یہ سمندر ہے تہ بہ تہ
جو لمحۂ خوشی ہے سو وہ ہے حباب سا
دُنیا میں انقلاب و تغیر کا ہے ثبوت
ہر لمحہ میرے دل میں ہے جو اضطراب سا
میں غیب داں نہیں ہوں مگر علم کے طفیل
عالم کھلا ہے سامنے میرے کتاب سا
بیچے گا کیوں نیازؔ کوئی مفلسوں کے ہاتھ
جسموں میں دوڑتا ہے جو نشہ شراب سا

نتائج امتحانات ادارۂ ادبیات اردو منعقدہ جون ۱۹۷۳ء

مرکز بلدہ امتحان اردو دانی۔ کامیاب :— رول نمبر ۱۔ راحت النساء بیگم ۳۔ عزت النساء بیگم۔ ۵۔ رئیس النساء بیگم ۶۔ میر عباس علی ۷۔ مسعود فاطمہ ۸۔ محمد عبد الخالق ۹۔ نفیس بیگم ۱۰۔ محمد سلیم ۱۱۔ واجد النساء ۱۲۔ اقبال النساء ۲۰۔ صالحہ بلقیس۔ امتحان زبان دانی۔ درجہ دوم :— ۲۔ عذرا جلیلی۔ درجہ سوم :— ۱۔ ذاکرہ بیگم

امتحان اردو عالم۔ درجہ دوم :— ۴۔ مرزا رضا علی ۸۔ رشید احمد ۱۰۔ سید محمد منیر الدین جیلانی ۱۴۔ مرزا احسین بیگ۔ ۱۵۔ محمد نظام الدین ۲۲۔ امتیاز حسین احمد انصاری ۳۵۔ راشدہ بیگم ۴۲۔ انور جہاں ۴۷۔ شہناز غزالہ۔ درجہ سوم :— ۲۔ محمد حسن شریف ۷۔ عادل خاں ۹۔ محمد عبد الرزاق ۱۲۔ گردھر راج بھٹناگر ۱۳۔ محمد قاسم خاں انور ۱۶۔ محمد حمید علی خاں ۲۱۔ سید غوث ۲۳۔ محمد قطب الدین ۲۵۔ سیدہ زہرہ ۲۶۔ سیدہ طیبہ ۳۱۔ حمید النساء بیگم ۳۶۔ نسیم النساء ۳۷۔ عقیلہ عزت ۴۵۔ بشیر النساء بیگم ۵۱۔ سیدہ حشمت النساء بیگم۔ امتحان اردو فاضل۔ درجہ دوم :— ۶۔ میر غیاث الدین علی خاں بلحاظ نشانات اول۔ ۹۔ حافظ محمد خواجہ ۱۱۔ محمد نعمت اللہ ۱۲۔ سید محمد عبد اللہ قادری ۱۳۔ حافظ بشیر الزماں ۱۴۔ محمد عبد الباسط خاں ۱۳۴۔ میر محمد ساجد علی۔ درجہ سوم :— ۱۔ سید محمد علی زیدی ۳۔ محمد احمد علی خالدی ۱۵۔ محمد عبد القادر۔

مرکز سنٹرل جیل امتحان اردو دانی۔ کامیاب :— ۱۱۔ بابو میاں ۱۲۔ شیخ یوسف ۱۴۔ بابو راؤ ۱۴۔ محمد اسرائیل ۱۵۔ محمد غیاث الدین احمد ۱۶۔ ببر سنگھ ۱۷۔ شیخ یوسف ۱۸۔ عبد اللہ ۱۹۔ عبد الجبار۔ ۲۱۔ فقیر محمد ۲۲۔ میر حسن علی ۲۷۔ داؤد میاں ۲۸۔ سید بشیر۔ امتحان اردو زبان دانی۔ درجہ اول :— ۱۰۔ وینکٹ راؤ ۱۴۔ محمد عبد الحفیظ خاں۔ درجہ دوم :— ۶۔ امر سنگھ ۱۱۔ جگنند اہنتو ۱۵۔ چکرال نارائن درجہ سوم :— ۷۔ عبد الجلیل ۹۔ محمد عثمان۔ امتحان اردو عالم : درجہ دوم :— ۵۵۔ عبد الستار ۶۲۔ میر مقصود علی درجہ سوم :— ۵۶۔ محمد رزاق احمد ۵۷۔ محمد یوسف ۵۸۔ حسن الدین خاں ۵۹۔ محمد عبد الرزاق ۶۰۔ محمد عبد الرشید ۶۱۔ ایس بابو راؤ۔

مرکز بنگلور امتحان اردو زبان دانی۔ درجہ دوم :— ۴۱۔ سلیمہ محمد۔ درجہ سوم :— ۴۲۔ نفرت فاطمہ ۴۳۔ عشرت فاطمہ ۴۶۔ شمیم آرا بیگم۔ امتحان اردو عالم۔ درجہ دوم :— ۱۶۸۔ محمد عبد القادر ۱۷۲۔ علی امام۔ درجہ سوم :— ۱۶۹۔ محمد سلیمان ۱۷۰۔ سید بشیر احمد ۱۷۱۔ سید خورند میر ۱۷۳۔ محمد مستقیم ۱۷۴۔ زرینہ بیگم ۱۷۵۔ محبوب النساء۔

مرکز اورنگ آباد امتحان اردو فاضل۔ درجہ دوم :— ۱۸۔ قاضی محمد الطاف محی الدین۔ ۲۳۔ محمد ممتاز حسین صدیقی ۲۸۔ سید علی ۲۹۔ شیخ علی ۳۱۔ محمد سراج الدین صدیقی۔

۳۶- فرحت سلطانہ - درجہ سوم :- ۱۹- نزہت داس پاشا ۲۰- محمد عبدالمجید انصاری ۲۲ محمد عبدالوارث ۲۶- سید سمیع الدین ۲۷- محمد منصور علی ۳۰- عبدالتسلیم ۳۲- میر حشمت علی ۳۳- اکبر خاں ۳۴- سید کلیم الدین بیابانی ۳۵- سلمیٰ سلطانہ ۳۹- گیسو دراز بیگم ۴۳۲- سید سعید اللہ قادری -

مرکز لودھن امتحان اردو دانی کامیاب :- ۶۱- محمد طاہر ۶۲- محمد نصیر - ۶۳- محمد امین - ۶۶- محمد جاوید ۶۸- اطہر سلطانہ ۶۹- وحیدہ بانو ۷۰- اقری بیگم ۷۲- منور سلطانہ ۷۳- مختار بیگم - ۷۵- انوار النساء ۷۷- نورجہاں - ۱۱۱- شیخ حبیب - ۱۱۲- عبدالرفیق ۱۱۳- محمد یعقوب ۱۱۵- معراج النساء بیگم -

امتحان اردو عالم - درجہ دوم :- ۱۹۳- ممتاز نکہت بیگم ۱۹۴- انوری بیگم - درجہ سوم :- ۱۸۶- عبدالوحید - ۱۸۸- عبدالرزاق - ۱۸۹- اصغر حسین ۱۹۰- شیخ احمد ۱۹۱- عبدالرشید - امتحان اردو فاضل - درجہ سوم :- ۱۲۵- مرزا عسکری حسین ۱۳۰- کبیر احمد ۱۳۱- سید شریف ۱۳۲- نعیم مرزا -

مرکز بھینسہ امتحان اردو دانی - کامیاب :- ۵۸- محمد عمر ۵۹- شیخ منیر ۶۰- سیدہ نجمہ زمانی بیگم - امتحان اردو زبان دانی - درجہ دوم :- ۳۶- عبدالروف ۴۰- سیدہ خدیجہ بتول - درجہ سوم :- ۳۳- خواجہ شفیع احمد - ۳۵- عبدالقدیر ۳۷- نسیم اللہ خاں ۳۸- حمیدہ بیگم ۳۹- ساجدہ بیگم -

امتحان اردو عالم - درجہ دوم :- ۱۶۰- احمد علی خاں ۱۶۲- آصفین خاں ۱۶۶- سیدہ بدر زمانی بیگم - ۲۰۱- محمودہ انجم امتحان اردو فاضل - درجہ دوم :- ۱۰۵- اسرار پاشا ۱۰۸- محمد عظیم الدین ۱۰۹- لطیف احمد خاں ۱۱۰- گنگادھر راؤ ۱۱۲- سید طلحہ ۱۳۳- سید ناظر علی ۱۳۷- صدیق احمد ۱۴۳- صبغۃ اللہ خاں - درجہ سوم :- ۱۰۶- اسید احمد حسین ۱۰۷- محمد ہاشم ۱۱۳- قمر النساء بیگم ۱۱۴- نجمہ صدیقی ۱۱۷- شوکت صدیقہ ۱۱۸- واجد صدیقہ ۱۳۹- محمد ولی الدین ۱۴۵ محمد عبدالمجیب

مرکز شمس آباد امتحان اردو دانی - کامیاب :- ۲۹- مہرالنساء بیگم ۳۰- آمنہ بیگم ۳۱- خیرالنساء بیگم - امتحان اردو زبان دانی - درجہ اول :- ۱۸- محمد محمود شریف - امتحان اردو عالم - درجہ دوم :- ۶۵- شیخ عبدالستار - ۶۷- محمد عبدالنعیم - درجہ سوم :- ۶۴- محمد یوسف علی خاں - ۶۶- محمد حسین ۶۹- شمیم النساء بیگم - امتحان اردو فاضل - درجہ دوم :- ۴۰- شبیر احمد ۴۱- سید عظیم الدین ۴۲- محمد رحیم الدین ۴۴- شیخ صادق علی - درجہ سوم ۴۳- محمد رزاق خاں ۴۵- محمد عبدالرزاق ۴۶- محمد جہانگیر ۴۷- محمد عبدالکبیر ۴۹ سید محمد طہ ہاشمی

مرکز عادل آباد امتحان اردو دانی - کامیاب :- ۳۳- محمد اطہر قریشی ۳۴- محمد یوسف - امتحان اردو زبان دانی - درجہ سوم :- ۱۹- محمد اسحق ۲۰- محمد یعقوب -

امتحان اردو عالم - درجہ سوم :- ۷۲- محمد ابراہیم قریشی ۷۳- محمد عبدالغفور ۷۴- زاہد اعظم القادری - ۷۵- عظیم الدین ۸۰- نجمہ فاطمہ ۷۹- اطہر شاہجہہ ۸۲- فہیم سلطانہ ۲۴۴- سید جہانگیر حسین علوی -

مرکز محبوب نگر امتحان اُردو عالم۔ درجہ دوم :۔ ۸۲۔ بی عبدالحمید ۸۴۔ شیخ مسعود محمود۔ ۸۵۔ محمد ہدایت اللہ۔ ۸۶۔ محمد تاج الدین ۹۲۔ محمد غوث ۹۳۔ میر امواد علی ۹۵ خواجہ نعیم الدین ۱۰۲۔ محمد عبدالرزاق ۱۰۳۔ محمد خلیل الدین ۱۸۰۔ محمد عثمان علی ۱۸۱۔ محمد حسین خاں ۱۸۲۔ خواجہ احمد نواز۔ درجہ سوم :۔ ۸۷۔ سید شمس الدین علی ۸۸۔ قمر سیدہ امۃ الرحیم برکت النساء بیگم ۹۰۔ شاہین سلطانہ بیگم ۹۱۔ محمد عبدالرشید۔ ۹۴۔ حافظ محمد قاسم ۱۰۱۔ جعفری بیگم ۱۸۲۔ قاضی محمود علی ۲۱۳۔ شیخ چاند ۲۱۶۔ سید محی الدین ۲۱۷۔ محمودہ بیگم۔ ۲۱۸۔ وینکٹ ریڈی۔ امتحان اردو فاضل۔ درجہ دوم :۔ ۵۸۔ محمد حسن خاں ۵۹۔ محمد احمد محی الدین ۶۲۔ طاہرہ بیگم ۱۵۵۔ محمد عبدالمنان درجہ سوم :۔ ۴۹۔ محمد عبدالرزاق ۵۰۔ سید بشیر الدین ہاشمی ۔ ۵۱۔ محمد سردار الدین ۵۲۔ محمد محبت علی ۵۳۔ علیم الدین ۵۴۔ اختر حسین ۵۵۔ محمد عبدالرشید ۵۶۔ ایم آصف علی۔ ۵۷۔ ایم سبیتا ۶۰۔ محمد خواجہ ۶۱۔ محمد عبدالرفیع ۶۳۔ سید حسن جعفری ۶۸۔ محمد عبدالمجیب ۷۷۔ مرزا غلام بیگ۔ ۷۸۔ مقصود علی اشفاق ۱۵۴۔ محمد سردار علی ۱۵۶۔ سید افضل ۱۵۸۔ محمد عبدالحی۔

مرکز مغل گدھا امتحان اُردو عالم۔ درجہ سوم :۔ ۱۱۷۔ سید ارشاد محی الدین قادری ۱۲۰۔ عتیق شمیم۔ ۲۰۷۔ محمد عبدالعلیم ۲۰۸۔ زاہدہ بیگم۔ امتحان اردو فاضل :۔ تمام اُمیدوار ناکام۔

مرکز ناگر کرنول امتحان اردو دانی۔ کامیاب :۔ ۵۲۔ نسیم النساء بیگم ۵۳۔ حسنہ بیگم۔ ۵۴۔ مجیب النساء بیگم۔ امتحان اردو عالم۔ درجہ دوم :۔ ۱۳۶۔ محمد عبدالحمید خاں ۱۳۷۔ محمد سلطان ۱۳۸۔ محمد طاہر علی ۱۴۱۔ وسیم النساء بیگم۔

مرکز کوہیر امتحان اردو دانی۔ کامیاب بہ امتیاز :۔ ۳۵۔ مرزا ابرار بیگ ۔ ۳۶۔ محمد عبدالکریم۔ ۳۷۔ سید لائق علی ۳۸۔ احمد پاشاہ ۳۹۔ محمد خواجہ ۴۰۔ رفیع الدین ۴۱۔ نسیم النساء بیگم ۔ ۴۲۔ خیر النساء ۴۳۔ واجد النساء بیگم۔ امتحان اردو زبان دانی۔ درجہ دوم :۔ ۲۲۔ محمد عبدالحفیظ۔ ۲۳۔ محمد عبدالسلیم ۲۵۔ محمد رشید احمد ۲۶۔ محمد غیاث الدین۔ درجہ سوم :۔ ۲۴۔ محمد علی۔ امتحان اُردو عالم۔ درجہ دوم :۔ ۱۲۲۔ محمد غلام رسول ۱۲۴۔ محمد یوسف ۱۲۵۔ آمنہ بیگم ۱۲۶۔ سکندر بیگم ۱۲۷۔ نسیم بیگم۔ درجہ سوم :۔ ۱۲۳۔ محمد بندہ علی۔

مرکز آرمور امتحان اُردو دانی۔ کامیاب :۔ ۴۴۔ خورشید سلطانہ ۴۵۔ ہاجرہ سلطانہ ۴۶۔ زبیدہ سلطانہ امتحان اُردو زبان دانی :۔ درجہ دوم :۔ ۲۷۔ محمد عبدالعزیز ۲۹۔ سید خورشید حسین۔ ۳۰۔ جمیل سلطانہ ۳۱۔ رئیس سلطانہ درجہ سوم :۔ ۲۸۔ محمد عبدالرشید۔ امتحان اردو عالم۔ درجہ دوم ۱۲۸۔ محمد عبدالسلیم ۱۳۰۔ ذبیحہ بیگم۔ درجہ سوم :۔ ۱۲۹۔ سعیدہ باقر ۱۳۱۔ ادیب سلطانہ امتحان اردو فاضل۔

درجہ دوم :- ۹۳ - اکبرالنساء بیگم -

مرکز میڈچل امتحان اردو دانی - کامیاب :- ۵۵ - ناہید صدیقی ۵۶ - شہناز صدیقی -
امتحان اردو عالم - درجہ دوم :- ۱۴۴ - محمد عبدالمجید صدیقی ۱۵۰ - سید محمود حسینی
۱۵۷ - سیدہ فاطمۃ النساء ۲۱۰ - ناظم الدین صدیقی - درجہ سوم - ۱۴۵ - محمد عبدالرحیم ۱۴۶ - خواجہ نذیر احمد -
۱۴۸ - خواجہ احمد معین الدین ۱۵۳ - صادق شجاعت ۱۵۵ - سید تقی حسین -

مرکز مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نتیجہ امتحان منعقدہ مارچ ۱۹۷۳ء

امتحان اردو دانی - کامیاب با امتیاز :- ۱۰ - افسرالنساء بیگم ۱۲ - محمد رشید ۱۳ - ایم سرسوتی
۱۵ - محمد رحمٰن ظہیر کامیاب ۳ - نفیس سلطانہ ۵ - ڈی - این جگدیشور ۷ - محمد عبدالقیوم خاں ۱۴ - محمد صادق -
امتحان اردو زبان دانی - درجہ اول :- ۱ - محمد عبدالجمیل خاں ۴ - کشور درجہ دوم - ۳ - پی جیت سنگھ
۷ - اصغری بیگم ۸ - انیس سلطانہ ۹ - محمد شریف الدین ۱۱ - قمرالنساء بیگم ۱۹ - شرف جہاں صوفی ۲۲ - سید خواجہ حسینی
۲۴ - محمد عبدالحمید شاہین ۲۵ - عارف النساء ۱۸ - محمد رشید درجہ سوم :- ۲ - محمد الحفیظ خاں ۵ - محمد یوسف -
۶ - احمدی بیگم ۱۳ - صبیحہ عباس ۱۶ - محمد افتخار الدین خطیب ۲۶ - خواجہ وہاج الدین ۲۷ - سید عظیم الدین ہاشمی -

مرکز مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ امتحان اردو دانی - کامیاب با امتیاز :- ۹۴ - میمونہ داؤد ۹۵ - محمد فاضل
۹۸ - غلام علی ۱۰۰ - محمد اشفاق احمد ۱۰۱ - ایم ڈی کھونڈکر - کامیاب :- ۸۵ - انیس فاطمہ ۸۶ - الطاف
معین الدین صدیقی ۸۷ - شیخ محمد عبدالقیوم ۹۲ - محمد نصیر احمد ۱۰۴ - محمد جعفر ۱۰۵ - محمد عبدالعزیز زبیری -
۱۰۶ - سید فصیح الدین ۱۰۷ - ایم سرشید خان ۱۰۸ - اے شالمہ ۱۰۹ - ایم وی سوامی ۱۱۰ - جی آر سوریہ راج -
امتحان اردو زبان دانی : درجہ سوم :- ۹۴ - معین الدین حقانی -

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد (۳۶) شمارہ (۹)

ستمبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

نگران

سید علی اکبر ایم اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مستظم

وقار خلیل

مہتمم

محمد جمال الدین

زر سالانہ: آٹھ روپے — بیرونی ممالک سے پندرہ روپے

زر ششماہی: چار روپے — فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کیلئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو کانفرنس دہلی میں ہو رہی ہے اور ملک کے مشہور ادیب جناب مالک اس کے کنوینر منتخب ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے ایک کانفرنس بے پور میں ہوئی تھی جس کو نو سال ہو رہے ہیں۔ تعصل نے عصبیت کی خلیجوں کو کچھ پاٹ دیا ہے۔ لیکن بالکل مٹایا نہیں۔ ضرورت ہے کہ یہ عصبیت بالکل مٹ جائے اردو کے ہندو ادیبوں کی کانفرنس سے بھی اس تصور کو تحریک ملی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ یہ کانفرنس لسانی تعصب دور کرنے کیلئے ذرائع اختیار کرے گی۔

ڈاکٹر زور مرحوم کی سرکردگی میں انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا پروگرام بنا۔ کمیٹی کے ارکان تو بلحاظ سہولت مقامی تھے۔ لیکن مضمون نگار حضرات میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے بھی شریک تھے ان میں نہ صرف ہندوستان کے ادیب ہی تھے بلکہ ہندوستان سے باہر کے رہنے والے ادیبوں سے بھی تعاون کی درخواست کی گئی تھی۔ نمونہ کے طور پر جو اوراق حرف (آ) پر مشتمل شائع کئے گئے ان کو اہل علم اور ماہرین نے پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ انسائیکلو پیڈیا کا کام اسی انداز پر ہو تو ایک معیاری انسائیکلو پیڈیا تیار ہو سکے گا حکومت کا منشا پورا ہوگا اور اس نے جو رقم عطا کی ہے اس کا مصرف صحیح ہو سکے گا۔

ادارہ کے امتحانات' اردو دانی' اردو زبان دانی' اردو عالم اور اردو فاضل آئندہ ۲۸ر تا ۳۱ر دسمبر منعقد ہوں گے۔ ۱۵ر نومبر تک درخواستیں فیس کے ساتھ بھیجی جا سکتی ہیں۔ اردو دانی کی فیس ایک روپیہ اردو زبان دانی کی تین روپے۔ اردو عالم کی اٹھارہ اور اردو فاضل کی بیس روپے ہوگی۔ اردو دانی اور اردو زبان دانی کے لیے درخواستوں کے فارموں کی قیمت دس پیسے ہوگی اور اردو عالم اور فاضل کیلئے چالیس پیسے۔ اردو عالم اور فاضل کے فارموں پر امیدواروں کو اپنے پاسپورٹ سائز کے دو مصدقہ فوٹو چسپاں کرنے ہوں گے۔

محمد اکبر الدین صدیقی

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

مومن کی شاعری کے عناصرِ ترکیبی

مومن کا شمار اردو کے ان چند باکمال شاعروں میں ہوتا ہے جن کے یہاں ایک شاعرانہ عظمت پائی جاتی ہے۔ اور اپنی ما بہ الامتیاز خصوصیات کی وجہ سے اردو شعراء کی صفِ اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن کا امتیاز الفاظ کے دروبست اور حروف و تراکیب کی حسنِ ترتیب سے بڑھکر ان کے فکر کا پہلو میں نمایاں ہوتا ہے۔ ان کی فکر کے دو پہلو ہیں۔ ایک زندگی کے متعلق اور دوسرا تغزل کے متعلق مومن کی شاعری میں یہ دونوں نظریات ایک مرتب انداز سے ملتے ہیں لیکن سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ان نظریات میں آپس میں تضاد سا پیدا ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں ایسی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو انکے نظریے کے خلاف ہوتی ہیں۔ مومن کی شاعری میں یہ عناصر اس طرح باہم دست و گریباں ہیں کہ ان سے ان کی شاعری کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور ان کے کلام پر غور و فکر کرنے والوں کو ایک وسیع دنیا مل جاتی ہے۔ فکر کے تضاد سے مومن کے کلام میں ایک جدت اور بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور یہی جدت ان کے فکر و تخیل کی جان ہے۔ مومن کا یہی بنیادی امتیاز ہے کہ انھوں نے ایک طرف زندگی میں وہ راہ نہیں اختیار کی جو عام شعراء کی راہ تھی بلکہ زندگی کے متعلق ایک پورا فلسفۂ حیات اپنایا اور اس کے لئے جد و جہد کی۔ دوسری جانب مومن نے غزل کو ایک نیا رنگ دیا اور تغزل کو ایک نرالے انداز سے پیش کر کے اردو ادب کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ مومن کے اس تغزل کو ہم غزل کی "داخلیت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کے تخیلات میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا بنیادی عناصر ہیں جنھوں نے ان کے افکار کو متاثر کیا ہے۔ اور ان میں یہ بوقلمونی پیدا کی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عقل محض کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ دراصل انسان کو متاثر کرنے والے۔ وہ عوامل اور عناصر ہوتے ہیں جو سماجی زندگی میں اسے متاثر کرتے ہیں یا پھر وہ عناصر خود اسکی افتادِ طبع سے عبارت ہوتے ہیں۔ زندگی کا نظریاتی اور نفسیاتی طور پر تجزیہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اثرات جو انسان کے اعمال و افکار پر مرتب ہوتے ہیں وہ خارجی بھی ہوتے ہیں اور داخلی بھی۔ مومن کی شاعری کا واقعیاتی انداز سے تجزیہ کرنے اور حالات سے موازنہ کرنے کے بعد یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعری کا بنیادی محور یہی دو عناصر ہیں۔ ایک خارجی عنصر جس نے مختلف طریقوں سے ان کی زندگی میں راہ پائی۔ ان کے دل کی پہنائیوں میں رچ بس گیا اور ان کی زندگی پر چھا گیا دوسرا داخلی عنصر ہے جس نے مومن کی طبیعت سے رنگ و بو حاصل کیا ہے اور جس نے ان کے مخصوص اندازِ تغزل کو جنم دیا ہے۔ مومن کی شاعری میں داخلیت کا یہ عنصر جو تمام تر ان کی طبیعت سے عبارت ہے۔ بہت پایا جاتا ہے اور غالب ہے۔ زندگی کے نظریہ کے متعلق مومن کے افکار کی تعمیر میں واقعات اور حالات کا کیا رول رہا ہے اور مختلف عناصر نے ان کے اس نظریہ کی تعمیر میں کیا کیا اثر ادا کیا ہے پہلے ہم اسی کا جائزہ لیتے ہیں۔

مومن ایک دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد غلام نبی صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے مریدوں میں سے تھے۔ جب ان کی عمر تعلیم کے قابل ہوئی تو شاہ صاحب سے انھوں نے تعلیم حاصل کی اور شاہ ولی اللہی خاندان سے منسلک رہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید ان کے ہم درس تھے۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ شاہ صاحب کا پورا خاندان علم و فضل اور زہد و طہارت میں معروف تھا۔ لوگ انکے پاس دور دور سے طلب علم کیلئے آتے تھے۔ ان کے یہاں دینداری کا بہت شدید اثر تھا اور ایک پورا علمی و ذہنی ماحول اس خاندان کے افراد نے تیار کر دیا تھا۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے چاروں بیٹے شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالغنی، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین صاحب نے اس دور میں دلی کی فضا کو غیر معمولی طور پر متاثر کیا تھا اور ایک غیر معمولی ذہنی لٹریچر عملی کردار کے ساتھ تیار کر دیا تھا۔ مومن کا بہت قریبی تعلق اس خاندان سے رہا۔ اس میں پلے بڑھے اور پروان چڑھے۔ اسلامی طرز کا قدیم یونانی فلسفہ منطق، حدیث و قرآن اور دوسرے علوم حاصل کئے۔ عربی پر انھیں عبور حاصل تھا۔ غالب علوم عربیہ میں مومن کے ہم پلہ نہیں تھے۔ علم طب اپنے والد سے حاصل کیا پھر جب سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کی ابتدا کی اور اسی خاندان کے مشہور فرد اور مومن کے ہم سبق مولانا اسمٰعیل جو شاہ عبدالغنی کے لڑکے تھے سید احمدؒ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کی امامت کو تسلیم کر کے ان کے ساتھ ہو لئے۔ نے بھی اس تحریک میں شرکت کی۔ اس تحریک کے بارے میں مختصر یہ ہے کہ سید احمدؒ ایک انقلاب لانا چاہتے تھے جس کا مقصد اسلامی نظام حیات کا برپا کرنا تھا۔ بہت سے لوگوں نے سید صاحب کا ساتھ دیا۔ سید صاحب مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان کی مغربی سرحد تک پہونچ گئے صوبہ سرحد کے مسلمان رئیسوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ہندوستان بھر میں اس تحریک کے داعی تھے جو اس کو امداد بھیجتے تھے اور سرحد پر جا کر سب سے پہلے اس تحریک کی جنگ سکھوں سے ہوئی کیونکہ اس علاقہ کے قریب انھیں کی طاقت زیادہ تھی اور وہ مسلمانوں کیلئے خطرہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن سید صاحب کا اصل مقصد تو انگریزوں اور ان طاقتوں کی بیخ کنی کرنا تھا جو ملک پر رفتہ رفتہ غالب آتی جا رہی تھیں۔ سید صاحب ملک کی اندرونی و بیرونی دونوں طاقتوں کا خاتمہ کر کے ایک نظریاتی بنیاد پر ملک کی نئی تنظیم کرنا چاہتے تھے جو انگریزوں کو سخت ناگوار اور ان کے لئے ایک عظیم خطرہ بن گئی تھی۔ ابتدا میں اس تحریک کو فتوحات حاصل ہوئیں۔ ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست ان لوگوں نے قائم کر لی اور پشاور شہر کی فتح نے ان کی عظمت اور اہمیت کو زیادہ بڑھا دیا مگر بڑا غداروں کا کہ سرحد کے مسلمان رئیسوں نے سید صاحب کے ساتھ غداری کی اور سکھوں سے مل گئے۔ سید صاحب اپنے اکثر ساتھیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ بظاہر یہ تحریک ختم ہو گئی مگر اس تحریک کے اثرات سے پورے ہندوستان میں عربی مدارس و علوم دینیہ کی اشاعت کے مراکز قائم ہوئے اور اس تحریک کے علماء نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ذہنی لحاظ سے دین کی نشاۃ ثانیہ کی۔

مومن سید احمدؒ کے مرید ہوئے ان کی تحریک کے ممبر بنے اور اسلامی نظام زندگی کو انھوں نے پوری طرح اپنا

اس وقت جو حالات تھے انھوں نے اور خود ان کی تعلیم و تربیت نے ان کو اس تحریک اور تخیل کا داعی بنایا۔ مومن کے ذہن میں سب سے پہلے ایک انقلاب تھا تاکہ فرسودہ نظام زندگی جس نے خود زندگی کو ایک تلخ تجرباتی تصور دیا تھا۔ اور اس کے کارواں کو ہلاکت کی راہوں پر ڈال دیا تھا وہ راہ جو ایک طرف پُر خار تھی اور دوسری طرف راہزنوں کی آماجگاہ چنانچہ وہ اس زندگی کے سماجی اخلاقی سیاسی اور معاشی ڈھانچہ کو بدلنا چاہتے تھے اور ایک ایسا انقلاب لانا چاہتے تھے جس میں زندگی کی قدریں اس کے بنیادی تصورات اور اس کے اخلاق و کردار کی تعمیر کے سرچشمے بالکل دوسرے ہوں تاکہ انسان کو اور خود ہندوستان کو سکون حاصل ہو سکے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

اے حشر جلد کر تہ و بالا زمیں کو یوں کچھ نہ ہو اُمید تو ہے انقلاب میں

مومن نے یہ انقلاب سیّد احمد صاحب کی قیادت میں پسند کیا تھا اور اس نظام کو جو نہ انگریزوں سے متعلق تھا اور نہ ان شخصی اقتدار کی کوششوں سے جو ملک کے مختلف طبقے مختلف مقامات پر ہندوستان میں کر رہے تھے بلکہ ایک نظریاتی انقلاب کی کوشش تھی جو وہ اس تحریک اور اس کے سربراہ کی قیادت میں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ سیّد احمدؒ کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ نورِ مجسم وہ ظلِ الٰہ کہ سایہ سے جسکے قبل مہر و ماہ
زہے سیّد احمد قبول خدا سراقتان رسولِ خدا
خبردار ہو جا کہ اے اہل دل کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

مومن ایک پورے نظام کو نافذ کرنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں اور فرماتے ہیں ؎

پلا مجھکو ساقی شرابِ طہور کہ اعضار شکن ہے خمار فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بہت کوشش جانفشانی کروں کہ شرع پیمبر کو جاری کروں

خود شاعر کی انتہائی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ وہ بھی اس مقدس انقلابی گروہ سے جا ملے اور مقصد کی اس راہ میں دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح سے جہاد کرے۔ چنانچہ یہ اشعار اس حقیقت کے غماز ہیں ؎

غنچہ ہائے آرزو مومن اب کھلنے کو ہیں خیر مقدم گلشن ایماں میں بہار آتی ہے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے ملا دے امام زماں سے مجھے
شوق بزم احمد و ذوق شہادت ہے مجھے جلد مومن نے پہونچ اس مہدی دوراں تلک
خدایا لشکر اسلام تک پہونچا کہ آپہونچا لبوں پر دم بلا ہے جوشش غول شوق شہادت کا

یکسو وہ تیغ جو بر ہا کر دے تمام دل صد پارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا
خود شعلۂ توحید کو وہ برق جولاں کر کہ خرمن پھونک دے ہستی اہل ضلالت کا

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہب کا ایک انقلابی تصور رکھتے تھے اور اپنے نظریہ میں پوری طرح سرگرم عمل تھے۔ ان اشعار کے علاوہ چونکہ ان کا تخلص مومن تھا۔ اس رعایت سے بھی اسی قبیلے کے انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے دینی خیالات کو جگہ دی ہے۔ ان کو پوری طرح بیان کیا ہے بدعت کے خلاف اور دوسری گمراہیوں کے خلاف تنقید یہاں ان کے اشعار میں موجود ہیں اور اسلام کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کا عزم ان کے یہاں ملتا ہے اور بنیادی طور پر اسلامی تصورات پائے جاتے ہیں ۔

مومن تو توڑنا نہ پیمانِ الست — ہیں مسلّم عاشقی کے فن میں ہم
لے نام آرزو کا تو دل سے نکال لیں — مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم
ترکِ مذہب کیوں کروں مومن ہوں کیا — اس صنم کو لاف یکتائی نہیں
سب کو ہوتا ہے گماں ہر پاس اپنے نام کا — ہم بھی تو مومن ہیں دل نذرِ صنم کیوں کر کریں
کافر اسے بتلاتا ہے کیا کیا بتو — مومن سے مل کے تم بھی مسلماں ہو گئے
کیوں پرستش خدا سے مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا
ربطِ بتانِ دشمنِ دیں کا اتہام ہے — ایسا گناہ حضرت مومن سے کب ہوا!
طوافِ کعبہ کا آخر کرے ہے دیکھو صدقے پھر لو — بتو سمجھو خدا مومن ہے مومن یوں نہ ٹھہرے گا
اے صنم مومن ہوں آخر کس طرح — مجھکو تسکیں ہو تری تصویر سے
[illegible] ہیں بے شمار گناہ — غم روزِ حساب نے مارا
حرم کو گر کے خوشی [illegible] نہ کرے مومن — لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ
دلِ بتاں کے دہی تو نہیں ہیں کہ ہو وبال — مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

یہ تمام اشعار مومن کی غزلیات سے ماخوذ ہیں ان میں مومن کا دینی طرز فکر صاف نمایاں ہے ظاہر ہے کہ یہ اثر ان کی بچپن کی تعلیم و تربیت کا ہے اور اس زمانے کے دینی ماحول و صحبت کا ہے جو کبھی مٹتا نہیں اور پتھر کی طرح دل پر نقش ہو جاتا ہے۔ چونکہ ایک دینی ماحول میں وہ پروان چڑھے تھے۔ دینی تعلیم حاصل کی تھی اس لئے اس دین کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے [illegible] اختیار کیا اور یہ ان کی فکر کا ایک اہم عنصر ہے۔

اب مومن کی شاعری کا دوسرا عنصر [illegible] ان کے تغزل اور مثنویوں میں نمایاں ہے اور جسے ہم داخلیت سے تعبیر کرتے ہیں یا جسے "معاملات" کہا جاتا ہے حسن و عشق کے جذبات کا بیان بغیر تصرف کی چاشنی کے تو بعض لکھنوی

شعراء نے بھی بہت کیا ہے مگر ان کے یہاں خرابی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ وہ شاعرانہ عظمت اس اظہار بیان میں برقرار نہیں
رکھ سکے ہیں بلکہ اکثر جگہ کھل گئے ہیں جس سے رکاکت اور سطحیت پیدا ہو گئی ہے۔ شاید مومن ہی اپنے معاصرین میں
تنہا ایسے شاعر ہیں جو غزل گو ہوتے ہوئے بھی اس کا ایک خاص نظریہ رکھتے ہیں اور جب بھی غزل کہتے ہیں تو اس حد سے
باہر نہیں نکلتے جو انھوں نے مقرر کر لی تھی۔ غزل کے اشعار میں وہ انھیں دونوں نظریات کی تائید کرتے ہیں یا تو وہ
اپنے پہلے والے نظریہ کو غزل میں سموتے ہیں یا پھر تغزل کے اشعار کہتے ہیں اور اپنے اسی مخصوص تخیل کے مطابق یعنی یہ
کہ وہ ضعیف غزل کو تو محدود نہیں تصور کرتے مگر جب غزل میں تغزل کا مضمون بیان کرتے ہیں تو وہ تغزل ان کے
اپنے تصور کا تابع ہوتا ہے اور اس پر وہ شدت سے عمل کرتے ہیں کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ تغزل کو محبوب کی ذات
کا مرکز ہونا چاہیئے چنانچہ اس دائرہ سے وہ کبھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ یہ بات نہیں کہ اپنے اس طرز تغزل کو وہ نہ جانتے
ہوں بلکہ یہ بھی ان کا ایک نظریہ تھا جس طرح زندگی کے بارے میں وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر جس کا بیان گذر چکا ہے
رکھتے تھے۔ اس حقیقت کا ثبوت خود ان کے یہ اشعار پیش کرتے ہیں۔

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن — آخر اس بزم میں کوئی تو سخنداں ہوگا
انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر ہم — تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو — جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہونچا
حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی — آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا
پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن — لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش
مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے — جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

اس قسم کے اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن نے یہ تخیل جو غزل میں ظاہر کیا ہے اور یہ راہ جو
انھوں نے اس میدان میں اختیار کی ہے۔ اس کی بنیاد شعور پر تھی اور وہ ایسا غیر شعوری طور پر نہیں کرتے تھے۔
ان کو پورا احساس تھا کہ ان کا اپنا الگ ایک رنگ تغزل ہے۔ جس میں ان کا کوئی حریف نہیں اور وہ اس بزم کے
تنہا مالک ہیں۔

مومن کے اس نظریہ تغزل نے اردو ادب کو ایک بہت پاکیزہ اور حقیقی جذبات کا آئینہ دار شعری ادب کا
سرمایہ بخشا ہے۔ جس میں انسانی محبت و تعلق کے فطری احساسات کی بہترین تصویر کشی ملتی ہے۔ مومن کے طرز تغزل نے
محبوب ہی کی نہیں محبت کی ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ انسان کے قلبی واردات اور انسانی احساسات کا حسین و
پُرلطف انداز بیان جو مومن کے مخصوص تغزل میں ہم کو ملتا ہے وہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ مومن نے محبت کے ان
اندرونی جذبات کو جو ہر انسان اپنے دل میں محسوس کرتا ہے .... گویا نکال کر رکھ دیا ہے۔ جس سے ہم اہل ذوق کے

دل کی محبت کی دھڑکنیں، جذبات کا تلاطم، احساسات کی لطافت اور خیالات کی نزاکت کی عکاسی اس خوبی سے مومن نے کی ہے کہ جس نے تغزل کی عظمت کو دوبالا کر دیا ہے۔ مومن کے تغزل میں غالب کی آفاقیت، میر کی سوگواری اور سودا کی تیزی و خوشس انگیزی کی کیفیات نہیں ملتیں۔ وہ صرف ایک انسان کے دل کی داستان ہے اور اسکی زبان سے، ایک انسان محبت کی زندگی میں جن راہوں سے گذرتا ہے۔ اسی کا فسانہ ہے اور خود مبتلا کی زبان سے کہیں حسرت کہیں غم، کہیں آرزوؤں کی دنیا، کہیں نا امیدیوں کا ماتم کدہ، کہیں وعدوں کے وفا کی امید کہیں بے وفائی کے شکوے اور کس مزے کے ساتھ، کبھی ہجر کی سموم تو کبھی وصل کی باد نسیم یہی سب مومن کی زندگی کی داستان معلوم ہوتی ہیں۔ مومن کے تغزل کا یہ رنگ اور یہ کیفیت ذیل کے اشعار میں نمونہ کے طور پر دیکھی جا سکتی ہے ؎

ما نگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہونگے

عمر تو ساری کٹی عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

منت حضرت عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کیلئے شرمندۂ احساں ہونگے

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہونگے

یارب وصال یار میں کیونکر ہو زندگی
نکلی ہی ...... جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمھارے سوا نہیں ہوتا

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جہاں تک مومن کے تغزل کے اس مخصوص رنگ کا تعلق ہے تو یہ بات بھی بالکل عیاں ہے کہ یہ طرز تغزل انھوں نے کہیں سے مستعار نہیں لیا ہے بلکہ وہ خود اس کے موجد ہیں اور بعد کے بہت سے شعرا اس طرز میں ان کے مقلد ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنی رجحانات، سماجی حالات، ماحول اور تعلیم و تربیت کے اثرات کے آئینہ میں اگر ان کے اس انداز تغزل کا تجزیہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ان کے تغزل پر کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔ ان کا ماحول اور انکی

تعلیم ایک طرف کام کر رہی تھی جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی دیندار اور مجاہد بنے اور سید احمد کی تحریک میں شریک ہوئے۔ مگر خود ان کی طبیعت بہت رنگین تھی وہ شاعر تھے اور دوسرے شاعروں کی طرح پیشہ ور نہیں انھوں نے اپنی شاعری سے اپنی زندگی میں کوئی نفع نہیں اٹھایا اور اس کو پیشہ نہیں بنایا بلکہ شاعری کو اپنے ذوق اور اپنی طبیعت کی تسکین کیلئے سمجھا اور اس کو کسی مادی شئے سے ملوث نہیں ہونے دیا۔ اس لئے ان کی شاعری ان کے خیالات کی اُن کے نظریات کی اور ان کے اندرونی جذبات واحساسات کی صحیح ترجمان ثابت ہوئی۔ ایک طرف انھوں نے اپنے نظریۂ حیات کی ترویج کی اور دوسری طرف انھوں نے اپنی طبیعت کو جو رنگین و تُرنہ مذاق تھی دبایا نہیں بلکہ اس کو ابھرنے اور زندگی کو سنوارنے کا صحیح موقع دیا۔

وہ رنگین طبع واقع ہوئے تھے اور عنفوان شباب میں جو کچھ بھی بے راہ روی ان سے ہوئی ہو مگر بعد میں مدھر گئے تھے۔ ان کی طبیعت کی اس شوخی اور تربیت کی گہری دینداری نے ان کے ذہنی افکار میں ایک کشمکش پیدا کر دی تھی جس سے انکار ممکن نہیں۔

بہرحال جو کچھ بھی ہو ان کے اشعار کے مطالعہ اور دوسری طرف وہ غیر معمولی دیندارانہ زندگی جس میں وہ پلے تھے دونوں میں کوئی مطابقت نہیں معلوم ہوتی سوائے اس بات کے کہ مومن کو طبیعتہً جس کا ثبوت ان کی شاعری میں ملتا ہے ایک پر ذوق و رنگین مزاج آدمی مان لیا جائے اور اس سے مومن کی شاعرانہ بلندی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا

اس موقع پر ایک بات قابل غور ہے کہ خود مومن کو اس کا احساس ہوتا تھا کہ وہ عشقیہ شاعری میں کہیں کہیں دینی حدود جس کو انھوں نے اپنی زندگی کا پیمانہ مقرر کیا تھا .... آگے بڑھ جاتے ہیں اور خود بھی اس کو صحیح نہیں تصور کرتے تھے یا امرد پرستی جو اگرچہ ان کی شاعری میں بہت کم ہے مگر ایسے شخص کے یہاں اس کا وجود بھی باعث تعجب ہے۔ طبیعت اور اعتقاد کے ان دو مختلف دھاروں نے ان کو ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر دیندار تھے مگر طبیعت کی رنگینی سے کبھی کبھی مجبور بھی ہو جاتے تھے۔ ضیاء احمد بدایونی کی رائے یہ ہے کہ یہ کشمکش ابتدائی عمر میں تھی اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس رنگینی سے باز آگئے تھے مگر مشکل یہ ہے کہ یہ ذہنی کشمکش ان کے یہاں ہر جگہ تھوڑی بہت مل جاتی ہے۔ جس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نظریئے ان کو اپنی اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور وہ کبھی ادھر اور کبھی ادھر مائل ہو جاتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ آخر عمر میں دینداری ہی غالب رہی۔ مومن کی شاعری کے یہ عناصر ان کے ان اشعار میں پوری طرح جھلکتے ہیں ؎

کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا		حضرت مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

کعبہ کا دھیان نہ ہو حضرت مومن کو کہ جان		حسرتوں سے پس دیوار صنم دیتے ہیں

کیا کسی بت خانہ کو زینت ہو ظلمت کدہ		حضرت مومن جہاں جاتے ہیں چھپ کر رات کو

شب ہجراں کو سمجھا روز جزا　　　مومن ایسا سیاہ کار ہے دل

مومن دیندار نے کی بت پرستی اختیار　　　ایک شیخ وقت تھا سو وہ برہمن ہو گیا

دل میں ہوائے بتکدہ ظاہر میں کیا ہوا　　　رہنا حرم میں مومن مکار کی طرح

گر یہی شوق شہادت ہے تو مومن ہی چکے　　　دل سے نہیں گیا ہے خیال بتاں ہنوز

کیں میں ہے مومن وہ کافر صنم　　　بس اب پاسبانی دیں ہو چکی

مومن ایماں قبول دل سے مجھے　　　وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

یہ اور اس قسم کے اشعار کثرت سے مومن کی غزلوں میں پائے جاتے ہیں جن میں ان مذکورہ دونوں نظریات کی کشمکش کا ایک دلچسپ منظر سامنے آتا ہے۔ اور ان کے ان فکری عناصر کو نمایاں کرتا ہے جنھوں نے ان کی زندگی و شاعری دونوں میں جدت اور اس کے ساتھ عظمت پیدا کی ہے اور نظریاتی نقطۂ نظر سے تضاد کو جنم دیا ہے۔

(بقیہ سلسلہ ۲۰ سے آگے) سماج اور ریاست کی اہمیت کے معترف ہی نہیں بلکہ انکی موجودگی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ PASSAGL TO INDIA نے PETER BURRA پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹھیک کہا ہے کہ فوسٹر کے لیے۔

"سماجی پس منظر وہ مرحلہ ہے جسے کامل انسان کا تجزیہ کرتے وقت نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے"۔

مختصر یہ کہ فوسٹر ایک کھلا دماغ رکھتے تھے اور ان کے دل میں حقیقی زندہ ذات (ACTUAL LIVINP SELF) سے جو محبت تھی اسی نے انہیں انسانی معاملات کی کشمکش اور تصادم کی طرف مائل کیا اور انھوں نے اس کشمکش اور تصادم کو مسکراتے ہوئے پیش کیا۔ یہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ وہ آزاد تصور کے حامل تھے۔ آزاد تصور کی طرح اور ایک قیمتی شئے جو انہیں حاصل تھی وہ انفرادیت پسندی تھی۔ لیکن ان کی یہ انفرادیت پسندی انفرادیت پرستی نہیں تھی۔

حامد اللہ ندوی

ایک غلط بیان

"سید شاہ امین الدین علی اعلیٰ" کے نام سے نوائے ادب بمبئی بابتہ اکتوبر ۱۹۷۲ء (جو ابھی دو ماہ پیشتر شائع ہوا ہے) میں ڈاکٹر حسینی شاہد کا ۴۴ صفحات پر مشتمل ایک طویل تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ صاحب کے نام، تخلص، حسب نسب، خاندان، ننھیال، پیدائش، سنہ پیدائش، استاد، پیر، بیعت، خلافت، حلیہ، لباس، مشاغل، وفات، مقام وفات، درگاہ، کتبہ، ازدواج و اولاد، مرید اور خلفاء وغیرہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کی حیات اور کارناموں پر سے بڑی خوبی کے ساتھ پردہ اٹھایا ہے، یہ مضمون تحقیقی نقطۂ نظر سے ایک گراں قدر اضافہ ہے اور قابل تعریف ہے۔

لیکن دوران مطالعہ میں جو چیز مجھے کھٹکی وہ شاہ امین الدین کے مقبرے کے دکھنی کتبہ کی قرأت سے متعلق ڈاکٹر حسینی شاہد کا یہ بیان تھا "مقبرے کے کتبے عام طور پر عربی یا فارسی میں ہوتے ہیں لیکن حضرت امین کے مقبرے کا کتبہ دکھنی میں ہے۔ جس کو پڑھنے کی سعادت پونا کے بھگوت دیال ورما کے حصے میں آئی۔ بعد میں محمد اکبر الدین صدیقی نے بھی اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھا" (ص ۴۸) حوالہ دیا ہے "بھگوت دیال ورما مقالہ پی ایچ ڈی بمبئی یونیورسٹی ۱۹۶۴ء"

اِس بیان کے کھٹکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں سنہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۷ء تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا لائبریرین تھا، ڈاکٹر ورما ان دنوں اپنے مقالہ کی تکمیل میں معروف تھے اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی سے مشورے کرنے کے لئے اکثر بمبئی آیا کرتے تھے، ان کے سامنے امین درگاہ کے کتبوں کی قرأت کا بھی مسئلہ تھا، اس کے دو کتبے تو فارسی اور مرہٹی میں تھے اور نسبتاً صاف تھے اس لئے انھوں نے ان کو حل کر لئے، لیکن دکھنی کتبہ نہایت پیچیدہ ہونے کی وجہ سے پڑھا نہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب محکمۂ آثار قدیمہ نے ناظم صدیقی کو بیجاپور کے کتبوں پر کام کرنے کے لئے متعین کیا تو انھوں نے تمام کتبے پڑھے لیکن امین درگاہ کا یہ کتبہ ان سے پڑھا نہ جا سکا اور محکمہ نے کتاب اس کے بغیر ہی شائع کر دی اِسی لئے ندوی صاحب کا خیال تھا کہ اس کو سوائے محمد اکبر الدین صدیقی کے اور کوئی نہیں پڑھ سکتا۔

ڈاکٹر ضیاء الدین دیسائی (ڈپارٹمنٹ آف آرکائوز ناگپور) سے بھی مراسلت ہوئی انھوں نے بھی ندوی صاحب کی رائے سے اتفاق کیا اور اس کی قرأت کے لئے محمد اکبر الدین صدیقی کو تکلیف دی گئی، محمد اکبر الدین صدیقی نے ندوی صاحب کی اس توقع کو پورا کیا اور ڈیڑھ سال کی محنت کے بعد اس کی ایک ایک بار یکی کو پڑھ کر اور اس کی ساری پیچیدگیاں حل کرکے

اس کی ایک مکمل قرأت تیار کی۔ جس کی تفصیلات خود محمد اکبرالدین صدیقی کے قلم سے اُردو نامہ کراچی جون ۱۹۶۱ء تحریر دہلی جلد ۲ شمارہ ۲ ۱۹۶۵ء اور ایپی گرافیا انڈیکا ۱۹۶۰ء میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر حسینی شاہد کا مذکورہ بیان پڑھنے کے بعد مجھے اپنی معلومات پر شک ہونے لگا چنانچہ اپنے اطمینان کے لیے میں بمبئی یونیورسٹی لائبریری گیا اور ڈاکٹر ورما کا وہ مقالہ نکلوا کے دیکھا۔ ڈاکٹر ورما نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

ڈاکٹر ورما کا مقالہ انگریزی میں ہے اور دکن کی مسلم ایپی گرافی ان کا موضوع ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں تاریخی پس منظر ہے اور دوسرے حصے میں دکن کے بعض اہم تاریخی شہروں کے کتبے اور ان کی تفصیلات ہیں۔ اسی ضمن میں بیجاپور اور درگاہ امین کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس میں انھوں نے اس درگاہ کے تین کتبوں کی قرأت دی ہے۔ پہلا دکھنی، دوسرا فارسی اور تیسرا مراٹھی کتبہ زیر بحث پہلے بتا ہے۔ اس کی قرأت دینے سے پہلے بہ طور تمہید انھوں نے لکھا ہے۔

"یہ کتبے دکھنی اردو میں موزوں کیے گئے ہیں اور بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ لکھے گئے ہیں بعض شعر فارسی میں ہیں...... گذشتہ تین صدیوں سے کسی اور اسکالر نے ان کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی .... میں نے اس کتبہ کے فوٹوگراف کی مدد سے اور خود اس جگہ پر جا کر کئی دن کے مطالعہ کے بعد آدھے سے زیادہ متن کو پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ اب اُمید ہے کہ اور اسکالرز مزید الفاظ کا پتہ چلانے کے لائق ہوں گے۔"

اسی سلسلہ میں آگے چل کر لکھا ہے کہ اس کتبہ میں حروف اس طرح ترتیب دیئے گئے ہیں کہ ان سے بہت سے جو لفظ نکالے۔ ان کے بجائے دوسرے الفاظ بھی بن سکتے ہیں۔ میں نے ایسی قرأت تیار کی ہے جو شعر کے وزن سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ ہے ص ۲۸۲ پھر ۲۸۷ پر ان الفاظ کے ساتھ اس کتبہ کی ان کی اپنی قرأت کو نقل کیا ہے۔

My incomplete reading of the text of some inscriptions is as follows.

انھوں نے اپنے قرأت کردہ متن کے ہر مصرعے کو دو ٹکڑوں میں بانٹ کر پوری نظم کے تینتیس ۳۳ ٹکڑے کئے ہیں اور اس طرح انھیں دیا ہے۔

۱۔ نہاد بنیاد عشق بازی	جز درد و بلا مقصود نہ بود	۴۔ سوز سد میں گذر	کریا کی عرفاں سنبھال
۲۔ رور ماصدقے کا جوار (؟)	دل بھر میں اخواص ہو	۵۔ موتی .... حاتے لے	عرفاں پلکوں (؟)
۳۔ بلبہاور قس صدف	میں نور حق جان امین	۶۔ ہے منور قس نو اسوں حال	جز ظاہر طلوع

اس طرح یہ متن ادھورا ادھورا آگے بڑھتا ہے اور نمبر (۳۳) پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ نمبر ۲۳، ۲۵، ۲۷ پر جیسے

خالی چھوڑ دی ہے۔ اور ۳۳ پر وہی پہلے والا مصرعہ دوبارہ لکھا ہے۔

جب ہم ڈاکٹر وردما کے اس متن کا محمد اکبرالدین صدیقی کے متن سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر وردما اپنی ساری محنت اور عرق ریزی کے باوجود دو ایک جملوں اور پندرہ بیس لفظوں سے زیادہ کوئی بامعنی چیز اس کتبہ سے پیدا نہ کر سکے جبکہ محمد اکبرالدین صدیقی کی قرأت نہایت واضح صاف اور سوفی صدی بامعنی اور مرتب ہے۔

ان تفصیلات سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد کا یہ کہنا کہ اس کتبے کو پڑھنے کی سعادت ڈاکٹر جگوت دیال ورما کے حصے میں آئی بعد میں محمد اکبرالدین صدیقی نے بھی اس پر ایک تفصیلی مضمون لکھا' محمد اکبرالدین صدیقی کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ ڈاکٹر ورما نے جو کچھ کوشش کی ہے اس کو "پڑھنا" سے تو تعبیر نہیں کر سکتے البتہ "پڑھنے کی کوشش کرنا" کہہ سکتے ہیں اور ان کی قرأت اپنی موجودہ صورت میں کسی بھی ادبی تحقیق کے لئے بہ طور حوالہ و استناد استعمال ہی نہیں کی جا سکتی۔ اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے اس قدر وثوق کے ساتھ اس کتبہ کو پڑھنے کا سہرا ڈاکٹر ورما کے سر کیسے باندھ دیا۔ یہ ان کی محض بے احتیاطی تھی یا ایک دانستہ عمل؟

ڈاکٹر حسینی شاہد کی صحیح ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں ہمیں ان کے اس خیال سے مدد ملتی ہے جو انھوں نے محمد اکبرالدین صدیقی کے محولۂ بالا مضمون "کتبۂ امین درگاہ بیجاپور" میں ظاہر کی ہوئی ایک رائے کے بارے میں ظاہر کیا ہے۔ محمد اکبرالدین صدیقی نے اپنے اس مضمون میں کتبہ کی ساری تفصیلات دینے کے بعد لکھا تھا:

" مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مضمون (اردو جنوری ۱۹۲۰ء) میں اس کتبہ کے پانچ شعر درج کئے ہیں اور انھیں امین الدین اعلیٰ سے منسوب کیا ہے' پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ان کے کسی مرید نے لکھے ہیں' ابھی تک ہمیں شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا' نظم میں اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے (ص ۱۴۳ آخر جلد ۱)

ڈاکٹر حسینی شاہد نے محمد اکبرالدین صدیقی کی اس رائے پر ان کے الفاظ نقل کئے بغیر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ " محمد اکبرالدین صدیقی کا خیال ہے کہ یہ غزل حضرت امین کی نہیں بلکہ ان کے کسی مرید کی ہے۔ لیکن یہ خیال درست نہیں معلوم ہوتا " (ص ۳۰) کیوں درست معلوم نہیں ہوتا اس کا انھوں نے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا ہے۔ صرف یہ لکھ کر خاموش ہو گئے ہیں کہ " راقم الحروف کے ہاں اس غزل کے دو نسخے ہیں ایک اس قدیم بیاض میں ہے۔ جس میں حضرت امین کا دوسرا کلام بھی ہے' دوسرا انتہائی بدخط اور غلط ہے" پھر لکھتے ہیں کہ " یہاں اصل متن کتبۂ درگاہ سے دیا گیا ہے" (حاشیہ ص ۲۸)

اور کمال یہ ہے کہ انھوں نے وہ پورا متن صدیقی صاحب کے مذکورہ بالا مضمون سے نقل کیا ہے اور اپنی آسانی کیلئے ان ساری درمیانی عبارتوں' کلموں اور دعاؤں کو حذف کر دیا ہے جو صدیقی صاحب نے اپنے اس مضمون میں دیئے ہیں جب راقم الحروف کے پاس اس غزل کے دو نسخے تھے تو راقم الحروف نے وہ غزل اسی بیاض سے کیوں نہ دیدی' سارا متن لفظ بہ لفظ محمد اکبرالدین صدیقی کا کیوں نقل کر دیا اور کیا انھیں محمد اکبرالدین کی قرأت سے پہلے کبھی اس بات کا علم

تھا کہ اس کتبہ میں جو غزل درج ہے وہ اُن کے پاس بھی ہے۔

غرض کہ اس کتبہ اور اس کی قرأت سے متعلق ڈاکٹر حسینی شاہد نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ہر لفظ دبی زبان سے یہ گواہی دے رہا ہے کہ انھوں نے محمد اکبرالدین صدیقی کے مضمون کا پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن چونکہ وہ کسی وجہ سے محمد اکبرالدین صدیقی کی اہمیت کو بڑھانا نہیں چاہتے۔ اس لئے انھوں نے اس کی قرأت کا اعزاز ڈاکٹر ورما کو بخش دیا اور ساتھ ہی اس سے متعلق ساری تفصیلات پر اس انداز سے روشنی ڈالی جیسے اس کی قرأت ایک معمولی بات ہو۔

انسانی تاریخ میں کتبوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ پڑھ پڑھ کر انسان نے اپنے نامعلوم ماضی کا پتہ چلایا۔ قدیم تاریخ کے تانے بانے بنے اور ہر ملک کا اس کا اپنا ثقافتی ورثہ معلوم کیا آج بھی مغربی مورخین ان لوگوں کا نام عزت سے لیتے ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ کے چند اہم اور بنیادی پتھروں چٹانوں اور لاٹوں کا پتہ چلایا اور ان پر کندہ عبارتیں پڑھیں۔ جن لوگوں نے امین درگاہ کے اس دکھنی کتبے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھا ہے یا اس کے فوٹو ملاحظہ کئے ہیں وہ وہ آسانی سے گواہی دے سکتے ہیں کہ اس کا پڑھنا کوئی آسان کام نہ تھا اور جس نے بھی اس کو پہلی بار پڑھا ہے وہ ہماری تعریف کا مستحق ہے۔ لیکن ہماری تنگ دلی کا یہ عالم ہے کہ ہم ایسے لوگوں کی اہمیت کا کھل کر اعتراف کرنے کی بجائے ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس پر خوش ہوتے ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر ورما اور محمد اکبرالدین صدیقی دونوں کی قرأتیں دی جا رہی ہیں تاکہ قارئین کو خود ہی اندازہ ہو جائے کہ واقعتاً اس کتبہ کے پڑھنے کی سعادت کس کے حصے میں آئی ہے۔

ڈاکٹر ورما کی قرأت

۱۔ نہاد بنیاد عشق بازی — جز درد و بلا مقصود نہ بود

۲۔ روح صدفلے کا جھا ؟ — دل بحر میں غواص ہو

۳۔ بے بہا در تس صدف — ہیں نور حق جان امین

۴۔ مسعود مسدمیں گنذ — کریا کی عرفان سنبھال

۵۔ موتی .... حات لے — عرفاں پلکوں (؟)

۶۔ ہے منور تس نور سوں حالی — جو ظاہر طلوع .....

۷۔ کرایا حضور وہ حق صدیہ — پس تب تو ں امین

۸۔ مقبول حق از حق ہوتا — کر جیا دو ہی کس جا دھرے

۹۔ راضی برضائے حق ہو — وو تھانا دہ جا امین

۱۰۔ ذو نکلے تر موک سو — تمثیل کو کس ںیا کر کہوں

محمد اکبرالدین صدیقی کی قرأت

۱۔ بنیاد نہاد عشق بازی — جز درد بلا نبود مقصود

۲۔ دل بحر میں غواص ہو روح صدف کی کاجیں امین

۳۔ در بے بہا تس صدف میں جان نور توں ساجیں امین

۴۔ گر گیان کی عرفان توں سنبھال سینپی چیر کر

۵۔ موتی مزین ہات لے عرفان انگوں پر کاد امین

۶۔ سو ہے منور نور توں تس حال جو ظاہر طلوع

۷۔ کرتا حضور حق اورچیت، ہو یہ الیس تب توں امین

۸۔ مقبول حق از حق ہوا پاگر چرا کس جا دھرے

۹۔ راضی برضا حق ہو خداشاں ذوق ناد وجا امین

۱۰۔ اس ذوق کی تمثیل کو کس موک سوں کیا کر کہوں

۱۱- ہر کسے زہرہ نہ تھا　تا اور کوئی سکیا ایں

۱۲- حق سور ہے تیرا لگے　یہ وصل نہ تس .... اپر

۱۳- بھو جیک اچنبہ گر ہے　گر گہر منزہ راز باصر (؟) ایں

۱۴- دھند صاحب اجس ایہا　وصل بحر امواج ایں

۱۵- یا ور تھار شغا از علت　برہ تاریک تاریک ایں

۱۶- عروت ولیکن ہے ایتا ج　من سمع ور غواص دسکے

۱۷- لا الٰہ الا اللہ محمد　رسول اللہ علی ولی اللہ

۱۸- لقائے موج دریا سو　غیر اللہ تحیں ایں

۱۹- ....　.................

۲۰- دو جا اور جان بیجان　کرکر پاتوں ایں

۲۱- سو اس پر دسے سنے　بیجا دو سب تجہ بین

۲۲- جن پیم امر ہے　حق............ ایں

۲۳- ....　.................

۲۴- ای پیر معلم سو　امداد لی خاص خور ایں

۲۵- ....　.................

۲۶- پایا تھا جو مجہ ھیں ہوا　............ درایں

۲۷- ....　.................

۲۸- قربان تن من جان دیکر　بل کیتا من اکھار

۲۹- اس درد کا ....　خط غلامی منجی ساتہ (؟) ایں

۳۰- تجھے میر آزاد کر نین　تجہ تھے پایا ایں

۳۱- ابیات خالی پنج دہ　تمت کیا ہے غزل ایں

۳۲- مفہوم کر ستار ہونا　عیب جو ہوتا ایں

۳۳- نہاد بنیاد عشق بازی　جز درد و بلا مقصود نہ بود

۱۱- ناہر کسے زہرہ تھاں نا اد کوی سکیا ایں

۱۲- حق وصل سوں بھو بجانتہ ہے تس بجاکتے قتل الانسان

۱۳- بجن بھن منزہ رو پدہ ہے بھو جگ اچنبہ کن ایں

۱۴- وصل بحر امواج میں ہادی ہدایت جس ایں

۱۵- ورتہ شفا اغلب تہاں باریک رہ تاریک ایں

۱۶- لیکن عروج اچا ہے من غواص دل کے سمع توں

۱۸- امواج نفسانی سو غیر اللہ تیں نا ڈر ایں

۱۹- مطلوب ہے آسان تب اشکال بر تکمیل ترنا

۲۰- جا ڈوب کر اد پار جا بیچار تیں کرنا ایں

۲۱- بیجا بود و سو اس سب پر خدا ہے تجہ ایں سنے

۲۲- مردان حق تن نام ہے جن بیم اہیں بیٹھا ایں

۲۳- شاید ہو دل انگسول دانا دلالہ لعد حد

۲۴- پیرے معلم خاص تجھے امداد دے حق سوں ایں

۲۵- برہان کیرے فیض سوں خوتا لیا ان دھوندھنے

۲۶- پایا جو تھا تجہ قدر دساب رہ ا ھیں ہوا ایں

۲۷- برہان بن میراں کیرے درگاہ کے سب خاک پر

۲۸- قربان تن بل جان من دیکر کہاں کیتا ایں

۲۹- خط غلامی منجہ سما آسیر اس دربار کا

۳۰- آزادگی کو نین تجھے میں منجہ تجھے پایا ایں

۳۱- ابیات خالی پنج دہ تمت کیا ہے غزل ایں

۳۲- مفہوم کر ستار ہونا عیب جو ہوتا ایں

۳۳- بنیاد نہاد عشق بازی جز درد بلا نبرد مقصود

منقول از "ایپی گرافیا انڈیکا" ۱۹۲۸ء صفحہ ۹۱ تا ۹۲

ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

حالی کی "حالیت"

حالی کی فضیلت ایک صالح اور صحت مند نظریہ کی آفرینش اور ساخت و پرداخت کی وجہ سے مسلمانوں کی زبوں حالی کے حالی کو خون کے آنسو رُلائے۔ انکا دل قومی درد سے تڑپ اٹھا اور انھوں نے قوم کو بے راہ روی سے ہٹا کر ایک عظیم منزل کی طرف لے جانے کی دعوت دی۔ حالی نے قوم کے جذبات سے بلند ہو کر غور فکر کرنے کو کہا اور اپنی عظمت۔ اقتدار و وقار کو واپس لینے کے لئے وسیع النظری۔ وسیع القلبی اور وسیع الدماغی سے کام لینے کو کہا۔ انھوں نے قوم کو یہ بتایا کہ مذہب مذہب چلانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی روح کو اعمال میں ڈھالنا چاہیئے۔ حالی ایک با مقصد شاعر ہیں انکی شاعری ایک مرد مومن کے دل کی آواز ہے۔ غالب اور دیگر عظیم فنکار کی طرح انکی قدر ان کی زندگی میں نہ ہو سکی۔ آج اس مصلح قوم کی شاعری ہماری تنقید کا نقش اول ہے اور ہم اس کے کارنامے سراہنے بیٹھے ہیں۔

بعد مرنے کے قدر کرتی ہے کتنی مردہ پرست ہے دنیا

جب سر سید قومی ترقی اور انسانیت کی اصلاح کے لیئے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے اسی وقت ایک دوسرا جنوا سر سے کفن باندھ کر میدان میں اتر آیا تھا وہ تھا حالی۔ سر سید کی قلم میں بہت زور تھا لیکن وہ شاعری کی جادو بیانی سے محروم تھے۔ سر سید کا رنگ کبھی کبھی بے رنگ ہو جاتا تھا۔ حالی نے اس میں ادبیت پیدا کی حالی نے سر سید کے مشورہ سے ایک نظم مدوجزر اسلام لکھی۔ یہ نظم نہیں۔ قوم کے عروج کا قصیدہ اور زوال کا مرثیہ ہے جس میں قومی بدحالی کی نقشہ کشی۔ پُر درد انداز میں کی گئی ہے۔

حالی کی ذہنیت اور شعور پر اثر ڈالنے والی دوسری طاقت انگریزی اور مغربی تہذیب کی جانب داری تھی۔ پنجاب بک ڈپو لاہور میں حالی کا کام اردو کی ان کتابوں کی تصحیح کرنا تھا جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ حالی عبارت کا لب و لہجہ درست کرتے اور کتابوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ اس ملازمت نے حالی کو انگریزی ادب سے روشناس کر دیا اور ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ وہ فارسی کو انگریزی کے سامنے ہیچ سمجھنے لگے۔ آج سر سید اور حالی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ انگریزی تعلیم نے اردو زبان کو قدامت پرستی کی زنجیروں سے آزاد کر دیا ہے اور ذخیرۂ الفاظ۔ نئے تخیلات۔ نئی تشبیہات۔ نئے نئے مضامین مناظر اور شعر کے لئے نئے نئے

سامانِ زینت فراہم ہو سکتے ہیں۔ حالی مغربی خیالات سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں		بس اتباعِ مصحفی میر کر چکے

شیفتہ کی صحبت کا بھی حالی پر بہت اثر پڑا۔ شیفتہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ سیدھی سادی بات کو محض حسنِ بیان سے دلفریب بنانا کمال شاعری سمجھتے تھے اور حالی ان سب کے حامی تھے۔ شیفتہ نے حالی کی شاعری کو عامیانہ اور رکیک خیالات سے پاک رکھا۔

حالی اور آزاد ایک ہی گلستان ادب کے ہم نوا ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں ایک نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرعِ طرح کی بجائے کوئی موضوع دیدیا جاتا تھا۔ حالی اس کی روحِ رواں تھے۔ حالی نے ایسے مشاعروں میں چار نظمیں پڑھیں۔ برسات، رحم و انصاف۔ امید، حبِ وطن۔ اور مذاقِ شعر و سخن میں ایک انقلاب اور ترقی پسند رجحانات کے حامی ہوئے۔

حالی غالب سے ضرور متاثر ہوئے۔ انھوں نے "یادگارِ غالب" لکھکر غالب کو عوام سے قریب لایا اور غالب کے مشکل اشعار کی تشریح لکھکر غالب کو عوام میں مقبول کروایا۔ دنیا میں بہت سے نیک اور اچھے کام محض اتفاق کی بدولت ہو جاتے ہیں یہی حالی اور غالب کی ملاقات کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ یہ اردو ادب کی خوش بختی ہی تھی کہ غالب جیسے باکمال استاد کو حالی جیسا ہونہار شاگرد مل گیا تھا جس نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو سیدھے راستے کی طرف موڑ کر نئی زندگی بخشی اور استاد نے الطاف حسین کو خستہ سے حالی بنا دیا۔

حالی کا اصلی میدان غزل نہیں۔ ان کی شاعری واہ نہیں آہ ہے۔ وہ عمر کی پختگی کے ساتھ گل و بلبل کے افسانے کے جنجال سے نکل کر قوم کے ہو رہے تھے۔ وہ ہمیشہ قوم کے اقبال کا ماتم کرتے رہے۔ انکی غزل میں تغزل کے بجائے قومی تاثرات زیادہ ہیں چونکہ یہ ان کے دل کی آواز ہے لہٰذا کسک بہت ہے۔ حالی نے جذبات و واردات سے ہٹ کر غزل میں موضوعاتی شاعری کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے ان کی غزل میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ وہ نہایت سادگی و صفائی سے بات کہتے ہیں جس سے ان کے بے ساختہ پن اور سوز و گداز کا اندازہ ہوتا ہے۔ انھوں نے تغزل میں نفسیات محبت کو بڑی اہمیت دی ہے۔ حالی کے یہاں جام و مینا کی داستان بالکل نہیں۔ غالب کی شاگردی کے باوجود ان کی شاعری اس فیضان سے محروم رہی۔ حالی کے یہاں تشبیہات کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔ انکی غزلوں میں روزمرہ اور محاورات کی بہتات ہے انکی زیادہ تر غزلیں مسلسل ہیں۔ پھر بھی چند غزلیں مثالی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

فطرت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا		تو سب سے ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا
ہم وقتِ وداع ان سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت		رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا
جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے		گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

حالی کی غزل میں کہیں کہیں تیکھی شوخی، ظرافت، طنز موجود ہے لیکن انکی متانت سب پر غالب ہے۔ چند ملاحظہ ہوں ؎

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

حالی عشق کی آگ سے کبھی دوچار نہیں ہوئے۔ انکا کوئی رقیب بھی نہ تھا اور نہ انھوں نے اپنی معروف کی بناء پر کسی کو رقیب بننے کا موقع دیا۔ نہ انکو خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ وہ نہ وصل کا نہ فراق کا مزا چکھ سکے۔ وہ جدا گ مصلح شاعر تھے انکو ادبی مصروفیتوں سے اتنا موقع ہی نہیں ملا۔ اس لئے حالی کی میں عشقیہ عناصر بہت کم ہیں۔

حالی کی غزل میں خاکساری وغیرہ کے مضامین بہت ملتے ہیں اور انھوں نے کیسی کیسی نازک خیالیاں پیدا کی ہیں۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؎

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا خاکساری اپنی کام آئی بہت

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

حالی نے نیچرل شاعری پر بہت زور دیا ہے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے چار مثنویاں لکھی جن میں نیچر کی عکاسی کی گئی ہے۔ حالی نے واقعاتی شاعری کو بھی پروان چڑھانے کی کوشش کی اور کہیں کہیں کو سادہ اور پر اثر انداز میں قلمبند کیا ہے۔ حالی کا دل وطن کی محبت سے پر تھا وہ ہمیشہ اپنے ہم وطنوں کی بہبود چاہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تیری اک مشت خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اے دل۔ اے بندۂ وطن ہوشیار خواب غفلت سے ہو ذرا بیدار

حالی نے اپنے وسعت بیان کے لئے صنف غزل کو تنگ پایا۔ انکا اہم کارنامہ مسدس مدوجزر اسلام ہے مسدس میں عرب کی جہالت۔ نبیؐ کا نزول۔ انکی سیرت۔ انکی تعلیم۔ ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص جذبۂ اسلامی، مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری۔ قرطبہ اور بغداد کی عظمت کا ذکر سادہ اور پر اثر الفاظ کیا ہے۔ حالی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں۔ مسدس ایک داستان درد شروع سے آخر تک وہ اسلام اور مسلمانوں کا حال زار دربار رسالت میں عرض کرتے ہیں اور اصلاح حال کے لئے دعا کرتے ہیں۔

دلّی کا مرثیہ بھی حالی کی جاندار نظم ہے جس میں انھوں نے دلّی کی زبوں حالی پر جی بھر کے آنسو بہائے ہیں۔

"مناجات بیوہ" حالی کا نامور کارنامہ ہے۔ حالی سے پہلے عورت کا شاعری میں کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ عورت کی فطری صفات یعنی خدمت۔ محبت۔ شرافت۔ شرم وحیا۔ قربانی و ایثار محبت و حفاکشی اور بلند کرداری کا کہیں ذکر بھی نہیں آتا تھا۔ حالی نے محسوس کیا کہ عورت کو سماج اور شاعری میں صحیح مقام دیا جائے۔ اس نظم میں انھوں نے ایک بیوہ عورت کے دلی جذبات کیفیات و احساسات کو پُر اثر انداز میں بیان کیا ہے۔ پڑھ کر دل تڑپ اٹھتا ہے اور آنکھوں سے آنسو خود بخود رواں ہو جاتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے مولوی عبدالحق سے پوچھا کہ اردو کی کونسی کتاب سب سے پہلے پڑھوں انھوں نے جواب دیا "مناجات بیوہ" بیوہ کی زبان نہیں۔ یہ بدقسمت ملک کی زبان ہے۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندوستان کی عام زبان ایسی ہی ہو۔

"چپ کی داد" حالی کی معرکے کی نظم ہے اس میں انھوں نے عورتوں کی اصلاح۔ تعلیم تربیت کا ذکر کیا ہے۔ اور عورتوں کی فطری صلاحیتوں۔ محبت، شفقت، ہمدردی، خلوص۔ وفا شعاری، خدمت، مروت اور پاس ناموس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے عورتوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کو تعلیم کی طرف راغب کیا ہے۔ ہندوستان میں سب سے پہلے جو آواز عورت کی مظلومی اور انصاف کے لئے بلند ہوئی وہ حالی کی آواز تھی۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے ؎

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے　　　ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے

مردوں نے عورت کو پوری طرح سے اپنا خدمت گزار بنا کر اسکو تمام علوم و فنون سے بے بہرہ رکھا ہے۔ دنیا میں انقلابات ہوتے آئے ہیں۔ آج کل دنیا کا حال اس درخت کا سا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹتی رہیں اور پرانی ٹہنیاں جھڑتی رہیں۔ حالی نے ادب میں بھی انقلاب لانا ضروری سمجھا۔ اصلاح ادب کے سلسلے میں حالی نے مقدمہ شعر و شاعری دیوان حالی کا دیباچہ لکھکر ادب پر وہ احسان کیا۔ جس سے ادب رہتی دنیا تک سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ مقدمہ شعر و شاعری ایسی مدلل کتاب ہے کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔ اس میں انھوں نے فن شاعری پر کافی بحث کی ہے اور بہت سے اصول مرتب کئے ہیں۔

حالی نے نثر نگاری کے میدان میں اپنے خاص موضوع منتخب کئے۔ ادبی تنقید اور سیرت نگاری حالی کی "حیات سعدی" تذکرہ نگاری میں پہلی ادبی کوشش تھی اس کے تذکرہ میں حالی نے مشہور صوفی اور بزرگ مت عصر شیخ سعدی۔ معلم اخلاق کے کردار کو بڑے نظریاتی حقائق سے پیش کیا ہے۔ کتاب کا مقصد قوم اور ملت کا شیرازہ بندی تھا۔ حالی نے "یادگار غالب" میں غالب کے فنی کمال اور محاسن شعری پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی خوش طبعی، [illegible] سنجی کی مکمل تصویر پیش کی ہے۔ حالی نے سب سے پہلے ہمارے ذہن نشین کیا کہ غالب محض گل و بلبل، وصل و فراق کا [illegible] نہیں ہے بلکہ وہ اردو کا سب سے بڑا رومانی شاعر، تخیلات آشنا اور صاحب طرز شاعر ہے، یہی ایک

واحد کتاب ہے جو غالب کو منظر عام پر لانے کا سبب بنی اور ان کتابوں کی محرک ہوئی جو غالب پر بعد
"حیات جاوید" حالی کی زندۂ جاوید تصنیف ہے۔ اس کتاب میں سرسید کی ابتدائی زندگی۔ ان کی
ان کے تعلقات۔ ان کے احباب اور طریقہ تالیف و تصنیف کے تفصیلی واقعات درج کئے گئے ہیں۔ یہ
ذہنی۔ دماغی اور ارتقائی کیفیات کی عکاسی کرتی ہے یہ سیرت نگاری کے مغربی طرز پر لکھی گئی ہے۔
حالی نے مسلم ایجوکیشن کے جلسوں میں شرکت کی اور نظمیں پڑھیں اور تقریریں کیں۔ سرسید کے اخ
الاخلاق" میں آپ کے اصلاحی مضامین شائع ہوتے تھے اس کے علاوہ دوسرے رسائل میں بھی حالی کے م
شائع ہوتے تھے۔ یہ تمام مضامین مقالات حالی کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔
حالی کی کاوشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ جدید شعر و سخن کا چرچا ملک میں پھیل گیا تھا عوام و خواص جدید ط
شعر کو پسند کرنے لگے تھے اور اس عصر کے شعراء کے لئے جدید عمارت تیار مل گئی اور پہلا اہر بوتنگ کا دور
گزر جانے کی وجہ سے شعراء کو کسی خاص رنگ میں پڑھنے کا موقع مل گیا۔
جدید اردو شاعری کے اس لہجے کی پرورش رومانی دور نے کی۔ یہ جذبہ کبھی اقبال کو مرد موم
خواب دکھاتا ہے۔ کبھی جوش کو فطرت پرستی اور انقلاب پر اکساتا ہے اور کبھی حفیظ کو تیرہ سو سال پرانی عظ
طرف کھینچ کرلے جاتا ہے۔
حالی نے جو کچھ سیکھا اپنے تجربات کی بناء پر سیکھا۔ حالی کی پشیمانی کی داستان انھیں کے الفاظ
"البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنو
وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ باد
پر آئے تو غم کے خم لنڈھا دیئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے ۔۔ کفر سے مانوس رہے۔ ایمان سے بیزار رہے
کعبہ و مسجد کی توہین کی ... خدا سے شوخیاں کیں نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ بیس برس کی عمر سے چالیس تک
کے بیل کی طرح دس گز زمین پر پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہان طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھولیں تو
ہوا کہ جہاں سے چلے تھے ابتک وہیں ہیں۔ حالی کو ان حالات نے مجبور کیا کہ وہ اردو شاعری میں نئے ع
ضرب کاری لگائیں۔

حالی ادب برائے ادب یا ادب برائے تفریح کے نظریہ سے بیگانہ ہو کر ادب برائے زندگی کے نظریہ کے حا
وہ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ اخلاق کی خاطر، زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر اور عظمت
کی خاطر چاہتے تھے۔ حالی کا عزم ادب کو عوام یعنی زندگی کی رگ جان کے قریب لانا تھا۔
حالی کے زمانے میں ہندوستان کی معاشرت اور تمدن انتہائی تنزل کے دور سے گزر ر

لذت پرستی" اور تحرک دنیا" عوام کے دونوں انفرادی پہلو شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ شاعر حقیقت کی تلخیوں سے گھبرا کر اپنے خیالی قلعوں میں محصور تھے۔ ان حالات میں حالی نے رفارمر کا کام کیا جس کو عبدالاحد خاں خلیل اپنے الفاظ میں اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

" حالی نے مروجہ خیالات سے اکتا کر نیز انکو رفتہ رفتہ سمجھکر غزل میں نیا انداز عشق و محبت اپنا ماحول فطرت، نیچرل شاعری سے رغبت۔ نیا اندازِ فکر اور نیا طرز سخن ایجاد کیا اور غزل کے مزاج میں مصلحانہ ڈھنگ سے ایسی تبدیلیاں کردیں کہ اس کی مقبولیت کو صدیوں کے لئے محفوظ کر دیا (اُردو غزل کے پچاس سال ص ۱۶۳)

حالی نے شاعری کے مواد پر بہت زور دیا ہے ان کے خیال میں اسلوب بیان ثانوی چیز ہے حقیقت بھی یہ ہے کہ اول شئے مواد ہے۔ اس میں جتنی تازگی جتنی جان اور جتنی توانائی ہوگی اتنی ہی کامیابی حاصل ہوگی۔ سانچہ صرف ایک ذریعہ ہے اور ذریعہ کبھی اصل مقصد نہیں بن سکتا۔ زندگی کے خزانے سے ہر شاعر اپنی جیب و بھرتا ہے لیکن زندگی کو سمجھنے اور اس کو شعر و سخن کے کام میں لانے کی صلاحیت ہر شاعر میں نہیں ہوتی۔ شاعر اپنے فن کا سہارا لیکر الفاظ کے پردے میں مصوری کرتا ہے۔

حالی کے خیال کے مطابق شعر کی اصلی خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو اور معین سانچہ میں ڈھلا ہو اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی پائے جائے تو بہتر ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں حالی نے شاعری کی عام خصوصیات پر زور نہ دیکر سوز و گداز پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں حالی کے نمونہ کے اشعار پیش خدمت ہیں ۔

اے شعرِ دلفریب نہ ہو تو غم نہیں — پر حیف تجھ پہ جو نہ ہو دل گداز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجئے نماز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

حالی نے اردو شاعری اور ادب کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور انھوں نے عشقیہ شاعری خاص طور سے غزل پر سخت حملہ کیا انکا کہنا تھا صحیح تغزل کی روح جذبات و واردات ہیں جو کیفیت ہم پر طاری ہو اور جو واقعات و مشاہدات پیش آئیں وہی ہماری غزل کا اصل موضوع ہیں" غالب نے کہا ہی تھا ۔

"بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

اس میں شک نہیں غزل کا دامن تنگ ہے۔ کیونکہ یہ ایک سلسل بیان نہیں اور اس میں کوئی خاص مضمون آسانی سے رقم نہیں کیا جاسکتا۔ غزل کی بے ربطی مسلّم ہے اور اسی بے ربطی کی وجہ سے غزل مغربی ادب میں مقبول نہ ہوسکی حالی نے غزل پر بہت اعتراضات کئے کچھ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

۱۔ غزل میں رزمیہ شاعری کا وجود نہیں۔

۲۔ غزل میں عشق و محبت کے معاملات کا مسلسل بیان نہیں۔

۳۔ غزل میں گل و بلبل، شمع و پروانہ، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں کے علاوہ کیا رکھا ہے۔

۴۔ غزل میں ہندوستانی عناصر کی کمی ہے اور اس میں غیر ملکی تلمیحات اور غیر ملکی الفاظ کی بھرمار ہے۔

۵۔ اردو غزل ہماری زندگی کے واقعات و سانحات کے مطابق نہیں۔

۶۔ غزل گو شعراء پرانے شعراء کی نقالی کرتے ہیں۔

۷۔ اردو غزل کے عروض و قافیہ کے اصول اتنے مشکل ہیں کہ مفہوم کھو جاتا ہے اور غزل الفاظ کا شعبدہ بن کر رہ جاتی ہے۔

حالی غزل کو انسانی زندگی کے مطابق اور روزانہ کے واقعات کے قریب لانا چاہتے تھے۔ انھیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات سے وابستہ ہے اور عشق، عقل اور اخلاق خراب کرنے والی چیز ہے۔

تنقید کے میدان میں حالی نے محسوس کیا کہ ہماری شاعری صحیح راستے پر نہیں چل رہی ہے۔ اس میں تصنع، تکلف، مبالغہ، استعاروں اور تشبیہوں کا زور ہے۔ تمام قوت لفظی اور ظاہری صناعیوں پر صرف کی ہے۔ زندگی سے ہمارے شعر و ادب کا کوئی رابطہ نہیں۔ حالی نے جدید شاعری اور جدید غزل کے لئے ضروری سمجھا کہ نئے مضامین تلاش کئے جائیں۔ غزل کے دائرہ کو جدید خیالات کے اظہار کے لئے تنگ پایا اور رباعی، قطعات پر زیادہ توجہ دی۔ وہ چاہتے تھے برسات، جاڑے اور گرمی کی بہاریں، دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کے خوش نما مناظر کو شاعری میں داخل کیا جائے۔ بیانیہ، تاریخی، اخلاقی، پولیٹیکل نظمیں شامل کی جائیں، جذبات انسانی اور کیفیات قلبی کو نہایت پر اثر الفاظ میں بیان کیا جائے۔

حالی کا سب سے بڑا کارنامہ غزل کو نظم کی طرف موڑ دینا تھا اور آج ترقی پسند ادب کے سائے میں نظم کا پودا اپنی خوراک غزل سے لیکر کھلی اور صاف ہوا میں نشو و نما پا رہا ہے اور آج کے ادب کا مستقبل نظم سے وابستہ ہے۔ آج کا شاعر نظم کی طرف زیادہ بڑھتا نظر آرہا ہے۔ پرانے شعراء میں جوش اب بھی نظم کہہ رہے ہیں۔ نئے شعراء میں فیض، جاں نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، معین احسن جذبی، ارشس صدیقی وغیرہ کا شعری سرمایہ نظم ہی میں ہے۔ انقلابی شاعری کو سردار جعفری نے ایک نئے رخ سے پیش کیا۔ انھوں نے سائنٹیفک اور سیاسی نظریوں ہی کو نہیں بلکہ وقتی موضوعات کو شاعرانہ وقار اور فنی ابدیت بخشی۔

حالی کا شعور ایک ترقی پسند انسان کا شعور تھا وہ سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانا چاہتے

بین الاقوامی رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی تعلیم سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور تصور کی دنیا سے نکل کر عمل کی دنیا میں آنا چاہتے تھے۔

حالی کے یہاں ہم کو وہ دیدہ زیبی نہیں ملتی جس کی توقع عہد حاضر کے نقاد سے کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ اپنی صفات کے لحاظ سے اردو کے کسی بھی بڑے نقاد سے بڑے ہیں۔ حالی کے فن کا جائزہ اور ان کے مرتبہ کا تعین ان کے عہد اور اس کے مخصوص حالات اور مسائل و وسائل کو نظر انداز کر کے ممکن نہیں ہے۔ آج تنقید کے جدید اصول مرتب ہو چکے ہیں پھر بھی حالی کا بتایا ہوا راستہ مستحکم ہے۔ آسکر وائلڈ کہتا ہے "اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دے دو"

حالی کا فن در اصل نقاب ہی ہے۔ انھوں نے پردے میں وہ کام کیا ہے جو شاید کھلم کھلا ممکن نہ تھا۔ سر سید پر کفر کا فتویٰ لگ گیا تھا اور اسی راہ سے حالی خراج تحسین وصول کرتے ہوئے گزر گئے۔

حالی نے ترقی پسند ادب کا پس منظر تیار کیا۔ ترقی پسند ادب قدیم ادب کو مٹانا نہیں چاہتا اور نہ اس کی اہمیت سے انکار کرتا ہے بلکہ ایسے نتائج اور نصائح اخذ کرتا ہے جس سے انسانیت کا راستہ ہموار ہو سکے زندگی اور ادب کا تعلق روز روشن کی طرح ثابت ہے۔ ادب خلا میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ زندگی کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے آغوش میں پلتا اور پروان چڑھتا ہے۔ زندگی کے ساتھ ادب بھی بدلتا رہتا ہے۔ زمانہ کے ردو بدل نے زندگی کے پرانے معیاروں پر نظر ثانی کی ضرورت ناقابل انکار طور پر ثابت کر دی ہے۔ رواں دواں زندگی ہمیشہ نئے مسئلے پیدا کرتی رہتی ہے اور یہی ادب میں تبدیلی کی محرک ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادب کو اتنا ہی وسیع ہونا چاہیئے جتنی حیات حاضرہ وسیع ہے اور صرف حال ہی سے بحث نہ کر کے مستقبل کی عکاسی کرنا چاہیئے۔

حالی مصلح قوم اور واعظ شاعر کے ساتھ ساتھ اردو ادب اور مزاج شعر و سخن میں تغیر کے علمبردار بھی ہیں۔ انھوں نے غزل کو نظم کی طرف راغب کر کے نیچرل اور واقعاتی شاعری کی بنیادیں مستحکم کیں اور غزل کی خامیوں کو دور کرتے ہوئے ترقی پسند ادب کا پس منظر تیار کیا ادب کو خانقاہ اور دربار سے نکال کر کوچوں بازاروں۔ دفتروں۔ تعلیم گاہوں اور عوام کے گھروں تک پہنچایا۔ حالی تنقید کے نقاش اول ہیں انکی تنقید کی بنیادوں پر عہد حاضر کی تنقید جدید کا انحصار ہے۔ حالی کی ادبی اصلاح آج جدیدیت کی تحریک میں تبدیل ہو چکی ہے اور ادب اور زندگی دونوں ایک چیز ہو کر رہ گئے ہیں۔

اختر حسین شافی

ای - ایم - فوسٹر

موجودہ دور کا ایک مفکر

ای - ایم - فوسٹر موجودہ دور کے ایک نامور مصنف ہیں جنکی تصانیف دُنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔ ہندوستان سے انکا خاص تعلق رہا ہے کیمبرج سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے یوروپ اور دُنیا کے مختلف ممالک کی سیر کی۔ ہندوستان بھی آئے اور اس ملک سے بہت ہی مرعوب ہوئے۔ انھوں نے PASSAGE TO INDIA لکھی۔ اسی کتاب کی بدولت انھوں نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء میں جب فوسٹر ہندوستان آئے تو انھوں نے ہندوستان کی ادبی دُنیا پر ایک تبصرہ کیا جو مغربی دُنیا کا ہندوستانی ادب پر سب سے پہلا قابل ذکر تبصرہ سمجھا جاتا ہے۔ ہندوستان کے دو شاعر سے وہ بہت مرعوب ہوئے تھے۔ وہ دو شاعر بنگلہ زبان کے ٹیگور اور اُردو کے مشہور شاعر ڈاکٹر اقبال ہیں۔ برتری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے مضمون INDIA AGAIN میں یہ کہا ہے کہ ان دو شاعروں کے انتقال سے ہندوستانی ادب غریب ہو گیا ہے اور اب تک کوئی ایسا ادیب پیدا نہیں ہوا۔ جو ان دونوں کا ہم پایہ ہو۔ فوسٹر کا ہندوستان سے کچھ ایسا تعلق رہا کہ انکے زیر اثر کئی ہندوستانی مصنف بھی ہو گئے۔

آج سے دو سال قبل جون ۱۹۷۰ء کو موصوف کا انتقال ہو گیا ۲۶ (چھبیس) سال پہلے ہندوستان اور اسکے ادب کے بارے میں انھوں نے جو جو باتیں کہی ہیں وہ آج بھی کم و بیش صادق آتی ہیں۔ ایسی صورت میں فوسٹر کے بارے میں واقفیت کو ضروری سمجھنا بیجا نہیں ہو گا۔

(الف) فوسٹر کا عالم داخلی :—

کسی مصنف پر تبصرہ کرتے ہوئے فوسٹر نے کہا تھا کہ "وہ اعلیٰ خیال ہوں یا نہ ہوں آزاد خیال فرد ہیں اور آزاد خیالی اتنی ہی کمیاب شئے ہے جتنی اعلیٰ خیالی بلکہ موجودہ حالات کے پس منظر میں زیادہ قیمتی بھی ہے" یہ بات خود فوسٹر پر بھی صادق آتی ہے۔

فوسٹر ایک آزاد خیال اور کھلے دماغ کے انسان تھے۔ ایسا دماغ جو زندگی اور زندگی کے تمام پہلوؤں سے آگاہ تھا۔ وہ انسانی امکانات سے واقف ہی نہ تھے بلکہ مطمئن بھی تھے۔ انسانی کمزوریوں کی پوری واقفیت

یا موجودہ انسان سے ناخوش نہ تھے۔ سارے زمانے کو حیرت ہوئی جب فوسٹر نے اپنے بڑھاپے میں عدالت پر کھڑے ہو کر ڈی۔ ایچ لارنس (D-H-LAWRENCE) کی کتاب LADY CHATTERLEY'S LOVER کی سفارش کی۔ انسانی کمزوریوں سے متعلق انھوں نے معذرت آمیز لہجہ بھی اختیار نہیں کیا۔ زندگی کی نسبت انکا نظریہ منفی نہیں۔ ہمیشہ مثبت ہی رہا۔ اس کے بارے میں LIONEL TRILLING نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ

"فوسٹر ایک کمیاب انسانی وجود ہے' ایک فطرت پرست
جسکی فطرت پرستی مثبت اور والہانہ ہے"۔

الغرض انسانی زندگی سے انکی دلچسپی بہت گہری اور پرجوش تھی۔ اس دلچسپی میں ایک قابل غور بات پائی جاتی ہے۔ جسکو PETER BURRA نے یوں بیان کیا ہے۔

فوسٹر کا سروکار تصورِ انسانی (IDEA OF MAN) سے نہیں بلکہ انسان کی حقیقی زندہ ذات (ACTUAL LIVING SELF) سے ہے"۔

انسان کی زندہ ذات کی طرف یہ رجحان ایک جدید رجحان ہے اس رجحان کا ذکر کرتے ہوئے۔ PETER BURRA نے لکھا ہے کہ موجودہ ترقیاتی تہذیب میں دیگر ترقی پسندوں کی طرح فوسٹر کا مقصد عین اُس فرق کو دکھانا ہے جو آرٹسٹ کی پیش کردہ زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان رہتی ہے۔ آرٹسٹ کی پیش کردہ زندگی زیادہ معین (DEFINITE) اور صاف ستھری (NEAT) ہوتی ہے۔ جبکہ حقیقت کچھ منتشر اور پراگندہ ہوتی ہے۔ کیونکہ زندگی کو پیش کرتے وقت ایک آرٹسٹ تمام باتوں کو سامنے رکھکر کچھ باتوں کو نظر انداز کرتا ہے اور کچھ انتخاب کرتا ہے اور کچھ ایسی بھی باتیں ہوتی ہیں جسے وہ اپنی طرف سے ایجاد کرتا ہے۔ تب جاکر ایک صاف اور خوبصورت آرٹ متشکل ہوتا ہے۔ آرٹسٹ کے اس قطع برید کے سبب اس کی پیش کردہ زندگی اور حقیقی زندگی میں فرق پیدا ہونے لگتا ہے۔ اس طرح ادبی دُنیا کے حقیقی دُنیا سے دور ہونے کو تجرید (ABSTRACTION) کہتے ہیں۔ ہر آرٹ میں تجرید کا داخلہ اسی روپ میں ہوتا رہتا ہے۔ تمام اصنافِ ادب میں ناول میں سب سے کم تجرید پائی جاتی ہے۔ اسی لئے ناول بہ نسبت ڈراما اور شاعری کے حقیقی زندگی سے زیادہ قریب ہے اور یہی سبب ہے کہ فوسٹر نے ناول کو اپنایا۔ لیکن ناول کے فورم (FORM) کو انھوں نے غیر معمولی آزادی اور ڈھیلاپن دیکر اسے حقیقی زندگی سے اور قریب کرنے کی کوشش کی ہے۔ انکی کتاب PASSAGE TO INDIA اور سمرسیٹ ام کی کتاب THE RAZER'S EDGE پڑھنے سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ناول کے فورم کو ڈھیلا بناکر اسے کیسے زندگی کے قریب لایا جاسکتا ہے۔ اِن کتابوں میں زندگی اور فطرت کا مشاہدہ کچھ ایسا خارجی OBJECTIVE

اور براہِ راست (DIRECT) ہے اس کے کردار اتنے ہی غیر واضح اور نامکمل نظر آتے ہیں جتنا کہ ہمارا کوئی زندہ
ساتھی ہمیں نظر آئے۔ لیکن پھر بھی کردار کی اصلیت کو سمجھنے میں فورسٹر چنداں ناکام نہیں رہا ہے۔ کیونکہ ایسی باتوں کی
پیش کشی کیلئے انکے پاس ایک خاص ٹکنک تھی۔ دنیا اور حقیقی زندگی کے تمام معاملوں کو سمجھنے کے لئے فورسٹر نے اس
عجیب ٹکنک کا سہارا لیا ہے۔ وہ کسی چیز کو سمجھنے کے لئے اس چیز کو انفرادی طور سے بیان نہیں کرتے بلکہ اس چیز کا
جن جن چیزوں سے تصادم ہے اسی تصادم کو پیش کرکے اسے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے
جو بات ان کے لئے پرکشش اور مرعوب کن ہے وہ انسانیت کی برتری نہیں بلکہ اسکی پیچیدگی (COMPLEXITY)
ہے۔ اس کش مکش اور تصادم سے اور ایک نیک اور اچھی زندگی بسر کرنے کے لئے جو خطرات ہیں ان سے واقفیت
بھی ہی فورسٹر کی اخلاقی حقیقت (MORAL REALISM) مبنی ہے فورسٹر کش مکش اور تصادم۔ COMPLEXITY
(AND CONTRADICTION-) کو شدت کے ساتھ کھلم کھلا اسی طرح پیش کرتے ہیں کہ کبھی کبھی وہ بھڑک کر جذباتی
اور پرجوش ڈراما (MELO DRAMA) یا جسمانی تشدد (PHYSICAL VIOLENCE) کا روپ دھار لیتے ہیں۔
لیکن فورسٹر کے یہاں زندگی اور زمانے کی تمام الجھنیں اور کش مکش المیہ کے روپ میں نہیں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے
ان چیزوں کو دیکھتے اور بیان کرتے وقت ان کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ وہ پریشان نہیں ہوتے بلکہ پرسکون رہتے ہیں
یہ ایک عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ اسی بات کو پیش کرتے ہوئے LIONEL TRILLING نے
اپنی کتاب FORSTER OF LIBERAL IMAGINATION میں یہ بتایا ہے کہ کش مکش اور تصادم کو پیش
کرتے وقت فورسٹر صرف مزاحیہ (COMIC) نہیں بلکہ کھلنڈرے (PLAYFUL) بھی نظر آتے ہیں۔ PASSAGE TO INDIA
کا تبصرہ کرتے ہوئے TRILLING نے کہا ہے کہ "یہ کتاب فورسٹر کی روایت کے عین مطابق ہے۔
اور وہ اس میں بالکل آسودہ نظر آتے ہیں" اس رائے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک دوسرے نقاد (D.F. -
ENRIGHT نے اپنی کتاب THE LIGHT HOUSE OR TO INDIA میں یہ بتایا ہے کہ لفظ آسودہ
(COMFORTABLE) کسی صورت میں بھی PASSAGE TO INDIA جیسی کتاب کے بارے میں استعمال نہیں
کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس کتاب نے ہندوستانیوں اور فرنگیوں دونوں کو ناخوش کیا۔ البتہ اسے اگر ہندوستانی
اور فرنگیوں کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ناخوش کن ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے فورسٹر کے سطحِ نظر سے
دیکھا جائے تو بات دوسری ہوگی۔ فورسٹر نے دیکھا کہ ہندوستان انگلستان کی طرح ایک مکمل وحدت (NEAT UNIT)
نہیں ہے بلکہ مختلف قوموں، مذہبوں اور تہذیبوں کا ایک جم غفیر ہے۔ اس لئے انھوں نے ہندوستانی زندگی کی پیچیدگیوں
کو دیکھ کر یہ کہا کہ یہ ملک گویا کائنات کا آئینہ ہے (IT MIRRORS THE UNIVERSE) اور اپنے اہم موضوع
کو پیش کرنے کے لئے اسی ملک کو انتخاب کیا وہ موضوع افتراق (SEPARATENESS) ہے۔ فرقہ فرقہ میں افتراق

زبان زبان میں افتراق اور مذہب مذہب میں افتراق PASSAGE TO INDIA میں انھوں نے پہلے ہندوستانیوں اور فرنگیوں کے درمیاں کشیدگی کو پیش کیا ہے۔ پھر ہندوستانیوں میں ہندو اور مسلمان کے اختلاف کو اُجاگر کیا ہے۔ پھر ہندوؤں کے اندر بھی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان کے تناؤ کو پیش کیا ہے۔ فورسٹر ان تمام اختلافات اور تصادم کو دیکھکر پریشان نہیں ہوتے اور انہیں چھپانا بھی نہیں چاہتے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ تمام اختلافات کو صاف صاف دیکھنا اور سمجھنا وسیع النظری کا ایک لازمی مرحلہ تصور کرتے ہیں۔

فورسٹر کا اسطرح انسان کی ظاہری اور باطنی کش مکش کو بغیر کسی پریشانی کے مسکراتے ہوئے پرسکون انداز سے پیش کرنا انگریزی نقادوں کے لئے ایک معمہ بن گیا۔ GERTRUDE M-WHITE کے خیال میں فورسٹر کے پاس وہی شگفتہ خیالی (OPTIMISM) پائی جاتی ہے جو ہیگل (HEGEL) کے تھیسس (THESIS) اینٹی تھیسس (ANTI THESIS) اور سنتھیسس (SYNTHESIS) کے فلسفے میں موجود ہے۔ ہیگل (HEGEL) کے اصول کے مطابق تصادم یا تناؤ دراصل ترقی کے آثار ہیں۔ لیکن دوسرے نقاد GLEN O. ALEN نے اپنی کتاب "STRUCTURE, SYMBOL AND THEME IN FORSTER'S PASSAGE TO INDIA" میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہیگل (HEGEL) کی شگفتہ خیالی اور فورسٹر کے آسودہ سکون (COMFORTABLE QUIETNESS) میں بہت فرق ہے اور اُن میں کوئی مشابہت نہیں۔ فورسٹر کے اندر تضاد کا جو پرسکون مشاہدہ ہے۔ اسکا سبب کچھ اور ہے۔

فورسٹر کا مزاحیہ انداز یا پرسکون مشاہدہ دراصل اس کی آزاد خیالی اور ترقی پسندی (LIBERALISM) پر مبنی ہے وہ کسی چیز کے مطلق اور قطعی ہونے پر یقین نہیں کرتا۔ اس لئے اسکی پرواز افلاطون کی پرواز سے جدا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف خیالات اور جذبات کے درمیان رہ کر اُن میں سے کسی ایک پر یقین و ایمان نہ لاکر دونوں جانب مشکوک نظروں سے مسکراتا ہوا دیکھتا ہے۔ اسی صورتِ حال کو LIONEL TRILLING نے یوں بیان کیا ہے:

> "وہ ایک فصیل پر کھڑا ہو کر دونوں جانب مشکوک نگاہوں
> سے دیکھتا ہے"۔

اسی لئے انکے اندر وہ تلخی نہیں پائی جاتی جو مخالف فریقین کے اندر ہوتی ہے۔ فورسٹر کے خیال میں کسی چیز کو مطلق مان کر اسے اپنا یقین اور ایمان بنا لینا گویا دماغ کو بند کر دینا ہے۔ اسلئے انکا عیسائی مذہب کی روحانی احیاءِ نو کی قوت (REGENERATIVE POWER) پر بھی ایمان و ایقان نہیں تھا۔ خود کو ایک فطرت پرست (NATURALIST) اور انسان دوست (HUMANIST) قرار دیکر انھوں نے یہ اعلان کیا۔

"میرے قانون ساز نہ تو موسیٰ ہیں نہ سینٹ پال بلکہ وہ ایراسمس (ERASMUS)
اور مونٹینگ (MONTANGUE) ہیں"۔

یہی آزاد خیالی فورسٹر کے تمام تضادات کے مزاحیہ نظریئے (COMIC VISION) کا سنگ بنیاد
ARNOLED KETTLE نے اپنی مشہور کتاب INTRODUCTION TO THE ENGLISH NOVEL
میں ٹھیک ہی کہا ہے کہ جو کوئی بھی فورسٹر پر تبصرہ کریگا وہ آزاد خیالی (LIBERALISM) پر بحث کرے گا

اس آزاد خیالی کے علاوہ ایک دوسری بات جو فورسٹر میں پائی جاتی ہے وہ اسکی انفرادیت پسندی
فورسٹر نے خود اپنی کتاب ARBINGER HARVEST میں یہ اعلان کیا ہے "میں ایک آزاد خیال (LIBERAL) ہوں اور انفرادیت پسند ہوں اسلئے میں کسی چیز پر یقین و ایمان نہیں لیکن اگر کسی چیز پر ایمان ہے تو وہ ہے فرد اور فرد کے ذاتی تعلقات VIRGINA WOLF کی طرح فورسٹر بھی ذاتی تعلقات کو اہم قرار دیتے ہیں۔ اگر کسی فرد کی دوستی یا محبت حکومت کی وفاداری سے ٹکرائے تو فورسٹر نے حکومت کو ترجیح دی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ڈینٹے (DANTE) کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ بروٹس اور کیسیس (CASIUS) نے چونکہ اپنے دوست قیصر (CEASER) کو ٹھکرا دیا۔ اسلیئے ڈینٹے نے انہیں جہنم کے سب سے نچلے درجے میں جگہ دی ہے۔

اگرچہ فورسٹر نے فرد کو اہمیت دی ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ اُسے انفرادیت پرستی کا اتنا جو عیش پرست ابیقوریوں (EPICURIANS) اور عالم بیزار CYMES میں پائی جاتی ہے ان دونوں نے بخلاف افلاطون اور ارسطو حکومت کے بجائے فرد کو اہم قرار دیا تھا۔ ان جماعتوں کے مطابق فرد حکومت (STATE) پر انحصار نہیں کرتا۔ لیکن فورسٹر کا فرد کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو بذاتِ خود وہ خود کفیل ہے۔ اُسے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سماج (SOCIETY) اور ریاست (STATE) پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ARBINGER HARVEST میں یہ اقرار کرتے ہوئے کہا ہے:

"میں فی الواقع وہی ہوں جو میری پرورش و پرداخت اور
زمانے نے مجھے بنایا۔ ایک بورژوا جو انگلستان کے دستور کا
پابند ہو"۔

یہ خیالات ارسطو کے اس فلسفے کے عین مطابق ہیں جس میں فرد کو ایک سماجی حیوان (ANIMAL) کہا گیا ہے۔ اس طرح فورسٹر فرد کو اہمیت دیتے ہوئے ریاست (STATE) کو بہ نظرِ تحقیر نہیں دیکھتے۔ انھوں نے حکومت میں جو ٹکراؤ کا ذکر کیا ہے وہ ایک ناخوشگوار امکان ہے اور انہیں یہ توقع ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔

(بقیہ صلا)

سید قدرت اللہ

شاہ عبدالحی احقر واعظ بنگلوری

دبستان دکن پر جس قدر تحقیقات کا اضافہ ہو رہا ہے اسی قدر تحقیق طلب موضوعات نادر کتب اور ادبی شخصیتیں ابھرتی چلی آرہی ہیں۔

ان ادبی شخصیتوں میں ریاست میسور کے شاہ عبدالحی احقر واعظ بنگلوری بھی ایک موقر اور قابل قدر ادیب گذرے ہیں جنھوں نے اپنے عہد میں زبان و مذہب کی بے حد خدمت کی ہے بالخصوص صاحب موصوف کی جنان السیر محتاج تعارف نہیں ہے۔ ریاست میسور میں اس کتاب کی شہرت عدیم المثال ہے گذشتہ صدی کے اواخر سے میسور، تامل ناڈ اور آندھرا پردیش سے اسکی بے شمار اشاعتوں کا سلسلہ چل رہا ہے اور آج کل بھی یہ کتاب تقریباً ہر دوسرے سال طبع ہو کر ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہو رہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعتوں کا شمار بھی ایک تحقیق طلب امر ہے۔

ادبی دنیا کی کرشمہ سازی کہئے یا بازیگری کہ شہرت کبھی مصنف کی شیدا ہوجاتی ہے اور کبھی تصنیف کی عاشق۔ اشاعت کی دکنی دنیا میں شاہ عبدالحی احقر کے بجائے انکی تصنیف جنان السیر کا طوطی بول رہا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ریاست میسور کے تقریباً ہر مسلم گھر میں تلاوت قرآن کے بعد خصوصاً جنان السیر کی تعلیم بھی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور قدر و منزلت کے سلسلہ میں اس واقعہ کا اظہار بے سود نہ ہوگا کہ کسی لڑکی کے رشتہ یا منگنی کے دوران تعلیمی قابلیت معلوم کرتے ہوئے یہ بھی دریافت کیا جاتا ہے کہ سیر شریف کی تعلیم بھی ہوئی ہے کہ نہیں۔ (قرآن مجید کو کلام شریف اور جنان السیر کو سیر شریف کہنا ریاست میسور کا روز مرہ ہے) مدت مدید سے آج تک اس کتاب کا تقدس اسی طرح قائم ہے اسکے علاوہ سال بھر جنان السیر کی تکمیلی یا توضیحی مجالس کا انعقاد بھی ہوا کرتا ہے اور بالخصوص ماہ ربیع اول میں آج بھی یہ کتاب میلاد گھروں اور مساجد میں بے حد شوق و ذوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہے۔

جنان السیر کا سدا بہار گلشن بنے ایک صدی سے طویل مدت بیت گئی ہے اسکی عمر کی درازی کے ساتھ اسکی وسعت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور بقول مولانا میر محمود حسین لکچرار فارسی جامعہ میسور جب تک اردو بولنے والے باقی رہیں گے۔ جنان السیر کے چمنوں پر کبھی خزاں نہ آنے پائیگی انشاءاللہ۔

جنان السیر اپنے نام کی مناسبت سے بارہ چمن پر مشتمل ہے جنمیں حیات طیبہ اور سیرت مطہرہ کے گلہائے صد رنگ کی جلوہ گری ہے اس سدا بہار چمنستان نبوی میں اخلاق سدھار اور سماج سدھار نسیم و شمیم کے جھونکے چل رہے ہیں۔ جنان السیر شاہ عبدالحی بنگلوری کی قوت استدلال، مہارت استنباط اور علمی شوق و ذوق نتیجہ ہے جو بے حد کد و کاوش سے سینچا گیا ہے ہر طرف سادگی شستگی اور شگفتگی کے پھول مہک رہے ہیں

شاہ عبدالحی کی تخلیقات کا دائرہ بہت وسیع ہے انکی ایک تصنیف کا حاشیہ انکی تخلیقات تعداد ۱۰۵ بتاتا ہے۔ شاہ صاحب کے ایک کثیر التصانیف فرزند شاہ عبدالقادر صوفی نے ان کی تعداد ۱۲۰ بتائی ہے۔ ڈاکٹر حبیب النساء نے اپنی کتاب ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما میں سوا سو کا عدد پیش کیا ہے تخلیقات احقر میں اس قسم کی کئی روایتیں ملتی ہیں جنمیں مختلف اعداد پیش کئے گئے ہیں مگر متفق علیہ امر یہ ہے کہ آپ نے خزانۂ اردو میں ایک سو سے زیادہ تصانیف کا اضافہ ضرور کیا ہے۔

راقم الحروف کو شاہ عبدالحی بنگلوری کی تیس تصانیف دیکھنے کا شرف حاصل ہوا ہے اور جملہ ۵۲ کتب کے نام ملے ہیں۔ ان تخلیقات کا شمار اردو کے اسلامی ورثہ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیر و حدیث، فقہ و عقائد، تصوف و مناظرہ، سیرت اور معاشرت وغیرہ ان کتابوں کے موضوعات ہیں ان میں کچھ تو طبعزاد تصنیفات ہیں اور کچھ عربی و فارسی کے ترجمے اور تالیفات۔

شاہ عبدالحی احقر واعظ بنگلوری کے آباء و اجداد کا تعلق دہلی سے ہے جو دکن آنے کے بعد سلطنت خداداد کے مختلف گوشوں میں ممتاز عہدوں پر فائز ہوتے رہے انکے والد ابراہیم بیگ رسالدار ہرو بکرہ (ریاست میسور) زمانے کے ہاتھوں مجروح ہو کر وارد بنگلور ہوئے جہاں ۱۲۳۴ھ میں انکے فرزند بڈھن بیگ پیدا ہوئے جو بعد میں شاہ عبدالحی احقر واعظ بنگلوری کے نام سے آسمان شہرت پر جگمگانے لگے۔ شاہ عبدالحی کو پہلے پہل ہی رئیس العلماء سید شاہ سجاد صاحب شطاری کے دامن فیض رساں میں تربیت کی سعادت ملی۔ شاہ سجاد علوم ظاہری و باطنی سے لیس تھے اور شہر بنگلور کے ممتاز علماء میں بلند مقام کے مالک تھے۔ یہ شاہ سجاد کی فیض رسانی کہیئے یا شاہ عبدالحی کی بلند اقبالی کہ انہیں اپنے وطن مالوف میں ہی علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہونے کا موقع مل گیا۔ آبائی پیشہ کی مناسبت سے آپ کے احباب اکثر فوجی تھے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ آپ کی دینی شخصیت کی شہرت ہو گئی حلقہ احباب وسیع ہو گیا۔ درس و تدریس کا شوق طبعاً موجود تھا۔ استفادہ اور افادہ دونوں دوش بدوش تھے ماہ رمضان میں درس حدیث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ روزہ کی حالت میں عصر کی نماز کے بعد ہر دن پانچ احادیث حفظ کر لیتے تھے۔ ان احادیث کی توضیحات و تشریحات سے اپنا دامن بھر لیتے پھر نماز تراویح کے بعد سامعین کے روبرو ان احادیث کے اسرار و رموز بکھیر دیا کرتے تھے۔ انکا دلکش انداز تخاطب بے حد بھا گیا۔ اب مولوی عبدالحی کے بجائے

مولانا واعظ بنگلوری کے لقب سے مشہور ہوگئے اور یہ درس حدیث سلسلۂ وعظ و نصیحت کا روپ لیکر انکی زندگی کا مقصد بن گیا۔ شہرت انکے قدم چومنے لگی۔ متانت و بردباری اور عجز و انکساری نے انکی جاذبیت اور دلکشی میں چار چاند لگا دیئے۔ علوم باطنی کی ڈھال سے غرور و تکبر کا اثر توڑ دیا ایک پھلدار شاخ کی طرح سرنگوں ہوکر عوام و خواص کو فیض یابی کا موقع فراہم کر دیا۔

شاہ عبدالحی اسقدر پُر دامن ہونے کے باوجود انہیں اپنی تہی دامنی کا احساس ہمیشہ ستاتا رہا۔ تشنگان رشد و ہدایت کو سیراب کرتے ہوئے خود تشنہ لب ہوگئے۔ آخر اسی اشتیاق علم کے ہاتھوں مجبور ہوکر قطب زماں نقیہ دوراں اعلیٰ حضرت شاہ محی الدین عبداللطیف المعروف بہ قطب ویلور سے کسب فیض کے لئے دار العلوم لطیفیہ ویلور (شمالی ارکاٹ تامل ناڈو) روانہ ہوگئے دار العلوم لطیفیہ اس وقت اہل دل و اہل علم کا مرکز تھا جہاں آپ نے مختلف شیوخ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور تصوف و سلوک کے کئی مراحل طے کئے۔ خود فرماتے ہیں "تیس سال مسلسل آستانۂ لطیفیہ پر جبیں سائی کے بعد وعظ و ارشاد اور فتویٰ کی اجازت حاصل کی تصوف و سلوک کا خرقۂ خلافت بھی ملا" اسکے بعد سید العلماء شاہ عبدالعزیز دہلوی کے چند خلفاء سے بھی فیض یابی کا موقعہ ملا۔ اس طرح جنوب و شمال کے علماء و صوفیاء سے اپنا رشتہ مضبوط کر لینے کے بعد تامل ناڈو میسور اور آندھرا کے دینی ماحول کو ایک نئی زندگی بخشنے میں مشغول ہوگئے چنانچہ آپ کے اساتذۂ کرام کہا کرتے تھے۔ حیّ و قیوم نے شمال میں ایک عبدالحی پیدا کیا تو جنوب میں بھی ایک عبدالحی کو جنم دے کر دین کو حیات تازہ بخشنے کا انتظام فرمادیا۔

شاہ عبدالحی وعظ و نصیحت کی محفلوں کو گرمانے میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے آپ کے وعظ اس قدر پُر مغز اور مؤثر ہوتے تھے کہ سامعین اپنے گناہوں سے توبہ کئے بغیر نہیں اٹھتے تھے۔ بعض شاہدین کا کہنا ہے کہ بعض اوقات رات بھر وعظ ہوتا پھر تہجد کے بعد معصیت اور گناہوں کے داغ صبح کی نماز تک سامعین اپنے آنسوؤں سے دھویا کرتے تھے بعد نماز فجر توبہ و استغفار کے بعد گھر لوٹتے تھے آپ ایک صحیح العقیدہ سنی حنفی عالم تھے بدعات پسند طبقات سے طبعًا متنفر تھے مدراس تنجاور کلونہ پیٹ (رام نگر) اور دھونی وغیرہ مقامات پر بدعات کے خلاف علمی مباحث اور مناظرے بھی ہوئے ہیں جہاں مخالف گروہ سرنگوں ہوکر جاتے تھے۔ آپ کو حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص محبت تھی۔ دربار رسالت میں حاضر ہونے کا شوق جنوں کی حد تک موجود تھا۔ ہر محفل وعظ میں جوار نبوی کو اپنی آخری آرامگاہ بنانے کی تمنا ظاہر کرتے تھے چنانچہ آپ کی تصانیف اور نعتیہ کلام اس پر شاہد ہے۔ اور یہ واقعی رحمت خداوندی تھی کہ آرزو پوری ہوگئی۔ ماہ محرم سنہ ۱۳۰۰ھ میں گنبد خضرا کے زیر سایہ اپنا آخری کاشانہ بنالیا۔

شاہ صاحب وعظ و نصیحت میں ہمہ تن مصروف ہونے کے باوجود لکھنے اور پڑھنے کا بے حد شوق رکھتے تھے ہر دن چند لمحات ہی سہی تحریر کے لئے مقرر کر رکھے تھے آپ کا ذوق تحریر بھی اس قدر عام تھا کہ لوگ مختلف کتب لکھنے کی فرمائش کرتے۔ یہی وجہ بعض اوقات شدت اصرار سے ایک کتاب کی تکمیل سے پہلے چند رسائل تصنیف فرما دیا کرتے تھے بقول شاہ صاحب تحریرات کی شہرت برما اور رنگون سے لار تک پھیلی ہوئی۔

آپ کی تخلیقات نظم و نثر دونوں میں موجود ہیں ترجمہ کے میدان میں کسی نثر کو نظم یا تو کسی نظم کو نثر میں پیش کیا۔ آپ کی منظومات مثنوی کی حد میں آجاتی ہیں۔ سلیس اور چھوٹی بحر میں ادق گھاٹیوں سے دامن بچا کر اظہار خیال کیا ہے۔ مثنوی کے علاوہ نعت قصیدہ منقبت اور غزل نما قصیدہ کی سرخیاں بھی انکی تصنیفات میں مل جاتی ہیں۔ اظہار خیال میں استنباطی نقطۂ نظر سے کام لیا ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا نہایت گیرائی اور گہرائی سے کام لیا ہے۔ روایات کی جستجو اور ترتیب سے آپ کے حسن استدلال اور علمی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ اکثر و بیشتر اپنے ماخوذات کی نشاندہی بھی کرجاتے ہیں آپ کی روایات معرض اعتراضات بن جاتی تھیں مگر موجودہ ترجمان السنہ مولفہ مولانا بدر عالم کی روایات سے ان شبہات کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

نثر میں سادہ نگاری کو اپنایا ہے۔ سرخیاں اور عنوانات مقفی اور مسجع نظر آتی ہیں۔ مگر عبارت بالکل سادہ اور صاف ہے۔ اکثر چھوٹے چھوٹے جملوں سے مافی الضمیر کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ کی نثر دکنی اردو کا بہترین نمونہ ہے دکنی خصوصیات کے ساتھ ساتھ زبان پر میسور کی چھاپ بے حد ہے۔

خصوصیات دکنی میں سے الفاظ کا گڈ مڈ اور ہ کا ادخال واخراج' الف اور لن سے جمع' نے کا غلط اور صحیح استعمال۔ فارسی اور صوبائی زبان کا ہو بہو ترجمہ وغیرہ ان کی تخلیقات سے نمایاں ہو رہی ہیں۔

آپ کی تصنیفات و تراجم سے زمانے کے کردار اور عقائد رسوم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔ آپ کی تخلیقات سے جہاں لسانیات کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ وہیں اسلامی تاریخ تمدن کے خاکے بھی مل جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کی تصنیفات سے حاصل شدہ ان کی اپنی تصانیف کی ایک فہرست پیش ہے۔

(۱) ترجمہ زاد الاخرت
(۲) ترجمہ تاریخ الخلفاء
(۳) ترجمہ حقیقت الاسلام
(۴) تحفۃ المریدین
(۵) تحفۂ طرفین
(۶) تحفۂ قبول در فضائل بتول۔
(۷) تحفۂ بنات در رد بدعات
(۸) ترجمہ شمشیر براں در رد مزامیر شیطان
(۹) تحفۂ مرغوب
(۱۰) تبئین الاسناد فی عمل المیلاد۔

(۱۱) تحقیق المحققین فی میلاد سید المرسلین (۱۲) تحقیق الشفاعت
(۱۳) تنبیہ العوام (۱۴) تنویر العقول فی اثبات اسلام آبائے رسول
(۱۵) تذکرۃ المدخلین (۱۶) جواہر التفسیر
(۱۷) جنان السیر (۱۸) چہار گلشن
(۱۹) حدیقۃ الابرار (۲۰) حدیقۃ الاحباب
(۲۱) حقوق المومنین (۲۲) حسن المقصود فی عمل المولود
(۲۳) خطبات حرمین الشریفین (۲۴) دیوان احقر
(۲۵) دلائل حنیفہ در مذہب ابو حنیفہ (۲۶) دیوان نعت احقر
(۲۷) رد الملحدین (۲۸) رسالہ ذکر حسین
(۲۹) ریاض الازہر (۳۰) روضۃ الابرار
(۳۱) رسالہ مباحث (۳۲) رد بدعات
(۳۳) رد الملحد (۳۴) سر الشہادتین
(۳۵) سیف المسلول فی رد مزامیر و طبول (۳۶) شرح چہل حدیث
(۳۷) عمدۃ النصائح (۳۸) فوائد قدسیہ
(۳۹) فیض الباری شرح صحیح بخاری (۴۰) فلاح کونین
(۴۱) قصائد نعتیہ محمدیہ (۴۲) قرآن السعادین فی حقوق الوالدین
(۴۳) قلوب اصفیاء۔ ترجمہ تذکرۃ الاولیاء (۴۴) کلید معرفت
(۴۵) گلزار شہادت (۴۶) مسلک المریدین
(۴۷) مجموعۂ فتاویٰ (۴۸) مصباح الہدایت ترجمہ شرح سفر السعادت
(۴۹) مطلع النور (۵۰) ملفوظات تطیب و طیور
(۵۱) نصرۃ التوحید (۵۲) یا رؤف یا رحیم

محمد عبداللطیف خاں

پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں

جامعہ عثمانیہ کا معمار

مولوی عبدالرحمن خاں صاحب حیدرآباد کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے جس کو زمانہ صدیا
کے بعد پیدا کرتا ہے۔ ان کی غیر معمولی شخصیت نے سرزمین دکن کو نہ صرف علم کی ضیاء سے منور کیا بلکہ ملک کے ان پو
جواہر پاروں کو جو زمانہ کی بے اعتنائی سے قعر گمنامی پڑے تھے۔ اُفق دکن پر اجاگر کیا۔

خاں صاحب کی زندگی کے حالات قلمبند کرنے کی ضرورت کئی وجوہ سے پیش آئی۔ پہلی اہم وجہ یہ تھی
خاں صاحب نے جس حسن خوبی انہماک اور عرق ریزی کے ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی کی خدمات انجام دیں اس کو سرے سے
بھلا دیا گیا۔ اُردو ذریعہ تعلیم کا یونیورسٹی سطح پر تجربہ ایک نازک اور خطرناک تجربہ تھا لیکن خاں صاحب نے
یونیورسٹی کی شیر خوارگی کے زمانہ میں اسکی وہ پرداخت کی جو دیکھتے دیکھتے ہندوستان کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی
تسلیم کی گئی جس کے تربیت یافتہ طلبار نے نہ صرف یوروپی جامعات میں امتیاز حاصل کیا بلکہ ایک طالب علم
نوبل انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ ملک کا نام روشن کرنیوالے ان طلباء میں یٰسین علی خاں جو خانصاحب کے خاص شاگرد
میں تھے وہ لندن یونیورسٹی کے امتحان انجینیرنگ میں اول آئے۔ اسی طرح دوسرے طالب علم رضی الدین صدیقی
خاں صاحب کے خاص تلامذہ میں تھے۔ اُنھوں نے آئینسٹائن کے "نظریہ اضافیت" پر کام کیا اور ساتھ ساتھ د
اعلیٰ تحقیقات کی بنا پر ان کا نام نوبل پرائز کے مستحق سائنسدانوں کی فہرست میں شریک کیا گیا۔ اسی طرح ایک ا
طالب علم محمد شفیع تھے جن کو خاں صاحب نے خاص طور پر عالمی پیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے حکومت کی
انگلستان روانہ کیا تھا اور جنہوں نے رود بار انگلستان کے مقابلوں میں حصہ لے کر عالمی ریکارڈ قائم کیا۔ خود خا
کے کئی شاگرد یوروپی جامعات سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری پر متعین کئے گئے بعض نے
خاں صاحب کے بعد وائس چانسلری کے عہدہ تک ترقی کی جن میں قابل ذکر ڈاکٹر ست نارائن روڈا، ڈاکٹر بھگونتم
ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے یونیورسٹی کے طالب علم رہ کر بعد میں یونیورسٹی کا سب سے بڑا عہدہ حاصل کیا اور بڑی خوبی
اپنے فرائض انجام دیئے۔ اسی طرح ایک اور شاگرد، محمد علی خاں ہیں جنہوں نے خاں صاحب کی خواہش پر لندن یونیو
بی۔ ایس۔ سی آنرز کامیاب کیا اور خاں صاحب کے بعد میں دوسرے طالب علم ہیں جنہوں نے طبیعات میں لندن یونی
سے پی ایس کی ڈگری لی۔ غرض ایسے واقعات بہت سے ہیں۔ جن کو اختصار کی خاطر نظرانداز کیا جاتا ہے۔

خاں صاحب نے اپنے دس سالہ دور صدارت میں یونیورسٹی کے نام کو بلند کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگ

نہ کیا۔ میں اکثر ان کے پاس رہا کرتا تھا۔ راتوں میں اکثر میں نے دیکھا کہ رات کے گیارہ بجے دوربین ہاتھ میں لئے ستاروں کا معائنہ کرتے اور کچھ نوٹ بھی لکھتے جاتے تھے یہ عمل بعض وقت ڈھائی بجے رات تک ہوتا تھا۔ ایک دن میں نے سوال کر ہی دیا کہ "آپ دن بھر دفتری اور درسی کام کرنے کے بعد رات میں آرام کیوں نہیں لیتے اور یہ اختر شماری کیوں کرتے ہیں؟ تو ہنس کر فرمانے لگے کہ بیٹا! ابھی میری یونیورسٹی گوشہ گمنامی میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کو ساری دنیا سے روشناس کراؤں" میں نے پوچھا کس طرح؟ تو فرمانے لگے "میرے تحقیقاتی مضامین خصوصاً فلکیات سے متعلق دنیا کے معیاری رسالوں میں چھپتے ہیں۔ اور میرے نام کے ساتھ جب پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی لکھا جاتا ہے تو میری یونیورسٹی علمی دنیا میں میرے نام کے ساتھ مشہور ہو جاتی ہے اور اس طرح لوگ جاننے لگتے ہیں کہ عثمانیہ یونیورسٹی بھی ہندوستان میں ایک تعلیمی ادارہ ہے۔ جہاں فلکیاتی تحقیقاتی کام ہوتے ہیں" خاں صاحب کی اسی محنت، مشقت اور ایثار کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے وظیفہ پر سبکدوش ہونے کے بعد یونیورسٹی میں کئی علمی جلسے اور معیاری یادگاری نمائشوں کا اہتمام کیا گیا۔ لیکن ان نمائشوں میں ہم کو خاں صاحب کی تصویر کہیں نظر نہ آئی۔ یونیورسٹی کی ترقی سے متعلق تقریبوں میں کسی وقت بھی خاں صاحب کی کارگذاری کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ البتہ سیاسی لیڈروں کی تصاویر جامعہ عثمانیہ کی نمائشوں کی زینت بنیں جن میں بعض ایسے بھی تھے جن کا تعلق یونیورسٹی سے دور کا بھی نہ تھا۔

حیدرآباد کی علمی دنیا میں جو شمع روشن کی گئی وہ خانصاحب کی بے لوث خدمات سے روشن سے روشن تر ہوتی گئی اور یہ دیا (عثمانیہ یونیورسٹی) جو عالم امید و بیم میں روشن کیا گیا تھا بڑھتے بڑھتے نہ صرف سرزمین دکن کو منور کرتا گیا بلکہ اس کی شعاعیں دور دور تک ملک کے باہر پھیلیں۔ سر سید کی طرح خاں صاحب نے سرزمین دکن خصوصاً حیدرآباد دکن کو زیور علم سے آراستہ کرنے میں بڑی جانفشانی اور خلوص سے کام انجام دیا۔ اسی لئے ان کے علمی کارنامے ملک کے نوجوانوں کے لئے مشعل راہ ہوئے ——— تقریباً آج سے تیس پینتیس سال پہلے میری ایک تالیف کا خاں صاحب نے مطالعہ فرمایا تو کہنے لگے کہ معنوی اولاد حقیقی اولاد سے زیادہ مسرت بخش ہوتی ہے اور اچھی تصانیف نہ صرف ملک کیلئے سودمند ہوتی ہیں بلکہ لوگ مصنف کو ہمیشہ یاد رکھتے، نہیں بھولتے۔ اسی سلسلہ میں فرمایا کہ "میں نے اپنی سوانح عمری لکھ رکھی ہے اور چاہتا ہوں کہ اس کو شائع کردوں" انھوں نے اپنی لائبریری میں سے ایک ٹائپ کی ہوئی فائل لاکر میرے حوالے کی اور کہا کہ "اس کو دیکھ لو بعد میں اس کی طباعت کا انتظام کرینگے" میں اس فائل کو گھر لے آیا اور ایک ہفتہ کے بعد لیجاکر واپس کیا۔ خانصاحب نے جب کتاب کے متعلق پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ ضرور چھپوائیے۔ لیکن۔ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا تو وہ کہنے لگے "چپ کیوں ہوگئے۔ تم اپنی رائے دے سکتے ہو" چونکہ خانصاحب میرے بزرگ تھے اور پھر ایسی غیر معمولی شخصیت کی تصنیف کے متعلق کچھ لکھنا میرے لئے مناسب نہ تھا۔ جب انھوں نے

اصرار کیا تو میں نے کہا کہ کتاب کا طرزِ بیان بدلنا پڑیگا۔ یہ ڈائری (روزنامچہ) کی شکل میں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی پیدائش سے لیکر تقریباً اپنی سرکاری خدمات کی انجام دہی تک یعنی وظیفہ حسن خدمت حاصل کرنے تک کے واقعات قلمبند فرمائیے ہیں لیکن اس کے بعد اس طویل مدت میں جو تصانیف آپ نے لکھی اور شائع ہیں اور آپکے دیگر علمی کارناموں کا تذکرہ اس میں نہیں ہے۔ اس لیئے مناسب ہوگا کہ آپ ان کا اضافہ فرما کر اس کی طباعت کا انتظام فرمائیں اور پیش لفظ یا تعارف نواب سر امین جنگ یا سر نظامت جنگ کا ہو۔ یہ آپ کے عزیز دوست ہیں۔ اور علمی دنیا میں ان دونوں کا پایہ بہت بلند ہے یوں بھی آپ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں لیکن پیش لفظ کے ذریعہ مصنف کو عوام سے حقیقی طور پر متعارف ہونے کا موقع ملتا ہے اور یہ کام وہ خود نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد خانصاحب نے فرمایا کہ مجھے اس تجویز سے اتفاق ہے تم کو اس کام میں میرا ہاتھ بٹانا ہوگا میں نے کہا کہ میں آپ کی خدمت کیلئے تیار ہوں۔ اس کے بعد خانصاحب کچھ دن بیمار ہوگئے اور پیرس یا فرانچرا کی وجہ بستر پر لیٹے رہے اور میں اس علمی خدمت سے محروم رہا۔

چار پانچ مہینوں کے بعد وہ میرے گھر تشریف لائے۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ کتاب میز پر رکھی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے لیکن موڈ بگڑا ہوا تھا۔ کتاب پر جب میری نظر پڑی تو میں نے دیکھا کہ یہ ان کی سوانح عمری ہے۔ میں نے اس کو میز پر سے اُٹھایا تو انھوں نے میرے ہاتھ سے کتاب لے لی اور کہنے لگے " ابھی ابھی مسٹر پلے (جو حیدرآباد کے ناظم دارالطبع تھے اور بعد میں ایک پریس قائم کرلیا تھا) کے پاس سے آرہا ہوں۔ صبح انہوں نے ایک خط بھیجا تھا کہ میں پریس آکر اپنی کتابیں لیجاؤں۔ خط پڑھ کر میں فکر میں پڑ گیا اور سیدھے پریس چلا گیا۔ وہاں جاکر دیکھا کہ ایک کتاب میز پر رکھی ہوئی تھی پلے صاحب نے کتاب دیتے ہوئے کہا آپکے حسب الحکم میں نے آپکی کتاب چھاپ دی اور آپ کو تکلیف اس وجہ سے دی کہ آپ چھپی ہوئی کتابیں ساتھ لیجائیں"۔ خانصاحب نے کہا کہ یہ سن کر مجھے بڑا غصہ آیا اور میں نے پلے صاحب سے پوچھا کہ میں نے کب آپ کو اپنی سوانح عمری چھاپنے کے لئے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ کے ایک عزیز میرے پاس آئے اور آپ کا نام لیکر کہا کہ آپ نے سوانح عمری کا مسودہ طباعت کے لئے روانہ کیا ہے۔ میں نے اپنے قدیم دوست کے حکم کی تعمیل کی اور بلا جھجک اس کو چھاپ دیا۔ کیونکہ میں آپ کے عزیز سے واقف تھا اس موقع پر خانصاحب نے اپنے عزیز کا نام مجھے نہیں بتلایا۔

خانصاحب یہ کہنے کے بعد کرسی سے اُٹھ گئے اور کتاب اپنے ساتھ لیکر سیدھے موٹر کی طرف روانہ ہوگئے میں موٹر تک اُن کو چھوڑنے گیا۔ جب وہ جاچکے تو میں اِس فکر میں تھا کہ یہ کون عزیز ہیں جو اتنی دیدہ دلیری کے ساتھ خانصاحب کی اجازت بغیر ان کی کتاب چھپوائی۔ دوسرے دن خانصاحب دوبارہ تشریف لائے کتاب میز

پر پیش کی اور کہا کہ "اب پڑھو۔ جب میں نے دیباچہ دیکھا تو وہ بجائے مصنف کے ایک دوسرے شخص کا لکھا ہوا تھا۔ جب میں نے خانصاحب سے مزید تفصیلات حاصل کرنے کی کوشش کی تو اُنھوں نے کہا میں خود حیران ہوں کہ اس عزیز کا کیا مقصد تھا؛ خیر اب اس قصّے کو یہیں ختم کرو۔ میں یہ سن کر خاموش ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد خانصاحب نے کتاب کی طباعت کا بل ادا کیا اور تمام جلدیں اپنے کتب خانہ میں محفوظ کر دیں۔ کیونکہ ان کی طبع شدہ سوانح عمری نامکمل اور ناقابل اشاعت تھی اور پھر دیباچہ نے اس کی صورت اور بھی مسخ کر دی تھی۔

خانصاحب کی زندگی کی کہانی میں نے خود ان کی زبانی سنی جب کہ میں میٹرک کی جماعت میں تعلیم پاتا تھا۔ ایک دن میں خانصاحب سے ملنے ان کے مکان پر گیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد مجھے اپنی لائبریری میں لے گئے اور وہاں تقریباً دو ڈھائی گھنٹوں تک گفتگو میں مصروف رہے۔ اور اپنی زندگی کے حالات سنائے آج قارئین سب رس کے مطالعہ کے لیے پیش ہیں۔

خاں صاحب ۵؍ اکتوبر سنہ ۱۸۸۱ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے جد اعلیٰ غزنی (افغانستان) کے باشندہ تھے جو اپنی بزرگی اور مذہبی تبحر کی وجہ سے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس خاندان کے چند افراد بغرض حج غزنی سے نکلے اور ہندوستان آئے اور مدراس کی بندرگاہ سے جدہ روانہ ہوئے۔ بعد فراغت حج ان کے معتقدین نے انھیں مدراس کے ایک علاقہ ارکاٹ میں روک لیا۔ ارکاٹ اُس زمانہ میں ایک مسلم بادشاہ کے زیر نگیں تھا۔ اس خاندان کے لوگ یہیں سکونت پذیر ہوگئے نواب ارکاٹ کی طرف سے اُن لوگوں کو وظائف مقرر کیے گئے لیکن ارکاٹ کے زوال کے بعد خاں صاحب کے دادا اور نانا اُس وقت کی انگریزی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوگئے۔ بعد میں یہ خاندان حیدرآباد منتقل ہوا۔ جہاں اکثر ارکان خاندان فوجی خدمات انجام دیتے رہے۔ خاں صاحب کی ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں جو اُس وقت شہر کا سب سے زیادہ معیاری مدرسہ سمجھا جاتا تھا ہوئی یہاں اعلیٰ عہدہ داروں جاگیرداروں اور شاہی خاندان کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ جس کی وجہ سے ایک شائستہ ماحول اور اچھے اساتذہ سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ خاں صاحب نے اسی مدرسہ سے مدراس میٹرک کا امتحان کامیاب کیا اس کے بعد انٹرمیڈیٹ سائنس کا امتحان اعلیٰ نمبرات سے کامیاب کیا۔ جب آپ بی۔ اے کی تیاری میں مصروف تھے تو آپ کے والد میجر نذر علی خاں صاحب کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کے چچا میجر محمود خاں نے ان کی سرپرستی کی۔ ان کے والد کی خدمات کے صلے میں دو سال تک پچاس روپے وظیفہ تعلیمی ماہانہ مقرر کیا گیا۔ خاں صاحب نے مدراس سے بی۔ اے میں طبیعیات مضمون اختیاری لے کر امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

بعض مضمون نگاروں نے لکھا ہے کہ خانصاحب کے مضامین بی اے میں ہندوستانی اور فارسی تھے یہ
چنانچہ ہندوستانی ادب" آزادی نمبر اگسٹ ۱۹۶۲ء میں ایڈیٹر صاحب نے لکھا ہے کہ خانصاحب نے مدراس یونیو
سے سائنس کے ساتھ انٹر کامیاب کیا مگر بی اے میں ہندوستانی اور فارسی تھے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ شاید ایڈیٹ
غلط معلومات یا غلط فہمی کی بناء پر ایسا تحریر کیا۔ خاں صاحب نے اس زمانہ کے مطابق لازمی زبان جو شریک ا
فارسی کو منتخب کیا۔ کیونکہ ان کو اس زبان سے بڑی وابستگی تھی۔ خانصاحب کا بی اے میں اختیاری مضمو
طبیعات تھا۔

مدراس یونیورسٹی سے ۱۹۱۰ء میں جب خانصاحب نے بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا تو آپ کی اس کا
عزیز رشتہ دار اور دوست احباب نے بڑی خوشیاں منائیں اب ملازمت کا مسئلہ تھا۔ سر جارج کیس وا
وزیر فینانس تھے انھوں نے "مہڑ سٹن" پرنسپل نظام کالج کو لکھا کہ ایک بی اے کامیاب طالب علم جو اردو
کافی مہارت رکھتا ہو روانہ کیا جائے۔ مسٹر سٹن نے خانصاحب کو روانہ کیا اس طرح خانصاحب نے محکمہ فینانس میں ملا
اختیار کی۔ یہاں خاں صاحب کے ذمہ فاکر صاحب کیلئے مقدمات کے خلاصے انگریزی میں لکھنا تھا۔ خانصاحب نے
دن یہ کام کیا۔ اسکے بعد ان کا تقرر نظام کالج میں بحیثیت مددگار لکچرار ہوا اور جب ڈاکٹر اگھورناتھ چٹوپادھیائے (
سروجنی نائیڈو کے والد) وظیفہ پر سبکدوش ہوئے تو ان کی جگہ خاں صاحب لکچرار ہوئے۔ خاں صاحب کی علمی قا
ہر ایک متاثر تھا لیکن اس زمانہ میں بھی سفارش کا بازار گرم تھا اور انہیں سرکاری طور پر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے
بھیجے جانے کے امکانات کم تھے اس لیئے انھوں نے ذاتی اخراجات پر اعلیٰ تعلیم کا قصد کیا اور انگلستان روانہ
۹ر فروری ۱۹۱۱ء کو رائل کالج آف سائنس میں داخلہ لیا۔ وہاں پر پروفیسر ایچ۔ ایل کیلنڈر شعبہ طبیعات کے صد
خاں صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کو دیکھ کر انھوں نے بی ایس سی کے دوسرے سال میں داخلہ دیا اس طرح خاں صاحب کا ا
تعلیمی سال بچ گیا۔

یہ خاں صاحب کی طلب صادق اور خدا کا فضل تھا کہ انھیں انگلستان میں بین الاقوامی شہرت رکھنے
سائنس دانوں سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ ان میں قابل ذکر سر ولیم رمزے تھے جو بعض عناصر مثلاً آرگن نیا
وغیرہ کے محقق کی حیثیت سے سائنس کی دنیا میں بلند مقام رکھتے تھے۔ خاں صاحب نے برق اور علوم بصری کی تعلیم ا
حاصل کی۔ سر ولیم رمزے نے خاں صاحب کا تعارف سر امبروز فلیمنگ سے کروایا۔ یہ لاسلکی میں شہرت یافتہ سائنس د
تھے۔ ان حضرات کے علاوہ خاں صاحب نے اس وقت کے چوٹی کے سائنس دانوں سے اپنے زمانۂ طالب علمی میں غیر معمو
استفادہ کیا اور رائل کالج آف سائنس سے خاں صاحب نے بی ایس سی آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

لندن کے تعلیم کے دوران میں ایک بڑا دلچسپ اور دل افروز واقعہ پیش آیا جس کا ذکر اس لئے ضروری

یہ خاں صاحب کا شخصی اور ان کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے - لندن میں قیام کے دوران میں خاں صاحب کی دوستی ایک ترک خاتون سے ہوگئی جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے لندن آئی ہوئی تھیں۔ اس دوستی نے بڑھتے بڑھتے محبت کا روپ اختیار کر لیا۔ خاں صاحب نے اسکے خاندان میں چند مہینے گذارے اور خاتون کے حسن کردار سے متاثر ہوکر شادی کا پیام دیدیا یہ خاندان بھی خاں صاحب سے زیادہ متاثر تھا۔ اس رشتہ کو ان لوگوں نے قبول کر لیا لیکن شرط یہ لگائی کہ خاں صاحب ترکی کو اپنا وطن بنالیں اور وہیں مستقل طور پر قیام کریں انھوں نے اس واقعہ کی اطلاع حیدرآباد میں اپنے عزیزوں کو دی اور یہاں یہ بات مشہور ہوگئی کہ خاں صاحب حیدرآباد واپس نہیں آئینگے بلکہ ترکی میں مستقل طور پر منتقل ہوجائینگے۔ لیکن خاں صاحب جیسے فرض شناس آدمی نے اپنی خاندانی ذمہ داریوں اور وطن کی خدمت کے مقابلہ میں اس آتش سوزاں کو اپنے سینے میں دبالیا اور شادی کے لئے جو شرط مقرر کی گئی تھی اس سے انکار کر دیا۔ خاں صاحب ایک زمانہ تک اس حادثہ سے متاثر رہے اور کئی سال بعد اپنی دل کی الجھنیں اور خلش کو ہلکا کرنے کے لیے ایک ناول لکھا جس کا نام انھوں نے "ضمیر" رکھا۔ یہ خاں صاحب کا تخلص بھی ہے۔ اس ناول میں انھوں نے اپنی محبت کی حقیقی داستان کو افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے۔

لندن یونیورسٹی کے پروفیسروں کا خیال تھا کہ خاں صاحب مزید چند سال رہ کر ڈی۔ ایس سی کی تکمیل کریں اور طیف پیمائی اور مقناطیس میں مزید تحقیقات کریں کیونکہ خاں صاحب کی علمی صلاحیتوں اور بہتر کارکردگی سے وہ بہت متاثر تھے۔ لیکن خاں صاحب کو لندن یونیورسٹی سے ملنے والا تعلیمی وظیفہ اس قابل نہیں تھا کہ وہ لندن کی معیاری زندگی چین سے بسر کرسکتے دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ خاں صاحب کو کوئی اُمید نہ تھی کہ حکومت حیدرآباد ان کے لیئے وظیفہ مقرر کر کے۔ ان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع فراہم کرے گی۔ اس لئے اُنھوں نے مناسب سمجھا کہ وطن واپس لوٹ جائیں۔

(باقی آئیندہ)

الطاف حسین برنی

پھول بن کی زبان

پھولبن کو نہ صرف ابنِ نشاطی بلکہ قدیم اُردو کا ایک ادبی شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ فارسی کی تصنیف "بساتین" کا اُردو ترجمہ ہے لیکن ابن نشاطی نے اسے اس کمال و خوبی سے اُردو میں منتقل کیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک مستقل تصنیف کی ہو گئی ہے۔ جذبات نگاری منظرکشی اور واقعات کے بیان سے شاعر کے قادرالکلام ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کی زبان سادہ سلیس اور رواں ہے۔ اسلوب میں بے تکلفی اور سادگی پائی جاتی ہے طرزِ تحریر دلچسپ اور صاف ہے اور خیالات گنجلک یا مبہم نہیں ہیں۔ پھولبن کی اسی سادگی اور سلاست کی وجہ سے اس کے سمجھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی۔ اس دور کی دوسری مثنویوں میں وہ سلاست اور صفائی نظر نہیں آتی جو اس میں ملتی ہے۔ اسی لئے ان کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ ہم عصر اور پیش رو شعراء کی بہ نسبت ابن نشاطی کی زبان زیادہ صاف اور سلیس ہے اور اندازِ بیان زیادہ نمایاں ہے۔ دکنی اُردو کی دوسری مثنویاں بعض وجوہ سے پھولبن پر فوقیت رکھتی ہیں۔ مگر زبان و بیان میں اس سے پیچھے نظر آتی ہیں۔ آغا حیدر حسن کا یہ خیال اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے کہ " نصرتی کی "گلشنِ عشق" تسلسل اور بلند خیالی میں تو اس سے بڑھ جاتی ہے لیکن سلاست اور روانی میں اسکو نہیں پہنچ سکتی" (دکن میں اُردو)

ابن نشاطی نے اس مثنوی میں اُنتالیس صنعتوں کا استعمال کیا ہے۔ جس طرح اُس نے سادگی میں پرکاری کے عناصر داخل کرنے کی کوشش کی ہے اور کلام میں خاص تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اس کو پڑھتے وقت قاری کی طبیعت لگی رہتی ہے اور اُسے اکتاہٹ کا احساس نہیں ہوتا۔ پوری مثنوی میں تصنّع اور آورد کا نشان نہیں ملتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ برجستہ بیان کر رہا ہے۔

پھولبن کی زبان کا خاص وصف اس کی سادگی اور سلاست ہے۔ ابن نشاطی نے بول چال کی وہی زبان استعمال کی ہے جو اُس دور میں رائج تھی۔ اُس وقت کے بہت سے الفاظ و محاورات اب چونکہ متروک ہو گئے ہیں اس لئے آج اس کی زبان کچھ اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں جا بجا فارسی تراکیب و الفاظ کا استعمال نظر آتا ہے لیکن مجموعی طور پر ہندی کا اثر زیادہ ہے۔ ہندی اور فارسی الفاظ کی آمیزش نے اس کی زبان کو شیریں اور سلیس بنا دیا ہے اور اسلوب میں ایک قسم کا زیر و بم پیدا ہو گیا ہے۔ ایک مثال دیکھئے :۔

کہوں رخسار کوں کیوں اس کے لالا ہر یک لالے کے درمیانی ہے کالا

دسن کوں کیوں کہوں انار دانے
اُتھے اس پر نیوا نے ہو کر دانے

کہوں جو ہیں کوں کیوں میں قرۂ نور
ہے قبتے نور کے اس پر بلا دور

سرو تھا کیوں کہوں میں اس کے قد کوں
اُنیڑ نے کاں سکت اس قد کی حد کوں

جو کوئی اس چال کو ہنس کر گیا ہے
ہنسو کر تس پہ ہنس ہنس گر گیا ہے

ابن نشاطی ایک قادر الکلام شاعر ہے۔ اسے جذبات نگاری منظر نگاری اور مکالمہ نگاری وغیرہ پر کامل عبور حاصل ہے۔ وہ ہر حالت اور ہر کیفیت کو بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر دیتا ہے۔ مشکل سے مشکل موقع پر اس کا بیان کمزور نہیں ہوتا۔ صفحات کے صفحات پڑھ جایئے زبان کہیں بے جوڑ اور ناموزوں نہیں معلوم ہوتی۔ افراد قصہ کی نفسی کیفیتوں اور ان کے جذبات کی عکاسی کو ایک مشکل مرحلہ سمجھا جاتا ہے۔ ابن نشاطی اس مشکل مرحلہ کو بڑی سہولت کے ساتھ طے کر لیتا ہے۔ ہمایوں فال کی جدائی میں سمن بر کے جذبات کی تصویر کشی ملاحظہ ہو:۔

لگی یوں بول کر دُو دُو پلانے
لگی اس دعات سوں افسوس کھانے

دندی یوں گھر ڈو بانگے کر نہ جانی
دریا میں غم کے بانگے کر نہ جانی

سمجھتی تھی تو یوں ہوگا گھر میں
چھپا رکھتی اسے دل کے بھیتر میں

نین پتلی کر اس رکھتی نین میں
جتن رکھتی کر اس کوں راز من میں

منظر نگاری میں بھی ابن نشاطی کو کمال حاصل ہے۔ منظر نگاری میں زبان و بیان کی دلکشی قابل دید ہے۔ ذیل کے اشعار پڑھئے:۔

بلندی سٹ سُرج پکڑیا جو پستی
گیا مغرب کے جا معبد میں بستی

شعلے چاند کا دیں ہکار آیا
مشعل جگ پو چندنی کا بچھایا

جو مغرب کی نشانیاں لکھ دکھائے
سو عالم نیند کے سجدے میں آئے

گریاں کے کنج پکڑے سب دندے
ہوئے گوشہ نشین سارے پرندے

پنکھی ہو معتکف بلکائے کرنے
لے تُحُرلت پرندے سب مرونے

مکالموں کی برجستگی، محاوروں اور لفظوں کی صفائی اور محاکات میں ابن نشاطی اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اس کے اشعار دل پر اثر کرتے ہیں اور کبھی کبھی ان میں بڑا درد و اثر ہوتا ہے۔ خاص طور پر وہ اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں وہ کربلا جانے کی تمنا کرتا ہے:۔

اول انجھواں سوں واں پانی چھنک خوب
کروں گا بعد ازاں پنکھاں سوں جاروب

پڑوں گنبد کنے جا چھاؤں کے سار　　لگوں اس کا ندکوں جیوں نقش دیوار

کروں قندیل واں میں مَن کوں اپنے　　بچھاؤں فرش کر واں تن کوں اپنے

پھر اس مرقد اُپر تے آپیں وار دوں　　ڈک اپنا دِل کے لہو سوں واں نگار دوں

زرات اپنے دو نیناں کر دکھاؤں　　لہو نذر کربلا تن کر کروں دکھاؤں

ہوس ہے دِل میں میرے بھوت رونے　　سیہ تاٹے کوں تس پانی سوں دھونے

پھول بن کی زبان اور اس کے بیان میں مناسبات و تلازمات کی بھی ایک اہمیت ہے۔ ابن نشاطی جہاں "شکار" کا بیان کیا ہے تو پورے بیان میں ایسے الفاظ کا التزام کیا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت میں جنگل اور جانوروں سے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہمایوں فال کے سراپا کے سلسلہ میں "خط" کی مناسبت سے اسی قسم کے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو خط سے تعلق رکھتے ہیں:-

خدا اس کوں دیا تھا خط میں توفیق　　کیا تھا خط سوں اپنے نسخ تعلیق

دیکھت وو خط ہوا سب محقق　　لکھیا ہے صُنع کا راقم محقق

کہے ہر کوئی دیکھ اس خط و رُخ کوں　　زمیں پر چاند اُترا ہے کھلے سوں

سُہاتا تھا اسے یوں مکھ اُپر خط　　مگر کیا حسن کو دیتے ہیں سر خط

تھے دِل کے نین اس کے خط سوں روشن　　جگت تھا تس کے فرخ رُخ سوں گلشن

رعایت لفظی کا استعمال ابن نشاطی نے کثرت سے کیا ہے۔ چند مثالوں سے اس کا ثبوت فراہم ہو سکتا

جو کئی ہو خار آوے شاہ کے گھر　　تو گل کے نادامن ہوئے پر زر

جو کوئی ہاتاں کی سیپیاں کو پسارے　　کرے مطلب کے پُر موتیاں وہ سارے

لیا عدل کا نور آپ نے ہاتھ　　نہ تھی اس دیس میں کہیں ظلم کی بات

خالص ہندی اور فارسی تشبیہات و استعارات نے مل جل کر پھول بن کی زبان میں ایک عجب لطف بہاؤ پیدا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-

بھنورا پھولاں پو بیٹھے سو دسے یوں　　کہ رُخ پر گل رخاں کے خال ہے جیوں

مشعل لے چاند کا دیں بھسار آیا　　مصلّے جگ پو چندنی کا بچھایا

بھبھوتی اپنے موں کوں پھیر لگاتی　　پُنم کا چاند بادل میں چھپاتی

دسے یوں ہو کہ پھول اس ٹھار سارے　　گگن پر جگمگاتے جیوں ستارے

ہندی اور فارسی تشبیہات و استعارات کے علاوہ پھول بن میں نئی اور اچھوتی تشبیہات کا استعمال

ملتا ہے۔ اس قسم کی تشبیہات نے اس کی زبان میں جدّت و ندرت پیدا کر دی ہے۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:۔

سیاہی یوں دِسے اس کے اُدھر پر — کہ جوں بیٹھیاں ہیں چُٹیاں آ شکر پر
جگت تھا باغ' شہ جوں باغباں تھا — ہمیشہ تازہ اس سوں سب جہاں تھا
حباب اچھتے جو اس ابرار کے تھے — مگر دیدے اُولِی الابصار کے تھے

پھول بن کا تعلق قدیم اردو ادبیات سے ہے۔ اس لئے اس کی زبان آج کی زبان سے بہت سے اُمور میں مختلف ہے دکنی اُردو کے بہت سے الفاظ آج متروک ہو گئے ہیں اور بہت سوں میں تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو قواعد نے بھی بہت سے پرانے طریقوں کو بدل دیا ہے۔ لہٰذا صوتی' صرفی اور نحوی نقطۂ نظر سے پھول بن کی زبان اور موجودہ اُردو میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیل درج کی جاتی ہے۔

(۱) صوتی اعتبار سے پھول بن کی زبان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے بہت سے لفظوں میں تخفیف کا عمل کار فرما ہے۔ ایسے الفاظ جن میں آج حروفِ علّت کا استعمال ہوتا ہے۔ پھول بن میں انھیں ساقط کر دیا گیا ہے:۔۔۔

جو کئی ہو خار کوے شاہ کے گھر — تو گل کے نادامن ہوئے پُر زر
سُنے سوں سوز کوں دکھلائے تھے کیں — لکھے تھے کیں رُپے سوں چاند کے تئیں

اس کے برعکس دوسری طرف ایسے الفاظ بھی نظر آتے ہیں جن میں اضافۂ صوت سے کام لیا گیا ہے۔ چُنانچہ ہے' کے بجائے 'اُہے' اور 'اچھے' اور 'تھے' کی جگہ 'اُتھے' سے قدم قدم پر واسطہ پڑتا ہے:۔۔۔

اُتھا اس شہر کا ایک نامور شاہ — سُلکھن سلطنت کے برج کا ماہ
خوشی کا میگ اُچھے جم واں برستا — اُتھا اس دھات سوں وہ شہر بستا

پھول بن کی زبان کی ایک امتیازی خصوصیت ہائے ہوز (ہ) کا استعمال اور عدم استعمال ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جہاں اس کا استعمال ہونا چاہئے وہاں نہیں ہوتا اور جہاں نہ ہونا چاہئیے وہاں ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔۔۔

ہوئی سو مہرباں آخر پری ناد — کروں جیوں یاد میں وو بی کرے یاد
یکایک جھانک کر دیکھی مجھے تار — مرے ہور اس کے دو دیدے ہوئے چار

کبھی کبھی ہائے ہوز کو ہائے مخلوط (ھ) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ مثلاً:۔۔۔

برہ میں جیو دینا کھوت آساں — ہے جینا پیو بن مشکل کٹھر جاں

ابن نشاطی کے یہاں نون غنہ کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔ حروف ہوں یا الفاظ' دونوں اس

صفت کے حامل نظر آتے ہیں:۔

کدھیں شیراز سوں جاتا دماوند | کدھیں جاتا بخارے سوں سمرقند
ہونٹوں آئے موراں ناچنے کوں | کرتے تھے لال طوطیاں پان کھاتوں

پھول بن کی زبان کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں الفاظ کا املا ان کے تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔ بولنے اور ادا کرنے میں لفظ کی جو آواز ہوتی ہے اس کو اسی طرح لکھ دیا گیا ہے جیسے:۔

شجاعت میں انھوں کو دیکھئے تو | ہر یک بجلی رہے دشمن لکھے دو
بھلا ہے دو کھیرا کی تاسنے تو | انگن کے پھول میرے ناچنے تو

جہاں دو معکوس آوازیں جمع ہو گئی ہیں وہاں ابن نشاطی نے پہلی آواز کو دندانی آواز میں تبدیل کر دیا ہے جیسے:۔

تھا عالم خلق سب ان میں تمام | رہتے تھے ٹھنڈی چھاؤں میں خاص و عام

ابن نشاطی کے یہاں ساکن کو متحرک کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ ایک مثال دیکھئے:۔

فقر کا اسی تار ترکوں ہے آب | حیا کا ہے جس کھ اوپر آب تاب

صرفی (۲) پھول بن کے اندر اسم کی جمع بنانے کا عام قاعدہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ واحد کے آخر میں "ان" کا اضافہ کر دیا ہے اور جمع بنائی گئی ہے۔ اسم اپنی اصل کے اعتبار سے خواہ عربی کا ہو یا فارسی کا یا ہندی کا۔ لیکن اس کی جمع بنانے کا عام اصول یہی ہے۔ چند مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جائے گی:۔

تیرے آگے دلیراں جگ کے رد ہیں | شجاعت کی گری کے تم اسد ہیں
علی سارے نبیاں میں ہے سپہ دار | علی سارے ولیاں میں کا ہے سردار
نگا کر طبع کی سوتیاں سوں ڈورا | بچن کا جگ منے ماریا ڈھنڈورا

پھول بن میں ماضی مطلق اس طرح بنائی گئی ہے کہ مصدر کے آخر سے 'نا' ہٹا کر اس کی جگہ 'یا' کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'پڑھنا' سے 'پڑھیا' اور 'دیکھنا' سے 'دیکھیا' وغیرہ۔ ذیل کے اشعار سے اس کی تصدیق ہوتی ہے:۔

سنیا جوں شہ یکایک چین کا ناؤں | پڑیا غم میں بھسل کر عیش کا پاؤں
دیکھیا سو شاہ کا ہو گئی بہوت پیار | کیا میں بی کروں یک اس پر اپکار

ابن نشاطی نے ضمیر کی جمع متکلم 'ہمن' اور 'ہمنا' استعمال کی ہے۔ وہ اس کے اندر فاعلی اور مفعولی حالت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس نے دونوں حالتوں میں کبھی ہمن اور کبھی ہمنا کا استعمال جائز رکھا ہے:۔

اُچھیں یک ٹھار جا کر یوں اہی دو		کہ جیوں اُچھتا ہے پھول میں بو

نہ چھوڑیگا ہمن دونوں کوں سارے		نہ رہے سے جیب بغیر دونوں کوں مارے

کہیں ہنا جگت دشمن تراشاں		ہمارا نام ہے درجن تراشاں

اسی طرح ' اُنھیں ' کے لئے ' اُنن ' اور اُنھوں کو ' مستعمل ہوا ہے۔ دونوں کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

دلیری میں یو ایسے ہیں دلیراں		اُنن کو دیکھ جنگل کے بڑے شیراں

شجاعت میں انھوں کوں دیکھئے تو		ہر یک بجلی رہے دشمن بکھے دُو

فعل معطوفہ کے لئے ' ت ' کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ' دیکھیت ' کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے ' دیکھکر ' اسی مفہوم کی ادائیگی کے لیئے بعض اوقات ' کو ' کا استعمال بھی ملتا ہے۔ جیسے ' آکو ' یعنی آکر۔ دونوں لفظوں کی مثالیں دیکھئے:۔

شجاعت کا دیکھیت تجکہ یو پانی		سٹے سب پہلواناں کی پہلوانی

کہے یاں آکو کچ ' واں جاکو کچ کئے		قلم کے ناد جکوں دو زباں ہے

دکنی اردو کی ایک انفرادی خصوصیت تاکید کے لیئے ' چ ' کا استعمال ہے۔ جب کسی اسم فعل یا صفت کے اندر تخصیص پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس کے آخر میں ' چ ' کا اضافہ کردیا جاتا ہے۔ مثلاً ' ایسا ہی ' کے لیئے دکنی میں ' ایساچ ' کا لفظ آئیگا۔ ابن نشاطی کے یہاں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے:۔

تمہا جس دن جو رستا خیز ہوگا		سُرج کا آنچ بو تیج ہوگا

' تج ' جو دراصل ' تجھ ' کی پرانی شکل ہے ' ایک ایسی ضمیر ہے جسکا استعمال ابن نشاطی نے مفعولی حالت کے علاوہ اضافی حالت میں بھی کیا ہے۔ ایک شعر دیکھئے:۔

گگن پر کہکشاں کا ہے جو وُو ہار		نہیں وُو ہار ہے تج ہاتھ کا وار

ایسے بہت سے الفاظ جو آج اردو میں مونث استعمال ہوتے ہیں۔ انھیں پھول بن میں مذکر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے:۔

تمہا جس دن جو رستا خیز ہوگا		سُرج کا آنچ بو تیج ہوگا

نحوی (۲)۔ جملے کے اندر جب فاعل جمع ہو اور وہ مونث بھی ہو تو ابن نشاطی اس کے لئے فعل بھی جمع الا مونث استعمال کرتا ہے۔ پھول بن کا ایک شعر ہے:۔

سیاہی یوں دسے اس کے اُدھر پر		کہ جیوں بیٹھیاں ہیں چھٹیاں آشکر پر

ابن نشاطی نے علامتِ فاعل (نے) کا استعمال بہت کم کیا ہے۔ اکثر و بیشتر اشعار ایسے ہی ملتے ہیں جن میں فاعل کی علامت غائب ہے:۔

دریاتے نین کے موتیاں کے تئیں رول　　　دیا بلبل جواب اس دھات توں کھول

پھول بن کے اندر صفت اور موصوف میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ اگر موصوف واحد ہے تو صفت بھی واحد ہے اور اگر موصوف جمع ہے تو اس کی صفت بھی جمع ہے۔ پھول بن کا مصنف 'ساری باتیں' کہنے کے بجائے 'باتاں ساریاں' کہتا ہے:۔

ایسے ہر کس کیتیں سمجھا کون توں بول　　　دکھنی کی باتاں ساریاں کوں کھول

موجودہ اردو میں اس بات کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جملے کے اندر فعل اور فاعل میں مطابقت ہو۔ اُن میں مذکر و مونث یا واحد و جمع کے اعتبار سے تضاد نہ پایا جائے۔ لیکن پھول بن میں اس کا التزام نہیں ملتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

سدا شاکر تھی اس کی گت پو بیبیاں　　　سنواں کھاتی تھی اس کی ہمت پو بیبیاں

متروکات (۴) ۔ پھول بن میں ایسے الفاظ کافی ملتے ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ آج کی معیاری اور تحریری زبان میں ان الفاظ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ ذیل میں چند الفاظ درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) کدھیں بمعنی کبھی:۔

کدھیں درپن میں جو کچھ دیکھنے جائے　　　دیکھ اپنے نین کی پتلیاں شرمائے

(۲) بیگی بمعنی جلدی:۔

مسافر ہو پرت کا گھر سوں نکلیا　　　برہ وندی کے بیگی ڈر سوں نکلیا

(۳) باج بمعنی بغیر:۔

تجھے ہے فارسی میں دستگہ آج　　　نہ کرسے ترجمہ بھی کوئی تج باج

(۴) نمن، ناد اور دھات بمعنی مانند:۔

لیکر بلبل کے پنجرے کوں آپس ہات　　　لگیا شہ بولنے بلبل سوں اس دھات

(۵) اُپرال بمعنی اوپر:۔

ملا صنعت کے ہاتاں سوں یک یک بال　　　بندیا محراب دو نیتاں کے اپرال

(۶) جم بمعنی ہمیشہ:۔

خداوندا تجھے ہے جم خدائی　　　ہمیشہ تجکوں ساجے کبریائی

(۷) نکو بمعنی نہیں:۔

تجھے معلوم ہے سارے صنائع　　　نکو اوقات اپنا کر توں ضائع

(۸) انگے بمعنی آگے یا سامنے :—

نکل آیا تازیاں دو طرف سوں   ہوئے انگے پیچھے کر اپنی صف کوں

(۹) سوں، ستی، سیتی اور سے بمعنی سے :—

بچھڑنے سوں ہوا ہے تلخ جینا   کر مٹھی ہے اور بھوٹا ہے سینا
الہی غیب کے پردے ستی توں   مرے مطلب کے شاہد کا دکھاؤں

(۱۰) جدہاں لگ بمعنی جب تک اور تدہاں لگ بمعنی تب تک :—

جدہاں لگ مہر و چرخ اختری ہے   جدہاں لگ گگن پہ زہرا مشتری ہے
اچھو تجہ کوں تدہاں لگ تاج ہور تخت   تدہاں لگ تجہ اچھو اقبال ہور بخت

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا پھولبن کی زبان میں ہندی الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات کا غلبہ ہے۔ ابن نشاطی نے ان کا استعمال اس چابکدستی اور خوبصورتی سے کیا ہے کہ ان کی وجہ سے زبان میں مٹھاس اور اسلوب میں سادگی کا جھرنا بہہ نکلا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :—

چندر ایسا سندر دکھلا کو رخسار   نظر سوں دور کرتوں میری آندکار
برہ کے درد دکھ سوں بد منی وو   چلی بنواس لے بیراگنی وو
گیا تھا رنگ روپ اس کا ہو برباد   لگی جھڑن پت جھڑی کے پات کے ناد
دو میرے جیو کا تن میت کاں ہے   دو منج تر جیو کا امریت کاں ہے

نقد و نظر

سید احمد خاں — تخلیق احمد نظامی - ناشر پبلی کیشنز ڈویژن - پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی
اچھی کتابت، طباعت اور گٹ اپ صفحہ ۱۹۶ قیمت پانچ روپے۔

یوں تو سرسید کی سوانح حیات لکھنے کا قومی فرض حالی نے "حیات جاوید" لکھ کر ادا کیا ہے اس کے بعد سرسید اور حالی کے چہیتے شاگرد بابائے اردو مولوی عبدالحق نے بھی سرسید اور ان کے کارناموں پر ایک کتاب لکھ دی ہے۔ علی گڑھ میگزین اور دیگر اخباروں اور رسائل نے سرسید کے متعلق خاص شمارے شائع کئے ہیں اس طرح سرسید کے کارناموں سے لکھی پڑھی دنیا ناواقف نہیں۔ لیکن مورخ کی نظر مورخانہ کی ہوتی ہے۔ اسی لئے پروفیسر صاحب موصوف نے مختصر اور مفید انداز میں سرسید کی حیات کے مختلف گوشوں کو خاص زاویہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے سرسید کی تحریرات کو سولہ جلدوں میں جمع کر کے...... شائع کر دیا ہے اور اس طرح سرسید کے اپنے خیالات نہ صرف مقالات بلکہ مکتوبات اور لکچرز سب ہمارے بس آگئے ہیں تاہم مجموعی حیثیت سے سرسید کو سمجھنے کیلئے یہ کتاب نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ دو سو صفحے کتاب کی قیمت پانچ روپے زیادہ ہے۔ (و۔ص)

علی سرور کے سو شعر — صفحات: ۵۶ اشاعت ۱۹۷۳ء سائز ۲۲/۱ کراؤن
مطبوعہ اعجاز پریس چھتہ بازار حیدرآباد قیمت ندارد

علی سرور، حیدرآباد کرناٹک کے غزل گو شاعر ہیں، مشاعروں میں رنگینی کلام سے یہ ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ سامعین شعر کے حسن پیش کشی کے قرینے اور قامت کی بوالعجبی کے سبب انھیں اشتیاق سے سنتے ہیں۔ اس "شعر چہ" میں شاعر نے لکھا ہے کہ ان کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ "یاد خوباں" کے نام سے زیر طبع ہے۔ سرور، غزل کی خالص روایتی شاعری کا عکس ہیں اور مشاعروں میں اپنا یہ رنگ خوب خوب جما لیتے ہیں۔ تین شعر نمونۃً پیش ہیں جس سے شاعر کے فکری اُفق کا اندازہ ہو سکے گا ؎

آنکھوں سے تم اس طرح [illegible]   جیسا پیر لرزتے ہیں قدم تاج محل کے
[illegible]   [illegible]
[illegible]   [illegible]

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

سنہ اجراء ۱۹۳۸ء جلد ۳۶ شمارہ ۱۰

اکتوبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس (ادارہ نمبر)

نگران

سید علی اکبر ایم' اے (کینٹب)

مجلس مشاورت

میر حسن' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ' رمن راج سکسینہ' ڈاکٹر غلام عمر خاں' محمد منظور احمد

معتمد

محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم

محمد جمال الدین

منتظم

وقار خلیل

زرِ سالانہ	آٹھ روپے	غیر ممالک سے	پندرہ روپے
زرِ ششماہی	چار روپے	فی پرچہ	۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۷۵ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہے۔ پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد نمبر ۴ ۵۰۰۰۰۴ سے شائع ہوا

ترتیب



تاثرات

دوران ۱۹۷۲ء "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے بارے میں جن اصحاب یا اداروں نے اپنے تاثرات تحریر یا شائع کئے ان کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں (ادارہ)

جناب دیوی سنگھ چوہان صاحب سابق وزیر ریاست مہاراشٹرا (بمبئی)

دکنی ادب کے مکمل مطالعے کے لئے مرہٹی زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضروری ہے۔ اگر یہ بات حاصل ہو جائے تو دکنی کا مطالعہ بلا کسی نقائص کے پبلک کے سامنے آجائے گا۔

میں اِس ادارہ کی دن دونی رات چوگنی ترقی چاہتا ہوں جہاں دکنی ادب کا قابلِ قدر ذخیرہ موجود ہے۔ جس سے میں نے کما حقہٗ استفادہ کیا ہے (۵ جنوری ۱۹۷۲ء)

جناب اخلاق فتح پوری صاحب لکچرار گورنمنٹ کالج۔ فتح پور (یوپی)

اِدارۂ ادبیاتِ اردو میں حاضر ہونے کا پہلی بار موقع ملا۔ اردو ادب سے متعلق رسائل مخطوطات کتب اور نوادر کا جس قدر عمدہ اور نادر ذخیرہ اِس ادارہ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ویسا اب تک کسی اور مقام پر نہیں مل سکا۔ اپنی ادبی کاوشوں کے لئے یہ ادارہ اور اِس سے متعلق افراد بلاشبہ مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان کا کارنامہ لائقِ تحسین ہے (۲۴ جنوری ۱۹۷۲ء)

جناب ذوالفقار علی خاں صاحب وظیفہ یاب نائب ناظم تعلیمات حیدرآباد

جناب سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ کی نوازش اور جناب سید کاظم صاحب کی تحریک پر ادارہ کو دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ گو کہ مرحوم زورؔ صاحب سے عثمانیہ یونیورسٹی میں طالب علمی کے زمانے سے مجھکو شرفِ نیاز حاصل تھا لیکن آج اِس حقیقت سے آگہی ہوئی کہ جناب زورؔ صاحب نے کس قدر غیر معمولی کام انجام دیا ہے۔ ادارہ کے "اردو میوزیم" میں نواب عنایت جنگ مرحوم کے عطایا نادرات سے حیدرآباد کی قدیم تاریخ پر غیر معمولی روشنی پڑتی ہے واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم نے اپنے عطیات عنایت فرما کر غیر معمولی ایثار سے کام لیا۔ ادارہ کے کتب خانے میں بعض ایسے قدیم اخبارات دیکھنے میں آئے جن کے نام تو ہم سنتے تھے۔ اخبار اودھ پنچ کے کارٹون واقعی غیر معمولی ہیں۔ ادارہ کی خواہش ہے کہ موجودہ کتب، تصاویر وغیرہ کو محفوظ کرے اور اس میں اضافہ کرے لیکن مالیہ کی کمی کی وجہ اس میں دشواریاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ صاحبِ ثروت حضرات کو توفیق دے کہ وہ ادارہ کی خدمت کریں۔

(۱۰ فروری ۱۹۷۲ء)

جناب محمد حفیظ الدین صاحب سابق شریک معتمد انجمن ترقی اُردو دہلی

وحال شریک مدیر سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵۔

آج میں پہلی مرتبہ "ایوانِ اُردو" گیا مجھے کچھ کتابوں کی تلاش تھی جب میری مشغولیت ختم ہوئی اُنھوں نے ادارے کی سرسری سیر بھی کرائی۔ ادارے کے علمی خزانے کی کامل نگہداشت صفائی ستھرائی حُسنِ انتظام دیکھ کر جی خوش ہوگیا البتہ وسائل کی کمی سن کر افسوس ہوا۔ بہرحال باحوصلہ کارکن ایثار و محنت سے اپنی سعی کئے جارہے ہیں اور اس علمی خزانے کی پاسبانی پوری جانفشانی سے جاری ہے۔

جب میں چلنے لگا تو میرے کرم فرمانے میرا نام پوچھا اور ایسا معلوم ہوا کہ وہ مجھ کو نام سے اچھی طرح جانتے ہیں میں نے حیرت سے اُن کا اسم گرامی دریافت کیا تو وہ جناب وقار خلیل صاحب نکلے جن سے مجھے دیرانہ غائبانہ شرف تعارف حاصل تھا (۴ مارچ ۱۹۷۲ء)

محترمہ ڈاکٹر یلاتوا اشرف جہاں صدر شعبہ اُردو وچی دوشانبے یونیورسٹی اموتیت

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے کارکنوں سے ملاقات کرکے اور یہاں کے علمی و ادبی ذخیرہ کو دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی مخطوطات، نوادرات اور مطبوعات کے اس گنجینہ میں اے کاش دوبارہ حاضر ہونے کا موقع ملے۔ یہ ادارہ اُردو زبان اور ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے (۱۰ جون ۱۹۷۲ء)

محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ معتمد انجمن ترقی اُردو دہلی۔

"ایوانِ اُردو کی تیسری بار زیارت کی زورؔ صاحب کے اس کارنامے کو خدا رہتی دنیا تک رکھے۔ عظیم کوشش ہے" (۲۸ جون ۱۹۷۲ء)

جناب مالک رام صاحب "دہلی"

ایوانِ اُردو کی عمارت اور اس کے محتویات کے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص ارادہ باندھ لے تو وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس سے دوسرے لوگوں کو ترغیب ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے قومی سرمایے کے تحفظ کا عزم کریں (۳۱ جون ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر امیر عارفی شعبہ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

ڈاکٹر زورؔ نے "ایوانِ اُردو" کے ذریعہ دکنی تہذیب و تمدن کا بیش بہا سرمایہ اہل ادب کے لئے محفوظ کرکے دکنی ادب اور اُردو کلچر کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ جس کو ریسرچ اسکالرز اور ادب کے اساتذہ کبھی بھول نہیں سکتے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو "سب رس" اور ایوانِ اُردو ڈاکٹر زورؔ کی تنہا محنت اور لگن کے خوبصورت کارنامے ہیں۔ (۱۳ اگست ۱۹۷۲ء)

جناب حاذق طیفوری صدر انجمن خیابانی بمبئی۔

" ایوانِ اُردو" میں عربی، فارسی اور اُردو کتابوں کا عظیم ذخیرہ موجود ہے جس میں ادب و تہذیب کے تمام ادوار کے جلوہ ہائے صد رنگ تابناک توانائیوں کے ساتھ منظر افروز ہیں۔ اُردو کے عظیم محقق ڈاکٹر زور کی شہرہ آفاق شخصیت اپنے اس کارنامے کی وجہ سے صفحۂ تاریخ پر جاوداں رہے گی" (۲۹ اگسٹ ۱۹۷۲ء)

جناب محمد عبدالحی شارق ادارۂ رہنمائے دکن حیدرآباد۔

" میرے اُستادِ محترم ڈاکٹر زور کی اِس ادبی یادگار سے میں جس درجہ متاثر ہوں اس کا اظہار کرنا میرے لئے دشوار ہو رہا ہے، عندالفرصت انشاءاللہ ایک مضمون کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کروں گا۔ (۲۹ اگسٹ ۱۹۷۲ء)

مولانا میر فرخندہ علی سالک صاحب (اچھے میاں) سجادہ نشین و متولی درگاہ حضرت سردار بیگ صاحب قبلہ حیدرآباد

میں نے اپنے احباب کے ہمراہ "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کا معاینہ کیا۔ دینیات اور تصوف کی نایاب کتابیں اور شجرہ ہائے متبرکہ نے مجھے متاثر کیا، ان سے ہٹ کر دیگر علوم و فنون کی کتابیں بھی دیکھیں جو گرانقدر اثاثہ ہیں۔ ایسے ذخیرہ کو جمع کرنے والے حضرات قابلِ مبارکباد ہیں، اللہ پاک اس کے بانی ڈاکٹر زور صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین (۲۹ اگسٹ ۱۹۷۲ء)

جناب حضرت خواجہ سید شاہ یداللہ محمد الحسینی القادری برادر سجادہ نشین آستانہ مخدوم الٰہی کرنول شریف

" ایوانِ اُردو میں حاضری کا موقع ملا، دیکھنے سے جو مسرت ہوئی تحریر سے باہر ہے۔ بانیانِ ادارہ کے لیئے دلی دعا نکلی، خصوصاً ڈاکٹر زور کی محنت و شفقت کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ دعا ہے الٰہی اس ادارہ کو ترقی عطا فرمائیے اور ہم میں ایسے ہی نوجوان علم داں پیدا کرے۔ آمین" (۵ ستمبر ۱۹۷۲ء)

پروفیسر آفاق احمد صدر شعبۂ اُردو مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج بھوپال

" کسی کو اگر کھویا ہوا خزانہ مل جائے تو اتنی خوشی نہیں ہوگی جتنی مجھے ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں چند گھنٹے گذار کر ہوئی، تحقیق کے جویا نہ صرف یہاں آکر استفادہ کر سکتے ہیں بلکہ اس احساس سے اپنی روح کو بالیدہ بھی کر سکتے ہیں کہ اُن کے بزرگوں نے اپنے قلب و نظر کی جو امانتیں چھوڑی ہیں وہ محفوظ ہیں اور آنے والی نسلوں کو روشنی دکھاتی رہیں گی۔ اپنی خوشی کو کن الفاظ میں بیان کروں، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں آکر میرا حیدرآباد کا سفر مکمل ہو گیا۔ (یکم نومبر ۱۹۷۲ء)

جناب سید مقبول علی وارثی صاحب جوڈیشیل مجسٹریٹ گنٹور (اے۔ پی)

" اُردو آج جس دور سے گزر رہی ہے یوں نہ گزرتی ہوتی اگر زور صاحب مرحوم کی سی تڑپ والے ایک

ہر ریاست میں چند اُردو والوں کے دل و دماغ میں ہوتا اور ایوانِ اُردو کی طرح جگہ جگہ مینارِ نور موجود ر
ادارۂ ہذا اور یہاں کے منتظمین صاحبان لائق مبارکباد ہیں" (۲۱ نومبر ۱۹۷۲ء)

آقائی محمد جواد آموزگار (طہران)

ایوانِ اُردو میں فارسی ادبیات کے قابلِ قدر ذخیرہ کو دیکھکر بے حد مسرت ہوئی۔ یہاں کا میوزیم ؟
تہذیبی اور ادبی آثار کا قابلِ قدر گنجینہ ہے۔ اراکین ادارہ نے جس خلوص سے ایوان کی سیر کرائی اس سے میں بے حد
متاثر ہوں اور اِس ادارہ کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے دعاگو (ترجمہ فارسی سے) (۱۹ ڈسمبر ۱۹۷۲ء)

پروفیسر عتیق احمد صدیقی صاحب شعبۂ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی۔

"ادارہ نہ صرف ادبیات کا مخزن ہے بلکہ اس میں اُردو کی تاریخ کا بھی بڑا مواد ہے۔ اِسے اُردو
ایک بڑا مرکز کہنا بے جا نہ ہوگا۔ (۲۷ ڈسمبر ۷۲ ۱۹ء)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب۔ ریڈر شعبۂ اُردو۔ دہلی یونیورسٹی

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ ایک یگانۂ روزگار شخصیت تھے۔ حیدرآباد والوں کو جو عشق اُردو سے
ڈاکٹر زورؔ کو وہی عشق اُردو اور حیدرآباد دونوں سے تھا۔ ادارہ کی ایک ایک چیز سے اُن کے اِس عشق کا پتہ
چلتا ہے۔ تصاویر، فرامین، سکّوں، رسالوں، کتابوں اور قلمی کتابوں کا اتنا اہم، اِتنا نادر اور اتنا عمدہ ذخیرہ ایک
شخص کی کوششوں سے جمع کیا ہوا ایسا کہیں اور نہ ملے گا۔ ڈاکٹر زورؔ کے بعد جناب محمد اکبرالدین صدیقی اور اُن کے
رفقاء لائق ستائش ہیں جو اس شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں۔ خدا اِسے ناساعد حالات کے جھونکوں سے
محفوظ رکھے اور کچھ ایسا انتظام ہوجائے کہ ادارہ کے فیوض و برکات کا سلسلہ قائم و دائم رہے (۲۷ ڈسمبر ۱۹۷۲ء)

ڈاکٹر عبدالغفار شکیل صاحب شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

"ادارۂ ادبیاتِ اُردو اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے جس میں اُردو کے فوادر ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی اُر
محبت اور اُردو کی خدمت کا جذبہ دونوں شامل ہیں۔ جناب محمد اکبرالدین صدیقی صاحب جیسا جانشین ڈاکٹر زورؔ مرحو
چھوڑا ہے جو اس ادارہ کے لئے موزوں ترین شخصیت ہیں اور انھیں کے نقشِ قدم پر اس ادارہ کو چلا رہے ہیں۔
کرے کہ ادارہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے۔ (۲۷ ڈسمبر ۱۹۷۲ء)

جناب شہباز حسین صاحب پرنسپل پبلی کیشنز ڈویژن دہلی۔

ادارۂ ادبیات اردو ایک مایہ ناز علمی ادارہ ہے۔ اِسکی اعانت ہر اُردو دوست کا فرض ہے۔ اسکو باقی رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی
ادارہ کے اراکین قابلِ ستائش ہیں کہ وہ انتہائی ناساعد حالات میں کام کررہے ہیں۔ انھیں چاہیئے کہ وہ اپنی سرگرمیوں سے زیادہ
زیادہ افراد کو باخبر کریں اور اپنے کاموں کو منظرِ عام پر لائیں تاکہ اہلیانِ ملک اس کی طرف متوجہ ہوں۔ میں کوشش کروں گا
ادارہ کے کسی کام آسکوں (۲۷ ڈسمبر ۷۲ ۱۹ء)

مصروفیاتِ ادارہ

علمی ـــــ ادبی اور ـــــ ثقافتی

اِدارے کی ۱۹۷۲ء کی ڈائری سے

جنوری ۱۹۷۲ء

چہارشنبہ ۵ جنوری (۴ بجے شام) جناب دیوی سنگھ چوہان سابق وزیر تعلیم ریاستِ حیدرآباد و حال ریسرچ اسکالر مہاراشٹرا بمبئی نے ایوانِ اُردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا اور ادارہ کے شعبۂ مخطوطات (دکنیات) سے استفادہ کیا۔ وقار خلیل نے موصوف کو تمام شعبوں کی سیر کرائی۔ اِس موقع پر ادارہ میں جناب بدیع حسینی صاحب لکچرار اردو کالج بھی موجود تھے۔

جمعہ ۱۴ جنوری ـــ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے امتحانات اردو عالم، اُردو دانی اور زباندانی حیدرآباد کے مرکز انوار العلوم کالج اور اضلاع کے مرکزوں پر ۱۴ تا ۱۷ جنوری منعقد ہوئے۔ جناب عارف الدین حسن معتمد امتحانات نے مرکز بلدہ کی نگرانی کی۔

دوشنبہ ۱۷ جنوری (۱۱ بجے دن) :ـــ اِدارہ کے امتحانات میں شرکت کرنے والے اُمیدواروں کی ایک ٹیم نے معتمد امتحانات جناب عارف الدین حسن اور نگران شعبہ خواتین محترمہ سعید جہاں کی قیادت میں ایوانِ اُردو کی سیر کی۔ اِس موقع پر جناب محمد الیاس صاحب ایڈوکیٹ بھی ادارہ میں موجود تھے۔

۲۶ جنوری :ـــ یادگار (۲۳) ویں یوم جمہوریہ کے موقع پر ادارہ کی عمارت "ایوان اُردو" پر صبح ۸ بجے جناب محمد جمال الدین صاحب مہتمم ادارہ نے قومی پرچم لہرایا۔ ۲ بجے شب طویل علالت کے بعد ادارہ کی مجلس انتظامی کے رکن اور نائب صدر جناب مولوی سید دلدار حسین صاحب (چیف انجینئر وظیفہ یاب) نے انتقال کیا۔

۳۱ جنوری (۱۱ بجے دن) :ـــ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی طرف سے ایوانِ اُردو میں مسٹر اظہر افسر نے ادارہ کے تعلق سے فیچر کے لیے بات چیت ریکارڈ کی۔ مسرز نواب میر یسین علی خاں شریک معتمد ادارہ، پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی معتمد کتب خانہ، میر سراج الدین علی خاں (آفس سکریٹری) وقار خلیل، محمد رضی الدین انصاری (لائبریرین) اور محمد جمال الدین (مہتمم ادارہ) نے بات چیت میں حصہ لیا۔

فبروری ۱۹۷۲ء

جمعرات ۳ فبروری :— آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے نیرنگ اردو پروگرام میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کے تعلق سے ادبی فیچر مرتبہ مسٹر اظہر افسر نشر ہوا۔

سہ شنبہ ۸ فبروری (۵ ½ بجے شام) :— ایوانِ اردو میں مجلس انتظامی ادارہ کا اجلاس صدرِ ادارہ پروفیسر سیّد علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ رکنِ ادارہ مولوی سیّد دلدار حسین صاحب کی وفاتِ حسرت آیات پر قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی جس میں ادارہ سے مرحوم کی دیرینہ وابستگی کا ذکر کیا گیا ہے دعائے مغفرت کے بعد دو منٹ کی خاموشی منائی گئی اور وقفے کے بعد ادارہ کے موازنہ ۱۹۷۲ء کو منظور کیا گیا دیگر علمی، دفتری مسائل زیرِ بحث آئے اور یوم محمد قلی قطب شاہ کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ اِس اجلاس میں جناب محامد علی عباسی صاحب نائب صدر، پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب (معتمد عمومی) اور اراکین مسرز پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، عارف الدین حسن، رمن راج سکسینہ اور سراج الدین علی خاں نے شرکت کی۔

۱۱ فبروری :— ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ادارۂ ادبیاتِ اردو اور شہر کی دیگر ادبی تنظیموں کی طرف سے ۱۱ تا ۱۳ فروری کو امیر خسرو کی ۷۰۰ سالہ تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ ادارہ کی طرف سے صدر و معتمد صاحبان پروفیسر سیّد علی اکبر اور ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ نے ان تقاریب میں عملی و علمی حصّہ لیا اور جلسوں کو مخاطب کیا۔

۱۲ فبروری :— انجمن ترقی ا[ردو] آندھرا پردیش کے آٹھویں سالانہ اجلاس میں اردو اساتذہ کے مسائل پر منعقدہ [جلسہ کی] صدارت ادارۂ کے صدر پروفیسر سیّد علی ا[کبر نے] فرمائی اور اردو اساتذہ کے مسائل پر گراں[قدر خیالات] کا اظہار کیا۔

۱۵ فبروری :— ادارہ کی سالا[نہ رپورٹ] "ادارۂ ادبیاتِ اردو ۱۹۷۱ء میں" مرتبہ و[...] شائع ہوئی جس پر ادارہ کی مطبوعات [...] درج ہے۔

۲۰ فبروری (۶ بجے شام) ادا[رہ کی] رفیق اور شعبۂ خواتین ادارہ کی سرگرم رکن [...] ممتاز شاعرہ محترمہ بشیر النساء، بیگم بشیر زو[جہ] مرزا ضامن علی غازی نے طویل علالت کے [...] مرحومہ کا شعری مجموعہ "آبگینۂ شعر" ادارہ کی طر[ف سے] شائع ہوا تھا۔

۲۵ فبروری :— پروفیسر مہندر [راج سکسینہ] صاحب معتمد ادارۂ ادبیاتِ اردو نے محتر[مہ کی] وفات پر تعزیتی بیان جاری کیا جس میں [کہا کہ] "محترمہ بشیر عہد عثمانی کی پہلی صاحبِ دیوان ش[اعرہ کی] حیثیت سے ممتاز رہی ہیں انکا پہلا ش[عری مجموعہ] "آبگینۂ شعر" ۱۹۶۵ء میں ادارہ کی طرف سے [شائع ہو کر] مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ بیگم بشیر نے اپنے [کلام کے] ذریعہ دکنی تہذیب اور قومی یکجہتی کی روا[یات کو فروغ] دینے میں نمایاں حصّہ لیا۔ مرحومہ کا ادارہ [...]

شعبوں سے گہرا ربط رہا ہے۔ حیدرآبادی خواتین
میں محترمہ بشیرؔ نے شعر و ادب کا جو ذوق پیدا کیا تھا
اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ وفات سے اُردو
شعر و ادب اور ادارہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

مارچ ۱۹۷۲ء

ہفتہ ۴ مارچ (ایک بجے دن) :۔
جناب مولوی ایم حفیظ الدین صاحب سابق شریک
معتمد انجمن ترقی اُردو ہند و حال شریک مدیر "ماہی
اسلام اور عصر جدید" جامعہ ملیہ دہلی نے ایوانِ اُردو کے
تمام شعبوں کا معاینہ کیا۔ وقار خلیل نے موصوف کو تمام
شعبوں سے متعارف کرایا (۶ بجے شام) ایوانِ اُردو
میں مجلس مشاورت یوم محمد قلی قطب شاہ کا اجلاس
پروفیسر سید علی اکبر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔
جس میں طے کیا گیا کہ ۲۹ اور ۳۰ اپریل کو دو روزہ
تقاریب منائی جائیں اس اجلاس میں مسز پی۔ این۔
گپتا، رمن راج سکسینہ، میر لیسین علی خاں، ڈاکٹر
غیاث صدیقی، محمد منظور احمد، سید شاہ تقی الدین
قادری، میر سراج الدین علی خاں، صلاح الدین نیرؔ
اور وقار خلیل نے شرکت کی۔

۹ مارچ :۔ مقامی اخبارات میں یوم
محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ادارہ کا پریس
نوٹ شائع ہوا۔

۱۲ مارچ :۔ ادارہ کے امتحانات منعقدہ
جنوری ۷۲ء کے نتائج بغرض اشاعت روانہ
کئے گئے

سہ شنبہ ۱۴ مارچ :۔
ادارہ کی مجلس انتظامی کے رکن اور شعبۂ امتحانات
کے معتمد جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب
مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے مرحوم کے سوگ
میں "ایوانِ اُردو" ایک دن کے لئے بند رہا

۱۵ مارچ :۔ صدر ادارہ پروفیسر
سید علی اکبر صاحب نے مولوی عارف الدین صاحب
صاحب کی وفات پر تعزیتی بیان جاری کیا جو مقامی
اخبارات میں شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مرحوم
میں بے لوث خدمات کا جذبہ غیر معمولی تھا۔ ادارہ کے
شعبۂ اُردو امتحانات سے دیرینہ وابستگی اور
بہ حیثیت معتمد اُنھوں نے قابلِ قدر خدمات انجام
دی ہیں۔

۲۰ مارچ :۔ جناب بدیع حسینی صاحب
لکچرار شعبۂ اُردو، اُردو کالج، حیدرآباد نے ادارہ کے
کتب خانہ کو اپنی کتاب "دکن میں ریختی کا ارتقاء"
اور "انتخاب شمائل الاتقیاء" کی ایک ایک جلد تحفۃً دی۔

۲۵ مارچ :۔ یوم محمد قلی قطب شاہ
تیاری کمیٹی کے اراکین کی تفصیلات پریس کے حوالے
کی گئیں جس کے بموجب ادارہ نے حسب سابق
جناب رمن راج سکسینہ صاحب کو معتمد یوم محمد قلی کی
حیثیت سے دوبارہ منتخب کیا۔ دیگر شعبوں کے اراکین
میں جناب محمد منظور احمد (معتمد ادبی اجلاس) ڈاکٹر
غیاث صدیقی (معتمد مشاعرہ) ڈاکٹر مغنی تبسم (کنوینر
بین کلیاتی تحریری مقابلہ) جناب صلاح الدین نیرؔ

(کنوینر بیت بازی) اور وقار خلیل (معتمد نشر و اشاعت) کے نام شامل ہیں۔

اپریل ۱۹۷۲ء

۶/اپریل:۔ حیدرآباد کے معروف غزل گو شاعر جناب سعید شہیدی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "برق آشیاں" ادارہ کی طرف سے شائع ہوا جس پر ادارہ کا نشان سلسلہ مطبوعات (۳۱۳) تحریر ہے۔

۷/اپریل:۔ سب رس کے بشیر نمبر کے سلسلے میں ایک پریس نوٹ کے ذریعہ دکن کی ممتاز شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیر کی شخصیت اور شاعری پر اہل قلم حضرات سے مضامین نظم و نثر کی اپیل کی گئی

۸/اپریل:۔ ہفتہ وار آدرش (گیا۔ بہار) میں رائے محبوب نارائن گوڑ کا سب رس میں مطبوعہ مضمون "رباعی" حوالے سے ڈائجسٹ کیا گیا۔

اتوار ۹/اپریل صبح ۱/۲ ۱۰ بجے:۔

ایوان اردو میں یوم محمد قلی قطب شاہ مشاورتی کمیٹی کا اجلاس جناب پی ین گپتا صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دوران تقاریب کا خاکہ و پروگرام متفقہ طور پر منظور کیا گیا۔ اس اجلاس میں ادارہ کے سرگرم رکن اور معتمد امتحانات مولوی عارف الدین حسن صاحب کی ناوقت رحلت پر ایک قرار داد تعزیت منظور کی گئی اور مرحوم کی ادارہ سے دیرینہ وابستگی اور ان کے تہذیبی و تعلیمی خدمات کو خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ اس مشاورتی کمیٹی میں جناب سری کرشن سنہا (آئی۔ اے۔ ایس۔ رکن ادارہ) جناب زین راج سکینہ (معتمد یوم محمد قلی) پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی، نواب میر یسین علی خاں، جناب ڈاکٹر عبدالوحید فلار ناظم ریاستی محکمہ آثار قدیمہ، ڈاکٹر غیاث صدیقی، جناب محمد منظور احمد، جناب میر سراج الدین علی خاں، جناب صلاح الدین نیر اور جناب وقار خلیل صاحبان نے شرکت کی۔

جمعرات ۱۳/اپریل (۶ بجے شام)

پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے ادارہ کی طرف سے جسٹس گوپال راؤ صاحب ایکبوٹے کے آندھرا پردیش چیف جسٹس کے عہدہ پر ترقی پانے کی مسرت میں مہاراشٹرا سنٹرل میں مختلف علمی و ادبی اداروں کی طرف سے منعقدہ تقریب تہنیت میں نمائندگی کی اور صاحب موصوف کی ادارہ کی طرف سے گلپوشی کرتے ہوئے ان کے تہذیبی اور قومی کارناموں کو خراج تحسین ادا کیا۔

جمعرات ۲۵/اپریل (۶ بجے شام)۔

ایوان اردو میں ادارہ شعر و حکمت کے زیر اہتمام مشہور شاعر جناب اکبر حیدرآبادی (حال مقیم لندن) کے پہلے شعری مجموعہ "خط رہگزر" کی رسم اجرا کی خوشگوار تقریب محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ادارہ کے رکن جناب میر حسن صاحب نے اس کتاب کو جاری کرکے رسم اجرا کی۔ ادارہ کے شعبہ امتحانات کے رکن ڈاکٹر مغنی تبسم (ڈائرکٹر ادارہ شعر و حکمت) اور ڈاکٹر عالم خوندمیری کے علاوہ پروفیسر حسن عسکری نے اکبر

شخصیت اور شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کیا
جناب صلاح الدین نیر نے اس تقریب کی کارروائی
انجام دی۔

شنبہ ۲۹ اپریل (۶ بجے شام) اردو
کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر اور بانی شہر حیدرآباد
سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں سہ روزہ یوم
محمد قلی تقاریب کا افتتاح گنبد محمد قلی واقعہ گولکنڈہ پر
عمل میں آیا۔ ریاستی وزیر آثار قدیمہ جناب ایم آر
شیام راؤ نے اس جلسہ کی صدارت کی ممتاز گلوکارہ
الاجر دوج نے محمد قلی کی مناجات سنائی جناب
دس راج سکسینہ معتمد یوم محمد قلی نے خیر مقدمی خطبہ
پڑھا پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ نے
پیامات سنائے ڈاکٹر عبدالوحید خاں ناظم آثار قدیمہ
اور جناب سید رحمت علی (ایم ایل اے) نے تقریروں
کے ذریعہ محمد قلی کے عہد کی قومی یک جہتی اور زبان
و ادب کے سلسلے میں اس کی عظیم خدمات کو خراج
عقیدت ادا کیا۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی اور رئیس اختر نے
اولین صاحبِ دیوان شاعر کے حضور نذرانۂ سخن ادا کیا
کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ دکنی زبان
میں سنایا۔ ادارہ کی طرف سے مزار محمد قلی پر چادرِ گل
چڑھائی گئی اور فاتحہ گزرانی گئی۔ آخر میں فائن آرٹس
اکیڈیمی کے فنکاروں نے سازوں پر محمد قلی، مخدوم، جامی
اور شاہد صدیقی کا کلام پیش کیا۔ وصی احمد صاحب
کی قوالی پر یوم محمد قلی کا ادبی اور تہذیبی تہوار خوشگوار
فضاء میں اختتام پذیر ہوا۔ ممتاز دانشوروں، ادیبوں،
سخنوروں، سیاسی اور تہذیبی نیز مختلف مذہبی
نقاطِ نظر کے حامل برگزیدہ اور نمائندہ اصحاب
اور شہریانِ حیدرآباد و سکندرآباد نے شرکت
کر کے اس تقریب کو کامیاب بنایا۔ اس موقع پر
ادارہ کی طرف سے شائع کردہ مشہور غزل گو شاعر
جناب سعید شہیدی کے مجموعۂ کلام "برق و آشیاں"
اور ادارۂ شعر و حکمت کے زیر اہتمام شائع شدہ شعری
مجموعہ حرفِ شوق (از جناب محمد منظور احمد) کی رسم اجرا
انجام دی گئی اور بین کلیاتی تحریری مقابلہ کے انعام
یافتگاں کو ادارہ کی طرف سے انعامات اور مسز
ہلال بن اسعد کی طرف سے محمد قلی سے موسومہ سلطان
پن دیئے گئے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس
کی رپورٹ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد نے ریکارڈ کی
جسے مسٹر اظہر افسر نے ٹیپ کیا اور ریڈیو رپورٹ
بعد ازاں ۳ مئی کی رات اردو پروگرام نیرنگ میں
نشر کی گئی۔ حکومت آندھرا پردیش نے افتتاحی اجلاس
میں شرکت کے لیئے ملازمین سرکار کو ۳ بجے دفتر
برخواست کرنے کے احکام جاری کئے۔

اتوار ۳۰ اپریل صبح ۱۰-۱/۲ بجے:—
یوم محمد قلی قطب شاہ کی دیگر تقاریب ایوانِ اردو میں
منعقد ہوئیں۔ ادارہ کے آڈیٹوریم میں انگریزی کی ممتاز
شاعرہ محترمہ راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر جی نے
نمائش آثار قطب شاہی کا افتتاح کیا۔ جناب
میر سراج الدین علی خاں صاحب اس نمائش کے
معتمد تھے۔ ادبی اجلاس جناب سری کرشن سنہا کی

صدارت میں منعقد ہوا ۔ جناب محمد اکبر الدین صدیقی،
نجمہ صدیقہ ریسرچ اسکالر اور ضیاء الدین احمد
شکیب صاحب (آرکیوسٹ دفتر ریاستی اسناد) نے
محمد قلی کے عہد اُس کی شاعری اور دکنی زبان وادب
پر مقالے پڑھے۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید محترمہ خورشید
نذیر، جناب جہاندار افسر اور جناب اسلم عمادی اور جناب
باقر امانت خانی نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ دکن کی
باکمال شاعرہ محترمہ بشیر النساء بیگم بشیرؔ کی نظم وقار خلیل نے
سُنائی۔ جناب محمد منظور احمد نے اس جلسے کی کارروائی
خوش اسلوبی سے انجام دی اور شکریہ ادا کیا۔

اسی شب ۹ بجے جناب اقبال چند صاحب (آئی اے
یس، رکن بورڈ آف ریونیو) کی صدارت میں غیر طرحی
یادگار مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں (۲۰) قدیم و جدید
مکتب خیال کے شعراء صاحبان نے کلام سُنایا اور
خوب خوب داد حاصل کی۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب نے
معتمدِ مشاعرہ کے فرائض بحسن وخوبی ادا کئے۔

۳ر مئی ۱۹۷۲ء

دوشنبہ یکم مئی (۶ بجے شام) :- سہ روزہ
یوم محمد قلی قطب شاہ کی آخری تلگو تقریب بمقام کرشنا
دیوارائے لائبریری جناب دیوراپلی راما نجا راؤ سکریٹری
ساہتیہ اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ تلگو کے
ممتاز ادیبوں، مصنفوں اور اساتذہ نے محمد قلی قطب شاہ
کی تلگو شاعری، اُسکے گنگا جمنی دورِ حکومت اور
دکنی زبان میں تلگو کے سرمایہ اور تلگو اُردو لسانی
رشتوں پر تقریروں کے ذریعہ روشنی ڈالی اور

ادارہ کی بین لسانی ادبی خدمات کو
تحسین ادا کیا۔ جناب میر سراج الدین علی
و قطب شاہی سلاطین اور تلگو زبان پر مضمو

جون ۱۹۷۲ء

۲۶ر جون :- روزنامہ "سیاست"
حیدرآباد میں ادارہ کی طرف سے شائع شدہ
سعید شہیدی کے شعری مجموعہ برق وآشیاں
ڈاکٹر اشرف رفیع صاحب کا تبصرہ شائع ہو

۲۸ر جون (۱۱ بجے صبح) محترمہ حمیدہ
صاحب معتمد انجمن ترقی اُردو ہند دہلی نے جناب
فخر الدین علی احمد صاحب مرکزی وزیر زراعت
ہمشیرہ .... صاحبان کے ہمراہ ایوان اُردو
تمام شعبوں کا معاینہ کیا۔ جناب میر سراج ال
اور جناب وقار خلیل نے مہمانوں کو تمام شعبوں
سیر کرائی اور ادارہ کا تعارفی لٹریچر نذر کیا۔

جولائی ۱۹۷۲ء

۲ر جولائی :- ادارہ کے امتحانات اُردو
اُردو دانی اور زباندانی منعقدہ مئی ۷۲ء کے
نتائج بغرض اشاعت پریس کے حوالے کئے گئے

سہ شنبہ ۴ر جولائی (۵ بجے شام)

ادبی محفلِ مشاعرہ

"ایوانِ اُردو میں" ادارہ کے زیر اہتمام ممتاز
وادیب جناب بہادر چند کھنہ صاحب کی صدا
میں ایک خوشگوار ادبی محفل ومشاعرہ منعقد ہو
کی مشہور افسانہ نگار خاتون محترمہ عائشہ صدیقی

محفل کی مہمانِ خصوصی تھیں۔ جناب میر سراج الدین علی خاں (آفس سکریٹری) نے مہمانِ خصوصی اور سامعین کا ادارہ کی طرف سے ابتدا میں خیر مقدم کیا۔ ممتاز جدید افسانہ نگار جناب ابراہیم شفیق نے دلچسپ کہانی "مجھے سمندر بلا رہا ہے" اور ملک کے معروف طنز و مزاح نویس جناب مجتبیٰ حسین نے شاہکار فکاہیہ "ریلوے منتری مسافر بن گئے" سنایا اور مہمان افسانہ نگار خاتون محترمہ عائشہ صدیقی نے "کنوارے ارمان" کے زیرِ عنوان کہانی سنا کر داد حاصل کی۔ صدر جلسہ نے غریب دل کے عنوان سے طنز و مزاح سے بھرپور مضمون سنایا۔ محفل شعر میں ممتاز اور صفِ اول کے افسانہ نگار جناب اقبال متین نے حصہ لیا۔ دیگر شعراء میں وقار خلیل، محمد منظور احمد، جمیل شیدائی، برق آشیانوی، مظفر الدین خاں صاحب اور برق یوسفی صاحبان نے حصہ لیا اور محفل کو کامیاب بنایا۔ وقار خلیل نے معتمد محفل کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

۲۹ر جولائی :۔۔ گجرال اردو کمیٹی کا اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوا۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کی طرف سے کمیٹی کو صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر صاحب نے اردو زبان، تعلیم اور کالجوں میں اسکے استعمال کے تعلق اپنا بیان قلمبند کرایا۔

۳۱ر جولائی (۴ بجے شام) ماہر غالبیات جناب مالک رام صاحب (رکن گجرال اردو کمیٹی) نے ایوانِ اردو کا معاینہ کیا اور ادارہ کے مخطوطات سے استفادہ کیا۔ جناب سراج الدین علی خاں اور وقار خلیل نے موصوف کو تمام شعبوں کا معائنہ کرایا۔

اگست ۱۹۷۲ء

یکم اگسٹ :۔۔ جناب شیخ محمد صاحب اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر پریس انفارمیشن بیورو حیدرآباد نے ادارہ کے کتب خانہ سے آزادی کے بعد کے حیدرآبادی اردو اخبارات و رسائل کے بارے میں مواد حاصل کیا۔

۸ر اگسٹ :۔۔ ہفت روزہ "برگ آوارہ" حیدرآباد میں "رفتارِ ادب" کے کالموں میں ادارہ کے ترجمان سب رس کا خصوصی شمارہ "بشیر نمبر" پر وقار خلیل کی رائے شائع ہوئی۔

۱۳ر اگسٹ :۔۔ جناب قاضی محمد ذکریا امیر عارفی صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے ایوانِ اردو کا معاینہ کیا۔ محمد جمال الدین صاحب منتظم ادارہ نے تمام شعبوں سے متعارف کرایا۔

۱۵ر اگسٹ :۔۔ جناب میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد دفتر نے ایوانِ اردو پر آزادی کی سلور جوبلی کے موقع پر قومی پرچم صبح ۸ بجے لہرایا۔

۱۸ر اگسٹ :۔۔ اردو کے نامور شاعر جناب عزیز قیسی (بمبئی) نے اپنا اولین شعری مجموعہ "آئینہ در آئینہ" اور جناب نواب اکبر علی خاں مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے پیسہ اخبار لاہور ۱۹۲۰ء کے پرچے اور ایک انگریزی کتاب "رومن اردو مینول آف ہارس ماسٹرشپ" ادارہ کے کتب خانے کے لئے تحفتہً

عنایت فرمائیں۔

۱۹ اگست (۶ بجے شام) :- ایوانِ اردو میں انڈو ایران سوسائٹی کے زیر اہتمام آزادی ہند کی سلور جوبلی تقاریب کا اہتمام کیا گیا۔ جناب اے۔ جگونت راؤ وزیر فینانس نے صدارت کی عزت مآب ڈاکٹر محمد تقی مقتدری قونصل جنرل ایران، جناب ٹی انجیا، وزیر لیبر جناب یل، ین، گپتا رکن اداره صدر سوسائٹی نے ہند ایران تعلقات اور آزادی ہند کو خراج عقیدت ادا کیا آخر میں جدید ایران کے ثقافتی ورثے کی عکاسی کرنے والی فلمیں دکھائی گئیں۔

۲۱ اگست :- روزنامہ "سیاست" حیدرآباد میں سب رس کے خصوصی شمارہ بشیر نمبر پر جناب میر حسن صاحب کا محررہ تبصرہ شائع ہوا۔

۲۹ اگست (۱۲ بجے دوپہر) :- صدر انجمنِ خیال بمبئی جناب حکیم حاذق طیفوری، مولانا اچھے میاں صاحب سالک سجادہ نشین درگاہ حضرت سردار بیگ صاحبؒ، جناب شارق جناب ایمان قریشی اور جناب ناظم میرزائی ایڈیٹر گولکنڈہ ویکلی اور جناب روف ارسلان (ملاپ) نے ایوانِ اردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ جناب میر سراج الدین علی خان نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ادارہ کی تفصیلات سے واقف کرایا۔

ستمبر ۱۹۷۲ء

سہ شنبہ ۵ ستمبر :- ادارہ کے ایک ادبی رفیق حضرت تاج قریشی نے طویل علالت صبح ۱/۲-۱ بجے دواخانہ عثمانیہ میں انتقال کیا۔ جلوس جنازہ میں ادارہ کی طرف سے وقار خلیل نمائندگی کی۔ ڈاکٹر زور بانی ادارہ نے اب چند سال پہلے حضرت تاج قریشی سے حیدرآباد ادبی و تہذیبی منظوم تاریخ لکھوائی تھی۔

۱۰ ستمبر :- ادارۂ ادبیاتِ اردو رپورٹ ادارہ ۱۹۷۱ء میں مرتبہ وقار خلیل شائع ہ

۱۱ ستمبر :- جناب ڈاکٹر محمد تقی م قونصل جنرل امپریل ایران مقیم حیدرآباد نے ایران کی تصنیف "وطن" کے لئے میرے عزا اردو ایڈیشن اور گلستانِ سعدی (فارسی رسم الخط) فارسی رسائل اور کتب کا اہم ذخیرہ ا کتب خانہ کے لئے تحفتہً مرحمت فرمایا۔

اکتوبر ۱۹۷۲ء

اتوار ۲۹ اکتوبر (۱۱ بجے صبح) :- جواں سال ماہر دکنیات ڈاکٹر نور السعید نے ریسرچ کے سلسلے میں ادارہ کے کتب خانہ استفادہ کیا اور ایوانِ اردو کے تمام شعبہ سیر کی۔ ترصیص الدین انصاری صاحب لا اور وقار خلیل نے موصوف کی رہنمائی کی۔

نومبر ۱۹۷۲ء

چہارشنبہ یکم نومبر (۱۱ بجے صبح) پروفیسر آفاق احمد صاحب صدر شعبۂ اردو مہ گرلز کالج بھوپال نے ایوانِ اردو کا تفصیلی

ملک کے صفِ اول کے شاعر مرحوم مخدوم محی الدین کی شخصیت اور فن پر اپنی شریک حیات کے مقالہ پی، ایچ، ڈی کے سلسلے میں موصوف نے ادارہ کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔

(۱۲ بجے دوپہر) شریمتی آر میلا گپتا (ایم اے) ہندی ریسرچ اسکالر مگدھ یونیورسٹی گیا (بہار) نے جناب حمایت اللہ (دکنی شاعر) کے ہمراہ ادارۂ ادبیات اُردو کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ دکنیات کے بارے میں موصوف نے ڈاکٹر خلیل سے گفتگو ٹیپ ریکارڈ کی اور ادارہ کے کتب خانے سے استفادہ کیا۔

ڈسمبر ۱۹۷۲ء

۴ر ڈسمبر:- ملک کے نامور نقاد اور ادیب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب صدر شعبہ اُردو الہ آباد یونیورسٹی کی وفات (یکم ڈسمبر) پر پروفیسر مہندر راج سکسینہ معتمد ادارہ اور جناب میر لئیق علی خاں صاحب شریک معتمد ادارہ نے بیگم صاحبہ احتشام کے نام ادارہ کی طرف سے تعزیتی مکتوب روانہ کئے جس میں مرحوم کی علمی و ادبی خدمات کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے ادارہ سے دیرینہ وابستگی کا تذکرہ تھا۔

چہارشنبہ ۶ر ڈسمبر (۶ بجے شام):- اُردو ہال میں جلسۂ تعزیت پروفیسر احتشام حسین صاحب انجمن ترقی اُردو، ادارۂ ادبیات اُردو، اُردو مجلس ابوالکلام انسٹی ٹیوٹ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے جناب فضل الرحمٰن صاحب سابق پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ادارہ کی طرف سے پروفیسر سید محمد صاحب نائب صدر شعبۂ امتحانات نے نمایندگی کی دیگر مقررین میں ڈاکٹر حسینی شاہد ڈاکٹر زینت ساجدہ ڈاکٹر سیدہ جعفر، جناب خواجہ محمد احمد اور جناب سرینواس لاہوٹی نے مخاطب کیا اور پروفیسر احتشام کی وفات پر قرار داد تعزیت۔ جناب ناصر کرنولی نے پیش کی جسے حاضرین نے دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ ایستادہ ہوکر منظور کیا۔

سہ شنبہ ۱۹ر ڈسمبر (۱۱ بجے صبح):- ایران کے مشہور مذہبی پیشوا آقائی محمد جواد آموزگار ظفر علی (سلسلۂ شاہ نعمت اللہ الہٰی دہلی) نے آقائی حسین ضابطہ اور آقائی حسن طبسی نیّر کے ہمراہ ادارہ کے تمام شعبوں اور خصوصاً فارسی شعبۂ مخطوطات کا گہری دلچسپی سے معائنہ کیا۔ جناب سراج الدین علی خاں نے تفصیلات سے واقف کرایا۔

(۱/۲ ۱۲ بجے دوپہر) جناب ڈاکٹر عبدالحکیم سفیر افغانستان مقیم دہلی نے ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ادارہ کے اردو میوزیم اور شعبہ مخطوطات سے موصوف نے گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ جناب میر سراج الدین علی خاں نے مہمان کا خیر مقدم کیا۔

۲۵ر ڈسمبر:- ادارہ کے اُردو امتحانات اُردو عالم، اُردو دانی اور زبان دانی ۲۵ر تا ۲۷ر ڈسمبر حیدرآباد کے مرکزوں کے علاوہ اضلاع تلنگانہ

اور کرناٹک و مہاراشٹرا میں ادارہ کے مقرر کردہ صدر نگران کاروں کی موجودگی میں منعقد ہوئے جن (۳۳۶) امیدواروں نے شرکت کی ۔ اور ۲۳۸ کامیاب ہوئے۔

چہارشنبہ ۲۷ر دسمبر (۱۱ بجے صبح) اردو اصطلاحات سمینار کے اراکین ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر عتیق احمد صدیقی (علی گڑھ یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل (علی گڑھ) نے پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی صاحب کے ہمراہ ادارہ کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا۔ میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد دفتر نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

۲۹ر دسمبر (۳ بجے شام) جناب شہباز حسین صاحب پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر و سکریٹری ترقی اردو بورڈ حکومت ہند دہلی نے ادارہ کے تمام شعبوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جناب محمد اکبرالدین صدیقی معتمد کتب خانہ و امتحانات ادارہ، میر سراج الدین علی خاں صاحب معتمد اردو میوزیم نے موصوف کو تمام شعبوں کی سیر کرائی۔

۳۰ر دسمبر: — پاکستان کے نامور شاعر اور ترقی اردو بورڈ کے ڈائرکٹر جناب شان الحق حقی صاحب نے ادارہ کے کتب خانہ کو ساذ جشن حقی اور اپنی نئی تصنیف "نکتہ راز" تحفتہً ارسال

استفادۂ کتب خانہ

۱۹۷۲ء

ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے گرانقدر اور وسیع کتب خانہ (شعبۂ مطبوعات، مخطوطات اور دارالمطالعہ عام) ایوانِ اُردو سے اُردو زبان و ادب کے شیدائی دیگر زبانوں کے محققین، طلباء و طالبات اور ریسرچ اسکالرس صاحبان بڑی تعداد میں استفادہ کرتے ہیں اور مطالعہ کی غرض سے دور و نزدیک کے مقامات سے آتے رہتے ہیں، ذیل میں چند اصحاب کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ جنھوں نے مختلف اوقات میں یا متواتر کئی روز ادارہ کے کتب خانے کے شعبۂ مخطوطات یا مطبوعات سے استفادہ فرمایا۔ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت اور حوالوں کے سلسلے میں اُن کی نقلیں لیں یا یم اے کے نصاب سے متعلقہ یا پی، ایچ، ڈی کی ڈگری کے حصول کے ضمن میں یا پھر اخبارات و رسائل کیلئے فیچروں کی تیاری کے سلسلے میں اُردو کی علمی ادبی اور تاریخی مطبوعات کے ذخیرۂ کتب خانہ سے مواد حاصل کیا (ادارہ)

۱۔ محترمہ ضیاء فاطمہ صاحبہ ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ
۲۔ محترمہ رضیہ صدیقی صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ۔
۳۔ ڈاکٹر ظفرالدین صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔
۴۔ پروفیسر یم سعداللہ صاحب حیدرآباد۔
۵۔ جناب م، ع، علوی صاحب حیدرآباد
۶۔ جناب خواجہ سید شاہ ید اللہ حسینی صاحب سجادہ کڑپہ
۷۔ جناب حفیظ رحمانی صاحب اُستادِ اُردو۔ کڑپہ
۸۔ جناب خواجہ معین الدین صاحب ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۹۔ جناب غلام ربانی صاحب ریسرچ اسکالر الٰہ آباد یونیورسٹی
۱۰۔ جناب محمد ہاشم علی صاحب میسور یونیورسٹی
۱۱۔ ڈاکٹر نورالسعید اختر صاحب بمبئی
۱۲۔ محترمہ محمدی بیگم صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۱۳۔ محترمہ احمدالنساء بیگم صاحبہ " " " " "
۱۴۔ جناب احمد خاں صاحب درویش۔ حیدرآباد۔
۱۵۔ جناب عبدالرحمٰن سعید صاحب حیدرآباد
۱۶۔ جناب محمد منظور احمد صاحب یم اے لکچرار گورنمنٹ کالج کریم نگر
۱۷۔ محترمہ فاطمہ النساء بیگم متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ
۱۸۔ جناب کریم زاہد صاحب " " " " "

۱۹۔ محترمہ میمونہ بانو صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۲۰۔ محترمہ اختر النساء صاحبہ متعلم یم۔ اے۔ جامعہ عثمانیہ
۲۱۔ محترمہ آمنہ رفیع صاحبہ " " "
۲۲۔ محترمہ امۃ الرحیم صاحبہ " " "
۲۳۔ محترمہ غوثیہ سلطانہ صاحبہ " " "
۲۴۔ جناب ملک تجمل حسین صاحب حیدرآباد
۲۵۔ جناب بدیع حسینی صاحب لکچرار اردو آرٹس کالج حیدرآباد
۲۶۔ جناب سید احمد صاحب طالب علم یم۔ اے جامعہ عثمانیہ
۲۷۔ محترمہ حمیرہ جلیلی ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانیہ
۲۸۔ جناب مسیح انجم صاحب مصنف "سائنس سے چلئے" حیدرآباد
۲۹۔ جناب احمد علی ادیب حیدرآبادی مولف اردو ٹیچر
۳۰۔ جناب کرشنوواج سکینہ صاحبہ متعلم یم اے۔ عثمانیہ
۳۱۔ جناب یوسف ندیم ایڈیٹر رہنمائے تلنگانہ حیدرآباد
۳۲۔ جناب سید نعیم الرحمن متعلم یم۔ اے جامعہ عثمانیہ
۳۳۔ جناب محمد اسمٰعیل اقبال صاحب بی ایس سی عثمانیہ
۳۴۔ محترمہ رشید سلطانہ صاحبہ طالبہ یم اے جامعہ عثمانیہ
۳۵۔ جناب سید عبدالحفیظ صاحب متعلم " " "
۳۶۔ جناب عطا کلیانوی صاحب کلیانی ضلع بیدر
۳۷۔ جناب اسلم عمادی عمادی منزل ہمایوں نگر حیدرآباد
۳۸۔ جناب ایاالدین صاحب متعلم یم اے جامعہ عثمانیہ
۳۹۔ جناب سید خضر الدین صاحب " " "
۴۰۔ ڈاکٹر انور معظم صاحب ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی
۴۱۔ جناب حبیب الرحمن صاحب حیدرآباد
۴۲۔ جناب خورشید عالم صاحب "
۴۳۔ جناب اکمل حیدرآبادی صاحب آغاپورہ
۴۴۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی صاحب کالی کمان حی
۴۵۔ جناب مقبول فاروقی صاحب حیدرآباد
۴۶۔ محترمہ قدیرہ بانو صاحبہ ریسرچ اسکالر جامعہ
۴۷۔ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی صاحب [illegible] آغا
۴۸۔ عبدالخالق صاحب انصاری ریسرچ اسکالر مبو
۴۹۔ جناب علی الدین صاحب افضل متعلم یم اے جا
۵۰۔ جناب میر احمد علی صاحب لکچرار شعبہ اردو کیر
۵۱۔ محترمہ اقبال صابر صاحبہ متعلم یم اے جامعہ ع
۵۲۔ محترمہ فوزیہ قریشی صاحبہ " " " "
۵۳۔ محترمہ انور فاطمہ صاحبہ " " "
۵۴۔ جناب طیب انصاری صاحب لکچرار اردو گو
۵۵۔ جناب کریم رومانی صاحب ریسرچ اسکالر ترپتی یو
۵۶۔ ڈاکٹر یوسف شرف الدین صاحب گورنمنٹ
۵۷۔ جناب ذاکر حسین فاروقی صاحب بمبئی یونیور
۵۸۔ محترمہ یالتا اشرف صاحبہ صدر شعبہ انڈولوجی
یونیورسٹی (سوویت یونین)
۵۹۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں صاحب ریڈر جامعہ عثمانیہ
۶۰۔ جناب غلام رسول گرانی صاحب لکچرار گورکھپور
۶۱۔ جناب عبدالوہاب صاحب نیلوری ریسرچ اس
۶۲۔ جناب لبھو سرن صاحب محکمۂ آثارِ قدیمہ حکومتِ
۶۳۔ محترمہ فاطمہ ظفر صاحبہ ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گ
۶۴۔ جناب صلاح الدین نیر صاحب سکریٹری ج
۶۵۔ پروفیسر آفاق احمد صاحب گورنمنٹ کالج بھوپا
۶۶۔ جناب قدیر امتیاز صاحب لکچرار سینٹ جوزف کالج بنگ
۶۷۔ جناب غلام ربانی صاحب علی گڈھ

-جناب سید مقبول علی صاحب وارثی حیدرآباد
-ڈاکٹر محمد عبدالمطلب صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ
-جناب طارق ندیم صاحب متعلم ایم اے۔ رانچی (بہار)
-جناب باذل عباسی صاحب متعلم ایم اے جامعہ عثمانیہ
-جناب غیاث متین صاحب لکچرار انوارالعلوم کالج حیدرآباد
-ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ
-جناب دیری سنگھ چوہان سابق وزیر و ریسرچ اسکالر مہاراشٹر۔ بمبی۔
-جناب اظہر افسر صاحب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد
-محترمہ ذاکرہ غوث صاحبہ ریسرچ اسکالر مدراس یونیورسٹی
-جناب محمود خاور صاحب اڈیٹر برگ آوارہ حیدرآباد
-جناب ضیاء الحق صاحب سابق آرکیاوسٹ دفتر ریاستی اسناد حیدرآباد
-وقار خلیل ۱۸۱/۴-۳-۲۳ سلطان شاہی حیدرآباد ۲

۸۰- ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید لکچرار تروپتی یونیورسٹی آندھرا
۸۱- جناب عبدالکریم صاحب آہر۔ تلے پلی حیدرآباد۔
۸۲- جناب سید مصطفٰے کمال صاحب لکچرار انوارالعلوم کالج حیدرآباد
۸۳- جناب ایم حفیظ الدین صاحب شریک مدیر اسلام اور عصر جدید دہلی۔
۸۴- جناب ضیاء الدین احمد شکیب ایم اے علیگ حیدرآباد
۸۵- جناب شیخ محمد صاحب اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر پی آئی بی حیدرآباد
۸۶- جناب مالک رام صاحب ماہر غالبیات۔ دہلی
۸۷- جناب قاضی محمد ذکریا امیر عارفی صاحب ریسرچ اسکالر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔
۸۸- جناب حکیم حاذق طیفوری صاحب صدر انجمن خیال بمبی
۸۹- محترمہ ارمیلا گپتا صاحبہ ریسرچ اسکالر گیا یونیورسٹی
۹۰- ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب سفیر افغانستان مقیم ہند۔ دہلی

ادارہ کا اشاعتی پروگرام

(۱) ادارہ ۱۹۴۳ء میں مرتبہ وقار خلیل

(۲) تذکرۂ نوادر ایوانِ اردو (جلد دوم)
مرتب: میر سراج الدین علی خاں (زیر ترتیب)

(۳) فہرست مطبوعات کتب خانہ ادارہ (جلد چہارم)
مرتب: محمد اکبر الدین صدیقی (زیر ترتیب)

اعداد و شمار

استفادہ دارالمطالعہ عام و کتب خانہ "ایوانِ اردو"

اوقات: ½۱۰ بجے صبح تا ½۴ ساعت شام ۰ جمعہ ہفتہ واری تعطیل

جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۲ء

ماہ	تعداد	
جنوری	۵۲۵	افراد
فروری	۴۴۳	افراد
مارچ	۴۹۸	افراد
اپریل	۳۶۵	افراد
مئی	۴۶۰	افراد
جون	۴۴۰	افراد
جولائی	۴۷۲	افراد
اگسٹ	۳۴۲	افراد
سپٹمبر	۳۱۰	افراد
اکتوبر	۳۸۱	افراد
نومبر	۳۵۰	افراد
ڈسمبر	۳۴۹	افراد

ترصیص الدین انصاری (نگران کتب خانہ) وقار خلیل (نگران دارالمطالعہ)

اِدارے کا ترجمان ماہنامہ "سب رس"

اِدارہ ادبیات اُردو کا ترجمان ماہنامہ "سب رس" جنوری ۱۹۳۸ء سے پابندی کے شائع ہو رہا ہے جنوری ۱۹۷۲ء سے یہ اپنی عمر کے ۳۵ ویں سال میں داخل ہو چکا ہے۔ اِس طرح "سب رس" نے علم و ادب، تاریخ و تنقید، شعر و زبان کی تین دہائیوں کی سرحد عبور کر کے اپنی چوتھی دہائی میں رواں دواں ہے۔ اِدارہ کے بانی اور معتمدِ اول "سب رس" کے مؤسس اور نگراں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی ادبی یادگار ہونے کا اعزاز بھی "سب رس" کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے بعد یہ رسالہ ملک کے نامور اور بزرگ ماہر تعلیم صدر ادارہ عالی جناب سید علی اکبر صاحب کی نگرانی میں شائع ہو رہا ہے۔ مشاورتی کمیٹی کے اراکین میں جناب میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب رمن لال سکسینہ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، جناب محمد منظور احمد صاحب شامل ہیں۔ اس مجلس مشاورت کے معتمد جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی ہیں جو ادارے کے بورڈ آف ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں اور کتب خانہ اور دارالمطالعہ اور شعبۂ امتحانات کے معتمد بھی۔ ترتیب و کتابت و طباعت کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں اور مضامین وغیرہ کے سلسلے میں مراسلت کے فرائض کی انجام دہی بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے رسالہ ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۷۲ء میں "سب رس" نے اپنے پڑھنے والوں کو پورے بارہ شمارے دیئے۔ ان میں دو ضخیم "یوم محمد قلی قطب شاہ نمبر" اور "بشیر نمبر" بھی شامل ہیں جن کے صفحات کی مجموعی تعداد (۷۳۲) ہوتی ہے۔ "سب رس" کو دکنی ادب سے متعلق مضامین اور تحقیقی مقالوں کی اشاعت میں شروع ہی سے امتیاز حاصل رہا ہے۔ ہند و پاک کی جامعات میں جہاں جہاں دکنیات پڑھائی جاتی ہے وہاں وہاں سب رس سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۷۲ء میں سب رس کے بارہ شماروں میں ادب، تحقیق، تنقید، شعر اور افسانے کے باب میں بہت سی معیاری تحریریں شائع ہوئیں جنھیں دیگر معاصرین نے افادیت کے پیش نظر اپنے اخبارات اور رسائل میں حوالے کے ساتھ ڈائجسٹ کیا ہے۔

ایک سال میں "سب رس" نے مختلف تحقیقی، تنقیدی، علمی اور شعری تحریریں شائع کی ہیں جن میں ۸۷ مضامین، ۳۳ نظمیں، ۴۶ غزلوں کے علاوہ ۳۰ نئی کتابوں اور ایک مجلہ پر تبصرے وغیرہ شائع کئے۔ مضامین کی ایک جامع فہرست اور دیگر تفصیلات اگلے صفحات پر ریسرچ اسکالروں کے استفادہ کی غرض سے بصراحت پیش کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

سب رس نما

فہرست مضامین مطبوعہ سب رس حیدرآباد دکن

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
۲۹	صوفیائے گولکنڈہ	محمد سلیمان صدیقی	جون
۳۰	قطب شاہیوں کے خارجی تعلقات	ضیاء الدین احمد شکیب	"
۳۱	قطب شاہی مورخین	نجمہ صدیقہ	"
۳۲	قطب شاہی دربار میں ایرانی شعراء	محمد اکبر الدین صدیقی	"
۳۳	شاعر کی نوا ہو کہ نفس ہو (محمد قلی)	ڈاکٹر ثمینہ شوکت	"
۳۴	قطب شاہی سلاطین اور تلگو زبان	میر سراج الدین علیخاں	"
۳۵	یوم محمد قلی قطب شاہ آنکھوں دیکھا حال	وقار خلیل	"
۳۶	آبگینۂ شعر کی شاعرہ	پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد	جولائی بشیر نمبر
۳۷	دکن کی مایہ ناز شاعرہ بشیر	جہاں بانو نقوی	"
۳۸	چند پھول چند آنسو	رشید قریشی	"
۳۹	بشیر النساء بیگم بشیر	ڈاکٹر قطب النساء ہاشمی	"
۴۰	خاک میں کیا صورتیں ہونگی	پروفیسر محمد محمود حسین	"
۴۱	تاثرات نظم "روحی"	حمید الدین شاہد	"
۴۲	بشیر کی شاعری	ڈاکٹر سید اطہر جاوید	"
۴۳	بشیر ایک تاثر	سید فضل المتین حسین	"
۴۴	دکن کی مایہ ناز شاعرہ بشیر	وحیدہ نسیم	"
۴۵	بشیر ایک سنجی جائزہ	ڈاکٹر محفوظ علی صدیقی	"
۴۶	دکن کی باکمال شاعرہ	شمیم نصرتی	"
۴۷	محترمہ بشیر اور عالم نسواں	حامد لطیف ملتانی	"

نمبر	عنوان	مضمون نگار	صراحت مہینہ
۴۸	بشیر آبگینۂ شعر کے آئینے میں	عزیز آصف علی	جولائی
۴۹	بشیر النساء بیگم بشیر	سید رفیع الدین قادری	"
۵۰	ایک خط (چند یادیں)	فیض الدین فانی	"
۵۱	بشیر حیدرآبادی	مالک رام	"
۵۲	بشیر کے نام (مکتوب)	ڈاکٹر زور	"
۵۳	بشیر اور آبگینہ شعر	نصیر الدین ہاشمی	"
۵۴	بشیر النساء بیگم بشیر	محمد بن عمر	"
۵۵	" " "	حمید الدین شاہد	"
۵۶	" " "	ڈاکٹر عبدالحفیظ قتیل	"
۵۷	بشیر اور آبگینۂ شعر	سید اللہ بخش توحید	"
۵۸	میری شاعری	بشیر النساء بیگم بشیر	"
۵۹	اقبال مجھے پسند ہے	" " "	"
۶۰	امراؤ جان ادا میں سماجی زندگی کی جھلکیاں	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	اگست
۶۱	اردو شاعری میں انسانی المیے	ڈاکٹر خلیل احمد شبیر	"
۶۲	روس میں اشاریت پسند شعراء	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	"
۶۳	وجدی کا مرثیہ اسمٰعیل خاں بیتی	سید عبدالرحیم	"
۶۴	نسیم دہلوی کی غزل گوئی	سید فضل امام رضوی	"
۶۵	ریاض خیرآبادی کا ملفوظ تلامذہ	ڈاکٹر خلیل اللہ خاں	"
۶۶	اردو ناول میں مصنف کا اظہار شخصیت	پروفیسر شاہ مقبول احمد	اگست
۶۷	سب رس نما (جنوری تا دسمبر ۱۹۷۱ء)	وقار خلیل	ستمبر

نمبر	عنوان	مضمون نگار	اشاعت مہینہ
۶۸	اُردو زبان اور ادب مسائل اور تقاضے - (تاثر)	آفاق حسین صدیقی	اکتوبر
۶۹	عثمانیہ میڈیکل کالج حیدرآباد	سیّد ضیاء الحق	〃
۷۰	میرے چند مخطوطات	ڈاکٹر محمد عبدالرحمٰن بارکر	〃
۷۱	انہار رام پوری شخصیت و شاعری	شارق میرٹھی	〃
۷۲	تلگو میں دخیل اُردو الفاظ	شیخ قادر علی	〃
۷۳	کلام محمد علی جوہر	محمد بدیع الزماں	〃
۷۴	عوامی اور ٹکسالی زبان	علیم جہانگیر	〃
۷۵	امیراللہ تسلیم بحیثیت قصیدہ نگار	ڈاکٹر فضل امام رضوی	نومبر
۷۶	مصحفی کا عصری شعور	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید	〃
۷۷	اردو نثر نگاری کے جدید رجحانات	ڈاکٹر احمد سجاد	〃
۷۸	ابو علی الحسین ابنِ سینا	جلال الدین سعید	〃
۷۹	حالی اور عصرِ جدید	طیّب انصاری	〃
۸۰	آیڈلنس حسینی از شاہ تراب	ڈاکٹر نور السعید اختر	〃
۸۱	غالب اور خدا	مفتون کوٹوی	〃
۸۲	دسویں صدی ہجری کے شعراء کی چند غزلیں	محمد اکبرالدین صدیقی	دسمبر
۸۳	رشید احمد صدیقی کا اسلوب بیان	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی	〃

نمبر	عنوان	مضمون نگار
۸۴	کرشن چندر اور شکست	ایم، اے، نعہ
۸۵	سیرت عائشہؓ	ابو علی آعظمی
۸۶	ذکرِ بشیر	مرزا ضامن علی غا
۸۷	جرم محمد آبادی کی شاعری	معصوم شرقی
۸۸	قانی اور اس کا غم	بی، پاشا

نظمیں

"سب رس" جنوری تا دسمبر ۱۹۷۲ء میں نظمیں (۱۰) رباعیات اور دو قطعات شائع
ذیل میں نظموں کے عنوانات اور شعراء کے نام بلحاظ ترتیب اشاعت درج کئے جاتے

۱- دلہن اور دل از اختر بستوی
۲- عہد وفا از نور الحسن انور ادیب
۳- قطعہ تاریخ رحلت بشیر از مراد علی طالع
۴- ایک نثر نظم از ایچ ایل ناگے گورڈر حمیدا
۵- ریڈیائی ابتلا از فرحت قمر
۶- قطعہ تاریخ رحلت عارف الدین حسن از اکبر الدٰ
۷- علم کا جگنو از وقار خلیل
۸- آہ عارف از بشیر احمد طاہر
۹- ناکام آرزو از اختر بستوی
۱۰- شاہانِ قطب شاہیہ اور اُن کے آثار — باقر امانت خانی
۱۱- یادِ صنادید از بشیر النساء بیگم بشیر
۱۲- اردو کی پہلی غزل بھاگ متی از ڈاکٹر

۱۳- محمد قلی قطب شاہ کے نام از بانو طاہرہ سعید
۱۴- محمد قلی کی یاد از فضل الرحمن سعید جلالی
۱۵- شہر خیال از اسلم عمادی
۱۶- سانحۂ ارتحال بشیر از ابوظفر عبدالواحد
۱۷- آہ بشیر (رباعیات) جذب عالمپوری
۱۸- بشیر از خورشید احمد جامی
۱۹- بشیر کے نام از سعید شہیدی
۲۰- بشیر کے نام از ابن احمد تاب
۲۱- بشیر کے نام از خیرات ندیم
۲۲- قطعہ تاریخ وفات از خواجہ شوق
۲۳- تاریخ وفات از عارف ابوالعلائی
۲۴- نوحہ سانحۂ ارتحال از مراد علی طالع
۲۵- قطعہ از امجد صدیقی
۲۶- بہن سکینہ بیگم کے نام از بشیر النساء بشیر
۲۷- ادبی از بشیر النساء بشیر
۲۸- نیرنگئ زمانہ از بشیر النساء بشیر
۲۹- نوائے وقت از بشیر النساء بشیر
۳۰- مسافر از بشیر احمد طاہر
۳۱- سفر دلی از عبدالرؤف
۳۲- رباعیات از مظفر حنفی
۳۳- رباعیات و قطعات از صادق حیدرآبادی

غزلیں

سب رس جنوری تا دسمبر ۱۹۷۲ء کے شماروں میں (۴۶) غزلیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے بعض شعراء کی ایک سے زیادہ غزلیں بھی چھپیں۔ بلحاظ ترتیب اشاعت شعراء کے نام نامی درج کئے جاتے ہیں۔

مظفر حنفی - حباب ہاشمی - بشیر احمد طاہر۔ مظفرالدین خاں صاحب، غلام مرتضیٰ راہی، اخلاق فتح پوری، عبدالمتین نیاز، یوسف جمال، رونق دکنی سیمابی - منظر حسن دسنوی - شاکر کرنپوری، وفا سکندر پوری - مہدی پرتاب گڈھی - تابش صدیقی- واحد پریمی - ثمر لبوانی - ریورنڈ ہنسن ریکانی - ڈاکٹر شیدا دہلوی، قطب سرشار، بشیر النساء بیگم بشیر سعادت نظیر - محمد شفیع الدین خاں شفیع - تاج مہجور حسنی سرور، کریم اسعدی - محمد منظور احمد منظور- حفیظ قضا - نور محمد نور۔

انتخاب مشاعرہ یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۷۲ء کی اشاعت

سب رس کے محمد قلی قطب شاہ نمبر جون ۱۹۷۲ء میں غیر طرحی مشاعرہ کے اقتباسات بھی شائع ہوئے۔ جس میں حیدرآباد کے قدیم و جدید مکاتیب خیال کے ۵۰ شعراء نے حصہ لیا تھا۔ جن شعراء صاحبان کا کلام شائع ہوا ہے۔ ان کے نام درج ذیل ہیں، نظم گو شعراء کے نام شامل ہیں :-

اما ن ارشد - اسحق ملک - ڈاکٹر اسد انصاری - اسلم عمادی - اکمل حیدرآبادی، ڈاکٹر رگھونندن راج سکینہ الہام - برق یوسفی - احمد معین الدین بزمی- مغز لال بہار، شمس الدین تاباں - رحمن جامی- حسن فرخ - فیض الحسن خیال - راجہ لال راجہ - روف خلش - روف خیر - ریورنڈ ریکانی - رئیس اختر

ستار چشتی۔ سعید شہیدی۔ شاہدہ محبوب، شفیع الدین خاں شفیع، شمیم نصرتی، مظفر الدین خاں صاحب۔ عباس عابدی۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی نکہت بدایونی۔ کنول پرشاد کنول۔ مسعود عابد۔ محمد منظور احمد۔ خیرات ندیم۔ خورشید نذیر۔ علی الدین نوید اور سوقار خلیل۔

تبصرے

"سب رس" نے ہمیشہ سیر حاصل اور معیاری تبصرے شائع کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ جنوری تا ڈسمبر ۱۹۷۲ء کے شماروں میں (۳۰) نئی مطبوعات اور ایک مجلہ پر تبصرے اشاعت پذیر ہوئے۔ تبصرہ کرنے والوں میں ادارہ کے خصوصی تبصرہ نگار جناب محمد اکبر الدین صدیقی صاحب ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کے علاوہ جناب سید ابراہیم ندوی۔ جناب اسلم عمادی اور جناب یس' جے' صادق صاحبان شامل ہیں۔

ذیل میں تبصرہ شدہ مطبوعات کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔

کتب

۱۔ جدید عربی ادب کا ارتقاء از ڈاکٹر احتشام احمد ندوی
۲۔ تذکرہ اولیائے حیدرآباد (حصۂ دوم) از سید مراد علی طالع
۳۔ آئینہ (شاعری) تاج پیامی
۴۔ تصورات بیدل (کلام) کیلاش نارائن کول بیدل
۵۔ ایسے تھے گاندھی جی (سوانح) یو'آر' راؤ
۶۔ بساط زیست (شاعری) ڈاکٹر کنول ڈبائیوی
۷۔ نیل کی ناگن (ڈرامہ) سید منجو قمر
۸۔ یہ ایک تبسم (طنز و مزاح) برق آشیانوی
۹۔ نجات سے پہلے (نظمیں) قاضی سلیم
۱۰۔ رہنمائے بنگلہ دیش (نثر و نظم) یوسف ندیم
۱۱۔ الہام ثانی (رباعیات) ڈاکٹر رگھو نندن راج سکینۃ الہام
۱۲۔ وقت کی صدیاں (مجموعۂ کلام) داؤد غازی مرحوم
۱۳۔ حرف شوق (غزلیں) محمد منظور احمد منظور
۱۴۔ چند مشاہیر (سوانح) عبدالاحد معظم آبادی)
۱۵۔ سیرت خواجہ بندہ نواز مرتبہ نور الحسینی مصطفیٰ قادری۔
۱۶۔ تازہ افسانے معہ حصۂ نظم از بشیر احمد طاہر
۱۷۔ مئے باقی (شاعری) بشیر احمد طاہر
۱۸۔ تیر نیم کش (طنز و مزاح) بھارت چند کھنہ
۱۹۔ ترجمان القرآن (جلد چہارم) مولانا ابوالکلام آزاد
۲۰۔ نقد ابوالکلام از ڈاکٹر رضی الدین احمد صدیقی
۲۱۔ مسلمان اور عصری مسائل از ڈاکٹر سید عابد حسین
۲۲۔ تذکرۂ معاصرین مرتبہ مالک رام
۲۳۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ از ڈاکٹر فاڈنگ/ ڈاکٹر خلیق انجم
۲۴۔ خط رہگزر (شاعری) اکبر حیدرآبادی
۲۵۔ سید احمد خاں (سوانح) خلیق احمد نظامی
۲۶۔ آب حیات (تذکرہ) تلخیص پروفیسر احتشام حسین
۲۷۔ زخموں کے گلاب (شاعری) صلاح الدین نیر
۲۸۔ سنگ ریزے (شاعری) حیرت گوکنی
۲۹۔ سنگ گراں (شاعری) عارف قادری/ ظفر رضوی
۳۰۔ قصہ مختصر (طنز و مزاح) مجتبیٰ حسین

رسائل

سہ ماہی "شعر و حکمت" حیدرآباد ایڈیٹر ڈاکٹر مغنی تبسم شہریار

سب رس کے تبادلے میں آنیوالے
رسائل وجرائد کی تفصیلات

مندرجہ ذیل رسائل وجرائد ایوان اُردو کے دارالمطالعہ عام میں قارئین کے مطالعہ کے لئے رکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند ایک رسائل وجرائد کو چھوڑ کر "سب رس" کے تبادلے میں آتے ہیں جنکی مجموعی تعداد (۱۵۱) ہے اور بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی (علیگڑھ) ہندوستان کے کسی دارالمطالعہ میں اس قدر تعداد میں معیاری رسائل وجرائد یکجا نہیں دیکھے اس طرح "ایوانِ اُردو" کا دارالمطالعہ اُردو دُنیا کا پہلا معیاری اور وسیع مطالعہ خانہ ہے۔

ہم تمام ہندو پاک اور بیرون ہند کے مدیران جرائد کے ممنون ہیں جو پابندی کے ساتھ "سب رس" کے تبادلے میں اپنے "رسائل" و "جرائد" ارسال فرماتے ہیں اُمید ہے کہ یہ تعاون مستقلاً برقرار رہے گا۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ختم سال پر ایسے تمام رسائل وجرائد کی اچھی اور پائیدار جلدیں بنوائی جاتی ہیں اور انہیں ادارے کے کتب خانہ میں درج رجسٹر کرکے استفادہ کیلئے محفوظ کردیا جاتا ہے اور ہر دوسرے یا تیسرے سال ادارے کے کتب خانہ کی کتابوں اور رسالوں کی ایک باضابطہ ضخیم فنواری فہرست اشاریہ کے ساتھ شائع کی جاتی ہے اس سلسلے میں ابتک فہرست کتب خانہ ادارہ کی تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور اب چوتھی جلد مرتب ہوچکی ہے' ادارے کے کتب خانے میں بے شمار اہم اور تاریخی کتب اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کئی اہم رسائل وجرائد کی فائلیں بھی محفوظ ہیں۔

۱۸۵۷ء سے پہلے اور اب تک کے نادر اور علمی ادبی رسایل اور کتابوں سے آئے دن ادب دوست اصحاب اور ریسرچ اسکالرس صاحبان ہر روز ۱۰ تا ۲ م ساعت استفادہ کرتے رہتے ہیں جمعہ کو ایوانِ اُردو بند رہتا ہے۔

اس افادی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے قارئین اور اُردو دوستوں کے ساتھ ساتھ مدیران رسائل وجرائد سے خواہش کریں گے کہ وہ اس قسم کے ریکارڈ اور یکجائی میں ہم سے بھرپور تعاون فرمائیں اور جب کبھی اپنا ایسا ادبی ذخیرہ قدیم وجدید کتب و رسایل چھانٹنا یا نکالنا چاہیں تو براہ کرم تحفتہً مرحمت فرمائیں جو معطی کے شکریہ کے ساتھ کتب خانے میں داخل کرلئے جائیں گے اور فہرست کتب خانہ میں معطی کے اسمِ گرامی کے ساتھ درج بھی ہونگے ــــــ اُمید ہے کہ ماہرین اور دیگر ادب دوست اصحاب اور مختلف علمی وادبی تنظیموں کے سربراہ ہم سے تعاونِ عمل فرماکر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔ (ادارہ)

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرِ سالانہ
		شش ماہی			
۱	اُردو ادب	انجمن ترقی اُردو ہند، علی گڑھ (یو۔پی)	پروفیسر آل احمد سرور	۱۴۴	۱۵ = ۰۰
۲	امریکن ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس، سکندرا روڈ، نئی دہلی ۱	مارگریٹ کلاب	۱۱۶	۴ = ۰۰
۳	امریکن لیبر ریویو (")	" " " " "	" "	۹۸	۴ = ۰۰
۴	تحریر	علمی مجلس ۲۹ ۱۴، چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ دہلی	مالک رام	۲۵۰	۱۵ = ۰۰
۵	سنگیت ناٹک (")	رابندرا بھون۔ دہلی	"	۸۰	—
۶	شعر و حکمت	۴-۲-۲۲۷ بازار نور الامرار، حیدرآباد ۲۴	ڈاکٹر مغنی تبسم، شہریار	۲۲۰	۶ = ۰۰
۷	صبح	انجمن ترقی اُردو، علی منزل، کوچہ پنڈت۔ دہلی ۶	عبداللطیف اعظمی	۲۰۰	۱۰ = ۰۰
۸	نوائے ادب	ادبی پبلیشرس، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۱	عبدالرزاق قریشی	۸۰	۱۰ = ۰۰
۹	ورتا وہا (انگریزی)	سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، مانسا گنگوتری میسور	ڈی۔پی۔ پٹناگ	۳۰	-
۱۰	ہندوستانی زبان (ہندی اردو)	مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر، سبھاش روڈ۔ بمبئی ۲	ڈاکٹر عبدالستار دلوی	۱۲۰	۲ = ۰۰
۱۱	ہما لکھنو	ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹیڈیز، پوسٹ بکس ۱۲۷ حیدرآباد	ڈاکٹر طالب شاد آبادی	۱۱۲	۴ = ۰۰
۱۲	یونسکو کرانیکل (انگریزی)	یونسکو ہاوس۔ پیرس	ناظم یونسکو	۳۲	-
		دوماہی			
۱۳	پرابلم آف کمیونزم (انگریزی)	یو۔ایس، انفارمیشن ایجنسی، واشنگٹن (ڈی۔سی)	ابرام برگ	۸۰	—
۱۴	شاخسار	بخشی بازار، کٹک (۱) اڑیسہ	امجد نجمی	۱۴۴	۹ = ۰۰
۱۵	شیرازہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سری نگر	محمد یوسف ٹینگ	۱۴۲	۱۰ = ۰۰
		ڈیڑھ ماہی			
۱۶	شگوفہ	۲۷، بیچلرس کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱	مصطفےٰ کمال	۵۶	۱۰ = ۰۰
		ماہنے			
۱۷	آجکل	پٹیالہ ہاوس نئی دہلی ۱	مہدی عباس حسینی	۶۴	۸ = ۰۰

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
۱۸	آب و آتش	نظام آباد (اے۔پی)	مغنی صدیقی	۴۰	۶=۰۰
۱۹	اردو اکیڈیمی جرنل	دفتر اردو اکاڈمی اترپردیش ۱۱ حضرت گنج لکھنؤ	صباح الدین عمر	۱۶	-
۲۰	آندھرا پردیش (اردو)	محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ کرم جاہی روڈ حیدرآباد ۱	اختر حسن	۴۸	۶=۰۰
۲۱	المجیب	خانقاہ مجیب پھلواری شریف پٹنہ (بہار)	احمد حسین سہرامی	۴۸	۶=۰۰
۲۲	آہنگ	کلچرل اکیڈیمی جگ جیون روڈ گیا (بہار)	کلام حیدری	۷۲	۱۲=۰۰
۲۳	الحق	۷-۳۹۶-۱۴/۱ روبرو گیان باغ سیتا رام پیٹھ حیدرآباد	سید عبدالجلیل	۴۸	حسب استطاعت
۲۴	امریکن ریپر ریویو (انگریزی)	چانکیہ پوری، شانتی پتھ - نئی دہلی ۱۲	پی' ایچ' ہیلین	۲۲	۱=۰۰
۲۵	انڈین لٹریچر (انگریزی)	۸/۲ رام نگر نئی دہلی ۱	لکشمن شاستری	۳۲	۶=۰۰
۲۶	بانو	آصف علی روڈ - اجمیری گیٹ - نئی دہلی ۱	زینت کوثر دہلوی	۶۴	۱۵=۰۰
۲۷	برہان	جامع مسجد، اردو بازار - دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	۷۰	۸=۰۰
۲۸	بڑھتے قدم	۱۲۳۵- بلیماران - دہلی (۱۱۰۰۰۶)	جاوید عظمت	۳۰	۳=۰۰
۲۹	بلٹن (انگریزی)	انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اڈوانسڈ اسٹڈیز راشٹرپتی نواس شملہ	وینکٹ رامن	۲۰	-
۳۰	بنت حوا	۱۴ کمرشیل چیمبرس کارنر محمد علی اینڈ یوسف مہر علی روڈ بمبئی ۳	مفیدہ خاتون	۷۴	۱۲=۰۰
۳۱	بیسویں صدی	انصاری مارکٹ، دریا گنج - دہلی ۶	خوشتر گرامی	۱۲۰	۱۵=۰۰
۳۲	پونم	۱/۱/۳۰-۷-۱۶ اعظم پورہ، حیدرآباد ۲۴	ناصر کرنولی	۳۲	۱۵=۰۰
۳۳	پیام تعلیم	جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵	محمد حسین حسان ندوی	۶۴	۸=۰۰
۳۴	پیکر	۲۱۴-۶-۳ مخدوم محی الدین مارگ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹	اعظم راہی	۸۴	۱۲=۰۰
۳۵	تجلی	دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)	عامر عثمانی	۶۴	۸=۰۰
۳۶	تحریک	۹-انصاری مارکیٹ - دریا گنج - دہلی ۶	گوپال متل	۶۴	۱۰=۰۰
۳۷	تعارف ادب	مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی	شمیم احمد	۱۶	۴=۰۰
۳۸	جامعہ	جامعہ نگر - نئی دہلی ۲۵	ضیاء الحسن فاروقی	۴۸	۶=۰۰
۳۹	جانثار	۶۸، سبھاش نگر گڑھ شیر سنگھ امرت سر (پنجاب)	سلام وفا	۵۰	۱۰=۰۰

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرِ سالانہ
۴۰	جمالستان	۳۶۴- بازار مٹیا محل دہلی ۶	نجم صدیقی	۶۴	۸=۰۰
۴۱	حریم	نسیم بکڈپو- لاٹوش روڈ لکھنؤ (یوپی)	نسیم انہونوی	۴۸	۷=۰۰
۴۲	خاتونِ دکن	۲۳۹-۳-۲۲ گھر کی باولی- حیدرآباد ۲	صالحہ الطاف	۴۰	۶=۰۰
۴۳	زبان وادب	آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی ۶	معراج احمد	۳۰	۳=۰۰
۴۴	زادِ آخرت	۲۲۶-۲-۶ اے سی گارڈ، حیدرآباد ۱۵ اے پی	شکراللہ رحمانی	۳۲	۸=۰۰
۴۵	زیور	سبزی منڈی- پٹنہ ۸ (بہار)	رضوان احمد	۶۴	۸=۰۰
۴۶	ساہتیہ اکیڈمی تحقیقی جرنل (انگریزی)	رابندرا بھون، فیروز شاہ روڈ نئی دہلی ۱	پی، ماچوے	۴۰	۶=۰۰
۴۷	سبدِ گل	۷۰، اَپر چیت پور روڈ، کلکتہ (۱)	نازش صدیقی	۴۰	۵=۰۰
۴۸	سنٹر کالینگ (انگریزی)	فیملی پلاننگ ڈپارٹمنٹ حکومتِ ہند کوٹلا روڈ- (نئی دہلی)	ایس اے کپور	۱۲	-
۴۹	سوویٹ فیچر (انگریزی)	۱/۲ کرتوزوسکی پروسپیکٹ- ماسکو (یو ایس ایس آر)	سادر ڈنگورف	۱۸۴	-
۵۰	سیکولر ڈیموکریسی (اردو)	۱۹/۹ تعمیر کمیونی کیشن بلڈنگ کناٹ سرکس نئی دہلی ۱	ڈاکٹر خلیق انجم	۴۸	۱۰=۰۰
۵۱	سہیل	باری روڈ- گیا (بہار)	ادریس سنہساروی	۳۲	۴=۰۰
۵۲	شاعر	مکتبۂ قصرالادب پوسٹ بکس ۵۲۶۷ بمبئی ۸ (بی آر)	اعجاز صدیقی	۸۰	۱۰=۰۰
۵۳	شانِ ہند	فلیٹ نمبر ۹- انصاری مارکٹ دہلی ۶	سرور تونسوی	۴۰	۷=۰۰
۵۴	شاہجہاں	قاسم جان اسٹریٹ بلیماران دہلی ۶	عتیق صدیقی	۳۲	۳=۰۰
۵۵	شاہکار	۱۱۰- مدن پورہ- بنارس (یوپی)	محمود احمد ہنر	۱۴۰	۱۵=۰۰
۵۶	شب خون	۳۱۳، رانی منڈی الہ آباد ۳	عقیلہ شاہین	۸۰	۱۲=۰۰
۵۷	شفا ڈائجسٹ	شفا پبلی کیشنز بینا جھابر کانپور ۲	ڈاکٹر ضیاء احمد انصاری	۱۴۸	۱۵=۰۰
۵۸	شمع	آصف علی روڈ- اجمیری گیٹ نئی دہلی ۱	یوسف دہلوی	۱۳۴	۱۵=۰۰
۵۹	شمعِ ملت	ادارہ تحریک سیرت النبی امیر پیٹھ حیدرآباد ۱۶	-	-	-

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرسالانہ
۶۰	صبح اُمید	بلاسیس روڈ۔ بمبئی ۸	عبدالحمید بوبیرے	۴۸	۶=۰۰
۶۱	صبح نو	"بشیرلاج" قطب الدین لین پٹنہ ۴ (بہار)	دنا ملکپوری	۵۶	۱۵=۰۰
۶۲	فارن افیرس ریکارڈ (انگریزی)	شعبۂ تشہیر۔ وزارت خارجہ حکومت ہند دہلی	-	۶۴	-
۶۳	فروغ اُردو	۳۷۔ امین آباد پارک۔ لکھنؤ (یو پی)	محمد حسین شمس علوی	۴۰	۴=۰۰
۶۴	کتاب	کیسر باغ مارکٹ۔ لکھنؤ ۱ (یو پی)	عابد سہیل	۸۰	۱۲=۰۰
۶۵	کتاب نما	مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵	دتی شاہجہاں پوری	۴۸	۳=۰۰
۶۶	کرنٹ ڈیولپمنٹ (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس نئی دہلی ۱	رانیال پی ادلکسو	۲۴	-
۶۷	کشاف	اسٹیٹ اسکاؤٹ ہیڈکوارٹرس دول گوڑہ حیدرآباد ۲۹	دستگیر غزمی	۲۴	۶=۰۰
۶۸	کنول	سیجوا۔ دھن بار (بہار)	شان بھارتی	۴۰	۶=۰۰
۶۹	کھلونا	آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۱	الیاس دہلوی	۶۴	۱۲=۰۰
۷۰	گگن	شعیب پیلیس نفیسہ فلور ۱۳۲ کامبے کر اسٹریٹ بمبئی ۳	شمس کنول	۶۴	۱۲=۰۰
۷۱	گلِ نو	۳۴۶-۷-۲۲۔ چھتہ بازار حیدرآباد ۲	انور نظامی	۴۰	۶=۰۰
۷۲	ماہنیر (اُردو)	ماہنیر اشاعت گھر۔ کریم نگر (اے پی)	کمال کریم نگری	۳۲	۶=۰۰
۷۳	مجرم	آصف علی روڈ۔ نئی دہلی ۸	ادریس دہلوی	۱۶۰	۱۲=۰۰
۷۴	محبِ وطن	چشتی چمن۔ حیدرآباد ۲ (اے۔ پی)	شبیر قادری افتخاری	۴۸	۶=۰۰
۷۵	معارف	دارالمصنفین۔ اعظم گڈھ (یو پی)	معین الدین احمد ندوی	۶۴	۸=۰۰
۷۶	معمار	منتخبی بلاکس آرمور (نظام آباد) 503224	اے آر جاوید	۶۸	۶=۰۰
۷۷	منادی	درگاہ حضرت نظام الدین اولیا۔ نئی دہلی ۱۳	حسن ثانی نظامی	۴۸	۶=۰۰
۷۸	نگارشات	ایک کارنر دانشمندان اسٹریٹ امروہہ دہلوی	ایچ ایم رضوی	۱۶	۲=۰۰
۷۹	نقش کوکن	۴۴ جیل روڈ۔ ایسٹ ڈونگری بمبئی ۹	یونس اگاسکر	۶۰	۸=۰۰
۸۰	نوری کرن	بازار صندل خاں۔ بریلی (یو پی)	اقبال احمد نوری	۴۸	۶=۰۰
۸۱	نیا دور	محکمۂ اطلاعات اتر پردیش لکھنؤ	خورشید احمد	۵۶	۶=۰۰
۸۲	ویت نام میگزین (انگریزی)	ویت نام کونسل فار فارن ریلیشن۔ سائیگاؤں (ویت نام)	الائی پاؤ	۴۰	-

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زر سالانہ
۸۳	ہمایوں	۸-۱۲/۷ تلک نگر دہلی ۱۸	تاجور سامری	۴۸	۵=۰۰
۸۴	ہندوستانی ادب	۸/۹۹ اعظم پورہ حیدرآباد - ۳۶	جی ایم خاں	۶۴	۵=۰۰
		پندرہ روزہ			
۸۵	امریکن پیپر ریویو (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس - نئی دہلی ۱	موریس ڈیانہر	۲۸	=۰۰
۸۶	بھودان تحریک	ہندرا روڈ - پٹنہ ۶ (بہار)	احمد فاطمی	۸	=۰۰
۸۷	پریس ریلیز نیدرلینڈ (اردو)	ندرلینڈ ایمبیسی - شانتی پتھ چانکیہ پوری دہلی	-	۸	-
۸۸	ٹراویل نیوز ایران (انگریزی)	ایران نیشنل ٹورسٹ آرگنائزیشن - طہران	-	۱۲	-
۸۹	تڑپ	۲/۳۹-۵-۱۰۰ مانصاحب ٹینک حیدرآباد ۲۸	خالد قادری	۸	=۰۰
۹۰	دور حیات	۱-۹۷-۱۰-۱۵ اے سی گارڈ - حیدرآباد	عمر بن علی	۸	=۰۰
۹۱	زرافشاں	۴۴۹ - حبیب نگر حیدرآباد ۱	مسعود جاوید	۸	=۰۰
۹۲	سلامتی	مومن پورہ گلبرگہ ۴ (کرناٹک)	حکیم شاکر	۱۲	=۰۰
۹۳	سوویت دیس (اردو)	۲۵ - بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	جمیل اختر	۴۸	۱=۰۰
۹۴	کرنٹ سائنس (انگریزی)	یونائیٹڈ سٹیٹس انفارمیشن سروس دہلی	ڈی، آمر	۴۰	۱=۰۰
۹۵	نغمہ حیات	کالاڈیرہ - حیدرآباد ۲۶	انور کمال خوندمیری	۶	=۰۰
۹۶	فرانس	انفارمیشن سروس ایمبیسی آف فرانس ۲ اورنگ زیب روڈ نئی دہلی ۱۱	فلورنس پیرودیلا	۲۸	=۰۰
۹۷	مغربی بنگال	نظامت اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت مغربی بنگال کلکتہ	-	۱۶	=۰۰
۹۸	ہماری منزل	۵-۷/۹۸ نامپلی مارکٹ حیدرآباد ۱	شفیع اقبال	۸	=۰۰
		(ہفتہ وار)			
۱۰۰	آدرش	آ بگلہ بنیاد گنج - گیا (بہار)	معین شاہد	۴	=۵۰
۱۰۱	آندھرا پنچ	اوپل کلاں - حیدرآباد ۲۳ (اے پی)	ملک محمد علی خاں	۶	=۰۰
۱۰۲	ادبی خبریں	ادبی سفارت خانہ ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	-	۸	برائے صحافہ
۱۰۳	امریکن رپورٹر (اردو)	امریکن انفارمیشن سروس - نئی دہلی ۱	ڈی - بی مست	۱۲	=۰۰
۱۰۴	امریکن رپورٹر (تلگو)	امریکن انفارمیشن سروس سکندرا روڈ نئی دہلی	ڈینس ڈی ڈونالڈ	۱۲	=۰۰

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	زرسالانہ
۱۰۵	امریکن رپورٹر (انگریزی)	امریکن انفارمیشن سروس، سکندرا روڈ، نئی دہلی ۱	ڈینس ہڈی ڈونالڈ	۱۲	۳ = ۰۰
۱۰۶	افکار و جائزے	روسی سفارت خانہ ۲۵، بارہ کھمبا روڈ، نئی دہلی	—	۱۲	برائے صحافت
۱۰۷	اردو سپیز فلیر (انگریزی)	۱/۹۲۳-۳-۱۱ تھیلی - حیدرآباد ۱	شاہد عظیم	۸۰	۱۰ = ۰۰
۱۰۸	ایشیاء	اردو بازار - جامع مسجد دہلی	ہرنارائن	۱۲	۹ = ۰۰
۱۰۹	برگِ آوارہ	ترپ بازار حیدرآباد ۱	محمود خاور	۸	۱۲ = ۰۰
۱۱۰	بلٹز (اردو)	۱۷/۱ کاوس جی پٹیل روڈ بمبئی ۱	منیش سکینہ	۱۲	۲۰ = ۰۰
۱۱۱	پرچا	اعظم روڈ - نظام آباد (اے پی)	عابد انصاری	۴	۶ = ۰۰
۱۱۲	پرچم ہند	گلی قاسم جان - بلیماران - دہلی ۶	انیس الرحمٰن	۲۴	۱۲ = ۰۰
۱۱۳	پریس بلیٹن	پی آئی بی مبارک منزل - عابد روڈ - حیدرآباد	اسحٰق ایوبی	۱۲	برائے صحافت
۱۱۴	پیام انقلاب	سری نگر (کشمیر)	خواجہ غلام محمد	۴	۸ = ۰۰
۱۱۵	تعمیر	کالج روڈ - محبوب نگر (اے پی)	محمد عبد العزیز	۸	۱۵ = ۰۰
۱۱۶	تھاٹ (انگریزی)	۳۵ نیتاجی سبھاش مارگ، دہلی ۶	رام سنگھ	۲۴	۱۵ = ۰۰
۱۱۷	تھرل (انگریزی)	نیو ملک پیٹھ حیدرآباد - ۳۶	علاؤ الدین حبیب	۱۲	۱۵ = ۰۰
۱۱۸	تیشہ	۱۴-۶-۳ مخدوم مارگ حمایت نگر حیدرآباد ۲۹	اعظم راہی	۶	۸ = ۰۰
۱۱۹	خیابان (انگریزی)	فردوسی - طہران (ایران)	کاظم زرنگار	۸۰	—
۱۲۰	دلیر	جموں (کشمیر)	—	۱۲	۸ = ۰۰
۱۲۱	ذوالقرنین	نظامی بکڈپو بداؤں (یو پی)	احمد الدین نظامی	۱۲	۱۲ = ۰۰
۱۲۲	رہنمائے تلنگانہ	سروج نگر - یوسف گوڑہ - حیدرآباد ۳۸	یوسف ندیم	۴	۸ = ۰۰
۱۲۳	رہنمائے وقت	نامپلی روڈ - حیدرآباد ۱	عثمان شہبا	۴	۱۵ = ۰۰
۱۲۴	رفیق ملت	مدراس	—	۸	۶ = ۰۰
۱۲۵	سوویت جائزہ	۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	محمد معظم	۳۲	[illegible]
۱۲۶	سماتا (اردو)	جالندھر (پنجاب)	[illegible]	۸	[illegible]
۱۲۷	شعور	[illegible] حیدرآباد ۲۹	[illegible]	۸۰	[illegible]
۱۲۸	طلبہ کی خبریں	روسی سفارت خانہ ۲۵، بارہ کھمبا روڈ - نئی دہلی	—	۴	برائے صحافت
۱۲۹	عوامی اقتدار	۳۲۰ بی، نیو ملک پیٹھ - حیدرآباد ۳۶	ایم - اے جلیل	۸۰	۱۲ = ۰۰

نمبر	نام رسالہ	مکمل پتہ	نام مدیر	صفحات	ز
۱۳۰	قادم نیوز بلیٹن (انگریزی)	مرکزی وزارت اغذیہ دہلی	-	۸	
۱۳۱	فکر جمہور	محلہ کاجل پیٹھ۔ نظام آباد (اے۔ پی)	حافظ سید معظم علی	۴	٥
۱۳۲	فلمی دنیا	نامپلی، اسٹیشن روڈ، حیدرآباد	عثمان اشیدا	۸	۱٥
۱۳۳	فصاحت	جینبلی کا منڈوا۔ کوٹلہ علی جاہ۔ حیدرآباد ۲	غضنفر علی نقوی	۸	٥٥
۱۳۴	قومی محاذ	جونا بازار۔ اورنگ آباد (مہاراشٹرا)			
۱۳۵	کانفرنس گزٹ	آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ علی گڈھ	حبیب الرحمن خاں شروانی	۱۲	٥
۱۳۶	کوثر	اشوکا روڈ۔ میسور (کرناٹک)	خلیل بیباک	۴	۱٥
۱۳۷	گلزار	۱۷-۷-۸۱۶ بیرون یاقوت پورہ، حیدرآباد ۲۳	ایم اے رؤف / یوسف ندیم	۸	۱۰
۱۳۸	گولکنڈہ ٹائمز	۲۲-۱-۵-۵ ہندی نگر، گرشہ محل حیدرآباد ۱۲	ڈی چند ششی	۸	
۱۳۹	مصنف	چارمحل۔ حیدرآباد ۲ اے پی	جعفر حسین جعفری	۴	٥
۱۴۰	مورچہ	بیراگی۔ گیا (بہار)	کلام حیدری	۱۲	۱۰
۱۴۱	موج	۱۱-۲-۲۷۸ روبرو مسجد ٹیک۔ نامپلی، حیدرآباد ۱	محمد فضل الرحمن نفضی	۸	٥٥
۱۴۲	نیا آدم	۶۴۸، گلی منڈی۔ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد	امجد باغی	۱۲	٥٥
۱۴۳	واقعات و تبصرے	روسی سفارت خانہ ۲۵، بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	—	۸	برائے
۱۴۴	ہماری زبان	انجمن ترقی اردو ہند علی گڈھ	پروفیسر آل احمد سرور	۱۲	٥٥
		دوروزہ			
۱۴۵	سوویت یونین کی خبریں	تاس ۲۵ بارہ کھمبا روڈ نئی دہلی	—	۱۲	برائے
۱۴۶	سوویت فیچر	" " " " "	—	۸	"
		روزنامے			
۱۴۷	انگارے	ونایک راؤ بلڈنگ جامباغ روڈ حیدرآباد ۱	معین فاروقی	۶	٥٥
۱۴۸	ترجمان	پنڈی اسٹریٹ۔ لدھیانہ (پنجاب)	امرداس بھاٹیہ	۴	٥٥
۱۴۹	خدمت	دی بنڈ۔ سری نگر (کشمیر)	پی، این، وآئل	۴	٥٥
۱۵۰	رہنمائے دکن	افضل گنج حیدرآباد ۱ (اے، پی)	سید لطیف الدین	۸	٥٥
۱۵۱	سیاست	جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد ۱ (اے، پی)	میر عابد علی خاں	۸	٥٥

تختۂ آمدنی سال یکم اپریل ۱۹۷۱ء تا ختم ۳۱ مارچ ۱۹۷۲ء ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (اے پی)

ابواب جمع	روپے	پیسے	روپے	پیسے
سلک افتتاحی (رقوم نقد و بنک)				
(۱) نقد رقم	5,057	07		
(۲) رقم در کرنٹ اکاونٹ اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	6,164	44		
اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ (کنرا بنک لمیٹڈ حیدرآباد)				
(۱) ادارہ اکاونٹ	28	78		
(۲) سب رس اکاونٹ	331	26		
کلکشن اکاونٹ جی رگھوناتھ مل بنک لمیٹڈ جواب کنرا بنک میں ضم ہوگیا ہے۔	11	48		
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد بشمول منافع	7,461	92	19,054	95
امداد				
(۱) از حکومت آندھرا پردیش محکمۂ تعلیمات منظورہ ذریعہ جی او نمبر 44 تعلیمات مورخہ ۱۰/۲/۷۲ء	5,000	-		
(۲) از معتمدی حیدرآباد گرانٹ حالیہ سمتا	100	-	5,100	-
آمدنی از فروخت مطبوعات ادارہ			1,196	17
آمدنی از ماہنامہ سب رس				
(۱) چندۂ سالانہ	809	20		
(۲) از فروخت قدیم شمارہ جات	180	12		
(۳) از فروخت غالب نمبر	113	00		
(۴) از اشتہارات	162	50	1,264	82
منافع از سیونگس بنک (بابتہ ادارہ اکاونٹ)	—	—	—	25
اردو امتحانات کی آمدنی				
(۱) آمدنی امتحان و سرٹیفکٹس	42	63		
(۲) فیس اور قیمت فارم شرکت	5,452	50		
(۳) قیمت قواعد و نصاب امتحانات و پرچہ جات سوالات	13	50	5,508	63
متفرق آمدنی				
(۱) ٹیلیفون کالس	2	75		
(۲) آمدنی از کارڈ بلاغ	107	63		
(۳) آمدنی از اقساط قرضہ عملۂ دفتر وغیرہ	110	-		
(۴) آمدنی از دیگر مدات متفرق	55	34	275	72
صدر میزان			32,400	54

حسابات کی تنقیح کی گئی اور بموجب بالا صراحت کردی گئی تا صحیح پائے گئے۔

شرح دستخط

چارٹرڈ اکاونٹنٹ، ایس جی دستگیر اینڈ کو حیدرآباد

تختۂ خرچ سال اپریل ۷۱ء تا ختم ۳۱ مارچ ۷۲ء ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

ابواب خرچ	روپے	پیسے	روپے	پیسے
مطبوعات ادارہ				
(۱) اخراجات اشاعت کتب، ڈاک خرچ، متفرق	37	87		
(۲) ادائی معاوضہ مصنفین	50	-	87	87
اخراجات اشاعت ماہنامہ سب رس				
(۱) اخراجات طباعت بشمول قیمت کاغذ	2,058	92		
(۲) ڈاک خرچ و متفرق اخراجات	124	21	2,183	13
لائبریری اکاونٹس				
(۱) خریدی کتب و جلد بندی	457	50		
(۲) صادر و متفرق	2	20		
(۳) تنخواہ عملۂ کتب خانہ	1,475			
(۴) درستی و مرمت کتب خانہ	200	-	2,134	70
اخراجات دفتر				
(۱) تنخواہ عملۂ دفتر	4,914	65		
(۲) بجلی، پانی، اور فون	688	14		
(۳) طباعت، صادر اور ڈاک خرچ	53	90		
(۴) متفرق اخراجات	144	03		
(۵) اخراجات اجرت ٹائپ	61	67		
(۶) داغ دوزی و مرمت ایوان اردو				
(۷) اخراجات آمد و رفت آفس سکریٹری	502	-		
(۸) ادا پیشگی بہ عملۂ دفتر بطور قرض	150	-		
(۹) ادائی انٹرسٹ بہ اسٹیٹ بنک بسلسلہ قرض	260	81		
(۱۰) بنک کمیشن	2	-	6,777	20
اخراجات امدو امتحانات ادارہ			2,876	10
ادائی از مالگزاری کار باغ			22	98
آڈٹ فیس			100	-
سلک اختتامی نقد و بنک				
(۱) نقد	5,342	39		
(۲) نقد در اسٹیٹ بنک صدر دفتر (کرنٹ اکاونٹ)	4,656	98		
اسپیشل سیونگس بنک اکاونٹ در کنرا بنک				
(۳) ادارہ اکاونٹ	29	03		
(۴) سب رس اکاونٹ	716	76		
(۵) کلکشن اکاونٹ بی رگھوناتھ مل بنک	11	48		
فکسڈ ڈپازٹ در اسٹیٹ بنک آف حیدرآباد (صدر دفتر)	7,461	92	18,218	56
صدر میزان			32,400	54

ادارۂ ادبیات اُردو

صدور ادارہ

نواب سر مہدی یار جنگ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء

نواب لیاقت جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء

جناب سیّد علی اکبر ۱۹۶۱ء

نائب صدور ادارہ

نواب لیاقت جنگ ۱۹۳۴ء تا ۱۹۴۷ء

نواب زین یار جنگ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۵ء

جناب سید علی اکبر ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء

پروفیسر عبدالمجید صدیقی ۱۹۵۶ء تا ۱۹۶۷ء

سید دلدار حسین ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۲ء

رائے جانکی پرشاد ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء

محترمہ تہنیت النساء بیگم زور ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء

محامد علی عباسی ۱۹۶۸ء

اعزازی سرپرست

محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور

مجلس امنا

۱- جناب سیّد علی اکبر (صدر)

۲- لکشمی نارائن گپتا (نائب صدر)

۳- محمّد اکبرالدین صدیقی

۴- ڈاکٹر مہندر راج سکسینہ (معتمد عموی)

مجلس انتظامی بہ شمول مجلس اُمنا

۵- محامد علی عباسی - نائب صدر

۶- ڈاکٹر ہاشم امیر علی خاں

۷- سری کرشنا سنہا

۸- میر حسن

۹- عارف الدین حسن

۱۰- رمن راج سکسینہ شریک معتمد

۱۱- میر لیسین علی خاں ٭

۱۲- میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری

ادارہ کی ذیلی مجالس

۱- مجلس اشاعت تاریخ و تمدن

۲- مجلس تعلیم بالغان وارد و امتحانات

۳- مجلس مشاورت "سب رس"

۴- مجلس نشر و اشاعت

عملۂ دفتر

میر سراج الدین علی خاں ــــ آفس سکریٹری

محمد جمال الدین - منتظم ادارہ

ترصیص الدین انصاری - لائبریرین

وقار خلیل منتظم سب رس و دارالمطالعہ

محمد نذیر الدین - کارپرداز

محمد عبداللہ - چوکیدار -

رپورٹ امتحانات ادارہ ادبیات اُردو منعقدہ ۱۹۷۲ء ماہ مئی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو سال میں دو مرتبہ اُردو کے امتحانات منعقد کرتا ہے۔ مئی ۱۹۷۲ء میں ادارہ کی جانب سے بالائی مرکز پر امتحان منعقد ہوا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:۔

(۱) بلدہ:۔ اُردو دانی زبان دانی میں دس طالب علم شریک رہے۔ دو اور تین اُمیدوار بالترتیب کامیاب رہے۔ اُردو عالم میں ۷۲ اُمیدوار شریکِ امتحان رہے۔ جن میں ۲۶ اُمیدواروں نے کامیابی حاصل کی (۲) گلبرگہ: مقامی معتمدِ امتحانات کے فرائض سید احمد علی صاحب بی ایل نے انجام دیئے۔ ادارہ کی جانب سے نواب شبیر حسین خاں صاحب بحیثیت صدر نگران کار بھیجے گئے تھے۔ اُردو عالم میں ۲۰ اُمیدوار شرکت کی جن میں سولہ کامیاب رہے (۳) سنٹرل جیل: جیل کے قیدی امتحان میں شرکت کرتے ہیں اور ان سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جاتی۔ شری گنیش پرشاد صاحب صدر مدرس مدرسہ قیدیان امتحانات کے لئے اُمیدواروں کو تیار کرتے ہیں۔ اُردو دانی میں ۲۳ اور زبان دانی میں ۱۴ اُمیدوار شریک ہوئے اور ۲۰ اور ۸ اُمیدواروں نے بالترتیب کامیابی حاصل کی۔ سید صدیق حسین صاحب نے ادارہ کی جانب سے نگرانی کے فرائض انجام دیئے (۴) ملکاپور: سید ہاشم صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول کمتل مقامی معتمد تھے چنانچہ ۲۰ سے زائد اُمیدوار اُردو عالم اور زبان دانی میں شریک رہے۔ زبان دانی میں سات اُمیدوار شریک رہے اور پورے کامیاب ہوئے اُردو عالم میں ۹ کامیاب ہوئے۔ عارف احمد صاحب ایم اے۔ ایل (عثمانیہ) نے صدر نگران کار کے فرائض انجام دیئے (۵) تانڈور: اُردو دانی میں دس اور اُردو عالم میں تیرہ اُمیدوار شریکِ امتحان رہے اور تین اور چھ اُمیدواروں نے بالترتیب کامیابی حاصل کی جناب قطب سرشار صاحب یہاں کے معتمد ہیں۔ ادارہ سے جناب عبدالرحمٰن صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ صدر نگران کار بھیجے گئے تھے (۶) اورنگ آباد: مولوی غلام جیلانی صاحب معتمدی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اُردو زبان دانی میں تین اُمیدوار شریک اور پورے کامیاب ہوئے۔ اُردو عالم میں پچیس اُمیدوار شریک ہوئے اور سترہ نے کامیابی حاصل کی جناب بشیر احمد خاں صاحب ایم۔ اے عثمانیہ بحیثیت صدر نگران کار گئے تھے (۷) سرپور ٹاؤن کاغذ نگر: اُردو زبان دانی میں دس اُمیدوار شریک رہے اور سب کامیاب ہوئے۔ اُردو عالم میں سولہ شریک تھے اور ۱۴ کامیاب ہوئے۔ محمد الیاس صاحب معتمدی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اشفاق احمد صاحب صدر نگران کار رہے۔ (۸) محبوب نگر: اُردو عالم میں پندرہ اُمیدوار شریک رہے دس کامیاب ہوئے۔ اُردو دانی میں دو شریک اور دونوں کامیاب رہے۔ جناب محمد یونس صاحب ایم اے بی ایڈ کارگذار معتمد ہیں اور کمال خوندمیری صاحب صدر نگران کار رہے۔ (۹) بھینسہ: سید ناظر علی صاحب مقامی معتمدی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ پانچ اُمیدوار اُردو دانی میں شریک رہے اور کامیاب ہوئے۔ اُردو عالم میں چوبیس شریک اور سب کامیاب رہے ۔۔۔ صاحب صدر نگران کار بھیجے گئے تھے۔ (۱۰) کریم نگر: جناب ریاست علی تاج ایم اے۔ بی۔ او۔ ایل عثمانیہ معتمد ہیں۔ زبان دانی اُردو دانی میں دو اور تین اُمیدوار بالترتیب شریک رہے اور سب کامیاب رہے۔ اُردو عالم میں چودہ شریک اور ۔۔۔

محمد منظور احمد صاحب ایم اے، عثمانیہ جونیئر لکچرر نے صدر نگران کاری کے فرائض انجام دیئے (۱۱) نظام آباد: اردو دانی میں گیارہ طالب علم شریک اور دس کامیاب رہے اردو عالم گیارہ شریک اور چھ کامیاب رہے۔ حافظ معظم علی صاحب معتمد اردو امتحانات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نثار احمد صاحب بحیثیت صدر نگران کار گئے تھے۔ (۱۲) نارائن کھیڑ: اردو دانی میں چار شریک اور کامیاب رہے۔ اردو عالم میں اکیس شریک رہے صرف ایک ہی کامیاب رہا۔ احمد علی صاحب یہاں کے معتمد امتحانات ہیں سید احمد بادشاہ قادری اختر ایم او ایل نے صدر نگران کاری کے فرائض انجام دیئے۔

رپورٹ امتحان بابتہ ڈسمبر ۱۹۷۲ء

گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی بارہ مرکزوں پر امتحان منعقد ہوا۔ بلدہ حیدرآباد کا مرکز امتحان انوار العلوم ہائی اسکول نامپلی رہا۔ اردو دانی میں ۳۵ امیدوار شریک اور ۲۳ کامیاب۔ زبان دانی میں بارہ شریک اور صرف دو کامیاب اور اردو عالم میں ۲۹ شریک اور سولہ کامیاب رہے۔ (۲) مرکز: —— جونیئر سرٹی فائیڈ اسکول چھپا بیٹھ: اردو دانی میں ۲۰ شریک اور تیرہ کامیاب رہے۔ زبان دانی میں شریک چھ امیدوار رہے۔ امتحان کے لئے فضل الرحمن صاحب اردو ٹیچر طلباء کو تیار کرتے ہیں۔ جناب انور کمال خوندمیری بی۔ اے صدر نگران کار رہے۔ (۳) بنگلور: اردو دانی میں ۴ امیدوار شریک اور دو کامیاب رہے۔ زبان دانی کے دو میں صرف ایک امیدوار نے کامیابی حاصل کی۔ اردو عالم کے سولہ امیدواروں میں سے گیارہ کامیاب رہے محترمہ صفیہ بیگم صاحبہ مقامی معتمد امتحانات کے فرائض انجام دیتی ہیں۔ جناب حسن علی خاں صاحب ایم اے ایڈ صدر اشرف المدارس ہائی اسکول نے صدر نگران کار کے فرائض انجام دیئے۔

(۴) بھینسہ: اردو عالم میں چھ زبان دانی میں نو اور اردو دانی میں گیارہ شریک رہے اور ہر امتحان کے نتائج صد فی صد رہے۔ ناظر علی صاحب مقامی معتمد ہیں۔ بحیثیت صدر نگران کار نثار احمد صاحب گئے تھے (۵) آرمور: جناب عبد المقتدر صاحب صدیقی شعبہ امتحانات کا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔ اردو عالم میں تین امیدوار شریک اور سب کامیاب رہے زبان دانی میں گیارہ شریک رہے اور سات کامیاب رہے۔ مولوی منہاج الدین صاحب ایم ایس سی نے صدر نگران کاری کے فرائض انجام دیئے (۶) اورنگ آباد: جناب غلام جیلانی صاحب امتحانات کے معتمد ہیں۔ اردو عالم میں اٹھارہ اور زبان دانی میں ایک اور اردو دانی میں تیرہ امیدوار شریک ہوئے اور سب امتحانوں کے نتائج صد فی صد رہے۔ جناب اعجاز محمد صاحب صدر نگران کار رہے (۷) محبوب نگر: ۳۵ امیدوار اردو عالم میں شریک اور ۲۹ کامیاب رہے۔ اردو دانی میں تین شریک تین کامیاب رہے۔ محمد یونس ایم اے بی ایڈ معتمدی امتحانات کا کام انجام دیتے ہیں۔ جناب خبیر حسین خاں صاحب صدر نگران کار رہے (۸) مغل گدہ: خواجہ ثناء الدین صاحب مقامی معتمد تھے۔ امتحان اردو عالم میں سولہ شریک اور بارہ کامیاب رہے اور اردو دانی میں سولہ شریک اور بارہ کامیاب رہے۔ جناب عبد الرحمن خاں صاحب نے صدر نگران کاری کے فرائض انجام دیئے (۹) نرمل: اٹھارہ امیدوار اردو عالم کے امتحان میں شریک اور نو کامیاب رہے جناب یحییٰ بن علی صاحب یہاں امتحانات کے معتمد ہیں سید احمد بادشاہ قادری صاحب اختر نے صدر نگران کاری کے فرائض انجام دیئے (۱۰) عادل آباد: اردو عالم میں نو اور اردو دانی میں پانچ امیدوار شریک امتحان رہے۔ چھ اور پانچ امیدوار بالترتیب کامیاب رہے۔ جناب عبد القدوس صاحب

صدر مدرس صدر نگران کار رہے۔ جناب قطب الدین صاحب معتمدی امتحانات تھے۔ اس مرکز کے قیام اور امیدوار ود
و ترغیب جناب محمد اسمٰعیل صاحب قریشی ایڈوکیٹ کی دلچسپی اور تعاون پر منحصر ہے۔ (۱۱) نظام آباد: اردو
اردو دانی میں سات اور زبان دانی میں تین امیدوار شریک رہے بارہ امیدوار اردو عالم میں کامیاب رہے اور زبان دا
کامیاب ہوئے۔ حافظ معظم علی صاحب معتمد امتحانات ہیں۔ سید صدیق حسین صاحب صدر نگران کار رہے۔

تختۂ امیدواران امتحانات ادارہ شرکا و کامیاب شدہ ۱۹۴۰ء

سنہ	اردو دانی		زبان دانی اردو		اردو عالم		اردو فاضل	
	شرکاء	کامیاب	شرکاء	کامیاب	شرکاء	کامیاب	شرکاء	کامیاب
۱۹۴۰ء	۱۹۳	۱۶۵	۵۱۸	۴۹۰	۷۴	۴۴	۱۱	۶
۱۹۴۱ء	۴۳۵	۳۱۷	۳۶۰	۳۲۹	۱۱۵	۶۵	۵۵	۳۶
۱۹۴۲ء	۸۳۹	۶۵۵	۲۲۷	۹۶	۱۹۵	۱۰۰	۵۵	۳۴
۱۹۴۳ء	۷۰۳	۶۵۶	۴۶۳	۴۰۰	-	-	۴۵	۳۱
۱۹۴۴ء	۸۲۲	۴۶۶	۴۶۷	۲۲۰	۱۸۸	۸۸	۳۰	۱۷
۱۹۴۵ء	۱۱۰۹	۹۰۹	۴۹۰	۲۶۰	۱۵۶	۵۱	۴۹	۳۴
۱۹۴۶ء	۸۶۷	۵۸۰	۳۲۰	۱۵۶	۸۴	۳۵	۲۷	۸
۱۹۴۷ء	۱۵۰۸	۱۰۲۹	۶۵۲	۳۰۳	۱۲۸	۸۵	۱۶	۱۳
۱۹۴۸ء	۳۷۰	۲۰۹	-	-	-	-	-	-
۱۹۴۹ء	۹۵	۷۸	۷۹	۵۴	۱۴	۲	۱	۱
۱۹۵۰ء	۲۶۲	۲۱۰	-	-	۱۶	۱۰	-	-
۱۹۵۱ء	۲۱۷	۱۹۸	-	-	۹	۵	-	-
۱۹۵۲ء	۹۶	۸۲	-	-	-	-	-	-
۱۹۵۵ء	۳۰۱	۱۰۲	۷	۱	۲۴	۲۰	۱۲	۹
۱۹۵۶ء	۱۷۸	۹۰	۵۵	۳۱	۸	۷	۱۱	۷
۱۹۵۷ء	۳۶	۳۱	۱	۱	۲	۲	-	-

سنہ	اردو دانی		زبان دانی اردو		اردو عالم	
	شرکاء	کامیاب	شرکاء	کامیاب	شرکاء	کامیاب
۱۹۵۸ء	۱۴	۱۳	۹	۸	۸	۵
۱۹۵۹ء	۲۳	۱۵	۱۰	۷	-	-
۱۹۶۰ء	۱۰۸	۶۸	۳۷	۲۲	۱۶	۹
۱۹۶۱ء	۱۱۷	۹۹	۲۳	۱۴	۱۹	۱۱
۱۹۶۲ء	۵۰	۴۰	۳۳	۳۱	۲۸	۲۲
۱۹۶۳ء	۹۲	۷۴	۴۱	۲۹	۹۱	۵۲
۱۹۶۴ء	۶۶	۴۳	۳۶	۱۶	۲۷۸	۸۸
۱۹۶۵ء	۱۱۷	۸۴	۶۶	۴۳	۲۵۲	۵۹
۱۹۶۶ء	۴۷	۲۴	۷۴	۴۲	۲۴۸	۳۲
۱۹۶۷ء	۹۳	۵۶	۸۰	۴۵	۲۴۶	۸۰
۱۹۶۸ء	۹۰	۵۸	۶۳	۴۳	۴۷۴	۶۶
۱۹۶۹ء	۶۵	۴۳	۵۳	۴۰	۶۷۷	۱۵
۱۹۷۰ء	۳۶۷	۲۲۸	۸۶	۵۹	۵۸۵	۶۶
۱۹۷۱ء	۱۱۹	۱۰۹	۶۰	۴۵	۵۰۲	۹۹
۱۹۷۲ء	۲۹۵	۱۴۹	۷۶	۵۱	۴۰۴	۷۷
۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء   جلد ۳۶   شمارہ ۱۱

نومبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

نگران
سید علی اکبر ایم-اے (کینٹب)

مجلس مشاورت
میر حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، رمن راج سکسینہ
ڈاکٹر غلام عمر خاں، محمد منظور احمد منظور

معتمد
محمد اکبر الدین صدیقی

مہتمم: محمد جمال الدین   منتظم: وقار خلیل

زرسالانہ: آٹھ روپے   غیر ممالک سے پندرہ روپے
ششماہی: چار روپے   فی پرچہ ۷۵ پیسے

نمونے کے پرچہ کے لئے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴ سے شائع ہوا۔

ترتیب

اپنی بات

۲۴ ستمبر ۱۹۶۲ء کو ڈاکٹر زور مرحوم نے وطن سے ڈھائی ہزار کلومیٹر دور سری نگر میں وفات پائی اور
خاک ان سے محروم رہی۔ ڈاکٹر زور کے دوست اور طالب علمی کے ساتھی ڈاکٹر سید سجاد ظہیر نے ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء
قازقستان کی راجدھانی الماآتا میں جہاں وہ ادبی کانفرنس میں شرکت کیلئے گئے تھے۔ قلب پر حملے کے باعث
سجاد ظہیر نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پائی بڑی سے بڑی ڈگری حاصل کی لیکن ہمیشہ آزاد رہے اور کبھی ملازمت کا خیال نہ
انجمن ترقی پسند مصنفین کے پریم چند کی صدارت کے زمانے میں سیکریٹری اور ان کے بعد صدر ہوئے او
رہے۔ ان کی زندگی کا آغاز ڈاکٹر رشید جہاں، احمد علی وغیرہ کے افسانوں کے مجموعے انگارے سے ہوا جو ضبط ہو گ
اسی آگ سے کھیلتے رہے جو ہندوستان کے کندھوں سے غلامی کا جوا اترنے کے بعد بھی ان کے سینے پر
ادارۂ سب رس سردار ظہیر حسن کے خاندان کے اس غم میں برابر کا شریک ہے خصوصاً ملک کی مشہور ادیبہ رضیہ
خدمت میں اظہار تعزیت کرتا ہے۔

ستمبر نے دوسرا ستم ۲۵ تاریخ کو ڈھایا جبکہ عثمانیہ یونیورسٹی کی عربی دنیا میں شہرت رکھنے والی ایک
یعنی ڈاکٹر عبدالمعید خاں اس خاکدان سے اٹھ کر ملاء اعلیٰ پہنچے۔ وہ قاہرہ کے ڈی لٹ اور کیمبرج یونیورسٹی کے پ
تھے۔ یورپ اور امریکہ کی جامعات میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ وہ ادارۂ "اسلامک کلچر" کے ۲۵ سال سے
اور ۱۲ سال تک ناظم و معتمد دائرۃ المعارف رہے۔ دائرۃ المعارف نے جو عالمگیر شہرت حاصل کی ہے۔ اس کا سبب ڈا
ذات تھی۔ اب نہ جامعات کو ان کا بدل مل سکے گا نہ دائرۃ المعارف کو اس لگن کے ساتھ کام کرنے والا ناظ
اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

۲۸ ستمبر کو ملک کے مشہور اور بزرگ شاعر جناب راگھویندر راؤ جذب عالمپوری نے (۸۰) سال
انتقال کیا۔ وہ عالمپور (ضلع رائچور۔ حکومت آصفیہ) کے رہنے والے تھے اور وہیں وکالت بھی کرتے تھے۔ اردو ا
شغف تھا شعر بھی کہتے تھے رباعی پر پوری قدرت تھی۔ حضرت امجد مرحوم سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ جناب حسن ا
کی مساعی سے ان کے کلام کے مجموعے شائع ہو کر مقبول ہوئے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو اور ڈاکٹر زور
ستائش گر تھے۔ ان کے کلام کو سراہنے میں کبھی پس و پیش نہ ہوا۔ ان کی خوش اخلاقی نے سبھی کے دلوں کو مو
مزاج میں انکساری تھی اسی لئے تعلی کلام سے بے تعلق رہی۔ خدا ان کی روح کو شانتی نصیب کرے۔
۲ اکتوبر کو محترمہ سیدہ اختر بیگم اہلیہ خاں صاحب عبدالغنی مالک لبرٹی ٹاکیز بنگلور کا انتقال

۱ باقی صفحہ ۴۱

پروفیسر ابو ظفر عبدالواحد

حرفِ شوق کا نوشت کار

وہی اِک چیز ہے لیکن نظر آتی ہے ہر شے میں
یہ شیریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی، کوہکن بھی ہے		اقبال

سگمنڈ فرائیڈ کا کہنا ہے کہ حیات (زندگی) جنسی جذبے اور "خود" "وجود" [1] پہ قائم ہے اور وہ چیز جسے آپ محبت، عشق اور چاہت سے تعبیر کرتے ہیں اسی حیوانی جذبے کے لطیف مظاہر ہیں۔ یہی جذبہ شائستہ روپ میں ڈھل کر شعر بنتا اور جمالی پیکر اختیار کرتا ہے۔ یہی عشق کا روپ دھار کر قیس کو صحرا نوردی پر اور زہاد کو کوہکنی پر مائل کرتا ہے۔ یہی جذبہ کسی کو حافظ اور کسی کو رومی بناتا ہے۔ یہی جذبہ اگر صحیح خطوط پر ارتقائی اور جمالیاتی منازل سے نہ گزرے تو محض ایک جنسی اور حیوانی عمل ہے یا پھر بقول شیکسپیئر ایک پاگل پن جملہ فنونِ لطیفہ اسی جذبۂ جنسی کے ترقی یافتہ اور شائستہ مظاہر ہیں اور ادب و شاعری اسی جذبے کا بھرپور اور شائستہ ترین روپ ہے۔

ہر زبان میں اس جذبے کے لطیف اظہار کے لئے کئی ایک طریقے اور اسلوب وضع کئے گئے ہیں۔ چنانچہ ہماری اپنی زبان میں بھی اس طرح کے اظہار کے کئی طریقے موجود ہیں جنھیں اصطلاح میں ' اصنافِ سخن ' کہتے ہیں اور یہ سب ' الفاظ کے ذریعے جذبۂ عشق کی چگونگی کو بیان کرنے کی شعوری سعی کرتے ہیں اسی کو عام بول چال میں دلی کیفیت یا وارداتِ قلبی کا اظہار کہتے ہیں۔ اسی چگونگی کے اظہار کو داخلی اظہار یا "تاثر" بھی کہتے ہیں۔ شعر و شاعری میں تاثر کا رنگ اور داخلیت جتنی تیز اور تیکھی ہوگی شعر جادو اور سحر کی طرح کاری اور زود اثر ہوگا۔ عاشقانہ جذبے

---

[1] "وجود" کو میں نے ایک خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے جسے فرائیڈ لبیڈو (Libido) کہتا ہے۔ لطیفہ:۔ عہد خواجہ میر درد کا ایک پُر لطف واقعہ ہے جو کبھی سُنا تھا اور غالباً اس کے نقوش میرے لاشعور میں محفوظ تھے جس سے اب میں نے مفید مطلب کام لیا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ ایک طوائف خواجہ صاحب کی ایک غزل کسی محفل سماع میں لہک لہک کر گا رہی تھی۔ ایک خاص شعر پر پہنچی تو اپنی لغزشِ مستانہ سے ساری محفل کو زعفران زار کشمیر بنا دیا۔ شعر تھا ؎

باوجودے کہ پَر و بال نہ تھے آدم کے		واں وہ پہنچا کہ فرشتوں کا بھی مقدور نہ تھا

عالمِ استغراق میں پہلے مصرعے کو موصوفہ کچھ اس طرح ادا فرما رہی تھیں، ' یا وا آدم کے "وجودے" پہ تو اک بال نہ تھا ' سمجھا آپ نے؟ وجودے بمعنی لبیڈو (Libido)

اظہار کے لئے بہترین روپ (صنف) ہماری زبان میں وہ ہے جسے "غزل" کہتے ہیں۔ غزل کے بعد اس نوعیت کے اظہار کے لئے دوسرا سانچہ جو ہمارے ہاں رائج ہے وہ ہے "مثنوی" کا سانچہ جو غزل کی بہ نسبت زیادہ معروضی اور اظہاری ہے۔ انگریزی جیسے وسیع و عریض ادب میں یکسر داخلی اور غنائی (Lyrical) اظہار کے لئے تین سانچے (اصناف) موجود ہیں جنھیں سانیٹ، اوڈ اور بیالڈ (Sonnet, ode and ballad) کہتے ہیں۔ موخرالذکر صنف (Ballad) ہماری مثنویات کی طرح نسبتہً زیادہ معروضی ہوتی ہے۔ تاہم ان مذکورہ اصناف میں سے ایک بھی غزل کی سی جاذبیت نہیں رکھتا۔ وہ جامعیت، اختصار، رمزیت اور دل کشی ان فرنگی اصناف میں نہیں جو بیک آن غزل میں پائی جاتی ہے۔ غزل ہماری زبان کی حد درجے حساس اور بڑی ہی نازک اور سبک صنف ہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوصف، ایک عیب اُس میں یہ ہے کہ وہ بڑی ہی گھونی اور پردہ پوش واقع ہوئی ہے۔ وہ بہت کچھ بتاتی اور ظاہر کرتی ہے لیکن اپنے خالق (تخلیق کار) اور نوشت کار کو ظاہر اور براگندہ نقاب نہیں کرتی۔ کسی غزل گو کی شخصیت کو پانا منظور ہو تو ہمیں اور ذرائع و وسائل تلاش کرنے ہوں گے۔ غزل اس خصوص میں ہماری کوئی رہبری نہیں کرتی۔

یہی دشواری "حرفِ شوق" کے مصنف منظور احمد کے تعلق سے مجھے درپیش ہے۔ منظور صاحب کو میں برسوں سے جانتا ہوں لیکن منظور صاحب کے اندر چھپی ہوئی اور بھید نہ بتانے والی "شئے" (شخصیت) کے متعلق بہت کم میری معلومات ہیں۔ اس طرح بہت کچھ جانتے ہوئے بھی میں "وہ" (!) نہیں جانتا جو اُن کا کوئی قریبی دوست جان سکتا ہے اور جانتا بھی ہوگا۔ پھر میرے اور منظور احمد کے درمیان سن و سال کا بھی بڑا تفاوت ہے۔ ان کی شخصیت کا بھید پانے کے لئے، اُن کے کسی بے تکلف دوست کی طرح بے تکلفانہ انداز میں اُنھیں میں ٹٹول بھی نہیں سکتا۔ ان دشواریوں کا احساس کرتے ہوئے مجھے منظور صاحب کے "حرفِ شوق" کا جائزہ لینا ہے اور بلاشبہ یہ ایک کٹھن کام ہے۔ پھر بھی نیک نیتی سے میں اسے شروع کرتا ہوں کہ ۔

چل رے خامے بسم اللہ !

منظور احمد نرے شاعر نہیں، ایک محتاط، معقول، تعلیم یافتہ، وضع دار، شائستہ اور شریف النفس آدمی ہیں۔ ادب و زبان کا ستھرا اور فطری ذوق رکھنے کے علاوہ وہ برسوں معلم و متعلم رہ چکے ہیں اور اب بھی پیشۂ معلمی سے وابستہ ہیں۔ آزادیٔ ہند کے یادگار سال (۱۹۴۷ء) میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے اُردو زبان و ادب کا ایم۔اے کیا۔ اس وقت سے شعر و ادب سے خود لطف اندوز ہونا، دوسروں کو متاثر کرنا، پڑھنا پڑھانا اُن کا محبوب شغلہ ہے۔ بہ حیثیت معلم، وہ ایک کامیاب استاد ہیں اور اپنے بعض ہم پیشہ حضرات کی طرح، افتاد و اتفاق کی بدولت اس پیشے میں داخل نہیں ہوئے۔ اس کا کھلا اظہار انھوں نے اپنے شعری مجموعے کے دیباچے میں بھی کیا ہے۔

جس طرح بہ ثبات عقل و ہوش اور اپنی مرضی اور خواہش سے اس جان لیوا پیشے میں (جسے میں پیشۂ انبیاءؑ کہتا ہوں اور میرا ایقان ہے کہ اس میں ایک کامیاب نبی بننا کوئی آسان کام نہیں) انھوں نے قدم رکھا ہے، اُسی طرح بہت سوچ سمجھ کر انھوں نے کوئی بیس سال کے خفیہ ریاض اور تپاس کے بعد ایک اور تاریخی سال (۱۹۶۵ء) سے شاعری و غزل گوئی سے عملاً اپنی وابستگی کا محتاط سا اعلان کیا اور رجاتے شرماتے ’ شاعروں میں بھی نظر آنے لگے۔ آہستہ آہستہ مشاعرے بھی لوٹنے اور داد و تحسین بھی بٹورنے لگے اور سات سال کے عرصے میں (بمصداقؑ نیت بیخیر دے داد کتاب) منظور صاحب اب صاحبِ کتاب شاعر ہیں! ان کی کتاب ”حرفِ شوق“ کی معنویت، غایت تخلیق، نوعیت اور وجہ تسمیہ کی نشان دہی گونڈے کے الہامی شاعر (اصغرؔ) کے ان پُر مغز مصرعوں سے ہوتی ہے جو بطور اشارہ بلیغ اپنی کتاب کے سرورق کے مقابل منظور صاحب نے شامل کئے ہیں ؎

عالم رواں دواں، بہ تقاضائے عشق ہے　　　ذرّوں کا رقص، مستیٔ صہبائے عشق ہے

ہر ”حرفِ شوق“ پردۂ اخفائے عشق ہے　　　ہر شیوۂ حجاب، طریقِ نمودِ حُسن!

اخفائے عشق، میرے نزدیک صد در جہ فن کارانہ طریقۂ اظہار ہے اور منظور صاحب کے بعض نقادوں کا کہنا ہے کہ اس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔ ” بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!

”حرفِ شوق“ (جیسا کہ ابھی اشارۂ بلیغ کے ذریعہ بتایا گیا) کہ غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں منظور صاحب ہر سمت جلوہ گر نظر آتے ہیں مگر کس طرح کہ ” صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں“ ! غرض کہ اسی ادبی چلمن اور آنکھ مچولی کی وساطت سے مجھے تاک جھانک مچانا اور منظور صاحب کی پردہ دار شخصیت اور شاعری کے محرکات کو سمجھنا اور بے انگندہ نقاب کرنا ہے۔ مجھ سے پہلے اور بھی پارکھوں اور نوشت کاروں نے اپنے نتائج (جو شامل کتاب ہیں) پیش کئے ہیں جن سے ہو سکتا ہے کہ آپ کو جزوًا یا پھر کلیتہً اتفاق نہ ہو۔ رسمی تنقید تو ایک طرح کی لعل بجھکڑی ہے۔ لگا تو تیر نہیں تو تُکّا! یا پھر یہ کہ رسمی تنقید عموماً مربیانہ انداز میں فن کار سے بے تعلق رہ کر کی جاتی ہے۔ میں ہمدردانہ تنقید کا قائل ہوں، اُس تنقید کا جو کسی فنکار سے ہم آہنگ ہو کر اور اس کی تخلیق میں ڈوب کر کی جاتی ہے۔ اصطلاح میں اسے تخلیقی تنقید کہتے ہیں۔ بہرحال میں پوری دیانتداری سے منظور صاحب اور ان کے فن کارانہ عمل (حرفِ شوق) کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

جیسا کہ ابھی کچھ پہلے میں عرض کر چکا ہوں، منظور صاحب اور اُن کے ” فن کارانہ عمل“ سے متعلق اور بھی لوگ مجھ سے پہلے قیاس آرائی کر چکے ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ منظور صاحب کی غزلوں میں چاہت اور عاشقی کا جو رنگ جھلکتا ہے، وہ یکسر ”مشفقانہ اور افلاطونی“ ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ اُن کی غزلوں میں اُن کی چاہت داغؔ اور مومنؔ کی طرح اقدامی اور بہ عزم نظر نہیں آتی۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ منظور کی عاشقی کس نوعیت کی ہے۔

آیا وہ برہم چاری ہیں یا کرم چاری۔ اُن کی شاعری (عاشقی) شریعت کی پابند ہے اور باوضو رہتی ہے یا پھر بے نیازِ وضو؛ میرے نزدیک اِن امور کا نفسِ موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اتنا دستاویزی طور پر جانتا ہوں کہ منظور صاحب نے سلیقہ سے شاعری کی ہے۔ وہ محبت کرنا بھی جانتے ہیں اور سلیقے سے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ وہ فطرتاً متین، محتاط اور باشعور آدمی ہیں اور وجاہت کے تعلق سے اُسی متانت، رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں میں کیا ہے۔

سمجھنے سمجھانے کی خاطر منظور کی غزلیں صاف و صریح طور پر دو؍ تین شقوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں:۔ (۱) اُبچی غزلیں جو بیشتر چھوٹے چھندوں (بحروں) میں ہیں اور کچھ بڑے اور دُہرے چھندوں میں بھی جو خاصی دلکش اور رواں ہیں اور جن میں منظور کا اپنا رنگ اور انفرادیت صاف جھلکتی ہے (۲) طرحی اور فرمائشی غزلیں جو مشاعروں میں پڑھی گئیں یا پھر کسی مشہور شاعر کی زمین میں لکھی گئیں۔ ان میں بھی منظور کی انفرادیت اور اسلوب، صاف نمایاں ہے اور انھیں پرایا مال یا کہیں کی نقل نہیں کہا جاسکتا۔ آیئے طویل آہنگ (دہرے مصرعوں والی) غزلوں کے کچھ اشعار پہلے لیں:۔

یہ رہے ایک غزل کے کچھ اشعار جو سب کے سب "بیت الغزل" کہے جاسکتے ہیں۔ ترنم اس وزن کا بڑا ہی تیز ہے اور دُہرے سبب[1] اور وتد کے اجتماع کے باعث، ہر مصرعے کے چو کھنڈی اجزا (۴۔ ارکان) کا ہر رکن، بڑی تیز تال دیتا ہے اور ہر تال سے (اگر طبلہ بھی ساتھ چلے) طبلے پر بڑی تیز تھاپیں پڑتی ہیں۔ ترنم کے اس اہتمام کے ساتھ، اشعار کی معنویت بھی اگر تیز ہو تو پھر کیا کہنا ہے۔ ملاحظہ ہوں منظور کے یہ اشعار جن کی تیکھی معنویت کے ساتھ، تال اور تھاپ کا مجموعی کیف بڑا ہی تیز اور سامعہ نواز ہے۔ یہ لیجئے پہلے ایک مطلع جو بیک آن مطلع بھی ہے اور مقطع بھی اور بقول سعدی دکنی "شیر و شکر آمیختہ، ہم ریختہ ہم گیت ہے"!

موقوف ہے، منظور یہ // نے صبح پر نے شام پر

S I S S + S I S S S I S S + S I S S

گاؤ ترانہ عیش کا // ہر دم پیا، کے نام پر

S I S S + S I S S S I S S + S I S S

---

[1] سبب = دو حرفی مرکب (پہلا حرف متحرک، دوسرا ساکن مثلاً پیا، سَن)

وتد = سہ حرفی مرکب (پہلا حرف متحرک، ما بقی دو؍ سبب۔ مثلاً چمک، دکن)

ہندی آنکڑے ساتھ کے ساتھ لگا دیئے ہیں جو تجزیئے (تقطیع) میں بہت کار آمد ہوتے ہیں۔

[2] ہر مصرعہ کے آدھے آدھے پر تنصیفی نشان (//) لگا دیئے گئے ہیں۔ ہر رکن (تجزیہ) کا وزن ہے مستفعلن چہار حرفی ہے۔

اہلِ خرد کی مصلحت // اندیشیوں کو کیا کہیں

S I S S + S I S S // S I S S + S I S S

جن کو جنوں تھا کام کا // دنیا میں کیا کچھ کر گئے

S I S S + S I S S S I S S + S I S S

جب بھی چلے در تم ہوئے // رُکتے ہوئے ہر گام پر

S I S S + S I S S // S I S S + S I S S

اُن سے یہاں کیا ہو سکا // مرتے رہے جو نام پر

S I S S + S I S S + S I S S + S I S S

اور تین شعر بخوفِ طوالت شامل نہیں کئے گئے ورنہ اُن کی معنویت اُوپر کے شعروں سے کچھ کم رُتبہ نہیں۔ مطلع کا دوسرا مصرع گولکنڈے کے تاجدار محمد قلی کا ہے جسے منظور نے خوب اپنایا ہے۔

اور اب ملاحظہ کیجئے اِن دو غزلوں کے کچھ اشعار اور ان کے مطلعوں کے شاندار جوڑ۔ ان میں سے ایک غزل غالباً اپنی ہے اور دوسری غیر اپنی (طرحی) دونوں کا تغزل تیکھا ہے۔ یہ رہے اول الذکر غزل کے چو کڑے سے تین مطلعے، پوری غزل (۸) اشعار پر مشتمل ہے۔

جذبِ دل پردہ دَر و پردہ کشا آج بھی ہے
حسن کیا کیجئے مجبورِ حیا آج بھی ہے

ناخنِ عقلِ رسا عقدہ کُشا آج بھی ہے
عمل و جہدِ مسلسل کا صلہ آج بھی ہے

حسن اک پیکرِ انداز و ادا آج بھی ہے
عشق مستِ مےِ تسلیم و رضا آج بھی ہے

اور یہ رہے دو تیز شعر، باقی پانچ میں سے، —

ایک مدت ہوئی منصور کو گزرے لیکن
اِن فضاؤں میں انا الحق کی صدا آج بھی ہے

دمِ رخصت وہ ترا سوچ میں ڈوبا چہرہ
دل پہ اس وقت کی غمگیں سی فضا آج بھی ہے

اور یہ رہے دوسری پُر تاثیر اور رواں غزل کے کچھ اشعار۔ طرحی نہ بھی سہی تو بھی اس زمین میں اور شعراء نے بھی اشعار موزوں کئے ہیں۔ کئی ایک مطلعوں کی مسلسل بارش بڑی شاندار ہے۔ صرف دو مطلعے یہاں پیش کئے جائیں گے اور کچھ اور اشعار اس غزل کے۔ پوری غزل دس اشعار پر مشتمل ہے۔ معنوی کیف کے ساتھ قوافی بھی بڑے تیز اور ردیف سے عاری ہیں، —

وہ گلشن میں جب بھی بصد ناز آئے
کئی پھول مہکے، کئی مسکرائے

یہ مژدہ سنا ہے "وہ آئے، وہ آئے"
خوشی سے مرا دل نہ کیوں جھوم جائے

سُنائی جو رودادِ دل ہم نے ان کو
وہ ہنستے رہے، اپنی نظریں جھکائے

وہ کیا جذبِ دل تھا، خراماں خراماں
بہت دور تک "وہ" مرے ساتھ آئے

؎ حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر طالب رزاقی کا ایک فکر انگیز شعر اسی زمین میں کیا خوب یاد آیا۔ آپ بھی سنیئے

رہے موردِ رنج و غم نیک بندے
رموزِ مشیّت سمجھ میں نہ آئے!

رہ عشق میں اپنا سب کچھ لُٹا کر　　　وہ ہم ہیں کہ بیٹھے رہے ہو ں لگائے

سقراط کے متعلق مشہور ہے کہ کوچہ و بازار کے شور و شغب میں بھی اُس کے ذہن کا دریچہ ہر دم کھلا رہتا جس سے وہ اپنے لئے غور و فکر کا کوئی گوشہ نکال ہی لیتا تھا۔ شاعر بھی بسا اوقات یہی کرتا ہے۔ ملاحظ ہوں منظور کی یہ دو بانکی غزلیں جو مشہور گلوکار محمد رفیع اور سہگل آنجہانی کے دو مقبول خاص و عام اور "سراپا حجاب" (!) گانوں سے متاثر ہو کر لکھی گئیں۔ پہلے سنئیے رفیع کی طرز میں لکھی ہوئی غزل کے کچھ اشعار پوری غزل ۹ شعروں پر مشتمل ہے۔ جس میں تین لگاتار مطلعے ہیں اور مابقی پانچ خاصے تیکھے شعر:—

مجھکو کسی کے پیار نے مارا ہے دوستو!　　　وہ حسن کا پیار جان سے پیارا ہے دوستو!
جو شخص ہے وہ درد کا مارا ہے دوستو!　　　یہ کیسا دل گداز نظارا ہے دوستو!
کس کو سنائیں ایک نئی صبح کے لئے　　　کس کرب میں یہ وقت گزارا ہے دوستو!
دنیا حسین تھی مگر اتنی حسین نہ تھی　　　یہ کس حسیں نظر کا اشارا ہے دوستو!
ہمت کے حوصلے کے سہارے کے واسطے　　　ہر ہر قدم پہ "اس کو" پکارا ہے دوستو!

اور یہ ہے ایک دوسری غزل، جو ریڈیو سے سہگل کا ایک گانا سننے کے بعد لکھی گئی۔ پچھلی غزل کی طرح یہ بھی ۹ شعروں پر مشتمل ہے جن میں ایک جوڑا مسلسل مطلعوں کا ہے۔ صرف تین شعر اور دو مطلعے یہاں پیش کئے جائینگے ؎

مجھکو جو تیرے در سے غم جاوداں ملا　　　گویا کوئی رفیق ملا، رازداں ملا
تجھ سا زمانے میں نہ کوئی مہرباں ملا　　　جب تو ملا، خوشی کا مجھے اک جہاں ملا
اے دوست تیرے حسنِ تغافل کے میں نثار　　　تیرے خیال سے مجھے عزم جواں ملا
جہد بقا کی راہ میں سب پیچھے رہ گئے　　　اک زندگی کا قافلہ ہر دم جواں ملا
سرمایۂ جنوں کی حفاظت کے واسطے　　　صد شکر، عقل سا مجھے اک پاسباں ملا

ایک آخری مثال، دو چندی چھند (دوہے مصرعوں) کی جس کے ارکان یکسر مجھنگی ہیں۔ اس کا آہنگ وہی ہے جس میں میر صاحب کی ایک مشہور غزل ؎

(اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں // کچھ نہ دوا نے کام کیا)

موزوں ہوئی ہے۔ ہندی کے بیشتر دوہے اور داورے اسی وزن میں ہوتے ہیں۔ منظور کی ایک غزل کے یہ اشعار بھی ملاحظ ہوں جن کا آہنگ وہی ہے جو میر صاحب کے مذکورہ مصرعے کا ہے۔ قافیے البتہ مختلف ہیں اور ردیف بھی ؎

ارمانوں کا مرکز تھا جو کبھی // اب لاش ہے بکھرے خوابوں کی
جو دل تھا متاعِ زیست اُسے // نذرِ غمِ جاناں کر بیٹھے

وہ آئیں گے "خانۂ تیر" میں بھی // اور اُن سے باتیں بھی ہوں گی[1]
اِک آس تھی اُن کے آنے کی // ہم جشن کا ساماں کر بیٹھے!

دل میں کئی شمعیں روشن ہیں // آنکھوں میں بھی دیپک جلتے ہیں
یادوں کے چراغوں کو منظورؔ ! // پھر آپ فروزاں کر بیٹھے!

اور اب آیئے کچھ چھوٹی بحروں کی غزلوں کی طرف جن کے اشعار کچھ بھجنگی چھندوں میں ہیں اور کچھ غیر بھجنگی چھندوں میں۔ ملاحظہ ہوں پہلے کچھ اشعار ایک بھجنگی غزل کے۔ پوری غزل ۷ اشعار پر مشتمل ہے اور سب کے سب بڑے نکیلے نشتر ہیں جن کی چمک دمک، ردیف کے فقدان سے اور بھی تیز ہو گئی ہے ؎

جب بھی تیری یاد ستائے | کیسے کوئی جی بہلائے!
کوہ کنی کا ہے یہ کرشمہ | تیشۂ جوئے شیر بہائے
دھوپ ہے جتنی تیز اتنے ہی | گہرے ہیں دیوار کے سائے!

چھوٹی بحروں میں منظورؔ نے اپنے کمالِ فن کا کامیاب اظہار کیا ہے۔ یہ رہی ایک اور غزل جو بحرِ ہزج کے تین اجزائی سانچے میں ہے۔ ردیف اس کی یکسر موضوعاتی (مہنگی پڑی ہے) اور کسی قدر لمبوتری ہے جس کے باعث بیشتر مصرعوں کا ⅔ حصہ (بشمول قافیہ) ردیف نے گھیر لیا ہے۔ اس طرح شعروں کے ⅓ حصے میں دل لگتی اور سلیقے سے کوئی بات کہنا، بڑا کٹھن کام ہے۔ ملاحظہ ہوں کچھ اشعار ؎

ازل سے تشنگی" مہنگی پڑی ہے | مئے فرزانگی" مہنگی پڑی ہے"
کوئی کرتا ہے شکوہ بے رُخی کا | کسی کو دوستی" مہنگی پڑی ہے"
تمنا خوں شدہ دل کی تمنا | بنامِ زندگی" مہنگی پڑی ہے"
جنونِ عشق ہی کام آیا منظورؔ[3] | خرد کی آگہی" مہنگی پڑی ہے"

چھوٹے اور ہلکے پھلکے چھندوں (اوزان) میں جنھیں منظورؔ نے بہت زیادہ استعمال کیا ہے اور اس طرح

۱۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طرحی غزل ہے اور اس شعر کے مصرعۂ اول میں "خانۂ تیر" کے "اشاری ذکر" سے میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ کہ کہیں یہ بھی میرؔ صاحب کی "جاگیری از زمین" (؟) نہ ہو۔ ۲۔ اسے پہلا وزن بھی کہہ سکتے ہیں۔ انگریزی کا آئی ایمبک وزن بھی آواز کے زیر و بم کے اصول پر ہے۔ ۳۔ اسی طرح کی لمبوتری ردیف رکھنے والی ایک غزل (ایک دوسرے آہنگ میں) آپ کو صفحہ ۱۱۱ پہ ملے گی ؎
زخم کھائے ہوئے ہیں اے دوست!"

اس "تنگ نائے" میں تیکھے شعر نکالے ہیں، ایک چھند وہ ہے جس کا نام ہی "بحرِ خفیف" (سبک چھند) ہے۔
یہ رہے کچھ شعر غالب کی ایک مشہور غزل (ابنِ مریم ہوا کرے کوئی) کے آہنگ میں۔ وہی متانت، وہی تاثر
ردیف کی پازیب بھی تقریباً وہی۔ قوافی کے گھنگرو البتہ مختلف ہیں۔ دو مطلعے اور تین شعر حاضر ہیں :-

اپنا جلوہ دکھا گیا کوئی میری ہستی مٹا گیا کوئی
یاد اپنی دلا گیا کوئی دل میں شمعیں جلا گیا کوئی
کتنی سادہ تھی داستانِ حیات کتنی رنگیں بنا گیا کوئی
کیسے ارماں سے کوئی آیا تھا کیسا گم صم چلا گیا کوئی
کوئی منظورِ منتظر سے کہے آیا، آیا وہ آ گیا کوئی

سبک چھند کی یہ ایک مثال اور :-

جب کوئی حالِ دل سناتا ہے چپکے چپکے وہ مسکراتا ہے
اس کی جب یاد دل میں آتی ہے آدمی سب کو بھول جاتا ہے
عمر دو روزہ یوں گزرتی ہے جیسے کوئی خیال آتا ہے
کٹ گئی بس اس انتظار میں عمر اب وہ آتا ہے اب وہ آتا ہے

جس خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ "حرفِ شوق" کے محاسن میں نے گنائے ہیں اور منظور صاحب کو سراہا ہے، وہیں ایک خاص خامی کی طرف اچٹتا سا اشارہ کر دینا غالباً بے محل اور نامناسب نہ ہوگا۔

میرا یہ ایقان ہے کہ قدرتی جوہر کے ساتھ جو عطیۂ ربانی ہے، شاعر کو کچھ واقفِ فن بھی ہونا چاہیئے۔ فن سے ناواقفیت بسا اوقات شعر کے معنوی حسن پر پانی پھیر دیتی ہے۔ اب تو خیر سے "خصی شاعری" (معرا نظم نگاری) بھی خاصی اچھی ہونے لگی ہے۔ لیکن پابند شاعری اور اس میں قافیوں کی تان اب بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہے اور رکھے گی۔ قافیئے بلاشبہ شعر کی تان کو تیز کرتے ہیں۔ قافیوں کا شعری تان میں وہی مقام ہے جو موسیقی میں "سم" کا ہوتا ہے یا طبلہ نوازی میں تھاپ کا ہوا کرتا ہے۔ غلط سلط تھاپ سے سنگیت میں خلل پڑتا ہے۔ قوافی میں سب سے بڑا عیب وہ ہے جبکہ قافیئے کے اصلی حروف کی بجائے شاعر کھوٹے اور "زائد" حروف کا سہارا لیتا ہے۔ اپنے سلیقے اور علمی قابلیت کے باوجود یہی حرکت منظور صاحب نے بھی بعض جگہ کی ہے۔ چند ایک مثالیں لغزشِ قوافی کی ان کے "حرفِ شوق" کی بعض غزلوں سے پیش کی جائینگی۔ یہ رہی ان کی ایک غزل جس میں بے عیب اور عیب دار قافیوں کی آمیزش ہوئی ہے۔ پہلے کچھ اشعار لیجئے جن میں کھرے قافیئے آئے ہیں :-

کون سمجھے فریب دنیا کا چال ہر دم نئی یہ چلتی ہے

وقت پہ کچھ نہ کر سکی دنیا | بعد از وقت ہاتھ ملتی ہے
رُخِ زیبا ہے روبرو منظور | دل میں اک آرزو مچلتی ہے

اوپر کے مصرعوں میں (چلی، ہِلی، اور مچلی) میں لام حرف اصلی (رَوی) ہے اور "تی" زاید حروف ہیں جو حرف اصلی (روی) سے مل کر قافیوں کی تان کو اور بھی تیز کرتے ہیں۔

برخلاف اس کے اسی غزل کے نیچے دیئے ہوئے مصرعوں کے قوافی میں حرفِ روی میں توافق (میل) نہ ہونے کے باعث محض زائد حروف پر ٹکاؤ (انحصار) مصرعوں کے آہنگ میں خلل ڈالتا ہے جو سخت عیب ہے۔ اصطلاح میں اسے "ایطائے جلی" کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں ان مصرعوں کے کھوٹے قافیے ؎

میری ہر سانس مجھ سے کہتی ہے | کوئی دم میں یہ رُت بدلتی ہے
بات کو طول دینے سے اے دوست! | بات بنتی نہیں، بگڑتی ہے
ختم ہوتا ہے یاس کا عالم | آرزو کی کلی چٹکتی ہے

اوپر کے مطلع اور بعد کے اشعار کے قوافی میں "تی" کے حروف زائد ہیں اور ان الفاظ (کہہ، بدل، بگڑ اور چٹک) میں چلیپائی تہہ "(ہ)"، لام، ڑے اور کاف، ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے اور مصرعوں کی پھس پھسی تان صرف "تی، تی" پر ٹکی ہوئی ہے جو سخت عیب ہے۔ اسی کو ایطائے جلی کہتے ہیں۔

ایک مثال "ایطائے خفی" کی بھی سہی جو اتنا معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ یہ رہے کچھ اشعار ایک غزل کے جس کے بیشتر قوافی یکسر حرف زاید (یائے معروف) کے بل پر قائم ہیں لیکن یہ (ی) کچھ اس طرح بے میل حروفِ روی سے

۱۔ قافیے میں کم سے کم ایک حرف کا علی التواتر (مکرر) آنا ضروری ہے۔ اصطلاح میں اسے "حرفِ روی" کہتے ہیں۔ حرف روی عموماً اصلی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار اصلی نہیں بھی ہوتا جسے "وصلی" یا زاید کہتے ہیں۔ حروف زاید روی کے مابعد آتے ہیں۔ یہ رہا ایک شعر دبیر کا جس میں امام حسین کی کربلا میں شہادت کی جانب اشارہ ہے ؎

جنبش میں ہے اب روضہ رسولِ عربی کا | اک ہاتھ نکل آیا ہے مرقد سے نبی کا | (دبیر)

اوپر کے شعری قافیوں (عربی، نبی) میں پہلے کی یائے معروف زائد ہے اور دوسرے کی اصلی ہے۔ حروفِ قوافی میں اصلی اور "زاید" حروف کا اس طرح کا امتزاج عیب نہیں لیکن کسی غزل یا نظم میں قافیے کے حروف سراسر زاید حروف ہی پر ٹکے ہوں اور حرف اصلی (روی) سرے سے غائب ہو یا پھر بعض مصرعوں میں اصلی حروف (حروف روی) کہیں آئیں اور کہیں بدلے روپ میں آئیں تو اس طرح کھرے اور کھوٹے قافیوں کا میل سخت عیب ہے۔ اس عیب کو اصطلاح میں ایطائے جلی کہتے ہیں۔ اگر یہ عیب زیادہ واضح نہ ہو تو "ایطائے خفی" اسے کہیں گے۔ موخرالذکر عیب مباح ہے۔ مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔

پیوست ہے کہ ان کا متناقص (بے میل پن) برا نہیں لگتا۔ سہولت کی خاطر بے میل حروفِ روی کے نیچے چلیپائی نشان لگا دیئے گئے ہیں۔

نئے انداز سے محفل سجی ہے — مگر بس ایک تیری ہی کمی ہے
کسے ساقی کہیں، مے خوار کس کو؛ — کہ چھائی سب پہ یکساں بے خودی ہے
دھندلکے میں چھپی جاتی ہے ہر شے — انوکھے طرز کی یہ روشنی ہے

اوپر کے تمام قافیوں (سجی، خودی، کمی، روشنی) میں یائے معروف (ی) حرفِ نایدہے جو روی کے بے میل حروف (ج، م، د، ن) سے کچھ اس طرح پیوست ہو گئی ہے کہ ان کا تناقص (بے میل پن) بادی النظر میں محسوس تک نہیں ہوتا۔ اس طرح کے اہتمام کو مباح اور جائز سمجھا جاتا ہے اور اصطلاح میں اسے "ایطائے خفی" کہتے ہیں۔

بخوف طوالت میں اب تفصیل میں نہ جاؤں گا۔ چند ایک غزلوں کے سرسری حوالے (بجراحت صفحہ) دیئے دیتا ہوں۔ اپنے طور پر انہیں دیکھئے اور آنکیئے۔

۱۔ غزل صفحہ (دل یہ کہتا ہے مرا کچھ تو کہو) اس غزل کے قوافی میں کہہ، رہ، سہہ جیسے کھرے حروفِ روی (ہ) کے ساتھ، یہ بے میل چلیپائی حروفِ روی (س، جیبت، چھیڑ) لائے گئے ہیں اور واؤ کا دُم چھلا (سنو، جیتو، چھیڑو) لگا کر ان کھوٹے قافیوں کو کھرے قافیوں کا ہم پلہ بنانے کی سعی کی گئی ہے۔ ان سب قوافیوں میں ایطائے جلی ہے۔

۲۔ غزل صفحہ ۱۱ (مع تیرا وہ حسن سانچے میں ڈھلتا دکھائی دے) جس میں ڈھلتا، مچلتا، اگلتا، ابلتا جیسے کھرے قافیوں کے ساتھ (جن کے حروفِ روی یعنی لام اصلی ہیں) ایسے کھوٹے قوافی (چھپتا، اجڑتا) لائے گئے ہیں، جن کے حروف (ک، ڑ) میں کوئی ہم آہنگی نہیں پائی جاتی (ایطائے جلی)

۳۔ غزل صفحہ ۹ (مع "سائے کی طرح جو میرے ہمراہ چلا ہے") اس غزل میں چلا کے ساتھ رہا اور کھڑا جیسے قافیئے بھی آئے ہیں جن کے حروفِ روی (ل، ہ، اور ڑ) میں کوئی مطابقت اور ہم آہنگی نہیں ہے۔ لیکن الف زائد (ا) ان سے کچھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ بادی النظر میں بدآہنگی کا کوئی احساس نہیں ہوتا (ایطائے خفی کی مثال)

۴۔ غزل صفحہ (مع پھول کے ساتھ ترا حسن دوبالا ہوگا) دوبالا اور اجالا کے ساتھ ہمارا اور گزارا کا قافیہ کرنا بھی عیب سے خالی نہیں، اس لئے کہ اول الذکر دو قوافی (بالا، جالا) میں حرف روی لام ہے اور بعد کے قوافی (ہمارا، گزارا) میں حرف روی "ر" ہے۔ اس طرح ایک ہی غزل میں روی کے حروف کی عدم مطابقت بدآہنگی کی علامت ہے لیکن الف نائد کچھ اس طرح "ر" کے ساتھ پیوست ہو گیا ہے کہ بیک نظر عیب محسوس نہیں ہوتا۔ (ایطائے خفی)

اور اب آیئے چند ایک موضوعاتی اور مسلسل غزلوں کی طرف جن کا رنگ تغزل خاصہ گہرا اور تیز ہے یہ رہے کچھ اشعار ایک غزل کے جس کو "آپ کیوں روئے" کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ معنویت اور معاملہ بندی بھی اس کی بڑی تیکھی اور برجستہ ہے ؎

بیان درد پر کیوں آپ گہری سوچ میں ڈوبے؟ ‏ ‏ اداسی جب کبھی چہرے پہ چھائی آپ کیوں روئے؟
یہ سچ ہے ہم تو بس یونہی ملا کرتے رہے برسوں ‏ ‏ جدائی کی گھڑی جب سر پہ آئی، آپ کیوں روئے؟
مجسم انتظار و شوق تھے خط کے لئے کیوں آپ؟ ‏ ‏ خبر جب میری مدت تک نہ آئی آپ کیوں روئے؟
کسی کی یاد میں بے چین ہو کر اک سہیلی نے ‏ ‏ کہانی ہجر کی جب بھی سنائی آپ کیوں روئے؟

یہ بھی اسی قبیل کی ایک قطعہ بند غزل اور جس کا انداز بھی یکسر محاکاتی اور بڑا ہی بانکا ہے۔ زندگی کے "سازِ دل پر رات بھر مچلنے" کا سماں کیا خوب باندھا ہے ؎

زندگی سازِ دل پر مچلتی ہوئی ‏ ‏ اپنا نغمہ سناتی رہی، رات بھر
رات بھر اک حسیں یاد آتی رہی ‏ ‏ زخم دل کے کھلاتی رہی رات بھر[1]
شب کی تنہائی میں گہری خاموشی میں ‏ ‏ اُن کی آواز آتی رہی رات بھر
اُن کے آنے کی اک آس منظور کو ‏ ‏ سو طرح سے جگاتی رہی رات بھر

بخوفِ طوالت میں دو مثالوں ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ ایسی کئی ایک غزلیں "حرفِ شوق" میں آپ کو ملیں گی۔ جنھیں اپنے طور پر آپ پڑھ سکتے ہیں) اور اب چند ایک دوسرے امور کی طرف آپ کی توجہ کو مبذول کیا جائے گا۔

"حرفِ شوق" بلاشبہ منظور صاحب کے دل کی کہانی ہے جس میں انھوں نے غزل کے لطیف پردے میں غالباً اپنی کسی نجی اور ناآسودہ چاہت کو بھی قلمبند کر دیا ہے۔ تاہم اس شعری مجموعے میں عام زندگی، وطنیت، انسان دوستی اور امن و آشتی سے والہانہ محبت کے جلوے بھی جا بجا آپ کو نظر آئینگے۔ اب تک دیئے ہوئے اشعار میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک آپ نے دیکھی ہے لیکن اس شق میں صاف و صریح اشارے اس خصوص میں آپ کو ملیں گے۔ آیئے اس اجمال کی کچھ تفصیل منظور صاحب سے سنتے ہوئے آگے بڑھیں۔ کتاب کے دیباچے ("حرفِ شوق سے پہلے") میں وہ خود کہتے ہیں:—

"مجھے دنیا میں امن کے قیام اور خوش حالی و مسرت کے عام کرنے کے سلسلے میں انسان اور انسانیت پر

---

[1] مصرعہ اوّل کے شروع اور مصرع ثانی کے آخر میں "رات بھر" کے الفاظ کا اعادہ کیا ہی خوب اور برجستہ ہے۔ اس طرح کے اہتمام کو اصطلاح میں صنعت "ردّ العجز" کہتے ہیں۔

کامل الیقان ہے۔ میں انسانیت کے روشن مستقبل کو دل و جان سے عزیز رکھنے، انسانی برادری کے خیال کو عام کرنے اور دلوں سے ایک دوسرے کے خلاف نفرت، حقارت اور تعصب کے جذبے کو مٹانے کی ضرورت اور اس کام کی اہمیت اور افادیت کو دل سے مانتا ہوں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مقدس مشن کی تکمیل، سماج کے ہر طبقے اور ہر فرد کا ہر سمجھدار، سنجیدہ اور متوازن مزاج رکھنے والے مہذب انسان کا فرضِ اولین ہے۔ شاعر کو بھی اس اہم کام کے سلسلے میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔ جذبۂ محبت کو عام کرکے وہ اس مشن کی تکمیل کر سکتا ہے" (ص ۱۸)

"زندگی کی جدوجہد میں مایوسی اور یاس کو میں شکست کے مترادف سمجھتا ہوں۔ اس لئے میں انھیں اپنے دل پر چھا جانے کا موقع نہیں دیتا۔ کامیابی اور مسرت پر ہمیشہ نگاہ رکھتا ہوں اور ان سے ہم کنار ہونے کی امید زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لئے میرے دل کو ابھارتی اور اکساتی رہتی ہے" (ص ۱۷)

متذکرہ بالا امور کی روشنی میں مصنف کے "حرفِ شوق" سے دو شقوں کے تحت، دستاویزی ثبوت پیش کروں گا (ا) منظور کی رجائیت اور وطنیت (ب) منظور کا رویہ، زندگی اور انسانیت کے تعلق سے

(الف) منظور کی رجائیت سے متعلق ملاحظہ ہوں یہ اشعار ایک غزل کے جس کے قوافی کا اہتمام خاص ترنم و نغمگی کے ساتھ، اشعار کے معنوی کیف کو دوبالا کر رہا ہے ؎

آج طوفاں بپا ہے، تو کیا ہے — مل ہی جائے گا اک دن کنارا[۱]
عزم و ہمت، خلوص و محبت — سب سے بڑھ کر یہی ہیں سہارا!
زندگی کی وہ پُر کیف منزل — دور سے کر رہی ہے اشارا!
شب کی تنہائیوں میں کسی نے — نام لے کر مرا پھر پکارا!

اور یہ دو شعر وطنیت سے متعلق، جن کے بعد جستہ جستہ اشعار پیش کئے جائیں گے ؎

بیش قیمت خزانے اگلتی ہوئی — کتنی زرخیز ہے میری خاکِ وطن!
اس کی چاہت میں منظور مر جاؤں میں — سب سے پیارا مجھے میرا پیارا وطن!

۱۔ حرفِ روی سے پہلے آنے والے دو گھنگروؤں (حروف) نے قافیوں کی تان کو تیز کر دیا ہے۔ ان سب میں آخری حرف (الفِ آخر) روی ہے۔ درمیانی حرف (ر) جو دونوں "الفوں" کے درمیان آیا ہے، حرفِ "دخیل" کہلاتا ہے اور الفِ اوّل کو حرفِ "تاسیس" کہتے ہیں۔

اور یہ رہے کچھ جستہ جستہ اشعار جن کے دو مصرعوں میں بہت کچھ مضمر ہے :-

۱- میرے عزم و عمل کی راہوں میں　　ہر رکاوٹ نے منھ کی کھائی ہے　　(ص۱۰۲)

۲- نئی شمعیں جلاؤ تو جانیں　　بجھتی شمعوں کا آسرا کب تک　　(ص۱۵)

۳- ہر مرحلۂ غم سے جو ہنستے ہوئے گزرے　　اعجاز دکھایا ہے یہ صاحب نظری نے　　(ص۲۶)

۴- ہنس ہنس کے پی لی راہوں میں تلخابۂ حیات　　بے خود سا یوں کیا نگہ مست یار نے　　(ص۹۵)

۵- صاحبِ فن نہ مر سکے منظور!　　ویسے کوشش بہت قضا نے کی　　(ص۹۷)

اور اب دوسری شق کی طرف :-

(ب) زندگی اور حیات کے تعلق سے منظور صاحب کی روش یکسر اثباتی اور پرعزم ہے۔ چاہت کے تعلق سے بھی ان کا یہی رویہ ہے :-

تیرے خیال میں گزری ہے زندگی اے دوست　　ترے خیال میں بھی زندگی نظر آئی

رہِ حیات میں جب تک بھی تیرا ساتھ رہا　　قدم قدم پہ ہمیں زندگی نظر آئی

اور یہ رہے ایک دوسری غزل کے کچھ اشعار زندگی کے تعلق سے :-

زندگی کی کام لانی کے لیے　　سو طرح کوشش کیے جائیں گے ہم

ہاں! اندھیرے کے مٹانے کے لیے　　اک نیا خورشید چمکائیں گے ہم

اپنی ہمت سے ہمیں امید ہے　　غم کا دریا پار کر جائینگے ہم

موت سے اک دن ملینگے یوں گلے　　زندگی کا نام کر جائینگے ہم

اور یہ ایک موضوعاتی غزل (دل والو!) کے کچھ اشعار :-

جہاں جہاں سے بھی گزرا ہے کاروانِ حیات　　وہاں وہاں پہ ہمارا نشاں ہے دل والو

غرض کی، حرص کی، بغض و حسد کی دنیا میں　　خلوص و مہر کا انساں کہاں ہے دل والو

اٹھو کہ منزلِ مقصود پر ہی دم لیں گے　　چلو کہ قافلہ دل کا رواں ہے دل والو

اور یہ رہے کچھ جستہ جستہ اشعار :-

۱- کیوں نہ ہم زندگی سے پیار کریں　　زندگی کیا ہے؛ اک گلِ تازہ　　ص۵۷

۲- قرض اور زندگی کا اے ہمدم　　کیا کہیں ہم سے کچھ ادا نہ ہوا　　ص۳۹

۳- نشۂ زندگی سے ہیں سرشار　　بے پئے ہی ہیں مے گسار سے ہم　　ص۱

۴- مقصدِ زیست تھا جو پیشِ نظر　　غرقِ دریا ابھر کے پار ہوئے　　ص۹۹

۵۔ جہل ونفرت کی عداوت کی فضا میں منظورؔ	امن و بیداری انساں کا نشاں ہیں کچھ لوگ ص۹۱

۶۔ ہنگامہ قیامت کا ہے اس بزم جہاں میں	حیرت ہے کہ انسان کھڑا دیکھ رہا ہے ص۹۲

۷۔ زمانہ میری روش کب سمجھ سکا منظورؔ	عجب عجب سا لگا اس کا کاروبار مجھے ص۹۳

خلاصۂ بحث

میرے نزدیک منظورؔ صاحب کے زیر نظر مجموعے میں اُن کی اپنی انفرادیت، اُن کا اپنا رنگ صاف نمایاں ہے۔ اُن کا اسلوب بھی اُن کا اپنا اور منفرد ہے۔ مختصراً یہ کہ ستھری زبان، تیکھی طرزِ ادا، متانت، رکھ رکھاؤ، ملائمت اور وہ خاص دلاویزی جو غزل کی جان کہلاتی ہے، یہ سب چیزیں منظورؔ صاحب کے حرفِ شوق میں موجود ہیں۔ کیا ضرور ہے کہ کوئی تخلیق کار کسی یا رکھ نقادی کی نظر میں ٹکسالی ٹھہرنے کی خاطر کسی دیسی یا بدیسی شاعر یا فلسفی کی چھاپ اپنے اوپر مسلط کر لے۔ ہر فن کار بس ایک ہی ضابطہ جانتا ہے۔ جو اُس کا اپنا ضابطہ ہوتا ہے اور اُس پر وہ سختی سے عامل بھی ہوتا ہے۔ ادبی تخلیق، خراکت اور ساجھے یا ٹریڈ مارک کے اصول پر نہیں ہوا کرتی۔ سچی تخلیق وہی جو اپنے ہی خونِ جگر سے پلے اور پروان چڑھے۔ کسی پیش رو کی تخلیق سے کچھ سطحی اور ظاہری مشابہت کی بنا پر کوئی نئی تخلیق، کسی پیش رو کی تخلیق کی نقل نہیں کہی جاسکتی۔ ہر تخلیق کار یکسر خلاق ہوتا ہے اور ہر تخلیق، اپنے بل بوتے اُبھرتی اور روپ رنگ پکڑتی ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲۸ سے آگے) انھوں نے پرانی اخلاقیات اور نئی معاشیات کا اجتماع۔

(COMBINATION OF OLD MORALITY WITH NEW ECONOMY)

کہا ہے۔ اگر یہ فلسفہ قبول کر لیا جائے تو کمیونسٹ ممالک کے بڑے بڑے ادیبوں کے جلاوطن ہونے کی نوبت نہیں آئیگی دوسری تجویز یہ ہے کہ اب چونکہ راجہ اور مہاراجہ نہیں بلکہ وزیر اعلیٰ یا پی، ڈی او کا زمانہ ہے، اس لئے ان افسروں کے پاس ایک ایسی کمیٹی ہو جو فنکار اور ادیب کو پہچان کرانہیں حکومت کی امداد سے محروم نہ ہونے دے۔

موجودہ دور کے بدلتے ہوئے حالات کی سختیوں پر تبصرہ کرنا اور اُن پر آنسو بہانا عام ہے بلکہ آج یہ جدیدیت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن حالات کے بدلنے کو ناگزیر سمجھکر اسکے قابلِ حل مسائل کو حل کرنے کی تجاویز پیش کرنا فوسٹر کی حقیقت پسندی کا ایک نرالا انداز ہے۔ اگر حالات کا بدلنا لازمی ہو تو تغیرِ حالات سے وابستہ خطرات اور مسائل سے مایوس ہونا کوتاہ نظری اور کم فہمی کی علامت ہے۔

محمد عبداللطیف خاں

(بہ سلسلۂ گذشتہ)
(اگست ۱۹۷۳ء)

پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں

جامعہ عثمانیہ کا معمار

خاں صاحب ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد لوٹے واپسی میں انھوں نے مصر خصوصاً ترکی اور دیگر یورپی ممالک کا دورہ کیا۔ حیدرآباد میں انکے عزیزوں اور دوستوں نے ان کا شاندار استقبال کیا خصوصاً ان کے چچا میجر محمود خاں نے اپنے لایق بھتیجے کا واڑی اسٹیشن پر استقبال کیا۔

خاں صاحب نے ۲۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو اپنی ملازمت کا جائزہ لیا اور تھوڑے ہی دن بعد نظام کالج کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ اس طرح جس مقصد کیلئے انھوں نے کوشش کی تھی وہ پوری ہوئی۔ خانصاحب کچھ دن چین اور سکون سے گذارنے نہ پائے تھے کہ ایک المناک حادثہ سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ انکے نوجوان بھائی عبدالرحیم خاں کی موت تھی نومبر ۱۹۱۴ء میں محرم کی تعطیلات میں خاں صاحب کو ان کے چچا میجر محمود خاں نے دوندگل میں جو نواب سالار جنگ کی جاگیر تھی آکر رہنے کی دعوت دی۔ یہ گاؤں حیدرآباد سے تقریبًا بیس میل دور واقع ہے جو اپنے آموں کی فصل کیلئے مشہور تھا۔ یہاں خاندانی زمینات بھی تھیں خاں صاحب دوندگل روانہ ہوئے ایک دن شکار کو نکلے ان کے ساتھ ان کے بھائی عبدالرحیم خاں بھی تھے۔ ناردل کے تالاب پر چند بطیں نظر آئیں خاں صاحب نے ان کو نشانہ بنایا۔ ایک بط پانی میں گری۔ بھائی نے جو اپنے وقت کے عمدہ پیراک تھے اپنے بھائی کے پہلے شکار کو حاصل کرنے کیلئے بغیر کسی سے کچھ کہے پانی میں چھلانگ لگادی۔ یہ تالاب کی دوسرے جانب تھے۔ جونہی وہ بط کے قریب پہنچے اور اسکو حاصل کرنے کی کوشش کی کہ تالاب کے اندر کی گھاس بیلوں نے انھیں جکڑ لیا۔ انھوں نے کشمکش میں بھائی کو آواز دی۔ خاں صاحب جوشِ جنوں میں آپے سے باہر ہوگئے اور خود تالاب میں کودنے کی کوشش کی لیکن اُن کے ساتھیوں نے اُنھیں پکڑ لیا۔ چند مقامی لوگ یہ خبر سن کر وہاں جمع ہوگئے اور ان سے کہا کہ اس تالاب میں خطرناک بیلیں ہیں۔ آپکے بھائی نے بڑی غلطی کی تھوڑی دیر میں عبدالرحیم خاں کی روح پرواز کرگئی۔ اس طرح جوان بھائی جس کی عمر ۲۴ سال تھی اس دارِ فانی سے رخصت ہوگیا۔

عبدالرحیم خاں صاحب شادی شدہ تھے۔ ان کی بیوی خود ان کی چچازاد بہن میجر محمود خاں کی بیٹی تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد خاں صاحب بہت مغموم رہنے اور وطن چھوڑ کر ترکستان میں جا بسنے کا ارادہ کرنے لگے۔ لیکن مہینے بعد ۲۶ جنوری ۱۹۱۵ء کو مرحوم بھائی کے گھر میں ایک لڑکا (راقم الحروف) پیدا ہوا۔ دن گذرنے لگے خاں صاحب کی

طبیعت سنبھلی اور اپنی ملازمت میں مصروف ہو گئے۔ ترکی جانے کا خیال ترک کر دیا اور چند مہینے بعد خاں صاحب کی شادی نواب سعادت جنگ معتمد مال حکومت حیدرآباد کی صاحبزادی سے ہو گئی۔

شادی کے دن ایک عجیب دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ خاں صاحب اپنے مرحوم بھائی کے لڑکے کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ شادی میں بھتیجے کو بھی اسی کپڑے کی شیروانی بنی جس سے دولہا کی بنی تھی اور بھتیجے صاحب ہر دم تایا صاحب کا ہاتھ تھامے رہے۔ پھر تایا بھتیجے کی شباہت بھی ملتی جلتی تھی اور پھر مزید یہ کہ برخوردار خاں صاحب کو ابّا ابّا کہکر مخاطب کر رہے تھے۔ نکاح کے بعد لوگوں نے اس منظر کو دیکھا اور آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ دولہا شادی شدہ ہے۔ یہ اس کی دوسری شادی ہے اور یہ لڑکا اُن ہی کا ہے۔ نواب صاحب نے بلا تحقیق شادی کر دی۔ غرض اندر باہر ایک کھلبلی مچ گئی۔ نواب سعادت جنگ کو جب یہ خبر پہنچائی گئی تو انھوں نے میجر محمود خاں صاحب سے استفسار کیا تب حقیقت حال کا انکشاف ہوا اور لوگ مطمئن ہوئے۔ زنانہ حصّہ کی گڑبڑ لڑکے کی والدہ نے وضاحت کر کے بند کرا دی۔ تب جاکر کہیں دلہن کی رخصتی عمل میں آئی۔ چند سال اپنے قدیم مکان واقعہ توپخانہ گوشہ محل میں گذارنے کے بعد خاں صاحب نے اپنی شریک حیات کی خواہش پر اپنے خسر کے مکان کے قریب بیگم بیٹھک میں زمین خرید کر ایک مکان تعمیر کروایا اور وہیں رہنے لگے۔

نظام کالج کی پروفیسری کے دوران میں آپ نے سائنس کے تعلق سے بہت نمایاں کام انجام دیئے۔ خود کالج کا تجربہ خانہ آپ ہی کی کوششوں سے وجود میں آیا اور اس کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کروائی گئی جس میں فنی آلات نصب کروائے گئے۔ خانصاحب درس و تدریس کے علاوہ ملک میں عام اصلاحی انجمنوں کی روح رواں تھے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں آپ نے نئی نئی تحریکات نہ صرف پیش کیں بلکہ ان کو عملی جامہ پہنانے میں اہم حصّہ لیا۔ زبان اُردو کے تعلق سے آپ نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اسی زمانہ میں ملک کے رہنماؤں اور خیرخواہوں کو یہ خیال آیا کہ ایک یونیورسٹی قائم کی جائے اور اس یونیورسٹی میں بجائے انگریزی کے اُردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اُردو ملک کی عام سرکاری زبان تھی۔ دفتری کاروبار اُردو میں ہوتے تھے اس لئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک عام اجلاس میں یہ طے کیا گیا کہ اُردو زبان یونیورسٹی میں تعلیم کا واسطہ بنے۔ خاں صاحب اس کانفرنس کے سرگرم رکن تھے۔ چنانچہ سر اکبر حیدری نے (جو اُس وقت سر اکبر حیدری خاں صاحب کے گہرے دوست اور گورنمنٹ کے ہوم سکریٹری تھے) ایک معروضہ اعلیٰحضرت میر عثمان علی خاں بادشاہ وقت کی خدمت میں گذرانا جس میں عرض کیا گیا تھا کہ اُردو کو یونیورسٹی کی زبان قرار دیا جائے اور انگریزی دوسری لازمی زبان رہے۔ اعلیٰحضرت نے بخوشی اس معروضہ کو منظور کر لیا اور ۱۹۱۷ء میں ذریعہ فرمان اس اسکیم کے نفاذ کی منظوری دی۔ اس مقصد کے لئے دارالترجمہ کا شعبہ قائم کیا گیا۔ جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف قابل حضرات

خدمات حاصل کی گئیں۔ اصطلاحات کے ترجمہ کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا گیا۔

جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد انگریزی زبان کی مستند سائنس اور دیگر علوم کی کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں ہوئے گئے۔ حکومت نے کروڑوں روپئے اس پر صرف کئے بعض کتابوں کے متعلق تو کہا جاتا ہے کہ ترجمہ اصل کتاب سے بازی لے گیا۔ خاں صاحب نے بھی سائنس کی کتابوں کے ترجمے کئے لیکن پروفیسر اسمتھ کی کتاب "آواز" کا انھوں نے جو ترجمہ کیا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ آپ نے نہ صرف کتاب کا ترجمہ کیا بلکہ خاص حاشئے لکھ کر اس کی افادیت میں اور اضافہ کیا اس طرح جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم ہونے کی وجہ سے ملک میں نوجوانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ زیور علم سے آراستہ ہونے لگا۔

۲۶ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو بذریعہ فرمان حضور نظام نے خاں صاحب کا تقرر جامعہ عثمانیہ کی پرنسپلی پر فرمایا۔ اس وقت یونیورسٹی کئی عمارتوں میں منقسم تھی۔ سائنس کی جماعتیں موجودہ اسٹیٹ بنک کے پچھلے حصہ میں ہوتی تھیں انگریزی پڑھنے کے لئے فتح میدان کے سامنے جہاں پر بڈولاہے۔ وہاں جانا پڑتا تھا اسی طرح دوسری جماعتیں دوسری مختلف عمارتوں میں ہوتی تھیں۔ لائبریری عابد روڈ کے راستہ پر ایک مکان میں تھی غرض گھنٹہ ختم ہونے کے بعد طلباء کو اپنی جماعتوں میں شریک ہونے کے لئے سیکلوں پر یا تیز رفتاری سے پا پیادہ جانا پڑتا تھا۔

اس وقت بی' اے کی جماعتیں جاری تھیں لیکن ایم' اے اور ایم' ایس' سی کی جماعتوں کا کوئی انتظام نہ تھا۔ طلباء جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے وہ یا تو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی بھیجے جاتے تھے یا ڈھاکہ یونیورسٹی لیکن خاں صاحب نے بہت جلد یونیورسٹی میں ایم' اے اور ایم' ایس' سی کی جماعتوں کا انتظام کر دیا اور سائنس کیلئے اعلیٰ تجربخانے قائم کئے۔ خاں صاحب خود ان طلباء کو سائنس کی تعلیم دیتے تھے۔ ان جماعتوں کے قیام کے لئے انہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑی اور ان کے حسن نیت سے انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ اسی زمانہ میں آپ نے ایک عودی بصری آلہ جو "خاں ونڈسکل آپٹیکل پینچ" کے نام سے موسوم ہے ایجاد کیا اس آلہ سے سروں کے ماسکی طول دریافت کئے جاتے ہیں۔ اس آلے نے عالمگیر شہرت حاصل کی۔

خاں صاحب ڈسپلن پر بڑا زور دیتے تھے۔ ان کی پرنسپلی کے زمانہ میں جب کہ جماعتیں علیحدہ علیحدہ عمارتوں میں اور پھر دور دور ہوتی تھیں طلباء میں نظم وضبط انتہائی عروج پر تھا اور یہی ڈسپلن اڈکمیٹ کی عالیشان عمارتوں میں جو یکجا تھیں قائم نہ رہ سکا۔ خانصاحب کے زمانہ میں طلباء اور اسٹاف دونوں ڈسپلن کے پابند تھے۔ ان کے زمانہ میں طلباء کی ہڑتالیں اور ان کی بے راہ روی کا پتہ نہ تھا۔

خاں صاحب ۱۹۲۷ء میں دوبارہ لندن گئے انہیں لندن یونیورسٹی کے جشن صد سالہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی یونیورسٹی سے متعلق کافی پرچار کیا ان کا یہ سفر پانی کے جہاز "دن پورا" کے ذریعہ ہوا۔

اِسی جہاز سے حیدر آباد کے ریذیڈنٹ ولیم بارٹن لندن جارہے تھے یہاں ان کی ملاقات ولیم بارٹن سے ہوئی جو بعد میں دوستی کی شکل اختیار کر گئی۔ واپسی پر خانصاحب نے ایک مفصل رپورٹ حکومت کو گذرانی جس میں اپنے سفر اور یونیورسٹی کے تعلق سے جو تکمیری کام انھوں نے کیا۔ اس کا ذکر کیا۔ اس سفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جامعہ عثمانیہ کے طلباء لندن یونیورسٹی میں بغیر کسی رکاوٹ کے شریک کئے جانے لگے۔ غرض ان کے دور صدارت میں یونیورسٹی دن دو نی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ لیکن ان کی ترقی بعض ہم عصروں کو کھٹکنے لگی۔ خانصاحب مزاج کے سیدھے اور حق گوئی میں بے باک تھے ان کے اس عمل سے دشمنوں نے فائدہ اُٹھایا۔ سر اکبر حیدری جو خانصاحب کے قریب ترین دوستوں میں تھے ان سے بدظن ہو گئے۔ اس کی اہم وجہ یہ تھی کہ خانصاحب غریب طلباء کی جو اعزاز کے ساتھ امتحان پاس کرتے تھے مالی امداد کرتے تھے اور سرکاری طور پر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک روانہ کرنے کا جب کبھی موقع آتا بلا جھجک سفارش کرتے تھے یہ چیز اسکالرشپ کمیٹی والوں پر شاق گذرتی تھی اس کمیٹی کے صدر سر اکبر حیدری تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کے حلقہ احباب کے طالب علم ان وظائف سے فائدہ اُٹھائیں لیکن خاں صاحب کی وجہ سے انہیں ناکامی ہوتی تھی۔ سر اکبر اس زمانہ میں حیدر آباد کے بے تاج کے بادشاہ تصوّر کیے جاتے تھے۔ اُنھوں نے یونیورسٹی پر ایک انگریز وائس چانسلر کا تقرر کرنے کیلئے حضور نظام کی خدمت میں معروضہ پیش کیا اور اسی دوران خانصاحب کو اپنی قدیم جگہ نظام کالج کی پروفیسری پر لوٹا دیا گیا۔ حیدر آباد کی تعلیمی دنیا میں ہلچل مچ گئی لیکن اُسوقت کے انگریز عہدہ دار جو خاں صاحب کے عزیز دوستوں میں تھے اور کافی ذی اثر تھے چھ مہینوں کے اندر ان کو دوبارہ پرنسپلی پر واپس لوٹا دیا۔ ان انگریزوں میں قابل ذکر مسٹر ٹرینچ وزیر مالی اور مسٹر ٹاسکر معتمد مال ہیں ان دو کے علاوہ نواب تلاوت جنگ نے جو خاں صاحب کے ہم جماعت اور دوست تھے اور حضور نظام کے قریبی رشتہ داروں میں تھے اس مہم میں حصہ لیا۔ فرمان جس کو میں نے خود دیکھا ہے اس میں بڑی خوبی سے حضور نظام نے اس بات کا اظہار کیا کہ ان کا مقصد خاں صاحب کو یونیورسٹی سے ہٹانے کا نہیں تھا بلکہ کسی انگریز کو یونیورسٹی کے نئے عہدہ پر وائس چانسلری پر تقرر کرنے کا تھا۔ خانصاحب کو یہ فرمان وصول ہونے سے پہلے راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی نے جو کوتوال شہر اور حضور نظام کی پیشی کے خاص آدمی تھے۔ خانصاحب کو آکر خوش خبری سنائی۔ غرض خاں صاحب پھر جامعہ عثمانیہ کی صدارت پر فائز ہوئے۔ لیکن مخالفین برابر اس کوشش میں تھے کہ انہیں اس عہدہ سے ہٹا کر ہی دم لیں گے۔ یہ لکھتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ایسے طلباء جن کو وظائف دلوا کر خاں صاحب نے اپنے مخالفین پیدا کئے۔ جنھیں ملازمتیں دلوائیں سر اکبر کی پارٹی سے وابستہ ہو گئے کیونکہ اُنھوں نے دیکھا کہ سر اکبر کی سرپرستی سے وہ ترقیوں سے مستفیض ہونگے۔ یہ طلباء زیادہ خوشامدی اور غیر معیاری گرے ہوئے ماحول کے پروردہ تھے۔ لیکن جو شریف گھرانوں کی پیداوار تھے اُنھوں نے نہ صرف خاں صاحب کے دور صدارت میں ان کی

خدمت بجالائی بلکہ خاں صاحب کے وظیفہ پر ہٹنے کے بعد بھی اُسی خلوص، محبت اور عقیدتمندی سے اِن سے ملنے آیا کرتے تھے چنانچہ خود غرض اور دھوکہ باز شاگردوں سے متعلق خانصاحب نے اپنے ایک کتابچہ "مرقع خیال" میں ایک قطعہ لکھا ہے جو قارئین کی دلچسپی کی خاطر درج ذیل ہے ؎

بیوفائی مردمان غرض | مضطرب قلب و تلخ کام کرد
آن کہ آموخت کیمیا از من | عاقبت زہر در طعام کرد

سر اکبر نے دوبارہ خانصاحب کو نظام کالج کی وائس پرنسپلی پر لوٹانے کی کوشش کی اور اُن کی جگہ ایک انگریز مسٹر میکنزی کو بحیثیت پرو وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ فرمان وصول ہونے کے بعد خاں صاحب نے نظام کالج جانے سے انکار کردیا اور ملازمت سے قبل از وقت جب کہ وظیفہ کو ڈھائی سال باقی تھے۔ سبکدوش ہوگئے۔ اکثر طلباء نے احتجاجاً کالج کا بائیکاٹ اور ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن خانصاحب نے ان طلباء کے لیڈروں کو بلاکر سمجھایا اور ہڑتال سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا طلباء اُس وقت تو خاموش ہوگئے لیکن تھوڑے ہی دن بعد حضور نظام کی سلور جوبلی کے سلسلے میں ان لوگوں نے امتحانات کی تاریخ بڑھانے کی درخواست دی جب ان کی یہ خواہش منظور نہیں کی گئی تو تمام طلباء نے بڑے پیمانے پر ہڑتال کردی۔ اِس طرح انھوں نے اپنے دل کا غبار نکالا اس کے بعد سے ہڑتالوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوگیا۔

وظیفہ پر علیحدہ ہونے کے بعد خاں صاحب مختلف امدادی کالجوں کی کمیٹیوں کے صدر رہے اور اپنا وقت تالیف و تصنیف میں گذارنے لگے۔ خصوصاً اجرام فلکی اور شہاب ثاقب پر آپ نے لاجواب تحقیقاتی کام کیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

مشغول حق بکنج قناعت نشستہ ایم | بست انہماک بر سمادی و رنگ ما
پہنائے چرخ پیش ہند من شکارگاہ | انجم درو نشانۂ تیر و تفنگ ما

خاں صاحب کو وظیفہ پر علیحدہ ہوکر دو تین مہینے گذرے ہونگے کہ ایک دن میں ان سے ملنے ان کے مکان پر گیا دیوان خانہ میں دیکھا کہ نواب ممتاز یار الدولہ تنہا مگر خاموش اور سہمے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں انہیں سلام کرکے مکان میں گیا تو دیکھا کہ خاں صاحب آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے اطلاع دی کہ ممتاز یار الدولہ آپ سے ملنے آئے ہوئے ہیں اس پر خاں صاحب نے اپنے خاص انداز میں کہا کہ "کیا وہ ابھی نہیں گئے" میں نے کہا نہیں تو ہنسنے لگے اور کہا کہ یہ بزرگ میرے پاس اس لئے آئے تھے کہ میں ان کے خانگی مدرسہ آصفیہ کی صدارت قبول کرلوں اور وہ مجھے ماہانہ پانچسو روپے تنخواہ دینگے۔ میں نے ان سے صاف کہدیا کہ آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ آپ آئندہ ایسی تحریک میرے سامنے ہرگز مت کیجئے" میں انہیں وہاں بیٹھا ہوا چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا"۔

میں نے کہا گو یہ فوجی آدمی ہیں فوجی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مگر آپ کی طرح علمی دنیا سے محبت رکھتے ہیں
اس پر خاں صاحب نے کہا کہ دس پندرہ سال سے ان کے مدرسہ کی کمیٹی کا سرگرم رکن رہا کئی کئی دن میں نے
ان کے مدرسہ کی ترقی اور معائنہ میں صرف کئے اب وہ مجھ پر مہربانی کرنے آئے ہیں ان کے معاوضہ کے بغیر
میں اب بھی ان کے مدرسہ کا کام کرنے تیار ہوں لیکن انھوں نے تنخواہ ایصال کرنے کی تجویز جو مجھ سے بیان کی
اس سے مجھے آگ لگ گئی میں نے کہا وہ پیرون میں تکلیف رکھتے ہوئے بیساکھیوں کے سہارے آپ کے مکان کی
سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہیں اور آپ کے قدیم دوستوں میں سے ہیں آپ ان سے ہمدردی کیجئے۔

خاں صاحب کچھ نرم پڑے دوبارہ جاکر ان سے بڑے خلوص سے ملے میں نے یہ تماشا اپنی آنکھوں سے
دیکھا کہ دونوں آپس میں بغلگیر ہوئے۔ ممتاز یار الدولہ نے اپنی گستاخی کی معافی چاہی اور خاں صاحب نے کہا کہ
میں آپ کے اسکول کی خدمت ضرور کرونگا۔ مجھے معاوضہ نہیں چاہیئے۔ اس طرح دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے
سے رخصت ہوئے۔ اسی طرح حضور نظام نے خاں صاحب کی سائنسی اعلیٰ صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو طلب
فرماکر شہزادہ مکرم جاہ کو سائنس کی تعلیم دینے کے لیئے مقرر کرنا چاہا مگر آپ نے اپنی صحت اور کبرسنی کا عذر پیش
کرکے معذرت چاہ لی۔

یہ بھی قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ خاں صاحب نے جس محنت اور جاں نشانی سے جامعہ عثمانیہ کے
چمن کو سنوارا اور آراستہ کیا ان ہی کی آنکھوں کے سامنے وہ سیاسی حوادث کا شکار ہوگیا۔

خاں صاحب کی ہمہ گیر صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لئے با ضابطہ ایک علیحدہ کتاب تحریر کرنے کی ضرورت ہے
علمی کارنامے تو آپ پڑھ چکے اب آپ جسمانی کارکردگی کا بیان سن لیجئے ہم انٹرمیڈیٹ سال اول میں تھے یونیورسٹی
کے سالانہ جلسے کے پروگرام ہورہے تھے۔ ورزش جسمانی کے پروگرام میں ایک نوجوان پہلوان تھا طالب علم نے
ایک موٹی لوہے کی سلاخ موڑ کر اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا اور خمیدہ سلاخ خاں صاحب کو پیش کی۔ خاں صاحب نے
سلاخ سیدھی کی اور طالب علم کو واپس لوٹادی۔ اس پر طلباء نے خوب تالیاں بجائیں اور خاں صاحب کی
قوت جسمانی کی داد دی۔ وظیفہ کے بعد جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ دن میں خاں صاحب کے اوقات تصنیف و تالیف
اور راتیں اختر شماری میں بسر ہوتی تھیں اگر ان سے تھک جاتے تو باغ میں جسمانی کام کرتے ایک دن جب میں
ان سے ملنے گیا تو آپ اپنے گھر کے باغ میں آم کے درخت پر نظر آئے۔ اس عمر میں بھی ان کی جسمانی کارکردگی معیاری
تھی گرما کی تعطیلات اور خصوصاً آم کے موسم میں خاندان کے اکثر لوگ اپنے گاؤں دندگل کو جو حیدرآباد سے بیس میل
دور ہے چلے جاتے تھے۔ ہمارا ایک مکان آبادی سے باہر تھا۔ رمضان کا مہینہ اور صبح کا وقت تھا کہ ایک دن دور سے
ایک صاحب سیکل پر سوار انگریزی لباس زیب تن کئے آتے ہوئے نظر آے جب قریب آیے تو دیکھا کہ خاں صاحب ہیں۔

سب نے اُٹھ کر اُن کی تعظیم کی۔ میں نے پوچھا کہ اچانک آپ بغیر اطلاع دیئے کیسے چلے آئے تو فرمانے لگے کہ "مجھے اطلاع ملی کہ تم گاؤں میں ہو اور ادھر سحری میں ذرا مزیدار کھانے تھے زیادہ استعمال میں آئے۔ انھیں ہضم کرنے کے لیئے یہاں چلا آیا" ہم تمام ہنس پڑے دو گھنٹے ٹھہرنے کے بعد واپس جانے کا ارادہ کیا میں نے انھیں یہ کہکر روک لیا کہ آپ روزہ سے ہیں شام میں افطار کرکے جائیے۔ چنانچہ وہ ٹھہر گئے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں دوسری سیکل پر خاں صاحب کے ساتھ ہوگیا اس طرح رات کے کوئی دس بجے ہم بیگم پیٹھ پہنچے۔ خاں صاحب کو سیکل کی سواری کا بہت شوق تھا یوں بھی گھوڑے کی سواری کا بھی شوق تھا۔ خصوصًا عالم جوانی میں میلوں وہ سیکل یا گھوڑے پر چلے جاتے تھے۔

اس صحت مند اور طاقتور شخصیت کو اپنے آخری زمانہ میں تکلیف اُٹھانی پڑی خاں صاحب بیمار ہوگئے۔ پاؤں میں تکلیف ہو جانے کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے مجبور ہوگئے۔ آپریشن کے بعد بہت ہی کمزور ہوگئے تھے۔

انتقال سے ڈیڑھ دو ماہ قبل ایک دن مجھ سے پوچھا کہ کیا تم خاندانی قبرستان کو فاتحہ پڑھنے جاتے ہو! میں نے کہا کہ والدہ صاحبہ کے انتقال کے بعد سے تقریبًا ہر مہینہ فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں۔ کہنے لگے کہ "میرے والد کو انتقال کئے تقریبًا ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ ہوا تم میرے لئے ان کے بازو جگہ دیکھو۔ ان کا انتقال ۱۰ محرم شام کے پانچ بجے ہوا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی اسی دن اور اسی وقت اس دنیا سے رخصت ہونگا" میں نے متاثر ہوکر پوچھا کہ آپ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں تو مسکرا کر کہنے لگے کہ "وقت قریب آگیا ہے اور کفن دفن کی تمام تیاری تمہیں کرنی ہوگی۔ دوسرے دن میں حضرت آغا محمد حسن صاحب کی درگاہ کے احاطہ میں جہاں ہمارا خاندانی قبرستان ہے گیا اور اپنے دادا صاحب کی قبر کے بازو جگہ دیکھی عجیب بات ہے کہ اس طویل عرصہ میں یہ جگہ محفوظ رہی۔ محرم کا مہینہ شروع ہوا اور میرے دماغ میں خاں صاحب کی گفتگو گھومنے لگی ۲ محرم کو مجھے اطلاع دی گئی کہ خاں صاحب اچانک شدید علیل ہوگئے ہیں میں فورًا پہونچا دیکھا کہ بیہوشی کے عالم میں ہیں ۹ تاریخ تک میں ان کے قریب رہا۔ ۹ کی صبح کو وہاں سے نکلا سجادہ صاحب درگاہ سے آکر ملا اور کہا کہ خاں صاحب کے لیئے ان کے والد کے بازو قبر کھدوا رہا ہوں اور آپ کو اس کی اطلاع دینے آیا ہوں ان سے اجازت رسمی تھی کیونکہ قبرستان خاندانی تھا۔ فورًا مزدور بلوا کر میں نے قبر کھدوانی شروع کردی کیونکہ دسویں محرم کو مزدوروں کا ملنا ذرا دشوار تھا۔ رات کے آٹھ بجے تک یہ کام ہوتا رہا۔ پھر قبر کی کڑیاں رکھوا کر میں اپنے گھر آیا۔ کھانا کھانے کے بعد معہ اپنی اہلیہ کے بیگم پیٹھ پہنچا۔ یہاں سب میرے منتظر تھے کیونکہ خاں صاحب کو دوا پلانے، پانی اور نگہداشت کی ذمہ داری خصوصًا رات کے اوقات میں مجھ پر تھی۔ قبر کی تیاری کی یہاں میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی۔ غرض رات گذری۔ صبح ۱۰ تاریخ کو ۹ بجے خاں صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ سب کو دیکھا اور مسکرائے۔ تقریبًا نصف

گلاس پانی پیا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ میری اہلیہ جو قبر کی تیاری سے واقف تھیں کہنے لگیں۔ اب انہیں ہوش آگیا ہے میں نے آہستہ سے ان کے کان میں کہا کہ یہ افاقۃ الموت ہے۔ عزیز جو قریب تھے خوش تھے۔ لیکن ہماری بے چینی بڑھنے لگی۔ مسز خاں صاحب سے رخصت چاہی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ خاں صاحب شام تک کے مہمان ہیں۔ ان کی موت میرے لئے ناقابل برداشت تھی کیونکہ کچھ عرصہ پہلے ہی میں ایک حزنیہ سے متاثر ہو چکا تھا۔ یہ میری والدہ کا انتقال تھا۔ غرض میں یہ کہکر کہ آج یوم عاشورہ ہے۔ گھر میں بھی بچے ختم قرآن کرتے ہیں۔ فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ میں پھر شام میں آؤنگا۔ یہ کہکر وہاں سے نکل آیا۔ شام میں ساڑھے پانچ بجے خاں صاحب کے پوتے نے انتقال ہوا کی اطلاع دی۔ میں نے بچے سے کہا کہ بیٹا! کفن دفن کی فکر مت کرو۔ میں خود آرہا ہوں اور انتظام کر دونگا۔ غرض ایک عالی وقار عالم نے اس دنیا سے کوچ کیا اور خاں صاحب نے دو ماہ قبل اپنی موت کی تاریخ و وقت سے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ خاں صاحب کا انتقال ۱۰ محرم ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۶۲ء کو ہوا۔

خاں صاحب کے انتقال کی خبر جیسے ہی بیرونی ممالک کی رصدگاہوں پر پہونچی وہاں ان کا بڑا غم منایا گیا۔ یورپ امریکہ اور روس میں تعزیتی جلسے ہوئے اور متعلقہ میگزینوں میں خاں صاحب کے کارناموں کو سراہا گیا۔ کیونکہ خاں صاحب ان رصدگاہوں کے خاص ممبر تھے اور ان کے تحقیقاتی کاموں سے یہ رصدگاہیں مستفید ہوتی رہتی تھیں۔ اختصار کی خاطر خاں صاحب کے انتقال پر ملال کے موقع پر چارلس پی۔ آلیور پریسیڈنٹ امریکن میٹر سوسائیٹی نے ایک تفصیلی بیان اپنے رسالہ اسٹرونومی اگسٹ ۱۹۶۲ء میں شائع کیا اس کے چند سطور کا ترجمہ پیش ہے " پروفیسر محمد عبدالرحمن خاں اے۔ آر سی۔ بی۔ ایس۔ سی (لندن) فیلو آف رائل اسٹرونامکل سوسائٹی کی موت سے امریکن میٹر سوسائیٹی نے ایک قدیم اور عالیشان رکن کو کھو دیا ہماری رصدگاہ ہیں۔ خاں صاحب کے کوئی گیارہ ہزار پانچ سو چالیس مشاہدات محفوظ ہیں۔ ان مشاہدات کے علاوہ آپ کے معیاری علمی مضامین یورپ اور امریکہ کے سائینٹفک جرائد میں کثرت سے شائع ہوئے خصوصاً امریکہ میں آپ کے مضامین قدر کی نگاہ سے پڑھے جاتے تھے پروفیسر خاں یونیورسٹی نیو میکسکو کے ایک سرگرم محقق اور رکن تھے" خانصاحب کے متعدد مضامین رسالہ سنیچر (جو لندن سے شائع ہوتا ہے) اسٹرونومی سائنس اور کلچر میں شائع ہوئے ہیں سائنس کی کتابوں کے ترجموں کے علاوہ اردو زبان میں آپ نے کچھ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جس میں تاریخ اسلام پر ایک نظر سفرنامہ ابن بطوطہ، سیاروں پر زندگی کے امکانات، قرون وسطی میں عرب و عجم کے حکماء کی علمی و تمدنی تحقیقات مرقع خیال اور ضمیر (ڈرامہ) زیادہ مشہور ہیں۔

جس شخص نے ستاروں اور سیاروں کی گردش اور نوعیت کے مطالعہ میں اپنی زندگی گذار دی

جس نے نور و ظلمت کے ہر منظر سے اپنے کو وابستہ رکھا عملی طور پر اپنی خانگی زندگی تابناک نہ بنا سکا اسکی بڑی وجہان کا ہمہ تن ملک و قوم کی تعلیمی ترقی فلاح و بہبود میں استغراق تھا ان کی حق گوئی اور بے باکی نے ہمیشہ دشمنوں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ اس لئے جو اونچے تصورات خاں صاحب نے اپنے خاندان کی فلاح و بہبودی کے لئے قائم کئے تھے زمانہ کی سیاسی اور ان کی خانگی الجھنوں سے روبہ عمل نہ آسکے۔ ستاروں کی گذرگاہوں کا زایر اپنے افکار کی دنیا میں کھو گیا۔ بقول علامہ اقبال سے

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

قارئین کو یہ پڑھکر تعجب ہوگا کہ خاں صاحب جو علوم ریاضی اور طبعیات جیسے خشک مضامین کے ماہر تھے شاعری میں بھی دخل رکھتے تھے۔ بحیثیت شاعر خاں صاحب سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ چنانچہ آج سے تقریباً اٹھائیس سال پہلے انھوں نے اپنے فارسی اور اُردو اشعار کو یکجا جمع کرکے "مرقع خیال" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی۔ مرقع خیال کی تمہید میں وہ فرماتے ہیں "میں نے اردو اور فارسی میں کبھی کبھی شعر کہے ہیں۔ جب کبھی کسی بات کا اثر دل پر ہوا اور طبیعت شعر کہنے پر راغب ہوئی کچھ کہہ لیا۔ بعض اوقات لکھنے کی بھی فرصت نہ ملی' جو کہا یاد سے جاتا رہا" عمر خیام جسکو دنیا کے عام لوگ بحیثیت ایک بلند پایہ رباعی گو شاعر جانتے ہیں ریاضی اور طبعیات کا نہایت ہی زبردست عالم تھا۔ جس نے اپنے علم کے زور سے علوم فلکیات اور طبعیات میں اضافہ کیا اور بعض نئی تحقیقات جو نیوٹن کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں۔ نیوٹن سے بہت پہلے خیام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھیں۔ خیام کے سائنسی انکشافات پر روس میں آج کل تحقیقاتی کام ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم دونوں سائنس دانوں میں یعنی خاں صاحب اور خیام میں ہم آہنگی دیکھ رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قدرت نے دونوں کو ایک ہی آب و گل سے بنایا۔ دونوں سائنس کی حقیقت اور افادیت کے محقق اور ماہر ہوتے ہوئے ادب' شعر و شاعری کی نزاکت و لطافت سے بھرپور ہیں۔ ذیل میں خاں صاحب کے چند اشعار نمونتاً دیئے جاتے ہیں۔

حمد ربانی کے عنوان سے خاں صاحب نے ایک نظم لکھی ہے جس میں علوم سائنس ہی کے ذریعہ خدا کی عظمت اور برتری کا اظہار کیا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں سے

اے خالق زمان و مکان و جہان و جاں
محکوم حکم تو ہمہ پیدا و ہم نہاں

ہر ارتعاش جوہر و قدرتیہ عمل
معروف خدمت تو بہر جا و ہر زماں

صد کہکشاں نہفتہ بہر گوشۂ فلک
ہر اختر آفتاب در آغوش کہکشاں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار رسالت میں معروضہ (قطعہ)

اے کہ یزداں ترا ثنا گفتہ
واقف راز دو جہاں ہستی

یک نظر سوئے ما کن از رحمت
تو کہ غمخوار بے کساں ہستی

خطاب بہ مسلمانان:۔

علامہ اقبال کی اثر آفریں نظم " ازخواب گراں خیز" کی طرز پر خاں صاحب نے اپنے درد مندانہ احساسات کا اظہار کیا ہے۔ طویل نظم کا ایک بند پیش ہے ؏

کو وارث گنجینۂ ایمان و یقینی	تعبیر رواداری دانائی و دینی
پیغام ازل را تو مبلغ بہ زمینی	ہر مسلک توحید ز سودائے بتاں خیز

از خواب گراں ۔ خواب گراں ۔ خواب گراں خیز

ایک طویل نظم بعنوان " اے مسلمان نوجوان" لکھی ہے ۔ یہ نظم نہ صرف بظاہر نظم ہے بلکہ حقیقت میں تاریخ اسلام کا نچوڑ ہے ۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں ؎

شیر میدان شجاعت اے مسلمان نوجوان	جز خدا از کس مترس و جز خدا کس را مخواں
بر صدائے دلکش اللہ اکبر گوش نہ	حاضر دربار یزداں باش بر صوت اذاں
تخت کسریٰ تاج قیصر شد نگوں در چند سال	غالب آمد نور ایمان بر ضلالت برق سال
آں مبارک عہد اکنوں ہم شود صورت پذیر	اے مسلماں نوجواں برخیز از خواب گراں
نعرہ اللہ اکبر ہست از ہر سو بلند	پُر عقیدت با ارادت آ بمیداں شادماں

در مصیبت صبر کن ہچوں ضمیر حق پرست
مشکل آساں گردد و گیتی فضائے گلستاں

مضمون کی طوالت کے خیال سے فارسی کے چند اشعار پر اکتفا کیا گیا ہے ۔ ذیل میں صرف ایک دلچسپ اُردو نظم کے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں جو جگن ناتھ آزاد کی نظم " بھارت کے مسلمان" سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی ۔ جگن ناتھ صاحب آزاد کی یہ نظم دعوۃ الحق کراچی میں ماہ اپریل سنہ ۱۹۵۲ء میں چھپی تھی اِس نظم کا جواب بعنوان " ہمدرد مسلمان" اسد ملتانی صاحب ساکن کراچی نے اسی رسالہ میں شائع کیا تھا ۔

" اے پیارے جگن ناتھ "

کیا نظم کہی تو نے مرے پیارے جگن ناتھ	بھارت کے مسلمان کا برے وقت دیا ساتھ
ہمدرد مسلماں ہے پُر اخلاص تری ذات	جادو کا اثر رکھتی ہے ہر ایک تری بات

اللہ کے ہوں تجھ پہ شب و روز عنایات		اے پیارے جگن ناتھ

ایسا بھی تھا اک وقت کہ بھارت کا مسلمان	حاکم تھا مگر مہر و محبت کا تھا انسان
سب اہل وطن کا تھا دل و جاں سے نگہبان	غدار کو بھی عفو سے کرتا تھا پشیمان

بھارت کے ہر اک شخص سے تھے اسکے مراعات اے پیارے جگن ناتھ

اب بھی اگر افعال پہ ہو اپنے وہ نادم کر توبہ وہ ہوجائے حقیقت ہی میں مسلم
بن جائے محمدؐ کا دل و جان سے خادم ہو جائینگے حاصل اسے پہلے کے مکارم
مل جائینگے سب کھوئے ہوئے اسکو کمالات اے پیارے جگن ناتھ

خاں صاحب کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً گیارہ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ لیکن ان کی جدائی کا غم ایسے ہی تازہ ہے جیسے یہ کل کا واقعہ ہے خانصاحب کی تعلیمی خدمات کا ذکر تو آپ اس مضمون میں پڑھ چکے لیکن اب خود خانصاحب نے اپنی خدمات سے متعلق جو مختصر سی نظم لکھی ہے پڑھیئے۔ میری رائے میں اس نظم میں خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے حرف بحرف صحیح ہے اور یہ مبالغہ اور شاعرانہ تعلی سے بالکل پاک ہے۔

روان شد زمن در دکن جوئے علم بتوفیق یزداں و تدبیر و حلم
براورنگ تمکین و عز و وقار شد از سعی من جامعہ برقرار
بمیدان حکمت براوج کمال ز من جامعہ یافت جاہ و جلال
در افواہ عالم ز تعلیم من فتادہ است صوت سیاق دکن
بسی رنج بردم دریں سال سی دکن زندہ کردم بدیں "پالیسی"

پانچواں شعر فردوسی کے بیتیہ شعر کی تضمین ہے "پالیسی" سے مراد وہ طریقۂ عمل ہے جو خاں صاحب نے اپنے زمانہ ملازمت میں ملک کے مستحق طلباء کو اعلیٰ تعلیم اور پھر اچھی خدمات دلانے کی غرض سے اختیار کیا تھا۔

فہرست تصانیف پروفیسر عبدالرحمٰن خاں

۱۔ نصاب ذیلی ریاضی حصۂ اول و دوم
۲۔ رسالہ طبیعات علی جلد اول، دوم، سوم
۳۔ طبیعی مناظر
۴۔ طبیعات حصہ چہارم آواز
۵۔ " نور
۶۔ " مقناطیسیت
۷۔ " برق

(نمبر ۱ تا ۷:) ناشر دارالطبع جامعہ عثمانیہ / دارالترجمہ

۸۔ خلاصہ تحفۃ النظار (سفرنامہ ابن بطوطہ) ناشر مکتبہ برہان دہلی
۹۔ قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات ناشر ندوۃ المصنفین۔ دہلی
۱۰۔ مجموعہ تحقیقات علمیہ جلد اول تا ہشتم جامعہ عثمانیہ
۱۱۔ ... تصنیفات اردو، انگریزی ... [illegible]

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

احتشام حسین کا نظریاتی اندازِ بیان

سماجی اور نظریاتی تنقید میں پروفیسر احتشام حسین کا مقام ایک روشن ستارہ کی طرح بلند ہے۔ انھوں نے اُردو ادب کو نظریاتی تنقید کے ساتھ ایک محکم حکیمانہ اسلوب نگارش بھی عطا کیا ہے۔ انھوں نے نیا مواد نئے لہجے اور نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے فکر کو بیدار کیا ہے اور اردو ادب کو سماجی مسائل سے موثر اسلوب میں آشنا کیا ہے۔ ان کے تنقیدی مباحث میں نظریات اور مادی اقدارِ حیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ مادی اور مارکسی تنقید کے اُردو میں سب سے بڑے علمبردار ہیں انھوں نے اس نقطۂ نظر کو بلندی اور فلسفیانہ تفکر کے ساتھ ایک پروقار و پرجلال اسلوب میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناقد بڑی بلندی اور گہرائی سے گفتگو کر رہا ہے۔ ان کے اسلوب نے اُردو اسالیب بیان میں ایک سنجیدہ اور دلکش اسلوب نگارش کا اضافہ کیا ہے۔ وقار اور سنجیدگی ان کی تحریر کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ وہ اپنی بات کو بڑے سلیقہ اور موثر انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر مسئلہ کو اپنے مخصوص اندازِ فکر کے معیار پر جانچتے ہیں اور اپنے مارکسی نقطۂ نظر سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ لیکن تنقیدی بحث میں جس عظیم اسلوب کو وہ اپناتے ہیں اس میں الفاظ، تراکیب، تنقیدی اور علمی اصطلاحات کو ایک خاص دروبست و سلیقہ سے استعمال کرتے ہیں۔ جن سے ان کا اسلوب نکھرتا ہے اور اس میں اس مواد کی عظمت سے مناسبت محسوس ہونے لگتی ہے جو وہ پیش کرتے ہیں۔

"تنقید جب حقیقت کے عام اور سطحی مفہوم سے گذر کر حقیقت کے ہر شعبہ کو اس کے مثبت و منفی اثرات کو اس کے مادی اور نفسیاتی وجود اور تعلق کو گھیر لیتی ہے تو اسے اشتراکی حقیقت نگاری کا نام دیا جاتا ہے (اس میں فرد کا تجزیہ ایک باشعور سماجی انسان کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور شاعر یا ادیب الہام و القا کی اونچی سطح سے اتر کر نقاد کے روبرو پیش ہوتا ہے[1]

ہر ادیب اور تصنیف اپنے ساتھ نئے سوالات لاتی ہے اور زندگی اتنی متنوع ہے کہ ہر تصنیف کو ایک ہی لٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا[2]۔"

- مقالہ "ادبی تنقید کے مسائل" ماخوذ از روایت و بغاوت، [2] ادب اور سماج مقالہ اُصولِ نقد۔

احتشام صاحب کے اس فلسفیانہ اسلوب میں ایک علمی و نظریاتی ماحول اور ایک فضا محسوس ہوتی ہے۔ وہ تنقیدی فضا پیدا کرنے اور اپنی تحریروں میں نظریاتی ماحول کو جنم دینے میں ایک فطری قدرت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ان کے یہاں پڑھنے والے کو ایک نظریاتی کیفیت کا احساس ہوتا ہے یہ کیفیت ان کی عملی تنقید میں بھی ملتی ہے اور نظریاتی تنقیدوں میں بھی۔ ان کے یہاں رعنائی خیال کی جلوہ سامانی ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان کے اس اسلوب بیان میں جمال سے زیادہ جلال اور جذبہ سے زیادہ فکر کا اجالا ہوتا ہے۔ ان کے اسلوب میں ماورائیت کے بجائے مادیت اور رنگینی کے بجائے سنجیدگی کی فراوانی نظر آتی ہے۔ اس پُر وقار اسلوب کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو۔

"اپنے ذوق اور وجدان کے سہارے کسی ادیب یا شاعر کی روح میں اُتر جانا آسان ہے لیکن اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے جانا اچھے نقادوں کا کام ہو سکتا ہے کیونکہ وہ داخلی کیف پذیری اور لذت اندوزی کی وہ نازک فکر بناتا ہوا نہیں چلتا جو اس کے گذر جانے کے بعد مٹ جائے بلکہ وہ علم کی روشنی میں ایک شاہراہ بنانے کی کوشش کرتا ہے وہی اصول اصول کہے جاسکتے ہیں جو صرف اصول بنانے والے یا اس کے چند ساتھیوں کے کام نہ آئیں بلکہ جو زیادہ سے زیادہ انسانوں کو روشنی دکھاسکیں جن میں انفرادی داخلیت اور ہر لمحہ بدلتے ہوئے وجدان کے سہارے منزلیں طے نہ ہوں بلکہ جن میں تاریخ منطق اور دوسرے علوم سے مدد لی جائے تاکہ نتیجہ میں غلطی کے امکانات کم ہوں۔"

احتشام صاحب کے اسلوب پر ان کے نظریات کی مہر ثبت ہے۔ ان کے ہر ہر جملہ پر ان کے تصورات کی چھاپ ہے اور ان کی شخصیت اس میں پوری جلال و جمال کے ساتھ جلوہ ساماں نظر آتی ہے۔ ان کے خیال کی بلندی ان کی عبارتوں کو محیط کئے ہوئے ہے۔ یہی نظریاتی انداز اور شخصی تفکر ان کے اسلوب کی جان ہے اور اسی سے اسکے تانے بانے تیار ہوتے ہیں۔ ذیل کی عبارت ایک معاشی و مارکسی تصور کو پیش کرتی ہے مگر اسلوب کی انفرادی کیفیت اسکو پوری طرح محیط کئے ہوئے نظر آتی ہے۔

"ادب یا تنقید ادب کو معاشیات کا ایک شعبہ نہیں سمجھنا چاہیئے اور نہ اس تعلق کو جو معاشیاتی عناصر اور تصوراتی ڈھانچے کے درمیان قائم ہوجاتا ہے ریاضیاتی تناسب سے بدلتا ہوا سمجھنا چاہیئے کیونکہ جب ایک دفعہ ایک مخصوص نظام حیات کی وجہ سے ایک مخصوص ادبی نظریہ بن جاتا ہے تو وہ اپنے قوانین و اصول آپ بنا لیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا تعلق معاشی نظام سے بالکل نہیں ہے۔"[1]

---

[1] روایت و بغاوت مقالہ ادبی تنقید کے مسائل۔

لطف یہ ہے کہ احتشام صاحب اپنی تنقیدوں میں جو انداز بیان اختیار کرتے ہیں اس میں نہ رنگینی ہے نہ تشبیہ و استعارہ کا حسن ہے نہ شاعرانہ انداز اور نہ اشعار سے استشہاد۔ اس کے باوجود ان کا اسلوب دلکش ہے وہ ایک خاص میکانیکی انداز سے اپنے اسلوب کی تشکیل کرتے ہیں اور مزا یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے اس معیار سے گرتے نہیں ورنہ ہر صاحبِ اسلوب کبھی عبارت کو زیادہ ادبی اور بلند انداز سے پیش کرتا ہے۔ اور کبھی کم یعنی صاحبِ اسلوب کے یہاں عموماً نشیب و فراز کی کیفیت ہوتی ہے مگر احتشام صاحب اپنے اسلوب کی عظمت کو ہر جگہ قائم رکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں جذبات سے زیادہ تجربہ اور جوش سے زیادہ ہوش نظر آتا ہے' وہ صنعت گری اور تکلف سے کوسوں دور نظر آتے ہیں ان کی زبان صاف و سادی ہے مگر عامی نہیں۔ ان کے یہاں زبان میں سادگی کے ساتھ بلندی' صفائی کے ساتھ دلکشی اور رعنائی خیال کی عظمت تحریر کو پرو قار بناتی ہے۔ اس کیفیت کا اندازہ ذیل کی عبارت سے کیا جا سکتا ہے۔

"ادب کی تخلیقی تنقید کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ نقاد بھی ادیب کے خیالات کی بنیاد ڈھونڈھکر اسکی ادبی کاوشوں پر اعلیٰ ادبی رنگ میں اظہار خیال کرے اور ادیب کے سماجی شعور کا جائزہ لے۔ فن کی نزاکتوں پر نگاہ ڈالے اور عام پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے اگر کوئی نقاد اس سے بچتا ہے تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کرتا۔"[1]

قاعدے سے احتشام صاحب کی زبان کو بہت جذباتی اور خطیبانہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ وہ فلسفہ اور ایک نظام حیات کے داعی ہیں مگر ترقی پسند ناقدوں میں ان کی اعتدال پسندی یہاں نمایاں ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ وہ اپنے پیغام کو وضاحت اور سادگی سے پیش کرتے ہیں۔ انھیں اس امر کا احساس ہے کہ وہ ایک فن کی ترجمانی کر رہے ہیں وہ اپنے اسلوب کو تبلیغی انداز سے بلند اور عام جذبات پسند ناقدوں کے زمرہ سے الگ رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا اسلوب تعقلی اور غیر جذباتی ہونے کے ساتھ ساتھ مدلل اور دل نشین ہو گیا ہے۔ وہ نظریاتی تنقید کے لئے سب سے زیادہ موزوں اور مناسب اسلوب کہا جا سکتا ہے ان کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے زبان کو فن کے قالب میں ڈھالا ہے اور مواد کو اسلوب پر مسلط نہیں کیا ہے۔ وہ ایک طرف یہ خیال رکھتے ہیں کہ کہیں موضوع سے بہک نہ جائیں اور مضمون بجائے تنقید کے اقتصادیات' جدلیات یا تاریخی و سماجی عوامل سے متعلق نہ بن جائے اسلئے وہ مواد کے سلسلہ میں مادی اثرات کے اشاروں پر اکتفا کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں:-

---

[1] تنقید اور عملی تنقید مقالہ از تنقید اور عملی تنقید۔

"نقاد بھی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ ادب کے محرکات کا پتہ لگائے ان سرچشموں کا منبع تلاش کرے جہاں سے ادیب نے زندگی حاصل کی ہے اس فلسفہ کو ڈھونڈھ نکالے جو ادیب کے خیالوں کو ایک مربوط شکل میں پیش کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس طرح یقیناً ایک منزل میں تو نقاد کو بھی ادب کے ساتھ ہر وادی و کہسار میں چلنا پڑے گا اور ہر صحرا کی خاک چھاننی ہوگی۔۔ وہ ادیب کی جانب داری کا ذکر کرے گا اور ارتقائے تہذیب پر ادیب کے کارناموں کی جگہ متعین کرے گا۔ یہ سارے کام محض تشریح یا تاثر کے اظہار سے ممکن نہیں ہیں ان کے لئے نقاد میں خود ایک تخلیقی قوت کی ضرورت ہے جو تنقید کو بھی ادبی حیثیت عطا کر دے۔ جس میں نقاد کے انداز نظر سے جان آجائے اور جو مصنف یا تصنیف کا تذکرہ ہونے کے باوجود انسان کے سماجی اور فلسفیانہ شعور میں اضافہ کا سبب بن جائے"[1]

احتشام حسین کی نثر مدلل، مفصل، سلیس اور دلچسپ ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو قاری کے ذہن میں اُتار دینے کی کوشش کی ہے اور ہر موضوع پر اپنے نظریات غور و فکر کے ساتھ پیش کئے ہیں اور ساکھ دلائل کی روشنی سے مستحکم کیا ہے۔ ان کی نثر کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور رقمطراز ہیں کہ "وہ موضوع اور نظریہ میں زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے مگر ہیئت کے تقاضوں اور فن کے مطالبات سے بیگانہ نہ تھے۔ ان کی نثر چست، مدلل اور رواں ہوتی تھی انھوں نے ہمارے علمی نثر کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے"[2]

احتشام صاحب کے اسلوب کی عظمت وہاں زیادہ نمایاں ہوتی ہے اور ان کے اسلوب کی خصوصیات وہاں زیادہ وضاحت سے سامنے آتی ہیں۔ جہاں وہ نظریاتی مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود الہٰی اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "احتشام صاحب ایک فلسفی نقاد ہیں ان کے قلم کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب وہ اصول و نظریات پر بحث کرتے ہیں"[3]

احتشام صاحب کے اسلوب میں ان کی پُر متانت اور سنجیدہ علمی شخصیت پوری طرح ابھر کر سامنے آگئی ہے ایک فرانسیسی ناقد کا قول ہے کہ اسلوب خود صاحب اسلوب کی شخصیت کا نام ہے۔ یعنی ادیب کی شخصیت اپنی توانائیوں یا خامیوں کے ساتھ پوری طرح اس کے اسلوب میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ احتشام حسین کی شخصیت ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے اسالیب کی طرح اپنے مخصوص ماحول کے ساتھ ممتاز اور منفرد ہے۔ یہ امتیاز کم ادیبوں کو حاصل ہوتا ہے، احتشام صاحب کی تھوڑی تحریر بھی ان کے اسلوب اور انداز فکر کی غمازی کرتی ہے۔ یہ امتیاز و انفرادیت کم ہی ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔

---

[1] "تنقید اور عملی تنقید" ماخوذ از مقالہ تنقید و عملی تنقید۔ [2] ہماری زبان اداریہ از پروفیسر آل احمد سرور ۸ دسمبر ۱۹۷۲ء
[3] [illegible] احتشام حسین کی تنقید نگاری از ڈاکٹر محمود الہٰی، مئی ۱۹۶۷ء ص ۲۵

ان کے یہاں اس مخصوص کیفیت اور انفرادیت کا سبب ان کا فلسفۂ فکر ہے چونکہ الفاظ اور اصطلاحات فکر کے مطابق استعمال کی گئی ہیں اسلئے ان کے ذریعہ ایک ایسا متوازن اسلوب وجود میں آگیا ہے جو ان کو امتیاز و افتخار بخشتا ہے - ایک انگریز مصنف ایلین نے لکھا ہے کہ

"WORDS ARE THE TOOLS OF THOUGHT"

یعنی الفاظ تخیل کو پیش کرنے کے اوزار ہیں۔ اگرچہ انھوں نے ہیئت کو مواد پر ترجیح کبھی نہیں دی۔ مگر ہیئت کی اہمیت کو کبھی نظر انداز بھی نہیں کیا۔

احتشام صاحب کے اسلوب پر عبدالمغنی صاحب نے بڑا جامع تبصرہ کیا جس کا ایک فقرہ یہاں پیش ہے۔

" اُردو تنقید کو جناب احتشام صاحب کا ایک بڑا عطیہ ان کا اسلوب ہے جو فی الواقع حکیمانہ اور علمی ہے - توضیح و تشریح اس کی خصوصیت ہے۔ سائنٹفک ہونے کے باوجود یہ اسلوب سپاٹ اور پھیکا تو ہرگز نہیں۔ احتشام صاحب اپنے افکار و خیالات ہی کی طرح طرز بیان میں بھی کسی قسم کی سہل نگاری اور بے پروائی کو راہ نہیں دیتے۔ وہ بہ اعتراف خود تخلیقی تنقید کے حامل ہیں۔ چنانچہ الفاظ کے انتخاب سے جملوں کے دروبست اور پیراگراف کی تراش بندی تک وہ ایک فن کار کی طرح اپنے اسلوب پر توجہ صرف کرتے ہیں۔ ہر فقرہ سجل اور عبارت میں جڑا ہوا ہوتا ہے۔ اپنے افکار کیلئے وہ موزوں ترین خیال انگیز پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں"[1]

بلاشبہ احتشام صاحب کا اسلوب نظریاتی اور علمی مباحث کیلئے موزوں ترین اسلوب ہے جس میں سرسید اور حالی کے اسلوب کی طرح غیر معمولی سادگی (جس کو بعض خشکی بھی کہتے ہیں وہ) نہیں پائی جاتی - دوسری طرف ان کے اسلوب میں ایک دلکشی اور ہلکا سا ادبی رنگ بھی محسوس ہوتا ہے۔ وہ اعلیٰ طرز کا علمی نمونہ ہے نظریاتی مُباحث کو پیش کرنے کا جس کی مثال اُردو کے ذخیرہ میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احتشام صاحب کے اسلوب میں بعض تسامح کا ذکر بھی کر دیا جائے مثلاً وہ اکثر جگہ طوالت سے کام لیتے ہیں۔ خاص عبارات پڑھنے کے بعد ہی مقصد سمجھ میں آتا ہے۔ ایسا شاید اس لیے ہے کہ صاحب پیام کو تشریح و توضیح کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ اپنی بات کو مفصل انداز سے بیان کرتا ہے۔

دوسری خامی یہ ہے کہ ان کے یہاں عبارتوں اور خیالات میں غیر معمولی تکرار کی کیفیت نظر آتی ہے۔

---

[1] ماہنامہ ادیب علی گڑھ مرتبہ ابن فرید اپریل ۱۹۶۲ء ملاحظہ ہو مقالہ احتشام حسین کی تنقید نگاری از عبدالمغنی ص ۴۲

اس کا سبب بھی ان کے مادی نظریات ہیں جن کو وہ بار بار کبھی مناسب اور کبھی غیر مناسب انداز سے بھی پیش کرتے ہیں مثلاً وہ نظم معریٰ کی نامقبولیت کی توجیہہ میں ذاتی ملکیت کا مسئلہ اٹھاتے ہیں اور مادی نقصان کا ذکر کرتے ہیں یا غزل کے رواج میں ہندوستانی اور ایرانی نظام معاش کو زیر بحث لاتے ہیں۔ مارکسیت کی مہر ان کی ہر تحریر پر ثبت ہے۔

ان کے یہاں کبھی کبھی خطیبانہ اسلوب بھی نظر آجاتا ہے اسلئے کہ وہ ایک فلسفہ وفکر کی ترجمانی کرتے ہیں اور اپنے نظریہ کی تبلیغ کرتے وقت وہ کہیں کہیں خطیبانہ طرز اختیار کرلیتے ہیں۔ البتہ میں پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس الزام کا کوئی جواز نہیں پاتا کہ احتشام کے اسلوب میں ہاتھی کی "خوش فعلیاں" نظر آتی ہیں۔ یہ محض الزام تراشی ہے حق یہ ہے کہ احتشام صاحب کا اسلوب نظریاتی اور دلکش ہے۔ جو اردو کے علمی اسالیب بیان میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

احتشام صاحب کے اسلوب میں ایک اخلاقی طاقت کارفرما ہے۔ ان کے یہاں اخلاص زدہ انسانیت سے ہمدردی کا جذبہ سارے جذبات پر بھاری نظر آتا ہے وہ خود اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے ہر مضمون میں اقتصادی انصاف اور سماجی بہبود کا ذکر خلوص اور شدت سے کیا ہے[1]۔ سانی ہمدردی کا سوز دروں، فکر کی استقامت اور سماجی انصاف کا جذبہ انھیں ایک نیا انداز اور ایک نیا آہنگ عطا کرتا ہے۔ جس میں عشق کے دردمند کا طرز کلام ایک نئے اسلوب میں ظاہر ہوتا ہے جہاں اندرون کا اجالا، اخلاق کی طاقت، دلائل کی عظمت اور فلسفۂ حیات کی ضوفشانی پوری طرح نمایاں ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو دیباچہ روایت اور بغاوت

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۲ سے آگے)

ادبی اور سماجی محفلوں کی وہ روح رواں تھیں۔ مشاعروں کے نظم ونسق میں حصہ لیتیں اور شعرا اور ادیبوں کی قدر داں تھیں خواتین میں ان کا مقام بلند تھا خدا مغفرت کرے۔

ادارہ ادبیات اردو کے امتحانات ۲۸ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۷۳ء ہوں گے اور جن نئے مراکز کے قیام کی اجازت دی گئی ہے ان میں کالی کٹ (کیرالا) [illegible] (مدھیہ پردیش) ہیں۔

۲ حسب تصفیہ مجلس انتظامی شعبہ امتحانات نظام آباد آئندہ تین سال تک مرکز نہ بن سکے گا۔

اختر حسین شافی

ای ' ایم ' فوسٹر

(بسلسلۂ گذشتہ)

موجودہ دور کا ایک مفکر

(الف) عالمِ داخلی (THE SUBJECTIVE WORLD) جو شائع ہو چکا ہے۔

(ب) عالمِ خارجی (THE OBJECTIVE WORLD)

فوسٹر کے جذبات اور خیالات کی ذاتی دنیا سے نکل کر اس خارجی دنیا کی سیر کی جائے جو ان کے اردگرد واقع تھی۔ اور جسکا انھوں نے بنظرِ غور مشاہدہ کیا ہے۔ اختتامِ تعلیم کے بعد موصوف نے اطالیہ' یونان اور جرمنی کا دورہ کیا کئی بار ہندوستان بھی آئے اور جنگِ عظیم کے دوران مصر کے شہر اسکندریہ میں رہے۔ ان تمام ممالک کی سیر کے بعد موجودہ حالات کے پسِ منظر میں انسان اور اسکی زندگی کے بارے میں انکا جو تجربہ ہوا اسے انھوں نے ناول اور مضامین کے روپ میں پیش کیا۔ اگر A ROOM WITH A VIEW اور WHERE ANGELS FEAR TO TREAD مطالعہ کیا جائے تو اطالیہ اور وہاں کی زندگی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر THE LONGEST JOURNEY کا مطالعہ کیا جائے تو انگلستان کی تصویر ذہن نشین ہوجاتی ہے اور اگر A PASSAGE TO INDIA کی ورق گردانی کی جائے تو ہندوستان کے اُس وقت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جب یہاں انگریز کا راج تھا۔

انگلستان اور اطالیہ کی طرزِ زندگی میں فوسٹر نے بڑا فرق پایا۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ ان کا موضوع افتراق ہے اس لئے انھوں نے اس فرق یا تصادم کو اہمیت دیتے ہوئے ان دو قوموں کے حالات پیش کئے ہیں WHERE ANGELS FEAR TO TREAD میں فوسٹر نے اس بات کو بڑی ہی کامیابی کے ساتھ نبھایا ہے' اس کتاب کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مصنف نے اطالیہ کو انگلستانی سماج کی کوتاہیوں کو ناپنے کا ایک پیمانہ یا آلہ بنایا ہے

A MEANS OF MEASURING THE INADEQUACY OF THE ENGLISH MIDDLE CLASS.

اطالیہ کو انھوں نے فطری جذبات کی سرزمین (A LAND OF NATURAL EMOTION) کہا ہے۔ جہاں انسان آزاد ہے اور جذبات نیچرل ہیں لیکن انگلستان کو روایت پرست اور گھٹے ہوئے لوگوں کا وطن: —

(HOME OF THE DEPRESSED AND THE CONVENTIONAL) قرار دیا ہے۔ جہاں روایت
پرستی ہے اور جہاں انسان اور اسکے جذبات آزاد نہیں مقید ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ فوسٹر
ہندوستان کو بھی کم و بیش اطالیہ کی طرح فطری جذبات کی سرزمیں سمجھتے ہیں۔

اس فرق کے اسباب کو سمجھاتے ہوئے انھوں نے یہ کہا ہے کہ یہ انگلستان کی طرز زندگی اور طرزِ تعلیم کا
نتیجہ ہے انھوں نے یہ بتایا ہے کہ جیسے جاپان امراء (ARISTOCRATS) کا ملک ہے اور روس غریب عوام
(PROLETARIATE) کا اسی طرح انگلستان ایک متوسط طبقہ کے لوگوں کا ملک ہے۔ ان لوگوں کی طرز تعلیم
بھی جدا ہے۔ یہاں پبلک اسکول (PUBLIC SCHOOL) کے طرز پر تعلیم دی جاتی ہے [illegible]
بہت کم ہے اور ہندوستان میں صرف ایک ہی یونیورسٹی ہے جہاں اسی طرز پر تعلیم دی جاتی ہے۔ وہ ہے علیگڑھ
مسلم یونیورسٹی۔ اس طرزِ تعلیم میں طلبہ کو کیسے زندگی بسر کرنی ہوگی، رہن سہن کیسے ہوگا، کس خیال کو اپنانا ہوگا،
کن باتوں کو کس طرح اور کہاں تک محسوس کرنا ہوگا، اسی قسم کی باتیں سکھائی جاتی ہیں اور یہ بھی بتایا جاتا ہے
کہ جذباتیت ایک مذموم شئے ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ایک نیچرل زندگی بسر کرنے کی بجائے ایک
خاص طرح کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس طرزِ تعلیم میں جو خوبیاں ہیں وہ اس کے معترف ضرور
ہیں لیکن اسکی خامیوں کو نظرانداز نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کا برا اثر ساری قوم پر پڑتا ہے۔ جب انگلستان کے
طلبہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو جسم اور دماغ کے اعتبار سے بالغ ہوجاتے ہیں۔ لیکن جذبات کے
اعتبار سے وہ نیم پختہ رہ جاتے ہیں۔ اسی لئے انگریزوں کو فوسٹر نے 'EMOTIONALLY [illegible]'
کہا ہے اور اسی بحث کو آگے بڑھا کر موصوف نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ روحانی اعتبار سے بھی انگلستان کے لوگ
نامکمل ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسلمانوں کے فلسفۂ توحید اور عیسائیوں کے فلسفۂ تثلیث کے ٹکراؤ یا تصادم کو
پیش کیا ہے۔ متوسط طبقے کے لوگ اتنے غریب نہیں کہ ان کو استطاعت و معاش کی طلب [illegible] ہی انکا خدا ہو
اور مذہبی خدا کچھ نہ ہو لیکن ہاں وہ اتنے خوشحال بھی نہیں کہ انہیں دنیا داری کے کاروبار سے فرصت ملے کہ مذہبی
باتوں پر غور کریں اور پارسائی اور بزرگی اختیار کریں۔ وہ لوگ مذہبی ضرور ہیں لیکن بہت ہی باعمل انسان ہیں
جنھیں ہمیشہ مصروفیت رہتی ہے۔ فوسٹر نے اپنے مضمون NOTES ON ENGLISH CHARACTER میں
یہ بتایا ہے کہ اگر ایک مسلمان انگریز سے یہ پوچھتا ہے کہ تین خداؤں کا معاملہ در اصل لفظ کے ہزار خداؤں اور الہامی
مذہب کے ایک خدا کے درمیان ایک واہیات سمجھوتہ (SINISTER COMPROMISE) ہے تو بقول
فوسٹر انگریز ان باتوں کو یہ کہکر ٹال جاتا ہے کہ مجھے ان باتوں پر غور کرنے کی فرصت نہیں میں جا رہا ہوں کیونکہ مجھے
یہ کام کرنا ہے وہ کام کرنا ہے۔ آپ کبھی پادری سے پوچھئے ہمارے آباؤ اجداد یہ کہہ رہے تھے ہم نے سنا اور یقین کرلیا

اسے فوسٹر نے ایک دھوکا یا ایک الجھن قرار دیا ہے۔ لیکن انگریزوں کو اسکا شعور نہیں کہ وہ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ یعنی وہ جان بوجھ کر یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے فوسٹر نے اسے غیر شعوری خود فریبی (UNCONSCIOUS DECEIT) کہا ہے۔ خیر کچھ بھی ہو فوسٹر انہیں روحانی اعتبار سے نامکمل قرار دیتا ہے کیونکہ فوسٹر کے خیال میں مکمل بننے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ دو چیزیں ہیں **معاملات** اور **عبادات** یا بہ الفاظ دیگر حق اللہ اور حق العباد۔ معاملات سے مراد انسان اور انسان کے درمیان تعلقات اور عبادات سے مراد انسان اور خدا کے درمیان تعلقات ہے۔ پہلی بات تو انگریزوں میں ضرور موجود ہے لیکن دوسری بات نہیں اس لئے وہ نامکمل ہیں۔

غرض اسطرح لندن مصر اور روم کی سیر و سیاحت کے بعد ان ممالک کے لوگوں میں جو فرق ہے اس کا پتہ چلا اور اسکے ساتھ یہ بھی پتہ چلا کہ مکمل انسان کون ہے اور انسانیت کی خوبیاں اور کمزوریاں کیا ہیں۔

اب آیئے ہندوستان کی طرف فوسٹر نے ہندوستان کے حالات کو دیکھکر یہ محسوس کیا کہ یہ دنیا کے کسی ایک یا دو قوم کا آئینہ نہیں بلکہ آئینہ کائنات ہے (IT MIRRORS THE UNIVERSE) کیونکہ یہاں مختلف فرقے زبان مذاہب اور ذات کے لوگ آباد ہیں یہاں انھوں نے افتراق اور تصادم کا ایک ہجوم پایا اور A PASSAGE TO INDIA لکھکر افتراق کے موضوع (THEME OF SEPARATENESS) کو پیش کیا۔ اس کتاب میں انھوں نے پہلے یہ بتایا ہے کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے تعلقات ہمیشہ تلخ رہے۔ کتاب جب شروع ہوتی ہے تو ہندوستانیوں کے درمیان یہ بات چیت ہو رہی ہے کہ ان کی انگریزوں سے دوستی ممکن ہے یا نہیں۔ اسکے بعد ڈاکٹر عزیز کی ملاقات میسس مور اور مس ایڈا سے ہوتی ہے جو انگلستان سے ہندوستان کی سیر کو آئی ہیں۔ ڈاکٹر عزیز مسٹر فیلڈینگ کے اصرار پر میسس مور اور مس ایڈا کو اپنے ساتھ لیکر سیر کرنے کو راضی ہو جاتے ہیں مالوار کے اندھیرے سرنگوں میں مس ایڈا کو کچھ دھوکا ہوتا ہے اور وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھتی ہیں کہ ڈاکٹر عزیز ان سے شرارت کرنا چاہتے ہیں۔ اس غلط فہمی سے بات بڑھکر بہت خطرناک حد تک پہنچ جاتی ہے۔ جب آخر میں ڈاکٹر عزیز بے گناہ ثابت ہوتے ہیں اور انگریز صاحبان انکی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ غصے میں گرجتے ہوئے یہ کہتے ہیں " تم لوگوں سے دوستی ممکن نہیں اگر ممکن ہے تو ابھی نہیں اور یہاں نہیں پھر فوسٹر نے یہ بتایا ہے کہ ہندوستانیوں میں بھی افتراق نفرت ہے کیونکہ ہندو مسلم تصادم کا عجب حال ہے آگے بڑھکر انھوں نے یہ بھی بتایا ہے ہندوؤں میں بھی برہمن اور غیر برہمن کے درمیان ہمیشہ شدت کی کشیدگی رہتی ہے ان باتوں کو انھوں نے بڑے ہی غیر جانبدارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اسی لئے LIONEL TRILLING نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ اس کتاب میں جو خاص بات ہے وہ اسکا غیر جانبدارانہ انداز (THE RIGOR OF ITS OBJECTIVITY) ہے۔

اس افتراق کے موضوع سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ فوسٹر کے خیال میں باہمی تعلقات اور مفاہمت کو دیرپا اور پرخلوص بنانے کے لئے ہم لوگ ایک دوسرے کے اختلاف کو صاف صاف دیکھیں اور سمجھیں۔ اسے چھپانے کی کوشش نہ کریں اور اب تو وہ وقت ہی نہیں رہا کہ اختلاف چھپکر رہ سکے۔ سائینس کی ترقی کی وجہ سے مختلف اقوام و ممالک میں اب دوری نہیں رہی۔ بقول فوسٹر دنیا اس طرح سمٹی ہے کہ ہم سبھوں کو اس نے ایک دوسرے کی باہوں میں لا ڈالا ہے۔ اب ہمیں چاہیئے کہ ہم باہمی افتراق کو سمجھیں اور تعلقات میں رابطہ پیدا کرکے اس دنیا میں رہیں۔ یہی ہے اس ناول کا فلسفۂ حیات اور شاید اسی فلسفے کو ذہن میں رکھکر GLEN. O. ALEN نے کہا ہے کہ اس کہانی کی جزیات کی تہ میں کشادگی اور وسعت کی لہریں موجزن ہیں"۔

ہندوستانی ادب اور کلچر پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہندوستانی ادب پر انگلستان کے تاثرات مرتسم ہیں شاعری کی دنیا میں T. S. ELIOT چھائے ہوئے ہیں۔ ہندوستانی شعراء ELIOT کی تقلید کر رہے ہیں۔ تنقیدی نثر کے معاملے میں ہندوستانی ادب بہت کمزور ہے۔ ڈراما "روبہ زوال ہے"۔ افسانہ نگاری کثرت سے ہو رہی ہے۔ خاص کر بنگال کی کہانیاں مقبول ہیں۔ فن تعمیر کے میدان میں انھوں نے اُن عمارتوں کی تعریف کی ہے جہاں ہندوستانی اور اسلامی فن کی آمیزش ہے۔ اسکی بہترین مثال وہ حیدرآباد یونیورسٹی کی عمارتوں کو سمجھتے ہیں۔ نقاشی میں انھوں نے شانتی نکیتن اور کلکتہ گروپ کے شاہکاروں کو قابل ذکر سمجھا ہے۔

یہ ہیں مختلف ممالک میں رہنے والی مختلف ترموں کی تصویریں جسے فوسٹر نے ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھا اور غیر جانبدارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اب یہ دیکھنا چاہئیے کہ فوسٹر کے خیال میں ایک اچھی اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے آج کے انسان کو کن کن خطرات اور چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج سب سے اہم خطرہ یا چیلنج باہمی نفرت، بے اعتمادی اور عالمی جنگ کا ہے۔ اسکا علاج ایک آئیڈلسٹ (IDEALIST) کے مطابق باہمی محبت ہے۔ لیکن فوسٹر اسکے قائل نہیں۔ ان کے خیال میں محبت ایک پرائیویٹ فورس (PRIVATE FORCE) ہے۔ ہم صرف اسی سے محبت کرسکتے ہیں جسے ہم ذاتی طور پر جانتے، پسند کرتے یا چاہتے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگ ضرور ہوں گے جنہیں ہم نہیں جانتے اور نہ پسند کرتے ہیں۔ ہم اُن سے کیسے محبت کرسکتے ہیں۔ اس لئے سبھوں سے محبت کرو کا پیغام دینے والے حقیقت سے دور ہیں۔ ان کی باتیں بقول فوسٹر مہمل اور غیر فطری ہیں۔ اس نے ان کے خیال میں موجودہ نفرت اور جنگ کا علاج محبت نہیں بلکہ رواداری و جذبۂ تحمل و بردباری ہے۔ عربوں کا یہودیوں سے محبت کرنا مشکل ہوسکتا ہے لیکن انہیں برداشت کرنا یا انہیں اپنے ساتھ اس سرزمین میں رہنے کی اجازت دینا ممکن ہوسکتا ہے۔ یہ نظریہ فوسٹر کی حقیقت پسندی کا

نتیجہ ہے۔

دوسرا چیلنج فنکار کی آزادیِ خیال اور انفرادیت پسندی کو درپیش ہے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر فرد یا آرٹسٹ کو پوری آزادی ملے۔ اس قسم کی آزادی نظامِ جمہوریت میں محفوظ رہتی ہے لیکن جمہوریت ہمیشہ شاہانہ یا سرمایہ دارانہ نظامِ معاشرت پر مبنی ہے جہاں ہر فرد کو آزادی کا حق حاصل ہے۔ لیکن ملوکیت اور سرمایہ داری آج خطرے میں ہے کیونکہ سرمایہ دارانہ نظام میں یہ نقص ہے کہ جس کے پاس دولت ہے وہ اُن لوگوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں جنکے پاس دولت نہیں ہے اور ملوکیت کا یہ نقص ہے کہ جو ممالک ترقی یافتہ ہیں وہ غیر ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ فائدہ اٹھانا آہستہ آہستہ خون چوسنے کا مترادف ہوگا۔ دُنیا بیدار ہوئی۔ ملوکیت تو روپوش ہوگئی اب سرمایہ داری بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ اس لئے قصرِ جمہوریت کی بنیاد متزلزل ہے۔ آج کمیونزم کا چیلنج درپیش ہے آج انسانیت یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ ہزاروں انسانوں کے پاس گھر بنانے کی خاطر ایک ٹکڑا زمین نہو۔ لیکن ایک دوسرا فرد ہزاروں ایکڑ زمین کا مالک بنکر املاک پر فرد کے حقوق کا ڈھونگ رچائے۔ ہزاروں کو فاقہ کشی پر مجبور کرے اور اپنے کھیتوں پر تالا ڈال کر انفرادی حقوق کا دعویٰ کرے۔ جب خوشحالی کا زمانہ تھا اور لوگوں کے پاس گزر بسر کے سامان موجود تھے تو امرا کے انفرادی حقوق کی طرف کوئی نظر اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ لیکن آج دنیا بدلی ہوئی ہے۔ لوگوں میں اب وہ پہلی سی خوشحالی نہیں رہی۔ تنگی کا زمانہ ہے جو سامان دستیاب ہورہے ہیں۔ انہیں مجبوراً بانٹ کر لینا ہے۔ راشن کارڈ پر منحصر رہنا ہے۔ منصوبہ بندی کا سہارا لینا ہے۔ اس لئے انفرادی حقوق سے بالادستوں کو دست بردار ہونا ہی پڑیگا۔ عدمِ دست اندازی (LAISSEZ FAIRE) کا نعرہ اب بے بنیاد نظر آنے لگا ہے۔

المقصد اشتراکیت جمہوریت کو للکار رہی ہے۔ یہ تمام باتیں ضروری ہیں لیکن جمہوریت کی دشمن ہیں۔ اس سے فرد کو اور فنکار یا ادیب کو بہت بڑا خطرہ ہے۔ یہ بدلتے حالات ہماری طرزِ زندگی کو اس نظام کی طرف لے جارہے ہیں جہاں فرد کو اجتماعی زندگی میں کھو جانا ہوگا۔ وہی سوچنا ہوگا وہی لکھنا یا کہنا ہوگا جو حکومت کے انتظام کے مطابق ہو۔ اب حکومت کا خزانہ عام لوگوں کی امانت ہے جسے صرف عام لوگوں ہی کے لئے خرچ کیا جاسکے گا۔ یہ خزانہ راجاؤں یا زمینداروں کا نہیں جس کے زیرِ سایہ ہزاروں چھوٹے بڑے ادیب و فنکار زندگی گزارتے اور پھلتے پھولتے تھے۔

اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیۓ انھوں نے چند تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کے خیال میں جہاں تک مالی حالات کا تعلق ہے عدمِ دست اندازی (LAISSEZ FAIRE) کے اصول سے دست بردار ہونا چاہیئے۔ یعنی فرد سے اسکے انفرادی حقوق چھین لئے جائیں لیکن فکر و خیال کی آزادی پر ڈاکہ نہ ڈالا جائے۔ اس فلسفے کو

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

سیّد مُراد علی طالعؔ

جذبؔ عالمپوری

راگھویندر راؤ نام، جذبؔ تخلص، خیّام آندھرا اور مسیح رباعی خطابات ہیں۔

۲۰؍ اپریل ۱۹۲۶ء کو بمقام گنگا دتی ضلع رائچور (کرناٹک) پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام رام راؤ تھا۔ ابھی کمسن ہی تھے کہ عالمپور ضلع محبوب نگر (تلنگانہ) کے ایک معزز و ممتاز زمیندار گھرانے میں جہاں کوئی اولاد نہیں تھی متبنّٰی ہو کر آئے اور یہاں پر اُنکی تعلیم و تربیت بہت ہی خاص اہتمام کے ساتھ ہوئی چنانچہ جذبؔ صاحب نے تلنگی زبان اپنی متبنّٰی والدہ سیتا بائی سے سیکھی جنھیں تلنگی زبان پر کافی عبور حاصل تھا۔ کنڑی زبان اپنے چچا پنڈت مادھو راؤ وکیل ہائی کورٹ سے سیکھی۔ اُردو سرکاری زبان ہونے سے مقامی مدرسہ میں تعلیم پائی اور قابل اساتذہ کی صحبت میں رہکر عربی اور فارسی سنسکرت اور ہندی میں مشق و مہارت تامہ حاصل کرلی۔ فارسی زبان اور ادب کے دل سے گرویدہ تھے چنانچہ اسی والہانہ جذبہ کے تحت منشی فاضل پنجاب یونیورسٹی کے امتحان میں شریک بھی ہوئے لیکن حالات ناموافق ہونے سے امتحان نہ دے سکے۔

مطالعہ کتب کا ابتدا سے عمر سے ہی بیحد شوق تھا۔ چنانچہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں جسے میں نے بچشم خود دیکھا ہے مختلف زبانوں سے متعلق دو ڈھائی ہزار کتب پائے گئے۔ چچا کے دیکھا دیکھی پیشہ وکالت کا شوق ہوا تو امتحان جوڈیشل میں کامیابی حاصل کر کے اپنے وطن عالمپور میں وکالت شروع کر دی اور مسلسل بارہ سال تک کامیاب طریقہ پر پیشۂ وکالت انجام دیتے رہے لیکن اس اثنار میں وہ نقص صحت کا بُری طرح شکار ہو گئے جسکی وجہ سے مجبوراً پیشہ وکالت سے ہات دھو لینا پڑا۔ علاج کے سلسلہ میں بہت دنوں تک دواخانہ کرنول میں زیر علاج رہے اور پھر پولیس ایکشن کے بعد حیدرآباد چلے آئے تو ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے۔

کثرت مطالعہ کے باعث سولہ سال کی عمر سے ہی شعر گوئی کا شوق ہوا اور اشعار موزوں کرنے لگے تو مجدد اسنہ شرقیہ حضرت سیّد احمد حسن شوکتؔ میرٹھی کے دامن سے وابستہ ہو گئے اور فن عروض میں مجتہد الشعرا حضرت سید نظیر حسن سخاؔ دہلوی سے فیض حاصل کیا۔ اِن دونوں اساتذہ صاحبان نے اس نوخیز کو بیک نظر پہچان کر اپنے گلے لگایا اور خاص توجہ و دلچسپی سے انھیں تعلیم دی جن کے احسانات کا جذبؔ صاحب نے بارہا مجھ سے تذکرہ کیا تھا۔ چنانچہ ان کی پہلی تصنیف رباعیات جذبؔ پر حضرت سخاؔ نے گرانقدر مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جو باوجود اختصار کے نہایت جامع ہے حضرت سخاؔ کے انتقال کے بعد راقم الحروف کے استاذ محترم حکیم الشعرا حضرت امجدؔ سے وقتاً فوقتاً اصلاح و مشورہ لیتے رہے۔

شاعروں کے سلسلہ میں جنوبی ہند کے اکثر مقامات مثلاً نندیال، کرنول، بجواڑہ، مسولی پٹم، بنگلور، میسور، کولار، مدراس، وانمباڑی، وشاکھاپٹنم، راجمندری وغیرہ کے سفر کئے اور ان میں سے بعض مقامات پر کل ہند شاعرہ کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ آپ کی تخلیقات جو زندگی میں ہی زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی تھیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ رباعیات جذب	طباعت بذات خود	۷۔ رباعیات حافظ	منظوم ترجمہ ناشر شوروہ بکڈپو دہلی
۲۔ ارمغان جذب	ناشر ادارۂ ادبیات اردو	۸۔ تاریخ ادب اردو و فارسی (بزبان کنڑی)	ناشر میسور یونیورسٹی
۳۔ تحفۂ جذب	بذات خود		
۴۔ دلستان تخیلات	"	۹۔ احساسات جذب	بذات خود
۵۔ آہنگ جذب	"	۱۰۔ معلومات جذب	"
۶۔ صد پارۂ جذب	"	۱۱۔ جوہر تمثیلات	سنسکرت کتاب کا منظوم ترجمہ بذات خود

۱۲۔ ساز غزل (مجموعۂ غزلیات) طباعت بذات خود

ان کے علاوہ تقریباً ایک درجن مسودات ہنوز محتاج اشاعت ہیں۔ قابل ذکر اردو کنڑی لغت اور کنڑی اردو لغت ہے جس کے بارے میں خود جذب صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ :۔

طابع صاحب ان کا چھپنا کارے دارد ہے البتہ زمانہ کی ناقدری کے سبب چھپ جائیں گے۔ اب یہ اُن کے ورثا اور پسماندوں کا کام ہے کہ بتدریج ہر سال ایک یا دو مسودے بطور یادگار شائع کر کے مرنے والے کی روح کو خوش کریں۔

ذیل میں نمونۂ کلام پیش ہے۔

ہے سکوت شمع ہی محفل کی موت — دل کی خاموشی ہے گویا دل کی موت
عمر قیام روح مسافر نہ پوچھئے — ہے مختصر یہ بات کہ آج آئی کل گئی
مر رہا ہوں تم نہیں ہو سامنے — موت ہے لیکن بڑی مشکل کی موت
بتاؤں کیا پتہ اپنے وطن کا — گلِ آوارہ ہوں اُجڑے چمن کا
اسیری بھی ہے آزادی کا اک نے — قفس بھی نام ہے میرے چمن کا
میں خود راہ محبت کا پیمبر بن کے آیا تھا — مجھ ہی پر ہوگیا یہ راستہ دشوار کیا باعث
تیرہ بختی کا یہی انجام ہے — صبح ہوتے ہی مرے گھر شام ہے
سنا ہے کہ وہ بے نیاز وفا ہے — نجانے محبت کو منظور کیا ہے

رباعیات :۔

میخانۂ کنٹری کا میں پیمانہ ہوں — پروردۂ سرحد تلنگانہ ہوں
قدرت کو یہ منظور تھا شاید اے جذبؔ — فطرت کے خلاف اُردو کا دیوانہ ہوں

جو ہے مخفی اسے خدا کہتے ہیں — مکار کو لوگ پارسا کہتے ہیں
دھوکے میں ہیں اے جذب یہ اُردو والے — مجھ کو خیام آندھرا کہتے ہیں

کھٹمل کو مسلنے میں نہیں لگتی دیر — بے بس کو کچلنے میں نہیں لگتی دیر
جو قول کا پابند نہ ہو اُس کے لئے — نیت کے بدلنے میں نہیں لگتی دیر

حضرت جذب کی اولاد میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں جن کی شادیاں ہوچکی ہیں اور سب کے سب صاحبِ اولاد ہیں۔ فی الوقت (۱۱) نواسیاں (۶) نواسے ایک پوتا اور ایک پوتی یادگار ہے۔ ۱۹۵۴ء میں آل آندھرا اُردو مجلس کی جانب سے اعتراف خدمات کے طور پر خیام آندھرا کا خطاب ملا تو ۲۵ جنوری ۱۹۷۰ء کو کل ہند انجمن خیال شاخ آندھرا کی طرف سے ان کی تخلیقات کے صلہ میں مسیح رباعی کا خطاب عطا ہوا نیز ان کی علمی ادبی خدمات کے صلہ میں ریاستی اور مرکزی حکومت کی جانب سے ڈیڑھ سو روپیہ (۱۵۰) ماہانہ وظیفہ کی امداد منظور کی گئی تھی جو زندگی بھر جاری رہی۔

راقم الحروف کی حضرت جذبؔ سے (۳۰) سالہ جان پہچان اور پندرہ سالہ قریبی تعلقات تھے۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۷۳ء کے اخبار میں جب میں نے ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو بڑا دکھ ہوا بہت افسوس کا مقام ہے کہ فلک کج رفتار نے موصوف کو ہمارے درمیان سے ایسے وقت میں اٹھالیا۔ جبکہ ان کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔ اگرچہ کہ وہ (۸۰) منزلیں طے کرکے اپنی عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے لیکن پھر بھی بقول حضرت غالبؔ ع

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

الحاصل یہ ہند و پاک کا جانا پہچانا چوٹی کا شاعر ۲۸ ستمبر ۱۹۷۳ء کی رات دیر گئے نقارۂ کوچ پر ضرب لگاتا ہوا دُنیا سے چل بسا۔ اُنکی آخری کا جلوس جوان کے مکان (۴-۷-۸۱۴) عیسیٰ میاں بازار سے لے جایا گیا شہر حیدرآباد وسکندرآباد کے ممتاز دانشوراد یبوں اور صحافیوں نے شرکت کی۔

جہاں تک ہم نے دیکھا بے وفا پایا زمانے کو
اسی سے جی نہیں ہوتا کسی سے دل لگانے کو

مظفرالدین خاں صاحب

رُباعی

تھی لطف تکلم کی جو با ہم مجلس — صاحب وہ بنی ہے صف ماتم مجلس
کیا کہئے کہ اک جذبؔ کے اٹھ جانے سے — صد حیف ہوئی آج وہ برہم مجلس

رئیسؔ نامدوی

یہی آغازِ وحشت ہے تو آگے پھر خدا جانے
ابھی تو دور ہے منزل تھکے جاتے ہیں دیوانے
زمانہ بھی بہا دیگا مری تقدیر پہ آنسو
اسے جب یاد آئینگے غمِ فرقت کے افسانے
بہاتی ہے جب آنسو شمع سوزِ غم کی شدت میں
ہمائے جاں نثاری میں اُڑے آتے ہیں پروانے
تقاضا ہے یہ اے پیرِ مغاں کالی گھٹاؤں کا
کھلے بوتل چلیں ساغر رہیں گردش میں پیمانے
جنھوں نے دلِ مرا لوٹا تھا کل اپنی اداؤں سے
خدا کی شان وہ مجھ سے لگے ہیں آج شرمانے
یقیناً یاد رہ جائے نہ انکو راہ کعبے کی
کبھی گر حضرت واعظ چلے آئیں صنم خانے
ہوئی تکمیل ایفاؤں مرے عہدِ محبت کی
جنونِ جوشِ وحشت نے کئے آباد ویرانے
تمہارے نام پر آنکھیں مری ہوتی ہیں نم کیونکر
یہ رازِ عشق ہے جسکو تمھیں سمجھے ہمیں جانے
مری تو چشمِ گریاں سے رواں اشکِ ندامت ہیں
وہ بخشے یا نہ بخشے یہ رئیسؔ اس کا کرم جانے

اخلاقؔ فتحپوری

کیوں ہے اس قدر وحشت ہم شکستہ حالوں سے
کاش پوچھتا کوئی شہر کے غزالوں سے
دوستی کے پردے میں دشمنی کے ہنگامے
زہر ہی پیا ہم نے شہد کے پیالوں سے
صبح نے چرایا تھا رنگ تیرے عارض کا
مانگ لائی ہے خوشبو رات تیرے بالوں سے
ہو گئے نمایاں کچھ داغ ہائے تاریکی
اور ہاتھ کیا آیا وقت کے اُجالوں سے
بجھ گئے اچانک ہی سب چراغِ محفل کے
یا چلا گیا کوئی روٹھ کر خیالوں سے
ایک لفظِ ناکامی اب جواب ہے سب کا
کس قدر پشیماں ہیں زیست کے سوالوں سے
بوئے پیرہن بھی ہے دردِ دل کی خوشبو بھی
کامیاب آئے ہیں مل کے خوش جمالوں سے
لفظ لفظ میں اخلاقؔ کتنے دل دھڑکتے ہیں
پوچھ میری غزلوں کو میرے ہم خیالوں سے

حباب ہاشمی

سوز و گداز و جذب و اثر کون لے گیا؛
ہم سے متاعِ دردِ جگر کون لے گیا؛

کیا ہو گیا ہے گردشِ دوراں ذرا بتا
حسن و جمال شام و سحر کون لے گیا؛

منزل کی سمت بڑھتے نہیں کس لئے قدم
اے دل متاعِ عزم سفر کون لے گیا؛

شوریدگیٔ عشق کی لذت کہاں گئی!
سودا تھا جس میں تیرا وہ سر کون لے گیا؛

چرچے تھے علم و فضل کے دنیا جہان میں
گنجینہ ہائے علم و ہنر کون لے گیا؛

دن میں حریم ناز کے جلوے تھے سب نہاں
شب میں ردائے نجم و قمر کون لے گیا؛

جبریل کے بھی جلتے ہیں پر جس جگہ حباب
اس جا پہ خاکِ پائے بشر کون لے گیا؛

اختر لیتوی

عذاب ہوشمندی

ترک کر دوں شغل مے زندگی سے ناتا توڑ دوں
چھوڑ دوں ساغر کی الفت جام و پیمانے کی چاہ
بے خودی احساس پر طاری نہ ہونے دوں، مگر
زندگی بے ہوش میں ہوگا بھلا کیونکر نباہ؛
کیا کروں گا کان میں گونجے گا جب آہوں کا شور
دیکھ کر ہر سو تباہی کیسے پاؤں گا سکوں؛
دوستو میرے لئے بہتر ہے عشق دخت رز
تاکہ میں دنیا سے غافل ہوش سے عاری رہوں

وسیلہ

خواہش وصل کے غنچے تو کھلیں گے نہ کبھی
انکے ہونٹوں سے مرے لب تو ملیں گے نہ کبھی
ہاں یہ ممکن ہے کہ اس بزم میں ہو جائے گذر
جس میں وہ پیتے پلاتے ہیں کریں رات بسر
اور وہاں میرے لبوں تک بھی وہی جام آئے
جو کہ انکے لبِ لعلیں کا تقرب پائے
اپنے ہونٹوں سے کریں جسکی وہ قسمت بیدار
میں اسی ساغرِ خوش بخت کو چوموں اک بار

تلگو سے ڈاکٹر سی نارائن ریڈی

شیخ نادر علی انور

یک جسم اشک ریز

ایک مدت کے بعد آئے ہیں
کہئیے کیا نذر کروں ؟
یاں تو یک جسم اشک ریز ہے صرف
ان اشکوں کی خوشبو سونگھو
یہ ہیں تازہ چنبیلی کی نکہت سے معمور
ان اشکوں کا ذائقہ چکھو
تلخیٔ شراب بھول جاؤ گے
بند کریں ان کھڑکیوں کو
کراہنے لگیں گے گونگے اُجیالے
کھولیں ان کھڑکیوں کو
لہرائینگے شب دیجور کی سیاہیوں کے پردے
ایک مدت کے بعد آئے ہیں۔
کہئیے کیا نذر کروں
ٹوٹی رگوں کے تار
ساحل ناآشنا کراہتوں کے دریا
کیا ؟
ابھی سے نیند آرہی ہے ؟
خاموش پلکوں پہ
طوفانِ مستی چھا رہا ہے ؛
اور میں پہلے ہی جانتا تھا
تمہیں یہ تلخی مزہ نہ دے گی۔
دوشالوں میں گذری ہوئی زندگی
کھلی حقیقت نہ سمجھ سکے گی
تم نے چاہا تھا آسمانوں کی رفعتوں کو چھوئیں
دھنستے جاتے ہو تاریک وادیوں میں
تم نے چاہی حسین جھیل کی سیر
اور پہنچے یک وادیٔ شور میں
آرزو کی تھی سکھ کی آخری منزل کی
پر ملا دکھ کا آخری زینہ حیف !
ایک مدت کے بعد آئے ہیں
کہئیے کیا نذر کروں
شب دیجور کے بستر کے سوا
بے زباں آہ کے سوا۔

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

مجھے افسوس ہے کہ کالجوں کے رسایل پر تبصرہ کرنے کا جلد موقع نہ مل سکا۔ اس تاخیر کیلئے معذرت خواہ ہوں یہ رسائل اشاعت کے ساتھ ہی سب رس میں تبصرے کے لیۓ وصول ہو چکے تھے۔

سٹی ملٹی پرپز اسکول میگزین سنہ ۷۲-۱۹۷۱ء

سرپرست غلام معین الدین خاں صدر مدرسہ مشیر ضیاء الحسن جعفری مدیر شیخ محی الدین متعلم دہم، نائب مدیر شمس الدین عارف متعلم نہم تحتانی

حصۂ اردو ۸۰ صفحے۔ تلنگی، ہندی اور انگریزی کے رسایل بھی اس میں شامل ہیں۔

سٹی کالج حیدرآباد کی وہ درسگاہ ہے کہ اس کے پرنسپل بعد کو ناظم تعلیمات اور پھر صدر المہام تعلیمات تک ہوئے خان فضل محمد خاں، سید محمد اعظم، احمد حسین خاں، ڈاکٹر رام لال، ڈاکٹر حسین ظہیر ان سبھوں نے حیدرآباد کی تعلیمی دنیا کو اپنی کارگذاریوں سے متاثر کیا۔ اب سٹی کالج ہائی اسکول اور ڈگری کالج دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے پچھلے دور میں تقریباً ربع صدی تک یہاں سے ایک سہ ماہی مجلہ "الموسی" شایع ہوتا تھا۔ زیر نظر رسالہ اسی کی یادگار ہے اور اس کے مشیر ضیاء الحسن جعفری صاحب اس دور کے واقف کار ہیں۔

ابتدائی بارہ مضامین اور نظمیں اساتذہ کے ہیں۔ دو تین نظمیں بیرونی شعراء کی اور بقیہ حصہ طلباء کا ہے۔ مضامین بڑی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ادبی بھی ہیں معلوماتی بھی اور سائنسی بھی یہ اساتذہ اور طلباء دونوں کی اعلیٰ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ کتابت اور طباعت بھی خوب ہے۔ ادبی اور سائنسی مضامین قابل استفادہ ہیں۔ ہائی اسکول سے اس معیاری رسالے کی اشاعت پر ارباب کار قابل مبارکباد ہیں۔

شعاع سنہ ۷۲-۱۹۷۱ء

انوار العلوم ایوننگ کالج حیدرآباد۔ سرپرست میجر الیس احمد الدین پرنسپل کنوینر شاذ تمکنت نگراں اردو مدیر اعلیٰ رشید شہیدی۔ مدیر قاضی عبدالسلام فردوس۔

حصۂ نظم میں خواجہ کور کھپوری بھی شامل ہیں اور کالج سے غیر متعلق اصحاب بھی طلباء کے رسالے کو اساتذہ سے گذر کر باہر کے اصحاب کی نظموں اور مضامین کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ رسالہ کا بنیادی مقصد طلباء کی حوصلہ افزائی اور ان کے معیار کو بلند کرنا ہے قطع نظر اس کے اساتذہ اور طلباء کے جو مضامین شریک ہیں ان میں عمادی صاحب کا مضمون سیکولرزم اہمیت کا حامل ہے۔ خالد قادری صاحب نے نوجوانوں کو آزادی کی حدود بتلائے ہیں اور بہت صحیح مشورہ دیا ہے کہ "نوجوان آزادی کی مانگ ضرور کریں... مگر اس کے ساتھ ساتھ آزادی کی پابندیاں بھی سمجھیں اور انھیں

اپنے اوپر لاگو کرلیں گے۔ طلباء نے بھی بساط بھر اپنے رسالے کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش ہے رشید شہیدی نے میر انیس پر لکھا ہے اور اسی مناسبت سے انیس کی تصویر ٹائٹل کو زینت دے رہی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ کالج کے طلباء اپنے ادبی معیار کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کی کوشش کریں گے۔

شمع حیات | دلی کالج (شبینہ) (ایوننگ کالج) اسٹاف ایڈوائزرز۔ محمد یوسف، محمد احمد، اسلم پرویز ایڈیٹر عتیق الرحمن فیضی کتابت، طباعت کاغذ اور ٹائیٹل سب اعلیٰ معیاری۔

اگر ایوننگ کلاسس کیلئے شبینہ استعمال ہوسکتا ہے تو اسٹاف ایڈوائزرز کیلئے مشیران جگہ کیوں نہیں لے سکتا یا مجلس مشاورت بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ تقاضات تو پیدا نہ ہوتی۔

اس حسین رسالے کا اداریہ بھی نہایت مختصر اور نہایت جامع ہے۔ یہ طلباء میں بے چینی سے متعلق ہے۔ لیکن کیا اس کے ذمہ دار صرف طلباء ہیں یا پورا تعلیمی نظام' بے چینی ایک مرض ہے مرض کا سبب جاننا علاج سے پہلے ضروری ہے۔ ملک اور قوم کا فائدہ اسی میں ہے کہ طلباء اپنی تمام تر صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف کریں" اس میں ایک جملہ کا اضافہ نامناسب نہ ہوگا یعنی اور سیاسی لیڈروں کا آلۂ کار نہ بنیں۔

جناب اسلم پرویز کا مضمون عصری آگہی اور اردو نظم فکر انگیز اور قابل مطالعہ ہے دوسرے مضامین تاریخ اور گھر کی رونق معلومات افزا ہے۔ ہم توقع کریں گے کہ مضامین کیلئے مزید طلباء کو ترغیب و تشویق دلائی جائے لطائف و ظرائف اور تصویروں سے بھی رسالے کو دلچسپ بنایا گیا ہے اس لئے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

بہار فروزاں ۱۹۷۲ء | اردو ایسوسی ایشن مہارانی کالج بنگلور۔ نگران ڈاکٹر آمنہ خاتون

یہ رسالہ مہارانی گرلس کالج بنگلور سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی نگران ملک کی مشہور ادیبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون ہیں انھوں نے اردو کی توسیع و اشاعت کیلئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ طالبات میں اردو سے دلچسپی قائم رکھنے اور انھیں صحیح راستہ پر گامزن کرنے کیلئے وہ کافی مشقتیں برداشت کرتی ہیں۔ اس رسالے کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ تمام مضامین طالبات کے ہیں جو کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ نے عروض یا وزن کو سادہ انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ طالبات کے ذہن میں شعر پڑھنے کا صحیح انداز قائم ہو۔ طالبات نے بھی مضامین محنت سے لکھے ہیں۔ اگر وہ اپنے مطالعہ کو بڑھائیں تو اس سے بہتر لکھ سکیں گی۔

نوائے لمنار ۷۳-۱۹۷۲ء خاص نمبر | سالنامہ بزم ادب اردو گورنمنٹ کالج ہاسن (میسور) چیف ایڈیٹر قیصر صادق صاحب ایم اے۔

اس کالج سے پہلے جو رسالہ نکلتا تھا اس کا نام "جام نو" تھا لیکن تبدیلی نام کا سبب یہ بتلایا گیا ہے کہ اس سے ملناڈ کے علاقہ کو متعارف کرانے کا موقع ملے میسور کے جنوبی چار اضلاع ہاسن چکمگلور شموگا اور کورگ ملناڈ کہلاتے ہیں ملناڈ کنڑی میں بارش کی سرزمین کو کہتے ہیں۔ مخصوص پیداوار کافی اور الائچی ہے ناریل کی بھی افراط ہے۔

رسالہ میں طلباء اور طالبات کے کافی مضامین ہیں۔ ترتیب میں اگر غور و فکر سے کام لیا جاتا تو اس کے حسن اور افادیت میں اضافہ ہو جاتا۔ یہ رسالہ ۱۵۲ صفحات پر ختم ہوتا ہے اسکے بعد جناب قیوم صادق صاحب اُستاذ اردو کی کتاب "کنج غالب ملا وجہی" ہے جس کے ۱۱۲ صفحے ہیں۔ اس میں وجہی کی سب رس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ غزلیں علیحدہ دی گئی ہیں جو اشعار "سب رس" میں استعمال ہوئے ہیں انھیں سرخ حرف کے حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ فارسی کے مصرعوں اور ابیات کو بھی علیحدہ علیحدہ اسی ترتیب سے ایک جگہ کر دیا گیا ہے۔ عربی آیات اور احادیث مع ترجمہ دی گئی۔ بعض جگہ ترجمہ میں صحت کا لحاظ کم نظر آتا ہے۔ اس کے بعد کام کی باتوں کے عنوان کے تحت وجہی نے سب رس میں مختلف مقامات پر جو خیالات ناصحانہ انداز میں ظاہر کئے ہیں انھیں جمع کیا گیا ہے۔ مگر مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصے میں ترمیم کی گنجائش ہے۔ بعض جملے اس عنوان کے ذیل میں نہیں آتے۔ اس کے بعد قطب مشتری اور تاج الحقائق کا بھی اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس کام میں صادق صاحب نے کافی محنت اٹھائی ہے۔ یہ کتاب وجہی کے بارے میں ایک انسائیکلو پیڈیا کا کام دے سکتی ہے۔ آخر میں فرہنگ دی گئی ہے۔

کالج میگزین ۷۳-۱۹۷۲ء ابھی حال ہی میں اسی کالج کا کالج میگزین بھی ملا جس میں کنڑی، انگریزی، ہندی اور اردو کے مضامین ہیں جس میں اردو کیلیے دو صفحات مختص ہیں ظاہر ہے کہ اردو کیلئے یہ گنجائش قطعاً ناکافی ہوگی۔ قیوم صادق صاحب نے اس میں ڈاکٹر ظہیر احمد پر ایک مضمون لکھا ہے۔ یہ طلباء کو متعارف کرانے کیلئے ہے۔ دوسرا قابل مطالعہ مضمون صادق محمد دہریزی کا تحلیل ہاسنی پر ہے جن کا شاعر کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا ہے۔ اشعار کے انتخاب میں توجہ سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

اشرف ۱۹۷۳ء اشرف المدارس سکنڈری گریڈ بیسک ٹریننگ اسکول حیدرآباد۔

یہ جناب حسن علی خاں صاحب ایم اے ایڈ کی سرپرستی میں نکلا ہے۔ یہ پہلا شمارہ ہے جو اس درسگاہ سے نکلا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حسن علی خاں صاحب ہی کی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے ہاشم مہاجر مشیر اعلیٰ ہیں۔ مسز انور سلطانہ رکن الدین فاروقی اور ریاض الحسن مجلس مشاورت کے رکن اور مدیر اعلیٰ مسز مومن نیفی۔ ابتدا پیامات سے ہوتی ہے۔ اشرف المدارس کے قیام کی داستان سنائی گئی ہے۔ مسز مومن فیض نے ملک کے مشہور ماہر تعلیم جناب سید علی اکبر صاحب سے ایک انٹرویو کی روداد لکھی ہے۔ یہ خاصے کی چیز ہے۔ تعلیمی مسائل پر اچھا خاصا مواد اس رسالہ میں ملے گا امریکہ کا نظام تعلیم بچے کی تربیت ہمارا طریق امتحان قومی یکجہتی طلباء میں اپنے پن اور

ضبط شکنی کے اسباب کا جائزہ' ہندوستان کا موجودہ نظام تعلیم اور ایسے کئی اہم عنوانات پر مضامین شامل ہیں۔
چونکہ یہ مضامین اکثر و بیشتر ٹرینڈ اساتذہ کے لکھے ہوئے ہیں اس لیے یہ نہایت وقیع اور گراں بہا ہیں ہمارے ملک کے
رہنماؤں کو انھیں پڑھکر پالیسی متعین کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن یہ ان تک کہاں رسائی حاصل کرسکتا ہے۔
اور کرے بھی تو اس کو پڑھے اور پڑھکر عمل کون کرے اظہر افسر صاحب اسکول سے غیر متعلق ہیں لیکن ان کا ایک ڈرامہ
غالباً دلچسپی اور تنوع کی خاطر شریک کرلیا گیا ہے۔ اس میں افسانے بھی ہیں اور نظمیں بھی اگر اس تک رسائی ہو تو ضرور
قابل مطالعہ ہے۔

نئی صبح ۷۴-۱۹۷۳ء | گورنمنٹ گرلز جونیر کالج حسینی علم حیدر آباد ۵۰۰۰۰۲

یہ رسالہ محترمہ اصغری بیگم صاحبہ پرنسپل کی سرپرستی میں ایک بڑی مجلس مشاورت اور اس سے بڑی
مجلس ادارت کے زیر نگرانی نکلا ہے۔ یہ انگریزی' تلگی' ہندی عربی اور اردو پانچ زبانوں پر مشتمل ہے جس میں
اردو کے لئے (۱۱۲) صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ طالبات نے مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھا ہے محمد محی الدین صاحب معظم
بی کام' بی ایڈ' ایل ایل بی کے دو مضامین ہیں مہمان نوازی' ایک اچھا لکھا ہے اور اردو ادب میں افسانہ نگار خواتین کا
حصہ معلوماتی اور تحقیقی ہے۔ معظم صاحب نے دونوں مضامین کے لکھنے میں کافی غور و خوض سے کام لیا ہے اور
کافی محنت کی ہے۔ سید محمد صاحب نے" راکٹ دوڑ" پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے۔ یہ کافی دلچسپ' عام فہم
اور دل نشین انداز میں لکھا گیا ہے۔ بقیہ مضامین افسانے اور ڈرامے اساتذہ اور طلباء کے ہیں۔ ان کے مطالعے سے
اردو سے لگن اور شوق کا اظہار ہوتا ہے۔

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم

سنہ اجرا ۱۹۳۸ء جلد ۳۶ شمارہ ۱۲

ڈسمبر ۱۹۷۳ء

ماہنامہ

سب رس

زر سالانہ آٹھ روپے غیر ممالک سے پندرہ روپے

زر ششماہی چار روپے فی پرچہ پچھتر پیسے

نمونے کے پرچے کے لیے ۵۰ پیسے کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

پرنٹر و پبلشر سید علی اکبر کے اہتمام سے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس میں چھپ کر ایوان اردو خیریت آباد حیدرآباد ۴ ... ۵۰۰ سے

شائع ہوا

ترتیب

حصۂ نظم

اپنی بات

گذشتہ مہینے نومبر کی ۱۰ اور ۱۱ کو اردو کے غیر مسلم مصنفین کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی۔ تقریباً سو مصنفین نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ یہ حضرات مختلف ریاستوں سے جمع ہوئے تھے۔ ان کے اجتماع کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ بلا تفریق مذہب و ملّت سب کی ہے۔ مندوبین کے اجلاس کی صدارت جناب آنند نرائن ملّا نے کی جس میں سات قراردادیں منظور کی گئیں۔ دو مذاکرے ہوئے ایک میں "اردو سے ہمارے رشتوں پر" مقالے پڑھے گئے اور تقریریں ہوئیں مقالات پڑھنے والوں میں ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شامل تھے دوسرے اجلاس میں "ہم اردو کے طرف دار کیوں ہیں" پر تقریریں ہوئیں۔ پروفیسر فراق گورکھپوری اور جناب آنند نرائن ملّا نے تقریریں کیں اور جناب کرشن چندر نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ کانفرنس کے کنوینر ملک کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار رام لال تھے یہ سب کچھ ہونے کے بعد بھی چراغ کے نیچے ابھی اندھیرا ہی ہے۔ مستحق مقام دینے کے وعدے ہیں لیکن دوسری سرکاری زبان بنانے کا ارادہ نہیں۔ جب تک دوسری سرکاری زبان تسلیم نہ کی جائے اس کی نشوونما میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ حکومت جو احکام اجرا کرتی ہے ان کی تعمیل نہیں ہوتی۔ حکومت یہ جانتی ہے کہ احکام کی تعمیل نہیں ہو رہی ہے اور عدول حکمی کرنے والوں کے ساتھ کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ حکومت احکام کی تعمیل نہ کرائے اس کے احکام کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ احکام کی تعمیل ہی میں حکومت کا وقار مضمر ہے۔ اپنے احکام کی تعمیل کرانا حکومت کا اولین فریضہ ہے۔

ملک کے مشہور شاعر سلام مچھلی شہری نے ۱۹ نومبر کو دہلی کے ولنگڈن ہاسپٹل میں انتقال کیا وہ جدید اردو شعرا میں بلند مقام کے حامل تھے اور تیس سال سے زیادہ مدت تک آل انڈیا ریڈیو دہلی سے وابستہ رہے ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کی بنا پر حکومت نے پدم شری کا اعزاز عطا کیا تھا۔ ان کے گیتوں کے مجموعے "پایل" نے کافی مقبولیت حاصل کی نظموں کا مجموعہ "وسعتیں" اور ناول "بازو بند کھل کھل جائے" ادب نواز حلقوں میں دلچسپی سے پڑھے گئے انجمن ترقی اردو ہند نے ان کی نظموں کا ایک انتخاب بھی شائع کیا تھا۔ ریڈیو سے منسلک ہونے کی وجہ سے کئی فیچر اور منظوم ڈرامے بھی لکھے جو ابھی شائع نہیں ہوئے کوئی ناشر اس کا انتخاب شائع کر دے تو ادب میں اچھا اضافہ متصور ہوگا ہم پسماندگان کے غم میں شریک ہیں۔
خدا مرحوم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

حیدرآباد کے ایک جواں سال اور مقبول عام شاعر ابن احمد تاب نے ۲۴ نومبر کو سویرے حرکت قلب بند ہو جانے

(بقیہ صفحہ ۶)

ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی

"نذیر احمد کے قصوں میں ناول کا تسلسل"[*]

نذیر احمد کے قصوں میں "ناول کا تسلسل ہر جگہ برقرار رہتا ہے۔ صرف مراۃ العروس میں دو جگہوں پر تسلسل ختم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک جگہ وہ ہے جہاں نذیر احمد اکبری کا قصہ بیان کرنے کے بعد اصغری کے قصے کا آغاز کرتے ہیں۔ دوسرا وہ موڑ ہے جہاں بنیادی طور پر ناول ختم ہو چکا ہے لیکن اس کے بعد اصغری کے والد کا خط الگ سے نقل کیا جاتا ہے۔ ناول کے تسلسل کے ٹوٹنے کا یہ دوسرا موڑ کافی واضح ہے اتنا واضح ہے کہ یہ خط اصل ناول سے بالکل الگ ہو کر رہ گیا ہے۔ ناول کی پہلے دراڑ کو بھرنے کی شعوری طور پر کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش مکمل طور پر کامیاب نہیں ہو پاتی۔ سلسلہ کسی حد تک ٹوٹا ہی رہ جاتا ہے۔ باقی تمام ناولوں میں ناول کا تسلسل کہیں بھی ختم نہیں ہوتا خواہ نذیر احمد لمبی لمبی تقریروں کا آغاز کرتے ہیں یا نصیحت اور وعظ کرتے ہیں۔ یا مختلف واقعات کو بیان کرتے ہیں وہ سب ایک سے ایک جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے نذیر احمد کی پلاٹ اور ڈیزائن سے آگاہی ظاہر ہوتی ہے۔ مراۃ العروس میں کئی ایسے دوسرے مواقع بھی آتے ہیں جہاں یہ سلسلہ ٹوٹ سکتا تھا مثلاً نذیر احمد ایک جگہ دہلی کے ان مقامات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جہاں مٹھائیوں میں سے کوئی مخصوص مٹھائی عمدہ ملتی ہے۔ اس کا سلسلہ وہ ایک ڈرامائی انداز میں ناول کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح مکتب میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یا بچیوں کو کس طرح کی تعلیم دینی چاہئے یعنی ایسے مدرسوں کا نصاب تعلیم کیا اور کیسا ہونا چاہئے ان تمام باتوں کو نذیر احمد بتانا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کھانا پکانے کی ترکیب اور اس کا مکمل فارمولا یعنی "خوانِ نعمت" کو پیش کرنا چاہتے ہیں اس کا سلسلہ وہ سفیہن کی مکتب کے متعلق شکایتوں اور بدگمانیوں سے بڑے ہی ڈرامائی انداز میں جوڑ دیتے ہیں جبکی لڑکی فضیلت اصغری کے مکتب میں پڑھتی ہے۔ بس ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ اسی طرح رویائے صادقہ میں نذیر احمد مذہبی امور پر اپنا تیار کردہ مکمل رسالہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو اس کو صادقہ کے خواب وخیال سے منسلک کرتے ہیں۔ اس کو پیش کرنے کیلئے اور دوسرے طریقوں سے زمین پہلے ہی سے تیار کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ابن الوقت اور میرمتقی وغیرہ کی طویل تقریریں بھی ناول کے تسلسل کو برہم نہیں کرتیں۔ ابن الوقت کے دو مستقل نظریاتی اور معاملاتی ابواب بھی ناول کے بدن سے الگ نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ آزادی کی وصیت بھی ناول کے ہی دامن سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

---

[*] علیگڑھ تحقیقی مقالہ "نذیر احمد شخصیت اور کارنامے" کے چند اوراق جو معارف پریس اعظم گڈھ سے شائع ہو رہا ہے جس پر اردو اکاڈمی نے بارہ سو روپیہ دینا منظور کیا ہے۔

اس طرح نذیر احمد ناول کے مختلف اجزا میں ربط و تسلسل کو برقرار رکھنے کے اعلیٰ فن سے واقف نظر آتے ہیں جس سے ان کے ناولوں کے سانچے اور ان پر بنی ہوئی کہانیاں اُبال کھانے کے باوجود ٹوٹ کر الگ نہیں ہوتیں۔ اس کے علاوہ ناول کا تسلسل برقرار رکھنے کیلئے وہ جس قسم کا طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ ایک ناول نگار کا طریقہ ہوتا ہے ایک رومانی قصہ نویس یا داستان گو کا نہیں۔

نذیر احمد ناول کا تسلسل برقرار رکھنے کیلئے ایک طریقہ یہ استعمال کرتے ہیں کہ وہ ایک خیال سے دوسرا دوسرے سے تیسرا خیال پیدا کرتے چلے جاتے ہیں اور ایک مستقل دھارے کی شکل میں ان کا زندگی کے متعلق شعور بہتا چلا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خیال جو ایک ہلکے سے اشارے کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔ اس سے ناول میں کافی دور جا کر سلسلہ جوڑ دیا جاتا ہے اور ناول کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ ایامیٰ میں آزادی پادری میم یعنی لیڈی ڈاکٹر اور مس میری کی مستقل کاوشوں سے بالکل تندرست ہو جاتی ہے۔ بس کبھی کبھی کوٹھے میں ہلکا ہلکا درد محسوس ہوتا ہے جس سے اس وقت کسی قسم کا خطرہ نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے اسکی طرف کوئی زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ لیکن بعد میں ناول کے آخر کا پلاٹ اسی ہلکے سے درد کے سہارے آگے بڑھتا ہے جو بے توجہی کے سبب زہرناک پھوڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں میں ایک سے زیادہ زندگی کی مختلف دھارائیں بہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جو آپس میں ملکر مکمل زندگی کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ مراۃ العروس میں خود خیالات کی مختلف دھارائیں بہتی ہیں جن کا سرچشمہ زندگی کا ایک مخصوص مسئلہ امورِ خانہ داری ہے۔

ناول کے تسلسل کا دوسرا طریقہ مخصوص اور محدود زندگی کے مسائل کا بالواسطہ اور براہ راست دونوں طرح کے بیانات سے عبارت ہے۔ امور خانہ داری کے متعلق اصغری کے بیاہ کے بعد ہی نذیر احمد نے نئی نویلی دولہن کیلئے جو دستور العمل پیش کیا ہے اس میں اصغری کے باپ دور اندیش کے فطری جذبات کا سہارا لیا گیا ہے۔ اس کو ہم بالواسطہ طریقے میں شمار کرتے ہیں۔ دور اندیش نے اس موقع پر جو خط بھیجا ہے۔ اس کا موقع بھی ہے اور دستور بھی ہے اس لئے اس سے ناول کا تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ اس کے برعکس اس خط سے ناول کے آئندہ واقعات میں تسلسل کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح فسانۂ مبتلا میں میر متقی کی وہ تقریر بھی جو سید حاضر کے سامنے سید نگر میں دی گئی ہے آئندہ کے واقعات میں تسلسل قائم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ میر متقی کے دیگر وعظوں، عارف اور مبتلا کے دیگر خلاقی امور اور زندگی کے مسائل پر مباحثے بھی ناول کے تسلسل میں کمی پیدا کرنے کے بجائے اس میں اضافہ کر دیتے ہیں۔

ناول کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا تیسرا طریقہ خود نذیر احمد کی اپنی فطرت اور انفرادیت سے جنم لیتا ہے۔ ں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے اعلیٰ شعور اور اس کے تجربات کی ہمہ وقت رواں دھاراؤں سے کتنی اچھی ہ واقف تھے۔ یہ بات حیران کن نہیں ہے کیونکہ نذیر احمد ان لوگوں میں سے تھے جن کیلئے قصہ گوئی ایک ہی فطری تھی۔

جتنی ہماری شریانوں میں خون کا بہاؤ ہوتا ہے۔ واقعات نگاری (NARRATLVE) ان کی تحریروں میں بری طرح سرایت کر گئی تھی۔ یہاں تک کہ ان کی مذہبی تحریروں پر بھی اس کا اثر ملتا ہے۔ ان کے بیانات سرسید اور شبلی کے مضامین کے برعکس ناول کے قریب معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے قلم سے نکلا ہوا ہر قسم کا بیان ناول کے تسلسل پر خراب اثر پیدا کرنے کے بجائے اسکو اور بھی استوار بنا دیتا ہے۔

نذیر احمد اس کام کیلئے اکثر ایک ایسا طریقہ بھی استعمال کرتے ہیں جس کے تحت وہ اپنی کسی گفتگو یا خیال کی تکمیل میں تاخیر پیدا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایامیٰ میں نذیر احمد آزادی کے اس معمولی سے درد کو جس کی طرف وہ ناول کی ابتدا ہی میں اشارہ کر دیتے ہیں مہلک شکل اختیار کرنے کا بیان کرنا چاہتے ہیں لیکن اس بات کو فوراً مکمل نہیں کر دیتے بلکہ اس کو کئی مخصوص منازل کی تاخیر سے پایۂ تکمیل کو پہنچاتے ہیں۔ اسی سلسلے میں انسانی فطرتوں کے متعلق بھی کئی گوشے روشن شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔

ناول کے تسلسل کا ایک طریقہ یہ بھی نذیر احمد کے یہاں ناولوں میں ملتا ہے کہ اس میں خیالات کو مکرر اختیار کے ساتھ محاورات کی شکل میں بھی پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا وہ سارے خیال کئے جاتے ہیں لیکن جہاں کم لفظوں میں وہ اپنی کسی گفتگو کو تمام کرنا چاہتے ہیں یہ طریقہ بھی اپناتے ہیں۔ نذیر احمد جب یہ دیکھتے ہیں کہ بیان کافی طویل ہوتا جا رہا ہے اس سے کتاب کی ضخامت غیر ضروری طور پر بڑھ جائے گی یا جب وہ دیکھتے ہیں کہ باتوں کو زیادہ پھیلا دینے سے اثر کم ہو جائے گا دلکش تراکیب یا لفظوں کا دلچسپ دلکش گروہ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ پیچیدہ اور طویل گفتگو کو بڑے ہی دلکش انداز میں لفظوں کے مختصر گروہ محاورات اور ضرب الامثال سے مختصر اور سلیس بنا دیتے ہیں۔ نذیر احمد فطری طور پر سلیس اور رواں عبارت لکھنے کے عادی ہیں۔ کبھی کبھی مواد بھی ہلکا ہوتا ہے۔ اور جب اس میں کافی وزن ہوتا ہے اس پر بھی وہ سبک انداز تحریر اختیار کرتے ہیں اور جب پیچیدہ اور مبہم باتوں کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت بھی سلاست کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ نذیر احمد کے ناولوں میں خانۂ رواں (بحری جہاز) اونگھتا اداس نکاح مجوزہ تعزیرات ہند وغیرہ لفظوں کے گروہ ملتے ہیں۔ ویسے محاورات کے کثرت استعمال کیلئے تو نذیر احمد بے حد بدنام ہیں لیکن یہاں یہ بھی بتا دینا میں ضروری سمجھتا ہوں کہ نذیر احمد اکثر مردہ محاورات کو ذرا ذرا سے تصرف سے زندہ کر کے ہی اپنے ناولوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا تخلیقی جوہر پوری طرح بیدار ہوتا ہے۔ اس طرح ناول کے تسلسل کیلئے ان کا یہ طریقہ مخصوص ہی کہا جا سکتا ہے۔ اپنے انھیں طریقوں سے نذیر احمد اپنے پیچیدہ خیالات کو واضح انداز میں پیش کرنے پر قادر ہو جاتے ہیں۔ ان کی دل میں اتر جانے والی اور ذہن کو زندگی کے متعلق مختلف تاثرات سے پر کر دینے والی تیز اور چبھتی ہوئی سلاست کا یہی راز ہے۔

ناول کے تسلسل کیلئے نذیر احمد اکثر ایک مخصوص محاکاتی انداز تحریر اختیار کرتے ہیں۔ یہ اندازِ تحریر بیسویں صدی میں زیادہ کامیابی کے ساتھ برتا جا رہا ہے۔ ہم اس سلسلے میں اس قدر حساس ہو گئے ہیں کہ ہر صفحہ سے بے شمار صفحیں جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ نذیر احمد کے ناولوں میں بھی اکثر ایسے پیکر ملتے ہیں جو زندگی سے لبریز ہوتے ہیں۔

نذیر احمد اپنے ناولوں کیلئے مختلف انسانی معاشرے سے پیکر تراشتے ہیں لیکن مسلم متوسط گھریلو ماحول کی عکس کشی ان کے ناولوں میں خاص طور سے ملتی ہے کیونکہ ان کے تمام ناولوں میں مکان کی تعمیر جدید کا رحجان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ بادی النظر میں ابن الوقت کا موضوع گھریلو ماحول اور مسائل سے کافی علیحدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن بغور مطالعہ سے اس ناول کی بنیاد بھی اسی قدرِ مشترک پر رکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ہر انسان کی تہذیب تمدن کی سب سے پہلی درس گاہ اسکی خاندانی زندگی ہوتی ہے۔ ابن الوقت، کلیم، مبتلا وغیرہ بھی کردار اپنا بہت کچھ خاندانی تہذیبی سرمایہ رکھتے ہیں۔ اسی کو لے کر وہ دنیا کے وسیع معاشرے پر پھیلتے ہیں۔ متاثر بھی ہوتے اور اثر انداز بھی۔ کلیم دولت آباد جاتا ہے۔ مبتلا جدید درس گاہ میں داخل ہوتا ہے اور ابن الوقت دنئی دہلی کی تعمیر میں حصہ لینا چاہتا تھا۔ جدید تہذیبی اور ثقافتی نظریات سے متاثر ہوتا ہے اور ایک طرف حجتہ الاسلام پر اثر انداز ہوتا ہے اور دوسری طرف مسٹر شارپ اور نوبل صاحب پر بھی اور انہیں کرداروں سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ چونکہ نذیر احمد کی قصہ نویسی کی باتیں اپنے عہد کے ہر طبقہ کی زندگیوں کو کہیں نہ کہیں ضرور چھوتی ہیں اور ان کی نظر ہر طرح کی زندگی پر ہوتی ہے اور اس کے ہر پہلو سے وہ واقف ہوتے ہیں اس لیے ان کے عکس مختلف الوانع کی زندگی سے کامیابی کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ اس میں ان کے وسیع تجربات اور گہرے مشاہدات کو کافی دخل ہے۔ رویائے صادقہ کو لیجئے اس میں علی گڑھ کالج کی زندگی کے عکس بھی ملتے ہیں، دہلی کے مسلم متوسط طبقہ کے لوگوں کی زندگیوں کی تصویریں بھی ملتی ہیں اور شاہی خاندان کے لوگوں کے خیالات اور مشغلوں کا بھی عکس ملتا ہے۔ اس سلسلے میں شاہی پہلوانوں کی کابلی پٹھان سے کشتی کے بیان میں بہت دلچسپ قسم کے نقوش ابھرتے ہیں۔ لیکن یہاں بھی مسلم متوسط خاندان کے نقوش خاص طور سے سامنے آتے ہیں۔

اس سلسلے میں نذیر احمد ایک خاص طریقہ یہ استعمال کرتے ہیں کہ مختلف اشیاء کے موازنے اور مقابلے سے مخصوص پیکروں کو ابھارتے ہیں۔ مثال کے طور پر شاہی پہلوانوں اور کابلی پٹھان کے موازنے کے ذریعہ اس وقع کے مختلف عکس واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ دونوں کو مختلف اوقات میں بیان کرنے پر کوئی عکس اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں ابھر سکتا تھا۔ نذیر احمد کی تحریر کا یہ بہت ہی مخصوص انداز ہے جو ان کی اندرونی کشمکش اور تصادم کا غماز ہے۔ ان کی شخصیت کے اسی وصف کے ذریعہ ان کے ناولوں میں زندگی کا رزمیہ علامتوں اور پیکروں میں سامنے آتا ہے۔ انگریزی ناول نگاروں میں یہ مخصوص دلکش رنگ فیلڈنگ کا ہے۔ اس کے یہاں بھی

(HOMER) اور ورجل (VIRGIL) کے اس فن کی بہت ہی لطیف اور نازک اور اپنے پیش رووں کے مقابلے میں متنوع بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ فیلڈنگ، کا خیال تھا کہ رزمیہ ناول نگار اور دوسرے فنکاروں کیلئے ایک معیار ہے۔ اسکاٹ اور آسٹین ناول کی ہیئت سے لطف اندوزی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اس کی طرف ان کا خیال کم ہی ہو پاتا ہے۔ یہ فرق ان کی شخصیتوں کے فرق کی وجہ سے بھی ہے۔ اسکاٹ کے اندر کسی قسم کی واقعی کشمکش کا پتہ نہیں چلتا جبکہ آسٹین کی کشمکش کی بنیاد صرف ایک آرزو اور تمنا پر موقوف ہے۔ یعنی اچھے گھر اور اچھے شوہر کی تلاش۔ آسٹین کے ناولوں سے ہر جگہ اس خیال کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن نذیر احمد کی کشمکش ہر طرف سے بڑھتے ہوئے دباؤ کا نتیجہ تھی اس لیے ان کے ناولوں میں متنوع رزمیہ پیکر ملتے ہیں۔ مراۃ العروس میں اصغری کی انفرادیت یا ما عظمت کی انفرادیت سے، اکبری کی محمد عاقل کی انفرادیت سے، اصغری کی اسکی ساس کی انفرادیت سے اور محمد کامل کی مبہم انفرادیت سے متصادم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دولت اور علم دہنر کی شکل میں، نچلے اور متوسط طبقے کی اصغری اور محلے کی کم رتبہ (کمینیوں) کی شکل میں طبقاتی کشمکش کے عکس بھی اس ناول میں اُبھرتے ہیں۔ اسی طرح ابن الوقت توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا ایامیٰ، رویائے صادقہ یہاں تک کہ بنات النعش میں بھی مختلف زندگیوں اور کرداروں میں کشمکش کا پتہ چلتا ہے جس سے دلکش رزمیہ پیکر ابھرتے ہیں اور موج زیریں کی طرح ناول میں ابتدا تا انتہا بہتے رہتے ہیں اور ناول کے تسلسل کو بہر حال برقرار رکھتے ہیں۔

نذیر احمد کے ناولوں میں اس قسم کے تصادم خاموش اور سنجیدہ ہوتے ہیں اور طنزیہ، مزاحیہ اور بلند آہنگی سے بھی بیش ہوتے ہیں۔ جہاں وہ خاموش تصادم کی جگہ پرشور تصادم کا مظاہرہ کرتے ہیں اس جگہ وہ لسان معلوم ہونے لگتے ہیں اور ناول کی ہیئت اور اُردو کے نقادوں کیلئے ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں۔

واقعات کے بیان کا وہ طریقہ جس میں جملوں کو "اور" سے آپس میں منسلک کیا جاتا ہے۔ ورجل اور معیاری تراجم میں اکثر مستعمل ہے۔ نذیر احمد کے ناولوں کی شروع کی اشاعتوں میں جملوں کو جوڑنے کا یہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے بعد کی اشاعتوں میں جو مختلف قسم کی علامتیں (کاما، فل اسٹاپ، سوالیہ نشان وغیرہ) ملتی ہیں وہ ان کے بعد کے مرتبوں کا کارنامہ ہے۔ جملوں کو اور سے جوڑنے کا طریقہ ڈرامائی انداز کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس طریقے سے ناول کا ڈرامائی منتہا (DRAMATIC CLIMAX) جنم لیتا ہے۔

رزمیاتی یا دیگر قسم کے پیکر نذیر احمد کے ایک سے زیادہ ناولوں میں ابھرتے ہیں جس سے ان کے مختلف ناول ایک بڑے سلسلے میں جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ شکسپیئر کے برعکس نذیر احمد کے پیکر زندگی کے ہر ڈرامے کا الگ الگ احساس دلانے کے بجائے ان کے ناولوں میں انسانی تاریخ پر منحصر مسلسل زندگی کی مختلف

کو بھی کا احساس دلاتے ہیں چونکہ نذیر احمد کے ہر ناول کی سرحدیں زیادہ سخت نہیں ہیں اس لیے ایک ناول کا موضوع اور مواد بھی دوسرے ناولوں کی سرحد میں داخل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک ناول کے کردار بھی دوسرے ناول میں اپنی شکلیں بدل کر داخل ہو گئے ہیں۔ اس لئے ان کے الگ الگ ناولوں میں بھی ایک طرح کا اندرونی رشتہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس بات کو ذیل کے نقشے میں اس طرح پیش کر سکتے ہیں۔

نام ناول	موضوعات
مراۃ العروس	امور خانہ داری اور تعلیم نسوان
بنات النعش	تعلیم نسواں اور تربیت بنات
توبۃ النصوح	تربیت اولاد اور مذہب
ابن الوقت	مذہب و معاشرت
رویائے صادقہ	مذہب

اسی طرح نذیر احمد کے مختلف ناولوں کے کرداروں میں بھی مسلسل ارتقاء کے باوجود اپنے قبل کے ناولوں کے کردار سے ایک اندرونی تعلق ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے دو ناول فسانۂ مبتلا اور ایامیٰ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے یہ کردار جس قدر آگے کی طرف بڑھتے جاتے ہیں سادہ اور اکہرے پن سے مدور کردار کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں۔ ناولوں کا یہ تسلسل آپس میں ایک مکمل زندگی کے رزمیہ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ مغربی ناول نگاروں میں تھیکرے کے تمام ناولوں میں بھی جیوفری ٹیلوٹسن (GEOFFREY TILLOTSON) نے اس قسم کا ایک تسلسل قائم کرنے کی کوشش کی ہے گو کہ تھیکرے نے خود اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ فرانسیسی ناول نگار بالزاک نے تو خود اپنے تمام ناولوں کو ہیومن کامیڈی (HUMAN COMEDY) کے نام سے اکٹھا کیا تھا۔ نذیر احمد نے بھی نہ تو اس قسم کا کوئی اشارہ کیا ہے اور نہ ہی اپنے تمام ناولوں کا کوئی ایک نام ہی دیا ہے۔ پروسٹ (PROUST) کے یہاں بھی ایک بڑے ناول کا تصور ملتا ہے۔ انگریزی ناول نگاری کی پہلی کھیپ میں، سرلی کا نام اس سلسلے میں لیا جا سکتا ہے جس نے ٹرسٹرم شینڈی کو ۱۷۶۰ء سے ۱۷۶۷ء تک مسلسل تصنیف کیا اور نامکمل چھوڑ کر مر گیا۔ لیکن بالزاک اور تھیکرے کا رزمیاتی تصور کو عملی جامہ عطا کرنے کا طریقہ ایک طرح سے مشابہ نظر آتا ہے۔

ان کے نزدیک ناول نگار اور قاری دونوں کی اہمیت مسلمہ معلوم ہوتی ہے۔ اسٹرنی اس خیال سے عاری معلوم ہوتا ہے اور پروسٹ بھی۔ یہ دونوں زندگی میں اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان سے نکلنے کا انھیں موقع ہی نہیں ملتا اور اول الذکر ناول نگار زندگی کی حرکت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے قاری کی زندگیوں کے ہنگامے کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت اور رویائے صادقہ یہ پانچ ناول داخلی طور پر ایک دوسرے سے منسلک معلوم ہوتے ہیں۔ ان ناولوں میں زندگی جھرنے کی طرح لڑھکتی آگے بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی ہے یا سانپ کی طرح رینگتی ہوئی باری باری تمام ناولوں سے گزرتی ہے اور نذیر احمد کے باقی دو ناول فسانۂ مبتلا اور ایامیٰ کے موضوع میں ایک گہرا تعلق ہے۔ ایک تاریخی حقیقت کو نظر انداز کر دینے کے سبب نذیر احمد کو ان دونوں مسائل پر ناول تصنیف کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسلام میں تعداد ازدواج کی اجازت اسی وجہ سے دی گئی تھی کہ بیواؤں کی دوبارہ شادی کا مسئلہ اس صورت میں حل ہو سکتا تھا۔ لیکن نذیر احمد کے زمانے میں لوگ مسئلہ کے اس قسم کے شعور سے عاری ہو چکے تھے۔ وہ اپنے نفس کے شکار تھے اور غلط ملکی رسوم و رواج کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ لہٰذا ان دونوں ناولوں میں اس قسم کے تعلقات کی وجہ سے ان کو الگ الگ گروپ میں رکھا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ دونوں ناول اول الذکر پانچ ناولوں کی طرح زندگی کا ایک بڑا المیہ نہیں بناتے اور نہ ان ناولوں سے کوئی تسلسل ہی قائم کرتے ہیں بلکہ الگ معلوم ہوتے ہیں اور نہ ان کی تکمیل کا احساس دلاتے ہیں اس لیے ان کو ایک علیحدہ گروپ ہی میں رکھنا چاہیئے۔ اس طرح نذیر احمد کے تمام ناولوں کو دو گروپوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک میں اول الذکر پانچ ناول اور دوسرے میں باقی دو ناول آئیں گے۔

لیکن فنی ارتقاء اور زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے ان ناولوں کو دوسری طرح سے دو ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلے دور کے ناولوں میں مرآۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح کو رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں ناول ایک ہی زمانے کے نتیجۂ فکر معلوم ہوتے ہیں جب قدیم دہلی کالج تحریک ان کے پیچھے تھی اور علی گڑھ تحریک ان کے آگے اور دوسرے دور میں ان کے باقی چار ناول آتے ہیں۔ ان چار ناولوں کو انھوں نے علی گڑھ تحریک کا ایک جزو بن جانے پر تحریر کیا۔ دونوں گروپ کے ناولوں کی تصنیف کے درمیان بارہ تیرہ سال کا لمبا وقفہ ملتا ہے۔ ان کے پہلے دور کے ناولوں میں کہانی اور روداد کردار وغیرہ دوسرے دور کے ناولوں کی طرح اعلیٰ قدر کے نہیں کہے جا سکتے۔ توبۃ النصوح ان کے اس دور کے ناولوں میں سب سے عمدہ ناول مانا جاتا ہے۔ بعض مصنف تو اس کو نذیر احمد کا سب سے عمدہ ناول مانتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ فنی اعتبار سے اس ناول میں ابن الوقت، فسانۂ مبتلا جیسی بلندی اور دقیقہ رسی نہیں ملتی۔ پیکر تراشی توبۃ النصوح میں بھی ملتی ہے لیکن ذہنی اور نفسیاتی پیکریت کی مثال شاذ ہی ملے گی۔ رزمیاتی پیکر خارجی کشمکش کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دور کے ناولوں میں داخلی اور نفسیاتی رزمیہ پیکر بھی کافی تعداد میں ملتے ہیں اس دور کے ناولوں کے کردار اپنے ذہنی اور نظریاتی تصادم اور باہمی کشمکش دونوں سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے فنی معیار کافی بلند ہو جاتا ہے۔ ان ناولوں میں کہانی بھی مرکب نہج کی ہے ایک ہی قصہ بیان ہوتا چلا گیا ہے۔ واقعات داخلی رشتے میں منسلک ہوتے ہیں۔ جس سے اس میں پیوندکاری کا بالکل احساس نہیں ہوتا ہے۔ وہ مرکزی قصے کے تابع اور اس میں پیوست ہیں اور وحدت میں کثرت کا احساس دلاتے ہیں جس سے رنگا رنگی بوقلمونی اور رکھ رکھاؤ بھی نظر آتی ہے اور زندگی کا حقیقی احساس ابھر آتا ہے

(باقی صفحہ نمبر ۱۶ پر)

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

نظم و نثر کے باہمی امتیازات

نثر انسانی تہذیب و ترقی کی داستان ہے مگر نظم تخیل اور جذبہ سے مستعار ہے۔ عجیب بات یہ ہے نثر جو عملی زندگی کیلئے بنیادی اہمیت کی حامل ہے وہ ذہنی ترقی تاخیر سے کرتی ہے مگر شاعری جو تخیل اور جذبہ کے سہارے آگے بڑھتی ہے وہ ہر قوم میں پہلے وجود میں آتی ہے۔ عربوں نے شاعری میں غیر معمولی بلندی اور پختگی حاصل کر لی تھی مگر نثر کا وجود اس وقت ہوا جب آنحضرت نے ذخیرۂ احادیث کے ذریعہ نثر کے ارتقاء کو اعلیٰ مدارج تک پہونچا دیا اور جاہلیت کے کاہنوں کی پر تکلف نثری زبان سے ہٹ کر ایسا اسلوب اختیار کیا جو زندگی اور زمانہ کا ساتھ دے سکے۔ یونان میں بھی پہلے شاعری اور موسیقی کا رواج ہوا بعد میں جب تہذیب نے ترقی کے مدارج طے کرنے شروع کئے تو فکری استدلال اور علمی تعلیمیت نے نثر کی ترقی کی جانب قدم بڑھائے۔ اس کا راز یہ ہے کہ شاعری تخیل، تصور اور استعارہ کی زبان ہے جس کی عظمت تصویری معنویت میں پوشیدہ ہے یا معانی کو مصور کرنے میں۔ اس کے ذرائع تشبیہ، استعارہ اور رمز ہیں شاعری ایک الہامی سی زبان ہے مگر نثر عملی زندگی سے مستعار ہے۔ ہنری برگساں (HENRY BERGSON) نے نثر کو وسعت (EXTENSIVE) اور نظم کو گہرائی (INTENSIVE) کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ نثر مختلف طریقوں سے انسانی ذہانت کو تعبیر کرنے کا ذریعہ ہے علوم انسانی نثر کے پیراہن میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ نظم میں تخیل اور تاثر کی کاری گری ہوتی ہے۔ چونکہ نثر انسانی علوم کی ترقی اور تہذیبی وسعت اور ذہانت کی غمازی کرتی ہے اور یہ مدارج ہر قوم میں دیر سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اسلئے قدرتاً نثر کا آغاز تہذیبی ترقی کی عظمت کا نشان بن جاتا ہے۔ خود اُردو میں شاعری صدیوں سے ترقی یافتہ ہے مگر نثر کا ترقی یافتہ ذخیرہ فورٹ ولیم کالج سے نظر آتا ہے یعنی اُردو نثر کا سرمایہ صرف ڈیڑھ سو برس کی محنت و کاوش پر مشتمل ہے۔

چونکہ نثر دیر سے ترقی کرتی ہے اس لئے ہر زبان میں ابتدائی نثری نمونے غیر ترقی یافتہ زندگی کی وسعتوں سے محروم اور پر تکلف اسلوب میں نظر آتے ہیں۔ اس کے برعکس شاعری کا اعلیٰ نمونہ وہی ہے جب ادبی نثر کا وجود نہ تھا یا وہ نہایت ابتدائی اور غیر ترقی یافتہ تھی۔ عربوں کی جاہلی شاعری مشرقی زبانوں میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے ادب میں میر و سودا کا دور ممتاز ہے۔ حالانکہ اب شعوری حیثیت سے ادب میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کو سمونے اور ان سے اس کو پر نور بنانے کا کام تیزی سے ہو رہا ہے مگر شاعری کے لحاظ سے کلاسیکی ادب کی اہمیت ہر زبان میں مسلّم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاعری عہد وحشت میں ترقی کرتی ہے۔ غیر مہذب دور میں انسان کے اصلی جذبات بغیر تصنع کے سامنے آتے ہیں۔ چونکہ

نثر تہذیبی ارتقاء کی ترجمانی کرتی ہے اس لئے جب تک سماج میں تہذیبی بلندی نہ ہو اس کا وجود پوری طرح نمایاں نہیں ہوتا۔ جو سماج جتنا ترقی یافتہ ہوگا اس کی نثر اتنی ہی جاندار اور زندگی کے رنگ میں رنگی ہوئی ہوگی۔ جنوبی ہند میں جو ابتدائی نثری نمونے ملتے ہیں، شمالی ہند میں سودا کا دیباچہ اور فضلی کی کربل کتھا یہ سب ایسی نثر ہے جو زندگی اور اس کے مسائل کو پیش کرنے کیلئے نامناسب ہے۔ میرامن، غالب اور پھر سرسید نے نثر کو نکھارا بالخصوص سرسید نے مختلف سماجی و معاشرتی مسائل پیش کرکے اس کو وسعت و عظمت بخشی۔

(نثر کا مخاطب دل نہیں عقل ہے اس کا اصل مقصد ذہن انسانی کو متاثر کرنا ہے) وہ محض خیال کو متحرک کرنے کیلئے پیش نہیں کی جاتی بلکہ اس کا مقصد دلائل سے کسی مسئلہ کو واضح کرنا ہوتا ہے۔ تاریخ، تنقید، فلسفہ، منطق، سائنس قانون، طب، مذہب اور جغرافیہ وغیرہ علوم کیلئے نثر کے بغیر چارہ نہیں۔ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل نثر ہے نہ کہ نظم۔ یہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ناول، افسانہ اور ڈرامہ میں خیالی و فرضی قصے پیش کئے جاتے ہیں جن میں انسانی جذبات و خیالات کی کارفرمائی ہوتی ہے مگر اس کی حیثیت شاعری سے بالکل مختلف ہے اس لئے کہ افسانوی ادب میں خود زندگی ہی کی عکاسی ہوتی ہے اور سماجی زندگی کے وہ رجحانات، واقعات، حالات اور امور و مسائل پیش کئے جاتے ہیں جن میں زندگی کا رس اور روغن ہوتا ہے۔ البتہ یہ اعتراض داستان کے بارے میں صحیح ہوسکتا ہے جو محض غیر انسانی، غیر حقیقی اور تخیلی فضا میں پروان چڑھتی تھی مگر جب سے ناولوں کا رواج ہوا عوام کی دلچسپیوں نے سماجی مسائل میں لطف و لذت محسوس کرنا شروع کردیا۔ افسانوی ادب عقل و جذبہ دونوں کو اپیل کرتا ہے اس لئے کہ بغیر جذبہ کے ادب کا وجود ممکن نہیں۔

نثر انسانی زندگی کی سدھار اور علوم کے ارتقاء کا ذریعہ ہے نثر انسانی زندگی کے دھارے بدل دینے کی طاقت رکھتی ہے قلم میں وہ طاقت پوشیدہ ہے جو انسانی سماج اور ذہن کا رُخ بدل سکتی ہے۔ معمولی انسان کو بلندی اور کامیابی سے دوچار کرسکتی ہے اور حیاتِ جاوداں کا مالک بنا سکتی ہے۔

انسان کے اندر جوش، استعجاب اور کسی چیز کا مشاہدہ کرکے جو خیالات دل میں موجزن ہوتے ہیں ان کے اظہار کیلئے نظم کا قالب موزوں تر ہے اس لئے کہ اس میں نہ دلائل پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ استنتاج کی۔ بعض ناقدوں نے یہ غلط فہمی سے سمجھ لیا کہ نظم و نثر میں صرف وزن کا فرق ہے حالانکہ یہ بالکل سطحی سی بات ہے بعض موزوں کلام پر بھی شاعری کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ اصل فرق دونوں کی ماہیت میں ہے ان قیود سے آزادی میں ہے جن سے شاعری کا پیرہن وابستہ ہے۔ شاعری ایک مرکب عمل ہے جن میں بہت سے عوامل کام کرتے ہیں۔ شاعری ایک پیچیدہ عمل ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔

نثر میں پابندیاں نہیں ہیں ہر شخص کسی نہ کسی شکل میں اظہار نثر کے قالب میں کرسکتا ہے مگر شاعری میں اظہار خیال صرف موزوں طبع لوگ کرسکتے ہیں۔ شاعری بلندیٔ خیال کا ذریعہ ہے وہ ہم کو ہمارے ماحول سے نکال کر ایک نئی دنیا میں

ے جاتا ہے وہ کائنات جو شاعر تعمیر کرتا ہے بلاشبہ اس پر زندگی کا عکس ہوتا ہے غموض و رمز کے دبیز پردے ہوتے ہیں اور تشبیہ و استعارہ کا رنگین پیرہن اس کا احاطہ کئے ہوتا ہے۔

یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ نثر کی دو قسمیں ہیں ایک سادہ اور دوسری رنگین۔ سادہ نثر اور شاعری میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن رنگین نثر شاعری سے قریب تر چیز ہے۔ ایسی نثر جس میں خیالی پیکر جذبات کا تموج الفاظ کا حسن، تصویر کشی، احساسات کی فراوانی ہو اور جس میں انسانی جذبات کو مخاطب کیا گیا ہو اور جس پر اشعار ہی کی طرح تشبیہ، استعارہ، رمز و اشارہ، تلمیح اور دوسری زبان و بیان کی صفات موجود ہوں تو ایسی نثر کو شعر منثور کہنا مناسب ہے۔ اس طرز کی نثر مولانا محمد حسین آزاد، مولانا ابوالکلام آزاد اور رجب علی بیگ سرور کے یہاں آسانی سے مل سکتی ہے۔ ایسی نثر میں تمام شاعرانہ صفات موجود ہوتی ہیں اکثر مقفی اور مسجع زبان میں وزن نہیں ہوتا مگر کبھی کبھی سجع میں وزن کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ البتہ بحر اور شاعری کا وزن نہیں پایا جاتا۔ پھر بھی جو اثر اور کیفیت شعر میں ہوتی ہے وہ شعر منثور میں ملنا ناممکن ہے یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ اس طرز کی شاعرانہ نثر تفریحی موضوعات میں تو لطف دے سکتی ہے مگر کسی سنجیدہ یا علمی موضوع کیلئے یہ قطعاً غیر مناسب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علمی موضوعات اور عام مسائل حیات وضاحت کے طالب ہوتے ہیں مگر یہ شاعرانہ نثر اشارے، کنائے، تشبیہات اور الفاظ و تراکیب کے حسن کی مصنوعی کوشش سے زبان کو بوجھل کر دیتی ہے اور مطلب میں غموض و ابہام پیدا کر دیتی ہے شعر کی خصوصیت اختصار ہے وہ وزن، بحر اور موسیقی کے سہارے یاد رہ جاتا ہے مگر نثر کی زبان یاد نہیں رہ سکتی اس کا یاد رکھنا ایک مشکل عمل ہے مگر اشعار آدمی کو ہزاروں کی تعداد میں یاد رہ جاتے ہیں۔

اب میں ہربرٹ روڈ (HERBERT ROAD) کا ایک طویل بیان نظم و نثر کے امتیازات پر نقل کرتا ہوں جو بڑا فکر انگیز ہے۔ ہربرٹ لکھتا ہے کہ

" نثر میں بھی ایک طرح کا آہنگ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ آہنگ اتنا ابھرا اور منظم نہیں ہوتا جتنا کہ شاعری میں ہوتا ہے۔ شاعری تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار۔ شاعری میں الفاظ تخلیقی اور فکری عمل کے دوران پیدا ہوتے ہیں یا دوبارہ جنم لیتے ہیں یہاں لفظ اور خیال کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ خیال لفظ ہے اور لفظ خیال، خیال اور لفظ دونوں شاعری ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نثر تعمیری اظہار ہے تو اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ نثر میں مواد عدم سے وجود میں نہیں آتا بلکہ اس کی حیثیت ریڈی میڈ مواد کی ہوتی ہے۔ اس میں موجود اور مستعمل الفاظ کو ان کے موجود اور مستعمل تلازم میں ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ نثر میں الفاظ کا مفہوم واضح اور متعین ہوتا ہے جبکہ شاعری میں الفاظ ایک بسیط، غیر واضح رمزیت کے حامل ہوتے ہیں اسی وجہ سے شاعری میں معنی اور جذبہ کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔ اگر نثر میں یہ کیفیت پائی جائے تو عیب قرار پائے گی۔ نثر میں وضاحت اور قطعیت پر جو اصرار ہے اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ

مثالی نثر میں بے کیفی اور اکتاہٹ پائی جاتی ہے۔ اچھی نثر میں بھی ایک طرح کی سوچ اور سہولت اظہار بھی ہوتی ہے جو ایک زمانہ کے لسانی ارتقاء کا حاصل ہوتی ہے۔ اچھے نثری اظہار میں آہنگ کی جو متنوع دنیا آباد ہوتی ہے۔ وہ بذات خود ایک ایسا وصف ہے جس سے آزاد سے آزاد شاعری بھی محروم ہے۔ نثر کے آہنگ کے تنوعہ، سوچ، جامعیت اور منطقی ارتکاز کے اوصاف تہذیبی ارتقاء اور لسانی ترقی کے فیضان ہوتے ہیں۔ نثر میں جو وضاحت ہوتی ہے۔ وہ نتیجہ ہوتی ہے ذہنی وضاحت کا۔ یہ ذہنی وضاحت تہذیب کے تمام مرحلوں میں نہیں ملتی بلکہ اس مرحلے پر نظر آتی ہے۔ جب افراد کے ردعمل کے نظام پر عقلیت غالب آجاتی ہے اور اقدار کی ترتیب واضح ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرانس اور انگلستان میں اٹھارویں صدی کو نثر کا دور زریں قرار دیا جا سکتا ہے"[۱]

نثری داستان کی تاریخ کا مطالعہ عربی ادب کے آئینہ میں اور وضاحت سے کیا جا سکتا ہے۔ عصر جاہلی کی نثر مقفیٰ و مسجع تھی عصر اسلامی ایک انقلابی دور تھا جس میں نثر زندگی اور اس نظام زندگی کا ساتھ دینے لگی جو اسلام لیکر آیا تھا بعد ازیں عصر عباسی نثری اسالیب کے ارتقاء کا اصل دور ہے جس میں مختلف و متنوع اسالیب نظر آتے ہیں۔ جب بیت الحکمۃ میں یونانی فلسفہ اور علوم کے ترجمے ہوئے تو اس کے اثرات نثر پر غیر معمولی طور پر پڑے۔ بعض اہل علم کی نثر میں عقلیت پیدا ہوئی اور بعض نے نثر کو منطق میں ڈھال دیا ہر چیز کی کئی قسمیں اور پھر ان قسموں کی کئی قسمیں نتیجہ یہ ہوا کہ عبارتیں چیستاں ہونے لگی۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے عربی میں نثر کی عظمت پر سب سے پہلی تصنیف "ادب الکاتب" تصنیف کی اس نے ایسی منطقی زبان کا اپنے مقدمہ میں مذاق اڑایا ہے اس نے یہ نہایت عمدہ اصول پیش کیا کہ زبان کو عوام کی فہم سے قریب ہونا چاہیئے۔ یہ محض اتفاقی نظریہ نہ تھا اس نے اپنی دوسری کتاب الشعراء میں بھی اس امر پر زور دیا ہے کہ شعر کو عوام کی فہم سے قریب ہونا لازم ہے۔

عصر عباسی کا ایک عظیم نثری فن کار ابن المقفع ہے جس نے بہت سی کتابوں کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا ہے۔ اس کا اسلوب نہایت آسان شیریں اور رواں ہے اس نے نثر کے بارے میں ایک دلچسپ نظریہ پیش کیا ہے کہ مشکل اور ثقیل تحریر سے مردم آزاری ہوتی ہے۔ مگر دلکش و رواں اسلوب سے دل کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ عصر عباسی میں جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اور زندگی میں زوال کے اثرات نمایاں ہونے لگے اسلوب علم بدیع کی صنعتوں سے بوجھل ہوتا گیا حتیٰ کہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں یہ عالم ہو گیا کہ کئی کئی صفحات پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک بات کہنے کے لیے اتنی عبارت، الفاظ، جملے، ترکیبیں اور ذہنی کاوش کی گئی ہے۔ یہی کیفیت شاعری میں بھی پیدا ہوگئی۔ مشہور عرب ناقد ابن کثیر جو دور انحطاط کی ترجمانی کرتا ہے وہ لکھتا ہے۔ عمدہ عبارتیں

---

[۱] ماہنامہ جامعہ جلد ۷۱ شمارہ ۵ مئی ۱۹۷۴ء ص ۲۶۱ - ۲۶۲

سجع و قافیہ ضروری اور مستحسن ہے جرجی زیدان نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ جب تصنع اور تکلف زندگی پر غالب ہو جاتا ہے تو اس کے اثر سے زبان بھی پر تکلف بن جاتی ہے۔ عصر عباسی کی ابتدا سے لیکر دسویں صدی تک نثر نے بڑی ترقی کی زبانِ عام ادیبوں کے یہاں سادہ رہی مگر بعد میں بدیعی صنعتوں نے اس کی فطری کشش ختم کر دی۔

نثر میں صنعت گری وہی صفت پیدا کرتی ہے جو اسکی روح کی مخالف ہے یعنی ابہام اور عدم وضاحت۔ یہ اوصاف شاعری کے ہیں لیکن علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ عمدہ شاعری بھی وہ ہے جو نثر سے قریب تر ہو۔ زبان میں زیادہ توڑ مروڑ نہ کی گئی ہو۔ شاعرانہ زبان تو بیشک الگ ہوتی ہے مگر نثری زبان میں ادبی مسرت ضروری ہے خصوصاً تخلیقی ادب کیلئے پھیکی نثر میں کوئی لطف ہم کو محسوس نہیں ہوتا لیکن جب ہم کوئی جاندار حسین عبارت پڑھتے ہیں جس میں تصنع نہ ہو مگر فطری روانی محسوس ہوتی ہو تو اندر سے دل میں خوشی اور روح میں اہتزاز کی کیفیت محسوس کرتے ہیں اور دل پر انہی جذبات اور احساسات کی بدلیاں چھانے لگتی ہیں جو موسیقی سے یا اچھے شعر سے ہمکو محسوس ہوتی ہیں۔ شاعری کی طرح اگر نقوش تخیل نثر میں مکمل و پرکشش انداز سے پیش کئے گئے ہوں تو وہ انسانی طبائع کو متاثر کرتے ہیں اس لئے کہ حروف و کلمات نفس انسانی میں حرکت پیدا کرتے ہیں۔ اسی بنا پر مشہور عرب مفکر ابو حیان توحیدی کہتا ہے کہ "در اصل کلمات اور حروف طبیعت انسانی کے لئے محرک بنتے ہیں جب یہ نقش و نگار پوری شکل میں ظاہر ہوتے ہیں تو ان میں کشش اور رونق محسوس ہوتی ہے اور اسی بنا پر ایک کلام دوسرے سے بہتر ہوتا ہے قوی کلام دل میں گھر کر لیتا ہے مگر ردی کلام کی طرح دل کے دروازوں سے پار نہیں اتر پاتا"[1]

سیاسی و تمدنی مسائل اور حالات کے لئے نظم کارآمد نہیں۔ نثر انسانی زندگی کی پیچیدگیوں کو وضاحت سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ نثر میں اخبار و رسائل سماج کا مزاج و موقف بناتے ہیں بدلتے ہیں اور رائے عامہ تیار کرتے ہیں ایک اخبار عوام پر جتنا اثر رکھتا ہے ایک شاعر اس کا تصور نہیں کر سکتا مگر ہاں دونوں کا حلقۂ اثر الگ ہے ایک دل و جذبہ پر حاکم ہے تو دوسرا عقل و سیاست پر۔

نثر میں مبالغہ و خیال آرائی کم ہوتی ہے مگر شاعری بغیر مبالغہ کے آگے نہیں بڑھتی۔ مبالغہ حقیقت سے دور کرتا ہے۔ نثر میں مبالغہ کا استعمال اعتدال کے ساتھ روا ہے مگر نظم میں جان اسی وقت پڑتی ہے جب مبالغہ اور جھوٹ کی زیادتی ہو البتہ یہ جھوٹ سچ کے مقابلہ میں نہیں ہے بلکہ شاعرانہ صداقت اور شاعرانہ کذب یعنی مبالغہ ایک وسیع اور ادبی مفہوم رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک عرب شاعر بحتری کہتا ہے ؎

کلفتمونا حدود منطقکم   والشعر یغنی عن صدقہ کذبہ

---

[1] کتاب المقابا۔ ص ۳۱ - ۵۷

(تم ہم کو اپنے منطقی حدود کا مکلف بناتے ہو حالانکہ شعر میں جھوٹ سچائی سے بے نیاز کر دیتا ہے)
لیکن اس سے قبل حضرت حسان بن ثابت نے فرمایا تھا ؎

إن احسن الشعر انت قائله   بیت یقال إذا انشدتہ صدقا

(بہترین شعر وہی ہے جس کو سن کر لوگ کہیں کہ یہ سچا ہے)

عربی میں ایک قول مشہور ہے کہ "احسن الشعر اکذبہ" زیادہ جھوٹا شعر زیادہ حسن رکھتا ہے مگر اس کے برعکس بھی کہا گیا ہے کہ "احسن الشعر اصدقہ" سب سے حسین شعر سب سے سچا شعر ہے۔ یہاں صدق و کذب کی بحث مقصود نہیں بلکہ دراصل یہ دکھانا مطلوب ہے کہ عمدہ شعر مبالغہ سے خالی نہیں ہوتا مگر عمدہ نثر کیلئے مبالغہ ضروری نہیں ہے ۔
بہت سی ایسی عمدہ و شگفتہ تحریریں ہم کو ملتی ہیں جن میں ذرا بھی مبالغہ تصنع اور غیر حقیقی کیفیت نظر نہیں آتی مگر پھر بھی زبان و بیان کا حسن پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ ساماں نظر آتا ہے۔ شاعری میں خیال آرائی ایک بنیادی عنصر ہے مگر نثر میں ضروری نہیں۔ البتہ افسانوی ادب میں تخیل کی زیادہ کارفرمائی ہوتی ہے اس لئے کہ وہ تخلیقی ادب ہے۔ لیکن تاریخ و تنقید میں خیال آرائی کی ضرورت نہیں پڑتی ۔ حق یہ ہے کہ شاعری دراصل خیالی پیکر ہے۔ جس پر زندگی اور حقائق کا عکس نظر آتا ہے مگر نثر میں احتیاط اور تیکنیکی نزاکتوں کے ساتھ تخیل کا استعمال ہوتا ہے۔
نثر اظہار خیال کا سب سے آسان ذریعہ ہے۔ اگرچہ شخصیت، تجربہ، مشاہدہ، فطری صلاحیت، زبان پر گرفت اور مختلف ذہنی، جذباتی، لسانی اور نفسیاتی عناصر و عوامل کے باعث نہ ہر آدمی ادیب بن سکتا ہے اور نہ صاحب اسلوب، البتہ سیدھی سادی زبان میں اظہار خیال ہر شخص کر سکتا ہے۔ سوا ان شاذ لوگوں کے جو اظہار مطلب پر قدرت نہیں رکھتے مگر ایسی مثالیں شاذ ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نثر قدرت کا وہ عطیہ ہے جو زبان کے ساتھ ہی ہر فرد بشر کو عطا کیا گیا ہے اور اس سے کوئی آبی و خاکی محروم نہیں۔ اگر ذرا کاوش سے اس فطری عطیہ کا استعمال کیا جائے تو مافی الضمیر سادہ زبان میں ادا کرنا کچھ مشکل نہیں مگر شاعری کا یہ عالم ہے کہ وہاں ہر منزل ایک کٹھن منزل ہے۔
اسی بنا پر شاعری میں امتیاز حاصل کرنا نہایت مشکل ہے یوں تو برائے شعر گفتن ہزاروں شاعری کرتے ہیں مگر واقعی شاعر کم ہی ہوتے ہیں شاعر جب تک بلندی کا ثبوت پیش نہ کرے اس وقت تک اس کی عظمت مسلّم نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں نثر میں امتیاز حاصل کرنا آسان ہے اس لئے کہ اس میں قیود نہیں، اختصار کی شرط نہیں، بحر، قافیہ اور وزن کا سوال نہیں۔
نظم کے موضوعات محدود ہیں مگر نثر کے موضوعات وسیع سے وسیع تر ہوتے جاتے ہیں۔ اس میں پوری کائنات اپنی روانی، بلندی اور وسعتوں کے ساتھ جلوہ ساماں نظر آتی ہے۔ نثر زندگی اور اس کے مسائل کو براہ راست اور بلاواسطہ بھی گرفت میں لاتی ہے مثلاً ناولوں اور افسانوں میں بالواسطہ زندگی اور

سماج کی ترجمانی کی جاتی ہے مگر صحافت میں بلاواسطہ سیاست اور مسائل حیات پر تنقید ہوتی ہے۔ شاعری صرف ایک مخصوص بلندی، فنی سطح اور دائرہ میں رہ کر مسائل حیات کا نہیں بلکہ ان کے اثرات و نتائج کے بارے میں اشارے یا جذبات پیش کرسکتی ہے وہ روح تو پیش کرسکتی ہے مگر حقیقی تصویر نثر ہی میں اتاری جاسکتی ہے۔ نثر معاشی، سماجی اور معاشرتی ضرورت کو پورا کرتی ہے یہ صلاحیت نظم میں نہیں ہے۔

شاعری زندگی کا جلوہ دیکھتی ہے مگر نثر زندگی میں گھس کر اس کا جائزہ لیتی ہے۔ غرض یہ تار حریر دو رنگ ہیں جن سے ادب اپنی قبائے صفات تیار کرتا ہے اور فن کا جلوہ عام کرتا ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۹ سے آگے) آجاتا ہے۔ اس طرح آخری دور کے ناولوں میں نذیر احمد کا فنی شعور کافی ترقی کرجاتا ہے۔ اس بدلے ہوئے اور ارتقا پذیر شعور کی بدولت ناول کے تسلسل کا احساس ان ناولوں میں اور بھی بڑھ جاتا ہے ناول کا ہر جزو داخلی رشتوں میں گتھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ناول کے تسلسل کو برقرار رکھنے کا فن اس وجہ سے اور بھی ترقی کرجاتا ہے کہ اس دور کے ناولوں کے قصے مختلف (انگریزی) قصوں سے ماخوذ نہیں ہیں بلکہ اکثر طبعزاد ہیں جسکی وجہ سے پیوندکاری اور تسلسل کیلئے خارجی طریقوں کو استعمال کرنے کی کم ضرورت پڑی ہے اور پلاٹ میں آمد کا احساس بڑھ گیا ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۳۹ سے آگے) میں اپنے طور پر سمجھتا ہوں کہ شاعری میں مقامی و آفاقی اور محدود و لامحدود دونوں کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ عظیم شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے اور ماورائے شخصیت بھی۔ عظیم شاعری صرف شخصیت کا مظہر ہوتی نہیں غیر شخصی بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے اس کی آفاقیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ بقول آل احمد سرور غیر شخصی عناصر میں شخصی رنگ کی دھوپ چھاؤں سے کہیں شاعری کی حقیقت عبارت ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ نمبر ۲ سے آگے) انتقال ہوگیا۔ ادبی ٹرسٹ نے ان کے کلام کا مجموعہ "خامۂ دل" کے نام سے شائع کیا۔ تاب ترقی پسند شعراء میں ممتاز تھے۔ غزلیں کہتے اور لحن سے پڑھتے۔ جناب صفی مرحوم کے شاگرد تھے زبان و بیان پر قدرت تھی۔ ہم مرحوم کے پسماندگان کے غم میں شریک ہیں اور مرحوم کی مغفرت کے طالب۔

ادارۂ ادبیات اردو کے امتحانات ۲۸ تا ۳۱ دسمبر منعقد ہورہے ہیں ان کیلئے حسب ذیل مراکز قائم ہوگئے ہیں حیدرآباد سنٹرل جیل۔ جونیئر سرٹیفائیڈ اسکول اورنگ آباد۔ شمس آباد۔ شیوپوری۔ عادل آباد۔ کالیکٹ (کیرالا) کریم نگر۔ کوہیر۔ گنتکل۔ محبوب نگر۔ نارائن پیٹھ۔ نندیال۔ ہاسن (کرناٹک) مختلف مراکز سے تقریباً چار [illegible] امیدواروں نے شرکت کی ہے۔

ڈاکٹر امین چند شرما

مومن کی مذہبی رباعیات

مومن کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن بڑے شاہد باز تھے۔ جوانی اور جوانی کی ہولناکیوں نے ان کی شہرت پر پردے ڈال دیئے۔ اصنام اور دوسرے کافران شوخ و شنگ کی صحبت نے انہیں بالکل نکما کر دیا تھا۔

حضرت شاہ عبدالقادر کے درس و تدریس نے آہستہ آہستہ اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور انہوں نے شاہدبازانہ زندگی سے تائب ہو کر مذہبی زندگی اختیار کر لی۔ مگر اس نئی زندگی میں بھی وہ زاہدِ خشک نہ تھے۔

مومن کے مذہبی کردار کی تشکیل کا آغاز حضرت شاہ عبدالعزیز کی مجلسِ وعظ اور حضرت شاہ عبدالقادر کے مدرسہ سے ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کے وعظ اور درس و تدریس اور حضرت شاہ اسماعیل کی صحبتوں نے ان پر اثر کیا۔

جب حضرت سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد شروع ہوئی تو مومن عملی حیثیت سے اس میں شریک نہ ہو سکے مگر ان کی مثنویوں میں اس کا بھرپور اثر موجود ہے۔

مومن رندِ شاہد باز زبردست حکیم و شاعر تھے۔ نجوم میں بھی ان کو مہارت کامل تھی۔[1]

ان کی غزل عاشق کی کامیاب و ناکام زندگی کا حسین مرقع ہے۔ ان کی اکثر رباعیات میں یہی رنگ ہے۔ آخر عمر میں سید احمد شہید کا ان پر گہرا اثر پڑا اور ان کی ارادت و اثر کی وجہ سے مومن نے توبہ کر لی اور عام ڈگر سے ہٹ کر بہت کچھ کہا۔ ان کی مثنویاں ان کے جہاد کے جذبہ کی آئینہ دار ہیں۔ مثنویوں کے آئینہ میں سچے مومن کی تصویر نظر آتی ہے۔

ملاحظہ کیجئے :۔۔۔

تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　　عروجِ شہید اور صدیق دے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اسی اثر کی وجہ سے وہ اہلِ حدیث مسلک کے قائل تھے۔

سطورِ ذیل میں ہم ان کی رباعیات کے اس رنگ کو بیان کر رہے ہیں۔

چند رباعیات میں ان کے عقاید کی جھلکیاں ملاحظہ کیجئے۔

---

[1] ان نصیبوں پہ کیا اختر شناس کو آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا　　آبِ حیات آزاد صفحہ ۴۲۳ بیاضِ سخن عبدالشکور شیدا صفحہ ۶۸

تحریک جہاد کی مخالفت کرنے والوں کو وہ منافق اور بدعتی کہتے ہیں ؎

یہ چند منافقِ سراپا بدعت　　　ہے کفر و ضلال و فسق جنکی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی امام حق کو　　　گویا کہ جہاد ہے خلاف سنت

معرکہ جہاد میں شرکت ایمان کی دلیل ہے ؎

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایمان　　　ہے معرکۂ جہاد چل دیجئے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز　　　وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

توحید:۔ توحید وجودی کو چھوڑ کر تصوّف میں شعر کہنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ صرف مومن خاں کا کمال ہے۔ کہ انہوں نے توحید شہودی کو لے کر شاعری کی ہے۔

ایک جگہ لکھا ہے:۔

مظہر سے بری ہے کبریائی اُس کی　　　آئینہ گداز خود نمائی اُس کی[2]

"آئینہ گداز خود نمائی" توحید وجودی کے خلاف بہترین شاعرانہ حربہ ہے ؎

مظہر سے بری ہے کبریائی اُس کی　　　آئینہ گداز خود نمائی اُس کی
وہ بندۂ نفس جو انا اللہ کہے　　　زیبندہ اُسی کو ہے خدائی اس کی

دوسری جگہ کہتے ہیں:۔ مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور　　　توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنے کہ بنائے ہیں خدا نے بندے　　　بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

توحید وجودی کو خود پرستی کا حیلہ قرار دیا ہے ؎

مومن یہ اثر سیاہ مستی کا نہ ہو　　　اندیشہ کبھی بلند و پستی کا نہ ہو
توحید وجودی میں جو ہے کیفیت　　　ڈرتا ہوں کہ حیلہ خود پرستی کا نہ ہو

انسان کی عالم بالا تک رسائی دشوار ہے اِس لئے رحمتِ یزداں سے امداد کی التجا کرتا ہے۔

گر ضعف یہی رہیگا مومن خاں کو　　　ہوگی تکلیف رحمتِ یزداں کو
کیونکر پہونچے گی عالم بالا تک　　　دشوار ہو جب تن سے نکلنا جاں کو

مومن نے اہل تقلید کو بُرا کہا ہے ذیل کی رُباعی میں ان کو حیوان کہا ہے ؎

یہ کچھ رہ سنت نہ طریق توحید　　　پھر کیا ہے فقط سب کی یکساں تھید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنے　　　حیواں ہیں حقیقت میں یہ اہل تقلید

---

[1] توحید وجودی۔ ترجمان القرآن آزاد　[2] یہ شعر درج ذیل رباعی مومن کا پہلا شعر ہے۔

دوسری رباعی میں کہتے ہیں ؎

ہر چند نہیں قیاس سے کچھ سروکار　　　پرتو ہے از بسکہ ہوا ایں بیمار
ہر دوا پینے کو مفتی کے حضور　　　تقلید ابوحنیفہ کا ہے اقرار

اہلِ حدیث کے مذہب و طریق کی خوبی کی یوں وضاحت کی ہے ؎

ہے بسکہ محبتِ رسولِ مختار　　　مذہب کو میں سوچتا ہوں لیکن ہر بار
آتا ہے قیاس میں حق اہلِ حدیث　　　ہر چند قیاس سے نہیں ہے سروکار

مومن نے اپنے اہلِ حدیث ہونے کا ذکر فخر کے ساتھ کیا ہے ؎

خالص ہوں محمدی مرا دین اسلام　　　گو رائے صواب ہو نہیں مجھکو کام
تقلید کی ٹھہری تو بتوں کا شیعہ　　　کس واسطے چھوڑ دیجئے افضل تر امام
ارباب حدیث کا میں فرمانبر ہوں　　　تقلید کے منکروں کا سردفتر ہوں
مقبول روایت ائمہ نہ قیاس　　　یعنے کہ فقط مطیع پیغمبر ہوں

کربلا :- مومن خاں کے کلام کے غائر مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دوسرے طریقوں پر سخت چوٹیں کی ہیں۔ رباعیات میں وہ حضرت حسین علیہ السلام کے ماتم میں سیاہ پوش نظر آتے ہیں۔ اس مضمون کی چند رباعیاں ان کے دیوان میں ملتی ہیں مگر رباعی کے لحاظ سے ان کا پایہ چنداں بلند نہیں ؎

روتا ہوں حسینؑ ابن علی کے غم میں　　　ہیں عیشِ جناں کے آرزو اس ماتم میں
حیف آلِ نبی میں کوئی باقی نہ رہا　　　لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

کربلا میں سید الشہدا امام عالی مقام اور ان کے رفقاء پر جو گذری اس کی بازپرس روزِ جزا ہوگی ؎

ہنگامۂ حشر جب کہ برپا ہوگا　　　یوں روئے رسول سو سے اعدا ہوگا
اولادِ نبی پہ ظلم کیا کیا نہ کیے　　　سمجھے نہ یہ تم کہ ہم پہ کیسا کیا ہوگا

شاہِ شہدا نے کرب و بلا کے مصائب و آلام کے ہجوم، بھوک اور پیاس کی شدت میں صبر و رضا کا جو نمونہ پیش کیا ہے۔ تاریخ اس کی مثال سے قاصر ہے امام عالی مقام اور آلِ رسول کا مرتبہ روشن ہے ؎

روشن ہے جو ہے آلِ عبا کا پایا　　　ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایا
قندیل ہے عرش کی جو ہر جان شہید　　　کیا ہے کا شاہ شہدا کا پایا

فوجِ یزیدی لشکر کے سردار ابنِ زیاد اور ابنِ سعد کی سنگ دلی اور بے رحمی پر فریاد کرتا ہے ؎

کیا سخت ابن سعد اور ابن زیاد　　　اولادِ نبیؑ پہ ہے ستم بیداد
فریادِ امام کی کسی نے نہ سنی　　　اللہ نہ سنے مقلدوں کی فریاد

ذیل کی رباعی میں صبر و رضا کے پیکر سیدنا امام حسین علیہ السلام کی وہ تصویر پیش کی ہے جب آپ نہر فرات کو دیکھ ان مخالفین (دشمنوں) پر نظر ڈالتے ہیں جو نبیؐ کے کلمہ گو تھے ؎

امواج فرات دیکھ روئے شبیر | حسرت سے یہ خونناب فشاں کی تقریر
ہیں اپنے ہی امتی لہو کے پیاسے | کیا تشنگی آل نبیؐ کی تدبیر

کربلا میں شہید کرنے کے بعد حضرت امام حسین علیہ السلام کے سر کو یزیدیوں نے ایک نیزہ پر رکھ کر کوفہ و شام کے بازاروں میں گھمایا روئے انور کی تابانی سے یزیدیوں کی سیاہ بختی ظاہر ہو رہی تھی ؎

تابندگی عذار سے فرق امام | تھا جلوہ نما سناں پہ جوں ماہ تمام
یہ حجت ساطع کرامات حسینؑ | افزوں ہوئی تیرہ روزئ لشکر شام

صبر حسینؑ نے حق تعالےٰ کی رضا حاصل کرلی۔

دو دو شہدائے کربلا تو دیکھو | خونریزئ چشم اجرا تو دیکھو
ایسوں سے ہو کیوں نہ حق تعالےٰ راضی | کیا صبر کیا اُن کی رضا تو دیکھو

حیرت کا مقام ہے کہ یزید نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت چاہی۔ گویا تاریکی روشنی سے بیعت کی طالب ہے گمراہ فرزند ید اللہ سے بیعت طلب کر رہا ہے ؎

مردک نے شہنشاہ سے بیعت چاہی | گمراہ نے کس راہ سے بیعت چاہی
مصداق ہوا معنی تبت کا یزید | فرزند ید اللہ سے بیعت چاہی

مومنؔ کی شاعری کے متعلق آزاد اور مولف گل رعنا کی رائیں قابل ملاحظہ ہیں۔ چنانچہ آزاد کہتے ہیں۔

"مومن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اُس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں ہیں کہ اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ اُن کی زبان میں چند وصف خاص ہیں۔ جن کا جتانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجب لطف لطیف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں"[1]

مؤلف گلِ رعنا حکیم عبدالحی نے آزاد کی رائے سے استفادہ کر کے اس میں اس طرح مزید اضافہ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں: "جوہذا

---

[1] آب حیات محمد حسین آزاد صفحہ ۴۳۹ [2] گل رعنا عبدالحی صفحہ ۲۹۱ [3] تاریخ ادب اُردو سکینہ صفحہ ۳۵۹

وخیالات غزل میں بیان کئے جاسکتے ہیں، وہ سب قدما کے حصے میں آگئے اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہوسکتے ہیں، وہ سب ختم ہوگئے، ممکن تھا کہ متاخرین اوس دائرہ سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم کر دیتے تو اونکو زیادہ وسیع اور فراخ میدان مِل جاتا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اوسی محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔[1]

مولانا عسکری اور سکسینہ کی راے قابلِ توجہ ہے۔

"مومن خاں کے ہمعصروں میں مرزا غالب نے اِس میں نمایاں حصہ لیا ہے، مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگار غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں مرحوم اِس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے۔
حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے"۔[2]

اگرچہ مندرجہ بالا اقتباس سے مومن کی شاعری کے متعلق وضاحت ہوجاتی ہے مگر اس امر کا خیال رہے کہ مومن ایک دولتمند امیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مومن کے کلیات میں غزلوں، قصیدوں وغیرہ کے ساتھ رُباعیات بھی موجود ہیں اور اپنی خصوصیات کے مدنظر صنف رُباعی میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں اُن کی رُباعیوں میں عشق و محبت کی روداد ہے اور تصوف کی حقیقت بھی اِس کے علاوہ رُباعیات حضرت امام حسینؓ کے غم کی عکاسی کرتی ہیں۔ مومن کی رُباعیاں اس دور کے انمول نگینے ہیں جن کی چمک، دمک بڑی تابناک ہوتی ہے اور ایسے قیمتی پھول ہیں جو سدا بہار ہوتے ہیں۔

مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پردازی کے لئے لاثانی ہے اُن کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں جذبات نگاری کی ہو بہو نقاشی کرنا اُن کا شیوہ ہے اور یہی چیز اُن کو طرز لکھنؤ سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ رنگین مزاج ہونے کے سبب عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں اُن کی علمی استعداد اور طباعی اُن کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے۔[3] اُن کی مثنویاں سرتا سر نشتر ہیں اور جذبات سے مملو ہیں اور ہیجان قلبی کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں۔[4]

مومن صاحب طرز کی حیثیت سے شعرائے اُردو میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔[5] افسوس ہے کہ اس جامع کمالات ہستی نے صرف ۵۲ سال کی عمر میں سنہ ۱۲۶۸ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔[6]

غرض یہ کہ مومن کی رباعیوں میں مضامین کی ہمہ گیری ملتی ہے۔ اس صنف شاعری میں جہاں انہوں نے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کیا ہے وہاں رندی کو بھی خوب خوب نوازا ہے۔ ان کی رباعیاں مختلف کیفیتوں کی ترجمان ہیں لیکن ان سب میں ایک نمایاں خصوصیت جو انہیں دیگر رُباعی گو شعراء میں امتیاز بخشتی ہے وہ ان کی سرمستی کا بیان ہے اور یہ ترجمانی ہے ان کے مزاج کی۔

۱۔ تاریخ ادب اُردو سکسینہ صفحہ ۲۵۹ ۲۔ ایضاً صفحہ ۲۶۷ ۳۔ ایضاً صفحہ [illegible] ۴۔ ایضاً صفحہ ۱۹۶ [illegible] ۵۔ [illegible] مؤلف میاں خورشید [illegible] کے [illegible] ۶۔ [illegible]

ڈاکٹر اخلاق اثر

احتشام حسین اور اردو ڈرامہ

پروفیسر سید احتشام حسین اردو کے ان چند خوش نصیب ادیبوں میں سے ایک تھے جنھیں ان کی اپنی زندگی میں ہی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ وہ ایک مستند عالم، ناقد، محقق، ادیب اور انسان دوست تھے۔ اہل نظر ان کی علمیت کے قائل تھے اور خاص و عام ان کی انسان دوستی کے دلدادہ تھے۔ ان کے انتقال پر تاثراتی اور تعزیتی پیغامات میں ان کی علمیت اور انسان دوستی کا خاص طور سے ذکر کیا گیا۔ ایسی تحریروں میں ان کے اصل ادبی کارناموں سے زیادہ ان کی شخصیت اور ان سے وابستہ واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ فطری بھی تھا۔ تاثرات لکھے جا رہے تھے پیغامات بھیجے جا رہے تھے۔ مقالات قلمبند نہیں ہو رہے تھے۔ پھر بھی تاثرات یا پیغامات بالکل رسمی بھی نہیں ہوتے۔ ہر موقع پر ایک سی ہی باتیں بیان نہیں کی جاتی ہیں۔ ہر بات کی بنیاد ہوتی ہے اور جب اس حقیقت کا خیال نہیں رکھا جاتا تو ہ تاثرات کی حالت چکبست کے ان شخصی مرثیوں جیسی ہو جاتی ہے جو کسی سے بھی وابستہ کئے جا سکتے ہیں۔

احتشام حسین کو تنقید اور تحقیق کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب سے گہری دلچسپی تھی درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود انہوں نے خاکے، افسانے اور ڈرامے لکھے شاعری کی۔ عام ناقدین کی بات تو الگ ہے، وہ ناقدین بھی جنھیں تخلیقی ادب سے خاص دلچسپی تھی انہوں نے بھی احتشام حسین کی افسانہ نگاری، ڈرامانگاری اور شاعری کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی ہے۔ بات یہاں تک آ پہنچی کہ ان کی ڈرامانگاری کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ لکھنؤ سے شائع ہونے والے اخبار "پانیر" اور ماہنامہ "ترنم" میں احتشام حسین کی ڈرامانگاری کے بارے میں بحث چلی اور یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ احتشام حسین نے نہ تو ڈرامے لکھے اور نہ انھیں اسٹیج کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

اس حقیقت کے شواہد موجود ہیں کہ احتشام حسین کو ڈرامانگاری سے دلچسپی تھی اور یہ کہ انھوں نے ڈرامے بھی لکھے تھے۔ احتشام حسین نے اپنے افسانوں کے مجموعے "ویرانے" کے طبقۂ اوّل کے دیباچہ میں اپنے افسانوں اور اپنی شخصیت کے بارے میں بہت سی باتیں لکھی ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں اپنے شعور کی "حکمت اور جنون" کی کشمکش کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے تحریر فرمایا۔

"میں نے متعدد افسانے لکھے۔ کچھ شائع ہوئے کچھ شائع نہ ہو سکے، بعض پسند کیے گئے بعض ناپسند۔ کچھ لوگوں نے دل بڑھائے اور کچھ نے ہمت شکنی کی۔ میں ہر طرح کے مضامین لکھ رہا تھا۔ ڈرامے اور نظمیں بھی لکھتا تھا۔[1]

---

[1] ویرانے۔ احتشام حسین ص۱۳

ادب لطیف' لاہور کے مدیر نے احتشام حسین کو کچھ سوالات بھیجے تھے جن کے جوابات احتشام حسین نے دئے تھے۔ بعد میں انہوں نے یہ تحریر" اعتبار نظر" میں شامل کرلی تھی۔ اس میں ایک سوال احتشام حسین کی شاعری اور افسانہ نگاری سے بھی متعلق تھا۔ اس کے جواب میں احتشام حسین نے لکھا تھا کہ "...... میں نے شعر اور افسانے بھی لکھے ہیں (افسانوں کا ایک مجموعہ دو تین بار چھپ چکا ہے) تنقید کے علاوہ بعض اور اصناف سے بھی دلچسپی لی ہے۔ شعر اب بھی کسی وقت کہہ لیتا ہوں۔ شاعری یا افسانہ نگاری چھوڑنے اور تنقید نگاری اختیار کرنے کا سوال نہیں۔ ممکن ہے پھر افسانے لکھوں یا شاعری کی رفتار تیز ہو جائے۔ ناول لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ شروع میں کچھ ڈرامے بھی لکھے تھے اب بھی کبھی وقت خواہش ہوتی ہے کہ کچھ ڈرامے لکھوں۔ تنقید کو خاص طور سے اپنانے کا سبب غالباً یہ ہوا کہ ۱۹۳۸ء میں جب یہ سارے کام بہ یک وقت جاری تھے ملازمت ملی یونیورسٹی میں پڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڑھانے کے لئے کچھ زیادہ باقاعدگی سے پڑھنا پڑا ... زندگی کی دوسری فکروں کے بعد جو وقت بچتا تھا وہ اس ایک کام کے لئے کافی نہ ہوتا تھا۔ دوست احباب اخبار اور رسائل بھی تنقیدی مضامین کا مطالبہ کرنے لگے اور آہستہ آہستہ طلب و رسد کا اصول کام کرنے لگا۔[1]

"ساحل اور سمندر" میں بھی امریکہ اور یورپ کے سفر کی روداد لکھتے ہوئے احتشام حسین نے اپنی شخصیت سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں ان سے بھی احتشام حسین کی ڈراما نگاری کا ثبوت ملتا ہے۔

"یونیورسٹی کی تعلیم کے دوران میں نے لکھنا شروع کیا' افسانے' ڈرامے' نظمیں' تنقیدی مقالات' علمی مضامین سب کچھ"[2]

حقیقت یہ ہے کہ احتشام حسین نے یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے بہت پہلے لکھنا شروع کر دیا تھا "ویرانے" کے دیباچہ میں خود انہوں نے تحریر کیا کہ :-

"سنہ ۱۹۳۰ء کی گرمیوں میں جب ہائی اسکول کا امتحان دے کر انتظار کر رہا تھا تو وقت گزاری کے طور پر کوئی افسانہ یا ناول لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ ناول تو خیر ارادے ہی کی منزل میں ختم ہو گیا لیکن دو یا تین افسانے میں نے ضرور لکھے"[3]

سنہ ۱۹۳۱ء میں احتشام حسین مذہبی موضوعات پر بھی لکھ چکے تھے۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ خاکوں کے علاوہ افسانے بھی۔ سنہ ۱۹۴۱ء تک وہ بہت سے ڈرامے بھی لکھ چکے تھے "ویرانے" کے طبع ثانی میں احتشام حسین کی جن دوسری زیر اشاعت' زیر ترتیب اور زیر تصنیف کتابوں کا ذکر ہے ان میں ڈراموں کے مجموعہ " اندھیری راتیں" کا نام بھی شامل ہے" اندھیری راتیں" کے ذکر سے اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین اس وقت تک کافی تعداد میں ڈرامے لکھ چکے تھے۔ اسٹیج ڈراموں کے علاوہ انھیں فلم اور ریڈیو

---

[1] اعتبار نظر۔ احتشام حسین ص۱۵-۱۴ [2] ساحل اور سمندر۔ احتشام حسین ص۱۱ [3] ویرانے۔ احتشام حسین —

ڈرامہ سے بھی دلچسپی تھی" روایت اور بغاوت" کے طبع ثانی میں احتشام حسین نے کچھ تبدیلیاں بھی کی تھیں۔ ان تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں" اس تبدیلی کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن نظر ثانی کرتے ہوئے۔ کچھ ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑی سی ترمیم اس کی افادیت میں اضافہ کرے گی۔ چنانچہ "اکبر الہ آبادی محفل قیل و قال میں" جو ایک ریڈیائی فیچر[1] کی شکل میں لکھا گیا تھا نکال دیا گیا۔ اس کے بجائے چند دوسرے مضامین اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں[2]" حال ہی میں لکھنؤ میں قیام کے دوران جناب شفاعت علی سندیلوی اردو پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ نے میرے سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ احتشام حسین نے بہت سے ریڈیو ڈراموں کے علاوہ احتشام حسین نے ایک اور ڈرامہ "چکبست۔ آزادی کا پہلا شاعر" بھی لکھا تھا جو فروغ اردو لکھنؤ کے ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا[3]۔ تحقیق و تلاش کے بعد اور بہت سے ڈرامے روشنی میں آجائیں گے۔ احتشام حسین نے ڈرامے لکھنے کے علاوہ اسٹیج اور فلم ڈراموں کا براہِ راست مطالعہ کیا۔ "ساحل اور سمندر" کے صفحات میں ان کے تبصرہ اور تاثرات شامل ہیں۔ اسٹیج، فلم اور ریڈیو ڈراموں سے متعلق انہوں نے کئی مضامین لکھے "جدید اردو ڈراما[4]" "جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل[5]" "ڈرامے میں وحدتوں کا مفہوم[6]" "آغا حشر کی ڈراما نگاری[7]" اور "نیا ہندی ناٹک[8]" ڈرامہ کی تنقید کا اہم حصہ ہیں۔

احتشام حسین کی ڈرامے سے متعلق تنقید کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈرامہ کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں تھے اور وہ اس کی عظمت کے لئے فکرمند تھے۔ وہ ڈرامے کے لئے اسٹیج کی ضرورت اور مناسبت پر زور دیتے تھے اردو ڈرامے کے پچاس سال بیت جانے پر بھی ڈرامے کے میدان میں کوئی حالی نذیر احمد، شبلی، سرشار، اقبال اور جوش کے نہ پیدا ہونے کے شاکی تھے یہ بات ضرور ہے کہ انہوں نے ڈرامہ کی جدید تحریکوں کا مفصل مطالعہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ایک انٹرویو میں اینٹی اسٹوری سے متعلق سوال کے جواب میں کہا تھا:—

"اینٹی اسٹوری، اینٹی ناول اور اینٹی تھیٹر وغیرہ منفی تحریکیں ہیں۔ میں نے ان کا زیادہ مطالعہ نہیں کیا ہے لیکن جو کچھ پڑھا ہے وہ اپنے مزاج سے ہم آہنگ نہیں پاتا اور اپنے ذہن سے مطابقت رکھنے والا نہیں پایا ہے[9]"

احتشام حسین نے مختلف اصناف ادب و فن پر طبع آزمائی کی اور ڈرامہ ان میں شامل تھا۔ انہوں نے اس وقت ڈرامے تخلیق کئے جب ڈرامہ "شریف فن" نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انہوں نے ڈرامے پر تنقیدی مضامین اس وقت لکھے جب ڈرامہ پر لکھنے کی طرف عام طور سے لوگ متوجہ نہیں تھے۔ ان کے ڈراموں اور ڈراموں سے متعلق تنقید کا مطالعہ ایک شخصیت اور ایک عہد کا مطالعہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے ڈراموں کو یکجا کیا جائے۔ زمان و مکان کے احساس کے ساتھ ان کا ہمدردی سے مطالعہ کیا جائے اگر ان کے ڈرامے اسٹیج کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہوں تو ان کو ضرور اسٹیج کیا جائے۔

---

[1] ریڈیو فیچر ریڈیو ڈرامہ کی ایک قسم ہے [2] روایت اور بغاوت۔ احتشام حسین [3] نگارشات احتشام حسین۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی۔ آہنگ گیا۔ [4] ادب اور سماج۔ احتشام حسین [5] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین۔ [6] آجکل ڈراما نمبر ۱۹۵۹ء [7] عکس اور آئینے۔ احتشام حسین [8] افکار و مسائل احتشام حسین [9] اعتبار نظر۔ احتشام حسین [10] احتشام سے ایک انٹرویو۔ رام لعل، قاضی عبدالستار، عابد سہیل۔ کتاب اگست ۱۹۶۵ء صلا

ہارون ایوب

اُردو ناول پریم چند کے بعد

ناول نگاری کی صنف اُردو میں مغرب اور مغربی ادب کے اثر سے متعارف ہوئی۔ اس صنف سے مشرقی ذہنوں نے بہت تیز رفتاری کے ساتھ مطابقت پیدا کی اور بہت کم عرصہ میں اسے اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا۔ اردو ناول کا آغاز صحیح معنوں میں پریم چند سے ہوتا ہے۔ پریم چند اور پریم چند کے بعد کے ناول نگاروں نے اس صنف کی طرف سنجیدگی سے توجہ کی چنانچہ اردو ناول نے فن اور مقصد کے لحاظ سے ارتقا کی اتنی منزلیں طے کر لیں کہ وہ علمی مطالعہ کا مستحق بن گیا۔

پریم چند کے بعد جو ناول نگار اردو ناول کے افق پر ابھرتے ہیں۔ وہ سب ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کی قدروں کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ تاہم اگر ان کے فن کا جائزہ لیا جائے تو اشتراکیت کے سائے بھی نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فرائڈ اور ڈی۔ ایچ۔ لارنس جیسے مفکروں کے خیالات اور نظریات کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ پریم چند کے بعد کے ناول نگاروں نے فرد اور سماج کے بدلتے ہوئے رشتوں کو محسوس کیا اور اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔

ان ناول نگاروں میں سجاد ظہیر پہلے ناول نگار ہیں جو دوسروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے مشہور ناولٹ "لندن کی ایک رات" کی حیثیت ادبی سے زیادہ تاریخی ہے اور اس کی اہمیت میں مواد سے زیادہ تکنیک کو دخل حاصل ہے۔ یہ اُردو کا پہلا ناول ہے جو شعور کی رو کی تکنیک سے لکھا گیا ہے۔ بعد میں قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو اپنایا اور "آگ کا دریا" لکھ کر شعور کی رو کی تکنیک کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ قرۃ العین حیدر نے اس تکنیک کو اس طرح سے برتا ہے کہ کرداروں کے داخلی اور خارجی زندگی کے ساتھ ساتھ ماضی اور حال بھی واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے "آگ کا دریا" اردو ناول نگاری میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ قرۃ العین حیدر نے اُردو ناول کو فکر و فن کی انتہائی بلندیوں سے روشناس کرایا ہے۔ اسے بیسویں صدی کا عظیم کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ ہندوستانی تہذیب و تاریخ کے دس ہزار سال کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، ساتھ ہی فلسفہ، ادب اور جمالیات کا بڑا حسین امتزاج بھی "آگ کا دریا" میں ملتا ہے۔ اس لیے آگ کا دریا کو مکمل ہندوستان کی تصویر کہا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بعد شعور کی رو کی تکنیک کا استعمال کئی لوگوں نے کیا لیکن خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی البتہ جستہ جستہ کچھ جیسے عبداللہ حسین کی "اداس نسلیں" اور ذکاءاللہ کی "دود چراغ محفل" اور ڈاکٹر قاضی عبدالستار کے مشہور تاریخی ناول "صلاح الدین ایوبی" میں ملتے ہیں۔ باقی اب تک کوئی مکمل ناول اس تکنیک سے نہیں لکھا جا سکا ہے جیسا کہ "آگ کا دریا"

ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا دور آیا اور اس میں ناول نگاروں نے فرائڈ کے نظریات کے تحت حقیقت نگاری میں اور شدت پیدا کر دی، ساتھ ہی ادب برائے زندگی کی آواز بلند ہوئی تو ادب کی نئی اور پرانی قدروں کا جائزہ بھی لیا گیا تاکہ ادب عوام سے قریب تر ہو سکے۔ عزیز احمد پہلے فنکار ہیں، جنہوں نے اس چیز کو محسوس کیا اور اپنے ناولوں میں پیش کیا، ساتھ ہی ناول کے میدان میں تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے جن سے اردو ناول پہلے سے آشنا نہیں تھا انہوں نے فرائڈ کے نظریات کو بھی اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ جنس اور اس سے پیدا ہونے والی برائیوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تاکہ عوام ان سے آگاہ ہو سکیں۔ درحقیقت انہوں نے نفسیات یا انسانی نفسیات کے تانوں بانوں سے اپنے ناولوں کا پلاٹ تیار کیا ہے۔ عزیز احمد کے ناولوں نے پہلی بار اردو ادب میں ایک دلچسپ ہلچل مچا دی۔ کیونکہ انہوں نے جنسی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ سماج میں پھیلی ہوئی گندگی کو بے نقاب کیا۔ جنسی تحریکات کے سلسلہ میں جسمانی مظاہروں کے ساتھ لطیف سے لطیف اور نازک سے نازک احساس کی وہ لاجواب عکاسی کی ہے جسے اُردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا جو ہمیشہ حسن و مسرت کا احساس دلاتی رہنگی" گریز" "ایسی بلندی ایسی پستی" اور "آگ" ان کے قابل ستائش ناول ہیں "گریز" پہلا اور سب سے زیادہ دلچسپ ناول ہے۔

ممتاز مفتی بھی ان ہی نظریات میں گہرا یقین رکھتے ہیں۔ انہوں نے "علی پور کا ایلی" لکھ کر فرائڈ کے اس نظریہ کی تصدیق کر دی کہ بچپن میں جو بات بچے کے ذہن میں بیٹھ جائے اسے نکالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی تعلیم حاصل کر لے۔ اس لئے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ بچہ لاشعوری حالت میں بہت سے واقعات سے دوچار ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کو بھول جاتا ہے لیکن جنسی معاملات کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہی ایلی کی روئیداد ہے جو ۱۱۸۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ ایلی کے کردار کو بنانے اور بگاڑنے میں ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایلی کے کردار کی کمزوریاں دراصل ان کے والدین کی کمزوریاں ہیں اس لئے یہ ناول ایسے لوگوں کے منہ پر ایک بھرپور طمانچہ ہے جو اپنی اولاد کی پرورش پر دھیان نہیں دیتے اور اپنی عیاشی میں مصروف رہتے ہیں۔ الغرض جنسی موضوعات پر روئیداد کی تکنیک کو اپنا کر ممتاز مفتی نے مسلم متوسط گھرانوں کی لاجواب عکاسی کی ہے" علی پور کا ایلی" اردو ادب میں اہم اضافہ ہے۔

بچوں کی نفسیات، فرائڈ اور مارکس ازم سے متاثر ہو کر عصمت چغتائی نے اپنا ناول "ٹیڑھی لکیر" پیش کیا۔ جو اردو کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے۔ اس میں انہوں نے مسلم متوسط گھرانوں کی پردہ نشین لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ دراصل وہ اس طرح سے مسلم متوسط معاشرت میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب اٹھانا چاہتی ہیں عصمت چغتائی کا اصل موضوع جنس ہے لیکن معاشرے کی اصلاح اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا ہے، جس میں واعظانہ رنگ نام کو نہیں ہے۔ ان کے کردار حقیقی ہیں اور جیتی جاگتی دنیا سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ کہانی بیان کرتی ہیں تو وہ ہماری آپ کی سب کی جانی پہچانی ہوتی ہے اور مسلم متوسط گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی اور

ذہنی الجھنیں مکمل کر سامنے آجاتی ہیں۔ عصمت چغتائی نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور گہرے مشاہدے سے پیش کیا ہے۔

کرشن چندر بھی ترقی پسند تحریک کی دین ہیں۔ ان کا نصب العین اشتراکیت ہے جو ان کے بیشتر ناولوں میں مقصد بن کر ابھرا ہے۔ ان کا ہر ناول کسی نہ کسی مخصوص نقطۂ نظر کو پیش کرتا ہے۔ درحقیقت وہ ہماری سوسائٹی کی خوبیوں، خامیوں اور ناانصافیوں سے خوب واقف ہیں وہ زندگی کی خوشیوں کو چند کے ہاتھوں سے نکال کر عوام میں بانٹ دینا چاہتے ہیں تاکہ مسرتیں چند اشخاص کا حصہ نہ بن کر رہ جائیں بلکہ تمام نسل آدم اس میں برابر کی شریک ہو۔ کرشن چندر انسان دوستی کے قائل ہیں۔

کرشن چندر کے اہم ناولوں میں "شکست" "ایک وائلن سمندر کے کنارے" "گدھے کی سرگذشت" اور "جب کھیت جاگے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے ہر ناول کا انداز جداگانہ ہوتا ہے اور وہ کسی نہ کسی پہلو یا اہم موضوع کی ترجمانی کرتا ہے۔ عمل اور تصادم ان کے ہر ناول میں ملتا ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی ان کے ہر چھوٹے بڑے ناول میں عریاں اور رقصاں نظر آتی ہے۔

کرشن چندر کا انداز رومانی ہے ان کے احساسات اور جذبات کی بنیاد رومان پر ہے، یہاں تک کہ طرز تحریر اور مزاج کا انداز بھی رومانی ہے۔ وہ منظر نگاری کے بادشاہ ہیں۔ شاعرانہ انداز لے کر آئے تھے لیکن نظم کے بجائے نثر حصہ میں آئی۔ اس لیئے قدرتی مناظر کے بیان میں اپنے قلم سے ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ ہو بہو تصویر کھنچ کر سامنے آجاتی ہے

اردو ناول نگاری آزادی کے بعد ایک اہم موڑ پر آکھڑی ہوئی جب فسادات کا سلسلہ شروع ہوا اور قیام پاکستان عمل میں آیا اس موضوع کو بہت سے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ یہ بہت نازک موضوع تھا۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک ناول نگار نے خواہ وہ ہندوستانی ہو یا پاکستانی بہت انصاف سے کام لیا اور حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا اور جو کچھ کہ سچ تھا بلاشبہ پیش کر دیا۔

ایم اسلم کا "رقص ابلیس" رئیس احمد جعفری کا "مجاہد" نسیم حجازی کا "خاک اور خون" قیسی رامپوری کا "خون" "بے آبرو" اور "فردوس"۔ کرشن چندر کا "غدار" رشید اختر ندوی کا "پندرہ اگست" فکر تونسوی کا "چھٹا دریا" اور رامانند ساگر کا "اور انسان مر گیا" کے علاوہ اور بہت سے ناول ہیں جو فسادات کے موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اس میں ناول نگاروں نے موضوع کے ساتھ تو ضرور انصاف کیا ہے لیکن ناول کی تکنیک کے اعتبار سے کوئی جدت نہ پیدا کر سکے بلکہ جگہ جگہ جذباتیت میں بہہ گئے ہیں لیکن یہ جذباتیت صرف اپنی ذات یا اپنے فرقہ تک محدود نہیں ہے بلکہ دونوں فرقوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھا ہے۔ اس لیے پھر ایک بار یہی کہنا بہتر ہوگا کہ ان سب ناول نگاروں نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

فسادات کے موضوع پر قرۃ العین حیدر نے تینوں ناول یعنی "میرے بھی صنم خانے" "سفینۂ غم دل" اور "آگ کا دریا" عبداللہ حسین کا "اداس نسلیں" حیات اللہ انصاری کا "لہو کے پھول" اور خدیجہ مستور کا "آنگن" بہترین اور کامیاب ناول ہیں جو تکنیک اور موضوع کی جدت کے علاوہ پورے معاشرے اور انسان کے درد و کرب کو پیش کرتے ہیں۔ ان سب ہی ناولوں

میں تقسیم ہند کے فسادات ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں" لہو کے پھول" اور "اداس نسلیں" بہت لمبے چوڑے پلاٹ پر مشتمل ہیں۔ یہی سبب ہے کہ "لہو کے پھول" حیات اللہ انصاری کے کانگریس واد کا شکار ہوکر رہ گیا اور "اداس نسلیں" عبداللہ حسین کے آئیڈیل ازم کی نذر ہوگیا، لیکن تقسیم ہند کے واقعات پر اگر دونوں مصنفین کچھ قلوبِ خون کے آنسو روئے ہیں قرۃ العین حیدر کے تینوں ناول اعلیٰ خاندانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مغربی تہذیب سے متاثر ہیں لیکن جب "ہندوستان چھوڑ دو" کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو یہ لوگ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں کیونکہ انگریز حاکموں سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کی طرز معاشرت کو پسند کرتے تھے لیکن دل سے وطن کی آزادی کے خواہش مند تھے اس لیے ہمیشہ ذہنی کشمکش اور نت نئی الجھنوں میں مبتلا رہتے کیونکہ آزادی کے خواہش مند ہونے کے باوجود اس وقت کے سیاسی حالات ان کو یہ اجازت نہیں دے رہے تھے کہ وہ کھل کر میدان میں سامنے آجائیں اور وطن کی آزادی کا مطالبہ کریں۔ اس طرح سے ان کا عیش و آرام اور جاگیریں ختم ہوجانے کے امکان تھے ان سب امیروں کی یہی حالت قیام پاکستان تک قائم رہی۔ وہ کبھی بھی کھل کر اپنے جذبات اور خیالات کو پیش نہیں کرسکے اس کی لاجواب عکاسی: قرۃ العین حیدر کے تینوں ناولوں میں ملتی ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ان کے تینوں ناولوں کا تھیم تقسیم ہند ہے اور اس کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ جو بات "میرے بھی صنم خانے" سے چھوٹ گئی تھی اس کو "سفینۂ غم دل" میں پورا کردیا، اور جو کچھ ان دونوں میں کہنے سے رہ گیا تھا اس کو خاص ترمیم کے ساتھ "آگ کا دریا" میں پیش کردیا۔ لیکن فسادات کے موضوع پر سب سے خوبصورت اور بہترین ناول "آنگن" ہے جس میں خدیجہ مستور نے مسلم متوسط گھرانوں کی زندگی کے ساتھ سیاسی حالات اور قیام پاکستان کے عمل کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے اور وہ ہر اس آنگن کی کہانی بن گیا ہے جس میں انسان اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزارتا ہے۔

راجندر سنگھ بیدی" ایک چادر میلی سی" میں۔ ڈاکٹر قاضی عبدالستار "شب گزیدہ" اور "پہلا اور آخری خط" میں بلونت سنگھ" رات چور اور چاند" میں جمیلہ ہاشمی "آتش رفتہ" میں اور رضیہ فصیح احمد" انتظار موسم گل" میں کسی نہ کسی پہلو سے گاؤں کی عکاسی کرتے ہیں اور پریم چند کی قائم کی ہوئی روایت سے آگے نکل جاتے ہیں کیونکہ یہ سب نئے امکانات اور موجودہ دور کے مسائل کی روشنی میں سوچے اور لکھے گئے ہیں حالانکہ ان میں کوئی بھی "گئودان" کے پائے کو نہیں پہنچا ہے۔ لیکن ان کے موضوع اور انداز مختلف ہیں۔ ان ناول نگاروں نے مسائل کے ساتھ انصاف کیا ہے اور گاؤں کا ماحول تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود جنسی و معاشی الجھنوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور قاری ان کے مطالعہ کے دوران اپنے آپ کو گاؤں کی کھلی فضا میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ان میں ڈاکٹر قاضی عبدالستار ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے گاؤں کے امراء کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور ان کو پوری خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اودھ کو اب تک ہمارے بہت سے فنکار موضوع

بنا چکے ہیں۔ مثلاً سرشار اور قرۃ العین حیدر نے صرف لکھنؤ کے امرا تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھا۔ پریم چند نے کسان اور اس کی زندگی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا لیکن ڈاکٹر قاضی عبدالستار نے گاؤں کے سب سے بڑے آدمی کو ناول کا ہیرو بنا کر پیش کیا جو گاؤں کی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے "شب گزیدہ" اور "پہلا اور آخری خط" اس لحاظ سے جدید ناول ہیں ساتھ ہی ان ناولوں کو جدید اس لیے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے افراد کو طبقات میں تقسیم کر دیا تھا اور افراد اپنے طبقہ کے لیبل سے پہچانے جاتے تھے یعنی زمیندار جابر اور ظالم ہوگا اور کسان مجبوری اور مظلومی کا پیکر "شب گزیدہ" پہلا ناول ہے جس میں زمیندار اور کسان ترقی پسندوں کے بنائے ہوئے خانوں کو توڑ کر نکل آتے ہیں یہاں تک کسان مظلوم اور مجبور ہونے کے علاوہ ایک فرد بھی ہے۔ زندہ آزاد اور طاقت ور بھی ہے۔ جاگیردار جابر اور ظالم ہونے کے ساتھ ساتھ دکھی اور شکست خوردہ بھی ہے۔ اس لیے "شب گزیدہ" کے مطالعہ کے دوران اس سے نفرت پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ وہ "ٹائپ" کردار نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے اور ہماری طرح سانس لیتے ہوئے انسان ہیں۔

"پہلا اور آخری خط" ڈاکٹر قاضی عبدالستار کا دوسرا ناول ہے۔ جو آزادی کے بعد دم توڑتے ہوئے جاگیردارانہ نظام اور اس دور کے نوجوانوں کے ذہنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس ناول کے کردار قدامت پرستی میں مبتلا نظر آتے ہیں لیکن نئی قدروں کا ساتھ دینے کا رجحان بھی نمایاں ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہی اس ناول کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ تعلقدارانہ نظام کی کھوکھلی تہذیب کو بے نقاب کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ڈاکٹر قاضی عبدالستار کے مخصوص طرز فکر اور اسٹائل نے اس ناول کو بھی انفرادی پیکر بخش دیا ہے۔

"تلاش بہاراں" "آبلہ پا" اور "خون جگر ہونے تک" الگ الگ انداز کے حامل ہیں۔ تلاش بہاراں کو جمیلہ ہاشمی نے یادداشت کی تکنیک سے لکھا ہے۔ جو تقسیم ہند پر آکر دم توڑ دیتا ہے۔ اس میں شعور کی رو تکنیک کے برخلاف بے ترتیبی کی جگہ ترتیب لے لی ہے — "آبلہ پا" رضیہ فصیح احمد کا ایک خالص جذباتی ناول ہے۔ جو اپنے دلکش طرز تحریر کی وجہ سے قاری کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے کہانی میں ذرا بھی جھول نہیں ہے۔ واقعات مربوط ہیں۔ "خون جگر ہونے تک" فضل احمد کریم فضلی کا یہ ناول بنگال کے قحط پر مبنی ہے۔ یہ اپنے طرز کا منفرد ناول ہے جس میں کوئی ہیروئن نہیں ہے پھر بھی ناول کا تانا بانا اتنا مربوط ہے کہ قاری کے ذہن کو اپنے محور سے الگ نہیں ہونے دیتا اور یہ احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ ہیروئن کی کمی ہے۔ دراصل قحط کا کرب اتنی مہلت ہی نہیں دیتا کہ قاری کچھ اور سوچ سکے اور ناول ختم ہو جاتا ہے۔ قحط کے بھیانک مناظر کو ناول نگار نے اس قدر دردانگیز انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ قاری کے دل کو متاثر کرتے ہیں اور قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

حال ہی میں شائع ہونے والے ناولوں میں علیم مسرور کا ناول "بہت دیر کر دی" ایک بہترین تخلیق ہے۔

اِن کو ناول کے فن پر پورا عبور ہے۔ کہانی بڑے فطری انداز میں ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے۔ واقعات مربوط ہیں اور ایک کے بعد ایک واقعہ اس ترتیب سے آتا ہے کہ قاری کو ناگوار نہیں گزرتا اور اس کی غیر ضروری طوالت اکتاہٹ بھی پیدا نہیں کرتی۔ ناول کا موضوع بڑے شہروں میں مکان کی فراہمی کا مسئلہ ہے۔ جس کے پس پردہ بڑے شہروں کی کھوکھلی زندگی کو بے نقاب کرتا ہوا ناول سلطانہ کے ایک جملے "بہت دیر کردی" پر ختم ہو جاتا ہے۔ بہت جان ہے اس ایک معمولی سے جملے میں اور نہ جانے کیا کیا پنہاں ہے اس چھوٹے سے جملے میں جو اس ناول کی جان بن گیا ہے۔

الغرض موجودہ دور کے ناول نگاروں نے اپنے اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی ہے جو وقت اور زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ اردو ناول میں آگئی ہیں۔ یہی بات اردو ناول کی قوت اور توانائی کی روشن دلیل ہے۔

آج کے ناولوں میں زیادہ بڑھتی ہوئی انفرادیت، نفسیاتی گہرائی اور بصیرت ملتی ہے۔ ساتھ ہی پرانی قدروں سے انحراف بھی ہے۔ احساسات و جذبات اور خیالات کو اس طرح سے پیش کیا جاتا ہے کہ وہ اہمیت حاصل کر لیتے ہیں اور پلاٹ کے بجائے کرداروں کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ آج کا ناول نگار اپنے کرداروں کی باتیں غور سے سنتا ہے اور ان کی حرکات و سکنات کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کرتا ہے اور یہی احساس و تاثر کو اپنے ناولوں کی بنیاد بناتا ہے۔

افغان اللہ خاں

نواب محمد زکریا خاں رضوی زکیؔ دہلوی
(شاگرد غالبؔ)

نواب محمد زکریا خاں رضوی ۱۸۳۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان اصلاً کشمیری تھا مگر ان کے بزرگوں نے دہلی میں ہی مستقل بودوباش اختیار کرلی تھی۔ زکی کی پرورش ایسے احوال میں ہوئی جو شعر و ادب سے معمور تھا اور ان کے لئے سازگار بھی۔ ان کے نانا (دادا کے بھائی) نواب اعظم الدولہ میر محمد خاں معظم جنگ بہادر "سرور" کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن کا شوق تھا۔ انھوں نے اردو شعراء کا اہم تذکرہ "عمدۂ منتخبہ" تالیف کیا تھا۔ ان کے والد سید محمود خاں بھی شاعر تھے۔ اور محمود تخلص فرماتے تھے۔ زکی اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ والد بزرگوار اور حضرت سرورؔ کے دواوین، مثنویات اور تذکرہ شعرائے اردو "خانہ بربادی کے وقت کچھ بدنہادوں اور بدذات فوجی سرقہ کرلے گئے اور اسکو اپنا لیا۔

زکی کی تعلیم اپنے وقت کے مقتدر علماء کے زیر سایہ ہوئی۔ انھوں نے فارسی، عربی، منطق اور ریاضی کی تعلیم صہبائی اور پنڈت رام کرشن سے حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ محکمہ تعلیمات سے منسلک ہوگئے۔ ان کا تقرر ڈپٹی انسپکٹر برائے ممالک مغربی اور شمالی کی حیثیت سے ہوگیا اس ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے گورکھپور تک سفر کیا زکی نے اپنی زندگی کا آخری حصہ بدایوں میں گذارا اور ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔

زکی نے شاعری میں غالبؔ کی شاگردی اختیار کی۔ زکی اور غالبؔ کے بزرگوں کے مابین دیرینہ مراسم تھے اسی کو بنیاد بناکر زکی نے ان سے کسب فیض کیا۔ زکی غالبؔ کے آخری عمر کے شاگردوں میں سے تھے۔ زکی نے اپنے دیوان کے دیباچے میں اپنی شاگردی کا ایک سرٹیفکٹ بھی شائع کیا ہے۔ اس شاگردی کی سند کا قصہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں۔

"سُنا ہے کچھ لوگ جنھیں شعر و سخن کا ذوق ہے۔ خود کو حضرت مغفور سے شاگردی کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اگرچہ اس سے حضرت مغفور کی شان پر کچھ اثر نہیں پڑتا پھر بھی یہ کام غلط ہے کیونکہ یہ لوگ نہ ان سے براہ راست ملے ہیں اور نہ بذریعہ مراسلہ ہی استفادہ کیا ہے۔ الغرض میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ خود کو استاذ حضرت سے منسلک کروں ایک سرٹیفکٹ ان سے لکھواؤں اور اس کی نقل اس میں (دیوان) شامل کروں تاکہ لوگوں پر ظاہر ہوجائے کہ حضرت ....
استاد کا میرے اوپر کتنا لطف بے پایاں تھا۔"

غالبؔ کی سرٹیفکٹ کی عبارت درج ذیل ہے۔

"سبحان اللہ سرٹیفکٹ لکھنے کا کب اتفاق ہوا۔ میں نیم جاں چند روزہ کا مہماں ہوں۔ مہینہ بھر سے غذا بالکل مفقود ہے۔ صرف گوشت کے پانی پر مدار ہے۔ اگر اٹھوں تو دوران سر سے گر پڑوں۔ سید محمد زکریا خاں بہ سبب میں سید امیر زادہ ہو دو ماں ان کے بزرگ وزارت کا درجہ پا چکے ہیں۔ جاگیر اب تک تھی پھر بعوض جاگیر پنشن مقرر ہوا۔ یہ شخص بذات خود نیک، صاحب علم متواضع۔ دانشمند اور نیک طبیعت ہے اور رنگینی طبع معنی سے طبیعت کو علاقہ اچھا ہے شعر کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ اس فن میں میرے شاگرد رشید ہیں۔"

اسداللہ خاں غالب

زکی نے اپنا دیوان جون ۱۸۹۵ء میں شائع کیا۔ جس کا ترقیمہ یہ ہے "دیوان سراسر ہذیان در ماہ ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ مطابق ماہ جون ۱۸۹۵ء بقالب طبع در آمد و رنگ اشاعت پذیر فت" اس موقع پر فروغ گورگانی۔ مضطر دہلوی و وسیم الہ آبادی اور اسیر بدایونی نے قطعات تاریخ کہے جو دیوان کے آخر میں شامل ہیں۔ اس پر بدایونی کا قطعہ ذیل میں درج ہے۔

صورت نگار معنی مثل زکی نباشد   جان کلیم و غالب روح روان غالب

آب حیات تازہ معجز از کلامش   لفظش بخوبیش نازد و ازشان میرزائی

دیوان او سراسر گویا زبان غالب   در فکر سال طبعش بودم اسیر حیراں

گفتا بگوشش تالف طرز بنان غالب

۱۳ ھ ۱۲

لالہ سری رام نے زکی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے دیوان میں ایسی غزلیات کم ہیں جن میں ایک یا دو شعر مرزا غالب کی یاد دلانے والے نہ ہوں۔ لالہ سری رام کا یہ خیال ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر زکی کے یہاں غالب کی سی بلندی فکر و ندرت تخیل نہیں اور نہ غالب کی وہ سماجی بصیرت ہی ہے۔ جس نے غالب کو آفاقیت بخشی۔ یوں تو زکی نے غالب کی تقلید میں معنی آفرینی کی کوشش ضرور کی مگر چونکہ انکا ذہن غالب کی طرح رسا نہیں اور نہ وہ اس انداز بیان ہی کے مالک تھے جو غالب کو نصیب تھا اس لئے کہ غالب کا وقار بہت کچھ ان کے انداز بیان میں مضمر ہے اسی لئے زکی کے کلام میں وہ جاذبیت پیدا نہ ہو سکی جو ان کے اُستاد کے کلام کی جان ہے۔ مگر اتنا ضرور درست ہے کہ زکی نے اپنی اشاقی اور مضمون آفرینی کے ذریعے غالب کے استعمال شدہ مضامین کو اس طرح نظم کیا ہے کہ وہ صرف کمو معلوم نہیں ہوتے ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ غالب کے اشعار ذہن میں گونج جاتے ہیں ؎

اس آنسو بہانے کی کیا آبرو ہے   جو لخت دل اسے دیدۂ تر نہ آیا   زکی

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل   جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے   غالب

دسمبر ۱۹

میرا جیب تھا ان کے داماں کا ہاتھ — تماشہ سرِ رہ گذر ہو گیا — ذکی

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے — غالب

آخر زیست، راست مقدر نہیں ہنوز — آنکھوں میں دم ہے ہاتھ میں ساغر نہیں ہنوز — ذکی

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے — رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے — غالب

عالم کو تیری طرزِ تغافل دکھائیں گے — اٹھ جائیں پہلے مرگ سے کیوں اسکے در سے ہم — ذکی

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا — غالب

وہی سبزہ وہی وحشت وہی ویرانی ہے — اور کیا دشت میں ہوگا جو مرے گھر میں نہیں — ذکی

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا — غالب

اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب — ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے — غالب

اٹھا جو تیری بزم سے سوئے عدم گیا — عاشق کو دیکھ اور چراغِ حرم کو دیکھ — ذکی

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا — غالب

ذکی اچھی شعری صلاحیتوں کے مالک تھے۔ اگر انھوں نے غالب کی تقلید کے بجائے صرف اپنی ذہنی اپج سے کام لیا ہوتا تو انکا شمار بھی مومن کی طرح "شاعرِ تغزل" میں ہوتا۔ غالب کی شاگردی ذکی نے اختیار ضرور کی مگر ان کا اپنا رنگِ غزل [illegible] قریب تھا۔ ذکی بھی مومن کی طرح تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کم کرتے ہیں۔ ترکیبیں اگر استعمال کرتے ہیں تو سادہ اور شگفتہ ہوتی ہیں وہ اس معاملے میں غالب کے پیرو نہیں۔ وہ پیچیدہ گوئی سے بھی انحراف کرتے ہیں۔

دراصل ذکی کی غزل گوئی اس طرزِ تغزل سے عبارت ہے جس کے سالارِ کارواں مومن تھے۔ اس میں نہ تو میر کا لب و لہجہ اور سوز و گداز ہے اور نہ غالب کی سی پروازِ فکر اور نہ ذوق کی با محاورہ شاعری۔ ان کی غزل کا طرۂ امتیاز (مومن کی طرح) واردات و معاملاتِ عشق ہیں۔ معاملاتِ عشق میں جب تہذیب کا دامن چھوٹ جاتا ہے تو کوئی جرأت ہو جاتا ہے اور کوئی داغ۔ مگر ذکی ایک حسین اعتدال کے قائل ہیں اور یہی اعتدال مومن کی شاعری کی بھی آبرو ہے۔ ذکی نے مومن کی طرح فکرِ شاعرانہ کا استعمال بڑے فنکارانہ ڈھنگ سے کیا ہے۔ ذکی کی مومن سے گہری وابستگی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اس طرح کے اشعار ان کے دیوان میں بھرے پڑے ہیں (انھوں نے دیوان کے سرورق پر بھی مومن سے وابستگی کا اظہار کیا ہے) ؎

غیر کی آنکھیں نکالی جائیں گی — ہاں نہ کرنا روزنِ دیوار بند

تم تو ایسے بگڑ گئے کہ پناہ — غیر کو بزم میں بٹھانے میں

خوش ہو گئے آخر کیوں غرض شوق سے آپ — نہ ہو قبول تمنا مگر جواب تو ہو

میں نے اچھا نہیں کیا مشہور — تم برا کہتے ہو بلا سے کہو

فغاں میں نالے میں سب چرخ کی شکایت ہے　　　تمہارا ذکر نہیں تم ذرا سنو تو سہی

مگر زکی کے کلام میں مومن سے زیادہ زبان کا لطف ہے لکھنؤ میں زبان و بیان کی جو اصلاح ہوئی اس سے غالب و مومن کے شاگرد بھی یکساں متاثر ہوے۔ صاحب شعر الہند کا یہ خیال صحیح ہے کہ "خواجہ آتش کے تلامذہ نے اپنے کلام میں جو لطف زبان پیدا کیا۔ مومن و غالب کے زمانے تک دلی کی شاعری اس سے ناآشنا رہی۔ لیکن ان کے تلامذہ کا دور شروع ہوا تو مومن اور غالب کی پیچیدہ گوئی کا دور ختم ہو گیا اور طرز بیان میں سادگی اور زبان میں روانی پیدا ہو گئی اگرچہ اس دور میں غالب کے بعض تلامذہ کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اپنے استاد کی روش کو باقی رکھا چنانچہ ذکریا خاں زکی فرماتے ہیں سے

نہیں مطبوع زکی ہم کو کلام آہل　　　قابل فہم ترے معنی دشوار نہیں

زکی کے دور تک اردو زبان ارتقاء کی کئی منزلیں طے کر چکی تھی۔ فارسیت اور پرشکوہ الفاظ کے بجائے سلیس اور عام فہم الفاظ غزل میں داخل ہو چکے تھے۔ پیچیدہ گوئی اور ابہام سے احتراز میر کے زمانے سے ہی شروع ہو چکا تھا اور غالباً یہی وجہ تھی کہ زبان دن بدن نکھرتی چلی جا رہی تھی۔ اس لسانی تغیر نے زکی کے لب و لہجہ اور زبان و بیان پہ گہرا اثر چھوڑا۔ ان کے یہاں پیچیدہ گوئی سے جو احتراز نظر آتا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ زکی نے جو مضامین نظم کئے ہیں وہ زیادہ تر وہی ہیں جو ان سے پہلے غزل میں استعمال ہوتے رہے اس لئے انھوں نے غزل کے موضوعات سے احتراز نہیں کیا اور نہ کوئی اضافہ ہی کر سکے وہ بھی اساتذہ کی طرح فنی چابکدستی کا مظاہرہ مشکل ردیفوں میں غزلیں کہہ کر کرتے ہیں۔ اس کا اظہار بھی وہ کرتے ہیں سے

اے زکی ترجمہ مسلم سراسر ہے ردیف　　　اور معنی میں بھی کہتے ہیں سخنور اچھا

زکی نے معنی آفرینی میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہو یا نہ دیا ہو۔ مگر مشکل سے مشکل زمینوں میں غزلیں ضرور کہی ہیں اور اپنی مشاقی اور زبان دانی کا مظاہرہ بھی خوب کیا ہے سے

اور کیا صبر و سکوں پیش نظر ہوتا ہے　　　آنکھ سے پردۂ تدبیر الٹ جاتا ہے

یوں ہی آغاز سے ہے دست و گریباں انجام　　　سلسلۂ صورت زنجیر الٹ جاتا ہے

ردیفوں کا استعمال اور انتخاب زکی کی ذہانت کے ضامن ہیں۔ ان کی ایک غزل جس کی ردیف "دہلی" ہے۔ وہ صرف ایک خوبصورت نظم کہی جا سکتی ہے بلکہ اسے قصیدہ دہلی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

نہ پوچھ اے دل کہ روح پرور ہوئی ہے کیا کچھ بہار دہلی
دم مسیحا۔ نسیم جنت بنا ہے اڑ کر غبار دہلی
ہوے ہیں مائل یہ صنعتوں پر وہ لٹ گئے ہیں لطافتوں پر
زمین پہ انساں ہیں صید دہلی فلک ملک پر شکار دہلی

غزل کا یہ انداز زکی کا اپنا انداز تھا جو مومن کو بھی نصیب نہ تھا۔ زکی کا یہ رنگ اس بات کا ضامن ہے کہ زکی نے اپنی راہ

الگ نکالنے کی کوشش ضرور کی یہ ضرور صحیح ہے کہ وہ پوری طرح اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور نہ اپنا کوئی انفرادی رنگ ہی پیدا کر سکے۔ مگر ان کے شعری اکتسابات ایسے نہیں کہ انہیں بالکل فراموش کر دیا جائے۔ ان سے اس دور کے شعر و ادب اور خصوصاً لسانی خصوصیات پر بڑی حد تک روشنی پڑتی ہے۔ ان کے یہ اشعار اردو غزل کے اچھے اشعار میں شمار کئے جائیں گے۔

نہیں ہے عشق کی سرگشتگی میں ساتھ ضرور — ہمیں تو خاک اڑانی ہے۔ کارواں نہ سہی

فسانہ ہائے محبت کو بے اثر کہہ لو — سناؤں گا جو طبیعت پہ اختیار ہوا

کوئی غمخوار نہیں اپنا شب تنہائی — ہاں مگر بہر تسلی غم ہجراں ٹھیرا

پھیلاؤ نہ یوں شانہ ہی پر زلف کو دیکھو — کیا حال ہے دیکھو تو نزاکت سے کمر کا

خار و خس ہے نہ کہیں شاخ و شجر کی صورت — دیکھی وسعت دل ویراں ہی میں گھر کی صورت

اس خرابہ کو تھا آباد نہ ہونا نہ ہوا — حسرتیں دل سے نکلتی ہیں پشیماں ہو کر

مجھ سے دیوانے کو کیا دیر و حرم سے سروکار — لے پھرتی ہے مگر جلوۂ دیدار کی حرص

وہ رنگ و بو نہ سہی ان کی یادگار تو ہیں — تری نظر میں ہیں داغ خزاں بہار کے پھول

آج کیا جانے کہا کیا وہ بھی سن کر رو دئے — ورنہ اظہار تمنا میشتر کرتے تھے ہم

دیکھو گے مہتاب کی حیرت ابھی ٹھہرو — آنے دو ذرا چاندنی دیوار کے نیچے

شرف الدین ساحلؔ

"فنکار کی شخصیت ٹیگور کی نظر میں"

فن فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے یا شخصیت سے ماورا؛ مغربی تنقید میں اس مسئلہ پر گرما گرم بحثیں ہوئی ہیں۔ لیکن ہندوستانی جمالیات میں یہ مسئلہ نہیں اٹھایا گیا۔ ٹیگور نے فن اور شخصیت کے معمہ کا بڑا سنجیدہ اور جامع حل پیش کیا۔ ٹیگور اس جمالیاتی مسئلہ کو انسانی ذات کی نشو و نما سے منسلک کرتے ہیں۔ ٹیگور کا نظریۂ شخصیت مغربی جمالیات سے مقابلتاً زیادہ وسیع و جامع ہے۔

مغرب کے پیمانہ نقد کے مطابق شاعری احساسات کے اظہار کا نام ہے اور احساسات کا کامیاب اظہار حسن کہلاتا ہے۔ عمل اظہار میں شاعر محض ایک آلۂ کار ہے۔ شاعر کا خلوص لمحاتی (PASSING) ہوتا ہے۔ قاری شعر کو فنکار کا ذاتی تجربہ متصور کرتا ہے لیکن اسکے باوجود شاعر کی شخصیت کے خد و خال کو شعر کے آئینہ میں متعین کرنے سے قاصر ہے چونکہ ایک سچا فنکار اپنی شخصیت کا اظہار نہیں کرتا۔ تجربہ و تجزیہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ شاعر کسی خاص قسم کی شخصیت یا خاص نوع کے فکر و احساس کا شعر میں اظہار کرنے کی بجائے خلوصِ فن کے ساتھ ہر اقسام کے خیالات اور احساسات کو ترجیح دیتا ہے۔ بقول کیٹس (KEATS) ایک عظیم شاعر شخصیت رکھتا ہے اور نہ متعین طرزِ فکر و احساس! گویا فنکار کے پاس بغرض اظہار نہ کوئی فلسفہ ہوتا ہے اور نہ کوئی پیام!! الیٹ[1] (ELIOT) کے ہاں کیٹس کی تائید ہی نہیں بلکہ بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بالفاظِ دیگر شاعری فنکار کی شخصیت کا عکس نہیں ہوتی بلکہ یہ غیر شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔ شاعر "خود۔ ایشارہ" ہوتا ہے نہ کہ "خود اظہار"۔ شاعر کا ذہن کیمیائی عمل میں CATALYST کی طرح خیال و جذبہ کے اتصال کو جنم دیتا ہے جس کے ردِ عمل یعنی نظم میں اس کی شخصیت کا شائبہ تک موجود نہیں ہوتا۔ الیٹ کی طرح کروچے بھی شعری غیر شخصیت کا قائل ہے[2]۔"

فن و شعر کی غیر شخصیت کا نظریہ آج مغرب میں مقبولِ عام ہے جسے مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے۔

الف :۔ عمدہ شاعری میں شخصیت کی جھلک نہیں ہوتی۔

ب :۔ غیر شخصیت شعری اپیل کے دائرہ کو وسعت دیتی ہے۔

ج :۔ جو شاعری فنکار کی شخصیت کا اظہار نہیں ہوتی وہ اخلاقی معنوں میں "مخلص" نہ سہی لیکن جمالیات میں اس غیر خلوص (INSINCERITY) کو خامی کی بجائے ایک خوبی تصور کیا جاتا ہے۔

---

[1] رومانیت اور انفرادی صلاحیت [2] جمالیات، باب ششم

ٹیگور کے جمالیاتی مفروضات مغربی فنکاروں سے بالکل جداگانہ ہیں۔ ٹیگور کے نزدیک :-

(۱) شاعری فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے :

(۲) وسیع اپیل کی حامل شاعری ترسیل کے مسئلہ سے دوچار نہیں ہوتی چونکہ فنکار کی شخصیت EXCLUSIVE نہیں بلکہ INCLUSIVE ہوتی ہے۔

(۳) فنکار شاعری میں خود اپنی شخصیت کا اظہار کرتا ہے اور اخلاقی اعتبار سے اس میں خلوص کا فقدان نہیں ہوتا۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ٹیگور کی نظر میں شخصیت کیا معنی رکھتی ہے؟ میری رائے میں ٹیگور شخصیت سے مراد "فنکار کی ذہنی زندگی" سے لیتے ہیں۔ فنکار کی شخصیت اُمنگ و تجربہ، فکر و احساس اور ذوق و شعور کی باہم وحدت و ہم آہنگی کے ذریعہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ ادب فنکار کی بنیادی شخصیت کی جلوہ گری کا نام ہے۔ ٹیگور نے اس شخصیت کو "فنکار کا بنیادی کردار"[۱] "حقیقی نفس"[۲] اور "سچی انفرادیت"[۳] جیسے مختلف ناموں سے یاد کیا ہے۔

ہر فنکار کے خیالات و احساسات میں ایک قسم کی وحدت پائی جاتی ہے جسے ہم "بنیادی فطرت" کہتے ہیں۔ اسی کو "کردار کی وحدت"[۴] بھی کہا جاتا ہے۔ انسان کے ذہنی عمل میں وحدت کا یہ اصول غیر مدرکہ ہوتا ہے۔ البتہ طرزِ عمل کے ذریعہ کسی فنکار کی اس "وحدت" کو بخوبی پہچانا جا سکتا ہے۔

ٹیگور اس نظریہ کے حامی ہیں کہ فنکار کی شخصیت کا اظہار اُس کی تحریروں میں موجود ہوتا ہے "ہمارا مطالعہ و مشاہدہ اور فکر و نظر مجموعی طور پر ایک بنیادی کردار کا حامل ہوتا ہے جس کی بنیاد پر ہم دنیا سے وابستہ یا غیر وابستہ، قومیت پسند یا آفاقیت پسند، مادہ پرست یا روحانیت پرست اور گفتار یا کردار کے غازی کہلاتے ہیں۔ مرا بنیادی کردار مری تحریروں میں واضح یا پوشیدہ صورت میں ضرور موجود ہونا چاہیئے۔ مری تحریر چاہے نغمہ ہو یا اور کوئی شے، یہ میرے ذہن کی لمحاتی کیفیت کی آئینہ دار نہیں ہوتی بلکہ اس پر میرے نفس باطن کے گہرے نقوش مرتسم ہوئے ہیں"[۵]

عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈرامائی تخلیقات میں شخصیت کا بہت کم عنصر موجود رہتا ہے، مگر ٹیگور کہتے ہیں "شکسپیر کے کردار انفرادیت کے مالک ضرور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن میں فنکار کے کردار کا کوئی عنصر موجود نہیں[۶]۔ اسی طرح ڈانتے کی شاعری میں اُس کی شخصیت و زندگی غیر منقسم طور پر تحلیل ہو گئی ہیں۔ دونوں کے بیک وقت مطالعہ کے بعد ہی ہم اُن کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں"[۷]

تخلیقات میں اُبھرنے والی شخصیت، فنکار کی سوانحی زندگی یا اُسکے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کہیں زیادہ سچی اور حقیقی

۱؎ SAHITYER PATHE صفحہ ۱۶۶ ۲؎ ایضاً صفحہ ۱۶۳ ۳؎ ایضاً صفحہ ۶۸ ۴؎ SAHITYER PATHE صفحہ ۱۶۹

۵؎ ایضاً صفحہ [illegible]

ہوتی ہے۔ ٹیگور کے الفاظ میں "تخلیقِ ادب، فنکار کے بنیادی کردار و مزاج کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ مختلف حالات میں انسان کے مختلف اجزا اور پہلو سامنے آتے ہیں۔ انھیں اجزا سے اُس کا نقطۂ نظر تشکیل پاتا ہے۔ انسان کے مشاہدہ سے سائنس اور فکر سے فلسفہ وجود میں آتا ہے تو ادب انسان کی ہیئت اجتماعی سے جنم لیتا ہے[1]۔ شاعری فنکار کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔" والمیکی کے قارئین نے شاعری کی بنیاد پر جو سوانح حیات ترتیب دی ہے اُس کی صداقت والمیکی کی تاریخ حیات سے کہیں زیادہ باوزن ہے[2]۔ ٹیگور کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ "فنکار کی شخصیت کو اُس کی تخلیقات سے الگ نہ کیا جائے۔ البتہ شخصیت کی موجودگی کو محسوس کرنا ضروری ہے[3]۔ شخصیت کی صداقت ادب کی صداقت ہے[4]۔ ادب حقائق کا ایسا ریکارڈ ہے جس میں فنکار کی انا کے سارے رنگ منعکس ہوتے ہیں[5]۔"

اب اس پہلو کی جانب آئیے کہ ایک عظیم شاعر یا فنکار کی شخصیت ہماری گرفت میں کیوں نہیں آتی؟ ٹیگور کی نظر میں فنکار کی شخصیت اتنی ہمہ گیر ہوتی ہے کہ اُس میں کئی آفاق گم ہوتے ہیں۔ عظیم فنکار کا نقطۂ نظر اتنا بلند و برتر ہوتا ہے کہ اُس کی کئی وسعتیں اور چوٹیاں ہوتی ہیں جنھیں سر کرنا ضروری ہے ورنہ وہ ہمارے فہم و ادراک کے دائرہ میں داخل نہیں ہو پاتا۔ عظیم فن پارہ مخصوص نظریہ یا محدود وحدت کا حامل نہیں ہوتا۔ اسی لئے جب ہم اپنے نظریات کی روشنی میں اس کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہر قدم اور ہر سطح پر یہ متضاد نظر آتا ہے۔ لیکن فن پارہ کے مافی الضمیر میں فنکار کا دل دھڑکتا ہے۔ شکسپیر کی تخلیقات میں انفرادیت کو تلاش کرنا مشکل ہے چونکہ یہ انفرادیت وسعت گیر ہے۔ اکثر اوقات ہم اس مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ کسی فنکار کی تخلیقات میں اُس کی مرکب شخصیت جلوہ گر نہیں ہوتی[6]۔ بالفاظِ دیگر فنکار کی شخصیت کا تنوع ہمیں اُس کی شخصی وحدت کو پہچاننے سے باز رکھتا ہے۔ ٹیگور کا ایقان ہے کہ عظیم فنکار قوتِ تخیل کے باعث ایسی جامع شخصیت کا مالک بنتا ہے جو ہمہ گیر انسانی جذبہ کی ترجمان ہوتی ہے۔

عظیم فنکار کی شخصیت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اُس کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کی بلندی تک پہنچنا پڑتا ہے۔ فنکار کی تخلیقات میں تضادات اور اُس کے کردار کی نشاندہی سے ہمارے مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی۔ نقاد کا فرض تو یہ ہے کہ وہ اِن تضادات پر توجہ صرف کرنے کی بجائے فنکار کے تخلیقات کی بنیادی ہم آہنگی کو اُجاگر کرنے کی سعی کرے۔

ادبی شاہکار آفاقیت کے حامل ہوتے ہیں۔ آپ شاید یہ سوال پوچھیں کہ ادب فنکار کی شخصیت کا اظہار ہے تو دوسرے اسکو کیسے پسند کریں؟ ترسیل کے اس مسئلہ کے ممکنہ حل کا ہم تصور کر سکتے ہیں۔ فنکار جامع شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ بنی نوع انسان کے عالمی و آفاقی خیالات و احساسات کا اظہار فنکار کی تخلیقات میں ملتا ہے جس کی داد و تحسین عالمی سطح پر

---

[1] SAHITYER PATHE صفحہ ۱۶۳-۶۴ [2] ساہتیہ، صفحہ ۱۶۴ [3] ساہتیہ، صفحہ ۱۶۴ [4] ساہتیہ، صفحہ ۱۶۶
[5] ساہتیہ سوروپ صفحہ ۶۳ [6] SAHITYER PATHE صفحہ ۱۶۸

ہوتی ہے۔ ان بیانات کے باہمی تضاد کہ ادب شخصیت کا اظہار ہے اور اس کی عالمی اپیل ہوتی ہے ٹیگور نے مفاہمت پیدا کی ہے۔

اب فنی خلوص کے پہلو کی جانب آیئے جس کا تعلق فنکار کی شخصیت سے ہے کیٹس اور کروچے "فنی خلوص" میں اعتقاد نہیں رکھتے چونکہ ان کے خیال میں فنکار لمحاتی طور پر کسی خیال یا احساس سے تعلق پیدا کرتا ہے اور بعد میں اس سے لاتعلق ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس ٹیگور فنکار سے پیہم خلوص کا مطالبہ کرتے ہیں چونکہ خیالات و احساسات "گزری گھٹائیں (PASSING MOODS)" نہیں بلکہ اس کی شخصیت کا اظہار ہیں۔ شخصیت کی چھاپ ہر فنکار کے تخلیقات میں نظر آتی ہے۔ ٹیگور شکسپیر کو عظیم شاعر تسلیم کرتے ہیں کیونکہ اس کی شخصیت اس کے تخلیق کردہ کرداروں میں رقصاں و جولاں ہے[۱]۔ فلسفی کی شخصیت فلسفہ کی داخلی لپیٹ سے آزاد ہوتی ہے لیکن اس کے برخلاف شاعر کی شخصیت شاعری کی داخلی لپیٹ سے ماورا نہیں ہوتی۔ اس لئے شاعر کا پر خلوص ہونا ضروری ہے۔ فنکار غیر معمولی قوت تخیل کے ذریعہ حیات و کائنات کا ایسا درک حاصل کرتا ہے جس کی نوعیت دائمی ہوتی ہے۔ فنکار حیات و کائنات کا عرفان ہی نہیں حاصل کرتا بلکہ اپنے کرداروں کے باطن کا مشاہدہ بھی کرتا ہے۔ اس بنیاد پر ٹیگور کہتے ہیں "کردار فنکار کی اولاد ہیں تو وہ ان کا باپ ہے۔ دونوں گہرے رشتہ میں منسلک ہیں[۲]" غرض ٹیگور نے فن میں خلوص کے عنصر پر بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے۔

ٹیگور کے عطا کردہ حل کے فلسفیانہ پہلو کی وضاحت کے بغیر شاید فنکار کی شخصیت سے متعلق ہماری بحث نامکمل رہ جائیگی۔ ٹیگور فنکار کی انفرادیت میں اعتقاد رکھتے ہیں حتیٰ کہ ایک عظیم فنکار اپنی جا[ذب]یت کے باعث آفاقیت سے ہمکنار ہوتا ہے۔ ٹیگور کا نظریہ منطقی اعتبار سے "خود متضاد" معلوم ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی اساس اپنشد پر رکھی گئی ہے یعنی نفس (SELF) درحقیقت آفاقی جذبہ ہے جسے ہماری لاعلمی نے "خودی یا انا" کے محدود دائرہ میں مقید کیا ہے۔ یہ خودی نشوونما پاکر برہما کا روحانی درجہ حاصل کرسکتی ہے۔ ٹیگور نے خودی کا جا بجا درس دیا ہے۔ خودی کا تذکرہ خصوصی طور پر "سادھنا" میں ملتا ہے۔ اس روحانی نظریۂ خودی کو جمالیات پر منطبق کیا جائے تو فنی شخصیت کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ یعنی ایک فنکار اپنی خودی کے مخلصانہ اظہار کے دوران بیک وقت ایک فرد اور آفاقی ہستی ہوتا ہے۔

"خودی یا انفرادیت جتنی مستحکم ہوتی ہے اسی قدر یہ آفاقیت کی طرف مائل ہوتی ہے۔ شخصیت کی عظمت جھیل کی گہرائی کی طرح اس کے تعمق میں پوشیدہ ہوتی ہے[۳]۔"

فنکار کی شخصیت جس قدر جامع ہوتی ہے اسی قدر فن میں خلوص ہمہ گیری اور آفاقیت پیدا ہوتی ہے۔ انفرادی انا ہمیشہ نشوونما پاتی اور خارجی کائنات کو جذب کرتی رہتی ہے۔ خودی اور کائناتی جذبہ کے وصال سے فنکار کو حاصل ہونے والی مسرت ہی ادب کہلاتی ہے[۴]" یا خودی کی نشوونما ادب کی نشوونما ہے۔

(بقیہ سلسلہ صفحہ ۱۲ پر)

ص[۱] ص[۲] SAHITYER PATHE صفحہ ۱۲۸ صفحہ ۱۲۳ ص[۳] سادھنا صفحہ ۵۹

نواب سعادت جاہ بہادر سعادت

(۱)

نظر کے اِدھر تیر چل ہی گئے
اُدھر دل کے ارماں نکل ہی گئے
کئے دل نے سب روکنے کے جتن
مگر اشک آنکھوں سے ڈھل ہی گئے
وہ شمشیرِ قاتل کہ کھینچنے لگی
گئے بھی تو ہم سر کے بل ہی گئے
غرور اُن کو تھا اپنی رفتار پر
قیامت سے آگے نکل ہی گئے
نہ بہلے نہ بہلے وہ پہلے بہل
بہلتے بہلتے بہل ہی گئے
گئے اُن کو مدت ہوئی آج بھی
یہ محسوس ہوتا ہے کل ہی گئے
سعادت نہ بدلو تم اپنی روش
بدلنا تھا اُن کو بدل ہی گئے

(۲)

کرمِ ساقیٔ جواں ہے ابھی
اک تماشا سرِ مغاں ہے ابھی
چرخ چکرا رہا ہے یاں لب پر
حرفِ آغازِ داستاں ہے ابھی
دن نکل آیا رات ختم ہوئی
سارا عالم دھواں دھواں ہے ابھی
حشر میں بے خبر بلائے جاتے ہیں
زندگی تیرا امتحاں ہے ابھی
عافیت کا پتہ نہیں کوسوں
اس زمیں پر تو آسماں ہے ابھی
کچھ کٹیلی سی کچھ رسیلی سی
اُن کی چلتی ہوئی زباں ہے ابھی
اے سعادت کہیں بگولا سا
دیکھتا میرِ کارواں ہے ابھی

وفا کرتپوری

میری نظر میں موت ہی سے سکوں کا جام ہے
جسے حیات کہہ دیا وہ گردشوں کا نام ہے

وہ کیا بدل گیا کوئی بدل گئی ہے زندگی
سحر میری سحر رہی نہ شام میری شام ہے

گذر رہی ہے زندگی عجیب رنگ و روپ میں
شعور آگہی، نہ اب جنوں کا اہتمام ہے

سنے کے باوجود بھی جو ہے لبوں پہ خامشی
اسے نہ مصلحت کہو یہ خود سے انتقام ہے

اسی پہ ناز ہے تجھے یہی ہے نظمِ میکدہ
نہ اہتمامِ میکشی نہ احترامِ جام ہے

تمہیں کہو یہ کیا ہوا جو رنگ ہے اڑا اڑا
نہ وہ نظر میں شوخیاں نہ لب پہ ابتسام ہے

یہ اپنا اپنا ظرف ہے یہ اپنا اپنا مشغلہ
انھیں جفا و جور سے مجھے وفا سے کام ہے

شریف الدین شاکر کرتپوری

جو دل نہ دردِ عشق کا حامل دکھائی دے
وہ کیا نگاہِ ناز کے قابل دکھائی دے

پُرپیچ کس قدر ہیں محبت کے راستے
جادہ دکھائی دے ہے نہ منزل دکھائی دے

دیکھا ہے ہم نے شہرِ نگاراں میں گھوم کر
معصوم جس کو جانیے قاتل دکھائی دے

اس بحرِ غم میں ڈوبنے والے گئے ہیں پار
طوفاں کی گود میں جیسے ساحل دکھائی دے

یوں لگ رہا ہے ترکِ تعلق کے بعد بھی
دل جیسے اُن کی بزم میں شامل دکھائی دے

اُس اک نگاہِ لطف کے قربان جائیے
جو مقصدِ حیات کا حاصل دکھائی دے

گھر گھر بلا سے اس کی پریشاں ہوا کرے
بے نور جس کو انجمنِ دل دکھائی دے

شاکر غمِ حیات کا مارا وہ کیا کرے
[illegible] مشکل دکھائی دے

نصیر پرواز

شہرت کی صلیب چاہتا ہوں
اے عظمتِ فن بے ریا ہوں
پلٹا ہوں شہرِ آگہی سے
لمحوں کے گناہ گن رہا ہوں
وہ آتشیں رخسار بجھ چکے ہیں
اب اپنے ہی ہونٹ کاٹتا ہوں
آندھی سے مقابلہ تھا میرا
ٹوٹا تو نہیں اکھڑ گیا ہوں
تو خود کو بے نقاب مت کر
میں اپنی اوقات پہچانتا ہوں
وہ حزن جو متاعِ جاں تھا
سب چھن گیا کہ رو لیا ہوں
اپنی ہی بلندیوں سے گر کر
میں آسماں کی سمت دیکھتا ہوں
یہ تصادم رنگ و نور کیسا
جب آنکھ ہی بند کر چکا ہوں
ہر جسم نے بچا لیا تھا دامن
پتھر سے آ کر لپٹ گیا ہوں
ہر شخص کو یقین ہو چکا ہے
میں شاید اپنے آپ میں چھپا ہوں
پر و آفہ بچکے سب ہی گزرے
میں کب سے راستے میں پڑا ہوں

نواب میر لٰسین علی خاں

رُخ پہ اک خالِ سیہ زُلفِ دوتا ہو جیسے
اک بلا سامنے اور ایک بلا ہو پیچھے
پہلے تو اسکو سنا اپنی وفا کے قصے
دلِ ناداں گلۂ جور و جفا ہو پیچھے
تو وہ منزل ہے مگر قافلے والو دیکھو
وہ جو رہبر تھا کہیں رہ نہ گیا ہو پیچھے
آج یوں نکلے مری عرضِ تمنّا کا جلوس
سامنے عزم مرا میری دُعا ہو پیچھے
اس کڑی دُھوپ میں بھی ظلمتِ شب ساتھ رہی
جیسے اک سایہ کہ چپ چاپ کھڑا ہو پیچھے
خون کو تیل کی قیمت سے بھی ارزاں کر دو
کسے معلوم کہ سودا یہ ہوا ہو پیچھے
محتسب ہم نے تو دیکھا نہیں واعظ کو مگر
دیکھ شاید وہ کسی خم کے چھپا ہو پیچھے
شیخ ہر بات پہ لاحول پڑھے جاتے ہیں
جیسے لٰسین کوئی شیطان پڑا ہو پیچھے

بشیر احمد طاہر

آرٹ اور سماج
(ایک تصویر دیکھ کر)

۱

اک مصوّر کی نئی تصویر میں
آدمی بھی تھا مثالِ خشت و سنگ
بے حقیقت اِس قدر اُس کا وجود
تھا بھی رنگوں میں وہ بھی ایک رنگ

۲

تھا وہ اک بدرنگ سا کالا نشاں
آدمی کا اُس پہ ہو کیسے گماں
جیسے رستہ پر بھکاری تھا پڑا
بے زر و بے سازو ساماں بے مکاں

۳

کیا یہی ہے آدمیت کا عروج
بن کے وہ رہ جائے دھبّا یا کہ سنگ
ہے کہاں اِس علم و دانش کا کمال
عقل خود اپنے کرشموں پر ہے دنگ

۴

ہو رہی انسانیت ہے نیم جاں
کر رہی تہذیبِ نو ہے اُس کا خوں
کھول دے باب اک نئی تہذیب کا
پاس تیرے ہے کلیدِ کُن فیکون

۵

جس میں حاصل ہو مساوات اور خلوص
جس میں ہو ہر دردِ انساں کا علاج
زندگی کی ہو اگر اس میں جھلک
آرٹ بھی پیدا کرے طرفہ سماج

۶

آرٹ کیا ہے؟ زندگانی کا پیام
اک تجلی ہے کہ تیغِ بے نیام
ہو رہی کیا کچھ اشاروں میں ہے بات
آرٹ ہے دل کا پیامِ بے کلام

؎ IMPRESSIONIST ART جس میں موضوع کو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان تصور یا امپریشن کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اختر بستوی

مارِ آستیں

بلاؤں کی فراوانی ہے اور آفات کی کثرت،
مصیبت ہی مصیبت ہے جدھر نظریں اٹھاتا ہوں
ہمیشہ اک تڑپ سی جاگزیں رہتی ہے سینے میں
نہ دن کو چین آتا ہے نہ راحت شب کو پاتا ہوں
مصائب لاکھ ہوتے، یوں نہ بیتابی مجھے ملتی
حقیقت یہ ہے محسوسات نے میرا سکوں کھویا
خلشِ قلب و جگر کی فطرتِ حساس نے دی ہے
مرا احساس میری آستیں کا سانپ ہے گویا

بہتر کون؟

جو لوگ کریں یوں عمر بسر
محلوں میں گذاریں شام و سحر
پھندوں میں تعیش کے پھنس کر
نکلیں نہ کبھی گھر سے باہر
محصور ہو جن لوگوں کی نظر
محکوم ہوں جن کے قلب و جگر
ہم سے وہ کسی بھی قیمت پر
ہو سکتے نہیں ہرگز برتر
محتاج ہیں اور مفلس ہیں مگر
آزاد تو ہیں ہم اہلِ ہنر
[illegible] کے محل ہونگے کیونکر
[illegible] سے بہتر

رونق دکنی سیمابی

مہکی دوشیزۂ فطرت کے بدن کی خوشبو
جیسے برسات کے موسم میں ہو بن کی خوشبو
کس نے کھولی گرۂ زلف چلی بادِ نسیم
کس کی انگڑائی سے پھیلی ہے چمن کی خوشبو
ہے جو پاکیزگیٔ نفس کا ضامن ملبوس
شخصیت سے بھی مہک اٹھتی ہے فن کی خوشبو
پیار خوشبو ہے تو خوشبو کی ہے بنیاد عمل
رکھتی ہے رو بہ عمل دل کو لگن کی خوشبو
فکر کو قوتِ تخلیق عطا کرتی ہے
بڑی فیاض جو ہے عظمتِ فن کی خوشبو
جو سمٹ جاتی ہے بانہوں میں حیا کے وہ سہاگ
پھیل جاتی ہے جو خود سے وہ دلہن کی خوشبو
وہ تکلم اک سماعت میں جو رس گھولے ہے
خوش کلامی سے عبارت ہے دہن کی خوشبو
اب بھی حق گوئی کے پھولوں سے معطر ہے دماغ
اب بھی ہے سرخوشیٔ دار و رسن کی خوشبو
میں کہ پروردۂ تہذیبِ دکن ہوں رونق
میری ہر سانس میں بسی ہے ارضِ دکن کی خوشبو

محمد اکبر الدین صدیقی

نقد و نظر

اُردو الفاظ شماری

جناب حسن الدین احمد ناشر ولا اکیڈیمی عزیز باغ سلطان پورہ حیدرآباد۔ سائز ڈبل ڈیمی۔ مقدمہ ۸۰ صفحے — فہرست تکراری الفاظ ۶۹۲ صفحے انگریزی مقدمہ ۲۰ = ۷۶۰ صفحے کاغذ دبیز چکنا، کتابت و طباعت نفیس۔ مجلد معہ گرد پوش قیمت ۵۰ روپے۔

الفاظ شماری کا کام اردو میں بہت کم ہوا ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر بہت کام ہوا ہے اور اسی کی روشنی میں نصابی کتابوں کا ایک عمدہ سلسلہ نیو میتھڈ ریڈر کے نام سے شائع ہوا تھا جو عرصہ تک ہمارے مدارس میں رائج رہا۔ الفاظ شماری سے ہمیں اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ کونسا لفظ ہماری زبان میں بہ کثرت استعمال ہوا ہے اور کونسا کم۔ کم استعمال شدنی الفاظ نو آموزوں کیلئے مفید نہیں ہوتے اسی لئے بہ کثرت استعمال ہونے الفاظ ہی ابتدائی نصاب میں بہ تدریج شامل کئے جاتے ہیں۔ زبان کی توسیع کا یہ ایک احسن طریقہ ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب کی ابتدا زبان کی تاریخ سے کی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ چار ہزار سال پرانی ہے۔ اس کے نام، روپ، اشکال اور الفاظ بدلتے رہے لیکن اس کا بنیادی کردار باقی رہا اور عوامی رنگ بھی ہمیشہ یکساں رہا۔ آریوں کی آمد سے عوامی زبان کی داغ بیل پڑتی ہے۔ مختلف ادوار سے گذر کر دہ دکن میں ایک خاص شکل اختیار کرتی اور ادبی زبان بنتی ہے۔ اس کو شاہی سرپرستی نہ ملی مسلمان فارسی کے دلدادہ رہے اور انگریزی دور میں انگریزی کی سرپرستی ہوتی رہی مگر اردو عوام کے سہارے آگے بڑھتی رہی۔ اس کو صوفیوں، سپاہیوں اور تاجروں نے پروان چڑھایا۔ چونکہ زبان کا مزاج جمہوری ہے اس لئے یہ پھولتی پھلتی اور زمانہ کے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے بڑھ رہی ہے۔

مقدمہ میں لفظ کی تاریخ کی بحث بہت دلچسپ ہے۔ یعنی الفاظ کے آغاز اور ان کی تشکیل کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں۔ مثلاً لفظ "پرانا" کے تعلق سے کہا گیا ہے کہ یہ پُران سے مشتق ہے اور معنی ہیں "پُران کے دور کا"

"اردو الفاظ شماری" کے عنوان کے تحت بتلایا گیا ہے کہ الفاظ کی تکراری فہرست سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کم و بیش ایک ہزار الفاظ اردو زبان کو جاننے کے لیے ضروری ہیں۔ فاضل مصنف نے یہ صحیح کہا ہے کہ "کسی نو آموز کو ایسا لفظ سکھانا جو ۵ لاکھ میں پچاس یا اس سے زیادہ دفعہ استعمال ہوا ہو زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ بہ نسبت اس لفظ کے جو ۵ لاکھ میں ایک یا دو بار استعمال ہوا ہو۔"

الفاظ شماری کے لئے اردو زبان کو دس شعبوں میں تقسیم کیا گیا پھر ہر شعبہ سے نمائندہ ادب کا انتخاب کیا گیا۔ جو

پچاس ہزار الفاظ پر مشتمل تھا اس طرح ۵ لاکھ الفاظ پر مشتمل نمائندہ ادب کو جمع کیا گیا۔

الفاظ کی فہرستیں دو ہیں ایک بلحاظ حروف تہجی اور ایک بلحاظ تکرار۔ تکرار میں لفظ "ہونا" سب میں زیادہ ہے اور ان پانچ لاکھ الفاظ میں ایسے کئی الفاظ ہیں جو صرف ایک دفعہ ہی استعمال ہوئے ہیں جن کے بارے میں یہ کہا جاسکتا کہ اگر یہ عام آدمی کے علم میں نہ آئیں تو مضائقہ نہ ہوگا۔

مقدمہ میں اس امر کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ انگریزی ہندی چھتیس گڑھی اور اردو میں الفاظ شماری کا کس قدر کام ہوا ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں یہ کام منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اشاعت سے زبان کے مسایل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے میں مدد ملے گی خصوصاً ان الفاظ کے تعلق سے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ جو ہندی اور دیگر یوروپی زبانوں کے ہماری زبان میں شامل ہوگئے ہیں۔

فاضل مرتب ہمارے ملک کے انتظامی امور کے اعلیٰ عہدہ دار ہیں اپنی سرکاری مصروفیات کے بعد اس قدر غیر دلچسپ برسوں کا وقت لینے والے اور اعتبار سے کٹھن کام کو ہاتھ میں لینا اور اس کو ذمہ داری کے ساتھ تکمیل کو پہنچانا زبان سے ان کی محبت اور کام سے لگن کا ثبوت ہے۔ کتاب کے انگریزی اور اردو مقدمے نہایت غور اور دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ ہماری زبان کے علماء اور نصاب مرتب کرنے والے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

بصائر (علم تصوف۔ نظری و عملی) جزو اول | سید شاہ لیاقت حسین صاحب قادری۔ صدر شعبہ عربی جامعہ عثمانیہ۔ بیت السادات۔ محلہ الاوہ بی بی حیدرآباد ملکپیٹ۔ قیمت چھ روپے۔

پروفیسر سید شاہ لیاقت حسین قادری اپنے علم و فضل اور وعظ و ارشاد کی وجہ سے حیدرآباد میں معروف ہیں۔ بصائر ان کی تصنیف ہے جس میں تصوف کے علم کو نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ تصوف کا مفہوم اس کی ابتدا اور اس کا ارتقا بہ تفصیل متعدد کتب احادیث۔ وفقہ سے واضح کیا گیا ہے

یہ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ علم تصوف پر ہے جس میں تصوف کی ابتدا۔ تحقیق اور معانی۔ قرآن اور احادیث سے تصوف کا ثبوت، اس کا مقصد۔ وسیلہ، سماع، وجد، نظام صوفیہ اور سلاسل طریقت پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرا مقالہ معرفت الٰہی پر ہے۔ جس کے ذیل میں واجب الوجود، مسئلہ توحید، وحدۃ الوجود، وحدت ذات، کلام اللہ، وحی، رویت الٰہی عارف الوجود، ممکن الوجود۔ مراتب ستہ، مرتبۂ احدیت، وحدت، واحدیت، عالم جبروت، ملکوت، لاہوت کی تفہیم کی گئی ہے۔ چوتھے مقالہ کا عنوان محبت حقیقی ہے جس کے تحت، محبت، حب اللہ۔ جمال، کمال، خصال، تربیت، محبت، حب رسول، صحبت کی تاثیر اور صحبت کے حکم کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آخری مقالہ سفر دنیا ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات میں دنیا۔ دنیا انسان کیلئے انسان خدا کے لئے۔ دنیا کی حقیقت،

دنیا کی بے ثباتی، رہبانیت، دنیا و آخرت، سفر دنیا، سفر ظاہری، سفر باطنی، سیر حکم، سیر سیر الی اللہ، باللہ، معہ اللہ، فی اللہ شامل ہیں۔

فاضل مصنف نے چونکہ خود سلسلۂ قادریہ میں منسلک ہیں اس لئے مختلف کتب سے اپنے بیانات کے لئے ثبوت پیش کئے اور حوالے دئے ہیں اور عالمانہ انداز میں مسائل کو سمجھایا ہے۔ قرآن اور حدیث کے بعد عربی، فارسی اور اردو میں اس موضوع پر جہاں کہیں بھی مفید مطلب مواد حاصل ہوا ہے اس کو پیش کر کے حوالہ دیا گیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیر نظر کتاب متعدد کتابوں کے مطالعہ کا حاصل ہے اور تصوف کے تعلق سے معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ جو مختلف کتابوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک جگہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

مولانا نے تصوف کے مسائل کو نظری کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی ظاہر کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔

ہمارا ادب خصوصاً دکنی ادب تصوف کی کتابوں سے مالا مال ہے بلکہ ہمارے ادب آغاز ہی صوفیائے کرام کا رہین منت ہے۔ حضرت خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین حضرت برہان الدین جانم کی تصنیف کلمۃ الحقائق اور ارشاد نامہ سید محمد ابراہیم زبیری قادری کا رسالہ کشف الاسرار، قاضی محمود بحری کی من لگن اور بنگاب نامہ شمالی ہند کی کتب میں ملک محمد جائسی کی پدماوت اور گجرات میں حضرت خوب محمد چشتی کی خوب ترنگ اور کنج خوبی حضرت شاہ علی جیو گام دھنی کی جواہر اسرار اللہ تعلیمات تصوف کے مظہر ہیں۔ صوفیائے کرام نے اپنی خانقاہوں کو ایک بڑی درسگاہ کی شکل دی تھی آج یہ خانقاہیں تو ہیں لیکن درسگاہوں کا وجود باقی نہیں رہا۔ عصر حاضر کے علمائے کرام اگر نئے سرے سے تصوف کو صحیح معنی میں سمجھانے کی کوشش کریں اور اپنے عمل سے اغیار کے قلوب کو مسخر کریں تو ان کا یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ اس سے تنفر کے جو جذبات جاگزیں ہوگئے ہیں ان سے نجات پانے میں مدد مل سکے گی۔ بصائر کا بغور مطالعہ اور اس پر عمل اس سلسلے میں کافی کارآمد ثابت ہوگا۔

فاضل مصنف علم تصوف پر ایک عالمانہ مقالہ کی اشاعت پر قابل مبارکباد ہیں۔ کتاب لیہ کرائون پر ٹائپ میں چھپی ہے اور چھ روپے قیمت واجبی ہے۔

جناب زینب ثانی زہرا مختصر سوانح حیات اور انیس کی سحر نگاری

نورالحسن۔ پی، اے، بی، ٹی (علیگ)، ڈپ ایڈ (گلاسگو)
۱۲۰ صفحے قیمت غیر مجلد تین روپے۔

حضرت زینب حضرت سید الشہدا کی ہمشیرہ محترمہ ہیں آپ اپنے بھائی کے ساتھ کربلائے معلی کے سفر میں ساتھ رہیں اور شہادت کے بعد مراجعت فرما ہوئیں آپ کے اسوۂ حسنہ کی متعدد تصویریں میر انیس نے اپنے مراثی میں جابجا پیش کی ہیں۔ ان مراثی میں آپ سے متعلق جو ٹکڑے ملے ان کا انتخاب کر کے جناب نورالحسن صاحب نے اس کتاب میں ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس میں جہاں حضرت [illegible] کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ ہوتا ہے وہیں میر انیس کی جذبات نگاری، انسانی نفسیات، خداشناسی، حسنِ تصور، زبان کی تراش خراش، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال، الفاظ کی فراوانی اور ان کے استعمال میں میدانی دریا کی روانی بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ انیس نے ایک محترم خاتون کے جذبات کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس کا جواب ہمارا ادب نہیں پیش کرسکتا۔ انیس کے مراثی کی چار جلدوں میں سے حضرت زینب سے متعلق بندوں کا جمع کرنا اور ان کی ترتیب قائم کرنا بھی آسان کام نہ تھا جناب [illegible] الحسن نے یہ بیڑا اٹھایا اور بحسن و خوبی انجام کو پہنچایا۔ صاحب ذوق حضرات کے لیے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

مطالعہ میر نظام الدین ممنون دہلوی حیات۔ شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر محمد نشاط الرحمٰن خاں نشا۔ ۱۱ اسٹار کی ٹاؤن۔ ناگپور۔ مجلد۔ ڈیمی سائز ۳۷۲ صفحے قیمت گیارہ روپے۔

میر نظام الدین ممنون دہلوی۔ میر قمر الدین منت کے بیٹے تھے۔ سونی پت کے رہنے والے تھے، دلی لکھنؤ اجمیر میں زندگی گزاری تقریباً اسی سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا اکبر شاہ ثانی کے دربار میں انھوں نے بحیثیت استاد السلطان کچھ عرصہ گزارا پھر لکھنؤ گئے وہاں سے اجمیر میں صدر الصدور ہوکر آگئے۔ مشکل زمینوں میں شعر گوئی کا دور دوغزلہ اور سہ غزلہ کہنا استادوں کا کام سمجھا جاتا تھا۔

ممنون نے بھی زمانہ کا ساتھ دیا اور ہر رنگ میں شعر کہے۔ چونکہ وہ غالب کے پیشرو تھے اس لئے اکثر اشعار جو انھوں نے لکھے غالب کے کلام میں بھی ان کا مضمون ملتا ہے۔ اس طرح ممنون کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

نشا صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے ممنون کا انتخاب کیا اور کام تکمیل کرکے ڈگری حاصل کی۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے۔ حیات۔ دربار سے سرکار تک۔ ممنون معاصرین کی نظر میں، ممنون شاعر اور استاد، محاسن کلام، شعری اور ادبی خدمات (تقابلی مطالعہ) اس کے بعد دیوان ممنون کو اختلاف نسخ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

کلیات کے جو نسخے مرتب کے پیش نظر رہے حسب ذیل ہیں۔ نسخۂ حیدرآباد (آصفیہ) ۲۔ نسخۂ لندن۔ ۳۔ نسخۂ بھوپال ۴۔ نسخۂ دہلی۔ آخری نسخہ نسخۂ حیدرآباد کی نقل ہے۔ اہمیت تین نسخوں کی ہے آصفیہ اور بھوپال کے نسخے قدیم ہیں اور لندن اہنیہ کا ہے۔ اس میں کلام بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے اختلاف نسخ کو درج نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کو اہمیت نہیں دی گئی۔

کاغذ اوسط کتابت و طباعت صاف اور دلکش ہے۔ توقع ہے کہ کتاب قبولیت عام حاصل کرے گی۔

اس میں جہاں حضرت موصوفہ کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ ہوتا ہے وہیں میر انیس کی جذبات نگاری، انسانی
احتیاط، فطانیت، حسن تصور، زبان کی تراش خراش، تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال الفاظ کی فراوا
ان کے استعمال میں میدانی دریا کی روانی بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ انیس نے ایک محترم خاتون کے جذبات
جس انداز میں پیش کیا ہے اس کا جواب ہمارا ادب نہیں پیش کر سکتا۔ انیس کے مراثی کی چار جلدوں
حضرت زینب سے متعلق بندوں کا جمع کرنا اور ان کی ترتیب قایم کرنا بھی آسان کام نہ تھا جناب [illegible]الحسن
بیڑا اٹھایا اور بحسن و خوبی انجام کو پہنچایا۔ صاحب ذوق حضرات کے لیے یہ ایک اچھا تحفہ ہے۔

مطالعہ میر نظام الدین ممنون دہلوی حیات۔ شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر محمد نشار الرحمن خاں نشا۔ ۱۱ اسٹار کی ٹاؤن۔ ناگپور۔ مجلد۔ ڈیمی سائز ۳۷۲ صفحے قیمت گیارہ روپے۔

میر نظام الدین ممنون دہلوی۔ میر قمر الدین منت کے بیٹے تھے۔ سونی پت کے رہنے والے تھے، دلی، لکھنؤ،
اجمیر میں زندگی گزاری تقریباً اسّی سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ میں انتقال کیا اکبر شاہ ثانی کے دربار میں انھوں نے نجم
استاد السلطان کچھ عرصہ گزارا پھر لکھنؤ گئے وہاں سے اجمیر میں صدر الصدور ہو کر آگئے۔ مشکل زمینوں میں شعر گوئی کا،
دو غزلہ اور سہ غزلہ کہنا استادوں کا کام سمجھا جاتا تھا۔

ممنون نے بھی زمانہ کا ساتھ دیا اور ہر رنگ میں شعر کہے۔ چونکہ وہ غالب کے پیشرو تھے اس لئے اکثر اشعار جو
انھوں نے لکھے غالب کے کلام میں بھی ان کا مضمون ملتا ہے۔ اس طرح ممنون کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

نشا صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے ممنون کا انتخاب کیا اور کام تکمیل کر کے ڈگری حاصل کی۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے۔ حیات۔ دربار سے سرکار تک۔ ممنون معاصرین کی نظر میں، ممنون شاعر اور
استاد، محاسن کلام، شعری اور ادبی خدمات (تقابلی مطالعہ) اس کے بعد دیوان ممنون کو اختلاف نسخ کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے۔

کلیات کے جو نسخے مرتب کے پیش نظر رہے حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ نسخۂ حیدرآباد (آصفیہ) ۲۔ نسخۂ لندن۔
۳۔ نسخۂ بھوپال ۴۔ نسخۂ دہلی۔ آخری نسخہ نسخۂ حیدرآباد کی نقل ہے۔ اہمیت تین نسخوں کی ہے آصفیہ اور بھوپال کے
نسخے قدیم ہیں اور لندن بعد کا ہے۔ اس میں کلام بھی نسبتاً زیادہ ہے۔ بعض جگہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مرتب نے
اختلاف نسخ کو درج نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کو اہمیت نہیں دی گئی۔

کاغذ متوسط کتابت و طباعت صاف اور [illegible] توقع ہے کہ کتاب قبولیت عام حاصل کرے گی۔

The "SABRAS" Urdu Monthly
Organ of "Idara-e- Adabiyat-e-Urdu", Aiwan-e-Urdu, Hyderabad-4 (A. P.